

اشرنگار
اہلِ تسلیم کی ایک جماعت

زیرِ نظر
استادِ محقق ایتانہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی

تفسیر نمونہ

جلد ۷

ترجمہ
حضرت مولانا سید صفدر حسین نجفی جوہان آبادی

زیرِ سرپرستی

www.sirat-e-mustaqeem.net

مصباح القرآن ٹرسٹ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

عَرَضِ نَاشِر

قارئین محترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔
الحمد للہ! مصباح القرآن ٹرسٹ۔ کلام حکیم اور عبد حاضر کی بعض عظیم تفاسیر و تالیفات کی نشر و اشاعت کے ایک عظیم مرکز کی حیثیت سے اب کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ اس کی یہ شہرت حق تعالیٰ کے فضل و کرم اور آپ حضرات کی تائید و اعانت کا ثمرہ ہے۔

اس ٹرسٹ نے اپنے آغاز کار میں موجودہ دور کی شہ و آفاق تفسیر۔ تفسیر نمونہ۔ کو فارسی سے اردو زبان میں ترجمہ کروانے کے شائع کرنے کا منصوبہ بنایا اور پھر جس ملت حضرت علامہ سید صفدر حسین نجفی قبلہ اعلیٰ اللہ مقامہ، کی غیر معمولی مساعی، مالی معاونت کی فراخ دلانہ اعانت اور کارکنان کی شبانہ روز محنت کی بدولت پانچ ہی سال کے قلیل عرصے میں کم و بیش دس ہزار صفحات پر محیط یہ تفسیر صوری و معنوی خوبیوں سے آراستہ تائیس جلدوں میں شائع کرنے کی سعادت حاصل کر لی۔ شکر اللہ۔

اس ادارے نے نہ صرف تفسیر نمونہ کے عظیم منصوبے کو حیرت انگیز سرعت کے ساتھ پایا تکمیل تک پہنچایا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ بیسیوں علمی کتب کے علاوہ سید العلماء السید علی نقی النقیوی اعلیٰ اللہ مقامہ کی سات جلدوں پر مشتمل تفسیر فیصل الخطاب شائع کی۔ اردو زبان کو پہلی مرتبہ تفسیر قرآن کے جدید اسلوب سے روشناس کراتے ہوئے تفسیر موضوعی کے دو طویل سلسلوں یعنی ”پیام قرآن“ از آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی اور ”قرآن کا دائمی منشور“ از آیت اللہ جعفر سبحانی کی اشاعت کو بھی تیزی سے آگے بڑھا رہا ہے۔

تفسیری حواشی پر مشتمل ایک جلدی قرآن پاک عبد حاضر کے مقبول اردو تراجم کے ساتھ زیر طباعت ہیں۔ اس سلسلے میں دانش فراور حمید عالم دین حضرت علامہ ذیشان حیدر جواد مدظلہ کا ترجمہ ”الوار القرآن“ حال ہی میں شائع ہوا ہے۔

تفسیر نمونہ چونکہ بلا امتیاز پوری امت مسلمہ کو اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لیے بیدار و تیار کرنے کے لیے لکھی گئی ہے، لہذا بھی مسلمانوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر جلد کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہونے کے باوجود اس کی



پیشکش: حوزہ علمیہ جامعہ المنتظر لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب: تفسیر نمونہ

جلد: ۷

زیر نظر: آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی

مترجم: حضرت مولانا سید صفدر حسین نجفی

ناشر: مصباح القرآن ٹرسٹ۔ ۱۰، رنگ گرام بلڈنگ

شاہراہ قائد اعظم، لاہور

مطبع: معراج دین پرنٹرز، لاہور

تاریخ اشاعت: ربیع الثانی ۱۴۱۷ھ

ہدیہ

ملنے کا پتہ:

قرآن سنٹر

۲۴ الفضل مارکیٹ اردو بازار، لاہور

فون: ۷۱۲۲۲۲۳ - ۷۱۴۳۱۱

طلب میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ آپ کا یہ ادارہ ہمیشہ خوب سے خوب تر کی جستجو میں رہا ہے۔ بعض باذوق اہل علم کی تجویز پر ہم تفسیر نمونہ کی طباعت کے ضمن میں ایک مفید تبدیلی کر رہے ہیں، چنانچہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ اسے موجودہ ستائیس جلدوں کی بجائے پندرہ جلدوں میں مرتب کر کے شائع کیا جائے تاکہ قارئین محترم کے لیے مزید آسانیاں پیدا کی جاسکیں۔

تفسیر نمونہ کی اس ترتیب نو کا ایک عام طریقہ تو یہ تھا کہ ہر جلد میں دو دو پاروں کی تفسیر ہو اور یوں اس کی پندرہ جلدیں مکمل ہو جائیں لیکن اس میں یہ سقم رہا جاتا ہے کہ بہت سی قرآنی سورتوں کا کچھ حصہ ایک جلد میں اور بقیہ حصہ اس سے اگلی جلد میں چلا جاتا ہے جس سے مطالعے کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے، لہذا ہم نے اپنے قارئین کو اس زحمت سے بچانے کی خاطر اس تفسیر کو سورتوں کی بنیاد پر ترتیب دیا ہے۔ اس طرح کوئی قرآنی سورت دو حصوں میں تقسیم نہیں ہونے پائی اور ہر جلد کسی نہ کسی سورت کی کامل تفسیر منہم ہو گئی۔ اس طرح پوری تفسیر نمونہ پندرہ جلدوں میں آگئی ہے۔

اس جدید اشاعت کے سلسلے میں تفسیر نمونہ جلد ۱۷ اس وقت آپ کے پیش نظر ہے جس میں سابقہ جلد ۱۲ میں سے صفحہ ۲۹۹ تا ۴۹۷۔ جلد ۱۳ مکمل اور جلد ۱۴ میں سے صفحہ ۲۷ تا ۱۶۷ شامل کیے گئے ہیں، چنانچہ یہ جلد سورہ کہف، سورہ مریم، سورہ طہ، سورہ انبیاء اور سورہ حج کی تفسیر مشتمل ہے۔

ہم نے زیر نظر کتاب کو بہتر انداز میں پیش کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے، تاہم اس بارے میں آپ کی آراء ہمارے لیے بہترین رہنما ہوا کرتی ہیں کہ جن کی روشنی میں ہم اپنی مطبوعات کو مزید بہتر بنا کر پیش کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔ امید ہے کہ آپ ہماری اس پیشکش کا بغور مطالعہ فرمانے کے بعد اس کا معیار مزید بلند کرنے کے سلسلے میں اپنی قیمتی آراء سے نوازیں گے۔ ہم مفید تنقید اور آراء کے لیے منتظر رہتے ہیں۔

آخر میں ہم لاہور کے ایک مخلص و فخر سردار مومن الحاج شیخ ظہور علی منگلا سے اظہار تشکر کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ جن کے تعاون سے تفسیر نمونہ کی یہ جدید اشاعت تکمیل کے مراحل طے کر رہی ہے، ہم دعا گو ہیں کہ خدا تعالیٰ بسحق معصومین ان کی اس خدمت کو قبول فرمائے۔ والسلام

الاکین

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

اُهداء

”مرکز مطالعات اسلامی و نجات نسل جوان“

جو تمام طبقات میں عموماً — اور

نوجوانوں میں خصوصاً

اسلام کی حیات بخش تعلیمات پہنچانے کے لیے قائم کیا

گیا ہے۔

اس نفیس تالیف کو

ان اہل مطالعہ کی خدمت میں پیش کرتا ہے

جو قرآن مجید کے متعلق

بیشتر، بہتر اور عمیق تر معلومات

حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

حرزہ علیہ وسلم



یہ تفسیر

حسب ذیل علماء و مجتہدین کی باہمی کاوش قلم کا نتیجہ ہے

- ◎ حجة الاسلام دالین آقائے محمد رضا آشتیانی
- ◎ حجة الاسلام دالین آقائے محمد جعفر امامی
- ◎ حجة الاسلام دالین آقائے سید حسن شجاعی
- ◎ حجة الاسلام دالین آقائے سید نور اللہ طباطبائی
- ◎ حجة الاسلام دالین آقائے محمود عبد اللہی
- ◎ حجة الاسلام دالین آقائے حسن قرآنی
- ◎ حجة الاسلام دالین آقائے محمد محمدی

چند تفاسیر

جن سے اس تفسیر میں استفادہ کیا گیا ہے

- | | | | |
|----|-------------------------|----|---|
| از | ۱- تفسیر مجمع البیان | از | مشہور مفسر علامہ طبرسی |
| از | ۲- تفسیر تبیان | از | دانشمند فقیہ بزرگ شیخ طوسی |
| از | ۳- تفسیر المیزان | از | علامہ طباطبائی |
| از | ۴- تفسیر صافی | از | علامہ محسن فیض کاشانی |
| از | ۵- تفسیر نور الثقلین | از | مروم عبد علی بن جمعة الحویزی |
| از | ۶- تفسیر بریلان | از | مروم سید ہاشم بحرینی |
| از | ۷- تفسیر روح المعانی | از | علامہ شہاب الدین محمود آلوسی |
| از | ۸- تفسیر المنار | از | محدث رشید رضا تقریرات (اس تفسیر شیخ محمد عبد) |
| از | ۹- تفسیر فی ظلال القرآن | از | سید قطب مصری |
| از | ۱۰- تفسیر قرطبی | از | محمد بن احمد انصاری قرطبی |
| از | ۱۱- اسباب النزول | از | واحدی (ابو الحسن علی بن مقویہ نیشاپوری) |
| از | ۱۲- تفسیر مراغی | از | احمد مصطفیٰ مراغی |
| از | ۱۳- تفسیر مفاتیح الغیب | از | فخر رازی |
| از | ۱۴- تفسیر روح البیان | از | ابو الفتوح رازی |



گزارش

تفسیر نمونہ (فارسی) ستائیس جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کے اردو ترجمے کے متعدد ایڈیشن بھی ستائیس جلدوں میں شائع ہوئے رہے ہیں۔ محسن ملت حضرت علامہ سید صفدر حسین نجفی اعلیٰ الشہ مقامہ کا اختتامی نوٹ اسی ترتیب کے مطابق جلد کے آخر میں تحریر کیا گیا تھا۔ نئی ترتیب میں بھی اسے تبدیل نہیں کیا گیا۔ خداوند کریم مولانا مرحوم کو جوار معصومین میں بلند درجات عطا فرمائے۔

(ادارہ)

اس تفسیر میں مد نظر اہداف

پوری دنیا، جس کی نظریں اسلام کی طرف لگی ہیں، چاہتی ہے کہ اسلام کو نئے سرے سے پہچانے۔ یہاں تک کہ خود مسلمان بھی چاہتے ہیں۔ اس کی کئی ایک وجوہات ہیں۔ جن میں سے ایک - ایران کا اسلامی انقلاب - اور - دنیا کے مختلف خطوں میں اسلامی تحریکیں - ہیں۔ جنہوں نے تمام لوگوں کے افکار خصوصاً نوجوان نسل کو اسلام کی زیادہ سے زیادہ معرفت کا پیاسا بنا دیا ہے۔

ہر شخص یہ جانتا ہے کہ اسلام کی شناخت کے لیے نزدیک ترین راستہ اور مطمئن ترین وسیلہ و ذریعہ عظیم اسلامی کتاب قرآن مجید میں غور و فکر اور اس کا مطالعہ ہے۔

دوسری جانب قرآن مجید جو ایک عظیم اور جامع ترین کتاب ہے، عام کتب کی مانند کسی ایک مسئلہ کی گہرائی پر مشتمل نہیں بلکہ اصطلاح کے مطابق اس میں کئی بطون ہیں اور ہر بطن میں دوسرا بطن مضمر ہے۔

بالفاظ دیگر ہر شخص اپنی فکری گہرائی، فہم و آگاہی اور لیاقت کے مطابق قرآن سے استفادہ کرتا ہے اور یہ مسلم ہے کہ کوئی شخص بھی قرآن کے چشمہ علم سے محروم نہیں کوٹتا۔

متذکرہ بالا گفتگو کی روشنی میں ایسی تفاسیر کی ضرورت پورے طور پر واضح ہو جاتی ہے جو افکارِ علما میں موجود رشتوں کو ایک دوسرے سے منسلک کریں اور محققین اسلام کی محنتوں اور حاصل فکر سے استفادہ کر کے بھی جائیں اور جو مختلف قرآنی اسرار کی گہری کھول سکیں۔

لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ کونسی تفسیر اور کونسا مفسر...؟ وہ تفسیر، کہ جو کچھ قرآن کہتا ہے اسے واضح کرے، نہ کہ جو کچھ مفسر چاہے اور پسند کرے اسے پیش کرے۔ اور وہ مفسر جو اپنے آپ کو قرآن کے سپرد کر دے اور اسی سے درس لے، نہ وہ کہ جو نہ جانتے ہوئے یا جان بوجھ کر اپنے پہلے سے کیے گئے فیصلوں اور نظریات کے مطابق جستجو کرے اور جو قرآن کا طالب علم بننے کی بجائے اس کا استاد بن جائے۔

البتہ عظیم مفسرین اور عالی قدر محققین اسلام نے آغاز اسلام سے آج تک اس سلسلہ میں قابلِ قدر کوششیں کی ہیں اور زمیں اٹھائی ہیں، انہوں نے عربی، فارسی اور دیگر زبانوں میں بہت سی تفسیریں تحریر کی ہیں کہ جن کے پڑھنے میں اس عظیم اسلامی کتاب کے بعض حیران کن مطالب تک رسائی ہو سکتی ہے (مشکر اللہ سبحانہ)

یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ حق طلب اور حقیقت کے متلاشی لوگوں کو

نئے نئے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مختلف مکاتب فکر کے تضادات اور محرکات کے باعث اور بعض اوقات منافقین و منافقین کے دوسوں کی وجہ سے، اور کبھی اس عظیم آسمانی کتاب کی تعلیمات کو ضروریاتِ زمانہ پر منطبق کرنے کے حوالے سے کچھ ایسے سوالات سامنے آتے ہیں جن کا جواب موجودہ دور کی تفاسیر کو دینا ہوگا۔

دوسری جانب تمام تفاسیر کو حوام الناس کے لیے نافذ اور اہل ادراک گوناگوں اقوال اور پیچیدہ مباحث کا مجموعہ نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ اس وقت ایسی تفاسیر کی ضرورت ہے جن سے خود قرآن کی طرح تمام طبقے استفادہ کر سکیں (اس کی وسعت اور اہمیت میں کمی کیے بغیر)۔

ان امور کے پیش نظر مختلف گردہوں نے ہم سے ایک ایسی تفسیر لکھنے کی خواہش کی جو ان ضروریات کو پورا کر سکے۔ چونکہ یہ کام خاصا مشکل تھا لہذا میں نے ان تمام فضلاء کو مدد و تعاون کی دعوت دی جو اس طویل اور نشیب و فراز کے حامل سفر میں اچھے بہتقدم اور ساتھی تھے اور میں تاکہ مشترکہ مساعی سے یہ مشکل حل ہو سکے۔ الحمد للہ! اس کام کے لیے توفیق شامل حال ہوئی اور ایسا ثمر و نتیجہ ملا کہ جس کا ہر طبقہ نے استقبال کیا۔ یہاں تک کہ اکثر علاقوں کے لوگ مختلف سطحوں پر اس تفسیر کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کی سترہ جلدیں جو اس وقت تک منظر عام پر آچکی ہیں (اور یہ اس کی اٹھارہویں جلد ہے) بار بار چھپیں اور تقسیم ہوئیں۔ اس توفیق الہی کا میں از حد شکر گزار ہوں۔

یہاں یہ بات میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس جلد کے مقدمہ میں اپنے قارئین کی توجہ چند نکات کی طرف مبذول کرواؤں۔

۱۔ بار بار یہ سوال ہوتا ہے کہ مجموعہ یا تفسیر کتنی جلدوں پر مشتمل ہوگی؟ اس کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ ظاہراً بیس جلدوں سے کم اور چوبیس جلدوں سے زیادہ نہ ہوگی۔

۲۔ اکثر یہ شکوہ بھی کیا جاتا ہے کہ تفسیر کی جلدیں تاخیر سے کیوں شائع ہوتی ہیں؟ مرضِ خدمت ہے کہ ہماری پوری کوشش ہوتی ہے کہ کام جلد از جلد ہو، یہاں تک کہ سفر و حضر میں، بعض اوقات جلا وطنی کے مقام پر، حتیٰ کہ بستر بیماری پر بھی میں نے یہ کام جاری رکھا ہے۔

چونکہ مباحث کے نظم و نسق اور محقق و گہرائی کو جلد بازی پر قربان نہیں کیا جاسکتا۔ لہذا اس طرح سے کام کرنا چاہیے کہ ان دونوں کے درمیان فاصلہ سمٹتا جائے۔ دوسری جانب طباعت و اشاعت کی مشکلات (خصوصاً جنگ کے زمانے میں) کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے۔ جو تاخیر کے اہم عوامل میں سے ایک ہے۔

۳۔ بعض اوقات یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر یہ تفسیر مختلف افراد کے قلم سے تحریر ہو رہی ہے تو

بعد ازاں تعداد ۲۷ تک چاہیے۔ (مترجم)

پہلے شاہ ایران معدوم کے دور میں مکتب کو جلا وطنی کا سامنا کرنا پڑا۔ (مترجم)

اس میں ہم آہنگی نہیں ہوگی۔

اس کے جواب میں عرض ہے کہ ابتدا میں معاملہ اسی طرح تھا۔ لیکن پھر اس صورت حال کو نظر رکھتے ہوئے میں نے فیصلہ کیا کہ تفسیر میں قلم ہر جگہ سیرا ہی ہو اور دوسرے دوست صرف مطالب کی جمع آوری میں مدد کریں۔ ان حضرات میں سے بھی ہر ایک اپنے کام کو پہلے انفرادی طور پر سرانجام دیتے ہیں اور ضروری یا دوامی جمع کرتے ہیں۔ بعد میں اجتماعی نشستوں میں ضروری ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے تاکہ مختلف مباحث، گوناگوں مسائل اور تفسیر کی ردائی میں بے ربطی پیدا نہ ہو اور ساری تفسیر ایک ہی طرز و روش پر ہو۔

انشاء اللہ امید ہے اس تفسیر سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کے لیے اس کا نہ صرف عربی بلکہ دیگر زبانوں میں بھی ترجمہ کیا جائے گا تاکہ اور لوگ بھی اس سے مستفید ہو سکیں۔ (یہ تجویز قارئینِ محترم کی جانب سے بھی آئی ہے)۔

خداوند!

ہماری آنکھوں کو بینا، کانوں کو شنوا اور ہماری فکر کو صاحب، کار ساز اور ارتقائی فرما تاکہ تیری کتاب کی تعلیمات کی گہرائیوں تک پہنچ سکیں اور اپنے اور دوسروں کے لیے روشن چراغ فراہم کر سکیں۔

خداوند!

جو آگ ہمارے انقلاب کے دشمنوں نے خصوصاً اور دشمنانِ اسلام نے عمرنا ہمارے خلاف لگا رکھی ہے اور جس کی وجہ سے ہماری توجہ مسلسل ان کی طرف ہٹی ہے، اس امتِ اسلامی کے مسلسل جہاد اور انتھک سعی و کوششوں کے نتیجے میں اسے خاموش کر دے تاکہ ایک ہی جگہ تجھ سے دل لگائیں اور تیرے راستے اور تیرے مستضعف بندگان کی خدمت کے لیے قدم اٹھائیں۔

بار اللہ!

میں توفیق اور زندگی عطا فرما کہ اس تفسیر کو مکمل کر سکیں۔ اس ناچیز و حقیر خدمت کو پایہ تکمیل تک پہنچا سکیں اور بیجا مجموعہ تیری بارگاہ میں پیش کر سکیں۔

اِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (تو ہر چیز پر قادر ہے)۔

ناصر مکارم شیرازی
حوزہ علیہ قم۔ ایران

فہرست

سورہ کہف

۲۸	سورہ کہف کی فضیلت
۲۹	سورہ کہف کے مضامین
۳۰	آیت اتا ۵
۳۲	اللہ اور قرآن کے ذکر سے آغاز
۳۳	چند اہم نکات
۳۴	۱۔ حمد الہی سے سورہ کی ابتداء
۳۴	۲۔ مستحکم، مستقیم اور نگہبان۔ کتاب
۳۴	۳۔ خدا کے لیے اولاد کے قائل افراد کو خصوصی تنبیہ
۳۵	۴۔ دعویٰ، بلا دلیل
۳۶	۵۔ عمل صالح۔ ایک مسلسل طرز عمل
۳۶	۶۔ جس نے اپنے "بندہ" پر کتاب نازل کی
۳۸	آیت ۶ تا ۸
۳۸	غم نہ کرو۔ یہ مونی آزمائش گاہ ہے
۳۹	چند توجہ طلب نکات
۳۹	۱۔ "بائع" کا مفہوم
۳۹	۲۔ "اسفاد" کا مطلب
۳۹	۳۔ "آثار" کا معنی
۳۹	۴۔ قرآن کے لیے لفظ "حدیث"
۳۹	۵۔ غنچہ ارادی
۴۲	آیت ۱۲ تا ۱۳
۴۲	شان نزول
۴۲	اصحاب کہف کا واقعہ شروع ہوتا ہے
۴۶	چند اہم نکات
۴۶	۱۔ "ادی الفتیۃ" کا مفہوم
۴۶	۲۔ "من لعدک رحمۃ" کا مفہوم
۴۶	۳۔ "ضربنا علی اذانہم" کا مطلب
۴۶	۴۔ "سنین عددا" کا مطلب
۴۶	۵۔ "بعثناہم" کا مفہوم
۴۶	۶۔ "لنعلم" کا مطلب
۴۶	۷۔ "ای الحزبین" کا مفہوم
۴۸	آیت ۱۳ تا ۱۶
۴۹	داستان اصحاب کہف کی تفصیل
۵۱	چند اہم نکات
۵۱	۱۔ ایمان اور جرأت و شہادت
۵۲	۲۔ ایمان اور امداد الہی
۵۲	۳۔ غار کے نام کی ایک پناہ گاہ

۵۴	آیت ۱۷ تا ۱۸
۵۵	اصحاب کہف کا اہم مقام
۵۵	چھ نشانیاں اور خصوصیات
۵۹	آیت ۱۹-۲۰
۶۰	ایک طویل نیند کے بعد بیداری
۶۱	چند اہم نکات
۶۱	۱۔ پاکیزہ ترین غذا
۶۲	۲۔ اصلاح کنندہ تقیہ
۶۲	۳۔ قرآن کا مرکز "لطف" ہے
۶۲	آیت ۲۱ تا ۲۴
۶۵	اصحاب کہف کے واقعے کا اختتام
۶۰	چند اہم نکات
۶۰	۱۔ "وجہا بالغیب" کا مفہوم
۶۰	۲۔ "وٹامنہم کلہم" میں واؤ
۶۲	۳۔ آرام گاہ کے پاس مسجد
۶۲	۴۔ تمام چیزیں مشیت الہی کے سارے
۶۲	پر ہیں۔
۶۳	۵۔ ایک سوال کا جواب
۶۵	آیت ۲۵ تا ۲۷
۶۶	اصحاب کہف کی نیند
۶۸	چند اہم نکات
۶۸	۱۔ داستان اصحاب کہف احادیث
۶۸	کی روشنی میں۔
۸۲	۲۔ "غار" کہاں ہے؟
۸۳	۳۔ اس واقعے کے تربیتی اور تعمیری پہلو
۸۵	اصحاب کہف کا واقعہ علی اعتبار سے
۸۹	ایک اور نمونہ۔ یوگا کے ماہرین
۸۹	زندہ انسان کے بدن کو منجمد کر دینا
۹۲	آیت ۲۸ تا ۳۱
۹۳	شان نزول
۹۴	پاک دل غریب لوگ
۹۸	چند اہم نکات
۹۸	۱۔ طبقاتی تفاوت۔ معاشرے کی
۹۸	عظیم شکل ہے۔
۹۹	۲۔ دونوں جہانوں کی زندگی کا موازنہ
۱۰۰	۳۔ ہوا پرستی اور خدا سے غفلت
۱۰۰	۴۔ دوسرے جہان میں لباس زینت
۱۰۰	۵۔ سرمائے کی وجہ سے سرمایہ داروں
۱۰۱	کی قربت۔
۱۰۲	آیت ۳۲ تا ۳۶
۱۰۳	مستضعفین کے مقابلے میں مسکین کا موقف
۱۰۵	آیت ۳۷ تا ۴۱
۱۰۶	مستضعفین کا جواب
۱۱۰	آیت ۴۲ تا ۴۴
۱۱۱	اور ان کا انجام کار.....
۱۱۳	چند اہم نکات
۱۱۳	۱۔ دولت کا غرور
۱۱۴	۲۔ اس داستان کے چند سبق

۱۱۶	آیت ۴۵-۴۶
۱۱۶	زندگی کی ابتداء و انتہا کے لیے ایک مثال
۱۱۹	چند اہم نکات
۱۱۹	۱- زندگی کی ناپائیدار خوشحائیاں
۱۲۰	۲- غرور شکن عوامل
۱۲۱	آیت ۴۷ تا ۴۹
۱۲۲	ہائے ہماری شامت - یہ کسی کتاب ہے؟
۱۲۲	چند اہم نکات
۱۲۲	۱- پہاڑ کیوں منہدم ہوئے
۱۲۶	۲- نامہ اعمال
۱۲۷	۳- معاد پر ایمان کا تربیتی نتیجہ
۱۲۹	آیت ۵۰ تا ۵۳
۱۳۰	نیطافوں کو اپنا سرپرست نہ بناؤ
۱۳۳	چند اہم نکات
۱۳۴	۱- کیا شیطان فرشتہ تھا؟
۱۳۵	۲- مگر اہل کو تعاون کی دعوت نہیں دینا چاہیے۔
۱۳۷	آیت ۵۴ تا ۵۶
۱۳۸	زیادہ عذاب کے منتظر ہیں
۱۴۱	آیت ۵۷ تا ۵۹
۱۴۲	اسب الہی میں جلدی نہیں ہو سکتی
۱۴۵	آیت ۶۰ تا ۶۴
۱۴۶	عز اور موسیٰ کی حیرت انگیز داستان
۱۵۱	آیت ۶۵ تا ۷۰
۱۵۲	عظیم استاد کی زیارت
۱۵۴	آیت ۷۱ تا ۷۸
۱۵۶	خدائی معلم اور یہ ناپسندیدہ کام
۱۶۲	آیت ۷۹ تا ۸۲
۱۶۳	ان واقعات کا راز
۱۶۷	چند اہم نکات
۱۶۷	۱- خضرؑ کی ماموریت تشریحی تھی یا تکوینی؟
۱۷۰	۲- خضرؑ کون تھے؟
۱۷۲	۳- خود ساختہ افسانے
۱۷۳	۴- کیا انبیاء کے لیے مجہول چوک ممکن ہے؟
۱۷۴	۵- موسیٰؑ خضرؑ کی ملاقات کو کیوں گئے؟
۱۷۵	۶- وہ عزرائلؑ کیا تھا؟
۱۷۶	۷- اس داستان سے حاصل ہونے والے درس
۱۸۱	آیت ۸۳ تا ۹۱
۱۸۳	ذوالقرنین کی عجیب کہانی
۱۸۷	آیت ۹۲ تا ۹۸
۱۸۹	ذوالقرنین نے دیوار کیسے بنائی؟
۱۹۲	چند اہم نکات
۱۹۲	۱- اس داستان کے تاریخی اور تربیتی نکات
۱۹۶	۲- ذوالقرنین کون تھا؟
۲۰۲	۳- دیوار ذوالقرنین کہاں ہے؟
۲۰۲	۴- یاجوج ماجوج کون ہیں؟
۲۰۴	آیت ۹۹ تا ۱۰۲
۲۰۵	بے ایمانوں کا ٹھکانہ

۲۰۸	آیت ۱۰۳ تا ۱۰۸
۲۰۹	سب سے زیادہ خسارے والے کون لوگ ہیں؟
۲۱۲	چند اہم نکات
۲۱۲	۱- "اخصرین اعمالاً" کون لوگ ہیں؟
۲۱۳	۲- "لقد اللہ" کیا ہے؟
۲۱۵	۳- اعمال کا وزن
۲۱۶	۴- "لا یبغون عنہا حولا" کی تفسیر
۲۱۶	۵- فردوس کن کا مقام ہے؟
۲۱۸	آیت ۱۰۹ تا ۱۱۰
۲۱۹	جو لقائے الہی کی امید رکھتے ہیں
۲۲۱	لامتناہی کی تصویر کشی
۲۲۲	اخلاص یا عمل صالح کی روح
۲۲۶	سورہ مریم
۲۲۷	اس سورہ کے مضامین
۲۲۷	اس سورہ کی فضیلت
۲۲۹	آیت ۱ تا ۶
۲۳۰	حضرت زکریاؑ کی پُر اثر دعا
۲۳۱	چند نکات
۲۳۱	۱- یہاں میراث سے کیا مراد ہے؟
۲۳۳	۲- "اذا نادى ربه ندا خفيا" کا مفہوم
۲۳۳	۳- "ویرث من ال یعقوب" کا مطلب
۲۳۴	آیت ۷ تا ۹
۲۳۵	آیت ۱۰ تا ۱۱
۲۳۵	زکریاؑ کی آرزو پوری ہو گئی
۲۳۷	چند نکات
۲۳۷	۱- یحییٰؑ: عشق الہی میں سرشار پیغمبر
۲۳۹	۲- محراب
۲۳۹	آیت ۱۲ تا ۱۵
۲۴۰	حضرت یحییٰؑ کی عمدہ صفات
۲۴۱	چند نکات
۲۴۱	۱- آسانی کتاب کو قوت کے ساتھ پکڑ لو
۲۴۱	۲- انسان کی سرنوشت کے تین مشکل دن
۲۴۲	۳- بچپن میں نبوت
۲۴۳	۴- حضرت یحییٰؑ کی شہادت
۲۴۴	آیت ۱۶ تا ۱۷
۲۴۵	آیت ۱۸ تا ۲۱
۲۴۵	حضرت عیسیٰؑ کی ولادت
۲۴۸	چند نکات
۲۴۸	۱- روح خدا سے کیا مراد ہے؟
۲۴۸	۲- تمثیل کیا ہے؟
۲۴۹	آیت ۲۲ تا ۲۶
۲۴۹	مریمؑ سخت طوفان کے تھپیڑوں میں
۲۵۲	چند اہم نکات
۲۵۲	۱- حضرت مریمؑ کی مشکلات میں تربیت
۲۵۲	۲- مریمؑ نے موت کی تمنا کیوں کی؟
۲۵۳	۳- ایک سوال کا جواب
۲۵۳	۴- خاموشی کا روزہ

۲۵۴	۵۔ ایک قوت بخش غذا	۲۸۰	آیت ۵۱
۲۵۵	آیت ۲۷ تا ۳۳	۲۸۱	آیت ۵۲، ۵۳
۲۵۶	حضرت یسوع کی گوارے میں باتیں	۲۸۱	موسیٰ ایک مخلص و برگزیدہ پیغمبر
۲۵۸	چند اہم نکات	۲۸۲	چند اہم نکات
۲۵۸	۱۔ قرآن کا شہن بیان اور ولادت عیسیٰ	۲۸۲	۱۔ مخلص کسے کہتے ہیں؟
۲۵۹	۲۔ مال کا مقام	۲۸۲	۲۔ رسول اور نبی میں فرق
۲۶۱	۳۔ باکرہ سے بچہ پیدا ہونا	۲۸۳	آیت ۵۴، ۵۵
۲۶۲	۴۔ نورانیدہ بچہ کس طرح بات کر سکتا ہے؟	۲۸۳	اسمعیل، صادق الوعد پیغمبر
۲۶۲	آیت ۳۲، ۳۵	۲۸۵	آیت ۵۶ تا ۵۸
۲۶۲	کیا خدا کا بیٹا ممکن ہے؟	۲۸۶	آیت ۵۹، ۶۰
۲۶۲	فرزند کی نفی یعنی خدا سے ہر قسم کے احتیاج کی نفی۔	۲۸۶	یسے پیغمبر تھے، لیکن.....
۲۶۲	پہلی ہجرت کے بارے میں ایک اہم تاریخی نکتہ	۲۸۹	چند نکات
۲۶۳	آیت ۳۶ تا ۴۰	۲۸۹	ادریس کون تھے؟
۲۶۴	قیامت، حسرت کا دن	۲۹۰	آیت ۶۱ تا ۶۳
۲۶۸	آیت ۴۱ تا ۴۳	۲۹۱	جنت کی توصیف
۲۶۸	آیت ۴۴، ۴۵	۲۹۴	آیت ۶۴، ۶۵
۲۶۸	ابراہیم کی موثر منطق	۲۹۴	شان نزول
۲۶۸	چند نکات	۲۹۵	ہم تو حکم کے بندے ہیں
۲۶۸	۱۔ دوسروں پر اثر انداز ہونے کا طریقہ	۲۹۶	آیت ۶۶ تا ۷۰
۲۶۸	۲۔ عالم کی پیروی کرنے کی اپیل	۲۹۶	شان نزول
۲۶۸	۳۔ رحمت اور یاد آوری کی ثورت	۲۹۶	دوزخیوں کی کچھ توصیف
۲۶۹	آیت ۴۶ تا ۵۰	۲۹۹	آیت ۷۱ تا ۷۲
۲۶۹	شرک اور مشرکین سے دوری کا نتیجہ	۳۰۰	کیا ہم سب جہنم میں جائیں گے؟
		۳۰۲	ایک سوال کا جواب

۳۰۳	آیت ۷۳ تا ۷۶	۳۰۳	آیت ۷۷ تا ۸۱
۳۰۶	آیت ۸۲	۳۰۶	ایک بیوہ اور انحرافی خیال
۳۰۷	آیت ۸۳ تا ۸۷	۳۱۰	شفاعت کیسے لوگ کر سکتے ہیں؟
۳۱۱	"عبد" کا معنی کیا ہے؟	۳۱۳	آیت ۸۸ تا ۹۳
۳۱۳	آیت ۹۴، ۹۵	۳۱۶	خدا اور اولاد کا ہونا
۳۱۶	چند اہم نکات	۳۱۸	۱۔ اب بھی اسے خدا کا بیٹا خیال کرتے ہیں
۳۱۸	۲۔ آسمان پھٹ کر ریزہ ریزہ کیسے ہوں گے؟	۳۱۸	آیت ۹۶ تا ۹۸
۳۱۹	ایمان محبوبیت کا سرچشمہ ہے	۳۱۹	چند اہم نکات
۳۲۲	۱۔ مومنوں کے دل میں حضرت علی کی محبت	۳۲۲	"یسرفہ بلسانک" کی تفسیر
۳۲۳	سورہ طہ	۳۲۳	سورہ طہ کی فضیلت
۳۲۴	اس سورہ کے مضامین	۳۲۴	آیت ۸ تا ۱۱
۳۲۸	آیت ۱۲ تا ۱۵	۳۲۸	سورہ طہ کی فضیلت
۳۲۹	شان نزول	۳۲۹	سورہ طہ کی فضیلت
۳۲۹	خود کو اتنا مشقت میں نہ ڈالو	۳۲۹	سورہ طہ کی فضیلت
۳۳۲	آیت ۱۶ تا ۱۹	۳۳۲	سورہ طہ کی فضیلت
۳۳۴	آیت ۲۰ تا ۲۳	۳۳۴	سورہ طہ کی فضیلت
۳۳۴	بیابان میں آگ کا شعلہ	۳۳۴	سورہ طہ کی فضیلت
۳۳۹	چند اہم نکات	۳۳۹	سورہ طہ کی فضیلت
۳۳۹	۱۔ "فاخلع تعلیق" سے کیا مراد ہے؟	۳۳۹	سورہ طہ کی فضیلت
۳۴۰	۲۔ ایک سوال کا جواب	۳۴۰	سورہ طہ کی فضیلت
۳۴۰	۳۔ نماز یا خدا کا بہترین ذریعہ	۳۴۰	سورہ طہ کی فضیلت
۳۴۱	آیت ۲۴ تا ۲۷	۳۴۱	سورہ طہ کی فضیلت
۳۴۲	موسیٰ کا عصا اور یہ بیضا	۳۴۲	سورہ طہ کی فضیلت
۳۴۵	چند اہم نکات	۳۴۵	سورہ طہ کی فضیلت
۳۴۵	۱۔ دو عظیم معجزے	۳۴۵	سورہ طہ کی فضیلت
۳۴۶	۲۔ چنیزوں کی فوق العادت استعداد	۳۴۶	سورہ طہ کی فضیلت
۳۴۶	۳۔ تورات اس بارے میں کیا کہتی ہے؟	۳۴۶	سورہ طہ کی فضیلت
۳۴۶	آیت ۲۸ تا ۳۰	۳۴۶	سورہ طہ کی فضیلت
۳۴۷	آیت ۳۱ تا ۳۶	۳۴۷	سورہ طہ کی فضیلت
۳۴۷	موسیٰ کے بچے تلے تقاضے	۳۴۷	سورہ طہ کی فضیلت
۳۵۱	چند اہم نکات	۳۵۱	سورہ طہ کی فضیلت
۳۵۱	۱۔ انقلاب کی رہبری کی شرائط	۳۵۱	سورہ طہ کی فضیلت
۳۵۱	۲۔ سرکشوں کے خلاف جنگ	۳۵۱	سورہ طہ کی فضیلت
۳۵۱	۳۔ ہر کام کے لیے پروگرام اور وسائل	۳۵۱	سورہ طہ کی فضیلت
۳۵۲	کی ضرورت ہے۔	۳۵۲	سورہ طہ کی فضیلت
۳۵۲	۴۔ تسبیح اور ذکر	۳۵۲	سورہ طہ کی فضیلت

۵۔ پیغمبر اسلام بھی موسیٰ علیہ السلام کے
تقاضوں کی تکرار کرتے ہیں۔

آیت ۲۷ تا ۴۱

لنسا مہربان خدا ہے؟

آیت ۴۲

یت ۴۲ تا ۴۸

باہر فرعون کے ساتھ پہلی مگر

چند اہم نکات

۱۔ خدا کی عجیب قدرت غائی

۲۔ مومنوں کے ساتھ مدارات

۳۔ کیا انبیاء کے علاوہ کسی اور پر وحی

ہو سکتی ہے؟

۴۔ ایک سوال کا جواب

یت ۴۹ تا ۵۳

یت ۵۴ تا ۵۵

۱۔ لفظ "مہد" اور "مہاد" کا مضمون

۲۔ لفظ "انولجا" کا مطلب

۳۔ اولیٰ النہی کی تفسیر

یت ۵۶ تا ۶۲

یت ۶۳ تا ۶۴

غری مقابلے کے لیے فرعون کی تیاری

یت ۶۵ تا ۶۹

موسیٰ بھی میدان میں آجاتے ہیں

چند اہم نکات

۱۔ جادو کی حقیقت کیا ہے؟

۲۔ جادوگر کبھی بھی کامیاب نہیں ہوتا

آیت ۷۰، ۷۱

آیت ۷۲ تا ۷۶

موسیٰ کی عظیم کامیابی

چند اہم نکات

۱۔ علم، ایمان و انقلاب کا سرچشمہ ہے

۲۔ ہم تجھے "بینات" پر مقدم نہیں کرتے

۳۔ مجرم سے کون مراد ہے؟

۴۔ ماحول کی مجبوری ایک بہانہ ہے

آیت ۷۷ تا ۷۹

بنی اسرائیل کی نجات اور فرعونوں کا غرق ہونا

آیت ۸۰ تا ۸۲

نجات کی واحد راہ

آیت ۸۳ تا ۹۱

سامری کا شور و غوغا

چند اہم نکات

۱۔ شوق ویدار

۲۔ انبیاء کے انقلاب کی مخالف تحریکیں

۳۔ رہبری کے مراحل

۴۔ ایک اعتراض کا جواب

آیت ۹۲ تا ۹۴

آیت ۹۵ تا ۹۸

سامری کا عبرت ناک انجام

چند اہم نکات

۱۔ مشکلات کے مقابل ٹوٹ جانا چاہیے

۲۔ سامری کون ہے؟

آیت ۹۹ تا ۱۰۱

آیت ۱۰۲ تا ۱۰۴

ان کے کندھوں پر بدترین بوجھ

آیت ۱۰۵ تا ۱۱۲

قیامت کا ہولناک منظر

چند نکات

۱۔ "ظلم" اور "ہضم" میں فرق

۲۔ قیامت کے مرحلے

آیت ۱۱۳، ۱۱۴

پروردگار! میرے علم کو اور زیادہ کر دے

چند نکات

۱۔ حصول وحی تک میں عجلت نہ کرو

۲۔ علم میں اضافے کے طلب گار رہو

آیت ۱۱۵ تا ۱۱۹

آیت ۱۲۰ تا ۱۲۱

شیطان کی فریب کاری

کیا آدم گناہ کے مرتکب ہوئے تھے؟

آیت ۱۲۳ تا ۱۲۵

آیت ۱۲۶ تا ۱۲۷

تنگ زندگی

چند اہم نکات

۱۔ یاد خدا سے غفلت اور اس کے نتائج

۲۔ اندرونی اور بیرونی غائبانی

۳۔ گناہ میں اسراف

۴۔ "بہوت" کیا ہے؟

آیت ۱۲۸ تا ۱۳۰

گذشتگان کی تاریخ سے عبرت حاصل کرو

آیت ۱۳۱ تا ۱۳۳

آیت ۱۳۴، ۱۳۵

سورہ انبیاء

سورہ انبیاء کی فضیلت

اس سورہ کے مضامین

آیت ۱ تا ۵

طرح طرح کے بہانے

ایک نکتہ

کیا قرآن حادث ہے؟

آیت ۶ تا ۹

آیت ۱۰

تمام پیغمبر نوح بشرت تھے

اہل ذکر کون ہیں؟

آیت ۱۱ تا ۱۵

ظالم غلاب کے جنگل میں کیسے گرفتار ہوئے؟

آیت ۱۶ تا ۱۸	۴۶۱
سمان اور زمین کی خلقت کھیل نہیں ہے	۴۶۱
ایک نکتہ	۴۶۲
قصہ خلقت	۴۶۳
آیت ۱۹ تا ۲۴	۴۶۶
آیت ۲۵	۴۶۶
شرک خیال آرائی سے شروع ہوتا ہے	۴۶۶
دلیل قانع	۴۶۹
ایک سوال اور اس کا جواب	۴۸۰
آیت ۲۶ تا ۲۹	۴۸۲
رشتے مکرم اور فرمانبردار بندے ہیں	۴۸۵
آیت ۳۰ تا ۳۲	۴۸۶
آیت ۳۳	۴۸۸
ان بستی میں خدا کی نشانیاں	۴۸۸
چند اہم نکات	۴۹۲
۱۔ "کل فی فلك یسبحون" کا مفہوم	۴۹۲
۲۔ آسمان حکم چھت ہے	۴۹۲
آیت ۳۴، ۳۵	۴۹۳
ت سب کے لیے ہے	۴۹۳
آیت ۳۶ تا ۴۰	۴۹۴
ان جلد باز مخلوق ہے	۴۹۸
اہم نکات	۵۰۰
جلد باز کو جلد بازی سے مانعت	"
"بل یتھم بغتۃ یتھم" کا مفہوم	"
آیت ۴۱ تا ۴۵	۵۰۱
کان دھر کے سنو اگر تھامے کان	۵۰۲
آیت ۴۶، ۴۷	۵۰۵
قیامت میں عدل کے ترازو	۵۰۵
آیت ۴۸ تا ۵۰	۵۰۸
انیاد کی کچھ داستان	۵۰۸
آیت ۵۱ تا ۵۸	۵۱۱
ابراہیمؑ جنوں کی نابودی کا منصوبہ بناتے ہیں	۵۱۲
چند اہم نکات	۵۱۵
۱۔ بت پرستی کی مختلف شکلیں	۵۱۵
۲۔ بت پرستوں کی گفتگو اور ابراہیمؑ کا جواب	۵۱۶
آیت ۵۹ تا ۶۷	۵۱۶
ابراہیمؑ کی دندان شکن دلیل	۵۱۷
آیت ۶۸ تا ۷۰	۵۲۲
اگ گلزار ہو گئی	۵۲۲
چند اہم نکات	۵۲۶
۱۔ سبب سازی و سبب سوزی	۵۲۶
۲۔ بہادر نوجوان	۵۲۶
۳۔ ابراہیمؑ اور غرود کے مابین معرکہ	۵۲۷
آیت ۷۱ تا ۷۳	۵۲۷
بت پرستوں کی سرزمین سے ابراہیمؑ کی ہجرت	۵۲۸
آیت ۷۴، ۷۵	۵۳۲
جڑوں کے علاقوں سے لوٹ کی نجات	۵۳۲
آیت ۷۶	۵۳۳

آیت ۷۷	۵۳۳
متعصب اور ہٹ دھرم لوگوں سے	۵۳۳
نوحؑ کی نجات	۵۳۴
ایک نکتہ	۵۳۶
آیت ۷۸ تا ۸۰	۵۳۶
داؤدؑ اور سلیمانؑ کا فیصلہ	۵۳۷
ایک نکتہ	۵۴۰
آیت ۸۱، ۸۲	۵۴۱
ہوٹنیں سلیمان کے زیر فرمان	۵۴۱
آیت ۸۳، ۸۴	۵۴۲
حضرت الیوبؑ کی مشکلات سے نجات	۵۴۵
چند نکات	۵۴۶
۱۔ حضرت الیوبؑ کی مختصر داستان	۵۴۶
۲۔ "اتینہ اھلہ و مثلہم مھم" کی تفسیر	۵۴۷
آیت ۸۵، ۸۶	۵۴۸
اسماعیلؑ، ادریسؑ اور ذوالکفلؑ	۵۴۸
ادریسؑ اور ذوالکفلؑ	۵۴۹
آیت ۸۷، ۸۸	۵۵۰
یونسؑ کی وحشت ناک زنداں سے رہائی	۵۵۰
چند اہم نکات	۵۵۱
۱۔ یونسؑ کی سرگذشت	۵۵۱
۲۔ یہاں ظلمات کے کیا معنی ہیں؟	۵۵۲
۳۔ یونسؑ نے کون سا ترک اولیٰ کیا تھا	۵۵۲
۴۔ کردار از سبق	۵۵۲
آیت ۸۹، ۹۰	۵۵۳
ذکر یا تنہا نہ رہے	۵۵۴
آیت ۹۱	۵۵۵
مریمؑ پاک دامن خاتون	۵۵۶
چند اہم نکات	۵۵۶
۱۔ ایک ابہام کی وضاحت	۵۵۶
۲۔ "روحنا" سے کیا مراد ہے	۵۵۷
۳۔ ماں بیٹا ایک معجزہ	۵۵۷
آیت ۹۲ تا ۹۴	۵۵۸
ایک اُمت	۵۵۸
آیت ۹۵ تا ۹۷	۵۶۱
کفار قیامت کے آستانے پر	۵۶۱
چند الفاظ کے لغوی معنی	۵۶۲
آیت ۹۸ تا ۱۰۳	۵۶۳
جہنم کا ایندھن	۵۶۵
آیت ۱۰۴	۵۶۸
جب آسمانوں کو لپیٹ دیا جائے گا	۵۶۸
آیت ۱۰۵، ۱۰۶	۵۷۰
زمین کی حکومت صالحین کے لیے ہو	۵۷۱
چند اہم نکات	۵۷۳
۱۔ قیام مہدی کے سلسلہ میں روایات	۵۷۳
۲۔ مزامیر داؤد میں صالحین کی حکومت	۵۷۳
کی بشارت	۵۷۳

۳۔ صالحین کی حکومت ایک قانون آفریش ہے۔

- آیت ۱۰۷ تا ۱۱۲
عالمین کے لیے پیغمبر رحمت
سورہ انبیاء کا اختتام

سورہ حج

- سورہ حج کے مضامین اور مطالب
۱۔ قیامت کا بیان
۲۔ شرک اور مشرکین کا بیان
۳۔ عذاب الہی کا بیان
۴۔ حج کا بیان
۵۔ ظالموں کے خلاف قیام کا بیان
۶۔ فروغ دین کا بیان
اس سورت کی تلاوت کے فضائل
آیت ۱-۲
قیامت کا وحشت ناک زلزلہ
چند اہم نکات
۱۔ دنیا میں قیامت کے مظاہر
۲۔ یہ آیات کس موقع کے بارے میں ہے
۳۔ "مرضعة" کے مفہوم کا ایک خاص پہلو
۴۔ "تروی الناس سکری" کا مفہوم
۵۔ ایک اہم واقعہ
آیت ۴، ۳

۲۲

شیطان کے پیروکار

- چند اہم نکات
۱۔ مجادلہ ہر دو حوالے سے
۲۔ باطل مجادلہ شیطانی طریقے سے
۳۔ ہر شیطان کی پیروی کیوں
۴۔ "کتب علیہ" کا مفہوم
آیت ۵ تا ۷
نباتات اور انسان کی پیدائش میں قیامت کے دلائل
چند اہم نکات
۱۔ انسانی زندگی سات مراحل پر مشتمل ہے۔
۲۔ معاد جسمانی
۳۔ ارذل العمر
آیت ۸ تا ۱۰
کج ہمتی کرنے والوں کے بارے میں
آیت ۱۱ تا ۱۲
کفر کے گڑھے کے کنارے کھڑے لوگ
آیت ۱۵ تا ۱۷
شان نزول
قیامت۔ تمام اختلافات کے خاتمے کا دن
چند اہم نکات
۱۔ آیتوں کا ایک دوسرے سے تعلق
۲۔ مجوسی کون ہیں؟

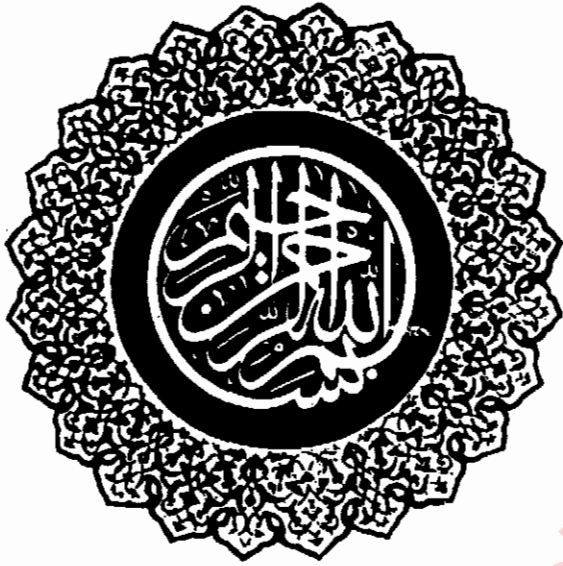
۲۳

۳۔ صالحین کون ہیں؟

- ۴۔ توحید سے انحراف کرنے والے
گمراہوں کی ترتیب
آیت ۱۸
عالم کی تمام موجودات اس کی بارگاہ میں سر بسجود ہیں۔
چند نکات
۱۔ یہ سب چیزیں سجدہ کس طرح کرتی ہیں؟
۲۔ کیا فرشتوں کا سجدہ "تشرعی" ہے؟
۳۔ چند سوالات اور ان کے جوابات
آیت ۱۹ تا ۲۲
شان نزول
دو مہم مقابل گروہ
آیت ۲۵
خدا کے گھر سے روکنے والے
چند اہم نکات
۱۔ دو مختلف صیغے
۲۔ "صد عن سبیل اللہ" کیا ہے
۳۔ اس منبع فیض میں تمام لوگ برابر کے
شریک ہیں "سواء العاکف والباد"
۴۔ اس آیت میں مسجد حرام سے کیا مراد ہے؟
۵۔ قلم کے ساتھ الحاد کا کیا مفہوم ہے۔
آیت ۲۶ تا ۲۸
حج کے لیے دعوت عام

چند اہم نکات

- ۱۔ آیات معلومات
۲۔ منیٰ میں ذکر خدا
۳۔ حج کا فلسفہ اور اس کے مضمرات
(۱) حج کا اخلاقی پہلو
(۲) حج کا سیاسی پہلو
(۳) حج کا ثقافتی پہلو
(۴) حج کا اقتصادی پہلو
۴۔ اس زمانے میں قربانی کے گوشت سے متعلق ذمہ داریاں
آیت ۲۹، ۳۰
مناسک حج کا ایک اہم حصہ
نکتہ
"قول الزور" کیا ہے؟
آیت ۳۱ تا ۳۳
شعار اللہ کی تعظیم علامت تقویٰ ہے
آیت ۳۵، ۳۷
بردار لوگوں کے لیے بشارت
آیت ۳۶ تا ۳۸
قربانی کیوں کی جاتی ہے؟
آیت ۳۹ تا ۴۱
جہاد کا پہلا حکم
چند اہم نکات
۱۔ حکم جہاد کا فلسفہ



۶۹۵	آیت ۶۰ تا ۶۲
۶۹۶	شان نزول
۶۹۶	کامران کون ہے؟
۶۹۹	آیت ۶۲ تا ۶۶
۷۰۰	کائنات میں اللہ کی نشانیاں
۷۰۲	چند اہم نکات
۷۰۳	۱۔ پروردگارِ عالم کی خاص صفات
۷۰۳	۲۔ ان آیتوں کا استدلالی پہلو
۷۰۳	۳۔ کائنات کا انسان کے لیے منجر ہونا
۷۰۵	آیت ۶۷ تا ۷۰
۷۰۶	ہر اُمت کے لیے ایک عبادت مقرر ہے
۷۰۸	آیت ۷۱ تا ۷۴
۷۱۰	مکھی سے بھی کمزور مضبوط
۷۱۲	چند اہم نکات
۷۱۳	۱۔ نبیوں کی ناتوانی کی ایک واضح مثال
۷۱۴	۲۔ ایک سوال کا جواب
۷۱۵	آیت ۷۵ تا ۷۸
۷۱۶	شان نزول
۷۱۷	پانچ اہم اور تعمیری کام

۶۹۷	(i) ظالم اور جاہل کے خلاف مظلوم کا جہاد
۶۹۷	(ii) طاغوتی طاقتوں کے خلاف جہاد
۶۹۸	۲۔ اللہ نے کن لوگوں سے مدد کا وعدہ فرمایا ہے۔
۶۹۹	۳۔ "محبتیں" اور اللہ کے انصار
۷۰۰	آیت ۴۲ تا ۴۵
۷۰۱	لا وارث کنوں اور فلک بوس محل
۷۰۲	ایک نکتہ
۷۰۳	آیت ۴۶ تا ۴۸
۷۰۵	سیر و سیاحت اور دلوں کی بیداری
۷۰۸	آیت ۴۹ تا ۵۱
۷۱۰	رزقِ کریم
۷۱۳	آیت ۵۲ تا ۵۴
۷۱۴	انبیاء کے خلاف وسوسے
۷۱۵	چند اہم نکات
۷۱۵	۱۔ شیطانی شکوک و شبہات کیا ہیں
۷۱۶	۲۔ "غراتیں" کا من گھڑت فساد
۷۱۷	آیت ۵۵ تا ۵۹
۷۱۸	رزقِ حسن

تفسیر نمونہ جلد ۷

اسے میرے مندرجہ ذیل سورتیں شامل ہیں۔

۱۔ سورہ کہف ۲۔ سورہ مریم ۳۔ سورہ طہ ۴۔ سورہ انبیاء ۵۔ سورہ حج

سورہ کہف: مکی سورت ہے اور اس کی ۱۱۰ آیات ہیں۔

پارہ ۱۵ — ۱ تا ۷۴ پارہ ۱۶ — ۷۵ تا ۱۱۰

سورہ مریم: مکی سورت ہے اور اس کی ۹۸ آیات ہیں۔

پارہ ۱۶ — ۱۹

سورہ طہ: مکی سورت ہے اور اس کی ۱۳۵ آیات ہیں۔

پارہ ۱۶ — ۱۹

سورہ انبیاء: مکی سورت ہے اور اس کی ۱۱۲ آیات ہیں۔

پارہ ۱۷ — ۱۷

سورہ حج: مدنی سورت ہے اور اس کی ۷۸ آیات ہیں۔

پارہ ۱۷ — ۱۷

اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ وَعَلَى آلِ مُحَمَّدٍ وَخَلِّ سُبُلَ رَحْمَتِكَ

سورہ کھف کی فضیلت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ اہل بیت علیہم السلام سے اس سورہ کی فضیلت کے بارے میں بہت سی روایات مروی ہیں۔ ان روایات سے اس سورہ کے مضامین کی بہت زیادہ اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔ چند ایک روایات ذیل میں درج کی جا رہی ہیں :

۱۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا :

کیا تمہیں ایسی سورہ کا تعارف کراؤں کہ جو نازل ہوئی تو ستر ہزار فرشتے اس کی نگرانی کر رہے تھے اور اس کی عظمت سے زمین و آسمان سمورے تھے۔ صحابہ نے عرض کی :

جی ہاں۔

آپؐ نے فرمایا :

وہ سورہ کھف ہے۔ جو شخص جمعہ کے روز اس کی تلاوت کرے گا آئندہ جمعہ تک اللہ اسے بخش دے گا (ایک اور روایت کے مطابق آئندہ جمعہ تک اللہ اسے گناہ سے محفوظ رکھے گا)۔ اور اسے ایسا نور عطا کرے گا کہ جو آسمان تک صوفشاں ہوگا اور وہ شخص دجال کے فتنے سے محفوظ رہے گا۔

۲۔ ایک اور روایت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی سے منقول ہے۔ آپؐ نے فرمایا :

جو شخص سورہ کھف کی دس آیات حفظ کرے گا اسے دجال نقصان نہیں پہنچائے گا اور جو شخص اس سورہ کی آخری آیات حفظ کرے گا روز قیامت یہ اس کیلئے روشنی بن جائیں گی۔

۳۔ امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے :

جو شخص ہر شب جمعہ سورہ کھف کی تلاوت کرے گا دنیا سے وہ شید جائے گا اور شہداء

کے ساتھ مبعوث ہوگا اور روز قیامت شہداء کی صف میں شمار ہوگا۔

ہم نے بار بار کہا ہے کہ قرآنی سورتوں کی عظمت، ان کے روحانی اثرات اور اخلاقی برکات ان کے مضامین و مفہیم کے لحاظ سے ہیں یعنی ان اثرات و برکات کے حصول کے لیے ان مضامین پر ایمان لانا اور ان پر عمل کرنا ہوگا۔

سُورَةُ الْكَافِ

اس سورہ کی
۱۱۰ آیتیں ہیں

آیت ۲۸ کے سوا سب مکتی ہیں

❖

اس سورہ کے مضامین کا ایک نہایت اہم حصہ چند باغیچت فوجوانوں کی داستان پر مشتمل ہے۔ ان فوجوانوں نے اپنے زمانے کے طاغوت اور دجال کے خلاف قیام کیا۔ نتیجتاً ان کی جان خطرے میں پڑ گئی اور وہ گویا موت کی سرحد تک آپہنچے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی حفاظت کی۔ اس سچی داستان کی طرف توجہ کی جائے تو ہو سکتا ہے وہ دل جو آمادہ ہو ان میں نور ایمان چمک اٹھے اور انہیں گناہوں اور فاسد ماحول کی برائیوں سے بچائے۔

اس سورہ میں عذاب دوزخ کا ایسا تذکرہ ہے کہ انسان لرز کے رہ جاتا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ کیسا بڑا انجام مکبرین کے انتظار میں ہے۔

اسی طرح اس سورہ میں ایک نہایت عمدہ مثال کے ذریعے علم الہی کی وسعت بیان کی گئی ہے۔ اگر انسان ان تمام امور کی طرف توجہ کرے تو ہو سکتا ہے شیاطین کے فتنوں سے محفوظ رہے۔ اس کے دل میں ایک روشنی چمک اٹھے اور وہ عصیاں و گناہ سے بچ جائے جس کے نتیجے میں آخر کار شہدار کے ساتھ معذور ہو۔

سورہ کف کے مضامین

یہ سورہ اللہ کی حمد و ستائش سے شروع ہوتی ہے اور توحید، ایمان اور عمل صالح کے ذکر پر تمام ہوتی ہے۔

دیگر مکی سورتوں کی طرح اس سورہ کے مضامین بھی زیادہ تر مبداء و معاد اور بشارت و انداز پر مشتمل ہیں۔ نیز اس میں ایک اہم مسئلے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس کی ان سخت دنوں میں مسلمانوں کو ضرورت تھی۔ مسلمانوں کو سمجھایا گیا ہے کہ حق پرست اگرچہ کہتے کم کیوں نہ ہوں انہیں اکثریت کے سامنے نہیں ٹھکانا چاہیئے۔ اگرچہ اکثریت ظاہراً کھتی ہی قوی اور طاقتور کیوں نہ ہو اور حق پرستوں کو ماحول کی خرابی میں مغل نہیں ہو جانا چاہیئے بلکہ اصحاب کف کے چھوٹے سے گروہ کی طرح اپنا الگ راستہ انتخاب کرنا چاہیئے اور اس بُرے ماحول کے خلاف قیام کرنا چاہیئے۔ ان تھوڑے افراد میں جب تک طاقت ہو مقابلہ کریں اور طاقت نہ ہونے کی صورت میں انہیں چاہیئے کہ ہجرت کر جائیں۔

اس میں دو افراد کی ایک اور داستان بھی ہے۔ ان میں سے ایک بہت زیادہ خوشحال اور دولت مند تھا لیکن ایمان کی دولت سے محروم تھا جبکہ دوسرا کمزور تھا مگر مومن تھا۔ یہ تھی دست اپنی عزت و وقار کو برقرار رکھتے ہوئے ہمیشہ اس امیر شخص کو نصیحت و ارشاد کیا کرتا تھا لیکن جب اس پر کوئی اثر نہ ہوا تو اس سے بیزاری کا اعلان کر دیا اور کامیابی کا راستہ بھی ہی ہے۔

یہ واقعہ بیان کرنے کا ایک مقصد یہ تھا کہ وہ مسلمان جو رسول اللہ کے ساتھ ابتدائی حالات کی مشکلات سے

دچار ہیں یا آئندہ کبھی جن مسلمانوں کو ایسے حالات کا سامنا کرنا پڑے وہ جان لیں کہ سرمایہ داروں کی جوش و خروش وقتی ہوتا ہے، جیسے ایک باایمان شخص کی تنگدستی۔

اس سورہ میں اگرچہ حضرت خضر کا نام نہیں آیا تاہم اس میں حضرت موسیٰ اور حضرت خضر کا ایک واقعہ مذکور ہے۔ اس واقعے کے مطابق بعض کام ایسے تھے جو ظاہراً تو ٹھیک نہ معلوم ہوتے تھے مگر باطناً صلیت پر مبنی تھے، حضرت موسیٰ ان پر صبر نہ کر سکے لیکن حضرت خضر نے وضاحت کی تو انہیں ان کی گہرائی کا پورا علم ہوا اور پھر اپنی بے تابی پر پشیمان ہوئے۔

اس واقعے میں بھی سب کے لیے یہ درس ہے کہ واقعات کو صرف ظاہری نظر سے نہ دیکھا کریں بلکہ ان کی گہرائی پر نظر کریں۔

اس سورہ میں حضرت ذوالقرنین کی داستان بھی مذکور ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ انہوں نے کیسے دنیا کے مشرق و مغرب کی سیر کی۔ دنیا کی مختلف قوموں سے ملے کہ جن کے رسم و رواج مختلف تھے۔ آخر کار وہ کچھ لوگوں کی مدد سے یا جوج و ماجوج کی سازش کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کے راستے میں آہنی دیوار کھڑی کر کے ان کے نفوذ کو ختم کر دیا۔ (اس واقعے کی پوری تفصیل انشاء اللہ سورت کے ذیل میں آئے گی)۔

یہ واقعہ بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان دنیا کے مشرق و مغرب میں نفوذ کے لیے پوری بصیرت کے ساتھ اپنے آپ کو تیار کریں اور ہر طرح کے یا جوج و ماجوج کا مقابلہ کرنے کے لیے آپس میں متحد ہو جائیں۔

یہ بات قابل غور ہے کہ اصحاب کف، موسیٰ و خضر کا واقعہ اور حضرت ذوالقرنین کی داستان کتب کا اس سورہ میں ذکر ہے دیگر قرآنی واقعات کے برخلاف ان کا قرآن میں کسی اور جگہ کوئی ذکر نہیں آیا۔ صرف سورہ انبیاء کی آیہ ۹۶ میں یا جوج و ماجوج کے مسئلے کی طرف اشارہ ہوا ہے تاہم حضرت ذوالقرنین کا نام اس میں نہیں آیا۔ بہر حال یہ بات اس سورہ کی خصوصیات میں سے ہے۔

بہر کفیت اس سورہ کے مضامین ہر لحاظ سے شریعت اور تربیت کنندہ ہیں۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

① اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ۝

② قِيَمًا لِّيُنْذِرَ اَبَاسًا شَدِيْدًا مِّنْ لَّدُنْهُ وَيُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا ۝

③ مَا كٰشِيْنَ فِيْهِ اَبَدًا ۝

④ وَيُنْذِرَ الَّذِيْنَ قَالُوْا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۝

⑤ مَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ وَلَا لِاَبَاسِهِمْ كَبِرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ اِنْ يَقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا ۝

ترجمہ

① شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے۔

② حمد مخصوص ہے اللہ کے لیے جس نے اپنے (برگزیدہ) بندے پر یہ (آسمانی) کتاب نازل کی اور اس میں کسی قسم کی کوئی کمی نہ رہی۔

③ وہ کتاب کہ جو ثابت، مستقیم اور دوسری کتب کی نگہبان ہے تاکہ (برے کام انجام دینے والوں کو) اس کے شدید عذاب سے ڈرائے اور نیک عمل انجام دینے والے مومنین کو بشارت دے کہ ان کے لیے اچھا اجر ہے۔

④ (وہی بہشت بریں کہ) جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

④ (نیز انہیں ڈرائے کہ جو کہتے ہیں کہ خدا نے (اپنے لیے) بیٹا انتخاب کیا ہے۔

⑤ نہ انہیں (ہرگز) اس بات پر یقین ہے نہ ان کے آباؤ اجداد کو، یہ بہت بڑی بات ہے جو ان کے منہ سے نکلتی ہے۔ یقیناً وہ جھوٹ کہتے ہیں۔

تفسیر

اللہ اور قرآن کے ذکر سے آغاز

سورہ کف قرآن کی بعض دیگر سورتوں کی مانند اللہ کی حمد و ثنا سے شروع ہوتی ہے اور حمد چونکہ کسی اہم اور لائق تعریف کام پر ہوتی ہے لہذا ساتھ ہی نزول قرآن کا ذکر کیا گیا ہے، وہ قرآن کہ جو ہر قسم کی کمی سے پاک ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: تعریف ہے اُس خدا کی جس نے اپنے بندے پر یہ آسمانی کتاب نازل کی کہ جس میں کسی قسم کا ٹیڑھ پن نہیں ہے (الحمد للہ الذی انزل علی عبدہ الکتاب ولم یجعل لہ عوجًا)۔ ایسی کتاب ہے کہ جو ثابت و مستقیم ہے، جو متدل و مستقیم ہے، جو حقیقی انسانی معاشرے کے قیام کے لیے ہے اور جو تمام آسمانی کتب کی پاسدار ہے (قیما)۔ تاکہ برے کام انجام دینے والوں اور دل کے اندھوں کو اللہ کے عذاب شدید سے ڈرائے (لینذربا شادیدا من لدنہ)۔ اور سچے مومنین کو جو ہمیشہ عمل صالح انجام دیتے ہیں انہیں بشارت دے کہ عظیم اور عمدہ جزا ان کے انتظار میں ہے (و یبشر المؤمنین الذین یعملون الصالحات ان لہم اجرًا حسنًا)۔ ایسی جزا کہ جو جاودانی ہے اور جن میں وہ تابدار رہیں گے (ماکشین فیہ ابدًا)۔

اس کے بعد یہودی ہوں، عیسائی ہوں یا مشرکین ہر قسم کے مخالفین کے ایک عمومی انحراف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اس آسمانی کتاب کا ایک ہدف یہ ہے کہ پیغمبر اُن لوگوں کو ڈرائے کہ جو خدا کے لیے بیٹے کے قائل ہیں (وینذر الذین قالوا اتخذ اللہ ولداً)۔

یعنی۔ عیسائیوں کو ڈرائے چونکہ اُن کا عقیدہ ہے کہ عیسیٰ خدا کے بیٹے ہیں اور یہودیوں کو ڈرائے چونکہ ان کا عقیدہ ہے کہ عزیر خدا کے بیٹے ہیں اور مشرکین کو ڈرائے کیونکہ ان کا عقیدہ ہے کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں۔

اس کے بعد اس قسم کے بے بنیاد عقائد کی اساس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے: انہیں اپنے اس عقیدے کے بارے میں کوئی علم و یقین نہیں ہے اور اگر یہ اپنے آباؤ اجداد کی تقلید کرتے ہیں تو ان کے آباؤ اجداد کا بھی یہی عالم تھا (مالہم بہ من علم ولا لاباشہم)۔ تاہم یہ منہ سے بہت بڑی اور دھشتناک

بات نکالتے ہیں (کبریت کلمۃ تخرج من افواہہم)۔

خدا کا جسم ہونا، خدا کی اولاد ہونا، خدا کو مادی احتیاجات ہونا۔ مختصر یہ کہ خدا کا عدد ہونا۔
یہ کیسی وحشت ناک باتیں ہیں۔

جی ہاں۔ یہ صرف جھوٹ بولتے ہیں (ان یقولون الا کذباً)۔

چند اہم نکات

۱۔ حمد الہی سے سورہ کی ابتداء: قرآن مجید کی پانچ سورتیں "الحمد للہ" سے شروع ہوتی ہیں۔ ان پانچ سورتوں میں حمد الہی کے بعد زمین و آسمان کی خلقت (یا مالکیت) یا عالمین کی پرورش کا ذکر آیا ہے سوائے زیر بحث سورت کے۔ یہاں حمد الہی کے بعد رسول اللہ پر قرآن نازل ہونے کا ذکر آیا ہے۔ درحقیقت سورہ انعام، سبا، فاطر اور فاتحہ میں "کتاب تکوین" کی بات کی گئی ہے لیکن سورہ کہف میں "کتاب تدوین" کا ذکر کیا گیا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ دو کتابوں یعنی عالم خلقت اور قرآن میں سے ہر ایک دوسرے کی تکمیل کرتا ہے اور یہ بات اس امر کو واضح کرتی ہے کہ قرآن سارے عالم خلقت جتنا وزن رکھتا ہے اور یہ بھی جہان ہستی کی سی نعمت ہے اور اصولی طور پر عالمین کی پرورش و تربیت کا مسئلہ کہ جو "الحمد للہ رب العالمین" کے جملے میں آیا ہے، اس عظیم آسمانی کتاب سے فائدہ اٹھانے بغیر ممکن نہیں ہے۔

۲۔ مستحکم، مستقیم اور نگہبان۔ کتاب: "قیتم" (بروزن "سید") "قیام" کے مادے سے لیا گیا ہے۔ یہاں یہ لفظ مستحکم، ثابت اور استوار کے معنی میں ہے۔ علاوہ ازیں یہاں اس سے مراد ایسی کتاب ہے جو دوسری کتب کی محافظ و پاسدار ہو نیز ایسی کتاب کہ جو اعتدال و استقامت کی حامل ہو اور ہر قسم کی کجی اور ٹیڑھ پن سے پاک ہو۔

پہلے قرآن کو ہر قسم کی کجی سے پاک کرنے کے بعد اس لفظ سے قرآن کی توصیف کی گئی۔ گویا یہ قرآن کی استقامت، اس کے اعتدال اور ہر قسم کے تضاد سے پاک ہونے پر تاکید بھی ہے اس عظیم کتاب کے جاودانی ہونے پر دلالت بھی ہے اور اصلوں کی محافظ ہونے کا مفہوم بھی دیتا ہے۔ نیز یہ ہر قسم کی کج روی سے اصلاح کرنے والی کتاب کا معنی بھی دیتا ہے اور یہ بھی بتاتا ہے کہ یہ کتاب احکام الہی اور انسانی عدالت و فضیلت کی نگہبانی کے لیے نمونہ بھی ہے۔

یہ صفت "قیتم" دراصل اللہ کی صفت "قیومیت" سے مشتق ہے جس کے مطابق خدا تمام موجودات اور اشیاء عالم کا محافظ و نگہبان ہے۔

سے مانہ تو قائم جو ثبوت تم بذات

ہم تجھ سے قائم ہیں چونکہ تو قائم بالذات ہے۔

قرآن چونکہ خدا کا کلام ہے اس کی بھی یہی حالت ہے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ قرآن کی آیات میں لفظ "قیتم" دین اسلام کی صفت کے طور پر کئی مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے:

فَاقْبِرُوا وَجْهَكُمْ لِلدِّينِ الْقَيِّمِ

اپنے آپ کو قیتم، پاک اور مستقیم دین کے ساتھ ہم آہنگ کرو۔ (روم ۴۳)

سطور بالا میں "قیتم" کی جو تفسیر بیان کی گئی ہے، یہ دراصل تمام تفاسیر کا ایک جامع مفہوم ہے جو اس سلسلے میں مفسرین نے بیان کی ہیں۔ کیونکہ بعض نے اسے اس کتاب کے معنی میں لیا ہے جو کبھی منسوخ نہیں ہوگی، بعض نے گزشتہ کتب کی محافظ کے معنی میں لیا ہے، بعض نے امور دین کو برپا کرنے والی کتاب کے مفہوم میں لیا ہے اور بعض نے ایسی کتاب کے معنی میں لیا ہے جس میں اختلاف و تضاد نہیں ہے۔ لیکن یہ تمام معانی اس جامع مفہوم میں جمع ہیں جو ہم نے بیان کیا ہے۔

بعض مفسرین نے "لنوعی جعل لہ عوجاً" کو الفاظ قرآن کی فصاحت کے معنی میں لیا ہے جبکہ "قیتم" کو بلاغت اور مفہوم کی استقامت کے معنی میں لیا ہے۔ البتہ اس فرق کے لیے کوئی واضح دلیل موجود نہیں ہے اور زیادہ تر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کے لیے تاکید کی مانند ہے۔ فرق یہ ہے کہ "قیتم" کا مفہوم زیادہ وسیع ہے یعنی ذاتی استقامت کے مفہوم کے علاوہ دوسروں کی پاسداری، اصلاح اور حفاظت بھی اس کے مفہوم میں شامل ہے۔

۳۔ خدا کے لیے اولاد کے قائل افراد کو خصوصی تنبیہ: مندرجہ بالا آیات میں وسیع اور مطلق طور پر انداز کے بعد ان لوگوں کو بالخصوص ڈرایا گیا ہے کہ جو خدا کے لیے اولاد کے قائل ہیں۔ یہ بات نشاندہی کرتی ہے کہ یہ انحراف خاص اہمیت رکھتا ہے۔

جیسا کہ ہم نے کہا ہے یہ اعتقادی انحراف عیسائیوں ہی سے مخصوص نہیں بلکہ یہود و مشرکین بھی اس میں شریک تھے اور جب یہ قرآن نازل ہوا تھا تو یہ ایک طرح کا عمومی اعتقاد تھا۔ ہم جانتے ہیں کہ ایسا عقیدہ روح توحید کو بالکل ختم کر دیتا ہے اور خدا کو مادی و جسمانی موجودات کی صف میں لے آتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اُس کے لیے انسانی جذبات و احساسات کا قائل ہونا جائے، اس کے لیے شبیر و شریک مانا جائے اور اسے حاجت مند شمار کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اس بات کا خصوصی ذکر کیا گیا ہے۔

لہ روح المعانی، ج ۱۵، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

تہ - قیتم، ترکیب غوی کے لحاظ سے حال ہے اور اس میں مال، انزل ہے۔

سورہ یونس کی آیہ ۶۸ میں ہے :

قَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا مُبِينًا هُوَ الْغَيْبُ

انہوں نے کہا کہ خدا کا بیٹا ہے، حالانکہ وہ غیبی وجہ نیاز ہے۔

سورہ مریم کی آیہ ۸۸ تا ۹۱ میں ہے :

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمَنُ وَلَدًا لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا إِدًّا تَكَاذُبًا لَّمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ إِنَّهُ لَكَلِمَ الْوَحْيِ لَمَّا عَلَّمَ الْقُرْآنَ ط هُوَ الْغَيْبُ لَا تُهْلِكُ الْبُيُوتَ وَتَقُومُ فِيهَا الْخَلْقُ وَالْخَلْقُ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ ۝

انہوں نے کہا کہ الرحمن کا بیٹا ہے۔ تمہاری یہ بات بہت ہی ناموزوں اور سنگین ہے قریب ہے کہ آسمان پھٹ پڑے، زمین شق ہو جائے اور پہاڑ گر پڑیں کیونکہ تم خدا کے لیے بیٹے کے قائل ہو۔

یہ انتہائی سخت انداز کلام اس بات کی دلیل ہے کہ غلط اعتقاد کا نتیجہ اور انجام بہت ہی بُرا ہے۔

اس کے مخصوص اثرات بہت وسیع ہیں اور درحقیقت ہے بھی ایسا ہی کیونکہ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اللہ کو اوج عظمت سے نیچے لے آیا جائے اور اسے پست مادی موجودات کی صف میں لا کھڑا کیا جائے۔

۴۔ دعویٰ، بلا دلیل : انحرافی عقائد کا مطالعہ کیا جائے تو ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں سے زیادہ تر دعویٰ بلا دلیل کے مترادف ہیں۔ بعض اوقات یہ جھوٹے نعروں کی بنیاد پر معرض وجود میں آتے ہیں۔ کوئی نعرہ بلند کرتا ہے اور دوسرے اس کے پیچھے لگ جاتے ہیں۔ یا بڑے بوڑھوں کے دم درواج کی صورت میں کوئی حقیقتہً ایک نسل سے دوسری نسل کی طرف منتقل ہوتا ہے۔

ضمنی طور پر قرآن ہمیں تعلیم دیتا ہے کہ ہر صورت میں ہم بے دلیل دعوؤں سے پرہیز کریں چاہے وہ کسی طرف سے اور کسی شخص کی جانب سے ہوں۔

مندرجہ بالا آیات میں اس قسم کے کام کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ بہت بڑی اور وحشتناک بات ہے اور ایسی بات کو جھوٹ کا سرچشمہ قرار دیتا ہے۔

یہ ایک ایسی بنیادی بات ہے کہ اگر مسلمان اپنی ساری زندگی میں اس کی پیروی کریں یعنی بلا دلیل نہ کچھ کہیں اور نہ کوئی بات قبول کریں اور پراپیگنڈا و سیل سے عاری دعوؤں کی پرواہ نہ کریں تو ان کی بہت سی پریشانیوں اور مشکلات دور ہو جائیں۔

۵۔ عمل صالح۔ ایک مسلسل طرز عمل : مندرجہ بالا آیات میں مومنین کے بارے میں

نکلیت اور خدا کی اولاد ہونے کے سلسلہ کے بارے میں تفسیر نمونہ جلد ۲ صفحہ ۶۵ پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ (اردو ترجمہ)

گفتگو کرتے ہوئے "عمل صالح" کو اس کا مسلسل اور دائمی طرز عمل قرار دیا گیا ہے کیونکہ "یعملون الصالحات" فعل مضارع ہے اور ہم جانتے ہیں کہ فعل مضارع تسلسل اور دوام پر دلالت کرتا ہے۔

حقیقت میں ہونا بھی ایسا ہی چاہیے کیونکہ چند ایک نیک کام تو ہو سکتا ہے اتفاقاً یا بعض وجوہ کی بنا پر انجام پائیں لہذا وہ ہرگز حقیقی ایمان کے لیے دلیل نہیں ہو سکتے حقیقی ایمان کی دلیل تو ایسا عمل صالح ہے جس میں تسلسل اور دوام ہو۔

۶۔ جس نے اپنے "بندہ" پر کتاب نازل کی : زیر نظر آیات میں آسمانی کتاب کے نازل ہونے کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے :

شکر ہے اس خدا کا جس نے اپنے "بندہ" پر کتاب نازل فرمائی ہے۔

یہ اس امر کی دلیل ہے کہ "بندہ" کی تعبیر انتہائی فخریہ اور با عظمت ہے۔ یہ وصفت اسی انسان کا ہو سکتا ہے جو واقعاً اللہ کا بندہ ہو۔ جو اپنی ہر چیز کو اُس سے وابستہ سمجھے۔ جس کی آنکھ اور کان اُس کے حکم پر لگے ہوں۔ جو اس کے غیر کا تصور بھی نہ کرے۔ جو اس کی راہ کے علاوہ کسی راہ پر نہ چلے۔ ایسے شخص ہی کو یہ افتخار اور اعزاز حاصل ہو سکتا ہے کہ وہ اس کا پاکیزہ بندہ ہو۔

④ فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَفْسَكَ عَلَىٰ آثَارِهِمْ إِنْ لَمْ يُؤْمِنُوا
بِهَذَا الْحَدِيثِ أَسَفًا ○

⑤ إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِينَةً لَّهَا لِنَبْلُوهُمْ
أَيُّهُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا ○

⑥ وَإِنَّا لَجَاعِلُونَ مَا عَلَيْهَا صَعِيدًا جُرُزًا ○

ترجمہ

④ اگر یہ لوگ اس بات پر ایمان نہ لائیں تو شاید تم غم کے مارے اپنی
جان دے بیٹھو گے۔

⑤ جو کچھ رُوئے زمین پر ہے اسے ہم نے اس کی زینت قرار دیا ہے تاکہ ہم
لوگوں کو آزمائیں کہ بہتر عمل ان میں کون کرتا ہے۔

⑥ (لیکن یہ زیب و زینت پایدار نہیں ہے) اور آخر کار ہم رُوئے زمین کو چٹیل
میدان بنا دیں گے۔

غیر

غم نہ کرو۔ یہ دنیا آزمائش گاہ ہے

گزشتہ آیات میں رسول اکرم کی رسالت اور رہبری کے بارے میں گفتگو تھی۔ زیر نظر پہلی آیت میں
رہبری کی ایک نہایت اہم شرط کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور وہ ہے ہمدردی اور غمخواری۔ ارشاد ہوتا
ہے: گویا تو اس شدت غم میں اپنی جان دے بیٹھے گا کہ یہ لوگ آسمانی کتاب پر ایمان نہیں لاتے

(فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَفْسَكَ عَلَىٰ آثَارِهِمْ إِنْ لَمْ يُؤْمِنُوا بِهَذَا الْحَدِيثِ أَسَفًا)۔

چند توجہ طلب نکات

۱۔ ”باخِع“ کا مفہوم: ”باخِع“ ”بغع“ (بروزن ”نخل“) کے مادہ سے ہے۔ اس کا معنی ہے
اپنے آپ کو شدت غم سے مار ڈالنا۔

۲۔ ”اَسَفًا“ کا مطلب: ”اَسَفًا“ غم و اندوہ کی شدت ظاہر کرتا ہے۔ یہ لفظ یہاں
اس امر کی تاکید کے لیے ہے۔

۳۔ ”اَشَارَ“ کا معنی: ”اَشَارَ“ ”اَشْرَ“ کی جمع ہے۔ یہ دراصل نشان پا کے معنی میں ہے
لیکن کسی چیز کی جو علامت باقی رہ جائے اسے بھی ”اَشْرَ“ کہتے ہیں۔ یہاں اس لفظ کا استعمال ایک لطیف
نکتے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ وہ یہ کہ کبھی انسان ایک جگہ سے چلا جاتا ہے۔ کچھ دیر تو اس کے آثار
باقی رہتے ہیں لیکن زیادہ وقت گزر جائے تو آثار بھی محو ہو جاتے ہیں یعنی تو ان کے ایمان نہ لانے سے
اس قدر پریشان ہے کہ تو چاہتا ہے کہ ان کے آثار محو ہونے سے پہلے تو اپنے آپ کو غم و اندوہ
سے مار ڈالے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ ”اَشَارَ“ سے مراد ان کے آثار و کردار ہوں۔

۴۔ قرآن کے لیے لفظ ”حدیث“: ”قرآن کو“ حدیث۔ کتنا اس کتاب کے تازہ
نزدل کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی وہ اتنی زحمت بھی نہیں کرتے کہ اس کتاب کا مطالعہ کریں کہ جو تازہ
نازل شدہ ہے اور جس کے مضامین نئے ہیں۔ یہ انتہائی بے خبری کی دلیل ہے کہ انسان کسی نئی چیز کے
پاس سے لاپرواہی سے گزر جائے۔

۵۔ غمخوار ہادی: آیات قرآن اور تاریخ سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ الٰہی رہبر لوگوں کی
گمراہی پر کسی کے تصور سے زیادہ دیکھی ہوتے تھے۔ ان کی آرزو تھی کہ لوگ ایمان لے آئیں چونکہ وہ دیکھ
رہے ہوتے تھے کہ لوگ پیاسے ہیں، صاف و شفاف چشمے کے پاس بیٹھے ہیں اور پھر بھی پیاس کی
شدت سے فریاد کناں ہیں۔ لہذا ان پر حق اس حالت پر پریشان ہوتے، اُٹھو بھاتے، دعا کرتے اور رات
دن کوشش کرتے تھے۔ چپ چاپ بھی تبلیغ کرتے۔ کھلے بندوں بھی پیغام حق پہنچاتے غلوت و جلوت میں
فرد اور اجتماع کو دعوت دیتے۔ اس بات پر بہت طول ہوتے کہ لوگوں نے سیدھی راہ کو چھوڑ کر ٹیڑھا
راستہ اختیار کر لیا ہے۔ ان کے اندوہ کا یہ عالم ہوتا کہ کبھی ایسا لگتا کہ وہ اس غم میں حسان
دے بیٹھیں گے۔

واقعاً رہبر جب تک ایسا غمخوار نہ ہو رہبری کا عمیق مفہوم علی جامع نہیں بن سکتا۔

بعض اوقات غم کی یہ حالت اس قدر شدید ہو جاتی کہ خود رسول اللہ کی جان خطرے میں پڑ جاتی اور ایسے میں اللہ تعالیٰ ان کی دلجوئی کرتا ہے اور انہیں تسلی دیتا۔

سورہ شعراء کی آیہ ۳ اور ۴ میں ہے :

لَعَلَّكَ بَاجِعٌ لِّنَفْسِكَ إِلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ إِن نَّشَأْ نُنْزِلْ عَلَيْهِمْ مِنَ السَّمَاءِ آيَةً فَظَلَّتْ أَعْيُنُهُمْ لَهَا خَضِيبِينَ ه

تو تو گویا اپنی جان دے ڈالے گا کہ وہ ایمان کیوں نہیں لاتے۔ غم نہ کر، ہم نے انہیں فاعل مختار بنایا ہے اگر ہم چاہیں تو آسمان سے ان کو ایسی آیت بھیجے کہ ان کی گردن بلا غصہ اس کے سامنے جھک جاتی۔

اگلی آیت میں اس عالم کی کیفیت بیان کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہ دنیا انسانوں کے لیے میدان آزمائش ہے۔ ارشاد ہوتا ہے : جو کچھ روئے زمین پر ہے اسے ہم نے اس کی زینت قرار دیا ہے (انما جعلنا ما علی الارض ذینۃ لہا)۔ ہم نے دنیا کو حسین بنایا ہے۔ اس کا ہر گوشہ دل کو کھینچتا ہے لگا ہوگی دعوت دیدار دیتا ہے اور انسان میں مختلف احساسات کو ابھارتا ہے۔ جذبات کی یہ کشاکش خوبصورت چیزوں کی یہ چمک دمک اور دلربا چہروں کی یہ جاذبیت انسان کے لیے آزمائش ہے۔ انسان کا ایمان، ارادے کی قوت اور معنویت و فضیلت ہر چیز کا امتحان ہو جاتا ہے۔

لہذا ساتھ ہی فرمایا گیا ہے : تاکہ انہیں آزمائیں کہ ان میں سے بہتر عمل کون انجام دیتا ہے (النبلوہم ایہموا حسن عملًا)۔

بعض مفسرین نے "ما علی الارض" کا مفہوم علماء میں محدود کرنا چاہا ہے بعض نے اس سے صرف مرد مراد لیے ہیں اور کہا ہے کہ زمین کی زینت یہی ہیں لیکن اس لفظ کا ایک وسیع مفہوم ہے جس میں روئے زمین کی تمام موجودات شامل ہیں۔

یہ بات جاذب نظر ہے کہ یہاں "احسن عملًا" کی تعبیر استعمال ہوئی ہے نہ کہ "اکثر عملًا" کی۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ کی بارگاہ میں حسن عمل اور عمل کی اعلیٰ کیفیت کی قدر و قیمت ہے نہ کہ کثرت و کمیت کی۔

بہر حال یہ تمام انسانوں بالخصوص تمام مسلمانوں کے لیے ایک تنبیہ اور صدائے بیدار باش ہے اور انہیں متوجہ آیا جا رہا ہے کہ دنیا کی دلربائیوں سے ضرب نہ کھائیں کیونکہ یہ دنیا تو میدان آزمائش ہے۔ ان دلفریب مظاہر سے دل لگانے کی بجائے حق عمل کے بارے میں سوچیں۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے : یہ پائدار نہیں ہے اور آخر کار نابود ہو جائے گی اور ہم روئے زمین کی تمام چیزوں کو ختم کر دیں گے "اور صفحہ ارض کو پھیل میدان میں بدل کے رکھ دیں گے (وانا لجالعون

ما علیہا صعیداً جرڈاً)۔

"صعید" "صعود" کے مادہ سے ہے۔ یہاں سطح زمین کے معنی میں ہے۔ وہ سطح کہ جس میں مٹی پوری طرح نمایاں ہو۔ "جرڈ" اس زمین کو کہتے ہیں جس میں گھاس نہ آگئی ہو، گویا وہ اپنی گھاس کو کھا جاتی ہو۔ دوسرے لفظوں میں "جرڈ" اس زمین کو کہتے ہیں کہ خشک سالی کی وجہ سے جس کے پردے ختم ہو گئے ہوں۔

جی ہاں ! یہ حسین اور دل انگیز مناظر کہ جو فصل بہار میں صحراؤں اور کوہساروں کے دامن میں دکھائی دیتے ہیں، چھوٹوں کی مسکراہٹیں، بھومتے ہوئے شجر، سرگوشیاں کرتے ہوئے پتے، ندی نالوں کے نرے۔ سب فصل خزاں میں ختم ہو جاتے ہیں۔ درختوں کی شاخیں قربان ہو جاتی ہیں۔ ندی نالے خاموش ہو جاتے ہیں۔ غنچے خشک ہو جاتے ہیں پتے مر جھکا جاتے ہیں اور زندگی کی آواز چُپ ہو جاتی ہے۔

انسانوں کی رنگین زندگی کا بھی یہی عالم ہے۔ یہ عمل اور یہ فلک بوس عمارتیں، یہ رنگارنگ لباس یہ گونا گوں نعمتیں، یہ خدام اور یہ مقام و منصب سب ختم ہو جانے والی چیزیں ہیں۔ ایک دن ایسا آئے گا کہ خشک و خاموش قبرستان کچھ باقی نہیں ہوگا، اور یہ ایک بہت بڑا درس عبرت ہے۔

- ⑨ اَفَرَحِیْبَتْ اَنْ اَصْحَبَ الْكُهْفِ وَالرَّقِیْمِ كَانُوا
 مِنْ اٰیٰتِنَا عَجَبًا ۝
 ⑩ اِذْ اَوٰی الْفِتٰیةُ اِلٰی الْكُهْفِ فَقَالُوْا رَبَّنَا اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ
 رَحْمَةً وَهَيِّ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا ۝
 ⑪ فَضَرَبْنَا عَلٰی اٰذَانِهِمْ فِی الْكُهْفِ سِنِیْنَ عَدَدًا ۝
 ⑫ ثُمَّ بَعَثْنَاهُمْ لِنَعْلَمَ اٰیَ الْحِزْبِیْنِ اَخْصٰی لِمَا
 لَبِثُوْا اَمَدًا ۝

ترجمہ

- ⑨ کیا تم خیال کرتے ہو کہ اصحاب کھف و رقیم ہماری عجیب نشانیوں میں سے تھے۔
 ⑩ وہ وقت یاد کرو جب جوانوں کے اس گروہ نے غار میں جا پناہ لی اور کہا:
 پروردگارا! ہمیں اپنی رحمت سے نواز اور ہمیں راہ نجات فراہم کر۔
 ⑪ ان کے کانوں پر ہم نے (نیند کا) پردہ ڈال دیا اور وہ سالہا سال تک غائبن سوئے رہے۔
 ⑫ ہم نے انہیں بھجھکھجھکاتے اٹھایا تاکہ واضح ہو جائے کہ ان دو گروہوں میں سے کسے اپنی
 نیند کی مدت خوب یاد ہے۔

شان نزول

مندرجہ بالا آیات کی مفسرین نے ایک شان نزول نقل کی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ قریش کے سرداروں نے اپنے دو ساتھی بیٹے، سلام کی دعوت کی تحقیق کے لیے علماء یہود کے پاس مدینہ بھیجے۔ وہ یہ جاننا چاہتے تھے کہ کیا گزشتہ کتب میں اس سلسلے میں کوئی چیز ملتی ہے۔

انہوں نے مدینہ پہنچ کر علماء یہود سے رابطہ کیا۔ ان سے ملے اور قریش کی بات بیان کی۔ تو یہودی علماء نے کہا: تم محمد (ص) سے تین مسائل کے بارے میں سوال کرو۔ اگر اس نے سب کا کافی و دانی جواب دے دیا تو وہ خدا کی طرف سے رسول ہے۔

(بعض روایات میں ہے کہ انہوں نے کہا کہ اگر محمد (ص) نے دو سوالوں کا جواب کافی و دانی اور ایک سوال کا جواب اجمالی دیا تو پھر وہ رسول ہے)۔

انہوں نے بات جاری رکھی: سب سے پہلے پوچھنا کہ بہت مدت پہلے جو چند جوان اپنی قوم سے جدا ہو گئے تھے، وہ کون تھے؟ کیونکہ ان کی داستان اور جوان کے ساتھ گزری بہت عجیب و غریب ہے۔ علماء یہود کہنے لگے: پھر سوال کرنا کہ وہ کون ہے جس نے پوری زمین کا پکر لگایا اور زمین کے مشرق و مغرب تک جا پہنچا۔ اس کا واقعہ کس طرح ہے۔

انہوں نے کہا: نیز یہ بھی پوچھنا کہ روح کی حقیقت کیا ہے؟ قریش کے نمائندے واپس مکہ سرداران قریش کے پاس پہنچ گئے اور کہا: ہم نے محمد (ص) کے سچ اور جھوٹ کی پہچان کا معیار پایا ہے۔

پھر انہوں نے اپنا سارا واقعہ سنایا۔ اس کے بعد وہ رسول اللہ کی خدمت میں پہنچے اور اپنے سوالات آپ کی خدمت میں پیش کیے۔

رسول اللہ نے فرمایا: میں تمہیں کل جواب دوں گا۔ لیکن آپ نے انشاء اللہ نہ کہا۔ پندرہ دن گزر گئے لیکن اللہ کی طرف سے رسول اللہ پر کوئی وحی نازل نہ ہوئی اور جبرائیل آپ کے پاس نہ آئے۔ اس پر اہل مکہ پر اپہنگنڈا کرنے لگے اور طرح طرح کی غلط باتیں بنانے لگے۔

رسول اللہ پر یہ بات بہت گراں گزری۔ آخر کار جبرائیل آئے اور خدا کی طرف سے سورہ کھف لائے۔ اس میں ان جوانوں کی داستان بھی تھی اُس سیاح عالم کا واقعہ بھی تھا۔ علاوہ ازیں آپ پر آیہ ”وَيَسْئَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ...“ بھی نازل ہوئی۔

آنحضرت نے جبرائیل سے پوچھا: اتنی تاخیر کیوں کی؟ انہوں نے کہا: میں آپ کے رب کے حکم کے علاوہ نازل نہیں ہو سکتا۔ مجھے اجازت نہیں دی گئی۔

یاد دہانی ضروری ہے کہ مذکورہ تین سوالوں میں سے دو کے جواب اسی سورہ میں آئے ہیں لیکن روح سے متعلقہ آیت سورہ بنی اسرائیل میں گزر چکی ہے۔ اور ایسی مثالیں قرآن میں اور بھی ہیں کہ ایک آیت

ایک خاص مطلب کے بارے میں نازل ہوئی۔ اور رسول اللہ کے حکم پر اسے کسی خاص سورت میں خاص مقام پر جگہ دی گئی۔

نفسیہ

اصحاب کف کا واقعہ شروع ہوتا ہے

گزشتہ آیات میں اس دنیا کی زندگی کے بارے میں بتایا گیا تھا اور یہ واضح کیا گیا تھا کہ یہ دنیا انسان کے لیے آزمائش ہے۔ مگر آج چونکہ عمومی حساس مسائل کے لیے کئی ایک مثالیں پیش کرتا ہے یا گزشتہ تاریخ سے نمونے پیش کرتا ہے لہذا یہاں بھی پہلے اصحاب کف کا واقعہ بیان کیا گیا ہے اور ان کا ذکر ایک نمونہ عمل کے طور پر کیا گیا ہے۔

چند بیدار فکر اور با ایمان نوجوان تھے۔ وہ ناز و نعمت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنے عقیدے کی حفاظت اور اپنے زمانے کے طاغوت سے مقابلے کے لیے ان سب نعمتوں کو ٹھوکر ماردی پہاڑ کے ایک غار میں جا پناہ لی۔ وہ غار کہ جس میں کچھ بھی نہ تھا۔ یہ اقدام کر کے انہوں نے راہ ایمان میں اپنی استقامت اور پامردی ثابت کر دی۔

یہ بات لائق توجہ ہے کہ اس مقام پر قرآن فن فصاحت و بلاغت کے ایک اصول سے کام لیتے ہوئے پہلے ان افراد کی سرگزشت کو اجمالی طور پر بیان کرتا ہے تاکہ سننے والوں کا ذہن مائل ہو جائے۔ اس سلسلے میں چار آیات میں واقعہ بیان کیا گیا ہے اور اس کے بعد چودہ آیات میں تفصیل بیان کی گئی ہے۔ پہلے فرمایا گیا ہے: کیا تم سمجھتے ہو کہ اصحاب کف و رقیم ہماری عجیب آیات میں سے تھے (ام حبیب ان اصحاب الکھف والرقیم کانوا من آیاتنا عجبا)۔

زمین و آسمان میں ہماری بہت سی عجیب آیات ہیں کہ جن میں سے ہر ایک عظمت تخلیق کا ایک نمونہ ہے۔ خود تمہاری زندگی میں عجیب اسرار موجود ہیں کہ جن میں سے ہر ایک تمہاری دعوت کی حقانیت کی نشانی ہے اور اصحاب کف کی داستان مسلمانان سے عجیب تر نہیں ہے۔

”اصحاب کف“ (اصحاب غار) کو یہ نام اس لیے دیا گیا ہے کیونکہ انہوں نے اپنی جان بچانے کیلئے غار میں پناہ لی تھی جس کی تفصیل ان کی زندگی کے حالات بیان کرتے ہوئے آئے گی۔

لیکن ”رقیم“ دراصل ”رقم“ کے مادہ سے لکھنے کے معنی میں ہے۔ زیادہ تر مفسرین کا نظریہ ہے کہ یہ مفردات میں راغب کہتا ہے کہ ”رقم“ (بروزن - قسم) صفت اور رنگ آلود راستے کو کہتے ہیں اور بعض اسے خط پر نقطہ لگے کے معنی میں سمجھتے ہیں۔

(ہر حال ”رقیم“ کتاب، تختی یا نامہ کو کہتے ہیں کہ جس پر کچھ لکھا گیا ہو)۔

اصحاب کف کا دوسرا نام ہے کیونکہ آخر کار اس کا نام ایک تختی پر لکھا گیا اور اسے غار کے دروازے پر نصب کیا گیا۔

بعض اسے اس پہاڑ کا نام سمجھتے ہیں کہ جس میں یہ غار تھی اور بعض اس زمین کا نام سمجھتے ہیں کہ جس میں وہ پہاڑ تھا۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ اس شہر کا نام ہے جس سے اصحاب کف نکلے تھے لیکن پہلا معنی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

رہا بعض کا یہ احتمال کہ اصحاب کف اور تھے اور اصحاب رقیم اور تھے بعض روایات میں ان کے بارے میں ایک داستان بھی نقل کی گئی ہے، یہ ظاہر آیت سے ہم آہنگ نہیں ہے کیونکہ زیر نظر آیت کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ اصحاب کف و رقیم ایک ہی گروہ کا نام ہے یہی وجہ ہے کہ ان دو الفاظ کے استعمال کے بعد صرف ”اصحاب کف“ کہہ کر داستان شروع کی گئی ہے اور ان کے علاوہ ہرگز کسی دوسرے گروہ کا ذکر نہیں کیا گیا۔ یہ صورت حال خود ایک ہی گروہ ہونے کی دلیل ہے۔

جو افراد غار میں بند ہو گئے تھے ان میں سے تین کے بارے میں تفسیر نور اشقلین میں مشہور روایات ذکر ہوئی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک نے خدا کو اپنے ایک خاص عمل کا واسطہ دیا جس کی وجہ سے انہیں اس تنگ و تاریک مقام سے رہائی ملی۔ ان روایات میں ”اصحاب رقیم“ کے نام کی کوئی بات نہیں ہے اگرچہ بعض کتب تفسیر میں اس عنوان کے تحت بات کی گئی ہے۔

بہر حال اس میں شک نہیں کرنا چاہیے کہ ”اصحاب کف و رقیم“ ایک ہی گروہ کی طرف اشارہ ہے۔ آیات کی شان نزول بھی اسی حقیقت کی تائید کرتی ہے۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: اس وقت کا سوچو جب چند جوانوں نے ایک غار میں جا پناہ لی (اذ اوی الفئیۃ الی الکھف)۔

جب وہ ہر طرف سے مایوس تھے، انہوں نے بارگاہ خدا کا رخ کیا۔ اور عرض کی: پروردگار! ہمیں اپنی رحمت سے بہرہ ور کر۔ (فقالوا ربنا اننا من لدنک رحمۃ) اور ہمارے لیے راہ نجات پیدا کر دے (وہی ولنا من امرنا رشدا)۔

ایسی راہ کہ جس سے ہمیں اس تاریک مقام سے چھٹکارا مل جائے اور تیری رضا کے قریب کر دے۔ ایسی راہ کہ جس میں خیر و سعادت ہو اور ذمہ داری ادا ہو جائے۔

ہم نے ان کی دعا قبول کی۔ ان کے کانوں پر خواب کے پردے ڈال دیئے اور وہ سالہا سال تک غار میں سوئے رہے (فرضینا علی اذانہم فی الکھف سنین عددا)۔

پھر ہم نے انہیں اٹھایا اور بیدار کیا تاکہ ہم دیکھیں کہ ان میں سے کون لوگ اپنی نیند کی مدت کا بہتر حساب لگاتے ہیں (فشریفنا ہم لنعلم ای الحزبین اھل لیما لبثوا امدا)۔

چند اہم نکات

۱۔ "اوی الفتیۃ" کا مفہوم: "اوی" "ماوی" کے مادہ سے لیا گیا ہے۔ اس کا معنی ہے: امن و امان کی جگہ۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ فاسد اور بُرے ماحول سے بھاگ کر یہ جوان جب غار میں پہنچے تو انہیں سکون و آرام محسوس ہوا۔

۲۔ "فتیۃ" "فتی" کی جمع ہے۔ دراصل یہ نوجوان سرشار جوان کے معنی میں ہے البتہ کبھی کبھار بڑی عمر والے ان افراد کے لیے بھی بولا جاتا ہے کہ جن کے جذبے جوان اور سرشار ہوں۔ اس لفظ میں عام طور پر جوانی و ترقی کے لیے ڈٹ جانے اور حق کے حضور تسلیم خم کرنے کا مفہوم بھی ہوتا ہے۔

اس امر کی شاہدہ حدیث ہے جو امام صادق علیہ السلام سے نقل ہوئی۔
امام نے اپنے ایک صحابی سے پوچھا: "فتی" کس شخص کو کہتے ہیں؟
اُس نے جواباً عرض کیا: "فتی" نوجوان کو کہتے ہیں۔
امام نے فرمایا:

اما علمت ان اصحاب الکھف کانوا اکلھم کھولاً فساھو
اللہ فتیۃ ہایما نہم
کیا تجھے نہیں پتہ کہ اصحاب کف کی عمر کے آدمی تھے لیکن اللہ نے انہیں "فتیۃ" کہا ہے اس لیے کہ وہ اللہ پر ایمان رکھتے تھے۔

اس کے بعد مزید فرمایا:

من امن باللہ و اتقی فھو الفتی

جو اللہ پر ایمان رکھتا ہو اور تقویٰ اختیار کیے ہو وہ "فتی" (جوانمرد) ہے۔

روضۃ الکافی میں امام صادق سے ایسی ہی ایک اور حدیث بھی منقول ہے۔

۳۔ "من لدنک رحمۃ" کا مفہوم: اس کا معنی ہے: "تیری طرف سے رحمت" یہ تعبیر اس طرف اشارہ ہے کہ جب انہوں نے غار میں پناہ لی تو دیکھا کہ کچھ ان کے بس میں نہیں رہا اور تمام ظاہری اسباب بے کار ہو گئے ہیں۔ ایسے میں انہیں صرف رحمت الہی کی امید تھی۔

۴۔ "ضربنا علی اذانہم" کا مطلب: "ہم نے ان کے کانوں پر پردہ ڈال دیا۔ عربی میں یہ سنانے کے لیے ایک لطیف کنیہ ہے نحسی شخص کے کان پر پردہ ڈالنا۔ گویا وہ کسی کی بات نہ

سنے اور اس پر دے سے مراد نیند ہی کا پردہ ہے۔

اسی بنا پر حقیقی نیند وہی ہے جو انسان کے کانوں کو گویا بے کار کر دے۔ یہی وجہ ہے کہ سوتے ہوئے کسی انسان کو بیدار کرنا ہو تو اسے آواز دیتے ہیں تاکہ اس کی قوت شنوائی پر اثر ہو اور وہ بیدار ہو جائے۔

۵۔ "سنین عدد ۱۰" کا مطلب: اس کا معنی ہے "متعدد سال"۔ یہ تعبیر اس طرف اشارہ ہے کہ وہ سالہا سال سوتے رہے جیسا کہ اس واقعے کی تفصیل انشاء اللہ آئندہ آیات کی تفسیر میں آئے گی۔

۶۔ "بعثناھو" کا مفہوم: یہ تعبیر ان کے بیدار ہونے کے بارے میں آئی ہے۔ شاید یہ لفظ اس لیے آیا ہے کہ ان کی نیند اتنی لمبی ہو گئی تھی کہ گویا موت کی طرح تھی اور ان کی بیداری قیامت اور بعد از موت اٹھنے کی مانند تھی۔

۷۔ "لنعلم" کا مطلب: اس کا معنی ہے: "تاکہ ہم جان لیں"۔ اس کا یہ مفہوم نہیں کہ خدا کوئی نیا علم حاصل کرنا چاہتا تھا۔ ایسی تعبیریں قرآن میں بہت آئی ہیں۔ ان کا مطلب ہے کہ خدا کو جو کچھ معلوم ہے وہ معلوم رہا ہو جائے یعنی ہم نے انہیں نیند سے بیدار کیا تاکہ یہ معنی عملی صورت اختیار کرے کہ وہ اپنی نیند کے بارے میں ایک دوسرے سے سوال کریں گے۔

۸۔ "ای الحزبین" کا مفہوم: اس سلسلے کی وضاحت آئندہ آیات سے ہو جائے گی۔ بات یہ ہے کہ جب وہ جاگے تو انہوں نے اپنے سونے کی مقدار کے بارے میں اختلاف کیا۔ بعض سمجھتے تھے کہ وہ ایک دن سوتے ہیں بعض کا خیال تھا کہ وہ آدھا دن سوتے ہیں حالانکہ وہ سالہا سال تک سوتے رہے تھے۔ بعض نے کہا کہ ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ "اصحاب رقیم" اور تھے اور "اصحاب کف" اور تھے یہ خیال بہت بعید ہے۔ اس کے بارے میں زیادہ گفتگو کی ضرورت نہیں ہے۔

۱۳ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَأَهُم بِالْحَقِّ ۖ إِنَّهُمْ فِتْيَةٌ آمَنُوا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنَاهُمْ هُدًى ۝

۱۴ وَرَبَطْنَا عَلَى قُلُوبِهِمْ إِذْ قَامُوا فَقَالُوا رَبُّنَا رَبُّ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ لَنْ نَدْعُوَ مِنْ دُونِهِ إِلَهًا لَقَدْ قُلْنَا إِذْ شَطَطًا ۝

۱۵ هَؤُلَاءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوا مِنْ دُونِهِ آلِهَةً لَوْلَا يَأْتُونَ عَلَيْهِم بِسُلْطَانٍ بَيِّنٍ ۖ فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَى عَلَى اللَّهِ كَذِبًا ۝

۱۶ وَإِذْ اعْتَزَلْتُمُوهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ فَاوَا إِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِنْ رَحْمَتِهِ وَيُهَيِّئْ لَكُمْ مِنْ أَمْرِكُمْ مَرْفَاقًا ۝

ترجمہ

۱۳ ہم تجھ سے ان کا صحیح واقعہ بیان کرتے ہیں۔ وہ ایسے جوان مرد تھے کہ جو اپنے پروردگار پر ایمان لائے تھے اور ہم نے انہیں مزید ہدایت فرمائی۔

۱۴ ہم نے ان کے دل مضبوط کیے جبکہ انہوں نے قیام کیا اور کہا: ہمارا رب آسمانوں اور زمین کا پروردگار ہے۔ ہم اس کے علاوہ ہرگز کسی کی پرستش نہیں کریں گے۔ اگر ہم ایسی بات کریں تو ہم نے بیہودہ بات کی۔

۱۵ ہماری اس قوم نے اس کی بجائے اوروں کو معبود بنا رکھا ہے۔ یہ لوگ ان معبودوں کے لیے کوئی واضح دلیل کیوں پیش نہیں کرتے۔ اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہو سکتا ہے کہ جو خدا پر جھوٹ باندھے۔

۱۶ اور جس وقت ان لوگوں سے اور ان سے کہ اللہ کی بجائے جن کی یہ پرستش کرتے ہیں، تم کن رہ کشتی اختیار کر لو تو غار میں جا پناہ لو کہ تمہارا رب تم پر اپنی رحمت (کا سایہ) کرے گا اور تمہارے لیے آسائش و نجات کی راہ کھول دے گا۔

تفسیر

داستان اصحاب کھف کی تفصیل

جیسا کہ ہم نے کہا ہے اجمالی طور پر واقعہ بیان کرنے کے بعد چودہ آیتوں میں اس کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ گفتگو کا آغاز یوں کیا گیا ہے: ان کی داستان، جیسا کہ ہے، ہم تجھ سے بیان کرتے ہیں (نحن نقص عليك نبأهم بالحق)۔ ہم اس طرح سے واقعہ بیان کرتے ہیں کہ وہ ہر قسم کی فضول بات بے نیاز چیزوں اور غلط باتوں سے پاک ہوگا۔

وہ چند جوان مرد تھے کہ جو اپنے رب پر ایمان لائے تھے اور ہم نے ان کی ہدایت اور بڑھادی تھی (انهم فتية امنوا ببرهم وزدناهم هدى)۔

جیسا کہ ہم کہ چکے ہیں "فتیہ" کی جمع ہے کہ جو نو نیر و سرشار جوان کے معنی میں ہے لیکن چونکہ جوانی میں انسان کا بدن قوی ہوتا ہے اس کے جذبات میں جوش و خروش ہوتا ہے۔ روحانی اعتبار سے دل نور حق قبول کرنے اور محبت، سخاوت اور حضور و درگزر کے جذبوں کے لیے زیادہ آمادہ ہوتا ہے لہذا اکثر ایسا ہوتا ہے کہ "فتی" اور "فتوت" اگر بڑی عمر والوں کے لیے بولا جائے تو مجموعی طور پر ان صفات کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ جیسے لفظ "جوانمردی" اور "فتوت" فارسی زبان میں بھی انہیں معنی ہم میں استعمال ہوتے ہیں۔

آیات قرآن سے اجمالی طور پر اور تاریخ سے تفصیلی طور پر یہ حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ اصحاب کھف جس دور اور ماحول میں رہتے تھے اس میں کفر و بدعت پرستی کا دور دورہ تھا۔ ایک ظالم حکومت کے جو عام طور پر شرک، کفر، جہالت، غارتگری اور ظلم کی محافظ تھی لوگوں کے سردوں پر مسلط تھی۔ لیکن یہ جوانمرد کہ جو جوش و

صداقت کے حامل تھے آخر کار اس دین کی غرابی کو جان گئے۔ انہوں نے اس کے خلاف قیام کا مصمم ارادہ کر لیا اور فیصلہ کیا کہ اگر اس دین کے خاتمے کی طاقت نہ ہوئی تو ہجرت کر جائیں گے۔ اسی لیے گزشتہ بحث کے بعد قرآن کتا ہے: جب انہوں نے قیام کیا اور کہا کہ ہمارا رب آسمان و زمین کا پروردگار ہے، ہم نے ان کے دلوں کو مضبوط کر دیا (و ربطناعلیٰ قلوبہم اذ قامرافقا لواربنا رب السملوات والارض)۔ انہوں نے کہا کہ ہم اس کے علاوہ کسی معبود کی ہرگز پرستش نہیں کریں گے (لن ندعوا من دونہ الہا)۔ اگر ہم ایسی بات کریں اور اس کے علاوہ کسی کو معبود سمجھیں تو ہم نے بے ہودہ اور حق سے دور بات کہی (لقد قلنا اذا شططنا)۔

”ربطناعلیٰ قلوبہم“ سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ان کے دل میں توحید کی فکر پیدا ہوئی لیکن وہ اس کا اظہار نہیں کر سکتے تھے۔ خدا نے ان کے دلوں کو ڈھاکس دی اور انہیں یہ طاقت بخشی کہ وہ اٹھ کھڑے ہوں اور علی الاعلان صدائے توحید بلند کریں۔

کیا انہوں نے یہ اعلان سب سے پہلے اس دور کے ظالم بادشاہ و قیافوس کے سامنے کیا یا عام لوگوں کے سامنے یا دونوں کے سامنے یا آپس میں ایک دوسرے کے سامنے؟ یہ بات صحیح طور پر واضح نہیں ہے لیکن ”قاموا“ کی تعبیر کا کافی ہر مضمون یہ ہے کہ انہوں نے یہ اعلان ظالم بادشاہ کے سامنے کیا۔

”شطط“ (بروزن) ”وسط“ (حد سے نکل جانے اور بہت دور چلے جانے کے معنی میں ہے۔ لہذا وہ باتیں کہ جو حق سے بہت دور ہوں انہیں ”شطط“ کہا جاتا ہے اور یہ جو بڑے دریاؤں کے ساحل کو ”شطط“ کہتے ہیں اس کی درجہ یہ ہے کہ وہ پانی سے دور اور بلند ہوتا ہے۔

ان با ایمان جو انہوں نے واقعا توحید کے اثبات اور ”الہہ“ کی نفی کے لیے واضح دلیل کا سارا لیا اور وہ یہ کہ ہم واضح طور پر دیکھ رہے ہیں کہ آسمان و زمین کا کوئی مالک اور پروردگار ہے کہ وجود نظام خلقت جس کے وجود کی دلیل ہے اور ہم بھی اس عالم ہستی کا ایک حصہ ہیں لہذا ہمارا پروردگار بھی وہی آسمانوں اور زمین کا پروردگار ہے۔

اس کے بعد وہ ایک اور دلیل سے متوسل ہوئے اور وہ یہ کہ ”ہماری اس قوم نے خدا کے علاوہ معبود بنا رکھے ہیں“ (ہؤلاء قومنا اتخذوا من دونہ الہة)۔ تو کی دلیل و برہان کے بغیر بھی اعتقاد رکھا جاسکتا ہے ”وہ ان کی الوہیت کے بارے میں کوئی واضح دلیل پیش کیوں نہیں کرتے (ولولایاتون علیہم بسلطان مبین)۔ کیا تصور، خیال یا اندھی تقلید کی بنا پر یہ ایسا عقیدہ اختیار کیا جاسکتا ہے؟ یہ کیسا کھلم کھلا ظلم اور عظیم انحراف ہے؟ اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہو سکتا ہے کہ جو خدا پر جھوٹا بیانیہ (فمن اظلم ممن افتری علی اللہ کذباً)۔

یہ افراء اپنے اد پر بھی ظلم ہے اور معاشرے پر بھی۔ اپنے اد پر اس طرح کہ وہ اپنے آپ کو اس طرح

بدبختی اور تباہی کے سپرد کر دیتا ہے اور معاشرے پر اس طرح کہ یہی عقیدہ وہ اس میں پیش کرتا ہے اور اسے جن انحرافات کی طرف کھینچتا ہے اور یہ ساحت قدس پر دروگاریں بھی ظلم ہے اور اس کے مقام بزرگ کی امانت ہے۔

ان توحید پرست جواں مردوں نے بہت کوشش کی کہ لوگوں کے دلوں سے شرک کا زنگ اتر جائے اور ان کے دلوں میں توحید کی کوئل پھوٹ پڑے لیکن وہاں تو بتوں اور بت پرستی کا ایسا شور تھا اور ظالم بادشاہ کے ظلم و سب سے داد کا ایسا خوف تھا کہ گویا سانس مخلوق خدا کے سینے میں گھٹ کے رہ گئی تھی اور نعمت توحید ان کے حلق میں ہی اٹک کر رہ گیا تھا۔

لہذا انہوں نے مجبوراً اپنی نجات کے لیے اور بہتر ماحول کی تلاش کے لیے ہجرت کا عزم کیا۔ لہذا باہمی مشورے ہونے لگے کہ کہاں جائیں، کس طرف کو کوچ کریں۔ آپس میں کہنے لگے: ”جب اس بت پرست قوم مذکورہ نے تیار کر لو اور خدا کو چھوڑ کر جنہیں یہ پوجتے ہیں ان سے الگ ہو جاؤ اور اپنا صاحب کتاب ان سے جدا کر لو تو غار میں چاہنا لو“ (واذ اعتزلتموہم وما یعبدون الا اللہ فاقوا الی الکھف) تاکہ تمہارا پروردگار تم پر اپنی رحمت کا سایہ کر دے اور اس مشکل سے نکال کر تمہیں نجات کی راہ پر ڈال دے (بیشکر لکم ربکم من رحمته ویھی لکم من امرکم مرفقا)۔

”یہی“ ”تعیہ“ کے مادہ سے تیار کرنے کے معنی میں ہے۔ اور ”مرفق“ اس چیز کو کہتے ہیں جو آرام و راحت اور مہربانی کا ذریعہ بنے۔ لہذا ”یہی لکم من امرکم مرفقا“ کا معنی ہے ”خدا تمہارے لیے راحت و آرام کا ذریعہ فراہم کر دے“۔ بعید نہیں کہ ”نشد رحمة“ گزشتہ جملے میں اللہ کے الطاف معنوی کی طرف اشارہ ہو جبکہ دوسرا جملہ جسمانی و مادی نجات و آرام کی طرف اشارہ ہو۔

چند اہم نکات

۱۔ ایمان اور جو انہوں نے کارشتہ: توحید پرستی اور اعلیٰ انسانی صفات ہمیشہ ساتھ ساتھ ہوتی ہیں۔ توحید پرستی، اعلیٰ انسانی صفات کے لیے سرچشمہ کی حیثیت رکھتی ہے اور یہ ایک دوسرے کے لیے باہمی تاثیر رکھتی ہیں۔ اسی بنا پر اصحاب کھف کی داستان میں ہے:

وہ ایسے جو انہوں نے جو اپنے پروردگار پر ایمان لے آئے۔

یہی وجہ ہے کہ بعض علماء نے کہا ہے:

رأس الفتوة الايمان

جو انہوں نے اس سرچشمہ ایمان ہے۔

بعض دیگر نے کہا ہے :

الفقوة ببدل الندى وكف الاذى وترك الشكوى
جو انفرادی - عطا و سخاوت ، دوسروں کو اذیت پہنچانے سے احتراز اور مشکلات میں
شکایت نہ کرنے کا نام ہے ۔

بعض دیگر نے "فتوت کی تفسیر یوں کی ہے :

ہی اجتناب المحارم واستعمال المکارم

جو انفرادی نام ہے گناہوں سے پرہیز کا اور انسانی فضائل و مکارم کو بروئے کار لانے کا ۔

۲۔ ایمان اور امداد الہی : مندرجہ بالا آیات میں متعدد مواقع پر یہ حقیقت بڑی صراحت سے
ظاہر ہوتی ہے کہ اگر انسان پہلا قدم راہ خدا میں اٹھالے اور اس کے لیے قیام کرے تو خدا کی کمک اور
امداد الہی اس کی طرف لپکتی ہے ۔

ایک مقام پر ہے کہ "وہ ایسے جو انرو تھے کہ جو ایمان لائے اور ہم نے ان کی ہدایت میں
اضافہ کر دیا"۔

ایک اور مقام پر ہے : "ہم نے ان کے دلوں کو مضبوط کیا اور انہیں توانائی بخشی :
اور آیات کے آخر میں بھی ہے کہ وہ رحمت الہی کے سایہ فگن ہونے اور راہ نجات پانے کے
انتظار میں تھے ۔

قرآن کی دیگر آیات سے بھی اس حقیقت کی تائید ہوتی ہے ۔ مثلاً :

وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا

جو لوگ ہماری راہ میں کوشاں ہوں ہم انہیں اپنے راستوں کی طرف راہنمائی کرتے ہیں
(عنکبوت - آخری آیت)

نیز سورہ محمد کی آیت ۷۱ میں ہے :

وَالَّذِينَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى

جو راہ ہدایت پر گامزن ہوئے اللہ نے ان کی ہدایت میں اضافہ کر دیا ۔

ہم جانتے ہیں کہ راہ حق میں بہت دشواریاں اور رکاوٹیں ہیں اور لطف خداوندی شامل حال نہ ہو
تو مقصد تک پہنچنا بہت ہی مشکل کام ہے ۔

ہم یہ بات بھی جانتے ہیں کہ لطف خداوندی اپنے حق طلب اور حق جو بندے کو اس راہ میں ہرگز
تھما نہیں چھوڑتا ۔

۳۔ "غار" کے نام کی ایک پناہ گاہ : "الکھف" میں الفت اور لام شاید اس طرف اشارہ ہو کہ

انہوں نے کسی دُور علاقے میں پہلے سے ایک غار کے بارے میں طے کر رکھا تھا کہ اگر ان کی تبلیغات
توحید کا کوئی نتیجہ نہ نکلا تو پھر وہ اس آلودہ اور تاریک ماحول سے نجات کیلئے اس میں پناہ لیں گے ۔

"کھف" ایک معنی خیز لفظ ہے ۔ اس سے انسان کی بالکل ابتدائی طرز زندگی کی طرف ذہن چلا جاتا
ہے ۔ وہ ماحول کہ جب راتیں تاریک اور سرد تھیں ۔ روشنی سے محروم انسان جانکاہ دُروں میں زندگی بسر کرتے
تھے ۔ وہ زندگی جس میں مادی آسائشوں کا کوئی پتہ نہ تھا ۔ جب نرم بستر تھے نہ خوشحالی ۔

اب جب اس طرف توجہ کریں کہ جیسا تاریخ میں منقول ہے اصحاب کھف اس دُور میں بادشاہ کے
وزیر اور بہت بڑے اہل منصب تھے ۔ انہوں نے بادشاہ اور اس کے مذہب کے خلاف قیام کیا ۔ اس سے
واضح ہوتا ہے کہ ناذر نعمت سے بھری اس زندگی کو چھوڑنا اور اس پر غارتشیں کو ترجیح دینا کس قدر عزم ، حوصلے
دلیری اور جانثاری کا غماز ہے ، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی رُوح کتنی عظیم تھی ۔

یہ غار تاریک ، سرد اور خاموش ضرور تھی اور اس میں موذی جانوروں کا خطرہ بھی تھا لیکن یہاں نور و صفا
اور توحید و معنویت کی ایک دنیا آباد تھی ۔

رحمت الہی کے نور کی لکیروں نے اس غار کی دیواروں پر گویا نقش و نگار کر دیا تھا اور لطف الہی کے
آثار اس میں موجزن تھے ۔ اس میں طرح طرح کے مضحکہ خیز بُت نہیں تھے اور ظالم بادشاہ کا ہاتھ دُیاں
نہیں پہنچ سکتا تھا ۔ اس کی فضا نے جبل و جرم کے دم گھٹنے والے ماحول سے نجات عطا کر دی تھی اور یہاں
انسانی فکر پر کوئی پابندی نہ تھی ۔ فکر آزادی اپنی پوری وسعتوں کے ساتھ موجود تھی ۔

جی ہاں : ان خدا پرست جو انفرادوں نے اس دنیا کو ترک کر دیا کہ جو اپنی وسعت کے باوجود ایک تکلیف دہ
زندگی کی مانند تھی اور اُس غار کو انتخاب کر لیا کہ جو اپنی تنگی و تاریکی کے باوجود وسیع تھی ۔ بالکل پاکباز یوسف
کی طرح کہ جنہوں نے عزیز مصر کی خوبصورت بیوی کے شدید اصرار کے باوجود اس کی سرکش ہوس کے سامنے
سر نہ جھکایا اور تاریک و مشتاک قید خانے میں جانا قبول کر لیا ۔ اللہ نے ان کی استقامت میں اضافہ کر دیا اور
آخر کار انہوں نے بارگاہ خداوندی میں یہ حیران کن حیلہ کہا :

رَبِّ السَّجْنِ أَخْبَرَنِي أَنِّي مَتَّيْنٌ عَيْنِي وَإِلَيْهِ لَا تَصْرُفُ عَنِّي كَيْدُهُنَّ أَصْبُ إِلَيْهِنَّ

پروردگار ! زندان اپنی جالگاہ تنگی و تاریکی کے باوجود مجھے اس گناہ سے زیادہ محبوب ہے
کہ جس کی طرف یہ عورتیں مجھے دعوت دیتی ہیں اور اگر تو ان کے دوسلوں کو مجھ سے دفع نہ کرے
تو میں ان کے دام میں گرفتار ہو جاؤں گا ۔ (یوسف - ۳۳)

۱۷) وَتَرَى الشَّمْسَ إِذَا طَلَعَتْ تَزْوُرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِينِ وَإِذَا غَرَبَتْ تَقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وَهُمْ فِي فَجْوَةٍ مِنْهُ ذَلِكَ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ مَنْ يَهْدِ اللَّهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ وَمَنْ يُضِلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهُ وَلِيًّا مُرْشِدًا ۝

۱۸) وَتَحْسَبُهُمْ آيْقَاطًا وَهُمْ رُقُودٌ وَنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِينِ وَذَاتَ الشِّمَالِ وَكَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيدِ لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعبًا ۝

ترجمہ

۱۷) جب سورج نکلتا ہے تو توڑ دیکھ گاہ کہ ان کی (غار کے) دائیں طرف جھک کے نکلتا ہے اور وقت غروب بائیں جانب کو اور وہ غار کے اندر ایک وسیع جگہ پر موجود ہیں۔ یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے جس شخص کی ہدایت اللہ کے درحقیقت وہی ہدایت یافتہ ہے اور جسے وہ بھٹکا دے تو پھر تجھے اس کا کوئی سرپرست راہنما نہیں ملے گا۔

۱۸) راہرو اگر تو انہیں دیکھتا تو سمجھتا کہ وہ بیدار ہیں حالانکہ وہ نیند میں مستغرق تھے اور ہم انہیں دائیں بائیں کروٹ بدلاتے تھے (تاکہ ان کا جسم صحیح و سالم رہے) اور ان کے کتے نے غار کے دہانے پر اپنے اگلے پاؤں پھیلا رکھے تھے (اور نگہبانی کر رہا تھا) اور تو اگر انہیں دیکھتا تو بھاگ کھڑا ہوتا اور سر تاپا وحشت زدہ ہو جاتا۔

تفسیر اصحاب کہف کا اہم مقام

ان دو آیات میں قرآن غار میں اصحاب کہف کی عجیب و غریب زندگی کی کچھ تفصیلات بیان کر رہا ہے۔ ان کی زندگی کی ایسی منظر کشی کی گئی ہے کہ گویا کوئی شخص غار کے سامنے بیٹھا ہے اور غار میں سوتے ہوئے افراد کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔

چھ نشانیاں اور خصوصیات

ان دو آیتوں میں غار اور اصحاب کہف کی چھ نشانیاں اور خصوصیات بیان کی گئی ہیں:

۱۔ غار کا دہانہ شمال کی طرف ہے اور غار چونکہ زمین کے شمالی نصف کرہ میں واقع تھی لہذا سورج کی روشنی مستقیم اس میں نہیں پڑتی تھی جیسا کہ قرآن کہتا ہے: اگر تو وقت طلوع سورج کو دیکھتا تو وہ غار کی دائیں جانب جھک کے گزرتا ہے اور غروب کے وقت بائیں جانب (و تری الشمس اذا طلعت تزاور عن كهفهم ذات اليمين) و اذا غربت تقرضهم ذات الشمال)۔

اس طرح سے ان پر سورج کی براہ راست روشنی نہیں پڑتی تھی اگر پڑتی رہتی تو ہو سکتا ہے کہ ان کے جسم بوسیدہ ہو جاتے۔

۲۔ ”تزاور“ کی تعبیر کہ جو جھکنے کے معنی میں ہے، اس میں یہ نکتہ پنہاں ہے کہ گویا سورج اس بات پر مامور تھا کہ غار کی دائیں سمت سے گزرے۔ اسی طرح ”تقرض“ کی تعبیر کاٹنے کے معنی میں ہے، اس میں بھی ماموریت کا مفہوم موجود ہے۔ اس سے قطع نظر ”تزاور“ ”زیارت“ کے مادہ سے ہے۔ اس میں آغاز کی طرف اشارہ بھی موجود ہے کہ جو طلوع آفتاب کا مفہوم دیتا ہے اور ”تقرض“ قطع کرنے اور ختم کرنے کے معنی میں ہونے کے باعث غروب کا مفہوم بھی دیتا ہے۔

۳۔ غار کا دہانہ شمال کی طرف ہونے کی وجہ سے اس میں ابھی اور لطیف ہوائیں آتی تھیں کیونکہ یہ ہوائیں عموماً شمال کی جانب سے چلتی ہیں۔ لہذا تازہ ہوا آسانی سے غار میں داخل ہو جاتی اور ایک تازگی قائم رکھتی۔

۴۔ وہ غار کی ایک وسیع جگہ میں تھے (و هم في فجوة منه)۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ وہ غار کے دہانے پر موجود نہ تھے کیونکہ وہ تو عموماً تنگ ہوتا ہے۔ وہ غار کے وسط حصے میں تھے تاکہ دیکھنے والوں کی نظروں سے بھی اوجھل رہیں اور سورج کی براہ راست چمک سے بھی۔

یہاں قرآن سلسلہ گفتہ گو یا رد کہتے ہوئے ایک معنوی نتیجہ بیان کرتا ہے کیونکہ اس ساری داستان کا ذکر اسی مقصد کے لیے کیا جا رہا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے جس شخص کو اللہ ہدایت دے وہی حقیقی ہدایت یافتہ ہے اور جسے وہ بھٹکا دے اس کے لیے تجھے کوئی سرپرست و راہنما نہیں ملے گا (ذٰلِكَ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ مَنْ يَهْدِ اللَّهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ وَمَنْ يُضِلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهُ وَلِيًّا مُرْشِدًا)۔

جی ہاں! جو لوگ راہِ حق میں قدم اٹھاتے ہیں اور اس کی راہ میں جہاد کے لیے نکل پڑتے ہیں ہر قدم پر انہیں اللہ کا لطف و کرم حاصل ہوتا ہے۔ یہ لطف و کرم کام کی بنیاد ہی میں میسر نہیں آتا بلکہ اس کی جزئیات میں بھی شامل حال ہوتا ہے۔

۳۔ ان کی فیند عام فتنہ سی نہ تھی۔ اگر تو انہیں دیکھتا تو خیال کرتا کہ وہ بیدار ہیں حالانکہ وہ گہری نیند میں سوئے ہوئے تھے (وَنَحْبِھُمُ الْيَقَظَا وَھُمْ رُقُودٌ)۔

یہ بات ظاہر کرتی ہے، ان کی آنکھیں بالکل ایک بیدار شخص کی طرح پوری طرح کھلی تھیں۔ یہ استثنائی حالت شاید اس بنا پر تھی کہ موزی جانور قریب نہ آئیں کیونکہ وہ بیدار آدمی سے ڈرتے ہیں۔ یا اس کی وجہ یہ تھی کہ ماحول رعب و خرابی سے تھا کہ کوئی انسان ان کے پاس جانے کی جرأت نہ کرے اور یہ صورت حال ان کے لیے ایب و سیر کا کام دے۔

۴۔ اس بنا پر کہ سالما مال سوئے رہنے کی وجہ سے ان کے جسم بوسیدہ نہ ہو جائیں "ہم انہیں دائیں بائیں کر دیں بدلواتے رہتے تھے (وَنَقْلِبُھُمْ ذَاتَ الْيَمِیْنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ)۔ تاکہ ان کے بدن کا خون ایک ہی جگہ نہ ٹپک جائے اور طویل عرصہ ایک طرف مرکز ہونے کی وجہ سے ان کے اعصاب خراب نہ ہو جائیں۔

۵۔ اس دوران میں "کتنے کہ جو ان کے ہمراہ تھا غار کے دہانے پر اپنے اگلے پاؤں پھیلانے ہوئے تھا اور پرہ دے رہا تھا (وَكَلْبُھُمْ بِأَسْطِ ذِرَاعِیْہِ بِالْوَصِیْدِ)۔

میساکہ راعب نے مفردات میں کہا ہے "وصید" ایسے کرے اور سٹور کے معنی میں ہے کہ جو پہاڑی علاقوں میں اموال و اسباب ذخیرہ کرنے کے لیے بنایا جاتا ہے۔ یہاں یہ لفظ غار کے دہانے کے معنی میں ہے۔

اس سے پہلے ابھی تک قرآنی آیات میں اصحاب کف کے کتے کے بارے میں کوئی بات نہیں ہوئی تھی لیکن قرآن واقعات کے دوران بعض اوقات ایسی باتیں کر جاتا ہے کہ جن سے دوسرے مسائل بھی واضح ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح یہاں اصحاب کف کے کتے کا ذکر آیا ہے۔ یہاں سے ظاہر ہوا کہ ان کے ہمراہ ایک کتا بھی تھا جو ان کے ساتھ ساتھ رہتا تھا اور ان کی حفاظت کرتا تھا۔

یہ کہ یہ کتا ان کے ساتھ کہاں سے شامل ہوا تھا، کیا ان کا شکاری کتا تھا یا اُس پر داسے کا کتا تھا جس سے ان کی راستے میں ملاقات ہوئی تھی اور جب چرواہے نے انہیں پہچان لیا تھا تو اُس نے اپنے جانور آبادی کی طرف روانہ کر دیئے تھے اور خود ان پاکباز لوگوں کے ساتھ ہو لیا تھا کیونکہ وہ ایک حق جو اور دیدار الہی کا طالب انسان تھا۔ اس وقت کتا ان سے ہدایت ہوا اور ان کے ساتھ ہو لیا۔

کیا اس بات کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ تمام عاشقان حق اس تک رسائی کے لیے اس کے راستے میں قدم رکھ سکتے ہیں اور کُتے یار کے دروازے کسی کے لیے بند نہیں ہیں۔ ظالم بادشاہ کے نائب ہونے والے ذریعوں سے لے کر چرواہے تک بلکہ اس کے کتے تک کے لیے بارگاہ الہی کے دروازے کھلے ہیں۔

کیا ایسا نہیں ہے کہ قرآن کہتا ہے کہ:

زَمِیْنٍ وَّآسْمَانٍ کے تمام ذرے، سارے درخت اور سب پھلنے پھرنے والے ذکر الہی میں مگن ہیں، سب کے سر میں اُس کے عشق کا سودا سمایا ہے اور سب دلوں میں اس کی محبت جلوہ گر ہے۔ (بنی اسرائیل - ۴۴)

۶۔ غار میں اصحاب کف کا منظر ایسا رعب انگیز تھا کہ اگر تو انہیں جہانم کے دیکھ لیتا تو بھاگ کھڑا ہوتا اور تیرا دودھ سر تپا خوفزدہ ہو جاتا (لَوْ اَطْلَعْتَ عَلَیْھُمْ لَوَلِیْتَ مِنْھُمْ فَارًا وَلَمَسْتُمْ مِنْھُمْ رُعْبًا)۔

یہ ایک ہی موقع نہیں کہ خدا تعالیٰ نے رعب اور خوف کو اپنے با ایمان بندوں کے لیے ڈھال بنا دیا۔ سورہ آل عمران کی آیت ۱۵۱ میں بھی ہے:

سَتَلَقُوْا فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا الشَّرْعَیْ

ہم جلد ہی کافروں کے دلوں پر رعب ڈال دیں گے۔

دعاے ندب میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے:

شعور نصرته بالرعب

خداوند! پھر تو نے اپنے پیغمبر کی مدد اس طرح سے کی کہ اُس کے دشمنوں کے

دلوں میں رعب ڈال دیا۔

لیکن یہ رعب کہ جو اصحاب کف کو دیکھنے والے کو سر تپا لرزادیتا، ان کی جسمانی حالت کے باعث تھا یا یہ کہ پراسرار روحانی طاقت تھی کہ جو اس سلسلے میں کام کر رہی تھی۔ اس سلسلے میں آیات قرآنی

میں کوئی وضاحت نہیں ہے اگرچہ مفسرین نے کئی قسم کی بحثیں کی ہیں لیکن وہ کسی دلیل کی بنیاد پر نہیں ہیں اس لیے ہم ان سے صرف نظر کرتے ہیں۔

ضمناً "ولم یلت منہم رعبا" (تیرے وجود پر سرتاپا خوف چھا جاتا) درحقیقت "لولیٰ منہم فرائدا" (اگر تو انہیں دیکھتا تو بھاگ کھڑا ہوتا) کی علت ہے یعنی تو اس لیے بھاگ اٹھتا کہ تو وحشت زدہ ہو جاتا۔

بہر حال جب کسی چیز میں اللہ کا ارادہ شامل ہو جائے تو بڑی معمولی سی چیزوں سے بڑے بڑے نتیجے پیدا ہو جاتے ہیں۔

①۹ وَكَذٰلِكَ بَعَثْنَاهُمْ لِيَتَسَاءَلُوْا بَيْنَهُمْ ۖ قَالَ قَائِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ ۚ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۚ قَالُوْا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ ۚ فَاْبَعَثُوْا اَحَدَكُمْ بِوَرَقِكُمْ هٰذِهٖ اِلَى الْمَدِيْنَةِ فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَا اَزْكٰى طَعَامًا فَلْيَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ وَلْيَتَلَطَّفْ ۚ وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ اَحَدًا ۝

②۰ اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ اَوْ يُعِيْدُوْكُمْ فِيْ مِلَّتِهِمْ وَلَنْ تُفْلِحُوْا اِذَا اَبَدًا ۝

ترجمہ

①۹ اسی طرح ہم نے انہیں (نیند سے) اٹھا بٹھایا تاکہ وہ ایک دوسرے سے پوچھیں۔ اُن میں سے ایک نے کہا: کتنی مدت سوئے ہو۔ انہوں نے کہا: ایک دن یا ایک دن کا کچھ حصہ (اور چونکہ انہیں اپنے سونے کی مدت ٹھیک طرح سے معلوم نہ تھی لہذا) کہنے لگے: تمہارا پروردگار بہتر جانتا ہے کہ تم کتنی مدت سوئے ہو۔ تمہارے پاس جو بکتہ ہے اب وہ دے کر کسی کو شہر کی طرف بھیج دو تاکہ وہ دیکھے کہ سب سے پاکیزہ کھانا جہاں سے ملتا ہو وہاں سے وہ کھانے کے لیے کچھ لے آئے لیکن اُسے چاہیے کہ بڑی احتیاط سے کام لے، کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی کو تمہارے بارے میں کچھ بتا بیٹھے۔

②۰ کیونکہ اگر انہیں تمہارے بارے میں پتہ چل گیا تو وہ تمہیں سنگسار کر دیں گے

یا اپنے دین کی طرف پھیر لے جائیں گے اور اگر ایسا ہو گیا تو پھر تم کبھی فلاح کا منہ نہیں دیکھ پاؤ گے۔

تفسیر

ایک طویل نیند کے بعد بیداری

خدا نے چاہا تو آئندہ آیات کے ذیل میں ہم پڑھیں گے کہ اصحاب کھف کی نیند اتنی لمبی ہو گئی کہ وہ تین سو نو سال تک سوئے رہے اور ان کی نیند موت سے بالکل طاق جلتی تھی اور ان کی بیداری بھی قیامت کی مانند تھی۔ لہذا زیر بحث آیات میں قرآن کت ہے: اور ہم نے انہیں اسی طرح اٹھا کھڑا کیا (و کذلک بھشناہو)۔

یعنی اسی طرح کہ جیسے ہم اس پر قادر تھے کہ انہیں لمبی مدت تک سلائے رکھتے انہیں پھر سے بیدار کرنے پر بھی قادر تھے۔

ہم نے انہیں نیند سے بیدار کر دیا۔ تاکہ وہ ایک دوسرے سے پوچھیں۔ ان میں سے ایک نے پوچھا، تمہارا کیا خیال ہے کتنی مدت سوئے ہو؟ لیستاء لواء بیئہم قال قائل منہم کم لبتہم انہوں نے کہا: ایک دن یا دن کا کچھ حصہ (قالوا لبتنا یوماً و بعض یوم)۔

اس میں تردید شاید انہیں اس لیے ہو کہ جیسے مفسرین نے کہا ہے کہ وہ جب غار میں آئے تھے تو دن کا ابتدائی حصہ تھا اور اگر وہ سو گئے تھے اور جب اٹھے تو دن کا آخری حصہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ پہلے انہوں نے سوچا کہ شاید ایک دن سو گئے ہیں اور جب انہوں نے سورج کی طرف دیکھا تو انہیں خیال آیا کہ شاید دن کا کچھ حصہ سوئے ہیں۔

لیکن آخر کار چونکہ انہیں صحیح طرح سے معلوم نہ ہو سکا کہ کتنی دیر سوئے ہیں لہذا کہنے لگے: تمہارا رب بہتر جانتا ہے کہ کتنی دیر سوئے ہو؟ (قالوا ربکم اعلم بما لبتہم)۔

بعض کا کہنا ہے کہ یہ بات ان میں سے بڑے نے کہی جس کا نام تمیلین تھا اور یہاں پر: قالوا کہ جو جمع کا صیغہ ہے اس کا استعمال ایک معمول کی بات ہے۔

یہ بات انہوں نے شاید اس لیے کہی کہ ان کے پھرے مہرے سے، ناخنوں سے، بالوں سے اور

لیستاء لواء میں جو لام ہے وہ اصطلاح میں لام عاقبت ہے نہ کہ لام علت۔ یعنی ان کے ہاتھ کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنی نیند کی مدت کے بارے میں ایک دوسرے سے پوچھنے لگے۔

بکس سے بالکل شک نہیں پڑتا تھا کہ وہ کوئی غیر معمولی طور پر نیند میں رہے ہیں۔

ہر حال انہیں بھوک اور پیاس کا احساس ہوا کیونکہ ان کے بدن میں جو غذا تھی وہ تو تمام ہو چکی تھی۔ لہذا پہلے پہلے انہوں نے یہی تجویز کیا کہ "تمہارے پاس چاندی کا جو سکہ ہے اپنے میں سے ایک کو دو تاکہ وہ جائے اور دیکھے کہ کس کے پاس اچھی پاکیزہ غذا ہے اور جتنی تمہیں چاہیے تمہارے لیے لے آئے (فابعثوا احدکم بورقکم هذه الى المدينة فليظفرا بها اذک طعاماً فلیأتکم برزق منہ)۔

"لیکن بہت احتیاط سے جائے، کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی کو تمہارے بارے میں کچھ بتا بیٹھے" (ولیتلطف ولا یشرعن بکموا حدثا)۔

"کیونکہ اگر انہیں تمہارے بارے میں پتہ چل گیا اور انہوں نے تمہیں آلیا تو سنگار کر دیں گے یا پھر تمہیں اپنے دین (میت پرستی) کی طرف موڑ لے جائیں گے" (انہم ان یظہروا علیکم میرجموکم او یبیدو وکم فی ملتہم)۔

اور اگر ایسا ہو گیا تو تم نجات اور فلاح کا منہ نہ دیکھ پاؤ گے" (ولن تغلحوا اذا ابدا)۔

چند اہم نکات

۱۔ پاکیزہ ترین غذا: یہ بات بہت جاذب نظر ہے کہ اس داستان میں ہم نے پڑھا ہے کہ اصحاب کھف جب بیدار ہوئے تو ظاہر ہے انہیں بہت بھوک لگ رہی تھی اور اس طویل مدت کے دوران ان کے جسم میں جو غذا تھی صرف ہو چکی تھی لیکن اس کے باوجود انہوں نے جسے کھانا لانے کے لیے بھیجا اسے نصیحت کی کہ ہر غذا نہ فرید لے بلکہ دیکھ بھال کر کھانا بیچنے والوں کے پاس سے جو سب سے زیادہ پاکیزہ ہو اسے لے کر آئے۔

بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ اس سے ذبح شدہ جانور کی طرف اشارہ تھا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اس شہر میں ایسے لوگ رہتے ہیں کہ جو نجس و ناپاک اور کبھی مردہ کا گوشت بیچتے ہیں یا بعض لوگوں کا کام ہی حرام کا تھا لہذا انہوں نے نصیحت کی ایسے لوگوں سے کھانا نہ فریدنا۔

لیکن ظاہراً اس جملے کا صحیح مفہوم ہے کہ جس میں ہر قسم کی ظاہری اور باطنی پاکیزگی شامل ہے اور یہ دراصل راہ حق کے تمام راہیوں کے لیے نصیحت ہے کہ وہ نہ صرف روحانی غذا کے بارے میں فکر کریں بلکہ اپنی جسمانی غذا کی پاکیزگی کا بھی خیال رکھیں کہ وہ ہر قسم کی آلودگی سے پاک ہو یہاں تک کہ زندگی کے مشکل ترین لحاظ میں بھی اس بات کو فراموش نہ کریں۔

دور حاضر میں دنیا گے بہت سے لوگ اس حکم کی اہمیت سے کسی حد تک آگاہ ہو گئے ہیں اور کوشش

کرتے ہیں کہ اُن کی غذا ہر قسم کی ظاہری آلودگی سے پاک ہو۔ وہ کھانے کی چیزوں کو ڈھک کر گندے ہاتھوں کی پیچ سے دُور اور گرد و غبار سے بچا کر رکھتے ہیں۔ یہ کام بہت اچھا ہے لیکن اس پر قناعت نہیں کرنا چاہیے بلکہ یہ بھی خیال رکھنا چاہیے کہ غذا حرام نہ ہو، سود، ملاوٹ، دھوکا بازی اور ہر قسم کی باطنی آلودگی سے بھی پاک ہو۔

اسلامی روایات میں قبولیت دعا اور پاکیزگی دل کے لیے حلال غذا کی بہت تاکید کی گئی ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ ایک شخص رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کرنے لگا:

احب ان يستجاب دعائي

میں چاہتا ہوں میری دعا قبول ہو جائے۔

فرمایا: طهرماً كلک ولا تدخل بطنك الحرام

اپنی غذا کو پاک رکھو اور دھیان رکھو کہ تمہارے بطن میں حرام غذا داخل نہ ہونے پائے۔

۲۔ اصلاح کنندہ تقیہ: مندرجہ بالا آیات کے الفاظ سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ اصحاب کف اس بات پر زور دیتے تھے کہ اس ماحول میں کسی کو ان کی پناہ گاہ کا پتہ نہ چلے کہ مبادا وہ لوگ انہیں بُت پرستی کا مذہب اختیار کرنے پر مجبور کریں یا پھر انہیں بُری طرح قتل کریں اور سنگسار کر دیں۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کی کسی کو خبر نہ ہو تاکہ آئندہ کی جدوجہد کے لیے یا کم از کم اپنے ایمان کی حفاظت کے لیے اپنی طاقت بچا کر رکھیں۔ یہ ایک قسم کا اصلاحی تقیہ ہے کیونکہ تقیہ کا مطلب ہے اپنی قوتوں کو فضول صرف ہونے سے بچانا اور اس کے لیے اپنے آپ کو چھپانا یا اپنے عقیدے کو چھپا کر اپنے آپ کو بچانا تاکہ ضرورت کے وقت مؤثر طریقے سے جدوجہد کی جاسکے۔

واضح ہے کہ جس مقام پر عقیدہ چھپانے سے ہدف اور پروگرام کو نقصان پہنچتا ہو وہاں تقیہ ممنوع ہے وہاں سب کچھ ظاہر کرنا چاہیے۔

ولو بلغ ما بلغ

پھر جو کچھ ہوتا ہے ہونے دو۔

۳۔ قرآن کا مرکز ”لطف“ ہے: مشورہ ہے کہ الفاظ کی گنتی کے لحاظ سے لفظ ”ولتلتطف“ میں قرآن کا درمیان ہے۔ یہ ایک لطف خاص ہے اور بہت لطیف معنی کا حامل ہے کیونکہ

۱۔ وسائل الشیخ ج ۳، الباب دعا، باب ۶۷، حدیث ۴۷۰۔ مزید تفصیل کے لیے تفسیر نمونہ جلد اول سورہ بقرہ کی آیت ۸۶ کی تفسیر کی طرف رجوع فرمائیں۔

یہ ”لطف“ اور ”لطافت“ کے مادہ سے لیا گیا ہے۔ یہاں یہ لفظ احتیاط اور باریک بینی سے کام لینے کے معنی میں لیا گیا ہے۔ یعنی غذا لانے کے لیے جانے والا شخص اس طرح سے جائے کہ کسی شخص کو ان کے بارے میں کوئی خبر نہ ہو۔

بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ یہاں مراد غذا خریدنے میں لطافت سے کام لینا ہے یعنی معاملہ کرنے میں سخت گیری نہ کرے اور ہلکا کھڑا نہ کر دے نیز بہترین چیز انتخاب کرے اور یہ بھی ایک لطف ہے کہ وسط قرآن کے لفظ میں لطف و لطافت کا مفہوم پوشیدہ ہے۔

۱۔ اس وقت ہم پروردگار کی عظیم توفیق سے پورے دس سال کے بعد قرآن مجید کی تفسیر کے نصف حصہ تک پہنچ گئے ہیں۔ اس پر ہم اللہ تعالیٰ کا شکر بجالاتے ہیں کہ اس دوران اگرچہ ہم اور ہمارے کلمتہ نہایت سخت حالات اور طوفان گزرے لیکن اس علاقے میں فورا سلام بجا نہیں بلکہ اس کا دامن وسیع ہوا ہے نیز اللہ کا شکر ہے کہ اس تفسیر کے لکھنے میں کوئی وقفہ پیش نہیں آیا ہے۔ لہذا ہمیں امید ہے کہ باقی ماندہ تفسیر (انشاء اللہ) زیادہ سرعت کے ساتھ تکمیل کے مراحل طے کرے گی۔

یہ شیک ہے کہ دس سال عموماً دیر نہیں ہوتے لیکن اب تک جو کام ہم نے اس تفسیر کے سلسلے میں انجام دیا ہے وہ بھی الحمد للہ کوئی چھوٹا سا نہیں۔

۲۱) وَكَذَلِكَ أَغْتَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوا أَن وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَأَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيهَا إِذْ يَتَنَازَعُونَ بَيْنَهُمْ أَمْرَهُمْ فَقَالُوا ابْنُوا عَلَيْهِم بُيُوتًا رَّبُّهُمْ أَعْلَمُ بِهِمْ قَالَ الَّذِينَ غَلَبُوا عَلَىٰ أَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِم مَّسْجِدًا ۖ سَيَقُولُونَ ثَلَاثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ وَيَقُولُونَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًا بِالْغَيْبِ وَيَقُولُونَ سَبْعَةٌ وَثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ قُلْ رَبِّي أَعْلَمُ بِعَدَّتِهِمْ مَا يَعْلَمُهُمْ إِلَّا قَلِيلٌ فَلَا تُمَارِ فِيهِمْ إِلَّا مِرَاءً ظَاهِرًا وَلَا تَسْتَفْتِ فِيهِمْ مِنْهُمْ أَحَدًا ۝

۲۳) وَلَا تَقُولَنَّ لِشَايٍ إِنِّي فَاعِلٌ ذَٰلِكَ غَدًا ۝
۲۴) إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ وَادْكُرْ رَبَّكَ إِذَا لَسَيْتَ وَقُلْ عَسَىٰ أَنْ يَهْدِيَنِّي رَبِّي لِأَقْرَبَ مِنْ هَٰذَا رَشْدًا ۝

ترجمہ

۲۱) اور ہم نے اس طرح سے لوگوں کو اُن کے حال سے مطلع کیا تاکہ وہ جان لیں کہ (قیامت کا) اللہ کا وعدہ حق ہے اور دنیا کے ختم ہو جانے اور قیامت کے برپا ہو جانے میں کوئی شک نہیں۔ اس وقت ان میں اس بارے میں نزاع پیدا ہو گیا۔ کچھ نے کہا کہ ان پر ایک عمارت بنا دی جائے (تاکہ وہ ہمیشہ کے لیے

نظروں سے اوجھل ہو جائیں اور ان کے بارے میں باتیں نہ کرو کہ) ان کا رب ان کی کیفیت سے بہتر آگاہ ہے (لیکن جنہیں اس راز سے آگئی نصیب ہوئی اور جنہوں نے اس واقعے کو قیامت کے لیے ایک دلیل سمجھا) ہم ان کے (مدفن کے) پاس ایک مسجد بنائیں گے (تاکہ انہیں بھلایا نہ جاسکے)۔

۲۲) بعض کہتے ہیں کہ وہ تین افراد تھے اور چوتھا ان کا کتا تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ پانچ افراد تھے اور چھٹا ان کا کتا تھا۔ یہ سب بلا دلیل باتیں ہیں بعض کہتے ہیں کہ وہ سات افراد تھے اور آٹھواں ان کا کتا تھا۔ کہہ دو کہ میرا رب ان کی تعداد سے بہتر آگاہ ہے۔ چند افراد کے سوا ان کی تعداد کو کوئی نہیں جانتا۔ لہذا ان کے بارے میں بغیر دلیل کے بات نہ کرو اور ان کے بارے میں کسی سے سوال نہ کرو۔

۲۳) اور ہرگز یہ نہ کہہ کہ میں کل فلاں کام انجام دوں گا۔
۲۴) مگر یہ کہ خدا چاہے اور اگر تو بھول جائے تو (اس کی تلافی کرتے ہوئے) اپنے رب کو یاد کرو اور کہہ: مجھے امید ہے کہ میرا رب مجھے اس سے زیادہ واضح رستے کی ہدایت کرے گا۔

تفسیر

اصحاب کھف کے واقعے کا اختتام

جلد ہی لوگوں میں ان مغیرہ جوانوں کی ہجرت کی داستان پھیل گئی۔ ظالم بادشاہ سیخ پا ہو گیا کہ ہمیں ایسا نہ ہو کہ ان کی ہجرت یا بھاگ نکلنا لوگوں کی بیداری اور آگاہی کا سبب بن جائے۔ اُسے یہ بھی خطرہ تھا کہ ہمیں وہ دُور یا نزدیک کے علاقے میں جاکر لوگوں کو دین توحید کی تبلیغ کرنے لگیں اور شرک و بت پرستی کی مخالفت جدوجہد شروع کر دیں۔ لہذا اس نے خاص افراد کو مامور کیا کہ انہیں ہر جگہ تلاش کیا جائے اور ان کا کچھ اتار پتہ معلوم

ہو تو گرفتاری کے لیے تعاقب کیا جائے اور انہیں سزا دی جائے۔

لیکن انہوں نے جتنی بھی کوشش کی کچھ نہ پایا اور یہ امر خود علاقے کے لوگوں کے لیے ایک عہد اور ان کے قلب و فکر کے لیے ایک خاص نقطہ بن گیا۔ نیز یہ امر کہ حکومت کے نہایت اہم چند اراکین نے ہر چیز کو ٹھوکر مار دی اور طرح طرح کے خطرات مول لے لیے شاید بعض لوگوں کی بیداری اور آگاہی کا سرچشمہ بن گیا۔ بہر حال ان افراد کی یہ حیران کن داستان ان کی تاریخ میں ثبت ہو گئی اور ایک نسل سے دوسری نسل کی طرف منتقل ہونے لگی اور اسی طرح اس مسئلے کو صدیاں گزر گئیں۔

آئیے اب دیکھتے ہیں کہ اُس پر کیا گزری جو غذا لینے کے لیے آیا۔ وہ شہر میں داخل ہوا تو اس کا مزہ تعجب سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ شہر کی عمارتوں کی شکل و صورت تمام تبدیل ہو چکی تھی، سب چہرے ناشناس تھے، لباس نئے انداز کے تھے یہاں تک کہ لوگوں کی بول چال اور رسم و رواج بھی بدل چکے تھے۔ کل کے دیوانوں پر آج محل تھے اور جہاں پہلے محل تھے وہاں دیرانے ہی دیرانے تھے۔

شاید تھوڑی دیر کے لیے اس نے سوچا ہو کہ ابھی میں نیند میں ہوں اور یہ جو کچھ دیکھ رہا ہوں سب خواب ہے۔ اُس نے اپنی آنکھوں کو خلا۔ وہ سب چیزوں کو پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ یہ کیسی حقیقت ہے کہ جس پر یقین نہیں کیا جاسکتا۔

اب وہ سوچنے لگا کہ وہ غار میں ایک یا آدھا دن سوئے ہیں تو پھر یہ اتنی تبدیلیاں اتنی مدت میں کیسے ممکن ہیں؟

دوسری طرف اس کا چہرہ مرہ اور حالت لوگوں کے لیے بھی عجیب اور غیر مانوس تھی۔ اس کا لباس اس کی گفتگو اور اس کا چہرہ سب نیا معلوم ہوتا تھا شاید اسی وجہ سے کچھ لوگ اس کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کے پیچھے چل پڑے۔

اُس وقت لوگوں کا تعجب انتہا کو پہنچ گیا جب اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا تاکہ اس کھانے کی قیمت ادا کرے جو اس نے خریدا تھا۔ دکاندار کی نگاہ سکتے پر پڑی وہ تین سو سال سے زیادہ پرانے دور کا تھا اور شاید اُس زمانے کے ظالم بادشاہ دقیانوس کا نام بھی اس پر کندہ تھا۔ جب اس نے وضاحت چاہی تو خریدار نے جواب میں کہا، میرے ہاتھ میں تو یہ سکہ ابھی تازہ ہی آیا ہے۔

قرآن اور احوال سے لوگوں کو آہستہ آہستہ یقین ہو گیا کہ یہ شخص تو انہی افراد میں سے ہے جن کا ذکر ہم نے تین سو سال پہلے کی تاریخ میں پڑھا ہے اور بہت سی مصلحتوں میں ہم نے جن کی پراسرار داستان سنی ہے۔

خود اسے بھی احساس ہوا کہ وہ اور اس کے ساتھی کسی گہری اور طولانی نیند میں مستغرق رہے ہیں۔ اس بات کی خبر جنگل کی آگ کی طرح سارے شہر میں اُن کی آن میں پھیل گئی۔

مورخین سمجھتے ہیں کہ اس زمانے میں ایک نیک اور خدا پرست بادشاہ حکومت کرتا تھا لیکن معاد جسمانی

اور موت کے بعد مردوں کے جی اٹھنے کے مسئلہ پر یقین کرنا وہاں کے لوگوں کے لیے مشکل تھا۔ ان میں سے ایک گروہ کو اس بات پر یقین نہیں آتا تھا کہ انسان مرنے کے بعد پھر جی اٹھے گا لیکن اصحاب کھٹ کی نیند کا واقعہ معاد جسمانی کے طرفداروں کے لیے ایک دنداں شکن دلیل بن گیا۔

اسی لیے زیر نظر پہلی آیت میں قرآن کہتا ہے: جیسے ہم نے انہیں سلا دیا تھا اسی طرح انہیں اس گہری اور طویل نیند سے بیدار کیا اور لوگوں کو اُن کے حال کی طرف متوجہ کیا تاکہ وہ جان لیں کہ قیامت کے بارے میں خدا کا وعدہ حق ہے (وَكَذَلِكَ اعْتَرَيْنَا عَلَيْهِمْ لَعَلَّوْا اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ)۔

اور دنیا کے خاتمے اور قیام قیامت میں کوئی شک نہیں (وَ اِنَّ السَّاعَةَ لَآتِيَةٌ فَيُفْهِمُ)۔ کیونکہ صدیوں پر محیط یہ لمبی نیند موت سے غیر مشابہ نہیں ہے اور ان کا بیدار ہونا قبروں سے اٹھنے کی مانند ہے بلکہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ سونا اور جاگنا کئی حوالوں سے مرنے اور پھر جی اٹھنے سے عجیب تر ہے کیونکہ وہ صدیوں سوئے رہے لیکن ان کا بدن بوسیدہ نہ ہوا جبکہ انہوں نے کچھ کھایا نہ پیا۔ تو پھر وہ اتنی لمبی مدت زندہ کس طرح رہے۔

کیا یہ اس بات کی دلیل نہیں کہ خدا ہر چیز اور ہر کام پر قادر ہے۔ ایسے منظر کی طرف نظر کی جائے تو موت کے بعد زندگی کا مسئلہ کوئی عجیب معلوم نہیں ہوتا بلکہ یقینی طور پر ممکن دکھائی دیتا ہے۔

بعض مورخین نے لکھا ہے کہ جو شخص غذا لینے شہر میں آیا تھا اُس نے یہ صورت دیکھی تو جلدی سے غار کی طرف پلٹا اور اپنے دوستوں کو سارا حال سنایا وہ سب کے سب گہرے تعجب میں ڈوب گئے۔ اب انہیں احساس ہوا کہ ان کے تمام بچے، بھائی اور دوست کوئی بھی باقی نہیں رہا اور ان کے احباب و انصار میں سے کوئی نہیں رہا۔ ایسے میں اُن کو یہ زندگی بہت سخت اور ناگوار لگی۔ لہذا انہوں نے اللہ سے دعا کی کہ اس جہان سے ہماری آنکھیں بند ہو جائیں اور ہم جوار رحمت حق میں منتقل ہو جائیں۔

ایسا ہی ہوا۔ اس دنیا سے انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ ان کے جسم غار میں پڑے تھے کہ لوگ ان کی تلاش کو نکلے۔

اس مقام پر معاد جسمانی کے طرفداروں اور مخالفوں کے درمیان بحثیں شروع ہو گئی۔ مخالفین کی کوشش تھی کہ لوگ اصحاب کھٹ کے سونے اور جاگنے کے مسئلہ کو جلد بھول جائیں لہذا انہوں نے تجویز پیش کی کہ غار کا دروازہ بند کر دیا جائے تاکہ وہ ہمیشہ کے لیے لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو جائیں (اذ يَتَشَاوَعُونَ مَبْنِیْہُمْ اَمْہُمْ فَقَالُوا اٰیْتِنَا عَلٰیہُمْ بَیِّنَاتٍ)۔

وہ لوگوں کو خاموش ہونے کے لیے کہتے تھے کہ ان کے بارے میں زیادہ باتیں نہ کرو، ان کی داستان اسرار آمیز ہے۔ ان کا پروردگار ان کی کیفیت سے زیادہ آگاہ ہے (رَبُّہُمْ اَعْلَمُ بِہُمْ)۔ لہذا ان کا قصہ ان تک رہنے دو اور انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو۔

جبکہ حقیقی مومن کہ جنہیں اس واقعے کی خبر ہوئی اور جو اسے قیامت کے حقیقی مفہوم کے اثبات کیلئے ایک زندہ دلیل سمجھتے تھے، ان کی کوشش تھی کہ یہ واقعہ ہرگز فراموش نہ ہونے پائے۔ لہذا انہوں نے کہا: ہم ان کے مدفن کے پاس مسجد بناتے ہیں تاکہ لوگ انہیں اپنے دلوں سے ہرگز فراموش نہ کریں علاوہ ازیں ان کی ارواح پاک سے لوگ استمداد کریں (قال الذین غلبوا علی امرہم لنتخذن علیہم مسجدًا)۔

اس آیت کی تفسیر میں کئی اور احتمال بھی پیش کیے گئے ہیں۔ چند اہم نکات کے زیر عنوان ہم ان میں سے بعض کی طرف اشارہ کریں گے۔

اگلی آیت میں ان چند اختلافات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جو اصحاب کف کے بارے میں لوگوں میں پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک ان کی تعداد کے بارے میں ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ تین تھے اور چوتھا ان کا کتا تھا (سیقولون ثلاثہ رابعہم کلبہم)۔

بعض کہتے ہیں کہ وہ پانچ تھے اور چھٹا ان کا کتا تھا (ویقولون خمسہ سادسہم کلبہم)۔

یہ سب بلا دلیل باتیں ہیں اور اندھیرے میں تیر چلانے کے مترادف ہیں (رجمًا بالغیب)۔

اور بعض کہتے ہیں کہ وہ سات تھے اور آٹھواں ان کا کتا تھا (ویقولون سبعۃ وثامنہم کلبہم)۔

کہہ دے: میرا رب ان کی تعداد بہتر جانتا ہے (قل رب اعلم بعد تمہم)۔

صرف تھوڑے سے لوگ ان کی تعداد جانتے ہیں (ما یعلمہم الا قلیل)۔

قرآن نے ان جملوں میں اگرچہ صراحت سے ان کی تعداد بیان نہیں کی لیکن آیت میں موجود بعض اشاروں سے سمجھا جاسکتا ہے کہ تیسرا قول صحیح اور مطابقت ہے کیونکہ پہلے اور دوسرے قول کے بعد رجما بالغیب

(اندھیرے میں تیر دانا) آیا ہے کہ جو ان اقوال کے بے بنیاد ہونے کی طرف اشارہ ہے لیکن تیسرے قول

کے بارے میں نہ صرف ایسی کوئی تعبیر نہیں بلکہ اس کے ساتھ ہی فرمایا گیا ہے: کہہ دے: میرا رب ان کی تعداد

سے بہتر طور پر آگاہ ہے اور یہ بھی فرمایا گیا ہے: ان کی تعداد کو تھوڑے سے لوگ جانتے ہیں: یہ جملے بھی اس

تیسرے قول کی صداقت پر دلالت کرتے ہیں۔

بہر حال آیت کے آخر میں مزید فرمایا گیا ہے: استدلالی اور منطقی گفتگو کے علاوہ ان کے بارے میں بحث

نکر (فلا تمار فیہم الامراء ظاہرًا)۔

جیسا کہ راغب نے مفردات میں کہا ہے: "مراد: مریۃ الناقۃ" (میں نے دودھ دہنے کے لیے

اونٹنی کا پستان کا ہاتھ میں پکڑا) سے لیا گیا ہے۔ بعد ازاں کسی ایسی چیز کے بارے میں بحث کرنے کے معنی میں

استعمال ہونے لگا کہ جس میں شک ہو اور اکثر یہ لفظ باطل کی حمایت میں ہٹ دھرمی کی گفتگو کے معنی میں استعمال

ہوتا ہے لیکن بنیادی طور پر یہ لفظ اس مفہوم کے لیے محدود نہیں ہے لیکن کسی بھی ایسی بات کے بارے میں بحث

کے مفہوم میں آتا ہے کہ جس کے بارے میں شک ہو۔

ظاہرًا۔ غالب، مسلط اور کامیاب کے معنی میں ہے۔

لہذا "فلا تمار فیہم الامراء ظاہرًا" کا مفہوم یہ ہے کہ ان کے ساتھ اس طرح سے منطقی اور استدلالی گفتگو نہ کر کہ تیری منطق کی برتری واضح ہو۔

اس آیت کی تفسیر میں بعض نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ ہٹ دھرم مخالفین سے علیحدگی میں بحث نہ

کر کیونکہ اس طرح تو ان سے جو کچھ کہے گا وہ اس میں رد و بدل کریں گے لہذا ان سے کھلم کھلا لوگوں کی موجودگی

میں بات چیت نہ کرنا کہ وہ حقیقت میں تخریب و انکار نہ کر سکیں۔

لیکن پہلی تفسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

بہر حال اس گفتگو کا مفہوم یہ ہے کہ وحی خدا پر بھروسہ کرتے ہوئے "تو ان کے ساتھ بات کر کیونکہ اس سلسلے

میں حکم ترین دلیل یہی ہے لہذا جو لوگ بغیر دلیل کے اصحاب کف کی تعداد کے بارے میں بات کرتے ہیں ان سے

اس بارے میں سوال نہ کر (ولا تستفت فیہم منہم احدًا)۔

اگلی آیت میں رسول اللہ کو ایک عمومی حکم دیا گیا ہے: کبھی نہ کہو کہ میں کل یہ کام کروں گا (ولا تقولن لشیء

انی فاعل ذلک غذا)۔ مگر یہ کہ خدا چاہے (الا ان یشاء اللہ)۔

یعنی آئندہ کی خبروں اور کاموں کے ارادے میں "انشاء اللہ" حتمی طور پر کہا کر دیکھو،

اولاً۔ ارادہ کرنے میں ہرگز تم مستقل نہیں کیونکہ خدا نہ چاہے تو کوئی شخص بھی کسی کام کی طاقت نہیں رکھتا

لہذا یہ واضح کیا کر دو کہ تمہاری قوت اس کی لایزال قوت سے ہے اور تمہاری طاقت اس کی قدرت سے وابستہ

ہے۔ اس لیے لازمی طور پر "انشاء اللہ" (اگر خدا نے چاہا تو) کہا کر دو۔

ثانیاً۔ ایسا انسان کہ جس کی طاقت محدود ہو اور راہ میں رکاوٹیں پیدا ہونے کا احتمال بھی ہو اس کیلئے

صحیح نہیں ہے کہ وہ آئندہ کی کوئی یقینی اور قطعی خبر دے جبکہ بعض اوقات اچانک بغیر متوقع رکاوٹیں پیدا ہو جاتی

ہیں۔ لہذا ایسی باتوں کے ساتھ "انشاء اللہ" کہنا چاہیے۔

زیر بحث آیت کی تفسیر میں بعض مفسرین نے ایک اور احتمال ذکر کیا ہے اور وہ یہ کہ یہاں مراد یہ

ہے کہ اس بات کی نفی کی جائے کہ انسان کو کاموں کی انجام دہی میں استقلال حاصل ہے۔ لہذا اس آیت

کا مفہوم یہ ہے:

تو یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں کل یہ کام کروں گا۔ مگر یہ کہ خدا چاہے۔

البتہ اس تفسیر کا لازمہ یہ ہے کہ اگر ہم "انشاء اللہ" کا اضافہ کر دیں تو گفتگو مکمل ہو جائے گی لیکن یہ جملے کا

لازمہ ہے نہ کہ متن اور اصل جملے کا مفہوم ہے جیسا کہ پہلی تفسیر میں کہا گیا ہے نہ

تو کہ وہ پہلی تفسیر کی بنا پر "ان تقول" "مقدور مانا پڑے گا۔ تقدیر یوں ہوگی:

الا ان تقول انشاء اللہ

لیکن دوسری تفسیر میں تقدیر کی ضرورت نہیں ہے۔

زیر بحث آیات کے بارے میں ہم نے جو شان نزول نقل کی ہے وہ پہلی تفسیر کی تائید کرتی ہے کیونکہ رسول اللہؐ نے "انشاء اللہ" کے بغیر اصحاب کف سے متعلق سوال کرنے والوں کو جواب دیا تھا۔ اسی لیے ایک مرتبہ تک وحی الہی میں تاخیر ہوگئی تاکہ اس بارے میں آپؐ کو متوجہ کیا جائے اور آپؐ اس سلسلے میں سب کے لیے نمونہ بن جائیں۔

اس جملے کے بعد قرآن کہتا ہے: اگر تو بھول جائے تو پھر اپنے رب کو یاد کر (واذکر ربک اذانیبت)۔ یہ جملہ اس طرف اشارہ ہے کہ آئندہ کے امور کے بارے میں بات کرتے ہوئے "انشاء اللہ" کہنا بھول جائے تو جس وقت یاد آئے فوراً تلافی کر اور "انشاء اللہ" کہو۔ یہ کہنے سے گزشتہ کی تلافی ہو جائے گی۔ اور کہہ: مجھے امید ہے کہ میرا رب مجھے اس سے زیادہ واضح راستے کی ہدایت کرے گا (وقل عسیٰ ان یمدین ربی لا اقرب من ہذا ارشداً)۔

چند اہم نکات

۱۔ "رجماً بالغیب" کا مفہوم: "رجم" دراصل "پتھر" یا "پتھر پھینکے" کے معنی میں ہے۔ بعد ازاں یہ لفظ ہر قسم کی تیر اندازی کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ کہیں یہ لفظ کٹائے کے طور پر الزام لگانا یا تمہمت لگانے کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ نیز گمان کی بنیاد پر فیصلہ کرنے کے مفہوم میں بھی استعمال ہونے لگا۔ لفظ "بالغیب" اس معنی کی تائید کے لیے ہے یعنی عدم موجودگی میں بغیر کسی ماخذ و دلیل کے کسی چیز کے بارے میں فیصلہ کرنے کو کہتے ہیں۔

یہ بالکل ایسے ہے جیسے فارسی میں کہتے ہیں:

تیر در تاریکی انداختن

اندھیرے میں تیر مارنا۔

اندھیرے میں عموماً تیر صیغ نشانے پر نہیں لگتا اسی طرح اس قسم کا فیصلہ بھی عموماً صیغ نہیں ہوتا۔

۲۔ "وٹامنہو کلہم" میں واؤ: زیر نظر آیات میں "وٹامنہو کلہم" اور "سادسہم کلہم" دونوں جملے بغیر واؤ کے آئے ہیں جبکہ "وٹامنہو کلہم" واؤ کے ساتھ شروع ہوتا ہے اور ستر آن کی ہر تعبیر میں چونکہ کوئی نہ کوئی حکمت اور مقصد پوشیدہ ہے لہذا مفسرین نے اس واؤ کے بارے میں بہت کچھ کہا ہے۔

۳۔ اس قسم کے خطاب جو باری تعالیٰ کے لیے گئے ہیں اور اہمیت ہے لہذا شان نزول کا یہ حصہ کہ "آپؐ نے انشاء اللہ" کا اس لیے کچھ حصہ وحی کا سلسلہ رکھا۔ صیغ معلوم نہیں ہوتا۔ (مترجم)

شاید ان میں سے بہترین تفسیر یہ ہو کہ یہ واؤ آخری بات اور آخری حرف کی طرف اشارہ ہے جیسے موجود زمانے کے ادب میں بھی یہ طریقہ عام ہو گیا ہے کہ چیزوں کو شمار کرتے وقت سب کو بغیر واؤ کے ذکر کرتے ہیں لیکن آخری کا ذکر لازمی طور پر واؤ کے ساتھ کرتے ہیں مثلاً:

زید، عمر، حسن و محمد آئے۔

(اُردو میں واؤ کی بجائے اور استعمال ہوتا ہے (مترجم)۔)

یہاں پر واؤ کلام کے اختتام اور آخری شخص یا چیز کے بیان کی طرف اشارہ ہے۔

یہی بات مشہور مفسر ابن عباس سے منقول ہے۔ بعض دیگر مفسرین نے بھی اس کی تائید کی ہے نیز انہوں نے اسی واؤ سے اس امر کی تائید کے لیے بھی استفادہ کیا ہے کہ اصحاب کف کی حقیقی تعداد سات تھی کیونکہ اس کے علاوہ اقوال کو بے بنیاد قرار دے کر قرآن نے ان کی حقیقی تعداد کو آخر میں بیان کیا ہے۔ بعض دوسرے مفسرین مثلاً خوارزمی اور قرطبی نے اس واؤ کی ایک اور تفسیر نقل کی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے:

سات کا عدد عربوں میں ایک مکمل عدد شمار ہوتا ہے۔ اسی لیے سات کے عدد تک بغیر واؤ کے ذکر کرتے ہیں لیکن جب اس عدد سے آگے بڑھتے ہیں تو واؤ استعمال کرتے ہیں کہ جو ابتدائے کلام کی دلیل ہے۔ اسی لیے ادباء عرب کی زبان میں یہ "واؤ ثانیہ" مشہور ہوگئی۔

آیات قرآن میں بھی عموماً اسی طرح دیکھا گیا ہے۔ مثلاً سورہ توبہ کی آیت ۱۱۲ میں جہاں راہِ خدا کے مجاہدین کی صفات شمار کی گئی ہیں وہاں سات صفات تو واؤ کے بغیر آئی ہیں لیکن جب قرآن انھوں صفات پر پہنچتا ہے تو کہتا ہے:

وَالشَّاهِدُونَ عَلَى الْمُنَافِقِينَ وَالْحَافِظُونَ لِحُدُودِ اللَّهِ

اور برائیوں سے روکنے والے اور حدود اللہ کی حفاظت کرنے والے۔

اسی طرح سورہ تحریم کی آیت ۵ میں ازواجِ پیغمبر کی صفات بیان کرتے ہوئے ساتویں صفت کے بعد انھوں صفات کا ذکر واؤ کے ساتھ کیا گیا ہے:

شَدِيدَاتٍ وَأَبْكَارًا

بیوائیں اور کنواریاں

نیز سورہ زمر کی آیت ۱۱ میں جنم کے درد ازل کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

فَبَتَحْتَ أَبْوَابِهَا

اس کے درد ازل سے کھول دیئے جائیں گے۔

لیکن دو آیتوں کے بعد جس وقت جنت کے درد ازل کے بارے میں گفتگو ہوتی ہے تو فرمایا گیا ہے:

وَفَتَحَتْ أَبْوَابَهَا

اور اس کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔

یہاں اس بنا پر نہیں ہے کہ جہنم کے دروازے سات ہیں اور جنت کے دروازے آٹھ ہیں۔ البتہ شاید یہ کوئی کلی قانون نہ ہو لیکن زیادہ تر مواقع پر ایسا ہی ہے۔ بہر حال یہ بات اس امر کی نشاندہی کرتی ہے کہ قرآن میں ایک داؤد نمک کا وجود بھی محسوس حساب کتاب کے تحت ہے اور کسی حقیقت کے بیان کے لیے ہے۔

۳۔ آرام گاہ کے پاس مسجد: تفسیر قرآن کا ظاہری مضمون یہ ہے کہ آخر کار اصحاب کف نے زندگی کو خیر باد کہا اور سپردِ خاک ہوئے اور غلط۔ علیہم۔ (ان پر) اس دعویٰ کی دلیل ہے۔

اس کے بعد ان کے حدیث مندوں نے ارادہ کیا کہ ان کی آرام گاہ کے پاس عبادت خانہ بنائیں۔ قرآن نے زیر بحث آیات میں ان کے اس ارادے کو موافقت کے بجائے میں بیان کیا ہے۔ یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ بزرگانِ دین کی قبور کے احترام میں وہابیوں کے خیال کے برعکس مسجد اور عبادت خانہ بنانا نہ صرف حرام نہیں ہے بلکہ اچھا اور پسندیدہ کام ہے۔

اصولی طور پر ایسی عمارتیں کہ جو اہم اور عظیم شخصیات کی یاد کو زندہ رکھیں ان کی تعمیر کا سلسلہ ہمیشہ سے ساری دنیا کے لوگوں میں رہا ہے اور آج بھی ہے۔ دراصل اس کام سے ان بزرگوں کے بارے میں ایک طرح سے قدر دانی اور احسان شناسی کا اظہار ہوتا ہے نیز جیسے کام انہوں نے کیے ان سے ان کی طرف رغبت اور شوق دلانے کا مضمون بھی اس میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ اسلام نے نہ صرف اس کام سے منع نہیں کیا بلکہ اسے جائز شمار کیا ہے۔

اس قسم کی عمارتوں کا وجود ایسی شخصیتوں، ان کے کام اور ان کی تاریخ کے لیے ایک تاریخی سند ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جن انبیاء و سرسلین اور دیگر شخصیات کی قبریں نہیں ملتیں ان کی تاریخ بھی مشکوک ہو گئی ہے اور ایک سوال بن کر رہ گئی ہے۔

یہ بھی واضح ہے کہ اس قسم کی عمارات ہرگز توحید کی نفی نہیں کرتیں اور نہ ہی ان کے وجود سے اس بات کی ذرہ بھر نفی ہوتی ہے کہ عبادت فقط اللہ کے لیے مخصوص ہے کیونکہ احترام کرنا اور سہ اور عبادت کرنا اور سہ۔

البتہ یہ ایک طویل بحث ہے جس کا یہ موقع نہیں ہے۔

۴۔ تمام چیزیں مشیتِ الہی کے سہارے پر ہیں: آئندہ سے مربوط ارادے اور کام کے ساتھ۔ انشاء اللہ۔ کمنا نہ صرف بارگاہِ خداوندی کے لیے ادب و احترام کا اظہار ہے بلکہ اس اہم حقیقت کا بیان بھی ہے کہ ہم اپنی طرف سے کچھ بھی نہیں رکھتے، جو کچھ ہے اسی کی طرف سے ہے۔ مستقل بالذات

خدا ہے اور ہم سب اسی کے سہارے پر ہیں۔ اگر ساری دنیا کی تلواریں چل پڑیں لیکن اللہ کا ارادہ نہ ہو تو وہ ایک رگ بھی نہیں کاٹ سکتیں اور اگر اس کا ارادہ ہو تو ہر چیز تیزی سے واقع ہو جائے یہاں تک کہ وہ آئینے کو پتھر کے پیلو میں محفوظ رکھ سکتا ہے۔

یہ درحقیقت توحیدِ افعالی کا مضمون ہے۔ یعنی اگرچہ انسان ارادہ، اختیار اور آزادی رکھتا ہے لیکن ہر چیز اور ہر کام اللہ کی مشیت کے ساتھ وابستہ ہے۔

یہ تعبیر ہمیں کاموں میں خدا کی طرف زیادہ توجہ دلانے کے علاوہ طاقت و ہمت بھی بخشتی ہے اور عمل کی پاکیزگی اور صحت کی دعوت بھی دیتی ہے۔

چند ایک روایات میں ہے کہ اگر کوئی شخص آئندہ کے بارے میں کوئی بات انشاء اللہ کے بغیر کہے تو اللہ تعالیٰ اسے اس کی حالت پر چھوڑ دیتا ہے اور اپنی حمایت اس سے اٹھا لیتا ہے۔

امام صادق علیہ السلام سے ایک حدیث مروی ہے۔ اس میں ہے:

انام نے ایک خط لکھنے کا حکم دیا۔ خط اختتام کو پہنچا تو آپ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ انام نے دیکھا کہ اس میں۔ انشاء اللہ۔ نہیں تھا، تو فرمایا:

کیف رجوتہم ان یتیم ھذا ولیس فیہ استثناء، انظر واصل موضع لایکون فیہ استثناء فاستثنای فیہ

تمہیں اس کے انجام پا جانے کی امید کیسے ہوئی جبکہ اس میں انشاء اللہ نہیں تھا۔ اس میں دیکھو جہاں جہاں پر (ضرورت ہے اور) نہیں ہے وہاں وہاں پر انشاء اللہ لکھو۔

۵۔ ایک سوال کا جواب: زیر بحث آیات میں ہم نے پڑھا ہے کہ اللہ نے اپنے رسول سے فرمایا کہ جس وقت خدا کو بھول جاؤ اور پھر تمہیں یاد آئے تو اسے یاد کرو۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ اگر انشاء اللہ کہنے کی صورت میں اس کی مشیت پر ہر دوسرے نہ کرو تو جس وقت تمہیں یاد آئے اس کی تلاقی کرو۔

اس آیت کی تفسیر میں اہل بیت علیہم السلام سے جو متعدد روایات منقول ہیں ان سے بھی اس مضمون پر تاکید ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ اگر ایک سال گزرنے کے بعد بھی تمہیں یاد آئے کہ انشاء اللہ نہیں کہا تھا تو گزشتہ کی تلاقی کرو۔

اس وقت یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیسے ممکن ہے کہ رسول اللہ بھول گئے ہیں حالانکہ اگر ان کی فکر و نظر میں نسیان آجائے تو ان کی گنت رادر اعمال پر کامل اعتماد نہیں کیا جاسکتا اور انبیاء و ائمہ کے خطا اور نسیان

سے معصوم ہونے کی یہی دلیل ہے یہاں تک کہ موضوعات خارجیہ میں بھی۔

لیکن اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ بہت سی قرآنی آیات میں ہم نے دیکھا ہے کہ روئے سخن انبیاء کی طرف ہے لیکن مقصود منظور عام لوگ ہوتے ہیں۔ اس بات سے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے۔ اس طرح کی گفتگو کے لیے عربوں کی مشہور ضرب المثل ہے :

ایاک اعنی واسمعی یا جارة

میری مراد تو ہے جو میرے پاس ہے اور اسے پڑوسن تو بھی سن لے گا

(بعض بزرگ مفسرین نے اس سوال کا ایک اور جواب دیا ہے جہم سورہ انعام کی آیت ۶۸ کے ذیل میں بیان کر آئے ہیں۔ پانچویں جلد کی طرف رجوع کیجئے۔)

۲۵) وَلَبِثُوا فِي كَهْفِهِمْ ثَلَاثَ مِائَةٍ سِنِينَ
وَارْدَادًا تِسْعًا ○

۲۶) قُلِ اللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوا لَهُ غَيْبُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ
أَبْصَرُ بِهِ وَأَسْمَعُ مَا لَهُمْ مِنْ دُونِهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا يُشْرِكُ
فِي حُكْمِهِ أَحَدًا ○

۲۷) وَاتْلُ مَا أُوحِيَ إِلَيْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ
وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُونِهِ مُلْتَحَدًا ○

ترجمہ

۲۵) وہ اپنی غار میں تین سو سال سے نو سال اوپر ٹھہرے رہے۔

۲۶) کہہ دے : ان کے قیام کی مدت سے خدا زیادہ آگاہ ہے، آسمانوں اور زمین کے پوشیدہ امور سے وہی واقف ہے واقعہ کیا خوب دیکھنے والا اور سننے والا ہے۔ اس کے علاوہ ان کا کوئی ولی دوسر پرست نہیں ہے اور کوئی شخص اس کے حکم میں شریک نہیں ہے۔

۲۷) جو کچھ کتاب میں سے تیرے رب کی طرف سے تجھ پر وحی کیا گیا ہے اس کی تلاوت کر، کوئی اس کے فرمودات بدل نہیں سکتا اور اس کے علاوہ تجھے کوئی پناہ گاہ نہیں ملے گی۔

۱۔ فارسی میں اس کے متبادل یہ ضرب المثل ہے،

در جوی گویم دیوار تو بشنو

اسے دروازے تجھے کہت ہوں اور اسے دیوار تو سن لے۔

۲۔ اردو میں اس کے لیے یہ ضرب المثل ہے :

کہوں دھی کو ہو تو کان رکھو

نیز پنجابی زبان میں اس مفہوم کو شاید سب سے عمدہ ادا کیا گیا ہے :

بھنیاں دھی نوں تے مٹانیاں نوں نوں

(شاقبہ)

تفسیر

اصحاب کھف کی نیند

گزشتہ آیات میں موجود قرائن سے اجمالاً معلوم ہوتا ہے کہ اصحاب کھف کی نیند بہت لمبی تھی۔ یہ بات ہر شخص کی حسرت جو کو ابھارتی ہے۔ ہر شخص جانتا چاہتا ہے کہ وہ کتنے برس سوئے رہے۔ زیر نظر آیات اس داستان کی قرآن حکیم میں آخری آیات ہیں۔ ان آیات میں تردد ختم کرتے ہوئے اس سوال کا جواب دیا گیا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: وہ اپنی غار میں تین سو سے نو برس زیادہ سوئے رہے (ولبتوا فی کھفہم ثلاثا مائۃ سنین وازدادوا تسعا)۔

اس لحاظ سے وہ کل تین سو نو سال غار میں سوئے رہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ تین سو نو سال کہنے کی بجائے یہ جو کہا — کہ نو سال اس سے زیادہ — یہ شمسی اور قمری سالوں کے فرق کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ شمسی حساب سے وہ تین سو سال رہے اور کہ جو قمری حساب سے تین سو نو سال ہوئے اور یہ تعبیر کا ایک لطیف پہلو ہے کہ ایک جزوی تعبیر کے ذریعے عبادت میں ایک اور وضاحت طلب حقیقت بیان کر دی جاتے رہے۔

اس کے بعد اس بارے میں لوگوں کے اختلاف اب آرا کو ختم کرنے کے لیے فرمایا گیا ہے: کہ بے خدا ان کے قیام کی مدت کو بہتر جانتا ہے (قل اللہ اعلم بما لبثوا)۔ کیونکہ آسمانوں اور زمین کے غیب کے احوال اس کے سامنے ہیں اور وہ ہر شے کی نسبت انہیں زیادہ جانتا ہے (لہ غیب السماوات والارض)۔ اور جو کل کائنات ہستی سے باخبر ہے کیونکہ ممکن ہے کہ وہ اصحاب کھف کے غار میں قیام کی مدت سے آگاہ نہ ہو۔

واقعاً وہ کیا خوب دیکھنے والا اور سننے والا ہے (البصیر بہ واس)۔

۱۔ قواعد نمونہ کے مطابق بیان سنیں (یع) کی بجائے سنہ (مزد) آنا چاہیے لیکن چونکہ یہ بہت طویل نیند تھی اور برسوں کی تعداد بہت زیادہ تھی اس بات کو ظاہر کرنے کے لیے جمیع کا میضہ استعمال ہوا ہے تاکہ اس سے کثرت ظاہر ہو۔

۲۔ شمسی اور قمری سال کا فرق گیارہ دن کا ہے۔ اگر گیارہ کو تین سے ضرب دیں اور پھر جواب کو تیسری سال کے دنوں میں ۳۵۴ پر تقسیم کریں تو نتیجہ نوی ہوگا (البستہ جو کچھ باقی بچے گا وہ چونکہ ایک سال سے کم مدت ہے لہذا نظر انداز کرنے کے قابل ہے)۔

۳۔ البصیر بہ واسیع۔ یہ تعجب کے صفے ہیں اور عظمت خدا ظاہر کرنے کے لیے استعمال ہوئے ہیں یعنی وہ اس قدر بڑا اور شہنا ہے کہ انسان حیرت میں ڈوب جاتا ہے۔

لہذا آسمانوں اور زمین کے باسیوں کا اس کے علاوہ کوئی اور سرپرست نہیں ہے (مالہو من دونہ من ولی)۔

یہ کہ "مالہو" کی تفسیر کن لوگوں کی طرف ٹوٹی ہے، اس سلسلے میں مفسرین میں اختلاف ہے۔

بعض کا خیال ہے کہ یہ آسمان و زمین کے ساکنین کی طرف اشارہ ہے۔

بعض دوسرے کہتے ہیں کہ یہ اصحاب کھف کی طرف اشارہ ہے یعنی اصحاب کھف کا اس کے علاوہ کوئی ولی و سرپرست نہیں تھا۔ وہی تھا کہ جو اس ساری صورت حال میں ان کے ساتھ تھا اور ان کی حمایت کرتا تھا۔

البتہ اس سے پہلے جملے کی طرف توجہ کریں تو اس میں آسمانوں اور زمین کے پوشیدہ احوال کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس زیر بحث جملے کے بارے میں پہلی تفسیر زیادہ صحیح دکھائی دیتی ہے۔

آیت کے آخر میں مزید فرمایا گیا ہے: اور کوئی شخص حکم خدا میں شریک نہیں ہے (ولا یشرک فی حکمہ احداً)۔

درحقیقت یہ اللہ کی ولایت مطلقہ کے بارے میں تاکید ہے کہ کوئی اور عالمین پر ولایت رکھتا ہے اور نہ کوئی ولایت میں شریک ہے۔ یعنی استقلال و اشتراک دونوں لحاظ سے کوئی دوسرا اس عالم امکان کی ولایت میں نفوذ نہیں رکھتا۔

زیر نظر آخری آیت میں روئے سخن پیغمبر اکرم کی طرف کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے، جو کچھ کتاب خدا میں ہے تجھ پر وحی کیا گیا ہے اُس کی تلاوت کر (واقل ما اوحی الیک من کتاب ربک)۔

اور ادر ادر ادر کی دروغ آمیز اور بے بنیاد باتوں کی پرواہ نہ کر۔ ان امور میں تجھے صرف وحی خدا پر ہرگز کرنا چاہیے۔ کیونکہ کوئی چیز اس کی باتوں کو بدل نہیں سکتی اور اس کی بات (اور اس کی معلومات) میں تبدیلی ممکن نہیں ہے (لا یبدل لکلماتہ)۔

اس کا علم اور کلام بندوں کے علم اور کلام کی طرح نہیں ہے کہ جو ہر روز نئے انکشاف اور آگاہی کی ڈچ سے تبدیل ہوتا رہے۔ اسی لیے بندوں کے علم اور کلام پر سو فیصد اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔

اسی درجہ سے تجھے اس کے علاوہ کوئی اور پناہ گاہ نہیں ملے گی (ولن تجد من دونہ ملجئاً)۔

۱۔ ملجئ۔ ملجئ۔ (بروزن)۔ مہد۔ اس گڑھے کے معنی میں ہے جو درمیان سے کسی ایک جانب جھکا ہو (اس لحد کی طرح جو قبر کے لیے بنائی جاتی ہے) اسی لیے ملجئ۔ اس جگہ کو کہتے ہیں جس کی طرف انسان مائل ہو۔ بعد ازاں یہ لفظ ملجاء اور پناہ گاہ کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔

یہ بات توجہ طلب ہے کہ زیر بحث آخری دو آیات میں ان لحاظ سے تمام موجودات عالم پر خدا کا احاطہ ملی بیان کیا گیا ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے، آسمانوں اور زمین کے پوشیدہ امور اس کے سامنے ہیں لہذا وہ ان سب سے آگاہ ہے۔
پھر یہ فرمایا گیا ہے، صرف وہی دلی و سر پرست ہے اور وہ سب سے زیادہ آگاہ ہے۔
نیز اضافہ کیا گیا ہے، کوئی بھی اس کے حکم میں شریک نہیں ہے کہ جس کے باعث اس کا علم محدود ہو۔
اس کے بعد فرمایا گیا ہے، اس کے علم اور کلام میں تبدیلی نہیں ہوتی کہ اس کی قدر و قیمت اور
ثبات میں کمی واقع ہو۔
آخری جملے میں ہے، "عالم میں واحد پناہ گاہ اسی کی ذات ہے" لہذا واضح ہے کہ وہ تمام پناہ لینے
والوں سے آگاہ ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ داستان اصحاب کف احادیث کی روشنی میں، اصحاب کف کے بارے میں منابع
اسلامی میں بہت زیادہ روایات دکھائی دیتی ہیں۔ ان میں سے بعض اسناد کے لحاظ سے قابل اعتماد نہیں ہیں۔
اسی لیے ان میں سے بعض میں باہم تضاد و اختلاف نظر آیا ہے۔
ایک روایت جو علی بن ابراہیم قمی نے اپنی تفسیر میں ذکر کی ہے وہ متن، مضمون اور آیات قرآن سے
ہم آہنگی کے اعتبار سے بہتر معلوم ہوتی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ امام صادق علیہ السلام نے اصحاب
کف و رقیم کے بارے میں فرمایا،

وہ ایک جابر اور ظالم بادشاہ کے زمانے میں تھے۔ وہ بادشاہ اپنے ملک کے باسیوں کو
بت پرستی کی دعوت دیتا تھا۔ جو شخص اس کی یہ دعوت قبول نہ کرتا اسے قتل کر دیتا تھا۔
اصحاب کف یا ایمان افراد تھے اور خدا نے بزرگ کی عبادت کرتے تھے (البتہ اس ظالم بادشاہ
سے اپنا ایمان چھپائے ہوئے تھے)۔

اس ظالم بادشاہ نے اپنے پایہ تخت کے دروازے پر کچھ لوگ مامور کر رکھے تھے۔ ان کے ذمہ
تھا کہ شہر سے جانے والا ہر شخص وہاں پرے ہوئے بتوں کو سجدہ کرنے پر مجبور تھا۔
جیسے بھی جو سکا یہ یا ایمان افراد شکار کھیلنے کے بہانے شہر سے باہر آتے (ان کا پکا ارادہ تھا کہ
اپنے اس شہر میں واپس نہ جائیں کہ جہاں کا ماحول بہت آلودہ تھا)۔

راستے میں ان کی ملاقات ایک چرواہے سے ہو گئی انہوں نے اسے خدا کے واحد کی طرف
دعوت دی۔ اس نے قبول نہ کی لیکن تعجب کی بات ہے کہ چرواہے کا کتا ان کے پیچھے ہولیا
پھر ان سے بالکل جدا نہ ہوا۔ وہ بت پرستی سے جھاگ کر نکلے تھے۔ دن ڈھل رہا تھا کہ ایک غار
کے پاس پہنچے۔ وہ اس میں کچھ دیر استراحت کے لیے ٹھہر گئے۔ اللہ نے ان پر نیند مسلط کر دی

جیسا کہ قرآن فرماتا ہے، ہم نے انہیں سالہا سال نیند میں مستغرق رکھا۔
وہ ایسے عجیب خواب رہے کہ وہ ظالم بادشاہ مر گیا۔ شہر کے لوگ بھی یکے بعد دیگرے دنیا سے
چل بسے۔ دور بدل گیا اور لوگ بھی بدل گئے۔ اس طویل نیند کے بعد اصحاب کف جاگے تو ایک
دوسرے سے اپنی نیند کی مدت کے بارے میں پوچھنے لگے۔ ان کی نظر سورج پر پڑی تو وہ ادبنا
ہو چکا تھا تو کہنے لگے کہ ہم ایک دن یا دن کا کچھ حصہ سوئے ہیں۔

اس کے بعد انہوں نے اپنے میں سے ایک سے کہا، یہ چاندی کا سکہ لے جاؤ اور چپکے
سے شہر چلے جاؤ، وہاں سے ہمارے لیے کھانا لے آؤ لیکن خیال رکھنا کوئی تمہیں پہچان نہ لے کہونکہ
انہیں ہمارے بارے میں پتہ چل گیا تو ہمیں قتل کر دیں گے یا اپنے دین کی طرف لے جائیں گے۔
وہ شخص شہر میں جا پہنچا لیکن شہر کا منظر تو اس کے خیال سے بالکل مختلف تھا اور لوگ بھی اس کے
دیکھے جالے نہ تھے۔ وہ ان کی زبان بھی ابھی طرح نہ سمجھتا تھا اور وہ بھی اس کی زبان پوری طرح نہ
سمجھتے تھے۔ وہ پوچھنے لگے، تو کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟۔

آخر کار اس نے اپنا جھبہ بتا دیا۔ (اس زمانے میں اس شہر کا حکمران خدا پرست) بادشاہ اپنے
ساتھیوں کے ساتھ اس شخص کے ہمراہ غار کی طرف آیا۔
یہ لوگ غار کے دہانے پر پہنچے تو اندر دیکھنے لگے۔ بعض کہتے، کہ یہ تین افراد سے زیادہ نہیں
ہیں اور چوتھا ان کا کتا ہے۔ بعض کہتے کہ یہ پانچ افراد ہیں اور چھٹا ان کا کتا ہے اور بعض کہتے
کہ سات ہیں اور آٹھواں ان کا کتا ہے۔

اس وقت ان پر خدا کی طرف سے ایک رعب سا چھا گیا۔ کوئی شخص غار میں داخل
ہونے کی جرأت نہیں کرتا تھا سوائے اس شخص کے کہ جو انہی میں سے تھا۔ جب وہ غار میں گیا تو اس
نے دیکھا کہ وہ وحشت زدہ ہیں کیونکہ وہ کچھ رہے تھے کہ ظالم بت پرست بادشاہ دقیاوس کے آدمی
غار کے دروازے پر آپہنچے ہیں۔ لیکن ان کے ساتھی نے انہیں ان کی طویل نیند سے آگاہ کیا اور
ان سے کہا کہ خدا نے تمہیں لوگوں کے لیے ایک نشانی قرار دیا ہے۔ یہ بات سنی تو وہ بہت
خوش ہوئے۔ خوشی کے مارے ان کے آنسو نکل آئے۔ انہوں نے اللہ سے درخواست کی کہ
ہمیں پہلی حالت کی طرف لوٹا دے۔

اس زمانے کے بادشاہ نے کہا کہ بہتر ہے ہم یہاں ایک مسجد بنائیں کیونکہ وہ باایمان
افراد تھے۔

لہذا علیہ السلام نے یہاں اضافہ فرمایا،

سال میں دو مرتبہ ان کے پہلو بدلتے تھے اور ان کے کتے نے غار کے دہانے پر اپنے اگلے

پاؤں پھیلائے ہوئے تھے (اور ان کی حفاظت کر رہا تھا) بلکہ

اصحاب کھٹ کے بارے میں ایک تفصیل حدیث حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے۔ اس

کا خلاصہ یہ ہے:

پہلے وہ چھ افراد تھے۔ دقیانوس نے انہیں اپنا وزیر بنا رکھا تھا۔ وہ ہر سال ان کیلئے

ایک دن عید کے طور پر مناتا تھا۔

ایک برس جبکہ عید کا دن تھا۔ اس کے بڑے بڑے فوجی افسر اس کی دائیں طرف اور خاص شیر بائیں طرف بیٹھے تھے۔

ایک فوجی کمانڈر نے اسے بتایا کہ ایران کا لشکر سرحدوں میں داخل ہو گیا ہے۔ یہ خبر سن کر اسے بہت دکھ ہوا۔ وہ اتنا پریشان ہوا کہ اپنے لگا اور تاج اس کے سر سے گر پڑا۔

اس کے ذریعوں میں سے ایک کہ جس کا نام تیلیقا تھا، اس نے دل میں سوچا کہ اس شخص کو لگان تھا کہ یہ خدا ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر یہ اس قدر غمزہ کیوں ہوا ہے۔ علاوہ انہیں اس میں تمام بشری صفات موجود ہیں۔

اس کے چہرے کے چھ وزیر روزانہ ایک وزیر کے گھر جمع ہوا کرتے تھے۔ اس روز تیلیقا کی باری تھی۔ اس نے دوستوں کے لیے اچھا کھانا تیار کیا لیکن وہ پریشان دکھائی دیتا تھا۔ (دکانے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھاتا تھا) اس کے دوست اس کی اس حالت کی طرف متوجہ ہوئے تو اس نے کہا، میرے دل میں ایک بات ہے کہ جس کے باعث میرا کھانا پینا اور آرام جاتا رہا ہے۔

انہوں نے واقعہ پوچھا تو اس نے کہا، اس بلند آسمان پر میں نے بہت غور کیا ہے کہ یہ بغیر کسی ستون کے قائم ہے۔ جس نے اس میں سورج اور چاند کی صورت میں دو روشن نشانیاں رواں دواں کر رکھی ہیں اور اس کی سطح ستاروں سے سجا رہی ہے اس کے بارے میں میں نے بہت غور و فکر کیا ہے۔ پھر میں نے اس زمین کی طرف دیکھا ہے اور اپنے آپ سے پوچھا ہے کہ کس نے اسے پانی سے باہر نکالا اور پھیلا یا ہے اور کس نے اس کی بے قراری کو پہاڑوں کے ذریعے قرار بخشا ہے۔ پھر میں نے اپنی حالت کے بارے میں سوچا ہے اور اپنے آپ سے پوچھا ہے کہ کس نے مجھے رحم مادر سے باہر بھیجا ہے، کس نے مجھے پستان مادر سے غٹکوار دودھ بخشا ہے اور غذا دی ہے۔ الغرض کس نے مجھے پروان چڑھایا ہے۔ ان سارے مسائل کے بارے میں میں نے تو یہی سمجھا ہے کہ کوئی ہے جس نے یہ سب کچھ بنایا ہے، یہ سب کچھ

پیدا کیا ہے اور وہ ان کے نظام چلاتا ہے۔ اور یہ دقیانوس نہیں کوئی اور ہے۔ وہ کہ جو مالک الملوک بھی ہے آسمانوں پر حاکم بھی،

اس نے یہ باتیں جب صراحت اور غلو سے کہیں۔ جو کچھ اس کے دل سے نکلا اس کے دوستوں کے دل میں اتر گیا۔ اچانک وہ سب اس کے پاؤں پر گر پڑے اور اس کی قدم بوسی کرنے لگے۔

انہوں نے کہا: اللہ نے تیرے ذریعے جیسے مگر ابھی سے نکال کر ہدایت کی طرف دعوت دی ہے۔ اب بتاؤ ہم کیا کریں؟

تیلیقا اٹھا۔ اس نے اپنے باغ کی کھجوریں تین ہزار درہم میں بیچیں۔ وہ رقم اٹھائی اور پھر وہ سب گھوڑوں پر سوار ہو گئے اور شہر سے باہر کی طرف چل پڑے۔ جب وہ تین میل کا راستہ طے کر چکے تو تیلیقا نے کہا: بھائیو! بادشاہی اور وزارت تو لگنی۔ اب خدا کی راہ کو ان قیمتی گھوڑوں کے ذریعے طے نہیں کیا جاسکتا۔ ان سے اتر آؤ تاکہ اب اس راستے کو پیدل طے کریں شاید خدا ہماری شکلیں آسان کر دے۔

انہوں نے گھوڑے چھوڑ دیئے اور پیدل چل پڑے۔ اس روز انہوں نے تیزی سے سات فرسخ راستہ طے کر لیا۔ مگر ان کے پاؤں زخمی ہو گئے۔ ان کے پاؤں سے خون بہہ رہا تھا کہ ان کی ملاقات ایک چرواہے سے ہوئی۔ انہوں نے کہا: اے چرواہے! تمہارے پاس دودھ یا پانی کا گھونٹ ہے تو کچھ ہماری مہمانی کر دو۔

چرواہے نے کہا: جو نہیں پسند ہو وہ حاضر ہے لیکن تمہارے چہرے مجھے بادشاہوں والے لگتے ہیں۔ تم یہاں کس لیے آئے ہو۔ میرا خیال ہے تم دقیانوس بادشاہ سے بھاگ کر آئے ہو۔

انہوں نے کہا: اے چرواہے! حقیقت یہ ہے کہ ہم بھوٹ نہیں بول سکتے لیکن اگر ہم پیچ نہیں تو کیا تو ہمارے لیے کوئی مصیبت کھڑی تو نہیں کر دے گا؟

اس کے بعد انہوں نے چرواہے کو اپنی ساری کہانی کہ سنائی۔ چرواہا ان کے ہاتھ پاؤں چرمنے لگا۔ اس نے کہا: بھائیو! جو کچھ تمہارے دل میں اتر گیا ہے وہ میرے دل میں بھی سما گیا ہے لیکن اتنی اجازت دو کہ یہ بیٹھ بکریاں میں ان کے مالکوں کے سپرد کر آؤں اور تم سے آملوں۔

وہ کچھ دیر تک گئے۔ چرواہا بیٹھ بکریاں پہنچا آیا۔ اس کا کہنا اس کے ساتھ ہی تھا ان چرواہوں نے کہنے کو دیکھا تو بعض نے کہا: ڈر ہے کہ کہیں یہ بھونک کو ہمارا راز فاش نہ کر دے۔ لیکن انہوں نے جتنی بھی کوشش کی کہ اسے دُور کریں وہ نہ مانا۔ گویا وہ کہتا تھا: مجھے رہنے دو میں دشمنوں سے تمہاری حفاظت کروں گا (میں بھی تمہارے راستے کا مسافر ہوں)۔

یہ ساتوں اپنی راہ پر چلتے رہے۔ کتا اُن کے پیچھے پیچھے تھا یہاں تک کہ ایک پہاڑ پر چڑھ گئے۔ ایک غار کے پاس پہنچ کر وہ رُک گئے۔ غار کے پاس انہوں نے چٹے اور پھلدار درخت دیکھے۔ انہوں نے پھل کھائے، پانی پیا اور سیراب ہوئے۔

راست کی تاریکی چھا گئی تو وہ غار میں جا پناہ گزین ہوئے۔ کتے نے غار کے دہانے پر اپنے اگلے پاؤں پھیلا دیئے اور پہرہ دینے لگا۔ یہ حالت تھی کہ خدا نے موت کے فرشتے کو قبض الوام کا حکم دیا (اور ان پر موت کی سی گہری نیند مسلط ہو گئی)۔

دقیانوس کے بارے میں بعض مفسرین کہتے ہیں کہ وہ شہنشاہِ روم تھا۔ اس نے ۲۴۹ سے ۲۵۱ عیسوی تک حکومت کی۔ وہ عیسائیوں کا سخت دشمن تھا اور انہیں بہت اذیت پہنچاتا تھا۔ یہ حکومت روم کے عیسوی دین قبول کرنے سے پہلے کا زمانہ تھا۔

۲۔ ”غار“ کہاں ہے؟ : یہ کہ اصحابِ کھٹ کس علاقے میں رہتے تھے اور یہ غار کہاں تھی، اس سلسلے میں علماء اور مفسرین کے درمیان بہت اختلاف ہے۔ البتہ اس واقعے کے مقام کو صحیح طور پر جاننے کا اصل داستان، اس کے تریخی پہلوؤں اور تاریخی اہمیت پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا۔ یہ کوئی واحد واقعہ نہیں کہ جس کی اصل داستان تو ہمیں معلوم ہے لیکن اس کی زیادہ تفصیلات معلوم نہیں ہیں لیکن مسلم ہے کہ اس واقعے کا مقام جاننے سے اس کی خصوصیات کو مزید سمجھنے کے لیے مفید ہو سکتا ہے۔ بہر حال اس سلسلے میں جو احتمالات ذکر کیے گئے اور جو اقوال نظر سے گزرے ہیں ان میں سے دو زیادہ صحیح معلوم ہوتے ہیں۔

پہلا یہ کہ یہ واقعہ شہرِ افسوس میں ہوا اور یہ غار اس شہر کے قریب واقع تھی۔ ترکی میں اب بھی اس شہر کے کھنڈرات ازیر کے قریب نظر آتے ہیں۔ وہاں قریب ایک قصبہ ہے جس کا نام ”ایا صولوک“ ہے اس کے پاس ایک پہاڑ ہے ”ینا برداغ“۔ اب بھی اس میں ایک غار نظر آتی ہے جو افسوس شہر سے کوئی زیادہ فاصلے پر نہیں ہے۔ یہ ایک وسیع غار ہے۔ کہتے ہیں اس میں سینکڑوں قبروں کے آثار نظر آتے ہیں۔ بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ اصحابِ کھٹ کی غار یہی ہے۔

جیسا کہ جاننے والوں نے بیان کیا ہے کہ اس غار کا دہانہ شمال مشرق کی جانب ہے۔ اس وجہ سے بعض بزرگ مفسرین نے اس بارے میں شک کیا ہے کہ یہ وہی غار ہے حالانکہ اس کی یہی کیفیت اس کے اصلی ہونے کی توثیق ہے کیونکہ طلوع کے وقت سورج کا دائیں طرف اور غروب کے وقت بائیں طرف ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ غار کا دہانہ شمال یا کچھ شمال مشرق کی جانب ہو۔

اس وقت وہاں کسی مسجد یا عبادت خانہ کا نہ ہونا بھی اس کے وہی غار ہونے کی نفی نہیں کرتا کیونکہ تقریباً سترہ صدیاں گزرنے کے بعد ممکن ہے اس کے آثار مٹ گئے ہوں۔

دوسرا قول یہ ہے کہ یہ وہ غار ہے کہ جو اردن کے دارا الحکومت عمان میں واقع ہے۔ یہ غار ”رجیب“ نامی ایک بستی کے قریب ہے۔ اس غار کے اوپر گرے کے آثار نظر آتے ہیں۔ بعض قرآن کے مطابق ان کا تعلق پانچویں صدی عیسوی سے ہے۔ جب اس علاقے پر مسلمانوں کو غلبہ ہوا تو اسے مسجد میں تبدیل کر لیا گیا تھا اور وہاں محراب بنائی گئی تھی اور اذان کی جگہ کا اضافہ کیا گیا تھا۔ یہ دونوں اس وقت موجود ہیں۔

۳۔ اس واقعے کے تریخی اور تعمیری پہلو: اس عجیب و غریب تاریخی واقعے کو قرآن نے تمام طرح کے خرافات اور بے بنیاد باتوں سے پاک کر کے ٹھیک ٹھیک بیان کر دیا ہے۔ یہ واقعہ بھی قرآن کے دیگر تمام واقعات کی طرح تریخی اور تعمیری نکات سے معمور ہے۔ تفسیر بیان کرتے ہوئے ہم نے ان نکات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ ایک مرتبہ پھر عمومی طور پر ان نکات کی طرف اشارہ کیا جائے تاکہ ہم قرآن کے اصلی مقصد کے زیادہ قریب ہو جائیں۔

الف۔ اس داستان کا پہلا سبق تقلید کے بند توڑنا ہے۔ اس داستان کا تقاضا ہے کہ فاسد ماحول کے رنگ میں نہیں رنگے جانا چاہیے۔ جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے کہ معاشرے کی اکثریت گمراہ تھی لیکن اس کے مقابلے میں جو افراد اصحابِ کھٹ نے اپنی آزادی فکرو کو گنوا یا نہیں اور یہی امر ان کی نجات و خلاص کا سبب بن گیا۔ اصولی طور پر انسان کو معاشرہ ساز ہونا چاہیے نہ کہ اس کی برائیوں کا شریک کار بست، کمزور اور بے حیثیت لوگ وہ ہوتے ہیں جو کہتے ہیں:

خواہی نشوی رسوا ہم رنگ جماعت شو

اگر تم ذلیل نہیں ہونا چاہتے تو جیسے لوگ ہیں دیسے ہو جاؤ۔

جبکہ اہل ایمان اور حریت فکر رکھنے والے افراد کہتے ہیں:

لوگوں کا ہم رنگ ہونا تیرے لیے باعثِ ننگ و عار ہے۔

ب۔ اس عبرت انگیز واقعے کا دوسرا سبق بڑے ماحول سے ہجرت اختیار کرنا ہے۔ ان کا شاہانہ ٹھاٹھ باطل تھا، خوشحال زندگی تھی، مادی نعمتیں ان کے لیے فراوان تھیں اُن کے گھر بھرے پُرے تھے۔ ایسی زندگی کو انہوں نے ٹھکرا دیا اور اس غار میں جا ڈیرہ کیا کہ جہاں طرح طرح کی محرمیاں تھیں۔ یہ سب کچھ انہوں نے اس لیے کیا تاکہ اپنے ایمان کی حفاظت کر سکیں اور ظلم و جور اور کفر و شرک کی تقویت کا باعث نہ بنیں بلکہ

ج۔ اس داستان کا تیسرا درس تفسیر ہے۔ وہ تفسیر کہ جو تربیتی، اصلاحی اور تعمیری ہے۔ وہ اس بات پر زور دیتے تھے کہ شہر والوں کو ان کے بارے میں پتہ نہ چلے اور وہ اسی طرح پردہ اسرار میں رہ جائیں کہ مبادا ان کی جان بے کار ہی ضائع چلی جائے یا انہیں جبری طور پر اس بُرے ماحول کی طرف پٹا دیا جائے۔

ہم جانتے ہیں کہ تفسیر اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ انسان اپنے حقیقی مقام یا موقت کو ایسے مقام پر بھی رکھے کہ جہاں ظاہر کرنا بے نتیجہ ہو تا کہ مقابلے کے لیے اور دشمن پر ضرب لگانے کے موقع کے لیے اپنی قوت کو محفوظ رکھا جاسکے۔

د۔ اللہ کی راہ میں سب انسان برابر ہیں۔ وزیر اور چرواہا اکٹھے ہیں۔ بلکہ ان کی حفاظت کرنے والا تمنا بھی ان کے ساتھ ہے۔ یہ بھی اس واقعے کا ایک درس ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ مادی دنیا کے امتیازات اور مقام و منصب راہ حق کے سافروں کو ایک دوسرے سے ہرگز جدا نہیں کرتے اور راہ توحید تمام انسانوں میں مساوات کا راستہ ہے۔

۵۔ اس داستان کا ایک درس یہ بھی ہے کہ مشکلات کے مواقع پر اللہ کی طرف سے اس کچھ دلوں کی تعجب انگیز طور پر امداد کی جاتی ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ کیسے جب معاشرے کے حالات ناسازگار تھے تو اللہ تعالیٰ نے اصحاب کھٹ کو سالہا سال سلائے رکھا اور جب حالات سازگار ہوئے تو انہیں بیدار کر دیا۔ اور لوگوں نے ان کا توحید پرستوں کی حیثیت سے احترام کیا۔ نیز ہم نے دیکھا کہ کس طرح اس طوفانِ مدت میں ان کے جہوں کو ہر قسم کے نقصان سے محفوظ رکھا اور ان کے اندر ایک ایسا رعب پیدا کر دیا کہ جس نے حملہ آوروں کے مقابلے میں ڈھال بن کر ان کی حفاظت کی۔

و۔ اصحاب کھٹ نے ان سخت ترین حالات میں بھی ہمیں پاکیزہ غذا کھانے کا درس دیا کیونکہ جسم انسان کی غذا کا انسانی روح فکر اور دل پر گہرا اثر ہوتا ہے۔ انسان جب حرام اور ناپاک غذا سے آلودہ ہوتا ہے تو وہ راہ خدا سے اور تقویٰ سے دور ہو جاتا ہے۔

ز۔ مشیت خدا پر بھروسہ اور اعتماد ضروری ہے۔ اس کے لطف و کرم سے مدد طلب کرنا اور آئندہ کے امور کے لیے انشاء اللہ کہنا۔ یہ درس بھی ہم نے اس واقعے کے ضمن میں سیکھا ہے۔

ح۔ ہم نے دیکھا ہے کہ قرآن انہیں جو انفرادی (فقیہ) کہہ کر یاد کر رہا ہے حالانکہ بعض روایات کے مطابق عمر کے لحاظ سے وہ جوان نہیں تھے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ پہلے وہ اس دور کے عالم بادشاہ کے وزیر تھے

۱۔ تفسیر کے بارے میں۔ تفسیر ایک حقائق ڈھال ہے۔ کے زیر عنوان ہم تفسیر نمونہ جلد ۲ ص ۲۹۵ (اردو ترجمہ) پر گفتگو کی ہے اور اس کے فقہی مدارک، اقوال و افعالیہ میں ہم نے بیان کیے ہیں۔

تو ماننا پڑے گا کہ وہ اچھی خاصی عمر کے تھے۔ یہ امر غافلانہ ہی کرتا ہے کہ قرآن جوانی کو جو انفرادی کے اصول پر دیکھتا ہے یعنی قرآن پاکیزگی، حرمت و ایثار کے حوالے سے جوانی کو مانتا ہے۔

ط۔ اس واقعے سے ایک اور اصلاحی سبق یہ ملتا ہے کہ مخالفین سے سابقہ پڑے تو ضروری ہے کہ بحث منطقی بنیاد پر کی جائے۔ کیونکہ جب اصحاب کھٹ اس شرک آلود ماحول پر تنقید کرتے تو منطقی دلائل کا سہارا لیتے۔ اس کے کچھ نمونے ہم نے اسی سورہ کی آیات ۱۵ اور ۱۶ میں دیکھے ہیں۔

اصول طور پر تمام انبیاء اور مادیان الہی کا طریق کار یہ تھا کہ وہ مخالفین سے مقابلے اور آمنہ سانا ہونے کی صورت میں آزاد اور منطقی بنیاد پر گفتگو کرتے تھے۔ طاقت وہ صرف اسی صورت میں استعمال کرتے جب فتوہ فساد کے خاتمے کے لیے منطقی بحث موثر نہ رہتی تھی یا یہ کہ جب مخالفین منطقی گفتگو میں رکاوٹ بن جاتے تھے۔

ی۔ دسواں درس اس داستان کا معاویہ جہانی اور قیامت کے دن انسان کی حیات نو کے امکان کا ہے۔ اس کی تشریح آئندہ مباحث میں تفصیل کے ساتھ آئے گی۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ اس داستان کے تربیتی، اصلاحی اور تعمیری نکات انہی میں منحصر ہیں لیکن ان دس درسوں میں سے ایک بھی جو تو ایسی داستان بیان کرنے کے لیے کافی ہے چہ جائیکہ یہ سب موجود ہوں۔

بہر حال مقصد خواہ مخواہ کی شغولیت اور داستان گوئی نہیں ہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ انسانوں کو مجاہد، بہادر، با ایمان، آگاہ اور شجاع بنانا ہے اور ان کی اصلاح کرنا ہے۔ اس کے لیے دیگر تبلیغی طریقوں کے علاوہ ایک یہ ہے کہ انسان کی گزشتہ تاریخ سے حقیقی نمونے پیش کیے جائیں۔

اصحاب کھٹ کا واقعہ علمی اعتبار سے

یہ بات مسلم ہے کہ اصحاب کھٹ کا واقعہ کسی گزشتہ آسمانی کتاب میں نہیں تھا چاہے وہ اصلی ہو یا موجودہ تحریف شدہ اور نہ اسے ان کتابوں میں جو نابی چاہیے تھا کیونکہ تاریخ کے مطابق یہ واقعہ ظہور حضرت مسیح کے صدیوں بعد کا ہے۔

یہ واقعہ "دیکوس" کے دور کا ہے، جسے عرب "دقیانوس" کہتے ہیں۔ اس کے زمانے میں عیسائیوں پر سخت ظلم ہوتا تھا۔

یورپی مؤرخین کے مطابق یہ واقعہ ۲۵۱ء مسیحی کے درمیان کا ہے۔ ان مؤرخین کے خیال میں اصحاب کھٹ کی فیند کی مدت ۱۵ سال ہے۔ یورپی مؤرخین انہیں "افسوس" کے ساتھ سونے والے "کہتے ہیں جبکہ ہمارے ماں انہیں "اصحاب کھٹ" کہا جاتا ہے۔

اب دیکھتے ہیں کہ "افسوس" شہر کہاں ہے؟ سب سے پہلے کن علماء نے ان سونے والوں کے بارے میں کتاب لکھی اور وہ کس صدی کے تھے؟

"افسوس" یا "افس" ایٹانے کو چمک کا ایک شہر تھا (موجودہ ترکی جو قدیم مشرقی روم کا ایک حصہ تھا) یہ دریائے کاسٹر کے پاس "ازمیر" شہر کے تقریباً چالیس میل جنوب مشرق میں واقع تھا۔ یہ "الونی" بادشاہ کا پایہ تخت شمار ہوتا تھا۔ افسوس اپنے مشہور بُت خانے اراطامیس کی وجہ سے بھی عالمی شہرت رکھتا تھا۔ یہ دنیا کے سات عجائبات میں سے تھا۔

کہتے ہیں کہ اصحاب کھف کی داستان پہلی مرتبہ پانچویں صدی عیسوی میں ایک عیسائی عالم نے لکھی۔ اس کا نام "ٹراک" تھا۔ وہ شام کے ایک گرجے کا متولی تھا۔ اس نے سریانی زبان کے ایک رسالے میں اس کے بارے میں لکھا تھا۔ اس کے بعد ایک اور شخص نے اس کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا۔ اس کا نام "گوگولوس" تھا۔ ترجمے کا نام اس نے "جلال شہداء" کا ہم معنی رکھا۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ظہور اسلام سے ایک دو صدیاں پہلے یہ واقعہ عیسائیوں میں مشہور تھا اور گرجوں کی مجلس میں اس کا تذکرہ ہوتا تھا۔

البتہ جیسا کہ اشارہ کیا گیا ہے، اسلامی مصادر میں اس کی جو تفصیلات آئی ہیں وہ مذکورہ عیسائیوں کے بیانات سے کچھ مختلف ہیں۔ جیسے اُن کے سونے کی مدت۔ کیونکہ قرآن نے صراحت کے ساتھ یہ مدت ۳۰۹ سال بیان کی ہے۔

یا قوت حموی نے اپنی کتاب "معجم البلدان" ج ۳ ص ۳۶۰ پر ابن خرداد بہ نے اپنی کتاب "المسالك والممالك" ص ۱۱۱ تا ۱۱۲ میں اور البرککان بردنی نے اپنی کتاب "الانوار الباقیہ" ص ۲۹ پر نقل کیا ہے کہ قدیم سیاحوں کی ایک جماعت نے شہر "آبس" میں ایک غار دیکھی ہے جس میں چند انسانی ڈھانچے پڑے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ہو سکتا ہے یہ بات اسی داستان سے مربوط ہو۔

سورہ کھف میں قرآن کے لب و لہجہ سے اور اس سلسلے میں اسلامی کتب میں منقول شاننامے نزول سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ داستان یودی علماء میں بھی ایک تاریخی واقعے کے طور پر مشہور تھی۔ اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ طولانی نیند کا یہ واقعہ مختلف قوموں کے تاریخی ماخذ میں موجود رہا ہے۔

شہر افسوس میں سالہا سال تک سوتے رہنے والے اصحاب کھف کی اس طویل نیند کے بارے میں

۱۔ قاضی مقدس ص ۳۳۳ سے ایک اقتباس۔

۲۔ اعلام مسترکان ص ۱۵۳۔

۳۔ معاد و جہان پس از مرگ ص ۱۹۳ تا ۱۹۵۔

ہو سکتا ہے کچھ افراد شک کریں کہ یہ بات سائنسی معیار پر پوری نہیں اترتی لہذا وہ اسے ایک افسانہ قرار دیں کیونکہ: اولاً: اس قسم کی طولانی عورتوں جیسے افراد کے لیے بعد معلوم ہوتی ہے کہ چھ جینک سوتے ہوئے افراد کیلئے۔

ثانیاً: اگر یہ قبول کر لیا جائے کہ بیداری کے عالم میں ایسی عمر ممکن ہے تب بھی سوتے ہوئے تو ممکن معلوم نہیں ہوتی کیونکہ کھانے پیتے بغیر اتنا طویل عرصہ انسان کیونکر زندہ رہ سکتا ہے۔ اگر فرض کیا جائے کہ ایک انسان کو ہر روز کے لیے ایک کلو کھانا اور ایک لٹر پانی کی ضرورت ہوتی ہے تو اصحاب کھف کی عمر کے لیے سوٹن غذا اور ایک لاکھ لٹر پانی کی ضرورت ہے اور اتنا ذخیرہ ایک بدن میں ممکن نہیں۔

ثالثاً: اگر ان تمام چیزوں سے صرف نظر بھی کر لیا جائے تو بھی انسانی بدن اتنا طویل عرصہ ایک جیسا کیسے رہ سکتا ہے انسانی آرگنائزم Organism کے لیے اتنی طولانی مدت یقیناً نقصان دہ ہے اور جسم کے اعضاء و اجزاء کا بہت سا حصہ اتنے طویل عرصے میں ضرور ضائع ہوتا ہے۔

ہوسکتا ہے پہلی نظر میں ان اشکالات اور موانع کے باعث ایسا ہونا ناقابل عمل دکھائی دے۔ لیکن ایسا نہیں کیونکہ:

اولاً: لمبی عمر کا مسئلہ کوئی غیر سائنسی نہیں ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ کسی زندہ موجود کی عمر کی طوالت کیلئے سائنسی حوالے سے کوئی ایسا معیار نہیں ہے کہ جس کے باعث موت حتمی اور یقینی ہو۔ دوسرے لفظوں میں یہ صحیح ہے کہ انسان کے جسمانی قومی جس قدر بھی ہوں آخر محدود اور اختتام پذیر ہیں لیکن اس کا یہ معنی نہیں کہ ایک انسانی بدن یا کسی اور زندہ شے کا بدن معمول سے زیادہ زندہ رہنے کی توانائی نہیں رکھتا۔

اس کی مثال پانی کی سی نہیں کہ جب اس کا درجہ حرارت سوئٹ پینج جاتا ہے تو وہ اُبلنے لگتا ہے اور مغز تک پہنچ جاتا ہے تو برف بن جاتا ہے۔ ایسا نہیں کہ جب انسان سو یا ڈیڑھ سو سال تک پہنچ جائے تو ضروری ہے کہ اس کے دل کی دھڑکن بند ہو جائے اور اس پر موت طاری ہو جائے۔ بلکہ زندہ موجودات کی عمر کا تعلق زیادہ تر اس کی کیفیت زندگی اور اندازِ بود و باش سے ہے اور حالات کی تبدیلی سے مکمل طور پر قابل تغیر ہے۔ اس بات کا زندہ شاید یہ امر ہے کہ ایک طرف تو دنیا کے کسی سائنسدان نے انسانی عمر کے لیے کوئی معین معیار مقرر نہیں کیا جبکہ دوسری طرف تجربہ گاہوں میں یہ بات ثابت کی جا چکی ہے کہ بعض زندہ موجودات کی عمر دو گنا، کئی گنا یہاں تک کہ بارہ گنا اور اس سے بھی زیادہ ہو سکتی ہے۔ بلکہ اب تو امید بھی دلائی جا رہی ہے کہ بعض نئے عملی طریقے پیدا ہونے سے انسان کی عمر موجودہ عمر کی نسبت کئی گنا بڑھ جائے گی۔

یہ تو طویل عمر کے بارے میں گفتگو تھی۔

ثانیاً: اس طولانی نیند میں آب و غذا کے بارے میں اگر تو معمول کی نیند ہو تو ہو سکتا ہے کہ اعتراض کرنے والے کو حق بجانب سمجھا جائے کہ یہ بات سائنسی اصول سے ہم آہنگ نہیں کیونکہ انسانی بدن میں اجزاء کی بیش

نیند کی حالت میں جسم حالت کی نسبت اگرچہ کم سبب پھر بھی اتنی طویل مدت میں تو بہت زیادہ ہوگی لیکن توجہ رہے کہ مادی دنیا میں ایسی نیندیں بھی ہیں کہ جن میں بدن کی غذا کا مصرف بہت کم ہوتا ہے اس کے لیے ان جانوروں کی مثال پیش کی جاسکتی ہے جو موسم سرما میں سو جاتے ہیں۔ ان کے کھانے کو ہم ذرا تفصیل سے دیکھتے ہیں:

بعض جانوروں کی سردیوں کی نیند بہت سے جانور ایسے ہیں جو سارے موسم سرما میں سوئے رہتے ہیں۔ اسے سانس اصطلاح میں "سردیوں کی نیند" کہتے ہیں۔

ایسی نیند میں علامات حیات تقریباً ختم ہو جاتی ہیں۔ زندگی کا معمولی سا شعلہ روشن رہتا ہے۔ دل کی دھڑکن تقریباً رک جاتی ہے اور اتنی خفیف ہو جاتی ہے کہ بالکل محسوس نہیں ہوتی۔ ایسے مواقع پر بدن کو ایک ایسے بڑے بھٹے سے تشبیہ دی جاسکتی ہے کہ جسے بچھا کر چھوٹا سا شعلہ بھڑکتا رہے۔ واضح ہے کہ آسان سے باتیں کرتے ہوئے شعلوں کے لیے بھٹے کو جتنے تیل یا گیس کی خوراک کی ایک دن کے لیے ضرورت ہوتی ہے ایک خفیف سے شعلے کے لیے اتنی برسا برس یا صدیوں کے لیے ضرورت ہوتی ہے۔ البتہ اس میں جتنے ہوئے بھٹے کی مقدار اور خفیف سے شعلے کی مقدار کے لحاظ سے فرق ہو سکتا ہے۔

سانس دان بعض جانوروں کی سردیوں کی نیند کے بارے میں کہتے ہیں:

کوئی مینڈک جب سردیوں کی نیند میں ہو تو اسے اگر اس کی جگہ سے باہر نکال لیں تو وہ مردہ معلوم ہوگا۔ اس کے پچھڑوں میں ہوائیں ہوتی ہیں۔ اس کے دل کی حرکت اس قدر کمزور ہوتی ہے کہ اس کا پتہ نہیں چلا یا جاسکتا۔ خون سرد جانوروں کی سردیوں کی نیند سوئے ہیں۔ اس سلسلے میں کئی طرح کے کیڑے مکوڑوں، حشرات الارض، گھونگھول اور ریگنے والے جانوروں کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ بعض خون گرم جانوروں کی سردیوں کی نیند بھی سردیوں کی ایسی نیند ہوتی ہے۔ اس نیند کے عالم میں حیاتی فعالیتیں بہت سست پڑ جاتی ہیں اور بدن میں ذخیرہ شدہ چربی آہستہ آہستہ صرف ہوتی رہتی ہے۔

مقصد یہ ہے کہ ایک ایسی نیند بھی ہے کہ جس میں غذا کی انتہائی کم ضرورت ہو جاتی ہے اور حیاتی فعالیتیں تقریباً صفر تک پہنچ جاتی ہیں۔ اتفاق کی بات ہے کہ یہی صورت حال اعتنا کو فرسودگی سے بچانے اور جانوروں کی طوالت عمر میں مدد کرتی ہے۔

اصولی طور پر جو جاندار احتملاً سردیوں میں اپنی غذا حاصل کرنے کی طاقت نہیں رکھتے ان کے لیے سردیوں کی نیند بہت غنیمت چیز ہے۔

ایک اور نمونہ - یوگا کے ماہرین: یوگا کے ماہرین کے بارے میں دیکھا گیا ہے کہ ان میں سے بعض کو یقین نہ کرنے والے حیرت زدہ افراد کی آنکھوں کے سامنے بعض اوقات تابوت میں رکھ کر ہفتہ بھر کی مدت تک کے لیے مٹی کے نیچے دفن کر دیتے ہیں اور مذکورہ مدت ختم ہونے کے بعد انہیں باہر نکالتے ہیں۔ ان کی مالش کی جاتی ہے اور مصنوعی سانس دی جاتی ہے اور وہ زندہ رہتے معمول کی حالت میں پلٹ آتے ہیں۔

اتنی مدت کے لیے اگر ضرورت غذا کا مسئلہ اہم نہ ہو تو بھی آنکھیں کا مسئلہ تو بہت اہم ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ دماغ کے غلیے آنکھیں کے معاملے میں اتنے حساس اور ضرورت مند ہوتے ہیں کہ اگر چند سیکنڈ بھی اس سے محروم رہیں تو تباہ ہو جائیں۔ لہذا سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک یوگی پورا ہفتہ کس طرح آنکھیں کی اس کمی کو برداشت کر لیتا ہے۔

ہم جو وضاحت کر چکے ہیں اس کی طرف توجہ کرنے سے اس سوال کا جواب زیادہ مشکل نہیں رہتا۔ بات یہ ہے کہ یوگی کے بدن کی حیاتی فعالیت اس عرصے میں تقریباً رک جاتی ہے۔ اس دوران میں غلیے کو آنکھیں کی ضرورت اور اس کا مصرف بہت کم ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہی ہوا جو تابوت کے اندر والے حصے میں ہوتی ہے بدن کے غلیوں کی ہفتہ بھر کی غذا کے لیے کافی ہوتی ہے۔

زندہ انسان کے بدن کو منجمد کر دینا: جانداروں بلکہ انسانی بدن کو منجمد کر کے ان کی عمر بڑھانے کے بارے میں آج تو بہت سے نظریے اور بحثیں چل پڑی ہیں۔ ان میں بعض تو عملی جامہ بھی پہن چکی ہیں۔

ان نظریوں Theories کے مطابق یہ ممکن ہے کہ ایک انسان یا حیوان کے بدن کو ایک خاص طریقے کے تحت صفر سے کم درجہ حرارت پر رکھ کر اس کی زندگی کو ٹھہرا دیا جائے، اس طرح سے کہ وہ واقفاً مر نہ جائے۔ پھر ایک ضروری مدت کے بعد اسے مناسب حرارت دی جائے اور وہ حالت معمول پر لوٹ آئے۔ ایسے کڑے جو بہت دور ہیں ان تک کا فضائی سفر جو کئی سو یا کئی ہزار سال تک کی مدت کا ہو سکتا ہے کے لیے کئی منصوبے پیش کیے جا چکے ہیں۔ ان میں سے ایک یہی ہے کہ خلا فورد کے بدن کو ایک خاص تابوت میں رکھ دیا جائے اور اسے منجمد کر دیا جائے اور جب سالہا سال کی مسافت کے بعد وہ مقررہ حرارت کے قریب پہنچے تو ایک خود کار نظام کے تحت اس تابوت میں حرارت پیدا ہو جائے اور خلا فورد حالت معمول پر لوٹ آئے بغیر اس کے کہ اس کی عمر ضائع ہو۔

ایک سائنسی جملے میں ایک خبر شائع ہوئی ہے کہ حال ہی میں انسانی بدن کو لمبی عمر کے لیے منجمد کرنے کے بارے میں رابرٹ نیلن نے کتاب لکھی ہے۔ سائنسی دنیا میں یہ کتاب بہت اہمیت اختیار کر گئی ہے اور اس کے مندرجات کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے۔

مجھے کے اس مقالے میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ حال ہی میں اس عنوان کے تحت ایک خاص سائنسی شبہ قائم ہو گیا ہے۔ مذکورہ مقالے میں لکھا گیا ہے :

حیات جادواں پوری تاریخ انسانی میں ہمیشہ انسان کا سنہرا خواب رہی ہے لیکن اب یہ خواب حقیقت میں بدل گیا ہے۔ یہ امر ایک نئے علم کی خوشگوار اور حیرت انگیز ترقی کا مہربان ہے۔ اس علم کا نام کریاتک ہے۔ (یہ علم انسانی بدن کو منجمد کر کے زندہ رکھنے کے بارے میں ہے۔ اس کے مطابق انسان کے بدن کو منجمد کر کے اسے بچایا جاسکتا ہے یہاں تک کہ سائنسدان اسے پھر سے زندہ کر دیں)۔

کیا یہ بات قابل یقین ہے ؟

بہت سے اہم اور ممتاز سائنسدان کئی پہلوؤں سے اس مسئلے پر غور کر رہے ہیں۔ اس کے بارے میں کئی کتابیں مثلاً "لائف" اور "اسکوائر" چھپ چکی ہیں۔ پوری دنیا کے اخبارات پوری شدہ مد سے اس مسئلے پر بحث کر رہے ہیں اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس مسئلے میں اب تجربات شروع ہو چکے ہیں۔

کچھ مہرہ ہوا کہ جراثیم یہ خبر چھپی تھی کہ برفانی قطبی علاقے سے چند ہزار سال پہلے کی ایک منجمد مچھلی ہے جسے خود وہاں کے لوگوں نے دیکھا ہے۔ اس مچھلی کو جب مناسب پانی میں رکھا گیا تو لوگ حیرت زدہ رہ گئے کہ وہ پھر سے جی اٹھی اور چلنے پھرنے لگی۔

واضح ہے کہ حالت انجماد میں علامت حیات موت کی طرح بالکل ختم نہیں ہو جاتی کیونکہ اس صورت میں تو پھر زندگی نہیں مل سکتی بلکہ اس عالم میں حیات کی خفایتیں بہت سست رفتار ہو جاتی ہیں۔

ان تمام باتوں سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ انسانی زندگی کو ٹھہرایا یا بہت ہی سست کیا جاسکتا لیکن ہے اور مختلف سائنسی تحقیقات اس امکان کی کئی حوالوں سے تائید کرتی ہیں۔ اس حالت میں غذا کا مصروف بدن میں تقریباً صفر تک جا پہنچتا ہے اور غذا کا تھوڑا سا ذخیرہ جو بدن میں موجود ہوتا ہے اس کی سست زندگی کیلئے طویل برسوں تک کافی ہو سکتا ہے۔

غلط فہمی نہیں ہونا چاہیے ہم ان باتوں کے ذریعے اصحاب کھٹ کی نیند کے اعجاز کے پہلو کا انکار نہیں کرنا چاہتے بلکہ ہم چاہتے ہیں کہ سائنسی حوالے سے اس واقعے کو ہم ذہن کے قریب کر دیں کیونکہ تسلیم شدہ امر ہے کہ اصحاب کھٹ ہماری طرح نہیں ہوتے۔ جیسے ہم معمول کے مطابق رات کو سوتے ہیں ان کی نیند ایسی نہ تھی بلکہ وہ استثنائی پہلو رکھتی تھی۔

جلد ۱ - مائیکرو سائنس - ص ۱۰۰

ایک پہلو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انسان نے قدرت کی بہت سی چیزیں دیکھ کر دلی ہی ایجادات کی ہیں۔ لہذا ہو سکتا ہے کہ اصحاب کھٹ کے واقعے سے انسان کے ذہن میں منجمد کرنے کی ایجاداتی ہو یا قدرت نے اسے منجمد کرنے کا اشارہ دیا ہو۔

لہذا اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کہ وہ ارادۃ الہی کے ماتحت ایک طویل زمانے تک سوئے رہے۔ اس دوران نہ انہیں غذا کی کمی لاحق ہوئی اور نہ ان کے بدن کے اجزاء Organism کو کوئی نقصان پہنچا۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ سورہ کھٹ کی آیات سے ان کی سرگزشت کے بارے میں یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ ان کی نیند عام طریقے کی نیندوں کی نیند سے بہت مختلف تھی۔ ارشاد ہوتا ہے :

وَتَحِبُّهُوَ إِيفَظًا وَهُوَ رَقُودٌ ... لَوْ أَطْلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَلَمَلَّثْتَ مِنْهُمْ رَعِيًّا

وہ ایسے لگتے تھے جیسے جاگ رہے ہوں (ان کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں) اگر تو انہیں دیکھتا تو گھبرا کے جھاگ اٹھتا اور تیرے پورے وجود پر خوف چھا جاتا۔ (کھٹ - ۱۸)

یہ آیت اس بات کی گواہ ہے کہ ان کی نیند عام کی سی نہ تھی بلکہ ایسی نیند تھی جو حالت موت کے مشابہ تھی۔ ان کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ علاوہ ازیں قرآن کہتا ہے :

سُورَجِ كِي رُشْنِي اِن كِي غَار كِي اندر نہیں پڑتی تھی۔

نیز اگر اس امر کی طرف توجہ کی جائے کہ ان کی غار احتمالاً ایشیائے کوچک کے کسی بلند اور ٹھنڈے مقام پر واقع تھی تو ان کی نیند کے استثنائی حالات اور زیادہ واضح ہو جاتے ہیں۔ دوسری طرف قرآن کہتا ہے :

وَنَقْلِبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِينِ وَذَاتَ الشَّمَالِ

ہم دائیں بائیں ان کے پہلو بدلتے رہتے تھے۔ (کھٹ - ۱۸)

یہ امر نشانہ ہی کرتا ہے کہ وہ بالکل ایک ہی حالت میں نہیں رہتے تھے ایسے حوالے کہ جو ابھی تک ہمارے لیے راز ہیں ان کے تحت شاید سال میں ایک مرتبہ انہیں دائیں بائیں پلٹایا جاتا تھا تاکہ ان کے بدن کے آگے و پیچ میں کوئی نقص نہ پڑ جائے۔

اب جبکہ اس مسئلے میں کافی واضح علمی بحث ہو چکی ہے نتیجہ اخذ کرتے ہوئے معاد اور قیامت کے بارے میں زیادہ گفتگو کی ضرورت نہیں رہتی کیونکہ ایسی طویل نیند کے بعد بیداری موت کے بعد زندگی کے غیر مشابہ نہیں ہے۔ اس سے ذہن معاد اور قیامت کے امکان کے قریب ہو جاتا ہے۔

۲۸) وَأَصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ وَلَا تَعْدُ عَيْنُكَ عَنْهُمْ تُرِيدُ زِينَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَلَا تُطِعْ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ وَكَانَ أَمْرُهُ فُرُطًا ۝

۲۹) وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكُمْ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيُكْفِرْ إِنَّا أَعْتَدْنَا لِلظَّالِمِينَ نَارًا لَا آحَاطَ بِهَا سُرَادِقُهُمْ وَإِنْ يَسْتَغِيثُوا يُغَاثُوا بِمَاءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِي الْوُجُوهَ بِئْسَ الشَّرَابُ ۖ وَسَاءَتْ مُرْتَفَقًا ۝

۳۰) إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ إِنَّا لَا نُضِيعُ أَجْرَ مَنْ أَحْسَنَ عَمَلًا ۝

۳۱) أُولَئِكَ لَهُمْ جَنَّاتُ عَدْنٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ يُحَلَّوْنَ فِيهَا مِنْ أَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَيَلْبَسُونَ ثِيَابًا خُضْرًا مِنْ سُندُسٍ وَاسْتَبْرَقٍ مُتَشَبِهِينَ فِيهَا عَلَى الْأَرَائِكِ نَعْمَ الثَّوَابُ ۖ وَحَسُنَتْ مُرْتَفَقًا ۝

ترجمہ

۲۸) ان لوگوں کے ساتھ رہ کہ جو صبح و شام اپنے رب کو پکارتے ہیں اور صرف اُس کی ذات کے خواہاں ہیں۔ حیات دنیا کی آرائش کی وجہ سے ہرگز اپنی نگاہیں

ان سے نہ اٹھالے اور ان لوگوں کی اطاعت نہ کر کہ جن کے دلوں کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر رکھا ہے وہ کہ جنہوں نے ہوائے نفس کی پیروی کی ہے اور جن کے کام تجاوز پر مبنی ہیں۔

۲۹) اور کہہ دے کہ یہ تیرے رب کی طرف سے حق ہے جو چاہے ایمان لے آئے (اور اس حقیقت کو مان لے) اور جو چاہے کافر ہو جائے۔ خالوں کے لیے ہم نے ایسی آگ تیار کر رکھی ہے کہ جس کی قناتیں انہیں ہر طرف سے گھیر لیں گی اور اگر وہ پانی مانگیں گے تو انہیں ایسا پانی پیش کیا جائے گا جو پگھل ہوئی دھات کی مانند ہوگا اور منہ کو بھون ڈالے گا۔ وہ کیا برا پانی ہے اور وہ کیا برا ٹھکانہ ہے۔

۳۰) یقیناً جو لوگ ایمان لے آئے اور انہوں نے اچھے عمل انجام دیئے، تو ہم نیک لوگوں کی جزا ضائع نہیں کریں گے۔

۳۱) وہ ایسے لوگ ہیں کہ جن کا مسکن بہشت جاوداں ہے، ایسے باغات بہشت کہ جن کے درختوں اور محلوں کے نیچے نہریں رواں ہیں۔ وہ وہاں سونے کے کنگنوں کے سنوارے جاتیں گے اور انہیں سبز رنگ کے نازک اور دبیز ریشم کے (فاخرہ) لباس پہنائے جائیں گے اور وہ تختوں پر ٹیکے لگائے بیٹھے ہوں گے۔ کیا ہی اچھی جزا ہے اور کیسی پیاری جگہ ہے۔

شان نزول

مندرجہ بالا آیات میں سے کچھ کی شان نزول کے بارے میں مفسرین نے لکھا ہے کہ کچھ سرمایہ دار منکبر، خود غرض، اشراف خدمت رسول میں حاضر ہوئے۔ وہ سلمان، ابوذر، صیب اور خطاب وغیرہ کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے: اے محمد (ﷺ) اگر تو محض محل میں صدر نشین ہو اور ایسے افراد کہ جن کی بدولت انسانی شام

کو اذیت پہنچاتی ہے اور جنہوں نے سخت ادنیٰ لباس پہن رکھے ہیں اپنے سے دور کر دے (یعنی مجلس میں اشرف اور بڑے لوگ بیٹھے ہوں) تو ہم تیرے پاس آئیں گے، تیری مجلس میں بیٹھیں گے اور تیری باتوں سے فائدہ اٹھائیں گے لیکن کیا کریں ان لوگوں کے ہوتے ہوئے تو ہم یہاں نہیں بیٹھ سکتے۔

اس وقت یہ آیات نازل ہوئیں اور پیغمبر اکرم کو حکم دیا گیا کہ ان پر فریب کھوکھلی باتوں کی طرف ہرگز مائل نہ ہوں اور زندگی کے ہر دور میں ہمیشہ باایمان، پاک دل افراد کے ساتھ رہیں کہ جو سلمان والہو ذریعہ ہوں اگرچہ ان کا ماتھ ثروت دنیا سے خالی ہو اور ان کا لباس کھردرا ہو۔

ان آیات کے نزول کے بعد رسول اللہ ان افراد کی تلاش کے لیے اٹھے۔ (یہ غلصہ مومنین ان سرمایہ داروں کی باتیں سن کر ناراض تھے اور مسجد کے ایک گوشے میں جا کر عبادت پر دروگاہ میں مشغول ہو گئے تھے)۔

آخر کار رسول اللہ نے انہیں مسجد کے آحسری حصے میں پایا۔ وہ لوگ ذکر الہی میں مشغول تھے۔ آپ نے فرمایا:

حمد ہے اس خدا کے لیے جس نے موت سے پہلے یہ حکم دیا کہ تم جیسے لوگوں کے ساتھ رہو۔

معکم المحیا ومعکم الممات

تمہارے ساتھ مینا اور تمہارے ساتھ مرنا ہی اچھا ہے نہ

پاک دل غریب لوگ

اصحاب کفایت کے واقعے نے ہمیں جو بہت سے درس دیئے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ انسانوں کی قدر و قیمت کا معیار منصب، ظاہری مقام اور دولت و ثروت نہیں ہے۔ اللہ کی راہ میں وزیر اور چرواہا ایک ہی صفت میں ہیں۔ زیر بحث آیات میں درحقیقت اسی اہم مسئلہ کا ذکر ہے۔ ان میں پیغمبر اکرم کو حکم دیا گیا ہے: ان افراد کے ساتھ رہو کہ جو صبح و شام اپنے پروردگار کو پکارتے ہیں اور صرف اسی کی پاک ذات کے طلبگار ہیں (واصبر نفسك مع الذين يدعون ربهم بالغداة والعشيٰ)

میسیدون وجہہ۔

”واصبر نفسك“ (اپنے آپ کو صابر بنا)۔ یہ تعبیر اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ

۱۔ مجمع البیان اور قرطبی۔ زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

رسول اللہ پر مشگبر دشمنوں اور بُرے اشرف کی طرف سے دباؤ تھا کہ غریب و فقیر مومنین کو اپنی بارگاہ سے دور کر دیں لہذا اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے کہ اس دباؤ کے مقابلے میں صبر و استقامت اختیار کرو اور ہرگز ان کے سامنے سر تسلیم خم نہ کرو۔

”صبح و شام“ کی تعبیر اس طرف اشارہ ہے کہ وہ ہر حالت میں اور زندگی بھر یادِ حسد ا میں محو رہتے ہیں۔

”میسیدون وجہہ“ (وہ اس کی ذات کے طلب گار ہیں)۔ یہ تعبیر ان کے خلوص اور اخلاص کی دلیل ہے۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ وہ خدا سے صرف اسی کو چاہتے ہیں۔ یہاں تک کہ بہشت کی نعمتیں اگرچہ بہت عظیم ہیں مگر وہ اس کی خاطر اللہ کی بندگی نہیں کرتے اور جہنم کا عذاب اگرچہ بہت دردناک ہے لیکن وہ اس کے خوف سے عبادت الہی نہیں کرتے بلکہ صرف اس کی پاک ذات کی خاطر اس کی پرستش کرتے ہیں۔ ان کے دل کی آواز تو لبس یہ ہے،

ما از تو بغیر از تو نداریم تنہا

ہم تجھ سے تیرے علاوہ کوئی تنہا نہیں رکھتے۔

اور یہ اللہ کی اطاعت، اس کی بندگی، اس کے عشق اور اس پر ایمان کا اعلیٰ ترین درجہ ہے نہ

اس کے بعد تاکید کے طور پر گفتگو جاری ہے: یہ باایمان کہ جو ظاہراً فقیر ہیں ان سے ہرگز اپنی آنکھیں نہ پھیرو اور دنیا کی زمینوں کی خاطر خدا سے بے خیران مشگبرین کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھو (ولا تعد عینا کہ عنہم ترید زینۃ الحیوۃ الدنیا)۔

مزید تاکید کے لیے فرمایا گیا ہے: اور جن کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے ان کی اطاعت نہ کرو (ولا تطع من اغفلنا قلبہ عن ذکرنا)۔ ان کی کہ جنہوں نے ہوائے نفس کی پیروی کی ہے (واتبع ہوہ)۔ وہی کہ جن کے سارے کام افراط پر مبنی ہیں۔ جو سوچ بچار اور خود فکر سے کام نہیں لیتے اور جن کے کام مد سے بڑھے ہوئے ہیں (وکان امرہ فراطاً)۔

۱۔ وجہ بھی ذات کے معنی میں آتا ہے اور بھی۔ چہرے کے معنی میں۔ اس قسم کے مواقع پر اس غفلت کے انتخاب کے بارے میں ہم تفسیر نمونہ جلد ۲ ص ۲۵ (اردو ترجمہ) پر تفصیلی بحث کر چکے ہیں۔

۲۔ لا تعد۔ ”عدا“ یعدوا۔ کے مادہ سے تہاد کرنے کے معنی میں ہے لہذا اچھے کاموں کا منہم یہ ہوگا۔ ان سے آنکھیں ہی نہ ہٹا کہ دوسرے پر نگاہ پڑے۔

۳۔ مغرط۔ مد سے تہاد کرنے کے معنی میں ہے اور ہر وہ چیز جو اپنی مد سے نکل کر اسراف ہو جائے اسے ”فراط“ کہتے ہیں۔

یہ بات حاذب نظر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں گروہوں کی صفات کو ایک دوسرے کے متقابل رکھ دیا ہے۔

حقیقی مومنین۔ کہ جو تہی دست ہیں۔ ان کے دل عشقِ خدا سے سرشار ہیں۔ وہ ہمیشہ اس کی یاد میں غور رہتے ہیں اور اُس سے فقط اس کے طلب گار ہیں۔

لیکن دولت مند مشرک یا دُعا سے بالکل غافل ہیں۔ جو اپنے نفس کے علاوہ ان کی کوئی طلب نہیں۔ ان کے سارے کام اعتدال کی حد سے بڑھے ہوئے ہیں اور وہ افراط و تفریط سے کام لیتے ہیں۔

مذکورہ مومنوں کی اس قدر اہمیت ہے کہ اگلی آیت میں قرآن صراحت کے ساتھ رسول اللہ سے کہتا ہے: کہ دو گمراہ تو یہ طریق کار ہے اور یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک حقیقت ہے جو چاہے ایمان لے آئے اور اس حقیقت کو قبول کر لے اور جو چاہے کافر ہو جائے (وقل الحق من ربکم من شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر)۔

لیکن یہ جان لو کہ یہ دنیا پرست ظالم کہ جو اپنی دنیاوی زندگی اور اس کی زیب و زینت پر اتراتے ہوئے سلمان و ابوذر جیسے لوگوں کے کھردرے لباس کا مذاق اڑاتے ہیں ان کا انجام بہت بُرا اور تاریک ہے کیونکہ ”ہم نے ان ظالموں کے لیے آگ تیار کر رکھی ہے کہ جس کے بلند خیوں نے چاروں طرف سے انہیں گھیر رکھا ہے (انا اعتدنا للظالمین نارا احاط بهم سرادقها)۔

جی ہاں! وہ جب اس دنیاوی زندگی میں پیاسے ہوئے تو آواز دیتے اور خدام طرح طرح کے مشروبات ان کے سامنے لا حاضر کرتے لیکن ”جہنم میں جب وہ پانی مانگیں گے انہیں ایسا پانی پیش کیا جائے گا جو ایسی پگھلی ہوئی دھات کی مانند ہو گا کہ اگر چہرے کے قریب ہو تو اسے بھون دے (وان یستنیشوا یناثوا بعباء کالمهل یشوی الوجوہ)۔ یہ پینے کی کیا بُری چیز ہے (بئس الشراب)۔ اور دوزخ کتنا بُرا ٹھکانا ہے (وساء مرتفقا)۔

غور کیجئے۔ وہ پانی کہ جو چہرے کے قریب ہو تو اسے بھون دے، کیا پینے کے قابل ہے؟ یہ اس بنا پر ہے کہ یہ لوگ دنیا میں اچھے اچھے مشروبات پیا کرتے تھے جبکہ محروم اور مستضعف لوگوں کے دلوں کو جلایا کرتے تھے۔ اب یہ وہی آگ ہے جس نے یہ جہانی شکل اختیار کر لی ہے۔

۱۔ ”مهل“ (بروزن ”مقل“)۔ جیسا کہ راغب نے مزدات میں کہا ہے۔ ”نشین تیل کو کتے ہیں کہ جو عام طور پر گندا، کھیت، گاڑھا اور بد فائز ہوتا ہے لیکن بعض مسرور نے اس لفظ سے ہر قسم کی پگھلی ہوئی دھات مراد لیا ہے اور ”یشوی الوجوہ“ (چروں کو بھون دیتا ہے) یہ تعبیر دوسرے معنی کی تائید کرتی ہے۔

۲۔ ”مرتفق“۔ ”دفع“ اور ”دفع“ کے مادہ سے ہے۔ اس سے دوستوں کے جمع ہونے کی جگہ مراد ہے۔

عجیب بات یہ ہے کہ قرآن نے یہاں دولت مندوں اور ظالم دہے ایمان مفاد پرستوں کے لیے جہنم میں بھی اس جہان کے تکلفات کا ذکر کیا ہے لیکن فرق یہ ہے کہ دنیا میں دولت مندوں کے جو ”سردق“ یعنی بلند خیے (یہ لفظ فارسی کے لفظ ”سراپردہ“ سے لیا گیا ہے) ہوتے ہیں ان میں غریبوں کا کوئی گزر نہیں۔ یہاں یہ امیروں کے عیش و نوش اور بادہ گساری کے لیے ہوتے ہیں لیکن وہاں ان کے بلند خیے دوزخ کے بلند بھڑکتے ہوئے شعلے ہیں۔ یہاں ان کے عیش کدوں میں طرح طرح کے مشروبات ہیں اور جب وہ ساقی کو آواز دیتے ہیں تو وہ شراب کے رنگارنگ جام ان کے سامنے لا حاضر کرتے ہیں۔ دوزخ میں بھی ان کیلئے ساقی اور مشروبات موجود ہیں۔ لیکن وہاں کا مشروب پگھلی ہوئی دھات کی مانند ہو گا۔ شیعوں کے اشکب سوزاں اور محتاجوں کی آہ آتشیں سے اُبلتا ہوا پانی۔

جی ہاں وہاں جو کچھ ہے وہ یہاں کی کیفیتوں کا تجسم ہے (پناہ بخدا)۔

قرآن حکیم کی روش چونکہ تطبیقی اور تربیتی ہے لہذا خود غرض دنیا پرستوں کے اوصاف اور ان کا کٹر کردار بیان کرنے کے بعد حقیقی مومنین کی حالت اور ان کا انتہائی زیادہ اجر و ثواب بیان کیا گیا ہے۔ پہلے مختصر طور پر اور پھر ذرا تفصیل سے۔ ارشاد ہوتا ہے: وہ کہ جو ایمان لاتے اور انہوں نے نیک عمل کیے ہم ان نیکو کاروں کا اجر و ثواب ضائع نہیں کریں گے (ان الذین آمنوا وعملوا الصالحات انا لا نضیع اجر من احسن عملا)۔ وہ ایسے لوگ ہیں کہ جناتِ جاوداں ان کے لیے ہیں (اولئک لہم جنات عدن)۔ وہ باغاتِ بہشت کہ جن کے درختوں سے نہریں رواں ہیں (تجری من تحتہم الانہار)۔ وہ سونے کے کنگنوں سے آراستہ ہوں گے (یحلون فیہا من اساور من ذهب)۔ اور وہ سبز رنگ کے نازک دبیز ریشم کے فاخرہ لباس زیب تن کیے ہوں گے (ویلبسون ثیابا خضرًا من سندس واستبرق)۔ جبکہ وہ تختوں اور کرسیوں پر تکیہ لگائے ہوں گے (متکئین فیہا علی الاراک)۔ وہ کیا کہنا! کیا ابھی چیز ہے (نعموا الشباب)۔

اور دوستوں کا کیسا اچھا اکٹھ ہے (وحسنت مرتفقا)۔

۱۔ ”اساور“۔ ”اسودہ“ (بروزن ”مشورہ“) کی جمع ہے اور خود ”اسودہ“ بھی ”سوار بروزن“ ”خمار“ اور ”کتب“ کی جمع ہے۔ پہل میں یہ فارسی لفظ ”ہمتوار“ (گھٹن) سے لیا گیا ہے۔ اسے عربی میں ڈھالنے کے بعد اس سے عربی کے فعل بھی مشتق ہوئے ہیں۔

۲۔ ”اراک“۔ ”اریکۃ“ کی جمع ہے۔ یہ اس تخت کو کہتے ہیں جو چاروں کونوں سے سائبان کی طرح ڈھانپا گیا ہو۔ راغب کے بقول یہ اصل میں ”اراک“ سے ہے جو ایک مشورہ درخت (پیل) کا نام ہے۔ اسے لیا گیا ہے کیونکہ عرب بعض اوقات اس درخت کے خاص طرح کا سائبان بناتے تھے۔ یا یہ لفظ ”اروک“ سے لیا گیا ہے کہ جو اقامت اور توقف کرنے کے معنی میں ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ طبقاتی تفاوت۔ معاشرے کی عظیم مشکل ہے: صرف یہی آیات نہیں کہ جو معاشرے کی ایر اور غریب کی تقسیم کے خلاف جنگ کر رہی ہیں بلکہ قرآن کی ایسی بہت سی آیات ہیں ان میں سے بعض کا مطالعہ ہم کر چکے ہیں اور بعض آئندہ آئیں گی۔

وہ معاشرہ کہ جس میں ایک گروہ (جو ظاہر ہے اقلیت میں ہوگا) بڑی خوشحال زندگی گزار رہا ہو، ناز و نعمت میں غرق ہو، اسراف میں ڈوبا ہو اور ساتھ ہی طرح طرح کے مفاسد اور برائیوں میں آلودہ ہو جبکہ دوسرا گروہ جو کہ اکثریت میں ہے زندگی کی ابتدائی ضروریات سے بھی محروم ہو۔ یہ وہ معاشرہ ہے کہ جسے نہ اسلام پسند کرتا ہے اور نہ وہ حقیقی انسانی معاشرے کا رنگ رکھتا ہے۔

ایسے معاشرے میں کبھی سکون و اطمینان نہیں ہو سکتا۔ اس پر ہمیشہ ظلم و ستم، لوٹ کھسوٹ اور استعمار و استبداد کی حکمرانی ہوگی۔ ایسے معاشرے میں آزادیاں سلب ہوں گی۔ خنجر جلیں عموماً ایسے ہی معاشرے سے اٹھی ہیں اور ایسے معاشرے سے پریشانیوں بھی ختم نہیں ہو سکتیں۔

اصولی طور پر یہ سب نعمات الہی آخر کیوں چند لوگوں کے ہاتھ میں ہوں اور معاشرے کی اکثریت طرح طرح کی محرومیوں، درد و غم، بھوک اور بیماریوں میں ایڑیاں رگڑ رہی ہو۔ یقیناً ایسا معاشرہ کینہ بغض، دشمنی، حسد، غرور، ظلم، خود پرستی، استبداد اور تباہی کے ایسے ہی عوامل سے پُر ہوگا۔ یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ تمام عظیم انبیاء خصوصاً پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسے نظام کے خلاف شدت سے اور مسلسل جہاد کیا تو اس کی بھی یہی وجہ ہے۔

ایسے معاشرے میں دولت مندوں کی محفلیں ہمیشہ تہی دستوں کی محفلوں سے الگ ہوتی ہیں، ان کے محلے الگ ہوتے ہیں، سیر و تفریح کے مراکز جدا ہوتے ہیں اور مل بیٹھنے کی جگہیں جدا ہوتی ہیں۔ (اگر غریبوں کے لیے بھی کوئی تفریح کی جگہ ہو تو وہاں کے طور طریقے بھی مختلف ہوتے ہیں)۔ یہاں تک کہ ان کے قبرستان بھی جدا جدا ہیں۔

یہ تفاوت اور تفریق کہ جو انسانی تقاضوں کے خلاف ہے اور تمام انسانی قوانین کی روح کے خلاف ہے کسی سرور خدا کے لیے قابل برداشت نہ تھی اور نہ ہے۔ زمانہ جاہلیت میں شدت سے یہ تفریق موجود تھی یہاں تک کہ وہ لوگ رسول اسلام کا سب سے بڑا عیب ہی سمجھتے تھے کہ سلمان و بدو جیسے پابرنہ اور تہی دست لوگوں نے آپ کو گھیر رکھا ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے میں بھی بت پرست اشراف اور "بڑے لوگ" آپ پر یہی اعتراض کرتے تھے کہ: "ہست لوگوں" (اراذل) نے کیوں تیری پیروی کی ہے؟

کیونکہ دل کے یہ اندھے بڑائی اور پستی کا معیار درہم و دینار کو سمجھتے تھے۔ قرآنی الفاظ میں،
فَقَالِ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَوْمِهِ مَا تَرَاكَ إِلَّا بَشَرًا مِثْلَكَ وَمَا تَرَاكَ إِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ أَرَادُوا لَنَا۔ (ہود - ۲۰)

ہم نے دیکھا ہے کہ ان خود پرست بے ایمان لوگوں کو با ایمان غریبوں کے ساتھ چند لمحے بھی بیٹھنا گوارا نہیں۔

اور تاریخ اسلام شاہد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کیسے ان خود پرستوں کو ایک طرف کر کے محروم لوگوں کو مواقع فراہم کیے اور ان کے ذریعے ایک حقیقی توحیدی معاشرہ تشکیل دیا۔ وہ معاشرہ کہ جس میں محض صلاحیتیں بیدار ہوئیں اور معاشرے میں انسانی وقار کا معیار انسانی کمالات، انسانی قدریں، تقویٰ، علم، ایمان، جہاد اور عمل صالح قرار دیا۔

آج بھی ایسے معاشروں کی تشکیل کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ پیغمبر اسلام کے طرز عمل کو نمونہ بنایا جائے۔ تعلیم و تربیت اور صحیح قوانین کی بنیاد پر طبقاتی فکر و نظر کا خاتمہ کر دیا جائے اور ان صحیح قوانین کو پوری طرح سے رائج کیا جائے چاہے عالمی استبداد کو یہ بات پسند آئے یا نہ آئے اور وہ اس کی مخالفت کے لیے ہی کیوں نہ اٹھ کھڑے ہوں۔ ہمیں جدوجہد کرنا چاہیے کیونکہ اس کے بغیر ایک صحیح و سالم حقیقی انسانی معاشرہ ہرگز تشکیل نہیں پاسکتا۔

۲۔ دونوں جہانوں کی زندگی کا موازنہ: ہم نے بار بار کہا ہے کہ تجسیم اعمال قیامت سے مربوط ایک نہایت اہم مسئلہ ہے یعنی اس جہان میں جو کچھ ہوگا وہ اس جہان کی ایک بڑی کی ہوئی تصویر (ENLARGED PICTURE) ہے وہ اسی دنیا کا تکامل و ارتقاء ہے۔ ہمارے اعمال و افکار، معاشرتی طور طریقے، مختلف اخلاقی عادات و خصائص اس جہان میں مجسم ہوں گے اور ہمیشہ ہمارے ساتھ رہیں گے۔
ذریعہ بحث آیات اس حقیقت کی زندہ تصویر ہیں۔

خود پرست اور ظالم دولت مند کہ جو اس جہان میں مخلوق میں تکیہ لگائے ہوئے نے نوشی میں سرمست تھے اور جن کی کوشش تھی کہ ان کی ہر چیز غریب مومنین سے الگ ہو۔ وہ وہاں بھی بلند میوں کے حامل ہوں گے لیکن وہ خبیثہ جلا ڈالنے والی آگ کے ہوں گے۔ کیونکہ ظلم و حقیقت آتش سوزاں ہے کہ جو مستضعفین کے خرم حیات اور سر پایہ امید کو جلا دیتی ہے۔ وہاں بھی انہیں مشروبات ملیں گے۔ وہاں شراب دنیا کا باطن جہانی روپ اختیار کرے گا۔ وہاں کے مشروبات محروم انسانوں کے خون و دل کا نتیجہ ہوں گے۔ اس دنیا میں ان کو ملنے والا مشروب نہ فقہان کی انہریوں کو جلا دے گا بلکہ پچھلی ہوئی دھات کی مانند جب وہ پینے کے لیے اپنا چہرہ اس کے قریب کریں گے تو وہ چہروں کو بھون دے گا۔

لیکن اس کے برعکس جن لوگوں نے اپنی پاکدامنی کی حفاظت کی اصول عدالت کا احترام کیا، ان چیزوں کو

ٹھکرا دیا، سادہ زندگی پر قناعت کی اور اس دنیا کی محرومیوں کو اس لیے قبول کر لیا کہ عدل قائم ہو۔ وہاں ان کے لیے بہشت بریں کے باغات جو کچھ جن کے درختوں تلے نہریں رواں ہوں گی۔ وہ فافرہ لباس پہنے ہوئے، زینت و رنگ اور شوق انگیز مٹھلیں ان کے انتظار میں ہوں گی۔ یہ تجسم ہے ان کی پاک نیت کا کہ وہ یہ نعمت دنیا تمام بندگان خدا کے لیے چاہتے ہیں۔

۳۔ بڑا پرستی اور خدا سے غفلت : انسان کی روح میں خدا سایا ہوتا ہے یا ہوائے نفس۔ یہ دونوں چیزیں اکٹھی نہیں ہو سکتیں۔ نفس پرستی درحقیقت خدا اور خلق خدا سے غفلت کا سرچشمہ ہے۔ بڑا پرستی تمام اخلاقی اصولوں سے دوری کا سبب ہے۔

مختصر یہ کہ بڑا پرستی انسان کو خود محور بنا دیتی ہے اور دنیا کے تمام حقائق سے دور کر دیتی ہے۔ ایک نفس پرست انسان اپنی خواہشات کی تکمیل کے علاوہ کچھ نہیں سوچتا، علم، آگاہی، ایثار، قربانی اور روحانیت کا اس کے لیے کوئی مفہوم نہیں۔

مندرجہ بالا آیات میں بڑا پرستی اور خدا سے غفلت کے درمیان رابطہ اچھی طرح سے واضح ہوتا ہے۔ ارشاد فرمایا گیا ہے :

ولا تقطع من اغفلنا قلبه عن ذكرنا واتبع هواه وكان امره فرطاً

پہلے خدا سے غفلت کا ذکر ہے اور پھر خواہشات کی پیروی کا۔ یہ بات لائق توجہ ہے کہ ان کا نتیجہ تجاوز اور افراط بیان کیا گیا ہے جو کہ مطلق کی صورت میں ہے۔ نفس پرست انسان ہمیشہ افراط میں گرفتار رہتا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ انسان کی طبیعت ایسی ہے کہ جب وہ مادی لذتوں میں پڑتا ہے تو پھر زیادہ اور زیادہ کی طلب ہوتی ہے۔ کل ایک شخص نشہ آور چیز کی جس مقدار سے مست ہوتا تھا آج اتنی مقدار سے اسے نشہ نہیں ہوتا بلکہ وہ تدریجاً اس کی مقدار میں اضافہ کرتا ہے۔ کل ایک شخص کو اپنے ساز و سامان کے ساتھ اگر نسبتاً ایک چھوٹی کوٹھی کافی معلوم ہوتی تھی تو آج وہ اسے کم سمجھتا ہے۔ انسان کی تمام خواہشات کا یہی عالم ہے یہاں تک کہ وہ اسی چکر میں اپنے آپ کو تباہ کر لیتا ہے۔

۴۔ دوسرے جہان میں لباس زینت : ممکن ہے بہت سے ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہو کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں دنیا کی زیب و زینت کی مذمت کی ہے لیکن مومنین کے لیے ایسی ہی زیب و زینت کا آخرت میں وعدہ کیا ہے۔ طلاق زینت، باریک و دبیز ریشمی لباس اور خوبصورت تخت وغیرہ۔

اس سوال کے جواب میں پہلے ہم اس نکتے کی طرف توجہ ضروری سمجھتے ہیں کہ ہم تو جہیں نکالنے والوں کی طرح، ان تمام الفاظ کو معنوی مفہام کے لیے ہرگز کنا یہ قرار نہیں دیں گے کیونکہ ہم نے خود قرآن سے سیکھا ہے کہ معاد و قیامت کا ایک پہلو روحانی ہے اور ایک پہلو جسمانی بھی ہے۔ لہذا اس جہان کی لذتیں بھی دونوں طرح کی ہیں البتہ اس میں شک نہیں کہ وہاں کی روحانی لذتوں کا مقابلہ جسمانی لذتوں سے نہیں کیا جاسکتا

اس کے باوجود اس حقیقت کو نہیں چھپایا جاسکتا کہ اُس جہان کی نعمتیں ہمارے لیے ایک ہولے کی طرح ہیں کہ جسے ہم دور سے دیکھ رہے ہوں۔ وہاں کی باتیں ہمارے لیے ایک اشارے کی مانند ہیں کیونکہ وہ جہان ہمارے لیے ایسے ہی ہے جیسے شک مادر میں موجود بچے کے لیے چار یا رہ جہان۔

ماں اپنے شکم کے بچے سے اس دنیا کے بارے میں کچھ کہ سکے تو اس دنیا کی خوبصورتی، خوشبودار شاخ، ماہ تاباں، رواں چشموں، باغات، رنگ برنگے پھولوں اور ایسی دوسری چیزوں کے بارے میں کچھ اشارے ہی کیے جاسکیں گے۔ چونکہ عالم جنین میں بچے کو سمجھانے کے لیے کافی و دانی الفاظ نہیں ہیں۔ اسی طرح رحم دنیا میں ہماری نظر محدود ہے۔ یہاں واضح طور پر قیامت کی مادی و معنوی نعمات کا پورا ادراک ممکن نہیں ہے۔ اس تمیدی وضاحت کے بعد اب ہم اس سوال کے جواب کی طرف آتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ اس دنیا کی زیب و زینت کی مذمت اس لیے کرتا ہے کہ یہ دنیا محدود ہے اور اگر کوئی یہاں پر زیب و زینت میں پڑے گا تو ایسی زندگی کی فراہمی کے لیے وہ طرح طرح کے ظلم اور زیادتی کا مرتکب ہوگا اور ایسی زندگی پانے کے بعد وہ غفلت میں جا پڑے گا۔ اس راستے میں تقریبات اور طبقے پیدا ہو جاتے ہیں جن کے باعث کینے، حسد، عداوتیں اور بالآخر خون ریزیاں جنم لیتی ہیں۔ لیکن اس جہان کی ہر چیز فزادوں ہے۔ وہاں ایسی زینتوں کے حصول سے کوئی مسد پیدا نہیں ہوگا اور نہ وہاں ان چیزوں کا حصول تفریق اور محرومیت کا سبب بنتا ہے، نہ وہاں اس سے کینہ اور نفرت ابھرتی ہے اور نہ معنویت و روحانیت سے محروم اس ماحول میں انسان خدا سے غافل ہوتا ہے۔ نہ وہاں پیڑوں کی حفاظت کا مسئلہ ہے اور نہ ہی رقیبوں کے حسد کا۔ یہ چیز وہاں غرور، تکبر کا باعث بنتی ہے اور نہ خدا اور خلق خدا کی دوری کا۔

لہذا اہل بہشت عظیم روحانی نعمتوں کے ساتھ ساتھ اس جسمانی لذت سے کیوں محروم رہیں جبکہ اس کا کوئی ناپسندیدہ نتیجہ نہیں ہے۔

۵۔ سرمائے کی وجہ سے سرمایہ داروں کی قربت : زیر بحث آیات ہمیں جو ایک اور نکتہ سکھاتی ہیں یہ ہے کہ ہم کسی گروہ کو ہدایت و ارشاد اس لیے ترک نہ کریں کہ وہ دولت مند ہے اور خوشحال زندگی گزارتا ہے۔ ایسے لوگوں کے گرد مریخ لکیر نہیں کھینچ دینا چاہیے بلکہ قابل مذمت یہ ہے کہ ہم اُن کی مادی زندگی سے فائدہ اٹھانے کے لیے ان کے قریب ہوں اور قرآن کے بقول "شرید ذینۃ الحیوۃ الدنیا" (تم دنیاوی زندگی کے طلبکار ہو) کے مصداق بنیں لیکن اگر مقصد ان کی ہدایت اور ارشاد ہو۔ یہاں تک کہ مقصد ان کے وسائل سے بہت اور تعمیری معاشرتی و اجتماعی ضروریات کے لیے فائدہ اٹھانا ہو تو ان سے رابطہ قائم رکھنا نہ صرف یہ کہ مذموم نہیں ہے بلکہ ضروری ہے۔

۳۲) وَأَضْرَبَ لَهُمْ مَثَلًا رَجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِأَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ

مِنْ أَعْنَابٍ وَحَفَفْنَاهُمَا بِنَخْلٍ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا ۝

۳۳) كَلَّمَا الْجَنَّتَيْنِ اتَتْ أَكْلَهَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِنْهُ شَيْئًا وَفَجَّرْنَا

خِلَلَهُمَا نَهْرًا ۝

۳۴) وَكَانَ لَهُ شَمْرٌ فَقَالَ لِمَصَاحِبِهِ وَهُوَ يُحَاوِرُهُ أَنَا

أَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَأَعَزُّ نَفَرًا ۝

۳۵) وَدَخَلَ جَنَّتَهُ وَهُوَ ظَالِمٌ لِنَفْسِهِ قَالَ مَا أَظُنُّ أَنْ

تَبِيدَ هَذِهِ أَبَدًا ۝

۳۶) وَمَا أَظُنُّ السَّاعَةَ قَائِمَةً وَلَئِنْ رُودْتُ إِلَىٰ رَبِّي لَأَجِدَنَّ

خَيْرًا مِنْهَا مُنْقَلَبًا ۝

ترجمہ

۳۲) ان سے مثال بیان کرو کہ دو شخص تھے۔ ایک کو ہم نے قسم قسم کے انگوروں کے

دو باغ دے رکھے تھے ان کے گردا گرد کھجور کے درخت تھے اور ان دونوں کے درمیان ابھی بابرکت کھیتی تھی۔

۳۳) دونوں باغ پھلتے پھولتے تھے اور ان کے بار آور ہونے میں کوئی کمی نہ تھی۔ ان

دونوں کے بیچوں بیچ ایک نہر گزرتی تھی۔

۳۴) اس باغ کے مالک کو خوب پیداوار ملتی تھی لہذا جب وہ اپنے دوست سے

بات کرنے لگا تو اُس نے کہا: میں دولت کے لحاظ سے تجھ سے برتر ہوں اور میرے

پاس زیادہ طاقتور افراد ہیں۔

۳۵) حالانکہ وہ اپنے اوپر ظلم کر رہا تھا۔ پھر وہ اپنے باغ میں داخل ہوا اور کہنے لگا کہ میرا

نہیں خیال کہ یہ باغ کبھی اجر جڑ جائے گا۔

۳۶) اور مجھے نہیں توقع کہ قیامت برپا ہوگی اور اگر میں اپنے رب کی طرف پلٹ بھی

گیا (اور قیامت آ بھی گئی) تو مجھے اس سے بہتر جگہ ملے گی۔

تفسیر

مستضعفین کے مقابلے میں مستکبرین کا موقف

گزشتہ آیات میں ہم نے دیکھا ہے کہ دنیا پرست کس طرح سے کوشش کرتے ہیں کہ وہ تہی دست اور

غریب مردان حق سے دُور دور رہیں۔ ہم نے یہ بھی پڑھا ہے کہ دوسرے جہان میں ان کا انجام کیا ہوگا۔

زیر بحث آیتوں میں دو دوستوں یا دو بھائیوں کی داستان مثال کے طور پر بیان کی گئی ہے۔ ان میں سے

ہر ایک مستکبرین اور مستضعفین کا ایک نمونہ تھا۔ ان کی طرز فکر اور ان کی گفتار و کردار ان دونوں گروہوں کے

موقف کا ترجمان تھا۔

پہلے فرمایا گیا ہے: اے رسول! ان سے دو شخصوں کی مثال بیان کرو کہ جن میں سے ایک کو ہم نے

انگوروں کے دو باغ دیئے تھے۔ ان میں طرح طرح کے انگور تھے۔ ان کے گردا گرد کھجور کے درخت آسمان

سے پاتیں کر رہے تھے۔ ان دونوں باغوں کے درمیان ہری بھری کھیتی تھی (واضرب لہم مثلاً رجلیین

جعلنا لاحدہما جنتین من اعناب وحففناہما بنخل وجعلنا بینہما زرعاً)۔ ایسے باغ اور

کھیتیاں جن میں ہر چیز خوب تھی۔ انگور بھی تھے، کھجوریں بھی تھیں، گندم اور دوسرا اناج بھی تھا۔ خود کھیل کھیتیاں

تھیں۔ یہ دونوں باغ پیداوار کے لحاظ سے بھرے پُرسے تھے۔ درخت پھلوں سے لدے ہوئے تھے اور

کھیتوں کے پودے خوب خوشہ دار تھے۔ ان دونوں باغوں میں کسی چیز کی کمی نہ تھی (کلما الجنّین اتّ

اکلھا ولم تظلمو منه شیئاً)۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ پانی جو ہر چیز کے لیے مائے حیات ہے، خصوصاً باغات و زراعت کیلئے،

انہیں فراہم تھا۔ کیونکہ دونوں باغوں کے درمیان ہم نے ایک نہر جاری کی تھی (وفجّرنا خلاًلہما نہراً)۔

اس طرح سے ان باغات اور کھیتوں کے مالک کو خوب پیداوار ملتی تھی (وكان له ثمر)۔

دنیا کا مقصد پورا ہو رہا ہو اور تو کم غرت اور بے وقعت انسان اپنی دنیاوی مراد پا کر غرور و تکبر میں مبتلا ہو جاتا ہے اور سرکشی کرنے لگتا ہے۔ پہلے پہلے وہ دوسروں کے مقابلے میں اپنے آپ کو بڑا سمجھنے لگتا ہے۔ باغات کے اس مالک نے بھی اپنے دوست سے بات کرتے ہوئے کہا: میں دولت اور سرمائے کے لحاظ سے تجھ سے برتر ہوں، میری آبرو، عزت اور حیثیت تجھ سے زیادہ ہے (فقال لصاحبه وهو يحاوره انا اكثر منك مالا واعز نفرا)۔ اور افرادی قوت بھی میرے پاس بہت زیادہ ہے۔ مال و دولت اور اثر و رسوخ میرا زیادہ ہے۔ معاشرے میں میری حیثیت زیادہ ہے۔ تو میرے مقابلے میں کیا ہے اور تو کس کھاتے میں ہے؟

آہستہ آہستہ اس کے خیالات بڑھتے چلے گئے اور بات یہاں تک پہنچ گئی کہ وہ دنیا کو جادوئی مال و دولت کو ابدی اور مقام و حشمت کو دائمی خیال کرنے لگا۔ وہ مزور تھا حالانکہ وہ خود اپنے آپ پر ظلم کر رہا تھا۔ ایسے میں اپنے باغ میں داخل ہوا اس نے ایک نگاہ سرسبز درختوں پر ڈالی جن کی شاخیں پھلوں کے بوجھ سے خم ہو گئی تھیں۔ اس نے اناج کی ڈالیوں کو دیکھا، نر کے آب رواں کی لہروں پر نظر کر کے جو چلتے چلتے درختوں کو سیراب کر رہا تھا۔ ایسے میں وہ سب کچھ بھول گیا اور کہنے لگا "میرا خیال نہیں کہ میرا باغ بھی کبھی ابرٹسے گا" (ودخل جننه وهو ظالم لنفسه قال ما اظن ان تبید هذه ابداً)۔

پھر اُس نے اس سے بھی آگے کی بات کی۔ اس جہان کا دائمی ہونا چونکہ حقیقت قیامت کے منافی ہے لہذا وہ انکار قیامت کا سوچنے لگا۔ اُس نے کہا: میرا ہرگز نہیں خیال کہ کوئی قیامت بھی ہے (وما اظن الساعة قاشعة) یہ تو وہ باتیں ہیں جو بعض لوگوں نے جی بھلانے کے لیے بنا رکھی ہیں۔

پھر مزید کہنے لگا، فرض کیا قیامت بھی اور میں اپنی اس حیثیت اور مقام کے ساتھ اپنے رب کے پاس جاؤں بھی تو یقیناً اُس سے بہتر جگہ پاؤں گا (ولئن رددت الی ربی لاجدن خیراً منها منقلباً)۔ وہ ان خام خیالوں میں غرق تھا اور ایک کے بعد دوسری فضول بات کرتا جاتا تھا کہ اس کا باایمان ساتھی بول اٹھا (اس نے جو باتیں کہیں اُن کا ذکر آئندہ آیات میں آ رہا ہے)۔

۳۷) قَالَ لَهُ صَاحِبُهُ وَهُوَ يُحَاوِرُهُ أَكَفَرْتَ بِالَّذِي خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُطْفَةٍ ثُمَّ سَوَّاهُ رَجُلًا ۝

۳۸) لَكِنَّا هُوَ اللَّهُ رَبِّي وَلَا أُشْرِكُ بِرَبِّي أَحَدًا ۝

۳۹) وَلَوْلَا إِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَاءَ اللَّهُ لَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ ۝

۴۰) إِنْ تَرَىٰ أَنَا أَقَلَّ مِنْكَ مَالًا وَوَلَدًا ۝

۴۱) فَعَسَىٰ رَبِّي أَن يُلَاقِيَكَ خَيْرًا مِّنْ جَنَّتِكَ وَيُرْسِلَ عَلَيْهَا حُسْبَانًا مِّنَ السَّمَاءِ فَتُصْبِحُ صَئِيدًا زَلْفًا ۝

۴۲) أَوْ يُصْبِحَ مَاءً غَورًا فَلَنْ تَسْتَطِيعَ لَهُ مَلَبًا ۝

ترجمہ

۳۷) جب وہ یہ باتیں کر رہا تھا تو اُس کے (باایمان) دوست نے کہا: کیا تو اُس

خدا سے کافر ہو گیا ہے کہ جس نے تجھے مٹی سے اور پھر نطفے سے پیدا کیا اور پھر تجھے پورا شخص بنایا۔

۳۸) لیکن میرا تو ایمان ہے کہ اللہ میرا رب ہے اور میں کسی کو اپنے رب کا شریک قرار نہیں دیتا۔

۳۹) جب تو اپنے باغ میں داخل ہوا تو تو نے یہ کیوں نہیں کہا کہ یہ نعمت اللہ کی منشا سے ہے اور اس کے علاوہ کوئی قوت نہیں ہے، اگر تو مجھے مال و اولاد کے لحاظ سے کم پاتا ہے (تو یہ کوئی اہم بات نہیں ہے)۔

شک کی نظر سے دیکھا ہے جس کا لازمی نتیجہ انکار خدا ہے کیونکہ معاد جسمانی کے منکر درحقیقت قدرت خدا کے منکر ہیں۔ انہیں اس بات پر یقین نہیں کہ منشر ہو جانے کے بعد مٹی پھر سے لباس حیات پہن سکے گی۔ لہذا اس با ایمان شخص نے خاک سے انسان کی پہلی خلقت، پھر نطفے سے اس کی تخلیق اور پھر دوسرے مراحل کے حوالے سے اسے پروردگار کی بے پایاں قدرت کی طرف متوجہ کیا تاکہ وہ جان لے کہ معاد کے کئی مناظر تو ہم ہمیشہ اپنی اسی زندگی میں دیکھتے رہتے ہیں۔

۲۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کے شرک اور کفر کی وجہ یہ تھی کہ وہ سمجھتا تھا کہ یہ مالکیت خود اس کی اپنی طرف سے ہے یعنی وہ اپنے لیے مالکیت میں اس کا قائل تھا اور اپنی مالکیت کو جادوائی خیال کرتا تھا۔

۳۔ تیسرا احتمال بھی بعید نظر نہیں آتا، وہ یہ کہ اُس نے اپنی کچھ باتوں میں خدا کا انکار کیا تھا اور اللہ تعالیٰ نے اس کی ساری باتیں بیان نہیں کیں۔ اس کا اندازہ اس با ایمان شخص کی باتوں سے کیا جاسکتا ہے۔ لہذا ہم دیکھتے ہیں کہ اگلی آیت میں وہ صاحب ایمان کہتا ہے کہ اگر تو اللہ کا انکار کرتا ہے اور راہ شرک اختیار کرتا ہے تو میں ایسا ہرگز نہیں کروں گا۔

بہر حال مذکورہ تینوں احتمالات آپس میں غیر مربوط نہیں ہیں اور ہو سکتا ہے اس توحید پرست شخص کا اشارہ ان سب کی طرف ہو۔

اس کے بعد اس با ایمان شخص نے اس کے کفر اور غرور کو توڑنے کے لیے کہا: لیکن میرا تو ایمان ہے کہ اللہ میرا پروردگار ہے اور مجھے اس عقیدے پر فخر ہے (لکننا ہوا اللہ ربی)۔

تو اس بات پر نازاں ہے کہ تیرے پاس باغات، کھیتیاں، پھل لہریاں فراوان ہیں لیکن مجھے اس پر فخر ہے کہ میرا پروردگار اللہ ہے، میرا خالق و رازق وہ ہے، تجھے اپنی دنیا پر فخر ہے اور مجھے اپنے عقیدہ توحید و ایمان پر۔ اور میں کسی کو اپنے رب کا شریک قرار نہیں دیتا۔ (ولا اشرک بربی احدا)۔

توحید اور شرک کا مسئلہ انسان کی سرنوشہ میں اہم ترین کردار ادا کرتا ہے۔ اس کے بارے میں گفتگو جاری ہے: ”جب تو اپنے باغ میں داخل ہوا تو تو نے یہ کیوں نہیں کہا کہ یہ نعمت اللہ کی منشاء سے ہے تو نے اسے اللہ کی جانب سے کیوں نہیں جانا اور اس کا شکر کیوں نہیں بجالایا (ولولا اذ دخلت جنتک قلت ما شاء اللہ)۔“

لفظ ”لکننا“ دراصل ”لکن انا“ تھا۔ پھر یہ دونوں الفاظ آپس میں مدغم ہو گئے تو یہ صورت ہو گئی۔

”ما شاء اللہ“ میں محذوف ہے۔ اس کی تقدیر یوں ہے:

هذا ما شاء الله

یہ وہ چیز ہے کہ جو اللہ نے چاہی ہے۔

(باقی اگلے صفحہ پر)

۴۰۔ بعید نہیں کہ میرا پروردگار مجھے تیرے باغ سے بہتر عطا کر دے اور تیرے باغ پر آسمان سے کوئی ایسا عذاب نازل کر دے کہ جو اسے چٹیل میدان میں بدل دے کہ جس پر پاؤں پھسل پھسل جائیں۔

۴۱۔ یا اس کا پانی زمین کی تہوں میں ایسا اتر جائے کہ تو اسے پا بھی نہ سکے۔

تفسیر

متضعفین کا جواب

ان آیات میں اُس مغرور، بے ایمان، خود مغرض دولت مند کی بے بنیاد باتوں کا جواب اس کے مومن دوست کی زبانی دیا گیا ہے۔ پہلے وہ خاموشی سے اس کوتاہ فکر انسان کی باتیں سناتا رہا تاکہ جو کچھ اس کے اندر ہے باہر آجائے اور پھر ایک ہی بار اسے جواب دیا جائے۔ ”اُس نے کہا: کیا تو اس خدا سے کافر ہو گیا ہے جس نے تجھے مٹی سے اور پھر نطفے سے پیدا کیا اور پھر تجھے پورا شخص بنایا (قال له صاحبه وهو يحاوره اكفرت بالذي خلقك من تراب ثم نطفة ثم سولك رجلا)۔“

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے کہ گزشتہ آیتوں میں مغرور شخص کی جو باتیں ہم نے پڑھی ہیں ان میں وجود خدا کا صریح انکار تو موجود نہیں ہے جبکہ ایک توحید پرست شخص اسے جو جواب دے رہا ہے ظاہر تو سب سے پہلے اُسے انکار خدا پر سرزنش کر رہا ہے اور اسے تخلیق انسان کے حوالے سے خدا سے عالم وقادری کی طرف متوجہ کر رہا ہے کیونکہ تخلیق انسان دلائل توحید میں سے بہت واضح دلیل ہے۔

وہ خدا کا جس نے ابتدا میں انسان کو خاک سے پیدا کیا۔ درختوں اور نباتات کی جڑوں نے زمین سے غذا حاصل کی۔ پھر نباتات حیوانات کی غذا بنے۔ انسان نے نباتات اور حیوانات سے غذا حاصل کی اور اس غذا کی قوت سے انسان کا لطف بنا جس نے رحم مادر میں تکمیل کے مراحل طے کیے۔ وہ دنیا میں آیا۔ یہاں تک کہ وہ ایک پورے انسان میں تبدیل ہو گیا۔ وہ انسان کہ جو موجودات زمین میں تمام سے برتر ہے جو سوچتا ہے، غور و فکر کرتا ہے، ارادہ کرتا ہے اور سب چیزوں کو اپنا مٹے بنا لیتا ہے۔

جی ہاں۔ ظاہر ایک بے حیثیت مٹی کا ایسے عجیب و غریب موجود میں تبدیل ہونا جس کی مشینری جسم و روح کے پیچیدہ آلات پر مشتمل ہے۔ توحید کی ایک بہت بڑی دلیل ہے۔

مفسرین نے مذکورہ سوال کے جواب میں مختلف تفسیریں پیش کی ہیں، مثلاً:

۱۔ بعض کا کہنا ہے کہ اس مغرور شخص نے صراحت کے ساتھ معاد اور قیامت کا انکار کیا ہے یا پھر اسے

تو نے کیوں نہیں کہا کہ اللہ کے سوا کسی کی کچھ طاقت نہیں (لاقوۃ الا باللہ)۔

اگر تو نے زمین میں ہل چلایا ہے، بیج بویا ہے، درخت لگائے ہیں، قلیں لگائی ہیں اور تجھے ہر موقع پر سب کچھ میسر آیا ہے یہاں تک کہ تو اس مقام پر پہنچا ہے تو سب اللہ کی قدرت سے استفادہ کرنے کی وجہ سے ہے۔ یہ تمام وسائل اور صلاحیتیں تجھے اللہ نے بخشی ہیں۔ اپنی طرف سے تو کچھ بھی تیرے پاس نہیں ہے اور اس کے بغیر تو کچھ بھی نہیں ہے۔

اس کے بعد اُس نے مزید کہا: یہ جو تجھے نظر آتا ہے کہ میں مال و اولاد کے لحاظ سے تجھ سے کم ہوں (یہ کوئی اہم بات نہیں ہے) (ان شر ان اقل منك مالا وولداً)۔

اللہ تیرے باغ کی نسبت مجھے بہتر عطا کر سکتا ہے (فعسی ربي ان يؤتني خيراً من جنتك)۔ بلکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خدا آسمان سے تیرے باغ پر بجلی گرائے اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ سرسبز شاہدِ زمین ایسے چٹیل میدان میں بدل جائے کہ جہاں پاؤں پھسلتے ہوں (ویرسل علیہا حساباً مہم السداد فتصبح صعيداً زلقاً)۔

یہ زمین کو حکم دے کہ وہ ہل جائے اور "یہ چشمے اور نہریں اس کی تہ میں ایسی چلی جائیں کہ پھر تو انہیں پا نہ سکے (او یصبح ماؤها غوراً فلن تستطيع له طلباً)۔

"حُبان" (بروزن، نُفحان) دراصل "حساب" کے مادہ سے لیا گیا ہے۔ بعد ازاں یہ لفظ ایسے تیزوں کے معنی میں استعمال ہونے لگا کہ جنہیں چلاتے ہوئے شمار کیا جاتا ہے۔ نیز یہ ایسی سزا کے معنی میں بھی ہے کہ جو کسی حساب کتاب کے تحت ہو مندرجہ بالا آیت میں اس کا یہی مفہوم ہے۔

"صید" اصل میں "صعود" سے لیا گیا ہے، اس سے مراد زمین کے اوپر کی تہ ہے۔

"زلق" چٹیل میدان کو کہتے ہیں، جس پر کوئی گھاس پھوس نہ ہو اور جس پر انسان کا پاؤں پھسل پھسل جائے (یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ موجودہ زمانے میں ریت کو بہرہ جانے سے روکنے کے لیے اور آبادیوں کو ریت کے طوفانوں میں دب جانے سے بچانے کے لیے کوشش کرتے ہیں کہ ایسے علاقوں میں نباتات اور درخت لگائے جائیں۔ یعنی ایسے علاقوں میں "زلق" اور پھسلنے کی کیفیت کو اس طرح سے کنٹرول کرنے کی کوشش کی جاتی ہے)۔

درحقیقت اس باایمان اور توحید پرست شخص نے اپنے مفزورِ ساقی کو خبردار کیا کہ وہ ان نعمتوں سے دل

نہ باندھ لے کیونکہ ان میں کوئی چیز بھی بھروسے کے قابل نہیں ہے۔

دراصل وہ کہتا ہے کہ تو نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے یا کم از کم سنا ہے کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آسمانی بجلی لمحہ بھر میں باغوں، گھسروں اور کھیتوں کو مٹی کے ٹیسلوں یا بے آب و گیاہ زمین میں بدل کے رکھ دیتی ہے۔ نیز تو نے سنا ہے یا دیکھا ہے کبھی زمین پر ایسا زلزلہ آتا ہے کہ چشمے خشک ہو جاتے ہیں اور نہریں نیچے چلی جاتی ہیں اس طرح سے کہ وہ قابلِ اصلاح بھی نہیں رہتیں۔

جب تو ان چیزوں کو جانتا ہے تو پھر یہ مفزور و غفلت کس بنا پر؟ تو نے یہ منظر دیکھے ہیں تو پھر یہ دہشت انگیزی آخر کیوں؟ تو یہ کہتا ہے کہ میں نہیں سمجھتا کہ یہ نعمتیں کبھی فنا ہوں گی اور تو یہ سمجھتا ہے کہ یہ ہمیشہ رہیں گی۔ کیسی نادانی اور حماقت ہے؟

میر گزشتہ ماہ: یا پھر یہ ہے

ماشاء اللہ کاش

جو خدا چاہتا ہے وہی ہوتا ہے۔

تفسیر

اور ان کا انجام کار...

ان کی آپس کی گفتگو ختم ہو گئی۔ اس خدا پرست شخص کی باتوں کا اس مغرور و بے ایمان دولت مند کے دل پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ اپنے انہی جذبات اور طرز فکر کے ساتھ اپنے گھر لوٹ گیا۔ اسے اس بات کی خبر نہ تھی کہ اس کے باغوں اور سرسبز کھیتوں کی تباہی کے لیے اللہ کا حکم صادر ہو چکا ہے۔ اسے خیال نہ تھا کہ وہ اپنے تکبر اور شرک کی سزا اسی جہان میں پالے گا اور اس کا انجام دوسروں کے لیے باعث عبرت بن جائے گا۔

شاید اس وقت کہ جب رات کی تاریکی ہر چیز پر چھائی ہوئی تھی، عذاب الہی نازل ہوا تباہ کن بجلی کی صورت میں یا وحشتناک طوفان کی شکل میں یا ہولناک زلزلے کی صورت میں اللہ کا عذاب نازل ہوا۔ بہر حال جو کچھ بھی تھا اُس نے چند لمحوں میں تروتازہ باغات، سرسبز درخت اور خوشوں سے لدی کھیتیاں درہم برہم اور تباہ کر دیں۔ اور عذاب الہی حکم خدا سے ہر طرف سے اس کے ٹرہ پر محیط ہو گیا اور اسے نابود کر دیا (واحیط بشمرہ)۔

”احیط“ ”احاطہ“ کے مادہ سے ہے اور ایسے مواقع پر یہ گھیر لینے والے ایسے عذاب کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جس کے نتیجے میں مکمل نابودی ہے۔

دن چڑھا۔ باغ کا مالک باغ کی طرف چلا۔ سرکشی اس کے ذہن میں ساتی ہوئی تھی۔ وہ اپنے باغات کی پیداوار سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی فکر میں تھا۔ جب وہ باغ کے قریب پہنچا تو اپنا تکبر اُس نے وحشت ناک منظر دیکھا۔ حیرت سے اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے تاریکی چھا گئی اور وہ وہاں بے حس و حرکت کھڑا ہو گیا۔

اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ یہ خواب دیکھ رہا ہے یا حقیقت۔ سب درخت اونڈھے پڑے تھے۔ کھیتیاں زیر و زبر ہو چکی تھیں۔ زندگی کے کوئی آثار وہاں دکھائی نہ دیتے تھے۔ گویا وہاں کبھی بھی شاداب و سرسبز باغ اور کھیتیاں نہ تھیں۔ اُس کا دل دھڑکنے لگا۔ چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ حلق خشک ہو گیا۔ اس کے دل و دماغ سے سب غرور و نخوت جاتی رہی۔ اُسے ایسے لگا جیسے وہ ایک طویل اور کمری نیند سے بیدار ہوا ہے۔ وہ مسلسل اپنے ہاتھ لی رہا تھا۔ اسے ان اعتراضات کا خیال آ رہا تھا جو اس نے پوری زندگی میں ان پر صرف کیے تھے۔ اب وہ سب برباد ہو چکے تھے اور درخت اونڈھے گرے پڑے تھے (خاصب یقلب کفیه علی ما انفق فیہا وہی خاویۃ علی عروشا)۔

اس وقت وہ اپنی فضول باتوں اور بیودہ سوچوں پر پشیمان ہوا۔ وہ کہتا تھا: کاش میں نے کسی کو

۴۲) وَأَحِيطَ بِشَمَرِهِ فَاصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلَىٰ مَا آنَفَقَ

فِيهَا وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَىٰ عُرُوشِهَا وَيَقُولُ يَلَيْتَنِي لَمْ

أُشْرِكْ بِرَبِّي أَحَدًا ۝

۴۳) وَلَمْ تَكُنْ لَهُ فِئَةٌ يَنْصُرُونَهُ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَمَا

كَانَ مُنْتَصِرًا ۝

۴۴) هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلَّهِ الْحَقِّ هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا

وَخَيْرٌ عُقْبًا ۝

ترجمہ

۴۲) (بہر حال عذاب الہی آپہنچا) اور اس کا سارا ٹرہ تباہ ہو گیا۔ اس کی جو

لاگت آئی تھی اُس پر وہ ہاتھ ملتا رہ گیا۔ باغ کی حالت یہ تھی کہ اپنی ٹہنیوں پر

اونڈھا گرا پڑا تھا۔ اب وہ کہتا تھا اے کاش میں نے کسی کو اپنے رب کا

شریک قرار نہ دیا ہوتا۔

۴۳) اور کوئی جتنا نہ تھا جو خدا کے سوا اُس کی مدد کرتا اور نہ وہ آپ اپنی کچھ مدد

کر سکتا تھا۔

۴۴) اس وقت ثابت ہوا کہ ولایت (اور قدرت) خداوند حق کے لیے ہے

کہ جس کے ہاں (اطاعت گزاروں کے لیے) بہترین ثواب اور

بہترین انجام ہے۔

اپنے پروردگار کا شریک قرار نہ دیا ہوتا۔ اسے کاشیں نے شرک کی راہ پر قدم نہ رکھا ہوتا (و یقول یا یلتنی لعلی اشرك بربی احداً)۔

زیادہ المناک پہلو یہ تھا کہ ان تمام مصائب و آلام کے سامنے وہ تنہا کھڑا تھا۔ خدا کے علاوہ کوئی نہ تھا کہ جو اس مصیبت عظیم اور اتنے بڑے نقصان پر اس کی مدد کرتا (ولم تکن له فشة ینصرونه من دون الله)۔ اور چونکہ اُس کا سارا سرمایہ تو یہی تھا جو برباد ہو گیا تھا۔ اب اس کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ لہذا وہ خود بھی اپنی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ (وما کان منتصراً)۔

درحقیقت اس واقعے نے اس کے تمام غرور آمیز تصورات و خیالات کو زمین بوس اور باطل کر دیا۔ ابھی تو وہ کہتا تھا کہ میں نہیں سمجھتا کہ یہ عظیم دولت و سرمایہ کبھی فنا ہو گا لیکن آج وہ اپنی آنکھوں سے اس کی تباہی دیکھ رہا تھا۔

دوسری طرف وہ اپنے خدا پرست اور با ایمان دوست کے سامنے غرور و تکبر کا مظاہرہ کرتا تھا اور کہتا تھا کہ میں تجھ سے زیادہ قوی ہوں۔ میرے یار و مددگار زیادہ ہیں لیکن اس واقعے کے بعد اس نے دیکھا کہ کوئی بھی اس کا مددگار نہیں ہے۔

اُسے کبھی اپنی طاقت پر بڑا گھمنڈ تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس کی بہت قوت ہے لیکن جب یہ واقعہ رونما ہوا اور اس نے دیکھا کہ کچھ بھی اُس کے بس میں نہیں تو اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا کیونکہ اب وہ دیکھ رہا تھا کہ اُس کے بس میں اتنا بھی نہیں کہ وہ اس نقصان کے کچھ حصے کی بھی تلافی کر سکے۔

اصولی طور پر مال و دولت کے گرد جمع ہو جانے والے لوگ تو مٹھاس پر بکیوں کے جمع ہونے کی مانند ہوتے ہیں بعض اوقات انسان سمجھتا ہے کہ بڑے دنوں میں یہ لوگ اس کا سہارا بنیں گے لیکن جب مال و دولت ختم ہو جائے تو وہ بھی نظر نہیں آتے۔ کیونکہ ان کی دوستی کوئی قلبی اور روحانی بنیاد پر تو ہوتی نہیں وہ تو مادی ہوتی ہے اور جب مادی نعمت ختم ہو جاتی ہے تو وہ بھی دکھائی نہیں دیتے۔

لیکن جو بھی بڑا اب تو وقت گزر چکا تھا اور کسی سنگین مصیبت کو دیکھ کر جو بیداری پیدا ہوتی ہے وہ تو منظر آری حیثیت رکھتی ہے۔ ایسی بیداری تو فرعون اور مرد یسے افراد میں بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے لیے بھی اس کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اُس وقت اُس نے کہا:

لعلی اشرك بربی احداً

کاش! میں اپنے رب کا کسی کو شریک نہ گردانا۔

یہی بات تو اُس کے دوست نے کہی تھی لیکن اُس کا یہ ایمان سلامتی کے ماحول میں تھا اور اس کا یہ اعتماد مصیبت کے موقع پر تھا۔

یہ وہ وقت تھا کہ یہ حقیقت پھر پھر یہ ثبوت کو پہنچ گئی تھی کہ ولایت و قدرت خدا کے لیے ہے وہ خدا

کہ جو عین حق ہے (هنا لك الولایة لله الحق)۔

جی ہاں! اس موقع پر یہ باری طرح واضح ہو گیا کہ تمام نعمتیں اس کی طرف سے ہیں اور جو کچھ اس کا ارادہ ہو وہی کچھ ہوتا ہے اور اس کے لطف و کرم پر بھر دوسرے کیے بغیر کچھ نہیں بنتا۔

جی ہاں وہی ہے کہ جس کے ہاں اطاعت گزاروں کے لیے بہترین جزا و ثواب ہے اور بہترین عاقبت و آخرت ہے (ہو خیر ثواباً و خیر عقباً)۔

پس اگر انسان کسی سے دل لگانا چاہتا ہے اور کسی پر بھروسہ کرنا چاہتا ہے اور کسی سے جزا کی امید باندھنا چاہتا ہے تو کیا ہی بہتر ہے کہ وہ خدا سے لو لگائے، اس پر بھروسہ کرے اور اس کے لطف و احسان کی امید رکھے۔

چند اہم نکات

۱۔ دولت کا غرور: اس داستان میں ہم نے دولت کے غرور کی زندہ تصویر دیکھی ہے اس میں ہمیں معلوم ہوا ہے کہ غرور کا انجام کیا ہے، وہ غرور کہ جس کی انتہا شرک اور کفر ہے۔

کم ظرف لوگ جب کسی مقام پر جا پہنچتے ہیں اور مقام و دولت کے لحاظ سے دوسروں پر کچھ برتری مائل کر لیتے ہیں تو اکثر اوقات غرور کی بیماری میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ان وسائل کے بل بوتے پر وہ دوسروں کے سامنے بڑے جتنے پھرتے ہیں۔ بھیکوں کی طرح بیٹھنا نہ والے لوگ جب ان کے گرد جمع ہو جائیں تو وہ بھینے لگتے ہیں کہ لوگوں کے دلوں پر ان کا اثر و رسوخ قائم ہو گیا ہے۔ اسی کو قرآن نے "انا اکثر منک مالا و اعز نفلاً" میں بیان کر رہا ہے۔

دنیا کا عشق رفتہ رفتہ ان میں یہ خیال پیدا کرنے لگتا ہے کہ یہ دنیا جادواں ہے اور پھر وہ یہ کہنے لگتے ہیں:

ما اظن ان تبید هذه ابداً

میں نہیں سمجھتا کہ یہ کبھی ختم ہو گا۔

اگر انسان مادی دنیا کی جادوئی کا قائل ہو جائے تو اس سے قیامت پر ایمان کی نفی ہوتی ہے لہذا ایسے لوگ کہنے لگتے ہیں:

وما اظن الساعة قاضية

میرا نہیں خیال کہ کبھی قیامت بھی آئے گی۔

ان کی خود پسندی کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو مقرب بارگاہ الہی سمجھنے لگتے ہیں اور سوچنے لگتے ہیں کہ خدا کے ہاں ان کا بہت زیادہ مقام و مرتبہ ہے۔ درکنے لگتے ہیں کہ اگر ہمیں اللہ کی طرف واپس

جاتا بھی پڑا اور معاد و قیامت کا کوئی دھواں تو پھر بھی دہاں ہمارا مقام یہاں سے بہتر ہوگا "ولئن رددت الی ربی لاجدن خبیثا منها منقلبا"

یہ چار مراحل کم و بیش تھوڑے بہت فرق کے ساتھ تمام دنیا پرست اہل اقتدار اور طاقتوروں میں پائے جاتے ہیں۔ ان کے انحراف کا آغاز دنیا پرستی سے ہوتا ہے اور شرک، بت پرستی اور انکار قیامت پر خاتم ہوتا ہے کیونکہ وہ مادی طاقت کو بت کی طرح پوجتے ہیں اور اس کے علاوہ سب کچھ بھول جاتے ہیں۔

۲۔ اس داستان کے چند سبق : یہ عبرت انگیز داستان مختصری ہے لیکن اس میں مذکورہ بہت بڑے درس کے علاوہ بھی بہت سے درس موجود ہیں۔ مثلاً :

الف۔ مادی دنیا کی نعمتیں جتنی بھی زیادہ ہوں ان پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا اور وہ ناپائیدار ہوتی ہیں، کڑکٹی ہوئی بجلی چند لمحوں میں سالبا سال میں تیار کیے گئے باغوں اور کھیتوں کو خاکستر بنا دیتی ہے۔ ان کی جگہ مٹی کے ٹیلوں اور پھسلنے والی زمین سجا کچھ نظر نہیں آتا۔ تھوڑا سا زلزلہ زمین کے ان پانیوں اور چشموں کو نگل لیتا ہے جن پر زندگی اور اس کی برکتوں کا دار و مدار ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ پھر اصلاح کی بھی گنجائش نہیں رہتی۔

ب۔ مادی مفادات کے لیے جو دوست انسان کے ارد گرد جمع ہو جاتے ہیں وہ اس قدر بے اعتبار اور بے وفا ہوتے ہیں کہ اسی لمحے جب دنیاوی نعمتیں انسان سے جدا ہو رہی ہوتی ہیں وہ اس سے ایسے رخصت ہوتے ہیں جیسے پہلے ہی جانے کو تیار بیٹھے تھے۔ "ولم تکن له فئسة ینصرفونہ من دون اللہ"۔ ایسے واقعات ہم نے بار بار سنے یا دیکھے ہیں۔ ان سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کے علاوہ کسی سے دل نہیں باندھنا چاہیے۔ انسان کے با وفا اور سچے دوست وہی ہیں جن سے معنوی اور روحانی رشتہ ہو۔ ایسے ہی دوست ثروت و تنگدستی، بڑھاپے اور جوانی، تندرستی اور بیماری اور عزت و ذلت کے ہر عالم میں دوست ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کی محبت و مودت کا رشتہ موت کے بعد بھی قائم رہتا ہے۔

ج۔ بلا و مصیبت کے بعد کی بیداری عام طور پر فضول ہوتی ہے۔ ہم نے بار بار کہا ہے کہ اضطراری بیداری انسان کے اندر دلی انقلاب اور اس کے طرز عمل کی تبدیلی کے لیے دلیل نہیں ہوتی اور نہ گزشتہ اعمال پر ندامت کی علامت ہوتی ہے بلکہ جب تختہ دار پر یا سوج طوفان پر انسان کی نگاہ پڑتی ہے تو اس پر وقتی طور پر اٹھو ہوتا ہے۔ ایسے میں چند لمحوں کے لیے جبکہ اسے اپنی زندگی بھی چند لمحے دکھائی دیتی ہے وہ اپنے طرز عمل میں تبدیلی کا ارادہ کرتا ہے لیکن چونکہ یہ ارادہ اس کی روح سے نہیں اٹھا ہوتا لہذا اس طوفان کے گزرتے ہی اس کا یہ ارادہ بھی ختم ہو جاتا ہے اور وہ اپنے پہلے راستے کی طرف پلٹ جاتا ہے۔

یہ جو سورہ نساء کی آیہ ۱۸ میں ہے کہ انسان جب موت کی نشانیاں دیکھتا ہے تو توبہ کے دروازے اس پر بند ہو جاتے ہیں، اس کی یہی وجہ ہے۔ اسی طرح قرآن سورہ یونس کی آیت ۹۰ اور ۹۱ میں فرعون کے بارے میں کہتا ہے کہ جب وہ غرق ہونے لگا اور جب وہ دریا کی لہروں میں غوطے کھانے لگا تو اس نے

پکارا کہ میں بنی اسرائیل کے خدا، خدا سے یکتا پر ایمان لایا ہوں لیکن اُس کی یہ توبہ ہرگز قبول نہ ہوئی۔ فرعون کی اس توبہ کی عدم قبولیت کی بھی یہی وجہ ہے۔

د۔ فقر و ذلت کی دلیل ہے اور نہ ثروت و عزت کی دلیل ہے۔ یہ بھی ایک درس ہے کہ جو ہم زیر بحث آیات سے حاصل کرتے ہیں جبکہ مادی معاشرہ اور مادی محنت فکر کے نزدیک تو فقر و ثروت و ذلت و عزت کی دلیل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ زمانہ جاہلیت کے مشرکین پیغمبر اسلام کے قیم اور تہی دست ہونے پر تعجب کرتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ قرآن مکہ اور طائف کے کسی دولت مند پر کیوں نازل نہیں ہوا۔ ان کے الفاظ میں :

لَوْلَا نَزَّلَ هَذَا الْقُرْآنُ عَلَى رَجُلٍ مِّنَ الْقُرَیَّتِیْنِ عَظِیْمٍ (زخرف - ۳۱)

۵۔ جب مال و مقام کی وجہ سے ایک آزاد انسان غرور کی زنجیروں میں جکڑا جاتا ہے تو اگر وہ اپنی پیدائش کی تاریخ پر نظر کرے تو یہ زنجیریں ٹوٹ سکتی ہیں۔ کیونکہ وہ دیکھتا ہے کہ وہ توبے و قنوت خاک تھا، ایک ناقابل نطفہ تھا پھر وہ اپنی ماں کے بطن سے اس حالت میں پیدا ہوا کہ بہت کمزور تھا۔ جیسا کہ قرآن زیر نظر آیات میں اس بے ایمان دولت مند کا غرور ختم کرنے کے لیے گزرے ہوئے زمانے کی اسے یاد دلاتا ہے۔ اس کا با ایمان دوست کہتا ہے :

اکفرت بالذی خلقک من تراب شرم نطفة شرم سواک رجلاً

۶۔ ان آیات میں عالم طبیعت کے ایک درس کی طرف بھی متوجہ کیا گیا ہے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ ہرے بھرے باغوں کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے :

ولم تظلمو منه شیئاً

یعنی۔ پھل دینے میں ان باغوں نے جہاں انسانیت پر کوئی ظلم نہیں کیا۔

لیکن اس صاحب باغ کے بارے میں فرمایا گیا ہے :

ودخل جنتہ وهو ظالم لنفسہ

وہ اپنے باغ میں داخل ہوا جبکہ وہ اپنے آپ پر ظلم کر رہا تھا۔

قرآن کنایہ چاہتا ہے کہ اے انسان! جہاں خلقت پر نگاہ ڈال، پھلوں سے لے کر ان درختوں اور ان ہری کھیتوں کے پاس جو کچھ ہے خلوص کے طبق میں رکھ کر تجھے پیش کر دیتی ہیں۔ ان میں خود غرضی ہے اور نہ بغل و حسد۔ جہاں آفرینش ایثار اور بخشش کا منظر پیش کرتا ہے۔ جو کچھ زمین کے پاس ہے وہ بڑے ایثار کے ساتھ نباتات اور حیوانات کو پیش کر رہی ہے۔ نباتات اپنی ساری نعمتیں انسان اور دوسرے جانداروں کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔ سورج کی ٹمکے روز بروز کمزور پڑ رہی ہے مگر نور افشانی کے جاری ہے۔ بادل برستے ہیں اور باد نسیم کی مویں چلتی ہیں اور ہر طرف زندگی کی لہریں بکھیر دیتی ہیں۔ یہ نظام آفرینش ہے۔

ایک بڑی زندہ اور منہ بولتی مثال پیش کی ہے۔ یہ وہ مثال ہے جو لوگ اپنی زندگی میں عموماً دیکھتے رہتے ہیں یہ مثال مغرور و غافل افراد کو بیدار کرنے کے لیے بیان کی گئی ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: حیات دنیا کے لیے ان سے آسمان سے برسنے والے بارش کے قطروں کی مثال بیان کر (واضرب لهم مثل الحیوة الدنیا کماء انزلنا من السماء)۔

بارش کے یہ حیات بخش قطرے پہاڑوں، صحراؤں اور میدانوں میں گرتے ہیں۔ زمین کے اندر موجود وہ دانے جن میں صلاحیت ہوتی ہے ان میں ان قطروں سے جان پڑ جاتی ہے اور وہ اپنی زندگی کا ارتقا سفر شروع کر دیتے ہیں۔

دانے اگرچہ سخت ہوتے ہیں اور ان کی جلد مضبوط ہوتی ہے لیکن وہ بارش کی نرمی کے ساتھ نرم ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے پودے پھوٹتے ہیں اور آخر کار شاخیں مٹی سے سر نکالتی ہیں۔ سورج جھکتا ہے، بادیم چلتی ہے، زمین میں موجود غذائی مواد بھی ندرکتا ہے اور یہ نورس شاخیں ان تمام عوامل حیات سے قوت پا کر رشد و نمو کا سفر جاری رکھتی ہیں۔ اس طرح سے، کچھ مدت بعد پودے ایک دوسرے سے بل جمل جاتے ہیں ایسے کہ جیسے گلے مل رہے ہوں۔ (فاختلط به نبات الارض)۔

کوہ و صحرا میں زندگی لہلہانے لگتی ہے۔ پھول اور پھل شاخوں کو زینت بخشتے ہیں تو ہر طرف خوشیاں اور مسرتیں بکھرجاتی ہیں۔ لیکن یہ دلربا منظر زیادہ دیر نہیں رہتا۔ پھر بادِ غزاں چلنے لگتی ہے۔ موت کی گرد اُن کے سروں پر آ پڑتی ہے۔ ہوا خشک ہو جاتی ہے اور پانی کم ہو جاتا ہے۔ زیادہ دیر نہیں گزرتی کہ وہ مسکراتے ہوئے سرسبز و شاداب پودے پژمردہ اور بے فروغ شاخوں اور پتوں میں بدل جاتے ہیں (فاصبح هشیماً)۔

وہ پتے کہ جنہیں فصل بہار کی تیز ہوائیں بھی جدا نہیں کر سکتی تھیں آج اس قدر بے جان ہو گئے ہیں کہ "ہوا کے جھونکے انہیں جدا کر کے ادھر ادھر لیے پھرتے ہیں" (تذروه الرياح)۔

جی ہاں! خدا ہر چیز پر قادر تھا اور قادر ہے (وكان الله على كل شئ مقتدرًا)۔ مال و ثروت اور افزائی قوت کہ جو دنیاوی زندگی کے دو اصلی رکن ہیں ان کے بعد اگلی آیت میں فرمایا گیا ہے: مال و اولاد حیات دنیا کی زینت ہیں (المال والبنون زينة الحیوة الدنیا)۔ یہ حیات دنیا کے شجر کی شاخوں کے پھول ہیں جن کی عمر بہت کم ہے۔ راہ خدا میں رنگِ جاوداں

لے "هشیو" "هشور" کے مادہ سے توڑنے کے معنی میں لیا گیا ہے اور یہاں ایسی خشک گھاس چونس کے لیے

استعمال ہوا ہے کہ جسے توڑ دیا گیا ہو۔

لے "تذروه" "مادہ" "ذرو" سے منتشر کرنے اور بکھرنے کے معنی میں ہے۔

لیکن۔ اسے انسان! تو چاہتا ہے کہ تو اس عالم کا گل سرسبد بھی ہو اور اس کے واضح قوانین کو بھی با مال کر دے۔ تیری آرزو ہے کہ تو ساری نعمتیں خود لے لے اور دوسروں کا حق بھی چھین لے۔

④۵ وَاضْرِبْ لَهُمْ مَثَلِ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنَاهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاَخْتَلَطَ بِهِ نَبَاتُ الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا تَذْرُوهُ

الرِّيحُ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا ۝
④۶ اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِينَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَالْبَلٰىئُ الصَّٰلِحَةُ خَيْرٌ ۚ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابٌ وَخَيْرٌ اَمَلًا ۝

ترجمہ

④۵ انہیں حیات دنیا کے لیے یہ مثال دو کہ ہم آسمان سے پانی برساتے ہیں اس سے زمین کی پود خوب پھل پھولی پھر کچھ عرصے بعد وہ خشک ہو گئی اور ہوا نے اسے ادھر ادھر بکھیر دیا اور خدا ہر چیز پر قادر ہے۔

④۶ مال و اولاد تو دنیاوی زندگی کی زینت ہیں اور باقیات صالحات (پائیدار اور اچھے اعمال اور یہ نیکیوں) کا ثواب تیرے رب کے ہاں بہتر اور زیادہ اُمید بخش ہے۔

زندگی کی ابتدا و انتہا کیلئے ایک مثال

گزشتہ آیات میں مادی دنیا کی ناپائیدار نعمتوں کے بارے میں گفتگو تھی اور اس حقیقت کا ادراک ۶ یا ۸۰ سال کی عمر میں عام افراد کے لیے آسان نہیں ہے لہذا قرآن نے زیر نظر آیت میں اس کے لیے

ذہبائیں تو یہ بہت بے اعتبار ہیں۔

در حقیقت اس آیت میں دنیاوی زندگی کے سرمائے کے دو اہم ترین حصوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ دنیاوی زندگی کی باقی چیزیں انہی دو سے وابستہ ہیں۔ ایک اقتصادی قوت ہے اور دوسری انفرادی قوت۔ ہر مادی مقصد تک پہنچنے کے لیے جتنا ان دو قوتوں کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل اقتدار یا طاقت حاصل کرنے کے خواہشمند ان دو قوتوں کو جمع کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ خصوصاً گزشتہ زمانے میں جس شخص کے زیادہ پیٹے ہوتے تھے وہ اپنے آپ کو زیادہ قوی محسوس کرتا تھا۔ گزشتہ آیات میں بھی جس بے ایمان دولت مند کا ذکر کیا گیا ہے وہ اپنے مال اور انفرادی قوت کا ذکر دوسروں کے سامنے بڑے غرور سے کرتا تھا اور کہتا تھا:

انا اکثر منلک مالا واعز نفرا

میرے پاس تجھ سے زیادہ مال اور زیادہ آدمی ہیں۔

پہلے "سون" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو "این" کی جمع ہے جس کا معنی ہے بیٹا۔ کیونکہ وہ بیٹوں کو انسانی سرمایہ اور فعال قوت سمجھتے تھے نہ کہ بیٹیوں کو۔

ہر حال جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے باغات، کھیتیاں اور پانی کے چشمے چند لمحوں میں نابود ہو گئے جو ظاہراً بہت مستحکم دولت تھی۔ اولاد کی زندگی اور سلامتی بھی ہمیشہ خطرے میں ہونے کے علاوہ بعض اوقات وہ دشمن ہو جاتی ہے اور مددگار ہونے کی بجائے تکلیف رساں ہو جاتی ہے۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: باقیات الصالحات (پائیدار اور شائستہ کاموں اور نیکیوں کا ثواب تیرے پردردگار کے ہاں بہتر اور زیادہ امید بخش ہے) (والباقیات الصالحات خیر عند ربک ثواباً وخیر املاً)۔

بعض مفسرین نے "باقیات الصالحات" کا بالکل محدود مفہوم بیان کیا ہے۔ مثلاً بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد نماز، حج، زکوٰۃ ہے۔ کچھ نے کہا ہے کہ اس سے یہ ذکر مراد ہے:

سبحان الله والحمد لله ولا اله الا الله والله اكبر

اسی طرح بعض لوگوں نے دیگر محدود مفہوم بیان کیے ہیں لیکن واضح ہے کہ اس تعبیر کا مفہوم اس قدر وسیع ہے کہ ہر صالح اور اچھا عقیدہ، نظریہ، گفتار اور کردار شامل ہے کہ جو باقی رہ جاتا ہے اور جس کے اثرات برکات لوگوں پر اور معاشرے پر مرتب ہوتے ہیں۔

یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ بعض روایات میں اس سے نماز، تہجد یا مودت اہل بیت مراد لی گئی ہے یہ بلاشبہ واضح مصادیق کا بیان ہے اور ان روایات سے یہ مراد نہیں کہ باقیات الصالحات کا مفہوم ان امور میں منحصر ہے خصوصاً ان روایات میں لفظ "من" استعمال ہوا ہے جو ان کے ایک مفہوم کے

ایک پہلو پر دلالت کرتا ہے۔ مثلاً ایک روایت میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

لا تستصغروا متنا فانها من الباقيات الصالحات

ہماری محبت مودت کو کم نہ سمجھو کہ یہ بھی باقیات الصالحات میں سے ہے۔

ایک اور حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

تسبیح اربع پڑھنے میں تنگدل نہ دکھاؤ کیونکہ یہ باقیات الصالحات میں سے ہے۔

یہاں تک کہ وہ ناپائیدار اسواں اور اولاد کو جو کبھی فتنے اور آزمائش کا باعث ہوتے ہیں اللہ کی راہ میں ہوں تو بھی باقیات الصالحات کے رنگ میں رنگ جاتے ہیں کیونکہ خدا کی پاک ذات جادوں ہے اور جو چیز اس کے لیے اور اس کی راہ میں ہو وہ جادواں ہو جاتی ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ دنیا کی ناپائیدار خوشنمایاں: زیر نظر آیات میں ایک مرتبہ پھر معانی کو مثال کے پیرائے میں مجسم کر کے پیش کیا جا رہا ہے۔ وہ عقل حقائق جن کا ادراک شاید بہت سے لوگوں کے لیے اتنا آسان نہیں ہے قرآن مجید انہیں ایک زندہ اور واضح مثال کے ذریعے محسوسات کے قریب لے آتا ہے۔ قرآن انسانوں سے کہتا ہے: اپنی زندگی کا آغاز و انجام کا منظر ہر سال تم دیکھتے ہو۔ اگر تمہاری عمر ساٹھ سال ہے تو یہ منظر تم نے ساٹھ مرتبہ دیکھا ہے۔ تم دیکھتے ہو کہ ہر موسم بہار میں دیرانے دل انگیز اور خوبصورت مناظر میں بدل جاتے ہیں اور ان کے ہر گوشے سے زندگی کے آثار نمایاں ہو جاتے ہیں لیکن فصل خزاں میں سرسبز دادیاں ویرانوں اور صحراؤں میں بدل جاتی ہیں اور ان کے ہر گوشے سے موت کے آثار نمایاں نظر آنے لگتے ہیں۔

جی ہاں! تم بھی ایک دن بچے تھے، نوٹنگفٹہ غنچے کی طرح پھر تم جوان ہو جاتے ہو تروتازہ اور کھلے ہوئے چھول کی مانند۔ پھر تم بوڑھے اور ناقواں ہو جاتے ہو، پڑمردہ اور خشک پھولوں کی طرح اور زرد افسردہ پتوں کی طرح۔ پھر طوفان اجل تمہیں کاٹ دیتا ہے۔ پھر چند دنوں کے بعد تمہاری بوسیدہ مٹی طوفانوں کے دوش پر ادھر ادھر بکھر جاتی ہے۔

لیکن یہ واقعہ بھی غیر طبعی صورت میں بھی پیش آجاتا ہے۔ بیچ راہ ہی میں بجلی یا طوفان اس زندگی کو ختم کر دیتا ہے۔ اس طرح سے جیسے سورہ یونس کی آیت ۲۴ میں آیا ہے:

انثما مثل الحیوۃ الدنیا کماء انزلناہ من السماء فاختلط بہ نبات الارض ممّا یا ککل الناس والانعام طحی اذّا اخذت الارض

زُخْرُفَهَا وَازَيَّنَّتْ وَظَنَّ أَهْلُهَا أَنَّهُمْ قَادِرُونَ عَلَيْهَا أَنَا هَا أَمْرُنَا لَيْلًا أَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنَا هَاحَصِيدًا كَأَن لَّمْ تَغْنِ بِالْأَمْسِ

دنیا کی زندگی کی مثال ایسی ہے کہ ہم نے آسمان سے پانی برسایا جس سے طرح طرح کے نباتات اُگتے ہیں جنہیں انسان اور چوپائے کھاتے ہیں۔ یہاں تک کہ زمین اپنا حسن و زیبائی ان سے لے لیتی ہے۔ ان کے مالک مطمئن ہوتے ہیں کہ اچانک رات کو یا دن کو ہمارا حکم آپہنچتا ہے (ہم ان پر سردی یا بجلی کو مسلط کر دیتے ہیں) اور انہیں یوں کاٹ کے رکھ دیتے ہیں گویا وہ تھے ہی نہیں۔

لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بیچ راہ میں ہمیش آنے والے حوادث ان نباتات کو تباہ نہیں کرتے اور وہ اپنا طبعی سفر پورا کر لیتے ہیں البتہ ان کا انجام بہر حال پذیردگی، پراگندگی اور فنا ہے، جیسا کہ زیر بحث آیت میں اشارہ ہوا ہے۔ لہذا دنیاوی زندگی اپنا طبعی سفر پورا کرے یا نہ کرے جلد یا بدیر دستِ فنا اُس کا دامن آپکڑے گا۔

۲۔ مغرور شکن عوامل: ہم کہہ چکے ہیں کہ بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جب انہیں ہادی نعمتیں میسر آتی ہیں تو وہ مغرور ہو جاتے ہیں اور یہ مغرور انسانی سعادت کا بہت بڑا دشمن ہے۔ گزشتہ آیات میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح مغرور، شرک و کفر کا باعث بنتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن جو ایک اعلیٰ تربیتی کتاب ہے، اس مغرور کی کمر توڑنے کے لیے مختلف طریقے اختیار کرتی ہے کبھی وہ بتاتی ہے کہ اس دنیا کی ہر چیز فانی ہے کبھی وہ مثالوں کے ذریعے ہادی چیزوں کی ناپائیداری کو واضح کرتی ہے (جیسا کہ زیر بحث آیات میں کہا گیا ہے)۔ کبھی یہ خبردار کرتی ہے کہ ہر شے ہے تمہاری دنیا کے وسائل اور سرمائے ہی تمہارے لیے دشمن جاں ہو جائیں (جیسا کہ سورہ قمر کی آیت ۵۵ میں ہے)۔ کبھی یہ تاریخ کے مغرور لوگوں کا انجام بیان کرتی ہے جیسا کہ قارون اور فرعون کا انجام بیان کر کے ان جیسے افراد کو خبردار کیا گیا ہے اور کبھی یہ انسان کو اس کے اس دور کی طرف متوجہ کرتی ہے کہ جب تک ایک بے حیثیت نطفہ یا معمولی سی خاک تھا کبھی وہ اس کے ایسے ہی مستقبل کو اس کی آنکھوں کے سامنے مجسم کرتی ہے تاکہ وہ جان لے کہ ایسے کمزور و ناتواں آغاز و انجام کے درمیانی عرصے میں مغرور و تکبر احمقانہ قدم ہے (جیسا کہ سورہ طارق کی آیت ۴، سورہ سجدہ کی آیت ۸ اور سورہ قیامت کی آیت ۸ میں ہے)۔

شیطان پوری تاریخ میں بڑے بڑے جرائم کا باعث رہا ہے۔ قرآن شیطانی حربوں کی ناکامی کے لیے یہ تمام ذرائع استعمال کرتا ہے۔

مسلم ہے کہ بالایمان، باعزت اور حقیقت شناس انسان مقام و ثروت پاکر مغرور جیسی قبیح عادت

میں مبتلا نہیں ہوتے۔ نہ صرف یہ کہ وہ مغرور نہیں ہوتے بلکہ ان کے طرز عمل میں ذرہ بھر تبدیلی نہیں آتی۔ وہ ثروت و حیثیت کو عاریتاً ملنے والی ایسی چیز سمجھتے ہیں جو ہوا کے ایک جھونکے سے گر پڑے۔

④۷ وَيَوْمَ نَسِیرُ الْجِبَالِ وَتَرَى الْأَرْضَ بَارِزَةً وَحَشَرْنَاهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ أَحَدًا ۝

④۸ وَعَرِضْنَا عَلَىٰ رَبِّكَ صَفَاءَ لَقَدْ جِئْتُمُونَا كَمَا خَلَقْنَاكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ زَبَلٌ زَعَمْتُمْ أَن لَّنْ نَّجْعَلَ لَكُم مَّوْعِدًا ۝

④۹ وَوَضَعَ الْكِتَابَ فَتَرَى الْمُجْرِمِينَ مُشْفِقِينَ مِمَّا فِيهِ وَيَقُولُونَ يُوِيلَتَنَا مَالِ هَذَا الْكِتَابِ لَا يُغَادِرُ صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً إِلَّا أَحْصَاهَا وَوَجَدُوا مَا عَمِلُوا حَاضِرًا وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ أَحَدًا ۝

ترجمہ

④۷ اس دن کا سوچو جب ہم پہاڑوں کو چلائیں گے اور تو دیکھے گا کہ زمین کھلے میدان کی مانند ہوگی اور ہم ان سب (انسانوں) کو محشور کریں گے اور کسی کو نظر انداز نہیں کریں گے۔

④۸ وہ سب صف بستہ تیرے رب کے حضور پیش ہوں گے (اور انہیں کہا جائے گا) تم سب کو اسی طرح ہمارے پاس آنا پڑا جس طرح ابتدا میں ہم نے تمہیں پیدا کیا تھا جبکہ تمہارا یہ گمان تھا کہ ہم تمہارے لیے کوئی وقت مقرر نہیں کریں گے۔

(۴۹) اور (سب انسانوں کے نامہ اعمال کی) کتاب وہاں رکھ دی جائے گی تو گنہگاروں کو دیکھے گا کہ وہ اس میں جو کچھ لکھا ہے اسے دیکھ کر ڈریں گے اور کہیں گے ہائے ہماری شامت، یہ کیسی کتاب ہے کہ جو کسی چھوٹے بڑے عمل کو شمار کیے بغیر نہیں چھوڑتی اور وہ اپنے تمام اعمال کو موجود پائیں گے اور تیرا پروردگار کسی پر ظلم نہیں کرے گا۔

تفسیر

ہائے ہماری شامت! یہ کیسی کتاب ہے

گزشتہ آیات میں ایک خود پرست اور مغرور انسان کے بارے میں گفتگو تھی کہ جس نے اپنے تکبر کی وجہ سے قیامت کا انکار کر دیا تھا۔ زیر نظر آیات میں قیامت کی کیفیت کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں تین مراحل کا ذکر ہے:

پہلا مرحلہ انسانوں کے قبروں سے اٹھنے سے پہلے کا ہے۔

دوسرا مرحلہ قیامت کا ہے اور

تیسرا مرحلہ اس کے بعد کا ہے

ارشاد ہوتا ہے: اس وقت کا سوچو جب (جہان ہستی کا یہ نظام نئے نظام کے مقدمے کے طور پر درہم برہم ہو جائے گا اور) پہاڑ چلنے لگیں گے اور سطح زمین کی ساری اونچ نیچ ختم ہو جائے گی۔ زمین کھلے میدان کی طرح ہوگی اور ہر چیز اس میں تم نمایاں دیکھو گے (ویوم نسیر الجبال وتری الارض بارزۃ)۔

ان آیات میں اُن حوادث کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو آغاز قیامت میں رونما ہوں گے۔ یہ حوادث بہت زیادہ ہیں۔ قرآن حکیم کی آخری مختصر سورتوں میں ان کا خاص طور پر بہت ذکر ہے۔ انہیں "اشراف الساعة" (قیامت کی نشانیاں) کہا جاتا ہے۔

یہ سب نشانیاں اس بات کی دلیل ہیں کہ آج کی دنیا اور یہ موجود عالم بالکل دگرگوں ہو جائے گا۔ پہاڑ چلنے لگیں گے اور پھر دکھائی نہ دیں گے۔ درخت اور عمارتیں گر پڑیں گی۔ زمین صاف اور ہموار ہو جائے گی۔ پھر زلزلے اسے درہم برہم کر دیں گے۔ سورج کی روشنی ختم ہو جائے گی اور چاند بے نور

ہو جائے گا۔ ستاروں کے چراغ بجھ جائیں گے۔ پھر ان دیرانوں میں نئے جہان اور نئے زمین و آسمان تعمیر ہوں گے۔ انسان نئے سرے سے نئی زندگی کا آغاز کریں گے۔ مزید فرمایا گیا ہے: اس وقت ہم محشور کریں گے اور ان میں سے ہم کسی کو نظر انداز نہیں کریں گے (وَحْشُرْنَاهُمْ فَلَمْ نَعْدَرْ مِنْهُمْ أَحَدًا)۔

"نَعْدَرْ" "غدر" کے مادہ سے کسی چیز کو ترک کرنے کے معنی میں ہے اسی لیے اپنے عہد و پیمان کو توڑنے والے شخص کے بارے میں کہتے ہیں کہ اُس نے "غدر" کیا ہے اور یہ جو پانی کے گڑھے کو "غدير" کہتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ بارش کے پانی کی کچھ مقدار وہاں چھوڑ دی گئی اور ترک کر دی گئی ہوتی ہے۔

بہر حال مذکورہ جملہ اس حقیقت کی تاکید کرتا ہے کہ معاد کا حکم سب کے لیے ہے اور اس سے کوئی شخص مستثنیٰ نہیں ہے۔

اگلی آیت میں قبروں سے انسانوں کے اٹھنے اور محشور ہونے کی کیفیت کے بارے میں ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: وہ سب ایک ہی صف میں تیرے رب کی بارگاہ میں پیش ہوں گے (وَعَرْضُوا عَلٰی رَبِّكَ صَفًّا)۔

ہو سکتا ہے یہ تعبیر اس طرف اشارہ ہو کہ لوگوں کا ہر گروہ جو ایک عقیدے کا حامل ہے یا جن کے عمل ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں وہ ایک صف میں ہوں گے یا یہ کہ سب کے سب کسی فرقہ اور امتیاز کے بغیر ایک صف میں ہوں گے۔

اور انہیں کہا جائے گا: تم سب کو ہمارے پاس اس طرح آنا پڑا جیسے ہم نے آغاز میں تمہیں پیدا کیا (لَقَدْ جِئْتُمُونَا كَمَا خَلَقْنَاكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ)۔

نہ مال و ثروت کا کوئی پتہ ہے، نہ زور و زور کی کوئی خبر ہے، نہ مادی امتیازات ہیں نہ رنگارنگ لباس ہیں اور نہ یاد و مددگار۔ بالکل اسی طرح جیسے ابتدائے آفرینش میں تھے، آج بھی اسی پسلی حالت میں ہو۔

لیکن تمہیں یہ گمان تھا کہ ہم تمہارے لیے کوئی وعدہ گاہ قرار نہیں دیں گے (بَلْ زَعَمْتُمْ اَلَنَّا مُجْعِلٌ لِّكُمْ مَوْعِدًا)۔ اور یہ اس وقت ہوتا تھا جب مادی وسائل اور نعمتوں کا زور تم پر چھا جاتا تھا۔ تمہیں دنیا جاوداں لگنے لگتی تھی اور آخرت کی فطری فکر اس میں چھپ جاتی تھی۔

اس کے بعد اس قیامت کبریٰ کے دوسرے مراحل بیان کیے گئے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے: وہ کتاب وہاں رکھ دی جائے گی جو سب انسانوں کا نامہ اعمال ہے (وَوَضَعُ الْکِتَابَ)۔

گنہگار جب اس کے مندرجات سے آگاہ ہوں گے تو خوفزدہ ہو جائیں گے اور وحشت کے آثار

تو ان کے چہرے پر دیکھے گا (فتری المعجزین منفقین مفاہیہ)۔

تو اس وقت فریاد کریں گے اور کہیں گے: ہائے افسوس! یہ کیسی کتاب ہے کہ جو کوئی چھوٹا بڑا عمل شمار کیے بغیر نہیں چھوڑتی (و یقولون یا ویلتنا مالہذا الکتاب لا یغادر صغیرہ ولا کبیرہ الا احصاھا)۔

اس نے تو چھوٹی سے چھوٹی چیز کا حساب رکھا ہے اور کسی چیز کو نظر انداز نہیں کیا۔ واقعاً یہ بھی متنی وحشتناک ہے جن کاموں کو ہم نے بھلا دیا تھا اور ہم تو سوچتے تھے کہ ہم نے کوئی غلط کام کیا ہی نہیں لیکن آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہماری جوابدہی کا وزن کتنا بھاری ہے اور ہمارا انجام تاریک ہے۔

اس تحریری سند کے علاوہ "تم اپنے سب اعمال کو حاضر پاؤ گے" (و وجدوا ما علوا حاضرًا)۔ نیکیاں، برائیاں، مظالم، عدل کے کام، فضول باتیں اور خیانتیں سب ان کے سامنے مجسم ہوں گی۔

درحقیقت وہ اپنے کیے میں گرفتار ہوں گے "اور تیرا رب تو کسی پر ظلم نہیں کرتا" (ولا یظلم ربک احداً)۔

یہ تو دہی کام ہوں گے جو انہوں نے اس جان میں انجام دیئے ہیں لہذا وہ شکوہ بھی اپنے آپ ہی سے کر سکتے ہیں۔

چند اہم نکات

۱۔ پہاڑ کیوں منہدم ہوں گے؟ ہم کہہ چکے ہیں کہ قیامت کے آغاز میں مادی دنیا کا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔ البتہ اس سلسلے میں قرآن میں مختلف تعبیری دکھائی دیتی ہیں۔

زیر بحث آیات میں ہے:

نسیر الجبال

یعنی ہم پہاڑوں کو حرکت میں لائیں گے اور انہیں چلائیں گے۔

یہی تعبیر سورہ نباہ کی آیت ۲۰ اور سورہ تکویر کی آیت ۳ میں بھی نظر آتی ہے۔ لیکن سورہ مزلات کی آیت ۱۰ میں ہے:

وَإِذَا الْجِبَالُ نُسْفَتْ ۝

شدید طوفانوں کے باعث پہاڑ اپنی جگہ سے اکھڑ جائیں گے اور الگ ہو جائیں گے۔

جبکہ سورہ حاقہ کی آیت ۱۲ میں ہے:

وَحُمِلَتِ الْأَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَاحِدَةً ۝

زمین اور پہاڑ اپنی جگہ سے اٹھ جائیں گے اور ایک دوسرے سے ٹکرائیں گے۔

سورہ مزل کی آیت ۱۲ میں ہے:

يَوْمَ تَرْجُفُ الْأَرْضُ وَالْجِبَالُ وَكَانَتِ الْجِبَالُ كَثِيبًا مَّهِيلًا ۝

وہ دن کہ جب زمین اور پہاڑوں میں لرزہ پیدا ہوگا اور پہاڑ ریت کے طے ہوتے

ٹیلوں کی طرح ہو جائیں گے۔

سورہ واقعہ کی آیت ۶۵ میں ہے:

وَبُسَّتِ الْجِبَالُ بُسًّا فَمَا كَانَتْ هِبَاءً مُنْبَثًّا ۝

پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں گے اور پھر گرد و غبار کی طرح بکھر جائیں گے۔

بالآخر سورہ قارعہ کی آیت ۵ میں ہے:

وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعُفُوشِ ۝

اور پہاڑ رنگی ہوئی دھنی ہوئی آدن کی مانند ہوں گے (کہ جو ادھر ادھر بکھر جاتی ہے)۔

واضح ہے کہ ان آیات میں آپس میں کوئی اختلاف نہیں ہے بلکہ یہ پہاڑوں کے درہم برہم ہونے

کے مختلف مراحل کی طرف مختلف اشارے ہیں۔

پہاڑ اس زمین کا علم ترین اور مضبوط ترین حصہ ہے۔ معاملہ ان کی حرکت اور چلنے سے شروع ہوگا۔

یہاں تک کہ وہ گرد و غبار بن کر لو اڑیں گے کہ فضا میں ان کا صرف رنگ نظر آئے گا۔

یہ اتنی بڑی حرکت کیسے پیدا ہوگی، یقیناً اس کا ہمیں علم نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ زمین کی کشش ثقل وقتی

طور پر اٹھالی جائے اور زمین کی دوری حرکت کے سبب پہاڑ درہم برہم ہو جائیں اور فضاؤں میں بکھر

جائیں۔ یا ہو سکتا ہے بڑے بڑے ایٹمی دھماکوں کے باعث زمین کے مرکز میں ایسی عظیم اور وحشت ناک

حرکت پیدا ہو جائے۔

بہر حال یہ سب امور اس بات کی دلیل ہیں کہ قیامت ایک بہت بڑے انقلاب کی حامل ہے۔

عالم کے بے جان مادہ میں بھی انقلاب پیدا ہوگا اور انسانوں کی زندگی میں بھی۔ سب انسان جان نوس

بلند تر زندگی شروع کریں گے۔ روح اور جسم تو اس دنیا میں بھی ہوگی لیکن دماغ اس کی بناوٹ پر لحاظ

سے وسیع تر اور کامل تر ہوگی۔

قرآن کی یہ تعبیر ضمنی طور پر انسان کو اس حقیقت کی طرف بھی متوجہ کرتی ہے کہ باغ اور پانی تو معمولی

چیز ہیں، بڑے بڑے پہاڑ تک ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جائیں گے۔ اس طرح دنیا کی تمام موجودات یہاں

تک کہ جو بہت بڑی بڑی چیزیں ہیں سب کے لیے فنا ہے۔

۲۔ نامۃ اعمال : زیر بحث آیات کے ذیل میں تفسیر المیزان میں ہے کہ تمام آیات قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ عالم قیامت میں انسانوں کے لیے تین قسم کے اعمال نامے ہوں گے۔ پہلی قسم : تروہ ایک ہی کتاب ہے جو سب کے اعمال کے لیے رکھی گئی ہے۔ درحقیقت اس میں سب اولین و آخرین کے اعمال ثبت ہیں جیسا کہ زیر بحث آیات میں ہے :

ووضع الکتاب

اس کا ظاہری مفہوم یہی ہے کہ سب انسانوں کے حساب کتاب کے لیے ایک ہی کتاب ہوگی۔ دوسری قسم : وہ کتاب ہے جو ہر امت کے لیے ہوگی۔ ہر امت کے لیے ایک کتاب ہوگی کہ جس میں اس کے اعمال درج ہوں گے۔ جیسا کہ سورہ جاثیہ کی آیت ۲۸ میں ہے :

کُلُّ أُمَّةٍ تُدْعَىٰ إِلَىٰ كِتَابِهَا

ہر امت اپنی کتاب اور نامۃ اعمال کی طرف بلائی جائے گی۔

تیسری قسم : وہ کتاب ہے کہ جو ہر انسان کے لیے الگ الگ ہے۔ جیسا کہ سورہ بنی اسرائیل کی آیت ۱۲ میں ہے :

وَكُلُّ الْإِنْسَانِ أَلْزَمًا بِمَا عَاقَبَهُ فِي عُنُقِهِ وَنُخْرِجُ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كِتَابًا....

ہر انسان کے نامۃ اعمال کی جوابدہی ہم نے اسی کی گردن میں ڈالی ہے اور روز قیامت ہم اس کے لیے کتاب اور نامۃ اعمال باہر نکالیں گے۔

واضح ہے کہ یہ آیات ایک دوسری کے منافی نہیں ہیں کیونکہ اس میں کوئی مانع نہیں کہ آدمی کے اعمال مختلف کتب میں درج ہوں۔ موجودہ زمانے میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔ ملک کے اداروں اور محکموں میں تفصیلات کے لیے ہر شخص کی الگ فائل ہوتی ہے اور پھر محکمے اور شعبے کے مجموعی ریکارڈ میں

مفسر قرآن مجید، فیلسوف عالی قدر، عالم بزرگ اخلاق آیۃ اللہ علامہ طباطبائی اسی دلوں میں سے جدا ہو گئے ہیں۔ ان کی یہ جدائی ہمارے لیے ایک بہت بڑا صدمہ اور نقصان ہے۔ وہ ایک ایسی عظیم ہستی تھے کہ جنہوں نے اپنی بابرکت زندگی میں بہت ہی اہم اور قیمتی خدمات انجام دی ہیں۔ وہ ہر قسم کی خود نمائی سے دور اسلامی معاشرے کی خدمت میں مصروف رہے۔ انہوں نے حوزہ علمیہ قم اور دور حاضر کے علمائے افکار میں ایک انقلاب پیدا کر دیا اور بہت ہی بلند پایہ شاگردوں کی تربیت کی۔ انہوں نے بہت قیمتی آثار بطور یادگار چھوڑے ہیں خصوصاً ان کی گرفتار تفسیر المیزان نے قرآن کریم کے نئے باب کھولے ہیں۔ یہ تفسیر تفسیر کے اہم اسلامی علم کی طرف تخیل و فکر کا سبب بنی ہے۔ اللہ کرے ان کی روح غریبی رحمت پر اور ان کی یاد پریشہ احترام و تکریم کے ساتھ دلوں میں باقی رہے۔ (آپ کی تاریخ ولادت ۲۲ آبان ۱۳۰۵ ہجری شمسی، مطابق ۱۸ افرام ۱۳۰۲ ہجری قمری)۔

بھی اس کے بارے میں کوائف ہوتے ہیں اور اسی طرح سلسلہ آگے بڑھتا رہتا ہے۔ لیکن اس نکتے کی طرف توجہ رہے کہ قیامت میں انسانوں کے نامۃ اعمال اس جہان کی عام فائلوں اور کتابوں کی طرح نہیں ہیں۔ وہ تو ایک منہ بولتا اور ناقابل انکار مجموعہ ہوگا۔ شاید وہ خود انسان کے اعمال کا فطری نتیجہ ہو۔

بہر حال زیر بحث آیات نشاندہی کرتی ہیں خاص کتابوں میں درج ہونے کے علاوہ خود اعمال بھی وہاں عظیم ہوں گے اور حاضر ہوں گے (ووجدوا ما عملوا حاضرا)۔ وہ اعمال جو بکھر جانے والی توانائیوں کی طرح اس جہان میں نظروں سے محو ہو چکے ہیں حقیقت میں ختم نہیں ہوتے۔

(دور حاضر کے علم نے بھی ثابت کیا ہے کہ مادہ، توانائی اور کوئی کوشش ختم نہیں ہوتی بلکہ ان کی شکل بدل جاتی ہے)۔ نیک اعمال جاذب اور خوبصورت شکل میں ظاہر ہوں گے اور بُرے اعمال بُرے اور بد صورت چہروں میں ظاہر ہوں گے۔ یہ اعمال ہمارے ساتھ ساتھ ہوں گے یہی وجہ ہے کہ زیر بحث آیات کے آخری جملے میں فرمایا گیا ہے :

وَلَا يَظْلَمُ رِبْكَ أَحَدًا

تیرا رب اپنے بندوں میں سے کسی پر بھی ظلم نہیں کرے گا۔

کیونکہ جزا اور سزا ان کے عمل کا حاصل ہی ہے۔

البتہ بعض مفسرین نے "ووجدوا ما عملوا حاضرا" کو نامۃ اعمال کے مسئلہ پر تاکید سمجھا ہے اور کہا ہے کہ اس جملے کا مفہوم یہ ہے کہ لوگ اپنے نامۃ اعمال کی کتاب میں اپنے تمام کاموں کو موجود اور لکھا ہوا پائیں گے۔

بعض دوسرے مفسرین اس آیت میں لفظ "جزا" کو مقدر سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اس کا مفہوم یہ ہے :

اس دن لوگ اپنے اعمال کی جزا کو حاضر اور موجود پائیں گے۔

لیکن پہلی تفسیر آیات کے ظاہری مفہوم سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔

تجسم اعمال کے بارے میں ہم نے تفسیر نمونہ کی دوسری جلد میں سورہ آل عمران کی آیت ۳۰ کے ذیل میں تفصیلی بحث کی ہے اور انشاء اللہ آئندہ بھی متعلقہ آیات کے ذیل میں بحث کریں گے۔

۳۔ معاد پر ایمان کا تربیتی نتیجہ : قرآن واقعاً ایک عجیبے بیٹی کتاب ہے۔ جب اس میں انسانوں

کے سامنے قیامت کا منظر پیش کیا جاتا ہے تو فرمایا جاتا ہے کہ ”وہ دن جب سب لوگ اللہ کی بارگاہِ عدل میں منظم طور پر صفیں باندھے پیش کیے جائیں گے۔“

ان کی مختلف صفیں ان کے عقائد و اعمال میں ہم آہنگی کی بناء پر ترتیب پائیں گی۔ ان کے ہاتھ تہی ہوں گے اور تمام دنیاوی تعلقات ختم ہو جائیں گے۔ وہاں اجتماع کے باوجود وہ تنہا ہوں گے اور تنہائی کے باوجود اکٹھے ہوں گے اور اعمال نا سے کھٹے ہوں گے۔ سب چیزیں بولیں گی اور انسانوں کے چھوٹے بڑے اعمال بتائیں گی۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ خود اعمال و افکار میں جان پڑ جائے گی اور جسمانی شکل میں ظاہر ہوں گے ہر شخص کے گرد اس کے اعمال جسمانی صورت میں موجود ہوں گے۔ لوگ اپنے آپ میں اس طرح سے کھوئے ہوں گے کہ ماں کو بیٹے کا اور بیٹے کو ماں کا ہوش نہیں ہوگا۔

عدل الہی کی عدالت لگی ہوگی۔ عذاب عظیم بدکاروں کے انتظار میں ہوگا۔ لوگ اس سے سخت وحشت زدہ ہوں گے۔ سانس سینوں میں اٹکے ہوں گے اور آنکھیں پھرتی ہوں گی۔

ایسی عدالت میں ایمان واقعاً انسانی تربیت کے لیے کس قدر مؤثر ہے۔ ہواد ہوس پر کنٹرول کیلئے یہ ایمان کس قدر مفید ہے۔ یہ ایمان انسان کو کس قدر آگاہی اور بیداری عطا کرتا ہے اور اس کے اندر احساسِ ذمہ داری پیدا کرتا ہے۔

ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے :

اذکان یوم القیامة دفع للانسان کتاب فتم قیل له اقرء۔ قلت فیعرف ما فیہ۔ فقال انه یذکرہ فہما من لحظۃ ولا کلمۃ ولا نقل قدم ولا شیء ففعلہ الا ذکرہ، کأنہ فعلہ تلک الساعة، ولذلک قالوا یا ویلتنا مالہذا الکتاب لا یغادر صغیرۃ ولا کبیرۃ الا احصاھا۔

روزِ قیامت انسان کے ہاتھ میں اس کا نامہ اعمال تھمایا جائے گا پھر اس سے کہا جائے گا : پڑھو۔

راوی کہتا ہے کہ میں نے امام سے پوچھا : جو کچھ اس نامہ اعمال میں ہوگا کیا وہ شخص اسے پہچان لے گا اور اسے یاد آجائے گا۔

امام نے فرمایا :

اسے سب کچھ یاد آجائے گا۔ پلکوں کا جھپکنا، ہر لفظ کا ادا کرنا اور ہر قدم کا اٹھانا مختصر یہ کہ اس نے جو کام بھی انجام دیا اسے ایسے یاد آجائے گا گویا اس نے ابھی انجام دیا ہے۔ لہذا لوگ فریاد کریں گے اور کہیں گے : ہائے افسوس! یہ کیسی کتاب ہے کہ جس نے کسی چھوٹے

بڑے کام کو شمار کیے بغیر نہیں چھوڑا بلکہ اس حقیقت پر ایمان کا تربیتی اثر کے بغیر واضح ہے۔ واقعاً ایسا ہو سکتا ہے کہ انسان ایسے عالم پر ایمان قاطع رکھتا ہو اور پھر بھی گناہ کرے۔

⑤۰ وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْا اِلَّاۤ اِبْلِیْسَ ۚ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّہٖ ۚ اَفَتَتَّخِذُوْہٗ وَ ذُرِّیَّتَہٗ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِیْ ۚ وَ هُمْ لَکُمْ عَدُوٌّۢ بِئْسَ لِلظٰلِمِیْنَ بَدَلًا ۝

⑤۱ مَاۤ اَشْہَدُ تَہُمْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَا خَلَقَ اَنْفُسَہُمْ وَمَا کُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّیْنَ عَصَدًا ۝

⑤۲ وَ یَوْمَ یَقُوْلُ نَادُوْا شُرَکَآءَیْ الَّذِیْنَ زَعَمْتُمْ فَدَعَوْہُمْ فَلَمْ یَسْتَجِیْبُوْا لَہُمْ وَ جَعَلْنَا بَیْنَہُمْ مَّوْبِقًا ۝

⑤۳ وَرَآ الْمُجْرِمُوْنَ النَّارَ فَظَنُّوْۤا اَنَّہُمْ مُّوَاقِعُہَا وَلَوْ یَجِدُوْۤا عَنْہَا مَصْرَفًا ۝

ترجمہ

⑤۰ وہ وقت یاد کرو جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے، وہ جنوں میں سے تھا اس لیے وہ اپنے رب کے حکم کی اطاعت سے نکل گیا (اس کے باوجود تم) میری بجائے اسے اور

اس کی اولاد کو اولیا بناتے ہو حالانکہ وہ تمہارے دشمن ہیں ظالم لوگ بہت بُرا بدل اپناتے ہیں۔

(۵۱) میں نے آسمانوں اور زمین کی خلقت کے وقت انہیں نہیں بلایا تھا اور نہ خود انہیں پیدا کرتے وقت انہیں شریک کیا تھا اور میں گمراہ کرنے والوں کو اپنا مددگار نہیں بناتا۔

(۵۲) اُس دن کا سوچو کہ جب اللہ کسے گا کہ اب انہیں آواز دو جنہیں تم میرا شریک خیال کرتے تھے (تاکہ وہ تمہاری مدد کو آئیں) لیکن انہیں جتنا بھی پکاریں وہ ان کی کچھ نہ سنیں گے اور ہم ان دونوں کے درمیان مرکزِ ہلاکت بنادیں گے۔

(۵۳) اور سارے مجرم (جنم کی) آگ دیکھیں گے اور یقین کر لیں گے کہ انہیں آگ میں ڈالا جائے گا اور آگ ان پر ڈالی جائے گی اور انہیں اس سے بچ نکلنے کی کوئی راہ سمجھائی نہ دے گی۔

تفسیر

شیطانوں کو اپنا سرپرست نہ بناؤ

قرآن میں کئی مقامات پر خلقتِ آدم کی داستان بیان ہوئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ فرشتوں نے انہیں سجدہ کیا مگر ابلیس نے حکمِ خدا کی مخالفت کی۔ جیسا کہ ہم اشارہ کر چکے ہیں یہ تکرار ہمیشہ کسی مقصد کے پیش نظر ہے اور ہر موقع پر کوئی خاص نکتہ پنہاں ہوتا ہے۔ اور یہ عین ممکن ہے کہ کسی ایک اہم واقعے کے مختلف پہلو ہوں اور جب بھی اس واقعے کا ذکر ہو تو کوئی ایک پہلو غور نظر ہو۔

گزشتہ مباحث میں مستکبر و مغرور دولت مندوں کے بارے میں ایک مثال بیان کی گئی ہے۔ اس مثال میں تہی دست متضعیفین کے بارے میں ان کے خیالات بیان کیے گئے ہیں اور پھر ان کے انجام کی تصویر کشی کی گئی ہے۔

در اصل روزِ اول سے غرور و تکبر ہی انحراف، کفر اور سرکشی کی بنیاد رہا ہے لہذا زیر بحث آیات میں ابلیس کا ذکر ہے کہ اُس نے حضرت آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔ اس امر کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے تاکہ ہم جان لیں کہ شروع ہی سے غرور و تکبر و سرکشی کا سرچشمہ رہا ہے۔ علاوہ ازیں اس داستان سے واضح ہوتا ہے کہ انحرافات کا باعث شیطانی دوسرے ہیں اور اس کے دوسروں کے سامنے سر جھکا دینا کس قدر احقانہ حرکت ہے کہ جس نے پہلے دن ہی سے ہماری دشمنی پر کمر باندھ رکھی ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: وہ دن یاد کرو کہ جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے نافرمانی کی (و اذ قلنا للملائكة اسجدوا لادم فسجدوا الا ابليس)۔

اس اشتہار سے ہو سکتا ہے یہ وہم پیدا ہو کہ ابلیس فرشتوں میں سے ہے حالانکہ فرشتے معصوم ہیں لہذا اس نے کیونکر سرکشی کی۔ اس لیے ساتھ فرمایا گیا ہے: وہ جنوں میں سے تھا اس لیے اپنے رب کی اطاعت سے نکل گیا (کان من الجن ففسق عن امر ربہ)۔

وہ فرشتوں میں سے نہیں تھا لیکن امتد کی بندگی، اطاعت اور قرب کی وجہ سے اس نے فرشتوں کی صف میں جگہ پالی تھی۔ یہاں تک کہ شاید ان کا استاد ہو گیا تھا لیکن لمحہ بھر کے غرور و تکبر نے اسے ایسا گرایا کہ اُس کا تمام تر روحانی مقام جاتا رہا اور وہ بارگاہِ خدا سے ٹھکرا دیا گیا اور وہ خدا کے نزدیک سب سے بُرھ کر قابلِ نفرت ہو گیا۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: کیا اس کے باوجود تم میری بجائے اسے اور اس کی اولاد کو اپنا سرپرست بناتے ہو (افتخذو نہ و ذریئہ اولیاء من دونی)۔ حالانکہ وہ تمہارے دشمن ہیں (وہم لکم عدو)۔ اُس نے تمہاری گمراہی اور تباہی کے لیے قسم کھا رکھی ہے اور تمہارے باپ کے بارے میں اس کی دشمنی پہلے روز ہی آشکار ہو گئی تھی۔

خدا کے بدلے شیطان اور اس کی اولاد کو اپنا ناگفتا بُرا ہے (بئس للظالمین بدلًا)۔ یہ واقعاً کس قدر بُری بات ہے کہ انسان عالمِ دُعا گاہ، رحیم و مہربان اور فیض رساں خدا کو چھوڑ کر شیطان اور اس کے حواریوں کو اپنا لے۔ یہ بدترین انتخاب ہے، کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک عقلمند انسان ایسے کو اپنا ولی، راہنما اور سہارا سمجھ لے کہ جس نے روزِ اول سے اس کی دشمنی پر کمر باندھ رکھی ہے۔

اگلی آیت میں اس غلط خیال کے ابطال کے لیے ایک اور دلیل پیش کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: آسمانوں اور زمین کی خلقت کے وقت ہم نے ابلیس اور اولادِ ابلیس کو نہیں بلایا تھا یہاں تک کہ ان کی اپنی

بدلا۔ ترکیب غوی کے لحاظ سے تیز ہے اور "بئس" کا فاعل شیطان اور اس کا لاؤ لشکر ہے یا شیطان اور اس کے لاؤ لشکر کی عبادت فاعل ہے۔

تخلیق کے وقت بھی انہیں شریک نہیں کیا (ما اشهد تھو خلق السموات والارض ولا خلق انفسھم)۔ کیونکہ اس عالم کی خلقت میں ان کی مدد درکار تھی اور نہ انہیں آگاہ کیا جانا ضروری تھا۔ لہذا جس کا اس عالم کی آفرینش سے کوئی تعلق ہے اور نہ اپنی تخلیق میں کوئی دخل ہے اور نہ روزِ خلقت کی جے کچھ خبر ہے وہ ولایت و پرستش کے لائق کیسے ہو سکتا ہے اور اصولی طور پر اُس کے بس میں ہے ہی کیا؟ وہ تو ایک ناتواں موجود ہے یہاں تک کہ خود اپنے مسائل سے نا آگاہ ہے تو پھر وہ دوسروں کی کیا رہبری کر سکتا ہے اور دوسروں کو مشکلات سے کیا نجات دلا سکتا ہے؟

آخر میں مزید فرمایا گیا ہے: میں ہرگز گمراہ کرنے والوں کو اپنا مددگار نہیں بناتا (وما كنت متخذ المضلین عضداً)۔ یعنی خلقت تو دوستی اور ہدایت کی بنیاد پر ہے لہذا جس کا کام ہی گمراہ کرنا ہو اس نظامِ خلقت کو چلانے میں اس کا دخل نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ تو آفرینش و ہستی کے اس نظام کی بالکل مخالف سمت میں گامزن ہے وہ تو غریبیاں پیدا کرتا ہے اور دیرانیاں لاتا ہے نہ کہ اصلاح، تکامل اور ارتقاء کے لیے کچھ کرتا ہے۔

زیر بحث آخری آیت ایک مرتبہ پھر خبردار کرتی ہے: اس وقت کا سوچ جب اللہ فرماتے گا کہ جنہیں تم میرا شریک خیال کرتے تھے انہیں اب اپنی مدد کے لیے آواز دو (و یوم یقول نادوا شرکاء الذین زعمتم)۔ ایک عمر تم ان کا دم بھرتے رہے اور ان کے آستانے پر سجدہ کرتے رہے۔ اب جب کہ تمہیں عذاب کی موجوں نے گھیر لیا ہے تو انہیں آواز دو کہ ایک لمحے کے لیے تو تمہاری مدد کو آجائیں۔ وہ لوگ گویا انہی دنیاوی افکار کے مطابق "انہیں پکاریں گے لیکن یہ خیالی اور جعلی معبود انہیں جواب تک نہیں دیں گے" چہ جائیکہ مدد کو آئیں (فدعوھم فلم یتجیبوا لھم)۔ اور ان کے درمیان ہم مرکز ہلاکت بنائیں گے (وجعلنا بینھم موبقا)۔

زیر بحث آخری آیت میں شیطان کے پیروکاروں اور مشرکین کا انجھام واضح کیا گیا ہے: اس دن گنہگار جنم کی آگ دیکھیں گے (وراء المعجمون النار)۔ وہ آگ کہ جس کے بارے میں انہیں کبھی یقین نہ آتا تھا ان کی آنکھوں کے سامنے ہوگی۔ اس موقع پر انہیں اپنی گزشتہ غلطیوں کا اندازہ ہوگا "اور اب انہیں یقین آئے گا کہ وہ آگ میں ڈالے جائیں گے اور آگ ان پر ڈالی جائے گی (فظنوا انھم مواقعوها)۔ پھر انہیں یقین آجائے گا کہ اب اس سے بچ نکلنے کی کوئی راہ نہیں ہے (ولم یجدوا عنھا مخرجاً)۔

۱۔ "موبق"۔ "و یوم" (بروز)۔ "نبوغ" کے مادہ سے ہے جو ہلاکت کے معنی میں ہے اور "موبق"۔ جاتے ہلاکت کو کہتے ہیں۔

ندان کے خود ساختہ معبود ان کی فریاد کو پہنچیں گے نہ شفاعت کرنے والوں کی شفاعت ان کے بارے میں موثر ہوگی اور نہ جھوٹ، زریا زور سے وہ جنم کی آگ سے بچ سکیں گے، وہ آگ کہ جو ان کے اعمال و کردار نے دکھائی ہے۔

اس نکتے کی طرف توجہ ضروری ہے کہ "ظنوا" اگرچہ "ظن" کے مادہ سے ہے لیکن یہاں اور بہت سے دیگر مواقع پر یہ لفظ یقین کے معنی میں استعمال ہوا ہے اسی لیے سورہ بقرہ کی آیت ۲۴۹ میں حضرت طاوت کے ساتھی حقیقی مومنین اور ثابت قدم مجاہدین کہ جو جابر و ظالم جالوت کے خلاف جنگ کے لیے نکلے ان کے بارے میں ہے:

قَالَ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُلَاقُوا اللَّهِ كُمْ مِّنْ فَتْنَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فَتْنَهُ كَثِيرَةً لِّكَذَا دِنَ اللَّهِ

جو اللہ سے ملاقات پر ایمان رکھتے تھے انہوں نے کہا کہ ایسا بہت مرتبہ ہوا ہے کہ چھوٹے سے (با ایمان) گروہ نے بڑے گروہ پر کامیابی حاصل کی ہے۔

ضمناً لفظ "مواقعوها" کہ جو "مواقعہ" کے مادہ سے ہے ایک دوسرے پر واقع ہونے کے معنی میں ہے، اس طرف اشارہ ہے کہ وہ بھی آگ میں گرے گئے اور آگ بھی ان پر گرے گی، وہ بھی آگ میں داخل ہوں گے اور آگ بھی ان میں داخل ہوگی۔ کیونکہ قرآن کی دوسری آیات میں ہے کہ: گنہگار خود آگ کا ایندھن ہیں۔ (بقرہ - ۲۴)

چند اہم نکات

۱۔ کیا شیطان فرشتہ تھا؟ ہم جانتے ہیں کہ فرشتے معصوم ہیں۔ قرآن نے ان کی پاکیزگی اور عصمت کا ذکر کیا ہے۔ ارشاد الہی ہے:

بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُونَ لَا يَسْبِقُونَهُ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِأَمْرٍ يَعْمَلُونَ ۝

وہ خدا کے عظیم و مکرم بندے ہیں۔ کسی بات میں اس پر سبقت نہیں کرتے اور اس کے احکام کے سامنے تسلیم خم کرتے ہیں۔ (انبیاء - ۲۴، ۲۵)

اصول طور پر ان کے جوہر میں عقل ہے اور شہوت نہیں ہے لہذا تنجیر، خود پرستی اور گنہ پر اٹھانے والی کوئی چیز ان میں نہیں ہے۔

مندرجہ بالا آیات میں کہا گیا ہے کہ ابلیس کے سوا سب فرشتوں نے سجدہ کیا۔ اسی طرح کا ذکر دوسری آیات میں بھی ہے۔ اس استثناء سے یہ تصور پیدا ہوتا ہے کہ ابلیس فرشتوں میں سے تھا جبکہ اس کی نافرمانی اور سرکشی پر نظر کی جائے تو یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی فرشتہ

گناہان کبیرہ کا مرتکب ہو۔

خصوصاً جبکہ بیخ البلاغہ کے بعض خطبات میں بھی ہے کہ:

ماکان اللہ سبحانه لیدخل الجنة بشراً با مخرج به منها ملکاً
ہرگز ممکن نہیں کہ اللہ انسان کو ایسا کام کرنے پر بہشت میں بھیج دے جیسا کہ گناہ پر اس
نے ایک فرشتے کو بہشت سے نکال دیا تھا۔
یہ ابلیس کے غرور کی طرف اشارہ ہے۔

زیر نظر آیات نے اس سوال کو حل کر دیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

کان من الجن

ابلیس جنوں کے گروہ میں سے تھا۔

جن ایسے موجودات ہیں جو ہماری نظروں سے پنہاں ہیں۔ وہ عقل و شعور بھی رکھتے ہیں اور شہوت و
غضب بھی۔ ہم جانتے ہیں کہ لفظ ”جن“ قرآن میں جہاں کہیں بھی آیا ہے اسی مخلوق کی طرف اشارہ ہے۔
بعض مفسرین کہ جن کا نظریہ ہے کہ ابلیس فرشتوں میں سے تھا وہ زیر بحث آیت میں آنے والے
لفظ ”جن“ کا لغوی معنی لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ”کان من الجن“ سے مراد یہ ہے کہ ابلیس دیگر فرشتوں کی طرح
نظروں سے پنہاں تھا۔ حالانکہ یہ معنی بالکل خلاف ظاہر قرآن ہے۔

ہمارے دعویٰ کے ثبوت میں سے ایک واضح دلیل یہ ہے کہ قرآن ایک طرف سے کہتا ہے:

وَخَلَقَ الْجَانَّ مِنْ نَّارٍ وَنَارِهِ

جن کو ہم نے آگ کے مخلوق شعلے سے پیدا کیا (رحمن۔ ۱۵)

دوسری طرف سے جس وقت ابلیس نے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کیا تو اس سرکشی کے لیے یہ
منطق پیش کی:

خَلَقْتَنِي مِنْ نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ مِنْ طِينٍ

میری تخلیق تو نے آگ سے کی ہے اور اسے تو نے مٹی سے بنایا ہے۔ (اعراف۔ ۱۲)

اس سے قطع نظر زیر بحث آیات میں ابلیس کی ”ذریہ“ (اولاد) کا ذکر ہے جبکہ ہم جانتے ہیں
کہ فرشتوں کے ہاں اولاد نہیں ہوتی۔

جو کچھ کہا گیا ہے اسے ملحوظ نظر رکھا جائے اور فرشتوں کے جوہر ساخت کو بھی پیش نگاہ رکھا جائے
تو مجموعی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ابلیس ہرگز فرشتہ نہیں تھا لیکن چونکہ ان کی صفت میں شامل ہو گیا تھا اور اس

لے بیخ البلاغہ، خطبہ ۱۹۲ (خطبہ قاصد)۔

نے اللہ کی اتنی عبادت کی تھی کہ مقرب خدا فرشتوں کے مقام تک جا پہنچا تھا لہذا جب آدم کو سجدہ کرنے
کا حکم ہوا تو وہ بھی شامل تھا۔ اس لیے آیات قرآن میں اس کی نافرمانی کا ذکر استثنائی صورت میں آیا ہے
نیز خطبہ قاصد میں اسے ”ملک“ مجازی طور پر کہا گیا ہے (غور کیجئے گا)۔

”عیون الاخبار“ میں امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام سے منقول ہے:

”سب فرشتے معصوم ہیں اور لطفت پروردگار سے کفر اور برائیوں سے محفوظ ہیں۔
راوی کہتا ہے کہ میں نے عرض کیا:

تو کیا ابلیس فرشتہ نہیں تھا؟

امام نے فرمایا:

نہیں وہ جنوں میں سے تھا۔ کیا تو نے اللہ کا یہ ارشاد نہیں سنا کہ وہ فرماتا ہے:

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ كَانَ مِنَ الْجِنِّ

جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو ابلیس کے سوا سب نے سجدہ کیا اور
وہ جنوں میں سے تھا۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ امام صادق علیہ السلام کے ایک خاص صحابی کہتے ہیں:

میں نے امام سے ابلیس کے بارے میں استفسار کیا کہ کیا وہ فرشتوں میں سے تھا؟
آپ نے فرمایا:

نہیں وہ تو جنوں میں سے تھا لیکن فرشتوں کے ساتھ رہتا تھا اور اس طرح سے ان کے
ساتھ تھا کہ وہ (اس کی عبادت اور قرب الہی کے سبب) سمجھتے تھے کہ وہ انہی کی نوع میں

ہے لیکن خدا جانتا تھا کہ وہ ان میں سے نہیں ہے۔ جس وقت سجدے کا حکم ہوا تو یہ بات
ظاہر ہوئی (پروے ہٹ گئے اور ابلیس کی ماہیت و حقیقت آشکار ہو گئی)۔

ابلیس اور شیطان کے بارے میں ہم نے سورہ اعراف کی آیت ۱۱ تا ۱۸ — (تفسیر نمونہ ج ۴ ص ۵۸)

آورد ترجمہ) اور سورہ انعام کی آیت ۱۱۲ (تفسیر نمونہ ج ۳ ص ۶۸ — اردو ترجمہ) اور سورہ بقرہ کی آیت ۳۴

(تفسیر نمونہ جلد اول ص ۱۲۲ — اردو ترجمہ) کے ذیل میں تفصیلی بحث کی ہے۔

۲۔ مگر اہل کو تعاون کی دعوت نہیں دینا چاہیے: زیر نظر آیات میں اللہ کے بارے میں

گفتگو ہے اور گمراہوں میں سے اس کے لیے یا در مددگار کی نفی کی گئی ہے اور ہم جانتے ہیں کہ اصولی طور پر

اللہ کسی معین و مددگار کا محتاج نہیں چاہے کوئی گمراہ ہو یا نہ ہو لیکن یہ سب کے لیے ایک عظیم درس ہے کہ اجتماعی

لے دہ فور الثقلین، ج ۳ ص ۲۹۷۔

کاموں میں ہمیشہ ایسے لوگوں کی مدد حاصل کی جائے کہ جو خود بھی حق و عدالت کے راستے پر ہوں اور طلبِ اُمت کرنے والے بھی صحیح راستے کے لیے مدد چاہے۔ ہم نے بہت دیکھا ہے کہ نیک افراد نے معاندین کے انتخاب کے وقت صحیح توجہ نہیں دی جس کے نتیجے میں بہت سی مشکلات، ناکامیوں اور اخراجات سے دوچار ہوئے ہیں۔ انہیں کمزور اور گمراہ کرنے والوں نے گھیر لیا ہے اور یہ لوگ ان کے کام کو تباہی کی طرف لے گئے ہیں۔ آخر کار ایسے لوگوں نے ان کا سب کچھ برباد کر دیا ہے۔

دستِ کر بلا میں ہے کہ دورانِ راہ سردِ رشیدان حضرت امام حسین علیہ السلام کی ملاقات عبید اللہ بن جریج سے ہوئی۔ امام عبید اللہ سے ملنے کے لیے گئے تو اس نے آپ کا بہت احترام کیا لیکن جب امام نے اسے مدد کی دعوت دی تو اس نے قسم کھا کر کہا کہ میں تو کوفہ سے اسی لیے نکلا ہوں کہ اس جنگ سے کنارہ کش ہو جاؤں۔

اس نے مزید کہا: میں جانتا ہوں کہ اگر ان لوگوں سے آپ نے جنگ کی تو سب سے پہلے آپ ہی مارے جائیں گے۔ البتہ میں یہ تلوار اور گھوڑا آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

امام نے اس سے منہ پھیر لیا اور فرمایا: جب تو اپنی جان بچاتا ہے تو ہمیں تیرے مال کی ضرورت نہیں۔ پھر آپ نے اس آیت کی تلاوت کی:

وَمَا كُنْتَ مَتَّخِذَ الْعَصْلِينَ عَصَدًا

یہ اس طرف اشارہ تھا کہ تو گمراہ اور گمراہ کنندہ ہے لہذا تو اس قابل نہیں کہ تیرا یہ تعاون قبول کیا جائے۔ بہر حال دوست اور مددگار کا نہ ہونا بُرے لوگوں سے مدد لینے اور انہیں اپنے گرد جمع کر لینے سے بہتر ہے۔

۵۴) وَلَقَدْ صَرَفْنَا فِي هَذَا الْقُرْآنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ۚ وَكَانَ الْإِنْسَانُ أَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا ۝

۵۵) وَمَا مَنَعَ النَّاسَ أَنْ يُؤْمِنُوا إِذْ جَاءَهُمُ الْهُدَىٰ وَيَسْتَغْفِرُوا رَبَّهُمْ إِلَّا أَنْ تَأْتِيَهُمْ سُنَّةُ الْأَوَّلِينَ أَوْ يَأْتِيَهُمُ الْعَذَابُ قُبُلًا ۝

۵۶) وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِينَ إِلَّا مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ ۚ وَ يَجَادِلُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوا بِهِ الْحَقَّ وَاتَّخَذُوا آيَاتِي وَمَا أُنذِرُوا هُزُوًا ۝

ترجمہ

۵۴) اس قرآن میں ہم نے لوگوں کے لیے ہر طرح کی مثال بیان کی ہے لیکن انسان سب سے زیادہ جھگڑالو ہے۔

۵۵) ہدایت آجانے کے بعد انسانوں کے ایمان لانے اور اپنے رب سے طلبِ مغفرت میں اس کے سوا کیا امر مانع ہے کہ وہ بھی گزشتہ لوگوں کے سے انجام کے منتظر ہیں یا یہ کہ عذابِ الہی کو دیکھنے کے منتظر ہیں۔

۵۶) اور ہم نے رسولوں کو صرف بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے اور کفار حق کو نیچا دکھانے اور ہماری ان آیتوں اور سزاؤں کا مذاق اڑانے کیلئے جھگڑتے رہتے ہیں۔

تفسیر

گویا وہ عذاب کے منتظر ہیں

ان آیات میں گویا گزشتہ اور آئندہ کی بحثوں کا نتیجہ پیش کیا گیا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: اس قرآن میں ہم نے لوگوں کے لیے ہر قسم کی مثال بیان کی ہے۔ (ولقد صرفنا فی هذا القرآن للناس من کل مثل)۔

گزشتہ لوگوں کی بلا کر رکھ دینے والی تاریخ کے مختلف نمونے ہم نے پیش کیے ہیں۔ ہم نے ان کی زندگی کے دردناک واقعات اور تلخ دشمنی باتیں لوگوں کو بتائی ہیں اور مسائل کو ایسی پختی طرح پر بیان کیا گیا ہے کہ آمادہ دل حق کو قبول کر لیں اور باقی لوگوں کے لیے اتمام حجت ہو جائے اور کسی اہم کی گنجائش باقی نہ رہے۔

لیکن اس کے باوجود سرکش لوگ بالکل ایمان نہ لائے کیونکہ "انسان سب سے بڑھ کر جھگڑا لوبے" (وكان الانسان اكثر شئاً مجادلاً)۔

"صرفنا"۔ "تصریف" کے مادہ سے ہے۔ اس کا معنی ہے تبدیل کرنا، دگرگوں کرنا اور ایک حالت سے دوسری حالت میں بدلنا۔ زیر بحث آیت میں اس لفظ کا مقصد یہ ہے کہ ہم نے مختلف انداز میں اور ہر اس پیرائے جس میں تاثیر کا امکان تھا لوگوں سے گفتگو کی ہے۔

"جدل" اس گفتگو کو کہتے ہیں کہ جو جھگڑے اور دوسرے پر تھلپ حاصل کرنے کے لیے ہو۔ لہذا "مجادلہ" دو آدمیوں کی آپس میں ٹوٹکار اور کھینچا تانی کو کہتے ہیں جیسا کہ راغب نے کہا ہے: یہ لفظ تجدل الحبل (رسی کو مضبوطی سے بٹ دیا) سے لیا گیا ہے۔ گویا جو شخص اس انداز سے بات کرتا ہے وہ دہ مقابل کے افکار کو زبردستی پیٹ میں لے لینا چاہتا ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ "جدال" دراصل کشتی لڑنے اور دوسرے کو زمین پر پٹھنے کے معنی میں ہے اور یہ لفظ فطری اور زبانی جھگڑوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

ہر حال یہاں انسانوں سے مراد غیر تربیت یافتہ انسان ہیں۔ اس کی نظیر قرآن میں بہت ہے۔ اس سلسلے میں تفصیلی بحث ہم سورہ یونس کی آیت ۱۲ کے ذیل میں کر آئے ہیں (نمونہ، جلد ۱۳۵ اردو ترجمہ)۔ اگلی آیت میں ہے: ایسی طرح طرح کی مثالیں پیش کی گئیں، بلا دینے والے واقعات بیان کیے گئے اور منطق و دلیل سے بات کی گئی۔ جس انسان کا دل صاف ہے اُس پر ان چیزوں کو ضرور اثر کرنا چاہیے پھر بھی بہت سے ایسے گروہ ہیں کہ جو ایمان نہیں لائے۔ "وایت الہی آجانے کے بعد ایمان اور طلب مغفرت میں لوگوں کو سوائے اس کے کوئی امر مانع تھا کہ وہ گزشتہ لوگوں کے سے انجام کے منتظر تھے" (وما منع

الناس ان یؤمنوا اذ جاءهم الہدای ویستغفروا ربهم الا ان تأتیہم سنۃ الاولین)۔ اور یا پھر وہ اس بات کے منتظر تھے کہ عذاب الہی کو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں (او یا تیہم العذاب قبل)۔

یہ آیت درحقیقت اس طرف اشارہ ہے کہ یہ بہت دھرم اور مغرور لوگ ہرگز اپنے ارادے اور رغبت سے ایمان نہیں لائیں گے۔ یہ صرف دو صورتوں میں ایمان لائیں گے۔ پہلی یہ کہ جیسے گزشتہ قوموں کو عذاب نے آگھیرا تھا اسی طرح انہیں بھی آگھیرے اور دوسری یہ کہ کم از کم یہ عذاب کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں اور ایسے اضطرابی ایمان کی کوئی حیثیت نہیں۔

اس نکتے کی طرف بھی توجہ ضروری ہے کہ ایسی قوموں کو ہرگز ایسا کوئی انتظار نہ تھا بلکہ ان کی کیفیت ایسی تھی کہ گویا وہ اس انتظار میں ہوں اور یہ ایک قسم کا خوبصورت کنایہ ہے۔ جیسے ہم کسی سرکش آدمی سے کہیں کہ تو تو بس یہ چاہتا ہے کہ تجھے سزا ملے یعنی تجھے بہر حال سزا ملے گی اور تو گویا سزا کے انتظار میں ہے۔

بہر حال سرکش اور مغرور انسان بھی اس حالت کو جا پہنچتا ہے کہ وحی آسانی، انبیاء کی مسلسل تبلیغ معاشرتی زندگی کے عبرت ناک درس اور گزشتہ لوگوں کی تاریخ۔ کوئی چیز بھی اس پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ صرف خدا کی لامحی، ہی سے اس کی عقل ٹھکانے آسکتی ہے۔ لیکن نزول عذاب کے وقت تو توبہ کے دروازے بند ہو جاتے ہیں اور پھر لوٹ آنے کی کوئی راہ باقی نہیں رہتی۔

اس کے بعد مخالفین کی بہت دھرمی کے مقابلے میں پیغمبر اکرم کی تسلی اور دلجوئی کے لیے فرمایا گیا ہے: تیری ذمہ داری تو صرف بشارت اور انداز ہے۔ ہم نے انبیاء و مرسلین کو بشارت و انداز کے علاوہ کسی اور چیز کے لیے نہیں بھیجا (وما نرسل المرسلین الا مبشیرین ومنذرین)۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: یہ کوئی نئی بات نہیں کہ ایسے لوگ مخالفت کرنے لگیں اور مذاق اڑائیں "کا فراور بہت دھرم لوگ ہمیشہ غلط طور پر جھگڑتے رہے ہیں، اس زعم میں کہ حق کو ختم کر دیں اور قیامت و عذاب کے بارے میں ہماری آیتوں کا مذاق اڑائیں (ویجادل الذین کفروا بالباطل لیدحضوا بہ الحق واتخذوا آیاتی وما انذروا ہذوا)۔

قبل۔ مقابلہ اور سامنے کے معنی میں ہے یعنی عذاب الہی کو وہ اپنے مقابلے اور سامنے دیکھیں۔ خبری نے جمع البیان میں، ابو الفرج نے روح الجنان میں اور آلوسی نے روح المعانی میں یہی احتمال ذکر کیا ہے کہ "قبیل" کی جمع "قبیل" عذاب کی گفتگو نمیتوں کی طرف اشارہ ہے لیکن پہلا معنی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

"یدحضوا"۔ "احضاض" کے مادہ سے ابطال اور زائل کرنے کے معنی میں ہے اور اصل میں یہ "دحض" سے لیا گیا ہے کہ جو لغزش کے معنی میں ہے۔

یہ آیت درحقیقت سورہ حج کی آیات ۴۲ تا ۴۵ کے مشابہ ہے۔ ان میں ہے :

وَإِنْ يَكْذِبُوا فَكُذِّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَعَادٌ وَشُعُوبٌ.....

اگر انہوں نے تیری تکذیب کی ہے تو تجھ سے پہلے قوم نوح، عاد اور ثمود نے بھی اپنے پیغمبروں کی تکذیب کی ہے۔

آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ انبیاء جبر و اکراہ سے کام نہیں لیتے بلکہ ان کی ذمہ داری بشارت و انداز ہے۔ آخری ارادہ خود لوگوں کی طرف سے ہوتا ہے تاکہ وہ کفر و ایمان کے انجام کے بارے میں سوچ سمجھ لیں اور اپنے آزادانہ ارادے سے ایمان لائیں نہ یہ کہ عذاب الہی کو سہنے پا کر اضطراری طور پر اظہار ایمان کریں۔

لیکن انکس سے کہنا پڑتا ہے کہ آزادی و اختیار کہ جو وسیلہ تکامل ہے اس سے زیادہ تر غلط فائدہ اٹھایا گیا ہے اور طرفدارانِ باطل نے ہمیشہ حق سے جھکڑا کیا ہے۔ بھی مغالطے پیدا کر کے اور بھی مذاق اڑا کر انہوں نے چاہا ہے کہ دین حق کو ختم کر دیں لیکن جن کے دلوں کے دریچے حق کے لیے کھلے تھے انہوں نے حمایت حق میں قیام کیا اور حق و باطل کی یہ جنگ پوری تاریخ میں جاری رہی ہے۔

۵۷ وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ ذَكَرَ بِآيَاتِ رَبِّهِ فَأَعْرَضَ عَنْهَا وَنَسِيَ مَا قَدَّمَتْ يَدُهُ إِنَّا جَعَلْنَا عَلَى قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَنْ يَفْقَهُوهُ وَفِي آذَانِهِمْ وَقْرًا وَإِنْ تَدْعُهُمْ إِلَى الْهُدَى فَلَنْ يَهْتَدُوا إِذًا أَبَدًا ○

۵۸ وَرَبُّكَ الْغَفُورُ ذُو الرَّحْمَةِ لَوْ يُؤَاخِذُ هُم بِمَا كَسَبُوا لَعَجَلْ لَهُمُ الْعَذَابُ بَلْ لَهُمْ مَوْعِدٌ لَنْ يَجِدُوا مِنْ دُونِهِ مَوْبِلًا ○

۵۹ وَتِلْكَ الْقُرَى أَهْلَكْنَاهُمْ لَمَّا ظَلَمُوا وَجَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِمْ مَوْعِدًا ○

ترجمہ

۵۷ ان سے بڑھ کر کون ظالم ہے کہ جنہیں پروردگار کی آیات یاد دلائی جاتی ہیں تو وہ منہ پھیر لیتے ہیں اور جو کچھ انہوں نے اپنے ہاتھ سے کیا ہوتا ہے اسے بھول جاتے ہیں۔ ان کے دلوں پر ہم نے پردہ ڈال دیا ہے تاکہ وہ کچھ نہ سمجھیں اور ان کے کان ہم نے بھاری کر دیئے ہیں (تاکہ انہیں آواز حق سنائی نہ دے) یہی وجہ ہے کہ اگر تم انہیں ہدایت کی طرف پکارو گے تو وہ ہرگز ہدایت حاصل نہیں کریں گے۔

۵۸ اور تیرا رب بخشنے والا اور صاحبِ رحمت ہے اگر وہ انہیں ان کے

اعمال کی سزا دینا چاہتا تو ان کے لیے فوراً عذاب بھیج دیتا لیکن ان کے لیے ایک وعدہ گاہے جہاں پہنچنے سے وہ رہ نہیں سکتے۔

(۵۹) یہ قریہ اور آبادیاں (جنہیں تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو) وہ ہیں کہ جب انہوں نے ظلم کیا تو ہم نے انہیں ہلاک کر دیا (اور پھر بھی) ان کی ہلاکت کے لیے ہم نے میعاد مقرر کر دی۔

تفسیر

عذاب الہی میں جلدی نہیں ہو سکتی

گزشتہ آیات میں تاریک دل متعصب کافروں کے بارے میں گفتگو تھی۔ زیر نظر آیات میں بھی وہی سلسلہ گفتگو جاری ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: ان سے بڑھ کر کون ظالم ہو سکتا ہے کہ جنہیں ان کے رب کی آیات یاد دلائی جاتی ہیں تو وہ منہ پھیر لیتے ہیں (ومن اظلم مقن ذکر بآیات ربہ فاعرض عنها ونسی ما قدمت یداہ)۔

لفظ "تذکر" (یاد دہانی) گویا اس طرف اشارہ ہے کہ انبیاء کی تعلیمات حقائق کی یاد آوری کی طرح ہیں۔ گویا یہ تعلیمات روح انسانی کی گہرائیوں میں موجود ہوتی ہیں اور انبیاء کا کام ان کے چہرے سے پردہ ہٹانا ہے۔ یہی مفہوم نوح البلاغہ کے ایک خطبے میں بھی ہے:

لیتادوہم میثاق فطرتہ ویذکروہم منسی نعمتہ ویحتجوا الیہو بالتبلیغ ویثیروا الیہم وفائن العقول

انبیاء کی بعثت کا ہدف یہ تھا کہ وہ انسانوں کو عہد فطرت پورا کرنے پر ابھاریں، انہیں خدا کی بھولی ہوئی نعمتیں یاد دلائیں، تبلیغ کے ذریعے ان پر اتمام حجت کریں اور محفل کے پنہاں خزانے آشکار کریں۔

یہ بات لائق توجہ ہے کہ ان دل کے اندھوں کو تین طرح سے بیداری کا درس دیا گیا ہے۔

اول: یہ کہ یہ حقائق تمہاری فطرت، وجدان اور روح سے مکمل کشتائی رکھتے ہیں۔

دوم: یہ کہ تمہارے رب کی طرف سے ہیں۔

سوم: یہ کہ یہ نہ بھول جاؤ کہ تم نے بہت سی غلطیاں کی ہیں اور انبیاء کی تعلیم کا مقصد ان کے اثرات کو دور کرنا ہے۔

لیکن ان تمام چیزوں کے باوجود یہ لوگ ہرگز ایمان نہیں لائیں گے "کیونکہ ہم نے ان کے دلوں پر پردے گرا دیئے ہیں تاکہ وہ سمجھ نہ پائیں اور ان کے کان بوجھل کر دیئے ہیں تاکہ وہ آواز حق سن نہ سکیں" (واناجعلنا علی قلوبہم اکنۃ ان یفقیہوہ و فی اذانہم وقرآن یشہ

یہی وجہ ہے کہ اگر تم انہیں حق کی طرف پکارو تو وہ ہرگز ہدایت قبول نہیں کریں گے (وان تدعہم الی الہدٰی فہم یبتعدوا اذا ابدا)۔

شاید یاد دہانی کی ضرورت نہ ہو کہ اگر اللہ نے قوتِ ادراک اور قوتِ سماعت چھین لی ہے تو اس کی وجہ ہے "ما قدمت یداہ" (ان کے وہی اعمال جو انہوں نے خود کیے ہیں) اور یہ سزا خود انہی کے اعمال کا سیدھا نتیجہ ہے بلکہ دوسرے لفظوں میں ان کے وہی بُرے اور شرمناک اعمال ہی ان کے دلوں پر پردے اور اُن کے کانوں کے لیے بوجھل پن میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ یہ ایسی حقیقت ہے جس کا ذکر قرآن کی بہت سی آیات میں ہے۔

مثلاً سورہ نسا کی آیت ۱۵۵ میں ہے:

بَلْ طَبَعَ اللَّهُ عَلَیْہَا بَکْفُرَہُمْ فَلَا یُؤْمِنُونَ إِلَّا قَلِیلًا

اللہ نے ان کے کفر کی وجہ سے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے لہذا بہت کم لوگ

ایمان لانے والے ہیں۔

لیکن کچھ لوگ اسلام کو مکتب جبر و اکراہ ثابت کرنے کے لیے بہانے تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ انہوں نے زیر بحث آیت کے دوسرے جملوں کو نظر میں نہیں رکھا اور اس کی تفسیر کرنے والی دیگر آیتوں کو بھی نہیں دیکھا۔ انہوں نے اس کے ایک حصے کے ظاہری لفظی معنی کا سہارا لے کر اپنا نقطہ نظر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے حالانکہ جیسے ہم نے بیان کیا ہے اس اشکال کا جواب پوری طرح واضح ہے۔

خدا کا تربیتی پروگرام ایسا ہے کہ وہ بغیر مصلحت اور موقع دیئے ظالم بادشاہوں کی طرح فوراً سزا نہیں دیتا۔ اس کی وسیع رحمت کا تقاضا ہے کہ گنہ گاروں کو زیادہ سے زیادہ مصلحت دی جائے اور اصلاح کا موقع دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اگلی آیت میں فرمایا گیا ہے: تیرا رب بخشنے والا اور صاحب رحمت ہے (وربک الغفور ذو الرحمة)۔

جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں "اکنۃ"۔ کنان (بروزن) کتاب کی جمع ہے۔ اس کا معنی ہے پردہ یا وہ چیز جو چھپا دینے والی ہو اور "قر" کان کے بوجھل پن اور کم سننے کے معنی میں ہے۔

اگر وہ انہیں سزا دینا چاہتا تو ان پر فوراً عذاب بھیج دیتا (لو یؤاخذہم بما کسبوا لعجل لہم العذاب)۔ لیکن ان کے لیے ایک میعاد مقرر ہے کہ جب وہ پوری ہو گئی تو پھر وہ پہنچ کر نہیں جائیں گے (بل لہم موعدا لن یجدوا من دونہ موثلاً)۔

اس کی بخشش کا تقاضا ہے کہ وہ توبہ کرنے والوں کو بخش دے اور اس کی رحمت کا تقاضا ہے کہ دوسروں کے عذاب میں بھی جلدی نہ کرے، شاید وہ توبہ کرنے والوں میں شامل ہو جائیں لیکن اس کی عدالت کا بھی تقاضا ہے کہ جب سرکشی انتہا کو پہنچ جائے تو پھر ان کا حساب بے باق کر دے۔ وہ فاسد و مفسد افراد کو جن کی اصلاح کی امید تک باقی نہ رہے اصولی طور پر ایسے لوگوں کی بقا، حکمت خلقت کی نظر سے کوئی معنی نہیں رکھتی لہذا ان کا خاتمہ ضروری ہے تاکہ زمین ان کے وجود ناپاک سے پاک ہو جائے۔

آخر میں ایک اور یاد دہانی ہے۔ آیات کے اس سلسلے کے آخر میں گزشتہ ظالموں کا دردناک انجام یاد دلاتے ہوئے فرمایا گیا ہے، اور یہ آبادیاں کہ جو دیرانوں میں بدل چکی ہیں، جب یہ لوگ ظلم و ستم کے مرتکب ہوئے تو ہم نے انہیں ہلاک کر دیا لیکن اس کے باوجود ہم نے انہیں عذاب کرنے میں جلدی نہیں کی بلکہ ان کی ہلاکت کے لیے ایک میعاد مقرر کی ہے (و تلتک القرۃ اہلکنا ہم لما ظلموا و جعلنا لہم لکھم موعداً)۔

۴۰) وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِفَتَاهُ لَا أَبْرَحُ حَتَّىٰ أَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ أَوْ أَمْضِيَ حُقُبًا ۝

۴۱) فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا نَسِيَا حُوتَهُمَا فَاتَّخَذَ سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا ۝

۴۲) فَلَمَّا جَاوَزَا قَالَ لِفَتَاهُ إِنِّي جَدَّاءٌ نَاذِلَقَدْ لَقِينَا مِنْ سَفَرِنَا هَذَا نَصَبًا ۝

۴۳) قَالَ أَرَأَيْتَ إِذْ أَوَيْنَا إِلَى الصَّخْرَةِ فَإِنِّي نَسِيتُ الْحُوتَ وَمَا أَنسَيْنِيهِ إِلَّا الشَّيْطَانُ أَنْ أَذْكُرَهُ وَاتَّخَذَ سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ عَجَبًا ۝

۴۴) قَالَ ذَلِكُمْ مَا كُنَّا نَبْغِي ۖ فَارْتَدَّاعْلَىٰ ۖ أَثَارِهِمَا قَصَصًا ۝

ترجمہ

۴۰) وہ وقت یاد کرو کہ جب موسیٰ نے اپنے دوست سے کہا کہ میں تلاش جاری رکھوں گا جب تک کہ دونوں دریاؤں کے سنگم پر نہ پہنچ جاؤں۔ اگرچہ اس کے لیے مجھے طویل عرصے تک سفر جاری رکھنا پڑے۔

۴۱) جس وقت وہ ان دو دریاؤں کے سنگم پر پہنچے تو انہیں اپنی مچھلی کا خیال نہ رہا (کہ جو انہوں نے پکا کر کھانے کیلئے پکڑ رکھی تھی) اور وہ نکل بھاگی۔

۹۲) آگے جا کر موسیٰ نے اپنے ہمسفر دوست سے کہا: لاؤ ہمارا کھانا لے آؤ، ہم اس سفر سے بہت تھک گئے ہیں۔

۹۳) اُس نے کہا آپ کو یاد ہے کہ جب ہم نے اس پتھر کے پاس پناہ لی (اور آرام کیا) تو میں مچھلی کے بارے میں بتانا بھول گیا تھا اور یہ بات شیطان نے میرے ذہن سے نکال دی تھی اور مچھلی عجیب طریقے سے دریا کی طرف چلتی بنی۔

۹۴) (موسیٰ نے) کہا: اسی کو تو ہم ڈھونڈ رہے تھے۔ پھر وہ اسے تلاش کرتے ہوئے اسی راستے سے واپس آئے۔

تفسیر

خضر اور موسیٰ کی حیرت انگیز داستان

مفسرین نے ان آیات کی شان نزول کے بارے میں لکھا ہے کہ کچھ اہل قریش رسول اللہ کی خدمت میں آئے۔ انہوں نے آپ سے اس عالم کے بارے میں سوال کیا کہ حضرت موسیٰ کو جس کی پیروی کا حکم دیا گیا تھا۔ یہ آیات اسی ضمن میں نازل ہوئی ہیں۔

اصولی طور پر اس سورت کشف میں تین واقعات بیان ہوئے ہیں۔ یہ تینوں ایک لحاظ سے ہم آہنگ ہیں۔ پہلا واقعہ اصحاب کشف کا ہے، جو گزر چکا ہے دوسرا زیر نظر ہے، یہ حضرت موسیٰ اور حضرت خضر کی داستان ہے تیسرا واقعہ ذوالقرنین کے بارے میں ہے جو بعد میں آئے گا۔

یہ تینوں واقعات ہمیں ہماری اس محدود زندگی سے باہر نکالتے ہیں جس کے ہم عادی ہو چکے ہیں۔ یہ واقعات اس امر کی نشاندہی کرتے ہیں کہ یہ جہان اسی میں محدود نہیں کہ جو کچھ ہمیں ملتا ہے اور نہ ہی واقعات کی حقیقت بس وہی ہے جو ہمیں معلوم ہوتی ہے یا جو ہم سمجھتے ہیں۔

بہر حال اصحاب کشف کا واقعہ ایسے جو انہوں نے اپنی ایمان کی حفاظت کے لیے ہر چیز کو ٹھوک مار دی۔

حضرت موسیٰ اور خضر کہ جو اس زمانے کے بڑے عالم تھے ان کا واقعہ بھی عجیب ہے۔ یہ واقعہ نشاندہی کرتا ہے کہ حضرت موسیٰ جیسے اولو العزم پیغمبر کہ جو اپنے ماحول کے آگاہ ترین اور عالم ترین فرد تھے، بعض

پہلوؤں سے ان کا علم بھی محدود تھا لہذا وہ استاد کی تلاش میں نکلے تاکہ اس سے درس لیں۔ استاد نے بھی ایسے درس دیئے کہ جن میں سے ہر ایک دوسرے سے عجیب تر ہے۔ اس داستان میں بہت سے اہم نکات پوشیدہ ہیں۔

پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے: وہ وقت یاد کرو جب موسیٰ نے اپنے دوست اور ساتھی جوان سے کہا کہ میں تو کوشش جاری رکھوں گا جب تک "جمع البحرین" تک نہ پہنچ جاؤں، اگرچہ مجھے یہ سفر لمبی مدت تک جاری رکھنا پڑے (واذ قال موسیٰ لفتنہ لا ابرح حتی ابلغ مجمع البحرین او امضی حقبا)۔

اس آیت میں "موسیٰ" سے مراد بلاشبہ وہی مشہور اولو العزم پیغمبر حضرت موسیٰ بن عمران علیہ السلام ہیں بعض مفسرین نے اس احتمال کا اظہار کیا ہے کہ یہاں کوئی اور موسیٰ مراد ہے۔ ہم بعد میں اس سلسلے میں وضاحت کریں گے کہ اس احتمال کی وجہ یہ ہے کہ مذکورہ مفسرین اس واقعے سے ابھرنے والے چند سوالات کا جواب تلاش نہیں کر پائے لہذا وہ مجبور ہوئے ہیں کہ کوئی اور موسیٰ فرض کریں حالانکہ قرآن نے جہاں کہیں "موسیٰ" کی بات کی ہے وہاں موسیٰ بن عمران علیہ السلام ہی مراد ہیں۔

بہت سے مفسرین اور بہت سی روایات کے مطابق آیت میں "فتنا" سے مراد "یوشع بن نون" ہیں۔ وہ بنی اسرائیل کے رشید، شجاع اور با ایمان جو امر دیتے۔ ہو سکتا ہے اُن کے لیے لفظ "فتی" (جوان) انہی برجستہ صفات کی بنا پر ہو یا اس لیے کہ وہ حضرت موسیٰ کی خدمت کرتے تھے، ان کے ہمراہی اور ہم قدم تھے۔

"جمع البحرین" کا مطلب ہے دو دریاؤں کا سنگم۔ اس سلسلے میں مفسرین میں اختلاف ہے کہ "بحرین" سے کیا کون سے دو دریا ہیں۔ اس سلسلے میں تین مشہور نظریے ہیں:

۱۔ خلیج عقبہ اور خلیج سویز کے ملنے کی جگہ۔ ہم جانتے ہیں کہ بحیرہ احمر دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ ایک حصہ شمال مشرق کی طرف بڑھتا رہتا ہے اور دوسرا شمال مغرب کی طرف، پہلے حصے کو خلیج عقبہ کہتے ہیں اور دوسرے کو خلیج سویز اور یہ دونوں خلیجیں جنوب میں پہنچ کر آپس میں مل جاتی ہیں اور بحیرہ احمر اپنا سفر جاری رکھتا ہے۔

۲۔ اس سے بحر ہند اور بحیرہ احمر کے ملنے کی طرف اشارہ ہے کہ جو باب المندب پر جاتے ہیں۔

۳۔ یہ بحیرہ روم اور بحر اطلس کے سنگم کی طرف اشارہ ہے کہ جو شہر طنجہ کے پاس جبل الطارق کا تنگ دہانہ ہے۔

تیسری تفسیر تو بہت ہی بعید نظر آتی ہے کیونکہ حضرت موسیٰ جہاں رہتے تھے وہاں سے جبل الطارق کا فاصلہ اتنا زیادہ ہے کہ اُس زمانے میں حضرت موسیٰ اگر عام راستے سے وہاں جاتے تو کئی ماہ لگ جاتے۔

دوسری تفسیر میں جس مقام کی نشاندہی کی گئی ہے اس کا فاصلہ اگرچہ نسبتاً کم بنتا ہے لیکن اپنی حد تک وہ بھی زیادہ ہے کیونکہ شام سے جزیریہ میں کا فاصلہ بھی بہت زیادہ ہے۔

پہلا احتمال زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جہاں رہتے تھے وہاں سے یعنی شام سے خلیج عقبہ تک کوئی زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔ دیے بھی زیر نظر آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ نے کوئی زیادہ سفر طے نہیں کیا تھا اگرچہ وہ مقصد تک پہنچنے کے لیے بہت زیادہ سفر کے لیے بھی تیار تھے (غور کیجئے گا)۔

بعض روایات میں بھی اسی معنی کی طرف اشارہ نظر آتا ہے۔

لفظ ”حقب“ ”عرصہ دراز“ کے معنی میں ہے۔ بعض نے اس کی ۸۰ سال سے تفسیر کی ہے۔ اس لفظ سے حضرت موسیٰ کا مقصد یہ تھا کہ مجھے جس کی تلاش ہے میں اسے ڈھونڈھ سکے رہوں گا چاہے اس مقصد کے لیے مجھے سالہا سال تک سفر جاری رکھنا پڑے۔

جو کچھ سطور بالا میں لکھا گیا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ کو کسی نہایت اہم چیز کی تلاش تھی۔ وہ اس کی جستجو میں در بدر پھر رہے تھے۔ وہ عزم بالجزم اور پختہ ارادے سے اسے ڈھونڈ رہے تھے۔ وہ ارادہ کیے ہوئے تھے کہ جب تک اپنا مقصود نہ پالیں نہیں سے نہیں بیٹھیں گے۔

حضرت موسیٰ جس کی تلاش پر مامور تھے اس کا آپ کی زندگی پر بہت گہرا اثر ہوا اور اس نے آپ کی زندگی کا نیا باب کھول دیا۔ جی ہاں! وہ ایک مرد عالم و دانشمند کی جستجو میں تھے۔ ایسا عالم کہ جو حضرت موسیٰ کی آنکھوں کے سامنے سے بھی حجاب ہٹا سکتا تھا اور انہیں نئے حقائق سے روشناس کروا سکتا تھا اور ان کے لیے علوم و دانش کے تازہ باب کھول سکتا تھا۔

ہم اس سلسلے میں جلد پڑھیں گے کہ اس عالم بزرگ کی جگہ معلوم کرنے کے لیے حضرت موسیٰ کے پاس ایک نشانی تھی اور وہ اس نشانی کے مطابق ہی چل رہے تھے۔

بہر حال جس وقت وہ ان دو دریاؤں کے سنگم پر جا پہنچے تو ایک پھیل کر جو ان کے پاس تھی اسے بھول گئے (فلما بلغا مجمع بینہما نسیا حوتہما) لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ پھیلنے والے دریا میں اپنی راہ لی اور چلتی بنی (فاتخذ سبیلہ فی البحر سرباً)۔

یہ پھیل جو بھرا ان کے پاس غذا کے طور پر تھی۔ کیا بھونی ہوئی تھی اور اسے نمک لگا ہوا تھا یا یہ تازہ پھیل تھی کہ جو مجزاۃ طور پر زندہ ہو کر اچھل کر پانی میں جا کر تیرنے لگی۔ اس سلسلے میں مفسرین میں اختلاف ہے۔

جیسا کہ داغیب نے مفرات میں لکھا ہے ”سرب“ (بروزن ”جرب“) نشیب کی طرف جانے کے معنی میں ہے اور ”سرب“ (بروزن ”حرب“) نشیبی راستے کے معنی میں ہے۔

بعض کتب تفسیر میں یہ بھی ہے کہ اس علاقے میں آب حیات کا چشمہ تھا۔ اس کے کچھ قطرات پھیل پر پڑ گئے جس سے پھیل زندہ ہو گئی۔

لیکن یہ احتمال بھی ہے کہ پھیل ابھی پوری طرح نری نہ تھی کیونکہ بعض پھیلیاں ایسی بھی ہوتی ہیں جو پانی سے نکلنے کے بعد بہت دیر تک نیم جاں صورت میں رہتی ہیں اور اس مدت میں پانی میں گر جائیں تو ان کی معمول کی زندگی پھر شروع ہو جاتی ہے۔

آخر کار موسیٰ اور ان کے ہمراہی دو دریاؤں کے سنگم سے آگے نکل گئے تو بے سفر کے باعث انہیں خشکی کا احساس ہوا اور بھوک بھی ستانے لگی۔ اس وقت موسیٰ کو یاد آیا کہ غذا تو ہم ہمراہ لائے تھے لہذا انہوں نے اپنے ہمسفر دوست سے کہا ہمارا کھانا لایئے۔ اس سفر نے تو بہت تھکا دیا ہے (فلما جاؤزا قال لفضہ ائتانا غذا ائنا لقد لقینا من سفرنا ہذا نصباً)۔

”غدا“ ناشتہ کو یا دوپہر کے کھانے کو کہتے ہیں لیکن کتب لغت میں جو تعبیرات آئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ گزشتہ زمانے میں ”غدا“ صرف اس کھانے کو کہتے تھے جو دن کی ابتدا میں کھایا جاتا تھا کیونکہ یہ لفظ ”غداۃ“ سے لیا گیا جو دن کے آغاز کے معنی میں ہے جبکہ موجودہ عربی زبان میں ”غدا“ اور ”تغدی“ دن یا دن کے کھانے کو کہتے ہیں۔

بہر حال یہ جملہ نشاندہی کرتا ہے کہ حضرت موسیٰ اور حضرت یوشع نے اتنا راستہ طے کر لیا تھا کہ جس پر سفر کا اطلاق ہوتا تھا لیکن یہی تعبیرات نشاندہی کرتی ہیں کہ سفر کچھ زیادہ طواری نہ تھا۔

اس وقت ”ان کے ہمسفر نے انہیں خبر دی کہ آپ کو یاد ہے کہ جب ہم نے اس پتھر کے پاس پناہ لی تھی (اور آرام کیا تھا) تو مجھے پھیل کے بارے میں بتانا یاد نہ تھا اور شیطان ہی تھا جس نے یہ بات مجھے بھلا دی تھی۔ ہوا یہ کہ پھیل نے بڑے حیران کن طریقے سے دریا کی راہ لی اور پانی میں چلتی بنی (قال ارییت اذ او سینا الی الصخرۃ فانہ لیسیت الحوت وما انسانہ الا الشیطان ان اذ کورہ واتخذ سبیلہ فی البحر عجبا)۔

یہ معاملہ چونکہ موسیٰ کے لیے اس عالم بزرگ کو تلاش کرنے کے لیے نشانی کی حیثیت رکھتا تھا لہذا ”موسیٰ نے کہا: یہی تو ہمیں چاہیئے تھا اور یہی چیز تو ہم ڈھونڈتے پھرتے تھے“ (قال ذلک ما کنا نبغ)۔ اور اُس وقت وہ تلاش کرتے ہوئے اسی راہ کی طرف پلٹے (فارتدا علی امانا دھما قصصاً)۔

”وما انسانہ الا الشیطان ان اذ کورہ“۔ یہ جملہ معترضہ ہے کہ جو بات کے بیچ میں آگیا ہے۔ یہ جملہ درحقیقت بھول جانے کی علت بیان کر رہا ہے اس لیے درمیان میں آگیا ہے۔ خصوصاً ایسے اشخاص کو جنہیں کسی بزرگ تر شخصیت کی طرف سے عتاب و خطاب ہو رہا ہو مولادہ طلب اصل کو اپنی گفتگو کے بیچ میں جملہ معترضہ کی صورت میں ذکر کر دیتے ہیں تاکہ اعتراف نہ ہو جائے۔

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے کہ کیا ممکن ہے کہ حضرت موسیٰ جیسے پیغمبر نسیان کا شکار ہو جائیں کیونکہ قرآن کہتا ہے:

نسیا حوتھما

وہ دونوں اپنی پھلی کو بھول گئے۔

علاوہ ازیں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ موسیٰ کے ہمسفر نے اپنی بھول کی نسبت شیطان کی طرف کیوں دی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں کوئی مانع نہیں کہ جن مسائل کا تعلق احکام الہی اور امور تبلیغی سے نہ ہو یعنی روزمرہ کے عام مسائل ہوں ان میں نسیان ہو جائے (خصوصاً ایسے موقع پر جہاں معاملے کا تعلق آزمائش سے ہو جیسا کہ اس موقع پر حضرت موسیٰ کے لیے کہا جاتا ہے۔ اس کی تشریح بعد میں آئے گی)۔ باقی رہا آپ کے ہمسفر کا نسیان کی نسبت شیطان کی طرف دینا۔ تو ممکن ہے یہ اس بنا پر ہو پھلی کا معاملہ اس عالم بزرگ کو پانے اور اس کی ملاقات سے مربوط تھا اور چونکہ شیطان ہر نیکی میں حائل ہونے کی کوشش کرتا ہے لہذا اس نے چاہا کہ اس ملاقات میں انہیں دیر ہو جائے اور شاید اس کی بنیاد خود پوش کی طرف سے پڑی ہو کہ اس کام میں جس قدر اہتمام اور احتیاط ضروری تھی وہ انہوں نے نہ کی ہو۔

۴۵ ﴿فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَا اتَيْنَاهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنَاهُ مِمَّا لَدُنَّا عِلْمًا﴾

۴۶ ﴿قَالَ لَهُ مُوسَىٰ هَلْ أَتَّبِعُكَ عَلَىٰ أَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا﴾

۴۷ ﴿قَالَ إِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا﴾

۴۸ ﴿وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلَىٰ مَا لَمْ تُحِطْ بِهِ خُبْرًا﴾

۴۹ ﴿قَالَ سَتَجِدُنِي إِن شَاءَ اللَّهُ صَابِرًا وَلَا أَعْصِي لَكَ أَمْرًا﴾

۵۰ ﴿قَالَ فَإِنِ اتَّبَعْتَنِي فَلَا تَسْأَلْنِي عَنْ شَيْءٍ حَتَّىٰ أُخْبِرَ لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا﴾

ترجمہ

۴۵ (دو ماں) انہیں ہمارے بندوں میں سے ایک بندہ ملا۔ وہ بندہ کہ جس

پر ہم نے اپنی رحمت کی تھی اور جسے ہم نے اپنی طرف سے بہت سا علم دیا تھا۔

۴۶ موسیٰ نے اس سے کہا: مجھے اجازت ہے کہ میں آپ کی پیروی کروں تاکہ

جو علم آپ کو عطا کیا گیا ہے اور جو باعثِ رشد و صلاح ہے آپ وہ مجھے سکھا دیں۔

۴۷ اُس نے کہا: تم ہرگز میرے ساتھ صبر نہیں کر سکتے۔

۴۸ اور جس چیز کے رموز سے تم آگاہ ہی نہیں ہو تم اس پر صبر کر بھی کیسے سکتے ہو؟
 ۴۹ (موسیٰ نے) کہا: انشاء اللہ مجھے صابر پاؤ گے اور میں کسی امر میں آپ کے حکم کی مخالفت نہیں کروں گا۔

۵۰ (خضر نے) کہا: اچھا اگر تم چاہتے ہو تو میرے پیچھے پیچھے آ جاؤ اور دیکھو! کسی مسئلے کے بارے میں سوال نہ کرنا یہاں تک کہ میں خود (موقع پر) تجھ سے بیان کر دوں۔

تفسیر

عظیم استاد کی زیارت

جس وقت موسیٰ اور ان کے ہم سفر دوست مجمع البحرین اور پتھر کے پاس پلٹ کر آئے تو اچانک ہمارے بندوں میں سے ایک بندے سے ان کی ملاقات ہو گئی۔ وہ بندہ کہ جس پر ہم نے اپنی رحمت کی تھی اور جسے ہم نے بہت سے علم و دانش سے نوازا تھا (فوجہ اعبدا من عبادنا اتیناہ رحمة من عندنا وعلماہ من لدنا علما)۔

”وَجَدَاہِی تَعْبِیْرَ اَسْ بَاتِی کِی نَشَانْدَہِی کَرْتِی سَہِ کَہ دَہ اَسِی عَالَمِ کِی مَلَاَشِ مِی تَحْتِی اَوْر اَخْرَا ر اَنھوں نے اسے ”پالیا۔“

”عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَا“ (ہمارے بندوں میں سے ایک بندہ)۔ یہ تعبیر بتاتی ہے کہ انسان کیلئے بہترین اعزاز و اعتماد یہ ہے کہ وہ خدا کا سچا بندہ ہو اور یہ مقام عبودیت ہی ہے کہ جہاں انسان پر رحمت الہی نازل ہوتی ہے اور علوم کے دریچے اس کے دل کے سامنے کھل جاتے ہیں۔

”مِّنْ لَّدُنَا“ کی تعبیر بھی بتاتی ہے کہ اس عالم کا علم معمولی اور عام سا نہیں تھا بلکہ اس جہان کے ایسے اسرار و حوادث کی آگاہی کا ایک حصہ تھا کہ جنہیں صرف خدا جانتا ہے۔
 ”علما“ کی تعبیر نگرہ ہے اور نگرہ ایسے مواقع پر عموماً تعظیم کے لیے ہوتا ہے۔ یہ تعبیر نشاندہی کرتی ہے کہ اس مرد عالم نے اس علم سے اچھا خاصہ حصہ پایا تھا۔

یہ کہ زیر بحث آیت میں ”رحمة من عندنا“ سے کیا مراد ہے۔ اس سلسلے میں مفسرین نے مختلف تفسیریں ذکر کی ہیں بعض نے کہا ہے کہ مقام نبوت کی طرف اشارہ ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ عہد ولایتی

کی طرف اشارہ ہے۔ لیکن یہ احتمال بھی ہے کہ اس سے مراد شایان شان استعداد، عظمت روح اور شرح حد ہوا اور یہ خدا کی طرف سے اس جوانمرد کے لیے اس لیے ہو کہ وہ علم الہی کے حصول کا اہل ہو سکے۔

یہ کہ اس عالم کا نام ”خضر“ تھا۔ وہ پیغمبر تھا یا نہیں۔ اس سلسلے میں ہم آئندہ صفحات میں بحث کریں گے۔ اس وقت حضرت موسیٰ نے بڑے ادب سے اس عالم بزرگ کی خدمت میں عرض کیا: کیا مجھے اجازت ہے کہ میں آپ کی پیروی کروں تاکہ جو علم آپ کو عطا کیا گیا ہے اور جو باعث رشد و صلاح ہے، مجھے بھی تعلیم دیں (قال له موسیٰ هل اتبعک علی ان تعلمن ما علمت رشدا)۔

”رشد“ کی تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ علم ہدف و مقصد نہیں ہے بلکہ علم تو حصول مقصد کا ذریعہ اور خیر صلاح کے حصول کا وسیلہ ہے۔ ایسا ہی علم قدر و قیمت کا حامل ہے اور استاد سے ایسا ہی علم حاصل کرنا چاہیے اور یہی علم مایہ افتخار ہے۔

لیکن بڑے تعجب کی بات ہے کہ اس عالم نے موسیٰ سے کہا: تم میرے ساتھ ہرگز صبر نہ کر سکو گے (قال انک لن تستطیع معی صبرا)۔

ساتھ ہی اس کی وجہ اور دلیل بھی بیان کر دی اور کہا: ”تم اس چیز پر کیسے صبر کر سکتے ہو جس کے اسرار سے تم آگاہ ہی نہیں (وکیف تصبر علی ما لم تحط بہ خبرا)۔“

جیسا کہ ہم بعد میں دیکھیں گے یہ عالم اسرار و حوادث کے باطنی علوم پر دسترس رکھتا تھا جبکہ حضرت موسیٰؑ باطن پر مامور تھے اور نہ ان کے بارے میں زیادہ آگاہی رکھتے تھے۔

ایسے مواقع پر ایسا بہت ہوتا ہے کہ حوادث کے ظاہر سے ان کا باطن مختلف ہوتا ہے بعض اوقات کسی واقعے کا ظاہر احمقانہ اور ناپسندیدہ ہوتا ہے جبکہ باطن میں بہت مقدس منطقی اور سوچا سمجھا ہوتا ہے۔ ایسے مواقع پر جو شخص ظاہر کو دیکھتا ہے وہ اس پر صبر نہیں کر پاتا اور اس پر اعتراض کرتا ہے یا مخالفت کرنے لگتا ہے لیکن وہ استاد کہ جو اسرار دروں سے آگاہ ہے اور معاملے کے باطن پر نظر رکھتا ہے وہ بڑے اطمینان اور ٹھنڈے دل سے کام جاری رکھتا ہے اور اعتراض اور واویلے پر کان نہیں دھرتا بلکہ مناسب موقع کے انتظار میں رہتا ہے تاکہ حقیقت امر بیان کرے جبکہ شاگرد بے تاب رہتا ہے لیکن جب اسرار اس پر کھل جاتے ہیں تو اسے پوری طرح سکون و قرار آ جاتا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام یہ بات سن کر پریشان ہوئے انہیں خوف تھا کہ اس عالم بزرگ کا فیض ان سے منقطع نہ ہو لہذا انہوں نے وعدہ کیا کہ تمام امور پر صبر کریں گے اور ”کہا انشاء اللہ آپ مجھے صابر پائیں گے اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ کسی کام میں آپ کی مخالفت نہیں کروں گا“ (قال ستجدن انی شاء اللہ صابرا ولا اعصی لک امرا)۔

یہ کہہ کر حضرت موسیٰ نے ہجرا انتہائی ادب و احترام اور خدا کی حیثیت پر اپنے بھروسے کا اظہار کیا۔

آپ نے اس عالم سے یہ نہیں کہا کہ میں صابر ہوں بلکہ کہتے ہیں: انشاء اللہ آپ مجھے صابر پائیں گے۔ لیکن چونکہ ایسے واقعات پر صبر کرنا کہ جو ظاہر نا پسندیدہ ہوں اور انسان جن کے اسرار سے آگاہ نہ ہو کوئی آسان کام نہیں اس لیے اس عالم نے حضرت موسیٰ کو خیردار کرتے ہوئے پھر عہد لیا اور کہا اچھا اگر تم میرے پیچھے پیچھے آنا چاہتے ہو تو دیکھو! خاموش رہنا اور کسی معاملے پر سوال نہ کرنا جب تک کہ مناسب موقع پر میں خود تم سے بیان نہ کر دوں (قال فان اتبعتنی فلا تسألن عن شیء حتی احدث لك منه ذکرا)۔

۴۱) فَأَنْطَلَقَا حَتَّىٰ إِذَا رَكِبَا فِي السَّفِينَةِ خَرَقَهَا قَالَ أَخَرْتُمَا لِتَغْرِقَ أَهْلَهَا لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا أَمْرًا ۝

۴۲) قَالَ أَلَمْ أَقُلْ إِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا ۝

۴۳) قَالَ لَا تُؤَاخِذْنِي بِمَا نَسِيتُ وَلَا تُرْهِقْنِي مِنْ أَمْرِي عُسْرًا ۝

۴۴) فَأَنْطَلَقَا حَتَّىٰ إِذَا لَقِيَا غُلَامًا فَقَتَلَهُ قَالَ أَقْتَلْتُمْ نَفْسًا زَكِيَّةً بِغَيْرِ نَفْسٍ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا نُكْرًا ۝

۴۵) قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَكَ إِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا ۝

۴۶) قَالَ إِنْ سَأَلْتَهُ عَنْ شَيْءٍ بَعْدَ هَٰذَا فَلَا تُصَحِّبْنِي ۚ قَدْ بَلَغْتَ مِنْ لَدُنِّي عُذْرًا ۝

۴۷) فَأَنْطَلَقَا حَتَّىٰ إِذَا أَتَيَا أَهْلَ قَرْيَةٍ اسْتَطْعَمَا أَهْلَهَا فَأَبَوْا أَنْ يُضَيِّفُوهُمَا فَوَجَدَا فِيهَا جِدَارًا يُرِيدُ أَنْ يَنْقَضَ فَأَقَامَا ۝

۴۸) "احداث لك منه ذكرا" میں لفظ "احداث" کا مفہوم ہے کہ میں خود بات شروع کروں گا اور پہلے خود اس سے پردہ اٹھاؤں گا، تم بات نہ کرنا۔

۴۸) قَالَ لَوْ شِئْتُ لَتَّخَذْتُ عَلَيْهِ أَجْرًا ۝
۴۹) قَالَ هَٰذَا فِرَاقُ بَيْنِي وَبَيْنِكَ ۚ سَأُنَبِّئُكَ بِتَأْوِيلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ عَلَيْهِ صَبْرًا ۝

ترجمہ

۴۱) وہ چل پڑے یہاں تک کہ ایک کشتی پر سوار ہو گئے۔ اس نے کشتی میں سوراخ کر دیا (موسیٰ نے) کہا: کیا آپ نے اس میں سوار لوگوں کو غرق کرنے کے لیے اس میں سوراخ کر دیا ہے، واقعاً آپ نے کیسا بڑا کام انجام دیا ہے اُس نے کہا: میں نے نہ کہا تھا کہ تم میرے ساتھ ہرگز صبر نہیں کر سکتے۔ (موسیٰ نے) کہا: اس جھول پر میرا مواخذہ نہ کریں اور اس امر پر مجھ پر سخت گیری نہ کریں۔

۴۲) پھر وہ چل پڑے یہاں تک کہ ایک بچے کو دیکھا۔ اُس نے اس بچے کو قتل کر دیا۔ (موسیٰ نے) کہا: کیا آپ نے ایک پاک انسان کو قتل کر دیا ہے جبکہ اس نے کسی کو قتل نہیں کیا۔ آپ نے سچ مچ بڑا کام کیا ہے۔

۴۳) اُس (عالم) نے (پھر) کہا: میں نے تم سے نہ کہا تھا کہ تم ہرگز میرے ساتھ صبر نہیں کر پاؤ گے۔

۴۴) (موسیٰ نے) کہا: اس کے بعد اگر میں آپ سے کسی چیز کے بارے میں سوال کروں تو مجھے ساتھ نہ رکھیے گا کیونکہ پھر میری طرف سے آپ معذور ہوں گے۔ وہ پھر چل پڑے۔ چلتے چلتے ایک بستی کے پاس پہنچے۔ انہوں نے ان

سے کھانا مانگا لیکن انہوں نے مہمان بنانے سے انکار کر دیا۔ (اُس کے باوجود انہوں نے دہاں ایک دیوار دیکھی کہ جو گر رہی تھی (اُس عالم نے) اُس (دیوار) کو کھڑا کر دیا۔ (موسیٰ نے) کہا (کم از کم) اس کام کی اجرت ہی لے لیتے۔

(۷۸) اس نے کہا: اب تمہارے اور میرے درمیان جدائی کا وقت آگیا ہے لیکن میں جلد تمہیں اس چیز کے راز سے آگاہ کروں گا جس پر تم صبر نہیں کر سکتے۔

تفسیر

خدائی معلم اوریہ ناپسندیدہ کام؟

موسیٰ اس عالم ربانی کے ساتھ چل پڑے۔ چلتے چلتے ایک کشتی تک پہنچے اور اس میں سوار ہو گئے (فانطلقا حتی اذا رکبا فی السفینۃ)۔

یہاں سے ہم دیکھتے ہیں کہ اب قرآن تنزیہ کی ضمیر استعمال کرنے لگا ہے۔ یہ اشارہ ہے حضرت موسیٰ اور اس عالم بزرگوار کی طرف۔ یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ حضرت موسیٰ کے مسافر پوش کی ماموریت اس مقام پر ختم ہو گئی تھی اور وہ یہاں سے پلٹ گئے تھے یا پھر یہ ہے کہ وہ موجود تھے لیکن اس معاملے سے ان کا تعلق نہیں تھا لہذا انہیں یہاں نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ لیکن پہلا احتمال زیادہ قوی معلوم ہوتا ہے۔

بہر حال وہ دونوں کشتی پر سوار ہو گئے تو اس عالم نے کشتی میں سوراخ کر دیا (خرقھا)۔

جیسا کہ راغب نے مفردات میں کہا ہے "خرق یحسی چیز کو بے سوچے سمجھے تباہ کرنے کی نیت سے چیرنے پھاڑنے کے معنی میں ہے اور اس عالم کا کام ظاہری طور پر یوں ہی لگتا تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام چونکہ ایک طرف تو اللہ کے عظیم نبی بھی تھے لہذا انہیں لوگوں کی جان و مال کا محافظ بھی ہونا چاہیے تھا اور انہیں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی کرنا چاہیے تھا اور دوسری طرف ان کا انسانی ضمیر اس بات کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ وہ اس قسم کے غلط کام پر خاموشی اختیار کریں لہذا حضرت خضر کے ساتھ ان کا جو معاہدہ ہوا تھا اسے ایک طرف رکھا اور اس کام پر اعتراض کر دیا اور کہا: کیا آپ نے اہل کشتی کو غرق کرنے کے لیے اس میں سوراخ کر دیا ہے۔ واقعاً آپ نے کس قدر بڑا کام انجام دیا ہے (قال اخرقتها لتغرق اهلها لقد جئت شيئا امرًا)۔

اس میں شک نہیں کہ اس عالم کا مقصد کشتی والوں کو غرق کرنا نہ تھا لیکن اس عمل کا نتیجہ غرق ہونے کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا تھا لہذا حضرت موسیٰ نے لام غایت کے ساتھ اسی طرف اشارہ کر دیا کیونکہ لام غایت مقصد بیان کرنے کے لیے آتی ہے۔

یہ بالکل ایسے ہی ہے کہ ایک شخص بہت کھانا کھاتا جائے تو اُسے کہا جائے کہ کیوں اپنے آپ کو مارنا چاہتے ہو۔ یقیناً اُس کا یہ مقصد تو نہیں کہ اپنے آپ کو مار ڈالے لیکن ہو سکتا ہے اس کے عمل کا یہی نتیجہ نکلے۔

"راضر" (بروزن "شمر") حیرت انگیز اہم کام یا بہت بُرے کام کو کہا جاتا ہے اور یہ کام واقعاً ظاہری طور پر تعجب انگیز اور بہت بُرا ہے۔ واقعاً یہ کام کتنا حیرت انگیز ہے کہ کسی کشتی میں بہت سے مسافر سوار ہوں اور اس میں سوراخ کر دیا جائے۔

بعض روایات میں ہے کہ اہل کشتی جلد ہی متوجہ ہو گئے اور انہوں نے اس سوراخ کو کسی ذریعے سے پُر کر دیا لیکن اب وہ کشتی صحیح نہیں رہ گئی تھی۔

اس وقت اس عالم نے بڑی مناسبت کے ساتھ موسیٰ پر نگاہ ڈالی اور کہا: میں نے نہیں کہا تھا کہ تم میرے ساتھ ہرگز صبر نہیں کر سکو گے (قال الم اقل انك لن تستطع معي صبرا)۔

اس واقعے کی اہمیت کے پیش نظر حضرت موسیٰ کی عجلت اگرچہ فطری تھی تاہم وہ پشیمان ہوئے۔ انہیں اپنا معاہدہ یاد آیا لہذا معذرت آمیز لہجہ میں استاد سے کہا: اس بھول پر مجھ سے مواخذہ نہ کیجئے اور اس کام پر مجھ پر سخت گیری نہ کیجئے (قال لا تؤاخذني بما نسيت ولا ترهقني من امري عسرا)۔ یعنی اشتباہ ہو گیا۔ اب وہ وقت گزر گیا ہے آپ اپنی بزرگی کی وجہ سے ضرب نظر کریں۔

"لا ترهقني" "ارهاق" کے مادہ سے قر و غلبہ سے کسی چیز کو ڈھانپنے کے معنی میں ہے کبھی یہ تکلیف دینے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ زیر بحث جملے میں مراد یہ ہے کہ مجھ پر سختی نہ کیجئے اور مجھے تکلیف میں نہ ڈالیں اور اس کام کی وجہ سے اپنا فیض علم مجھ سے منقطع نہ کریں۔

ان کا دریا فی سفر ختم ہو گیا۔ وہ کشتی سے اتر آئے۔ سفر جاری تھا۔ اشارے راہ میں انہیں ایک بچہ ملا لیکن اس عالم نے بھی تمہید کے بغیر ہی اس بچے کو قتل کر دیا (فانطلقا حتی اذا القيا غلاما مقتله)۔

حضرت موسیٰ سے پھر نہ رہا گیا۔ یہ نہایت وحشتناک منظر تھا۔ بلا جواز اور بے وجہ ایک بے گناہ بچے کا قتل ایسی چیز نہ تھی کہ حضرت موسیٰ خاموش رہ سکتے۔ آپ غصے سے آگ بگولہ ہو گئے۔ غم داندہ اور غصے کا یہ عالم تھا کہ آپ نے پھر اپنے معاہدے کو نظر انداز کرتے ہوئے اب کے شدید تر اور واضح تر اعتراض کیا۔ یہ واقعہ بھی پہلے واقعے کی نسبت زیادہ وحشتناک تھا۔ وہ کہنے لگے: کیا آپ نے ایک بے گناہ اور پاک انسان کو قتل کر دیا ہے جبکہ اس نے کسی کو قتل نہیں کیا (قال اقتلت نفسا زكية بغير نفس)۔

واقعا آپ نے کیسا بڑا کام انجام دیا ہے (لقد جئت شیئا نكرا)۔

لفظ "غلام" جو ان نرس کے معنی میں ہے۔ وہ مد بلوغ کو پہنچا ہوا یا نہ پہنچا ہو۔

جس نوجوان کو اس عالم نے قتل کیا تھا وہ مد بلوغ کو پہنچا ہوا تھا یا نہیں۔ اس سلسلے میں مفسرین میں اختلاف ہے۔

بعض نے "نفسا ذکیۃ" (پاک اور بے گناہ انسان) کو اس بات کی دلیل قرار دیا ہے کہ وہ بالغ نہیں تھا۔

بعض دیگر نے "بغیر نفس" کی تعبیر کو اس بات کی دلیل بنایا ہے کہ وہ بالغ تھا کیونکہ قصاص صرف بالغ سے لیا جاسکتا ہے۔

البتہ آیت کو مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اس سلسلے میں حتیٰ فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔

"نکر" قبیح اور منکر کے معنی میں ہے ایسے کام کا نتیجہ بھی "امر" سے زیادہ ہے جو کشتی میں سوراخ کرنے کے واقعے کے لیے آیا ہے۔ اس کی دلیل بھی واضح ہے کیونکہ ان کے پہلے کام نے چند لوگوں کو خطرے میں ڈال دیا تھا اور وہ لوگ جلد ہی متوجہ ہو گئے اور انہوں نے خطرے کو اپنے آپ سے دور کر دیا لیکن دوسرے کام میں ظاہر آ رہا ہے کہ ایک جرم کے مرتکب ہوئے تھے۔

اس عالم بزرگوار نے پھر اپنے خاص اطمینان اور نرم لہجے میں وہی جملہ دہرایا: "کما: میں نے تم سے نہ کہا تھا کہ تم ہرگز میرے ساتھ صبر نہ کر سکو گے" (قال الم اقل لک انک لن تستطیع معی صبرا)۔ پہلے اور اس جملے میں فرق یہ ہے کہ اس میں لفظ "لک" کا اضافہ ہے کہ جو مزید تاکید کے لیے ہے یعنی میں نے یہ بات خود تم سے کہی تھی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنا عہد یاد آگیا۔ انہیں بہت احساسِ شرمندگی ہو رہا تھا کیونکہ دوسرے یہ بیان ٹوٹ چکا تھا چاہے بھول کر ہی ایسا ہوا ہو۔ انہیں خیال آ رہا تھا کہ ہو سکتا ہے استاد کی بات صحیح ہو کہ انہوں نے تو پہلے ہی واضح کر دیا تھا کہ ابتداء میں ان کے کام موسیٰ کے لیے ناقابلِ برداشت ہوں گے۔ موسیٰ نے پھر عذر خواہی کے لہجے میں کہا کہ اس دفعہ بھی مجھ سے صرف نظر کیجئے اور میری بھول چوک کو نظر انداز کر دیجئے اور "اگر اس کے بعد میں آپ کے کاموں کے بارے میں وضاحت کا تقاضا کروں (اور آپ پر اعتراض کروں) تو پھر بے شک مجھے ساتھ نہ رکھیں اور اس صورت میں آپ میری طرف سے معذور ہوں گے" (قال ان سألک عن شیء بعد ہا فلا تصاحبنی قد بلغت من لدنی عذرا)۔

یہ جملہ حضرت موسیٰ کی انصاف پسندی، بلند نظری اور عالی ظرفی کی حکایت کرتا ہے اور نشانہ دہی کرتا ہے کہ وہ ایک حقیقت کے سامنے سر ہٹکا دینے والے تھے اگرچہ وہ کتنی ہی تلخ بھول نہ ہو۔

دوسرے لفظوں میں۔ تین بار کی آزمائش سے یہ واضح ہو جائے گا کہ ان دونوں کی ماوریت الگ الگ

ہے اور اس کا نباہ نہیں ہو سکتا۔

اس گفتگو اور نئے معاہدے کے بعد "موسیٰ اپنے استاد کے ساتھ چل پڑے۔ چلتے چلتے وہ ایک بستی میں پہنچے۔ انہوں نے اس بستی والوں سے کھانا مانگا لیکن بستی والوں نے انہیں ممان بنانے سے انکار کر دیا (فانطلقا حتی اذا اتیا اهل قریۃ استطعما اهلہا فابوا ان یضیفوہما)۔

اس میں شک نہیں کہ حضرت موسیٰ اور حضرت خضر کوئی ایسے افراد نہ تھے کہ اس بستی کے لوگوں پر بوجھ بننا چاہتے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنا زاد و توشہ راستے میں کہیں دے بیٹھے تھے یا پھر ختم ہو گیا تھا۔ لہذا وہ چاہتے تھے کہ بستی والوں کے ممان ہو جائیں (یہ احتمال بھی ہے کہ اس عالم نے جان بوجھ کر لوگوں سے ایسا کہا ہوتا کہ حضرت موسیٰ کو ایک اور درس دیا جاسکے)۔

اس نکتے کی یاد دہانی بھی ضروری ہے کہ "قریۃ" قرآن کی زبان میں ایک عام مفہوم رکھتا ہے اور ہر قسم کے شہر اور آبادی کے معنی میں آیا ہے لیکن یہاں خصوصیت سے شہر مراد ہے کیونکہ چند آیات کے بعد اس کے لیے لفظ "المدینہ" آیا ہے۔

بہر حال مفسرین میں اس سلسلے میں اختلاف ہے کہ یہ شہر کونسا تھا اور کہاں واقع تھا۔ ابن عباس سے منقول ہے کہ یہ شہر "انطاکیہ" تھا یہ۔

بعض نے کہا ہے کہ یہاں "ایلہ" شہر مراد ہے کہ جو آج کل "ایلات" نام کی مشہور بندرگاہ ہے اور بحیرہ احمر کے کنارے خلیج عقبہ کے نزدیک واقع ہے۔

بعض دوسروں کا نظریہ ہے کہ اس سے "ناصرہ" شہر مراد ہے کہ جو فلسطین کے شمال میں واقع ہے اور حضرت عیسیٰ کی جائے پیدائش ہے۔ مروج طبری نے اس مقام پر حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک حدیث نقل کی ہے کہ جو آخری احتمال کی تائید کرتی ہے۔

مجمع البحرین کے بارے میں ہم کہہ چکے ہیں کہ اس سے مراد خلیج عقبہ اور خلیج سبیر کا سنگم ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ شہر ناصرہ اور بندرگاہ ایلہ اس جگہ سے انطاکیہ کی نسبت زیادہ قریب ہیں۔

بہر صورت جو کچھ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے استاد کے ساتھ اس شہر میں پیش آیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شہر کے رہنے والے بہت بخیل اور کم ظرف لوگ تھے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس شہر والوں کے بارے میں ایک حدیث منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

"انطاکیہ" شام کے قدیم شہروں میں سے ہے۔ اس کا فاصلہ حلب سے ۹۶ کلومیٹر ہے اور اسکندرون سے ۵۹ کلومیٹر ہے۔ یہ علاقہ اناج کی پیداوار کے لیے مشہور ہے۔ سویدہ بندرگاہ اسی علاقے میں ہے اور انطاکیہ سے ۲۴

کلومیٹر دور ہے (دائرة المعارف فریہ ویدی جلد ۵ ص ۵۳۷)۔

كانوا اهل قرية لثام

وہ کیمنے اور کم ظرف لوگ تھے یہ

قرآن کہتا ہے: اس کے باوجود انہوں نے اس شہر میں ایک گرتی ہوئی دیوار دیکھی تو اس عالم نے اس کی مرمت شروع کر دی اور اسے کھڑا کر دیا (فوجدوا فيها جداراً يريد ان ينقض فاقامہ) یہ حضرت موسیٰ اس وقت تھکے ہوئے تھے۔ انہیں بھوک بھی سارہی تھی، کوفت الگ تھی۔ وہ محسوس کر رہے تھے اس آبادی کے نا سجدہ لوگوں نے ان کی اور ان کے استاد کی ہتک کی ہے۔ دوسری طرف وہ دیکھ رہے تھے اس بے احترامی کے باوجود حضرت خضرؑ اس گرتی ہوئی دیوار کی تعمیر میں لگے ہوئے تھے جیسے ان کے سلوک کی مزدوری دے رہے ہوں۔ وہ سوچ رہے تھے کہ کم از کم استاد یہ کام اجرت لے کر ہی کرتے تاکہ کھانا تو فراہم ہو جاتا۔

لہذا وہ اپنے معاہدے کو پھر بھول گئے۔ انہوں نے پھر اعتراض کیا لیکن اب لوجہ پہلے کی نسبت ملائم اور نرم تھا۔ کہنے لگے: اس کام کی کچھ اجرت ہی لے لیتے: (قال لو شئت لامتخذت عليه اجراً)۔ درحقیقت حضرت موسیٰ علیہ السلام یہ سوچ رہے تھے کہ یہ عدل تو نہیں کہ انسان ان لوگوں سے پیار کا سلوک کرے کہ جو اس قدر فرومایہ اور کم ظرف ہوں۔ دوسرے لفظوں میں نیکی اچھی چیز ہے مگر جب برعمل ہو۔ یہ ٹھیک ہے کہ برائی کے جواب میں نیکی کرنا مردان خدا کا طریقہ ہے لیکن وہاں کہ جہاں بُروں کے لیے برائی کی تشویش کا باعث نہ ہو۔ (یعنی وہ "شرافت خور" نہ ہو)۔

اس موقع پر اس عالم بزرگوار نے حضرت موسیٰؑ سے آخری بات کہی کیونکہ گزشتہ تمام واقعات کی بنا پر انہیں یقین ہو گیا تھا کہ موسیٰؑ ان کے کاموں کو برداشت نہیں کر سکتے۔ لہذا فرمایا: "لو اب تمہارے اور میرے درمیان جدائی کا وقت آگیا ہے۔ جلد میں تمہیں ان امور کے اسرار سے آگاہ کروں گا کہ جن پر تم صبر نہ کر سکتے" (قال هذا افراق بيني وبينك سأنبئك بتأويل ما لم تستطع عليه صبراً)۔

حضرت موسیٰؑ نے بھی اس پر کوئی اعتراض نہ کیا کیونکہ گزشتہ واقعے میں یہی بات وہ خود تجویز کر چکے تھے یعنی خود حضرت موسیٰؑ پر یہ حقیقت ثابت ہو چکی تھی کہ ان کا نباہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن پھر بھی جدائی کی خبر موسیٰؑ کے دل پر ہتھوڑے کی ضرب کی طرح لگی۔ ایسے استاد سے جدائی کہ جس کا سینہ خزن اسرار

۱۔ مجمع البیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

۲۔ دیوار کی طرف ارادہ کی نسبت یقینی طور پر مجازی ہے۔ اس کا مضمون یہ ہے کہ وہ ایسی کمزور اور خستہ ہو چکی تھی کہ گویا اس نے گرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔

ہو، جس کی ہمراہی باعث برکت ہو اور جس کی ہر بات ایک درس ہو، جس کا طرز عمل الہام بخش ہو جس کی پیشانی سے نور خدا صوفشاں ہو اور جس کا دل علم الہی کا گنجینہ ہو۔ ایسے رہبر سے جدائی باعث رنج و غم تھی۔ لیکن یہ ایک ایسی تلخ حقیقت تھی جو موسیٰؑ کو ہر حال قبول کرنا تھی۔ مشہور مفسر ابو الفتوح رازی کہتے ہیں کہ ایک روایت ہے:

لوگوں نے حضرت موسیٰؑ سے پوچھا: آپ کی زندگی میں سب سے بڑی مشکل کونسی تھی؟ حضرت موسیٰؑ نے کہا: میں نے بہت سختیاں جھیلی ہیں (فرعون کے دور کی سختیاں اور پھر بنی اسرائیل کے دور کی مشکلات کی طرف اشارہ ہے) لیکن کسی مشکل اور رنج نے میرے دل کو اتنا رنجور نہیں کیا جتنا حضرت خضرؑ سے جدائی کی خبر نے بلے

"تأویل"۔ "اول" (بروزن "قول") کے مادہ سے کسی چیز کو لٹانے کے معنی میں ہے۔ لہذا ہر کام یا بات کو اس کے اصلی ہدف کی طرف لوٹا دینے جانے کو تاویل کہتے ہیں اور خواب کی تعبیر کو بھی اسی لیے تاویل کہتے ہیں (جیسا کہ سورہ یوسف کی آیہ ۱۰۰ میں آیا ہے)۔

هذا تأويل رؤياي

www.sirat-e-nabi.com

تفسیر ابو الفتوح رازی، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

زیر تفسیر کے لیے جلد ۲ تفسیر نمونہ میں سورہ آل عمران کی آیہ ۷ کے ذیل میں رجوع کریں۔

﴿٤٩﴾ اَمَّا السَّفِينَةُ فَكَانَتْ لِمَسْكِينٍ يَعْمَلُونَ فِي الْبَحْرِ فَأَرَدْتُ أَنْ أَعِيبَهَا وَكَانَ وَرَاءَهُمْ مَلِكٌ يَأْخُذُ كُلَّ سَفِينَةٍ غَضْبًا ۝

﴿٥٠﴾ وَامَّا الْغُلَامُ فَكَانَ اَبُوهُ مُؤْمِنًا فَخَشِينَا أَنْ يُرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَكُفْرًا ۝

﴿٥١﴾ فَاَرَدْنَا اَنْ يُبَدِّلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِنْهُ زَكَاةً وَّاَقْرَبَ رُحْمًا ۝

﴿٥٢﴾ وَامَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلَامَيْنِ يَتِيمَيْنِ فِي الْمَدِينَةِ وَكَانَ تَحْتَهُ كَنْزٌ لَهُمَا وَكَانَ اَبُوهُمَا صَالِحًا فَارَادَ رَبُّكَ اَنْ يَبْلُغَا اَشَدَّهُمَا وَيُخْرِجَا كَنْزَهُمَا بِرَحْمَةٍ مِنْ رَبِّكَ وَمَا فَعَلْتُهُ عَنْ اَمْرِي ۚ ذٰلِكَ تَاْوِيلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَلَيْهِ صَبْرًا ۝

ترجمہ

﴿٤٩﴾ ماں وہ کشتی کی بات۔ تو وہ کچھ مسکین و غریب افراد کی تھی۔ وہ اس سے دریا میں کام کرتے تھے۔ میں نے چاہا کہ اس میں کوئی نقص ڈال دوں (کیونکہ) ایک ظالم بادشاہ ان کے پیچھے تھا کہ جو ہر کشتی کو زبردستی ہتھیار لے لے گا۔

﴿٥٠﴾ راہ وہ لڑکا۔ تو اس کے ماں باپ صاحب ایمان تھے۔ ہم نے پسند نہیں کیا

کہ وہ انہیں سرکشی اور کفر پر اکسائے۔

﴿٥١﴾ ہم نے چاہا کہ ان کا رب اس کے بدلے انہیں زیادہ پاک اور زیادہ پُر محبت اولاد عطا کر دے۔

﴿٥٢﴾ رہی اُس دیوار کی بات تو وہ اس شہر کے دو یتیم لڑکوں کی تھی۔ اس کے نیچے ان کا خزانہ تھا۔ اُن کا باپ نیک اور صالح شخص تھا۔ تیرا رب چاہتا تھا کہ وہ بالغ ہو کر اپنا خزانہ نکال لیں۔ یہ تیرے پروردگار کی رحمت تھی۔ میں نے یہ کام اپنی مرضی سے نہیں کیا اور یہ تھا ان کاموں کا راز کہ جن پر تو صبر کی تاب نہ رکھتا تھا۔

تفسیر

ان واقعات کا راز

جب حضرت موسیٰ اور حضرت خضرؑ کا جہا ہونا طے پا گیا تو ضروری تھا کہ یہ الہی استاد اپنے ان کاموں کے اسرار ظاہر کرے کہ حضرت موسیٰ جنہیں گوارا نہیں کر پاتے تھے۔ درحقیقت ان سے مہربانی کا فائدہ حاصل کی تعلیم کے لیے کلید بن سکتا تھا اور مختلف سوالوں کا جواب اس میں پنہاں تھا۔

حضرت خضرؑ نے کشتی والے واقعے سے بات شروع کی اور کہنے لگے: ہاں، تو وہ کشتی والی بات یہ تھی کہ وہ چند غریب و مسکین افراد کی ملکیت تھی۔ وہ اس سے دریا میں کام کرتے تھے۔ میں نے سوچا کہ اس میں کوئی نقص ڈال دوں کیونکہ میں جانتا تھا کہ ایک ظالم بادشاہ ان کے پیچھے ہے اور وہ ہر صیغہ سالم کشتی کو زبردستی ہتھیالیتا ہے (اما السفينة فكانت لمساكين يعملون في البحر فاردت ان اعيبها و كان وراءهم ملك ياخذ كل سفينة غصبا)۔

گویا کشتی میں سوراخ کرنا ظاہر تو برائے تھا لیکن اس کام میں ایک اہم مقصد پوشیدہ تھا اور وہ تھا کشتی کے غریب مالکوں کو ایک غاصب بادشاہ کے ظلم سے بچانا کیونکہ اس کے نزدیک عیب دار کشتیاں اس کے کام کی نہ تھیں اور ایسی کشتیوں پر وہ قبضہ نہیں جاتا تھا۔ خلاصہ یہ کہ یہ کام چند مسکینوں کے مفاد کی

حفاظت کے لیے تھا۔ اور اسے انجام پانا ہی چاہیے تھا۔

لفظ - وراء - (پچھے) - یقیناً یہاں مکانی پہلو نہیں رکھتا۔ یہ تعبیر یہاں کنائے کے طور پر آئی ہے اور اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ وہ متوجہ ہوئے بغیر اس خاتم کے چٹل میں پھنس جاتے اور انسان چونکہ اپنے پس پشت ہونے والے واقعات سے بے خبر ہوتا ہے لہذا یہاں یہ تعبیر استعمال کی گئی ہے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ میرے قرض خواہ میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور مجھے چھوڑتے نہیں۔ سورہ ابراہیم کی آیہ ۱۶ میں ہے:

مَنْ وَرَّاهُ جَهَنَّمُ وَيُنْفَعِي مِنْ مَّاءٍ صَدِيدٍ ۝

اور جہنم اُن کے پیچھے ہے ۔۔۔۔

گویا جہنم ان کا تعاقب کر رہی ہے۔ یہاں بھی وہی - وراء - کی تعبیر آئی ہے بلکہ ضمناً لفظ "مساکین" سے یہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسکین وہ شخص نہیں ہے کہ جس کے پاس بالکل کوئی چیز نہ ہو بلکہ ایسے شخص کو بھی مسکین کہا جاتا ہے جس کے پاس اتنا مال ہو کہ جو اس کی ضروریات کے لیے کافی نہ ہو۔

یہ احتمال بھی ہے کہ انہیں مالی حوالے سے "مساکین" نہ کہا گیا ہو بلکہ طاقت کے حوالے سے وہ مسکین اور فقیر ہوں اور عربی زبان میں یہ تعبیر موجود ہے اور یہ مفہوم مسکین کے اصل معنی سے بھی مطابقت رکھتا ہے جس کے مطابق مساکین کمزور اور ناتواں کو مسکین کہا جاتا ہے۔

نہج البلاغہ میں ہے :

مسکین ابن آدم تؤلمه البقرة وتقتله الشارقة وتنتنه العرقه

بے چارہ فرزند آدم پھر اسے تکلیف پہنچا دیتا ہے۔ تھوڑا سا پانی اس کے گلو

میں الٹک جاتا ہے اور پسینہ آجاتے تو اس سے بدبو آنے لگتی ہے بلکہ

اس کے بعد حضرت خضرؑ کے قتل کے سنے کی طرف آتے ہیں۔ کہتے ہیں : وہ لڑکا تو اس

کے ماں باپ صاحب ایمان تھے۔ ہمیں یہ بات ابھی نہ لگی کہ وہ اپنے ماں باپ کو راہ ایمان سے ہٹا

دے اور سرکشی و کفر پر ابھارے (واما الغلام فكان ابواه مؤمنين فخشينا ان يرهقهما

طغيانا وكفرا)۔

بعض مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ یہاں یہ مراد نہیں کہ کافر و سرکش

لڑکا اپنے ماں باپ کو سرخورد نہ کر دے بلکہ مراد یہ ہے کہ وہ اپنی سرکشی اور کفر کی وجہ سے اپنے ماں باپ

نے "وراء" کے معنی کے سلسلے میں تفسیر نمونہ جلد ۶ سورہ ابراہیم کی آیہ ۱۶ کے ذیل میں بحث کی گئی ہے۔

نہج البلاغہ - کلمات قصار جلد ۱۹ -

کو زیادہ اذیت نہ دے بلکہ البتہ پہلی تفسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

بہر حال اس عالم نے اس لڑکے کو قتل کر دیا اور اس لڑکے کے زندہ رہنے کی صورت میں اس کے

ماں باپ کو آئندہ جو ناگوار واقعات پیش آنے والے تھے انہیں اس قتل کی دلیل قرار دیا۔

انشاء اللہ ہم جلد اس داستان کے مختلف نکات پر تفصیل بحث کریں گے اور حضرت خضرؑ کے تمام

کاموں کو احکام الہی اور منطقی حوالوں سے دیکھیں گے اور "جرم سے قبل قصاص" والے اعتراض کا

جواب دیں گے۔

خشینا - (ہمیں ڈر تھا کہ ایسا ہوگا) - یہ بہت معنی خیز تعبیر ہے۔ یہ تعبیر نشان دہی کرتی ہے کہ وہ

عالم اپنے آپ کو لوگوں کے مستقبل کا ذمہ دار سمجھتا تھا اور وہ اس بات کے لیے تیار نہ تھا کہ صاحب ایمان

ماں باپ اپنی جوان اولاد کے اغواف کی وجہ سے مصیبت سے دوچار ہوں۔

ضمناً یہ بات بھی ہو جائے کہ لفظ "خشینا" (ہمیں خوف ہوا) یہاں "ہمیں اچھا نہ لگا" کے معنی میں

آیا ہے کیونکہ علم و قدرت میں اس مقام کے حامل شخص کے لیے ایسے امور میں خوف و خطر نہیں ہوتا۔ دوسرے

لفظوں میں مقصد ناپسندیدہ کام سے بچنا ہے اور انسان اپنی فطرت کی بنا پر ناگوار امور سے بچنا

چاہتا ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ یہ لفظ یہاں "علمنا" (ہم نے چاہا) کے معنی میں ہو۔ ابن عباس سے

بھی اس کا یہی مفہوم منقول ہے۔ یعنی :

ہم نے چاہا اور ہمیں معلوم ہوا کہ اگر یہ لڑکا زندہ رہ گیا تو اس کے ماں باپ کو ناگوار

واقعہ دیکھنا پڑے گا۔

لڑکا یہ سوال کہ ایک شخص کے لیے جمع منکمل کی ضمیر کیوں استعمال ہوتی ہے۔ تو اس کا جواب

واضح ہے اور وہ یہ کہ -

یہ پہلا موقع نہیں کہ ہم قرآن میں ایسی ضمیر دیکھ رہے ہیں۔ قرآن حکیم میں، اس کے علاوہ عربی زبان

اور دوسری زبانوں کے محاورات میں بھی بڑے لوگ بھی گفتگو کرتے وقت جمع کی ضمیر استعمال کرتے ہیں

اور یہ عام طور پر اپنے ماتحت افراد کو مختلف کاموں کی انجام دہی کے لیے مامور کرنے اور ایسے ہی دیگر

مواقع پر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں کو حکم دیتا ہے اور انسان اپنے ماتحت افراد کو -

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے : ہم نے چاہا کہ ان کا رب ان کو اس کے بدلے زیادہ پاک اور

پہلی تفسیر کے مطابق - میرھق - کے دو مفعول ہیں - پہلا - ہما - اور دوسرا - طغیاناً - اور دوسری تفسیر کی بنا پر طغیاناً

اور "کھڑا مفعول لاحقہ (مفعول لہ) ہیں -

زیادہ پُر محبت اولاد عطا فرمائے (فارد نا ان یدلہما ربہما خیراً منہ زکوٰۃ واقرب رحمًا)۔
 ”اردنا“ (ہم نے ارادہ کیا) اور ”ربہما“ (ان دونوں کا رب)۔ یہ دونوں یہاں معنی نیز تعبیریں ہیں اور ہم جلد ان کے مقصد سے آگاہ ہو جائیں گے۔

لفظ ”زکوٰۃ“ پاکیزگی اور طہارت کے معنی میں ہے اور اس کا یہاں وسیع مفہوم ہے اور اس میں ایمان اور عمل صالح بھی شامل ہے۔ اس میں دینی امور بھی شامل ہیں اور دنیاوی بھی اور شاید یہ تعبیر حضرت موسیٰ کا جواب ہو کیونکہ انہوں نے کہا تھا کہ آپ نے ”نفس زکیہ“ کو قتل کر دیا ہے۔ حضرت خضر نے جواب میں کہا کہ نہیں وہ پاکیزہ نہ تھا بلکہ ہم چاہتے تھے کہ اللہ اس کی بجائے انہیں پاکیزہ اولاد عطا کرے۔

مختلف اسلامی کتب میں آنے والی احادیث میں یہ عبارت آئی ہے:

ابدلہما اللہ بہ جاریۃ ولدت سبعین نبیاً

اللہ نے اس بیٹے کی جگہ انہیں ایک ایسی بیٹی عطا فرمائی کہ جس کی نسل سے ستر نبی پیدا ہوئے۔

آخری زیر بحث آیت میں تیسرے کام یعنی دیوار بنانے کے واقعے کا جواب ہے۔ اس عالم نے اس واقعے کے راز سے پردہ اٹھاتے ہوئے کہا: رہی دیوار کی بات۔ تو وہ اس شہر کے دو قیمتی بچوں کی تھی۔ اس دیوار کے نیچے ان کا خزانہ چھپا ہوا تھا اور ان کا باپ ایک نیک اور صالح شخص تھا (واما العبدار فکان لغلامین یتیمین فی المدینۃ وکان تحتہ کنز لہما وکان ابوہما صالحاً)۔

تیرا پروردگار چاہتا تھا کہ وہ بالغ ہو جائیں اور اپنا خزانہ نکال لیں (فارد ربک ان یدلخا شدہما ویستخرجا کنزہما)۔ یہ تو تیسرے رب کی طرف سے رحمت تھی (رحمۃ من ربک) اور ان کے نیک ماں باپ کی وجہ سے میں مامور تھا کہ اس دیوار کو تعمیر کروں کہ میں وہ گرنے جاسے اور خزانہ ظاہر ہو کر خطرے سے دوچار نہ ہو جائے۔

آخر میں انہوں نے چالاکی سے حضرت موسیٰ کا ہر قسم کا شک دور ہو جائے اور وہ یقین کر لیں کہ یہ سب کام ایک خاص منصوبے اور ذمہ داری کے تحت تھے۔ لہذا انہوں نے کہا: اور میں نے یہ کام خود سے نہیں کیے بلکہ اللہ کے حکم کے تحت انجام دیئے (وما فعلتہ عن امری)۔

جی ہاں! یہ تھے ان کاموں کے راز کہ جن پر صبر کی تم میں تاب نہ تھی (ذلک تأویل ما لم یسطع علیہ صبراً)۔

چند اہم نکات

۱۔ خضر کی ماموریت تشریحی تھی یا تکوینی؟ یہ وہ اہم ترین مسئلہ ہے جس نے بزرگ علماء کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے۔ تین واقعات کہ جو اس عالم کے ہاتھوں انجام پائے ان پر حضرت موسیٰ نے اعتراض کیا کیونکہ وہ باطن امر سے آگاہ نہ تھے لیکن بعد میں استاد نے وضاحت کی تو مطمئن ہو گئے۔ سوال یہ ہے کہ کیا واقعات کی مال میں اس کی اجازت کے بغیر نقص پیدا کیا جاسکتا ہے اس بنا پر کہ غاصب اسے لے نہ جائے۔

اور کیا کسی لڑکے کو اس کام پر مزادی جاسکتی ہے کہ جو وہ آئندہ انجام دے گا۔

اور کیا ضروری ہے کہ کسی کے مال کی حفاظت کے لیے ہم محنت و زحمت برداشت کریں۔

ان سوالات کے جواب میں ہمارے سامنے دو راستے ہیں:

پہلا یہ کہ ان امور کو ہم فقہی احکام اور شرعی قوانین کی روشنی میں دیکھیں۔ بعض مفسرین نے یہی راستہ اختیار کیا ہے۔

انہوں نے پہلے واقعے کو اہم اور اہم تر قوانین پر منطبق سمجھا ہے اور کہا ہے کہ مسلم ہے کہ ساری کشتی اور پوری کشتی کی حفاظت اہم کام تھا جبکہ جزوی نقص سے حفاظت زیادہ اہم نہیں تھا۔ دوسرے لفظوں میں حضرت خضر نے کم نقصان کے ذریعے زیادہ نقصان کو روکا۔ فقہی زبان میں ”افسد کو فاسد سے دفع کیا۔ خصوصاً جبکہ یہ بات ان کے پیش نظر تھی کہ کشتی والوں کی باطنی رضامندی انہیں حاصل ہے کیونکہ اگر وہ مل صورت حال سے آگاہ ہو جاتے تو اس کام پر راضی ہو جاتے۔ (فقہی تعبیر کے مطابق حضرت خضر کو اس مسئلے میں ”اذن فحوی“ حاصل تھا)۔

اس لڑکے کے بارے میں مفسرین کا اصرار ہے کہ یقیناً وہ بالغ تھا اور وہ مرتد یا فاسد تھا لہذا وہ اپنے موجودہ اعمال کی وجہ سے جائز القتل تھا اور یہ جو حضرت خضر اپنے اقدام کے لیے اس کے آئندہ جرائم کو دلیل بناتے ہیں تو وہ اس بنا پر ہے کہ وہ کتنا چاہتے ہیں کہ یہ مجرم نہ صرف یہ کہ اس وقت اس کام میں مبتلا ہے بلکہ آئندہ بھی اس سے بڑھ کر جرائم کا مرتکب ہو گا لہذا اس کا قتل قوانین شریعت کے مطابق تھا اور وہ اپنے افعال اور خود کردہ گناہوں کی وجہ سے جائز القتل تھا۔

دوایسرا واقعہ تو کوئی شخص کسی پر یہ اعتراض نہیں کر سکتا کہ تم دوسرے کے لیے کیوں اشارہ کرتے ہو اور اس کے اموال کو بچانے کے لیے کیوں بیگار اٹھاتے ہو۔ ہو سکتا ہے یہ اشارہ واجب نہ ہو لیکن مسلم ہے کہ یہ اچھا کام ہے اور لائق تحسین ہے بلکہ ہو سکتا ہے کہ بعض مواقع پر مرد و عورت تک پہنچ جائے۔ شاکس قیام بچے کا بہت سا مال ضائع ہو رہا ہو اور تھوڑی سی زحمت کر کے اسے بچایا جاسکے تو بعید نہیں ہے کہ ایسے

موقع پر کام واجب ہو۔

دوسرا راستہ اس بنیاد پر ہے کہ مذکورہ بالا توضیحات اگرچہ خزانے اور دیوار کے بارے میں لائق اطمینان ہوں لیکن جو جان مارا گیا اس کے بارے میں مذکورہ وضاحتیں ظاہر آیت سے مناسبت نہیں رکھتیں کیونکہ اس کے قتل کا جواز ظاہر اس کے آئندہ کا عمل قرار دیا گیا ہے نہ کہ موجودہ عمل۔
کشتی کے بارے میں بھی مذکورہ وضاحت کسی حد تک قابل بحث ہے۔
لہذا ضروری ہے کہ کوئی اور راہ اختیار کی جائے اور وہ یہ ہے :

اسی جہان میں ہیں دو نظاموں سے سابقہ پڑتا ہے۔ ایک نظام تکوین ہے اور دوسرا نظام تشریع۔ یہ دونوں نظام اگرچہ کلی اصول میں تو ہم آہنگ ہیں لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جزئیات میں ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔

مثلاً اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی آزمائش خوف، اموال و فرائض کے نقصان، اپنی اور عزیزوں کی موت اور قتل کے ذریعے کرتا ہے تاکہ یہ معلوم ہو کہ کون شخص ان حوادث و مصائب پر صبر و شکیبائی اختیار کرتا ہے۔

تو کیا کوئی فقیہ بلکہ کوئی پیغمبر ایسا کر سکتا ہے۔ یعنی اموال و نفوس، فرائض اور امن کو ختم کر کے لوگوں کو آزمائے؟

یا کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بعض نبیوں اور صالح بندوں کو خبردار کرنے اور انہیں تنبیہ کرنے کے لیے کسی ترک اولیٰ پر بڑی مصیبتوں میں گرفتار کرتا ہے جیسا کہ حضرت یعقوب مصیبت میں گرفتار ہوئے اس بات پر کہ انہوں نے بعض مساکین کی طرف کم توجہ دی یا حضرت یونس کو ایک معمولی ترک اولیٰ پر مصیبت میں گرفتار ہونا پڑا۔ تو کیا کوئی حق رکھتا ہے کہ کسی کو سزا کے طور پر ایسا کرے۔

یا یہ کہ ہم دیکھتے ہیں کبھی اللہ تعالیٰ کسی انسان کی ناشکری کی وجہ سے اس سے کوئی نعمت چھین لیتا ہے مثلاً کوئی شخص مال شے پر شکر ادا نہیں کرتا تو اس کا مال دریا میں غرق ہو جاتا ہے یا صحت پر شکر ادا نہیں کرتا تو اللہ تعالیٰ اس سے صحت لے لیتا ہے تو کیا فقیہ اور شرعی قوانین کی زد سے کوئی ایسا کر سکتا ہے کہ ناشکری کی وجہ سے کسی کا مال ضائع کر دے اور اس کی سلامتی کو بیماری میں بدل دے۔

ایسی مثالیں بہت زیادہ ہیں۔ یہ سب مثالیں مجموعی طور پر ظاہر کرتی ہیں کہ جہاں آفرینش خصوصاً خلقت انسان اس احسن نظام پر استوار ہے کہ اللہ نے انسان کو کمال تک پہنچانے کے لیے کچھ عکوبینی قوانین بنائے ہیں کہ جن کی خلاف ورزی سے مختلف نتائج مرتب ہوتے ہیں حالانکہ قانون شریعت کے لحاظ سے ہم ان قوانین پر عمل نہیں کر سکتے۔

مثلاً کسی انسان کی انگلی ڈاکٹر اس لیے کاٹ سکتا ہے کہ زہر اس کے دل کی طرف سرایت نہ کر جائے

لیکن کیا کوئی شخص کسی انسان میں صبر پیدا کرنے کے لیے یا کفران نعمت کی وجہ سے اس کی انگلی کاٹ سکتا ہے؟ (جبکہ یہ بات مسلم ہے کہ خدا ایسا کر سکتا ہے کیونکہ ایسا کرنا نظام احسن کے مطابق ہے)۔

اب جبکہ ثابت ہو گیا کہ ہم دو نظام رکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ دونوں نظاموں پر حاکم ہے تو کوئی چیز مانع نہیں ہے کہ اللہ ایک گروہ کو نظام تشریعی کو عملی جامہ پہنانے کے لیے مامور کرے اور فرشتوں کے ایک گروہ یا بعض انسانوں کو (مثلاً حضرت خضرؑ) نظام تکوین کو عملی شکل دینے پر مامور کرے (خود کیجئے گا)۔

اللہ تعالیٰ کے نظام تکوین کے لحاظ سے کوئی مانع نہیں کہ وہ کسی نابالغ بچے کو بھی کسی حادثے میں مبتلا کر دے اور اس میں اس کی جان چلی جائے کیونکہ ہو سکتا ہے اس کا وجود مستقبل کے لیے بہت بڑے خطرات کا حامل ہو جیسا کہ بعض اوقات ایسے اشخاص کا باقی رہ جانا آزمائش وغیرہ کے حوالے سے مصلحت کا حامل ہوتا ہے۔ نیز کوئی مانع نہیں کہ اللہ مجھے آج کسی سخت بیماری میں مبتلا کر دے، اس طرح سے کہ میں گھر سے باہر نہ نکل سکوں کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر میں گھر سے باہر نکلا تو خطرناک حادثہ پیش آجائے گا اور وہ مجھے اس حادثے سے بچانا چاہتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں اس عالم میں مامورین کا ایک گروہ باطن پر مامور ہے اور ایک گروہ ظاہر پر مامور ہے۔ جو باطن پر مامور ہیں ان کے لیے اپنے اصول و ضوابط اور پروگرام ہیں اور جو ظاہر پر مامور ہیں ان کیلئے اپنے خاص اصول و ضوابط ہیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ ان دونوں پروگراموں کا اصلی اور ٹکلی مقصد انسان کو کمال کی طرف لے جانا ہے اس لحاظ سے دونوں ہم آہنگ ہیں لیکن بعض اوقات جزئیات میں فرق ہوتا ہے جیسا کہ مذکورہ بالا مثالوں سے واضح ہوتا ہے۔ البتہ اس میں شک نہیں کہ ان دونوں طریقوں میں سے کسی میں بھی کوئی خود سری سے کوئی اقدام نہیں کر سکتا بلکہ ضروری ہے کہ وہ حقیقی مالک و حاکم کی طرف سے مجاز ہو لہذا حضرت خضر علیہ السلام نے صراحت کے ساتھ اس حقیقت کو بیان کیا اور کہا :

ما فعلتہ عن امری

میں نے یہ کام خود سے ہرگز نہیں کیے۔

یعنی۔ میں نے یہ کام حکم الہی کے مطابق اور اسی کے ضابطے اور طریقے کے مطابق انجام دیئے ہیں۔ اس طرح ان اقدامات میں جو ظاہری تضاد نظر آتا ہے وہ ختم ہو جاتا ہے۔

اور یہ جو ہم دیکھ رہے ہیں کہ حضرت موسیٰؑ حضرت خضرؑ کے کاموں کو برداشت نہیں کر پاتے تھے تو یہ اسی بنا پر تھا کہ ان کی ماموریت اور ذمہ داری کا طریقہ جناب خضرؑ کی ذمہ داری کے راستے سے الگ تھا لہذا جب انہوں نے حضرت خضرؑ کا کام ظاہر اشرعی قوانین کے خلاف دیکھا تو اس پر اعتراض کیا لیکن حضرت خضرؑ نے ٹھنڈے دل سے اپنا کام جاری رکھا اور چونکہ یہ دو عظیم خدائی رہبر مختلف ذمہ داریوں کی بنا پر ہمیشہ کے لیے

اکٹھے نہیں رہ سکتے تھے لہذا حضرت خضرؑ نے کہا :

هَذَا فِرَاقٌ بَيْنِي وَبَيْنَكَ

یہ اب میرے اور تمہارے جدا ہونے کا مرحلہ آگیا ہے۔

۲۔ خضرؑ کون تھے : جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے کہ حضرت خضرؑ کا نام صراحت کے ساتھ قرآن میں نہیں لیا گیا اور حضرت موسیٰؑ کے دوست اور استاد کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے :

عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَا آتَيْنَاهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعِلْمَنَاهُ مَن لَّدَنَا عَلَمًا

ہمارے بندوں میں سے ایک بندہ جسے ہم نے اپنی رحمت عطا کی اور جسے ہم نے اپنے علم سے نوازا۔

اس تعارف میں ان کے مقام عبودیت کا تذکرہ ہے اور ان کے خاص علم کو واضح کیا گیا ہے لہذا ہم نے بھی عالم کے طور پر ان کا زیادہ ذکر کیا ہے۔ لیکن متعدد روایات میں اس عالم کا نام "خضر" بتایا گیا ہے۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا اصلی نام "بلیا ابن ملک" تھا اور "خضر" ان کا لقب ہے کیونکہ وہ جہاں کہیں قدم رکھتے ان کے قدموں کی بدولت زمین سرسبز ہو جاتی تھی۔

بعض نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ اس عالم کا نام "الیاس" ہے۔ یہیں سے یہ تصور پیدا ہوا کہ ہو سکتا ہے "الیاس" اور "خضر" ایک ہی شخص کے دو نام ہوں لیکن مشہور و معروف مفسرین اور راویوں نے پہلی بات ہی بیان کی ہے۔

واضح ہے کہ یہ بات کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی کہ اس شخص کا نام کیا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ وہ ایک عالم ربانی تھے اور پروردگار کی خاص رحمت ان کے شامل حال تھی۔ وہ باطن اور نظام حکومتی پر مامور تھے اور کچھ اسرار سے آگاہ تھے اور ایک لحاظ سے موسیٰ بن عمران کے معلم تھے اگرچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کئی لحاظ سے ان پر مقدم تھے۔

یہ کہ وہ پیغمبر تھے یا نہیں۔ اس سلسلے میں روایات مختلف ہیں۔ اصول کافی جلد اول میں متعدد روایات ہیں کہ جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ وہ پیغمبر نہیں تھے بلکہ وہ "ذوالقرنین" اور "اصطٰ بن برخیا" کی طرح ایک عالم تھے۔

جبکہ کچھ اور روایات ایسی بھی ہیں کہ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مقام نبوت کے حامل تھے اور زیر نظر روایات میں بھی بعض تعبیرات کا ظاہری مفہوم بھی یہی ہے۔ کیونکہ ایک موقع پر وہ کہتے ہیں :

میں نے یہ کام اپنی طرف سے نہیں کیا۔

ایک اور مقام پر کہتے ہیں :

ہم چاہتے تھے کہ ایسا ہو۔

نیز بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک لمبی عمر کے حامل تھے۔

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے۔ وہ یہ کہ کیا اس عالم بزرگوار کا واقعہ یہودیوں اور عیسائیوں کی کتابوں میں بھی ہے ؟

سوال کا جواب یہ ہے :

اگر کتب سے مراد کتب حدیث (تورات و انجیل) ہیں، تو ان میں تو نہیں ہے لیکن بعض یہودی علماء کی کتابوں میں جو گیارہویں صدی عیسوی میں مدون ہوئی ہیں ان میں ایک داستان نقل ہوئی ہے کہ جو حضرت موسیٰؑ کی مذکورہ داستان سے کچھ مشابہت رکھتی ہے۔ اگرچہ اس داستان کے ہیرو "الیاس" اور "یوشع بن لاوی" ہیں کہ جو تیسری صدی عیسوی کے "تمود" کے مفسرین میں سے تھے۔ یہ داستان اور کئی پہلوؤں سے بھی موسیٰؑ خضر کی داستان سے مختلف ہے۔

بہر حال مذکورہ داستان کچھ یوں ہے :

یوشع نے خدا سے چاہا کہ اُس کی الیاس سے ملاقات ہو۔ اس کی دعا پوری ہو گئی اور اسے الیاس سے ملاقات کا اعزاز حاصل ہو گیا۔ اس کی آرزو تھی کہ الیاس سے کچھ اسرار حاصل کرے۔ الیاس نے اُس سے کہا، تجھ میں اتنی طاقت نہیں کہ انہیں برداشت کر پائے۔

لیکن یوشع نے اصرار کیا تو الیاس نے اس کی درخواست اس شرط پر قبول کر لی کہ وہ جو کچھ بھی دیکھے گا ہرگز سوال نہیں کرے گا اور اگر اس نے خلاف ورزی کی تو اسے انگ ہونا پڑے گا۔ بہر حال اس معاہدے کے بعد یوشع اور الیاس اکٹھے چل پڑے۔

دوران سفر وہ ایک گھر میں داخل ہوتے ہیں۔ صاحب خانہ بڑی گرم جوشی سے ان کی پذیرائی کرتا ہے۔ اس گھر والوں کے پاس دنیا کی چیزوں میں سے صرف ایک گائے تھی کوئی اور چیز ان کی ملکیت نہ تھی۔ وہ گائے کا دودھ بیچ کر گزار اوقات کرتے تھے۔

الیاس نے صاحب خانہ کو حکم دیا کہ گائے کو ذبح کر دے۔ یوشع کو اس کردار پر سخت تعجب ہوتا ہے۔ وہ اس کا سبب پوچھتا ہے۔ الیاس اسے معاہدہ یاد دلاتا ہے اور جدا ہونے کی دھمکی دیتا ہے۔ یوشع مجبوراً خاموش ہو جاتا ہے۔

وہاں سے وہ دونوں ایک اور بستی کی طرف چل پڑتے ہیں۔ اس بستی میں پہنچ کر ایک مالدار آدمی کے گھر داخل ہوتے ہیں۔ اس گھر کی ایک دیوار گرنے کے قریب ہوئی ہے۔ الیاس خود مٹی کے کام میں لگے ڈالتا ہے اور اس دیوار کی مرمت کر دیتا ہے۔

دہاں سے وہ ایک اور بستی میں پہنچے ہیں۔ اس گاؤں کے چند لوگ ایک جگہ جمع ہوتے ہیں۔ وہ ان دونوں کی ابھی پذیرائی نہیں کرتے۔ الیاس نے ان کے لیے دعا کی کہ ان سب کو ریاست و امارات نصیب ہو۔

وہ چوتھی بستی میں پہنچے ہیں تو ان کا بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا جاتا ہے۔ الیاس ان کے لیے دعا کرتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک کو ریاست نصیب ہو۔

آخر کار یروش بن لادی کی قوت برداشت جواب دے دیتی ہے وہ ان چار واقعات کے بارے میں سوال کرتا ہے تو الیاس کہتا ہے:

پہلے گھر میں صاحب خانہ کی بیوی بیمار تھی۔ اگر وہ گائے صدقہ کے طور پر قربان نہ کی جاتی تو وہ عورت مر جاتی۔

دوسرے گھر میں دیوار کے نیچے ایک خزانہ تھا کہ جو ایک یتیم بچے کیلئے محفوظ رہنا چاہیے تھا۔ تیسری بستی کے سب لوگوں کے لیے ریاست کی دعا اس لیے کی کہ وہ پریشانی سے دوچار ہوں جبکہ اس کے برعکس چوتھی بستی کے ایک شخص کے لیے دعا کی تاکہ ان کے امور منظم اور بہتر طور پر انجام پائیں۔

غلط فہمی نہیں ہونا چاہیے۔ ہم ہرگز یہ نہیں کہتے کہ یہ دونوں داستانیں ایک ہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ یہ واضح کیا جائے کہ یہودیوں نے جو داستان نقل کی ہے وہ قرآن کی موسیٰ و خضر کی داستان کے مشابہ ہے یا پھر موسیٰ و خضر کی داستان میں تخلیق ہو کر یہ اس صورت میں باقی رہ گئی ہے۔

۳۔ خود ساختہ افسانے: حضرت موسیٰ اور حضرت خضر کی داستان کی بنیاد وہی ہے کہ جو کچھ قرآن میں آیا ہے لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس سے منسلک کر کے بہت سے افسانے گھڑ لیے گئے ہیں۔ ان افسانوں کو اس داستان کے ساتھ غلط ملط کرنے سے اصل داستان کی صورت بھی بگڑ جاتی ہے۔ جاننا چاہیے کہ یہ کوئی پہلی داستان نہیں ہے کہ جس کے ساتھ یہ سلوک کیا گیا ہے اور بہت سی سچی داستانوں کے ساتھ یہی ہاتھ کیا گیا ہے۔

لہذا حقیقت تک رسائی کے لیے قرآن کی ان تین آیتوں کو بنیاد قرار دیا جانا چاہیے جن میں یہ داستان بیان ہوئی ہے۔ یہاں تک کہ احادیث کو بھی اسی صورت میں قبول کیا جاسکتا ہے جب وہ قرآن کے موافق ہوں۔ اگر کوئی حدیث اس کے برخلاف ہو تو یقیناً وہ قابل قبول نہیں ہے اور خوش قسمتی سے معتبر احادیث میں ایسی کوئی حدیث نہیں ہے۔

یہ تمام ترجمان کتاب اعلام قرآن ص ۱۳۳ سے نقل کی گئی ہے۔

۴۔ کیا انبیاء کے لیے بھول چوک ممکن ہے؟ مندرجہ بالا واقعے میں ہم نے بار بار دیکھا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بھول گئے۔ پہلے تو اس پھلی کو جو انہوں نے کھانے کے لیے رکھی تھی۔ دوسری اور تیسری مرتبہ آپ اپنے عالم دوست سے یکے گئے معاہدہ کو بھول گئے۔ ان امور کو دیکھ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا انبیاء کے لیے نسیان ممکن ہے؟

بعض کا نظریہ ہے کہ انبیاء سے ایسے نسیان کا صدور بعید نہیں ہے کیونکہ یہ دعوت نبوت کی بنیاد اور اصول سے مربوط ہے اور نہ اس کے فروغ سے اور نہ ہی اس کا تعلق تبلیغ نبوت کے ساتھ ہے بلکہ اس کا تعلق صرف روزمرہ کی معمول کی زندگی سے ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جو کچھ مسلم ہے یہ ہے کہ کوئی نبی نبوت کی دعوت اور اس سے متعلقہ امور میں ہرگز خطا و اشتباہ کا شکار نہیں ہوتا اور ان کا مقام عصمت انہیں اس قسم کی چیزوں سے محفوظ رکھتا ہے لیکن اس میں کیا مانع ہے کہ موسیٰ کو جو بڑے اشتیاق سے اس عالم کی تلاش میں جا رہے تھے اپنے کھانے بھول گئے اور یہ ایک معمول کا مسئلہ ہے نیز اس میں کیا مانع ہے کہ کشتی میں سولخ، نوجوان لڑکے کے قتل اور بخیلوں کے شر کی دیوار کی بے درجہ تعمیر جیسے بڑے واقعات نے ایسا بیجاں زدہ کیا کہ انہوں نے اپنے عالم دوست سے جو ذاتی عہد کیا تھا اُسے بھول گئے۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ نہ ایک پیغمبر سے بعید ہے اور نہ مقام عصمت کے منافی ہے۔

بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ نسیان یہاں مجازی معنی میں یعنی ترک کرنے کے معنی میں آیا ہے کیونکہ انسان جب کسی چیز کو ترک کرتا ہے تو وہ ایسے ہی ہے جیسے اسے بھول گیا ہو اور اس کے بارے میں اس نے نسیان کیا ہو۔ حضرت موسیٰ نے اپنی غذا کو اس لیے ترک کیا کیونکہ وہ اس کے بارے میں بے اعتنا تھے اور اپنے عالم دوست سے یکے ہوئے معاہدے کو انہوں نے اس لیے ترک کیا کیونکہ حوادث کو ظاہری حوالے سے دیکھنے کی وجہ سے اصلاً یہ بات ان کے لیے قابل قبول نہ تھی کہ کوئی شخص بلا وجہ لوگوں کے جان و مال کو نقصان پہنچائے لہذا انہوں نے اعتراض کرنا اپنی ذمہ داری سمجھا اور ان کے نزدیک یہ معاہدے کا مقام نہ تھا۔

لیکن واضح ہے کہ ایسی تفاسیر ظاہر آیات سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتیں بلکہ

یہ بات سلمات میں سے ہے کہ کسی نقل و دلیل کا غور مسلم عقلی دلیل کے ساتھ کرنا ہے تو اس نقل و دلیل کی تاویل کی جائے گی مثلاً خدا کے بارے میں تسبیح کی بہت سی آیات کا غور یہ ہے کہ وہ لائق تعظیم، پہلو اور نفس رکھتا ہے یا معاذ اللہ وہ جم رکھتا ہے لیکن چونکہ یہ امور اصول مسلمہ اور دلائل عقلیہ قطعیہ کے خلاف ہیں لہذا ان آیات کی تاویل کی جاتی ہے یعنی خلاف ظاہر معنی کیا جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ معنی مجازی ہوتا ہے۔ اسی طرح انبیاء اور ائمہ کا مطلقاً موصوم ہونا منطوری ہے لہذا اس کے خلاف غمورات کی تاویل کی جانا چاہیے (مترجم)۔

۵۔ موسیٰ خضر کی ملاقات کو کیوں گئے؟ ابی بن کعب نے ابن عباس کی وساطت سے پیغمبر اکرمؐ کی ایک حدیث اس طرح نقل کی ہے:

ایک دن موسیٰ بنی اسرائیل سے خطاب کر رہے تھے۔ کسی نے آپؐ سے پوچھا: دئے زمین پر سب سے زیادہ علم کون رکھتا ہے۔ موسیٰ نے کہا: مجھے اپنے آپ سے بڑھ کر کسی کے عالم ہونے کا علم نہیں۔ اس وقت موسیٰ کو وحی ہوئی کہ ہمارا ایک بندہ مجمع البحرین میں ہے کہ جو تجھ سے زیادہ عالم ہے۔ اس وقت موسیٰ نے درخواست کی کہ میں اس عالم کی زیارت کرنا چاہتا ہوں۔ اس پر اللہ نے انہیں ان سے ملاقات کی راہ بتائی۔

ایسی ہی ایک حدیث امام صادق علیہ السلام سے بھی منقول ہے۔ یہ درحقیقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تنبیہ تھی کہ اپنے تمام تر علم و فضل کے باوجود اپنے آپ کو افضل ترین نہ سمجھیں۔ لیکن یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ کیا ایک اولوالعزم صاحب رسالت و شریعت شخص کو اپنے زمانے کا سب سے بڑا عالم نہیں ہونا چاہیئے؟

اس سوال کے جواب میں ہم کہیں گے کہ اپنی ماموریت کی فہم میں نظام تشریع میں اسے سب سے بڑا عالم ہونا چاہیئے اور حضرت موسیٰ اسی طرح تھے لیکن جیسا کہ ہم نے پہلے نکتے میں بیان کیا ہے کہ ان کی ماموریت کی فہم ان کے عالم دوست کی فہم سے الگ تھی۔ ان کے عالم دوست کی ماموریت کا تعلق عالم تشریع سے نہ تھا۔ دوسرے لفظوں میں وہ عالم ایسے اسرار سے آگاہ تھے کہ جو دعوت نبوت کی بنیاد تھے۔ اتفاقاً ایک حدیث کہ جو امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے اس میں صراحت کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ حضرت خضر سے زیادہ عالم تھے یعنی علم شریعت میں۔

شاید اس سوال کا جواب نہ پانے کی وجہ سے اور نسیان سے مربوط سوال کا جواب نہ پانے کے سبب بعض نے ان آیات میں جس میں موسیٰ کا ذکر ہے اسے موسیٰ بن عمران تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ ایک حدیث کہ جو حضرت علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے اس سے بھی یہ نکتہ معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں بزرگوں کا دائرہ کار اور فہم ایک دوسرے سے مختلف تھی اور ہر ایک دوسرے سے اپنے کام میں زیادہ عالم تھا۔

۱۔ مجمع البیان، ج ۱، ص ۲۰۱ (ہم نے روایت اختصار سے درج کی ہے)۔

۲۔ نور الثقلین، ج ۳، ص ۲۷۵۔

۳۔ میزان، ج ۱۳، ص ۳۵۳۔

۴۔ مجمع البیان، ج ۱، ص ۲۰۱۔

اس نکتے کا ذکر بھی مناسب ہے کہ ایک حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے: جس وقت موسیٰ خضر سے ملے تو ایک پرندہ ان کے سامنے ظاہر ہوا۔ اس نے پانی کا ایک قطرہ اپنی چونچ میں لیا تو حضرت موسیٰ سے خضر نے کہا: جانتے ہو کہ پرندہ کیا کتا ہے: موسیٰ نے کہا: کیا کتا ہے؟ خضر کہنے لگے: کتا ہے:

ما علمک و علم موسیٰ فی علم اللہ الا کما اخذ منقاری من الماء
تیرا علم اور موسیٰ کا علم خدا کے علم کے مقابلے میں اس قطرے کی طرح ہے جو میں نے پانی سے چونچ میں لیا ہے۔

۶۔ وہ خزانہ کیا تھا؟ اس داستان کے بارے میں ایک سوال اور بھی ہے اور وہ یہ کہ وہ خزانہ آخر کیا تھا جسے موسیٰ کے عالم دوست پوشیدہ رکھنا چاہتے تھے اور آخر اس باایمان شخص یعنی یمین کے باپ نے یہ خزانہ کیوں چھپا دیا تھا؟ بعض نے کہا ہے کہ وہ خزانہ مادی پلو کی بجائے زیادہ معنوی پلو رکھتا تھا۔ بہت سی شیوہ سنی روایات کے مطابق وہ ایک تختی تھی جس پر حکمت آمیز کلمات نقش تھے۔ اس بارے میں مفسرین میں اختلاف ہے کہ وہ حکمت آمیز کلمات کیا تھے۔

کتاب کافی میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپؐ نے فرمایا:
یہ سونے چاندی کا خزانہ نہیں تھا۔ یہ تو صرف ایک تختی تھی جس پر یہ چار جملے ثبت تھے:
لا الہ الا اللہ،

من یقن بالموت لم یضلک،

ومن یقن بالحساب لم یفرح قلبہ،

ومن یقن بالتدر لم یخش الا اللہ،

اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔

جو موت پر یقین رکھتا ہے وہ (بے ہودہ) نہیں ہنستا۔

اور جسے اللہ کی طرف سے حساب کا یقین ہے (اور اسے جوابدہی کی فکر ہے) وہ خوش نہیں رہتا۔

اور جسے تقدیر الہی کا یقین ہے وہ اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا۔

تفسیر میزان میں در المنثور اور دیگر کتب کے حوالے سے یہ روایت درج کی گئی ہے۔

نور الثقلین، ج ۳، ص ۲۷۵۔

لیکن کچھ اور روایات میں آیا ہے کہ وہ سونے کی تختی تھی۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ روایات ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں کیونکہ پہلی روایت کا مقصد یہ ہے کہ وہ درہم و دینار کا ڈھیر نہ تھا کیونکہ خزانہ سے یہی مفہوم ذہن میں آتا ہے۔

بالفرض اگر ہم لفظ "کنز" کا ظاہری مفہوم یعنی زردیسم کا ذخیرہ مراد لیں پھر بھی اس میں کوئی اشکال نہیں۔ کیونکہ ایسا خزانہ اور ذخیرہ ممنوع ہے کہ جو ایسے بہت زیادہ گراں قیمت مال پر مشتمل ہو جو طویل مدت کے لیے جمع رکھا جائے جبکہ معاشرے کو اس کی بہت ضرورت ہو لیکن اگر مال کی حفاظت کے لیے، وہ مال جو معاملہ کی گردش میں ہے، ایک دن یا چند دن زیر زمین دفن کر دیا جائے (گزشتہ زمانے میں بے امنی کی وجہ سے اس کا معمول تھا یہاں تک کہ لوگ ایک رات کے لیے بھی اپنے اموال دفن کر دیتے تھے) اور بعد ازاں اس کا مالک کسی حادثے کی بنا پر دنیا سے چل بے تو ایسا خزانہ ہرگز قابل اعتراض نہیں ہے۔

۷۔ اس داستان سے حاصل ہونے والے درس : اس داستان سے ہمیں بہت سے سبق حاصل ہوتے ہیں مثلاً :

(۱) عالم رہبر کی تلاش اور اس کے علم سے استفادہ کرنا اس قدر اہمیت رکھتا ہے کہ حضرت موسیٰ جیسے اولوالعزم پیغمبر نے اس کی تلاش میں اتنا سفر کیا اور یہ سب انسانوں کے لیے ایک نمونہ ہے، وہ جس مرتبہ کے بھی ہوں اور جس سن و سال کے اور انہیں جیسے بھی حالات درپیش ہوں۔

(۲) جو ہر علم الہی کا سرچشمہ عبودیت اور اللہ کی بندگی ہے۔ جیسا کہ زیر نظر آیات میں ہم نے پڑھا :

عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَا آتَيْنَاهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعِلْمًا مِّنْ لَّدُنَّا عِلْمًا

وہ ہمارے بندوں میں سے ایک بندہ تھا اسے ہم نے اپنے خاص علم سے نوازا تھا۔

(ج) علم ہمیشہ عمل کے لیے حاصل کرنا چاہیے جیسا کہ حضرت موسیٰ اپنے عالم دوست سے کہتے ہیں :

مَعَا عَلِمْتَ رَشْدًا

مجھے ایسا علم سکھائیے جو راہ مقصد میں میرے لیے مفید ہو۔

یعنی ہمیں علم برائے علم نہیں چاہتا بلکہ حصول مقصد کے لیے علم حاصل کرنا چاہتا ہوں۔

(د) کاموں میں جلد بازی نہیں کرنا چاہیے کیونکہ بہت سے امور کے لیے مناسب موقع کی ضرورت ہوتی ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے :

الامور ممرهونة باوقاتها

امور اپنے وقت کے مرہون منت ہوتے ہیں۔

خصوصاً زیادہ اہم مسائل میں اس بات کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ اسی بنا پر اس عالم نے اپنے کاموں کے اسرار حضرت موسیٰ سے مناسب وقت پر بیان کیے۔

(ھ) چیزوں اور واقعات کا ظاہری چہرہ بھی ہوتا ہے اور باطنی بھی۔ یہ ایک اہم سبق ہے کہ جو ہم اس داستان سے سیکھتے ہیں اس سے ہمیں یہ درس ملتا ہے کہ اپنی زندگی میں پیش آنے والے ناگوار واقعات کے بارے میں ہمیں جلد بازی سے فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔ کتنے ہی ایسے واقعات ہیں کہ جو ہمیں ناپسند ہوتے ہیں لیکن بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمارے لیے اللہ کا لطف خفی تھے۔ اسی بات کے بارے میں قرآن حکیم ایک اور جگہ کہتا ہے :

عَلَىٰ أَنْ تَكْفُرُوا بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ۚ وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسَىٰ أَنْ تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۚ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ۝

ہو سکتا ہے ایک چیز تمہیں ناپسند ہو حالانکہ وہ تمہارے فائدے میں ہو اور ممکن ہے

ایک چیز تمہیں پسند ہو اور وہ تمہارے لیے مضر ہو اور خدا جانتا ہے تم نہیں جانتے۔ (بقیہ ۱۷۷)

اس حقیقت کی طرف توجہ کے سبب انسان ناگوار واقعات و حوادث پر فوراً مایوس نہیں ہوتا۔ اس سلسلے میں ایک جاذب نظر حدیث امام صادق علیہ السلام سے منقول نظر سے گزرتی ہے۔ امام نے فرزند زرارہ سے فرمایا :

اپنے باپ سے میرا سلام کہہ کر یہ کنا : بعض محفلوں میں جو تیری برائی بیان کرتا ہوں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے دشمن اس بات کی نگرانی کرتے ہیں کہ ہم کس شخص سے اظہار محبت کرتے ہیں تاکہ اسے اس محبت کی وجہ سے تکلیف پہنچائیں کہ جو ہم اس سے رکھتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر ہم کسی کی مذمت کرتے ہیں تو وہ اس کی تعریف کرتے ہیں۔ بعض اوقات اگر میں تیری عدم موجودگی میں تیری برائی کرتا ہوں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں میں جاری دلالت و محبت کے حوالے سے شور ہو چکا ہے۔ اسی بنا پر ہمارے مخالفین تیری مذمت کرتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تجھ پر عیب لگاؤں تاکہ تجھ سے ان کا شر دور ہو۔ جیسا کہ اللہ موسیٰ کے دوست عالم کی زبانی فرماتا ہے :

اما السفينة فكانت لمساكين يعملون في البحر فاروت ان اعيبها و كان وراشهم ملك ياخذ كل سفينة غصبا

کشتی کا مسکہ یہ تھا کہ وہ چند مسکینوں کی ملکیت تھی وہ اس سے دریا میں کام کرتے تھے۔

میں نے اُس میں اُس لیے عیب اور نقص ڈال دیا کہ ایک بادشاہ ان کے پیچھے تھا اور وہ سب کشتیوں کو زبردستی ہتھیار لایا تھا۔

ذراہ اپنے زمانے کے بزرگ فقہاء اور محدثین میں شمار ہوتے تھے انہیں امام سے بہت محبت تھی اور امام کو ان سے بہت لگاؤ تھا۔

اس مثال کو اچھی طرح سمجھ لے لیکن خدا کی قسم تو لوگوں میں مجھے سب سے زیادہ محبوب ہے چاہے وہ زندہ میں یا فوت ہو گئے ہیں۔ تو اس سوجزن دریا میں بہترین کشتی ہے اور خالم غاصب بادشاہ تیرے پیچھے ہے جس کی بڑی گہری نظر ہے کہ بحر ہدایت میں سے کونسی صیغ و سام کشتیاں گزرتی ہیں تاکہ انہیں غصب کر لے۔ تم پر اللہ کی رحمت ہو زندگی میں بھی اور مرنے کے بعد بھی۔

(۹) اعتراض کے ساتھ ساتھ حقیقتوں کا اعتراف۔ اس داستان کا ایک اور سبق ہے۔ حضرت موسیٰ نے تین بار نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے عالم دوست سے یکے کے بعد کو نظر انداز کر دیا اور باوجود اس کے اس استاد کی جدائی انہیں سخت ناگوار تھی تاہم اس تلخ حقیقت کے سامنے انہوں نے ہٹ دھرمی سے کام نہیں لیا، اور ان اقدام کو حق تسلیم کیا۔ ان سے بڑی محبت اور غلوں کے عالم میں جدا ہوئے اور اپنے کام میں لگ گئے جبکہ اس دوستی اور رفاقت کے مختصر سے عرصے میں انہوں نے حقیقت کے عظیم خزانے جمع کر لیے تھے۔

انسان کو نہیں چاہیے کہ آخر عمر تک اپنی آزمائش میں لگا رہے اور ایسے مستقبل کے لیے اپنی زندگی کو تجربہ گاہ نہ بنالے کہ جو ہرگز نہیں آئے گا۔ جب انسان کسی ایک چیز کو چند مرتبہ آزمائے تو پھر اس کے نتیجے کے سامنے سر جھکا دے۔

(ن) ماں باپ کے ایمان کا اولاد کے لیے اثر بھی اس داستان کا ایک اہم سبق ہے۔ حضرت خضرؑ نے ایک نیک اور صالح باپ کی وجہ سے اس کی اولاد کی اس قدر حمایت اپنے ذمہ لے لی کہ جس قدر ہو سکتی۔ یعنی اولاد اپنے باپ کے ایمان اور امانت کی وجہ سے سادت مند ہو سکتی ہے اور اس کی نیکی کا فائدہ اس کی اولاد کو پہنچ سکتا ہے۔ چند ایک روایات میں ہے کہ وہ مرد صالح ان یتیموں کا باپ نہیں تھا بلکہ ان کے دور کے اجداد میں شمار ہوتا تھا (جی ہاں! عمل صالح کی تاثیر اس قدر ہے)۔

اس کے صالح ہونے کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے اپنی اولاد کے لیے منویہ کے خزانے اور حکیمانہ پند و نصائح بطور یادگار چھوڑے۔

(ح) اس داستان کا ایک سبق یہ ہے کہ ماں باپ کو تکلیف پہنچانے سے ملزم ہو جاتی ہے جب ایسی اولاد دوست کی سختی سے کہ جس نے آئندہ ماں باپ کو تکلیف پہنچانا ہے ان کے مقابلے میں سرکشی اور کفران اختیار کرنا ہے یا انہیں راہ خدا سے خوف کرنا ہے۔ تو پھر اس اولاد کی کیفیت بارگاہ الہی میں کیا ہوگی

کہ جو اس وقت مشغول گناہ ہے۔

اسلامی روایات میں بیان ہوا ہے کہ عمر کی کمی اور ترک صلہ رحمی (خصوصاً ماں باپ کو تکلیف پہنچانے کے درمیان قریبی رشتہ ہے۔ ان میں کچھ روایات کا ذکر ہم اسی جلد میں سورہ بنی اسرائیل کی آیت ۲۲ کے ذیل میں کر آئے ہیں۔

(ط) اس داستان کا ایک درس یہ ہے کہ لوگ اس چیز کے دشمن ہوتے ہیں جسے نہیں جانتے۔ بسا ایسا ہوتا ہے کہ کوئی شخص ہمارے بارے میں نیکی کرتا ہے لیکن چونکہ ہم باطن کار سے آگاہ نہیں ہوتے اس لیے اُسے دشمن خیال کرتے ہیں اور اس پر براہم ہوتے ہیں۔ خصوصاً ہم ان چیزوں کے بارے میں کم صبر اور بے حوصلہ ہوتے ہیں جنہیں نہیں جانتے۔ البتہ یہ ایک فطری امر ہے کہ انسان ایسے امور کے بارے میں بے صبر ہوتا ہے کہ جن کا صرف ایک رخ اور ایک زاویہ اُس کے سامنے ہوتا ہے۔ بہر حال یہ داستان ہمیں بتاتی ہے کہ فیصلہ کرنے میں جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیے بلکہ تمام پہلوؤں کا مطالعہ کرنے کے بعد فیصلہ کرنا چاہیے۔ امیر المومنین علی علیہ السلام سے بھی ایک حدیث مروی ہے، آپ نے فرمایا:

الناس اعداء ما جهلوا

انسان جس چیز کو نہیں جانتے اس کے دشمن ہوتے ہیں۔

اسی بنا پر لوگوں کی سطح علم و ادب کی جس قدر بلند ہوگی مسائل سے ان کا برتاؤ اتنا ہی منطقی ہوتا چلا جائے گا۔ دوسرے لفظوں میں صبر کی بنیاد علم و ادب کی ہے۔

البتہ حضرت موسیٰؑ ایک لحاظ سے مضطرب اور ناراحت ہونے کا حق رکھتے تھے کیونکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ ان یتیموں واقعات میں شریعت کے احکام کا بہت سا حصہ خطرے میں پڑ گیا ہے۔ پہلے واقعے میں لوگوں کا مال محفوظ نہیں رہا دوسرے میں جان محفوظ نہیں رہی اور تیسرے میں مالی حقوق خطرے سے دوچار ہو گئے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں انہوں نے دیکھا کہ ظاہر آ لوگوں کے حقوق کے ساتھ منطقی برتاؤ نہیں ہوا لہذا کوئی تعجب کی بات نہیں کہ وہ اس قدر پریشان ہو جائیں کہ اس عالم بزرگ سے باندھا ہوا امدد بھلا دیں لیکن جب وہ باطن امر سے آگاہ ہوئے تو انہیں چین آگیا اور پھر کوئی اعتراض نہ کیا اور یہ بات خود اس امر کو واضح کرتی ہے کہ معاملات کے باطن سے مطلع نہ ہونا کس قدر پریشان کن ہے۔

(ی) اس داستان سے ہم استاد اور شاگرد کے آداب بھی سیکھ سکتے ہیں۔ اُس عالم ربانی اور حضرت موسیٰؑ کے درمیان ہونے والی گفتگو سے استاد اور شاگرد کے درمیان آداب کے سلسلے میں بہت سے نکات سامنے آتے ہیں۔ مثلاً:

(۱) حضرت موسیٰ اپنے آپ کو حضرت خضرؑ کے تابع قرار دیتے ہیں؛

اتبعك

(۲) اور اس پیروی اور اتباع کے لیے حضرت موسیٰ اپنے استاد سے اجازت طلب کرتے ہیں؛

هل اتبعك

"کیا میں آپ کی اتباع کر سکتا ہوں؟"

(۳) حضرت موسیٰ اپنی احتیاج علم اور استاد کے صاحب علم ہونے کا اقرار کرتے ہیں؛

علی ان تعلمن

تا کہ میں آپ سے علم حاصل کر سکوں۔

(۴) انکسادی کا اظہار کرتے ہوئے حضرت موسیٰ اپنے استاد کا علم بہت زیادہ قرار دیتے ہیں اور ظاہر کرتے ہیں کہ میں تو اس علم کا کچھ حصہ حاصل کرنے حاضر ہوا ہوں۔ لفظ "معا" اس کی دلیل ہے۔

(۵) علم استاد کو علم الہی کے عنوان سے یاد کرتے ہیں (علمت)۔

(۶) ان سے ارشاد و ہدایت کی خواہش کرتے ہیں (رشد)۔

(۷) حضرت موسیٰ در پردہ اپنے استاد سے کہتے ہیں کہ جس طرح اللہ نے آپ پر لطف و کرم کیا ہے اور آپ کو تعلیم دی ہے آپ بھی مجھ پر یہ لطف بھیجئے؛

تعلمن مما علمت

(۸) "هل اتبعك" سے یہ حقیقت بھی ظاہر ہوتی ہے کہ شاگرد کو استاد کے پیچھے جانا چاہیئے نہ کہ استاد کو شاگرد کے پیچھے (سوائے خاص مواقع کے)۔

(۹) حضرت موسیٰ بہت بلند مقام اور عظیم مقام کے حامل تھے۔ اولوالعزم نبی تھے اور صاحب رسالت کتاب تھے اس کے باوجود انہوں نے اس انکساری کا مظاہرہ کیا ہے۔

ان کا کردار ہر کسی سے کہہ رہا ہے کہ تو جو بھی ہے اور جو مقام بھی رکھتا ہے کسب علم و دانش کے موقع پر فرد تنی اور انکساری سے کام لینا چاہیئے۔

(۱۰) حضرت موسیٰ نے استاد سے عہد کرتے وقت قطعی اور یقینی لفظ استعمال نہیں کیے بلکہ کہا:

ستجد فی انشاء اللہ صابراً

انشاء اللہ آپ مجھے صابر پائیں گے۔

یہ اللہ کے حضور بھی ادب ہے اور استاد کے حضور بھی۔ کہ خلافت درزی ہو جائے تو استاد کی

ہنگام احترام نہ ہو۔

(۱۱) اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ اس عالم ربانی نے تعلیم و تربیت کے وقت انتہائی علم و بردباری

کا مظاہرہ کیا۔ موسیٰ جب ہیجان و اضطراب کے عالم میں اپنا عہد بھول جاتے تھے اور اعتراض کرنے لگتے تھے تو وہ بڑے ٹھنڈے دل و داغ سے سوالیہ انداز میں صرف اتنا کہتے تھے:

میں نہ کہتا تھا کہ میرے کاموں پر تم صبر نہ کر سکو گے۔

(۸۳) وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْقَرْنَيْنِ ؕ قُلْ سَأَتْلُو عَلَيْكُمْ مِنْهُ ذِكْرًا ۝

(۸۴) إِنَّا مَكَنَّا لَهُ فِي الْأَرْضِ وَابْنَهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا ۝

(۸۵) فَاتَّبَعَ سَبَبًا ۝

(۸۶) حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِي عَيْنٍ حَمِئَةٍ وَوَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا ؕ قُلْنَا يَذَا الْقَرْنَيْنِ إِمَّا أَنْ تُعَذِّبَ وَإِمَّا أَنْ تَتَّخِذَ فِيهِمْ حُسْنًا ۝

(۸۷) قَالَ آمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نَعَذِّبُهُ شَوَّيْرًا إِلَىٰ رَبِّهِ

فِيُعَذِّبُهُ عَذَابًا ثَكْرًا ۝

(۸۸) وَأَمَّا مَنْ آمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُ جَزَاءٌ الْحُسْنَىٰ ۖ وَ

سَنَقُولُ لَهُ مِنْ أَمْرِنَا يُسْرًا ۝

(۸۹) ثُمَّ اتَّبَعَ سَبَبًا ۝

(۹۰) حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلَىٰ قَوْمٍ لَّهُ

نَجْعَلْ لَهُمْ مِّنْ دُونِهَا سِتْرًا ۝

(۹۱) كَذَلِكَ ؕ وَقَدْ أَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا ۝

ترجمہ

(۸۳) اور تجھ سے ذوالقرنین کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ ان سے کہہ دو کہ عنقریب اس کی کچھ سرگزشت تم سے بیان کروں گا۔

(۸۴) ہم نے اسے زمین پر قدرت و حکومت عطا کی اور ہر طرح کے اسباب اس کے اختیار میں دیئے۔

(۸۵) اس نے ان اسباب سے استفادہ کیا۔

(۸۶) یہاں تک کہ وہ سورج کے مقام غروب تک پہنچا۔ اسے آفتاب ایسے دکھائی دے رہا تھا جیسے وہ کالے کچڑ کے چشے میں ڈوب رہا ہو۔ وہاں اس نے ایک قوم کو آباد پایا۔ ہم نے کہا اسے ذوالقرنین کیا تم انہیں سزا دینا چاہو گے یا اچھی جزا۔

(۸۷) کہنے لگا: جن لوگوں نے ظلم کیا ہے انہیں تو ہم سزا دیں گے اور وہ اپنے رب کی طرف پلٹ جائیں گے۔ اور اللہ انہیں سخت سزا دے گا۔

(۸۸) رہا وہ شخص جو ایمان لے آئے گا اور نیک کام کرے گا وہ اچھی جزا پائے گا اور ہم اسے آسان کام کہیں گے۔

(۸۹) اس نے پھر ان اسباب سے کام لیا۔

(۹۰) یہاں تک کہ وہ سورج کے مقام طلوع تک جا پہنچا۔ وہاں اس نے دیکھا کہ سورج ایسے لوگوں پر طلوع کر رہا ہے جن کے لیے سورج کے سوا ہم نے کوئی ستر (اور لباس) قرار نہیں دیا۔

(۹۱) جی ہاں (ذوالقرنین کا معاملہ) ایسا ہی تھا اور اس کے پاس جو وسائل تھے ہم ان سے اچھی طرح آگاہ تھے۔

تفسیر

ذوالقرنین کی عجیب کہانی

اصحاب کھف کے بارے میں گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے ہم نے کہا تھا کہ چند قریشیوں نے رسول اللہ کو آزمانا چاہا۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے مدینے کے یہودیوں کے مشورے سے تین مسئلے پیش کیے۔ ایک اصحاب کھف کے بارے میں تھا، دوسرا مسکد روح کا تھا اور تیسرا ذوالقرنین کے بارے میں۔ ان میں سے روح کے مسئلہ کا جواب سورہ بنی اسرائیل میں آیا ہے دوسرے دو سوالوں کا جواب زیر نظر سورہ کھف میں ہے۔ اب ذوالقرنین کی داستان کی باری ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں خود سورہ کھف میں تین واقعات کا ذکر ہے۔ یہ واقعات اگرچہ ظاہراً ایک دوسرے سے مختلف ہیں لیکن ان میں ایک قدر مشترک ہے۔ اصحاب کھف کا واقعہ، موسیٰ و خضر کی داستان اور ذوالقرنین کی کہانی۔ یہ سب ایسے مسائل پر مشتمل ہیں جو ہمیں علم محدود زندگی سے باہر لے جاتے ہیں اور نشاندہی کرتے ہیں کہ عالم اور اس کے حقائق بس یہی نہیں کہ جو ہم دیکھتے ہیں اور جس کے ہم عادی ہو چکے ہیں۔

ذوالقرنین کی داستان ایسی ہے کہ جس پر طویل مرصے سے فلاسفہ اور محققین غور و خوض کرتے چلے آئے ہیں اور ذوالقرنین کی معرفت کے لیے انہوں نے بہت کوشش کی ہے۔

اس سلسلے میں پہلے ہم ذوالقرنین سے مربوط آیات کی تفسیر بیان کرتے ہیں۔ یہ کئی سوالات ہیں کیونکہ تاریخی حقیقت سے قطع نظر ذوالقرنین کی ذات خود سے ایک بہت ہی تربیتی درس کی حامل ہے اور اس کے بہت سے قابل غور پہلو ہیں۔ ان آیات کی تفسیر کے بعد ذوالقرنین کی شخصیت کو جاننے کے لیے ہم آیات روایات اور مؤرخین کے اقوال کا جائزہ لیں گے۔ دوسرے لفظوں میں پہلے ہم اس کی شخصیت کے بارے میں گفتگو کریں گے اور پھر موضوع دی ہے جو قرآن کی نظر میں اہم ہے۔

اس سلسلے کی پہلی آیت کہتی ہے: تجھ سے ذوالقرنین کے بارے میں سوال کرتے ہیں: روایتاً عن ذی القرنین۔ کہہ دو عنقریب اس کی سرگزشت کا کچھ حصہ تم سے بیان کروں گا (قل سأتلوا علیکم منہ ذکراً)۔

سأتلوا میں جو زمین ہے وہ مستقبل قریب کے لیے آئی ہے حالانکہ اس بارے میں رسول اللہ

نے ساتھ ہی گفتگو شروع کر دی ہے۔ ہو سکتا ہے یہ ادب کے پیش نظر ہو۔ ایسا ادب کہ جس میں ترکِ محبت کا مضمون پایا جاتا ہے اور ایسا ادب کہ جس کا مضمون یہ ہے کہ خدا سے بات معلوم کر کے لوگوں کو ہستائی جاری ہے۔

بہر حال اس آیت کی ابتداء یہ بتاتی ہے کہ لوگ پہلے بھی ذوالقرنین کے بارے میں بات کیا کرتے تھے۔ البتہ اس سلسلے میں ان میں اختلاف اور ابہام پایا جاتا تھا۔ اسی لیے انہوں نے پیغمبر اکرمؐ سے ضروری وضاحتیں چاہیں۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: ہم نے اسے زمین پر تکنت عطا کی (قدرت، ثبات قوت اور حکومت بخشی) (انامکنالہ فی الارض)۔

اور ہر طرح کے وسائل و اسباب اس کے اختیار میں دیئے (و ائیناہ من کل شیء سبباً)۔ سبب "در اصل اس رسی کو کہتے ہیں کہ جس کے ذریعے کھجور کے درختوں پر چڑھتے ہیں۔ بعد ازاں یہ لفظ ہر قسم کے وسیلے اور ذریعے کے معنی میں بولا جانے لگا۔ بعض مفسرین نے اس لفظ کو کسی خاص مضمون میں محدود کرنا چاہا ہے لیکن ظاہر ہے کہ آیت پوری طرح مطلق ہے اور وسیع مضمون رکھتی ہے اور نشانہ ہی کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ذوالقرنین کو ہر چیز تک پہنچنے کے اسباب عنایت فرمائے تھے۔ سبب کے اس مضمون میں عقل و درایت، انتظامی صلاحیت، طاقت و قوت، لشکر، افرادی قوت، مادی وسائل غرض ہر قسم کے ایسے مادی وسائل شامل ہیں جو مقاصد کے حصول کے لیے ضروری تھے۔

اس نے بھی ان سے استفادہ کیا (فاتبیع سبباً)۔ یہاں تک کہ وہ سورج کے مقام غروب تک پہنچ گیا (حتیٰ اذا بلغ مغرب الشمس)۔ وہاں اس نے عکس کیا کہ سورج تاریک اور کچھ آؤ دھنسے یا دریا میں ڈوب جاتا ہے (وجدھا تغرب فی عین حمۃ)۔

وہاں اس نے ایک قوم کو دیکھا (کہ جس میں اچھے بُرے ہر طرح کے لوگ تھے) (وجدھا عندھما قوما)۔ تو ہم نے ذوالقرنین سے کہا: کہ تم انہیں سزا دینا چاہو گے یا ابھی جزا (قلنا یا ذا القرنین امان تعذب و امان تتخذ فیہم حسناً)۔

۱۔ حمۃ "در اصل سیاہ بدو دار کچھ کے معنی میں ہے۔ دوسرے مفسرین میں یہ "لحم" نے معنی لیا ہے۔ جس کا معنی ہے سیاہ مٹی جو کسی حوض یا نالے کی تہ میں جوتی ہے۔ یہ لفظ شاعری کو کہتے ہیں کہ ذوالقرنین جس علاقے میں پہنچے تھے وہاں بدو دار کچھ بہت زیادہ تھا۔ یہاں تک کہ غروب آفتاب کے وقت ذوالقرنین کو ایسا لگتا تھا جیسے سورج کا لالہ اس کیڑا ڈوب رہا ہو۔ جیسے دریا کے پاس سے گزرنے والے مسافروں اور وہاں رہنے والوں کو وقت غروب ایسا لگتا ہے جیسے سورج دریا میں غروب ہو رہا ہے۔ اور طلوع کے وقت ایسا لگتا ہے جیسے دریا سے نکل رہا ہو۔

۲۔ امان تعذب۔ ایسا لگتا ہے جیسے استغاثہ ہو اگر اس کا ظاہر خبر یہ ہے۔

بعض مفسرین نے لفظ "قلنا" (ہم نے ذوالقرنین سے کہا) سے ان کی نبوت پر دلیل قرار دیا ہے لیکن یہ احتمال بھی ہے کہ اس جملے سے قلبی الامام مراد ہو کہ جو غیر انبیاء میں بھی ہوتا ہے لیکن اس بات کا انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ تفسیر زیادہ تر نبوت کو ظاہر کرتی ہے۔

ذوالقرنین نے کہا: وہ لوگ کہ جنہوں نے ظلم کیے ہیں، انہیں تو ہم سزا دیں گے (قال امان ظلم فسوف نعدبہ)۔ اور پھر وہ اپنے پروردگار کی طرف لوٹ جائیں گے اور اللہ انہیں شدید عذاب کرے گا۔ (ثم یرد الی ربہ فیعذبہ عذاباً منکراً)۔ یہ ظالم و سنگرد دنیا کا عذاب بھی چکیں گے اور آخرت کا بھی۔ اور ربوہ شخص کہ جو با ایمان ہے اور عمل صالح کرتا ہے اسے اچھی جزا ملے گی (وامان امن و عمل صالحاً ظلمہ جزاء الحسنی) اور اسے ہم آسان کام سونپیں گے (وسنقول لہ من امرنا یسراً)۔

اس سے بات بھی محبت سے کریں گے اور اس کے کندھے پر سخت ذمہ داریاں بھی نہیں رکھیں گے اور اس سے زیادہ خراج بھی وصول نہیں کریں گے۔

ذوالقرنین کی اس بیان سے گویا یہ مراد تھی کہ توحید پر ایمان اور ظلم و شرک اور برائی کے خلاف جدوجہد کے بارے میں میری دعوت پر لوگ دو گروہوں میں تقسیم ہو جائیں گے۔ ایک گروہ تو ان لوگوں کا ہوگا جو اس الہی تعمیر پر درگرم کو مطمئن ہو کر تسلیم کر لیں گے انہیں اچھی جزا ملے گی اور وہ آرام و سکون سے زندگی گزاریں گے جبکہ دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہوگا جو اس دعوت سے دشمنی پر اتر آئیں گے اور شرک و ظلم اور برائی کے راستے پر ہی قائم رہیں گے انہیں سزا دی جائے گی۔

ضمناً یہ بھی عرض کر دیا جائے کہ "من ظلمو" کہ جو "من امن و عمل صالحاً" کے مقابلے میں آیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ "ظلم" اس جگہ شرک اور غیر صالح عمل کے معنی میں آیا ہے اور غیر صالح عمل دراصل شرک کے ناپاک درخت کا ایک کڑوا پھل ہے۔

ذوالقرنین نے اپنا مغرب کا سفر تمام کیا اور مشرق کی طرف جانے کا عزم کیا اور جیسا کہ قرآن کہتا ہے: جو مسائل اس کے اختیار میں تھے اُس نے ان سے پھر استفادہ کیا (شواتبع سبباً)۔

اور اپنا سفر اسی طرح جاری رکھا یہاں تک کہ سورج کے مرکز طلوع تک جا پہنچا (حتیٰ اذا بلغ مطلع الشمس)۔

وہاں اس نے دیکھا سورج ایسے لوگوں پر طلوع کر رہا ہے کہ جن کے پاس سورج کی کرنوں کے علاوہ تن ڈھانپنے کی کوئی چیز نہیں ہے (وجدھا تطلع علی قوم لم یجعل لہم من دینھما ستراً)۔

یہ لوگ بہت ہی پست درجے کی زندگی گزارتے تھے یہاں تک کہ برہنہ رہتے تھے یا بہت ہی کم مقدار

"نکرو" منکر کے مادہ سے ہے۔ اس کا معنی ہے، نا معلوم یعنی نامعلوم عذاب کہ جس کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔

باس پسنتے تھے کہ جس سے ان کا بدن سورج سے نہیں چھپتا تھا۔

بعض مفسرین نے اس احتمال کو بھی بعید قرار نہیں دیا کہ ان کے پاس رہنے کو کوئی گھر بھی نہ تھے کہ وہ سورج کی تابش سے بچ سکتے رہے۔

اس آیت کی تفسیر میں ایک اور احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ وہ لوگ ایسے بیابان میں رہتے تھے کہ جس میں کوئی پہاڑ، درخت، پناہ گاہ اور کوئی ایسی چیز نہ تھی کہ وہ سورج کی تابش سے بچ سکتے گویا اس بیابان میں ان کے لیے کوئی سایہ نہ تھا۔

بہر حال یہ تمام تفاسیر ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں۔

جی ہاں! ذوالقرنین کا معاملہ ایسا ہی ہے اور ہم خوب جانتے ہیں کہ اس کے اختیار میں (اپنے اہل ان کے حصول کے لیے) کیا وسائل تھے (کذلک وقد احطنا بما لہ خبراً)۔

بعض مفسرین نے آیت کی تفسیر میں یہ احتمال ذکر کیا ہے کہ یہ جلد ذوالقرنین کے کاموں اور پروگراموں میں اللہ کی ہدایت کی طرف اشارہ ہے۔

ثُمَّ اتَّبَعَ سَبَبًا

حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ وَجَدَ مِنْ دُونِهِمَا قَوْمًا لَا

يَكَادُونَ يَفْقَهُونَ قَوْلًا

قَالُوا يَا هَذَا الْقَرْنَيْنِ إِنَّ يَأْجُوجَ وَمَأْجُوجَ مُفْسِدُونَ

فِي الْأَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلَىٰ أَنْ تَجْعَلَ بَيْنَنَا

وَبَيْنَهُمْ سَدًّا

قَالَ مَا مَكَّنِّي فِيهِ رَبِّي خَيْرٌ فَأَعِينُونِي بِقُوَّةٍ أَجْعَلْ

بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ رَدْمًا

أَتُوْنِي زُبْرًا حَدِيدًا حَتَّىٰ إِذَا سَاوَىٰ بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ

قَالَ انْفُخُوا حَتَّىٰ إِذَا جَعَلَهُ نَارًا قَالَ أَتُوْنِي أَفْرَغْ

عَلَيْهِ قِطْرًا

فَمَا اسْطَاعُوا أَنْ يَظْهَرُوهُ وَمَا اسْتَطَاعُوا لَهُ نَقْبًا

قَالَ هَذَا رَحْمَةٌ مِنْ رَبِّي فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ رَبِّي جَعَلَهُ

دَكَّاءَ وَكَانَ وَعْدُ رَبِّي حَقًّا

بسم

اس نے پھر ان وسائل سے استفادہ کیا (کہ جو اس کے اختیار میں تھے)۔

(اور اسی طرح اپنا سفر جاری رکھا) یہاں تک کہ وہ دو پہاڑوں کے درمیان

بعض روایات میں پہلی تفسیر بیان ہوئی ہے اور بعض میں دوسری تفسیر آئی ہے اور یہ دونوں ایک دوسری کے منافی بھی نہیں ہیں (ذوالقرنین ج ۳ ص ۳۳۳ ملاحظہ فرمائیے)۔

تفسیر فی ظلال القرآن اور تفسیر فرالدین رازی، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

المیزان ج ۱۳ ص ۳۹۱

پہنچا اور وہاں ان دو گروہوں سے مختلف ایک ایسا گروہ پایا جس کے لوگ کوئی بات نہیں سمجھ سکتے تھے۔

(۹۳) (وہ لوگ) کہنے لگے: اے ذوالقرنین! یا جوج و ماجوج اس سرزمین پر فساد برپا کرتے ہیں کیا ممکن ہے کہ اخراجات تجھے ہم فراہم کریں اور تو ہمارے اور ان کے درمیان ایک مضبوط دیوار بنا دے۔

(۹۵) (ذوالقرنین نے) کہا: اللہ نے جو میرے اختیار میں دیا ہے وہ (اس سے) بہتر ہے (کہ جس کی تم پیشکش کرتے ہو) قوت و طاقت سے میری مدد کرو تاکہ تمہارے اور ان کے درمیان دیوار بنا دوں۔

(۹۶) لوہے کی بڑی بڑی سلیں میرے پاس لے آؤ اور انہیں ایک دوسرے پر چُن دو تاکہ دونوں پہاڑوں کے درمیان کی جگہ پوری طرح چھپ جائے۔ اس کے بعد اس نے کہا (اس کے اطراف میں آگ روشن کرو اور) آگ کو دھونکو یہاں تک کہ (دھونکتے دھونکتے انہوں نے لوہے کی سلوں کو سُرخ انگارہ بنا کر پگھلا دیا اس نے کہا (اب) پگھلا ہوا تانبا میرے پاس لے آؤ تاکہ اسے اس کے اوپر ڈال دوں۔

(۹۷) (آخر کار اس نے ایسی مضبوط دیوار بنا دی کہ) اب وہ اس کے اوپر نہیں جاسکتے تھے اور نہ ہی اس میں نقب لگا سکتے تھے۔

(۹۸) اُس نے کہا: یہ میرے رب کی رحمت ہے لیکن جب میرے رب کا وعدہ آپسپنچا تو اسے درہم بھسم کر دے گا اور میرے پروردگار کا وعدہ حق ہے۔

تفسیر

ذوالقرنین نے دیوار کیسے بنائی؟

زیر نظر آیات میں حضرت ذوالقرنین کے ایک اور سفر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے اس کے بعد اُس نے حاصلِ مسائل سے پھر استفادہ کیا (شعرا تبیع سبباً) اور اس طرح اپنا سفر جاری رکھا یہاں تک کہ وہ دو پہاڑوں کے درمیان پہنچا وہاں ان دو گروہوں سے مختلف ایک اور گروہ کو دیکھا۔ یہ لوگ کوئی بات نہیں سمجھتے تھے۔ (حتیٰ اذا بلغ بین السدین وجد من دونہما قومًا لا یکادون یفقهون قولاً)۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ وہ کوہستانی علاقے میں جا پہنچے۔ مشرق اور مغرب کے علاقے میں وہ جیسے لوگوں سے ملے تھے یہاں ان سے مختلف لوگ تھے۔ یہ لوگ انسانی تمدن کے اعتبار سے بہت ہی پسماندہ تھے کیونکہ انسانی تمدن کی سب سے واضح منظر انسان کی گفتگو ہے۔

بعض نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ "لایکادون یفقهون قولاً" سے یہ مراد نہیں کہ وہ مشہور زبانوں میں سے کسی کو جانتے نہیں تھے بلکہ وہ بات کا مفہوم نہیں سمجھ سکتے تھے یعنی فکری لحاظ سے وہ بہت پسماندہ تھے۔

اُدھر یہ کہ وہ دو پہاڑ کھماں تھے اُس سلسلے میں ہم اس واقعے کے دیگر تاریخی اور جغرافیائی پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہوئے تفسیری بحث کے آخر میں گفتگو کریں گے۔

اس وقت یہ لوگ یا جوج ماجوج نامی خونخوار اور سخت دشمن سے بہت تنگ اور مصیبت میں تھے۔ ذوالقرنین کو جو عظیم قدرتی وسائل کے حامل تھے ان کے پاس پہنچے تو انہیں بڑی تسلی ہوئی۔ انہوں نے ان کا دامن پکڑ لیا اور کہنے لگے: اے ذوالقرنین! یا جوج و ماجوج اس سرزمین پر فساد کرتے ہیں کیا ممکن ہے کہ خرچ آپ کو ہم دے دیں اور آپ ہمارے اور ان کے درمیان ایک دیوار بنا دیں (قالوا یا ذوالقرنین ان یا جوج و ماجوج مفسدون فی الارض فهل نجعل لك خرجاً علی ان تجعل بیننا و بینہم سدّاً)۔

وہ ذوالقرنین کی زبان تو نہیں سمجھتے تھے اس لیے ہو سکتا ہے یہ بات انہوں نے اشارے سے کی ہو یا پھر ٹوٹی پھوٹی زبان میں انعامِ مدعا کیا ہو۔

یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ ان کے درمیان سترجمین کے ذریعے بات چیت ہوئی ہو۔ پھر خدائی الہام کے ذریعے حضرت ذوالقرنین نے ان کی بات سمجھی ہو جیسے حضرت ذوالقرنین بعض پانچوں سے بات کر رہے تھے۔

بہر حال تیسرا حکم ذوالقرنین نے یہ دیا کہ آگ لگانے کا مواد (ایندھن وغیرہ) لے آؤ اور اسے اس دیوار کے دونوں طرف رکھ دو اور اپنے پاس موجود وسائل سے آگ بھڑکاؤ اور اس میں دھونکو یہاں تک کہ لوہے کی سلیں انگاروں کی طرح سرخ ہو کر آخر پگھل جائیں (قال انفخوا حتی اذا جعله نارا)۔

درحقیقت وہ اس طرح لوہے کے ٹکڑوں کو آپس میں جوڑ کر ایک کر دیتا چاہتے تھے۔ یہی کام آج کل خاص مشینوں کے ذریعے انجام دیا جاتا ہے۔ لوہے کی سبوں کو اتنی حرارت دی گئی کہ وہ نرم ہو کر ایک دوسرے سے مل گئیں۔

پھر ذوالقرنین نے آخری حکم دیا: کہہا کہ پگھلا ہوا تانبا لے آؤ تاکہ اسے اس دیوار کے اوپر ڈال دوں (قال اتونی اخری علیہ قطرا)۔

اس طرح اس لوہے کی دیوار پر تانبے کا لیپ کر کے اسے ہوا کے اثر سے اور خراب ہونے سے محفوظ کر دیا۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ موجودہ سائنس کے مطابق اگر تانبے کی کچھ مقدار لوہے میں ملا دی جائے تو اس کی مضبوطی بہت زیادہ ہو جاتی ہے۔ ذوالقرنین چونکہ اس حقیقت سے آگاہ تھے اس لیے انہوں نے یہ کام کیا۔

ضمناً یہ بھی عرض کر دیا جائے کہ "قطر" کا مشہور معنی "پگھلا ہوا تانبا" ہی ہے لیکن بعض مفسرین نے اس کا معنی "پگھلا ہوا جست" کیا ہے جبکہ یہ خلاف مشہور ہے۔

آخر کار یہ دیوار اتنی مضبوط ہو گئی کہ اب وہ مضبوط لوگ نہ اس کے اوپر چڑھ سکتے تھے اور نہ اس میں نقب لگا سکتے تھے (فما استطاعوا ان یظہروہ وما استطاعوا لہ نقباً)۔

ذوالقرنین نے بہت اہم کام انجام دیا تھا۔ مسکبرین کی روش تو یہ ہے کہ ایسا کام کر کے وہ بہت فخر و ناز کرتے ہیں یا احسان جتلاتے ہیں لیکن ذوالقرنین چونکہ مرد خدا تھے لہذا انتہائی ادب کے ساتھ کہنے لگے: یہ میرے رب کی رحمت ہے (قال ہذا رحمتہ من ربی)۔

اگر میرے پاس ایسا اہم کام کرنے کے لیے علم و آگاہی ہے تو یہ خدا کی طرف سے ہے اور اگر مجھ میں کوئی طاقت ہے اور میں بات کر سکتا ہوں تو وہ بھی اس کی طرف سے ہے اور اگر یہ چیزیں اور ان کا احسان میرے اختیار میں ہے تو یہ بھی پروردگار کی دین رحمت کی برکت ہے میرے پاس کچھ بھی میری اپنی طرف سے نہیں ہے کہ جس پر میں فخر و ناز کروں اور میں نے کوئی خاص کام بھی نہیں کیا کہ اللہ کے بسندوں پر احسان جتاتا پھروں۔

اس کے بعد مزید کہنے لگے: یہ نہ سمجھنا کہ یہ کوئی دائمی دیوار ہے "جب میرے پروردگار کا حکم آیا تو یہ درہم برہم ہو جائے گی اور زمین بالکل مہوار ہو جائے گی (فاذا جاء وعد ربی جعلہ دكا)۔

بہر حال اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کی اقتصادی حالت اچھی تھی لیکن سوچ بچار منہ پر نہ اور صنعت کے لحاظ سے وہ کمزور تھے۔ لہذا وہ اس بات پر تیار تھے کہ اس اہم دیوار کے اخراجات اپنے ذمہ لے لیں، اس شرط کے ساتھ کہ ذوالقرنین اس کی منصوبہ بندی اور تعمیر کی ذمہ داری قبول کر لیں۔ یا جوج ماجوج کے بارے میں انشاء اللہ اس بحث کے آخر میں گفتگو کی جائے گی۔

اس پر ذوالقرنین نے انہیں جواب دیا: یہ تم نے کیا کہا؟ اللہ نے مجھے جو کچھ دے رکھا ہے وہ اس سے بہتر ہے کہ جو تم مجھے دینا چاہتے ہو اور میں تمہاری مالی امداد کا محتاج نہیں ہوں (قال ما مکنی فیہ ربی خیر)۔

تم قوت و طاقت کے ذریعے میری مدد کرو تاکہ میں تمہارے اور ان دو مضبوط قوموں کے درمیان مضبوط اور مستحکم دیوار بنا دوں (فاعینونی بقوة اجعل بینکم و بینہم ردماً)۔

"ردم" (بروزن "مرد") بنیادی طور پر پتھر کے ذریعے سوراخ بھرنے کے معنی میں ہے لیکن بعد ازاں یہ لفظ وسیع معنی میں استعمال ہونے لگا۔ اب ہر قسم کی رکاوٹ اور دیوار کو "ردم" کہتے ہیں یہاں تک اب پتھر سے بنی ہوئی دیوار کے لیے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔

بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ "ردم" مضبوط اور مستحکم "سد" کو کہتے ہیں اس تفسیر کے مطابق ذوالقرنین نے ان سے وعدہ کیا کہ وہ ان کی توقع سے زیادہ مضبوط دیوار بنا دیں گے۔

ضمناً تو جہر ہے کہ "سد" بروزن "قد" اور "سد" بروزن "خود" کا ایک ہی معنی ہے اور وہ ہے "دو چیزوں کے درمیان کوئی رکاوٹ" لیکن مفردات میں راغب نے لکھا ہے کہ ان دونوں لفظوں کے درمیان فرق ہے۔ "سد" کو وہ انسان کی مثال رکاوٹ یا دیوار سمجھتے ہیں اور "سد" کو فطری اور طبی رکاوٹ خیال کرتے ہیں۔

پھر ذوالقرنین نے حکم دیا: لوہے کی بڑی بڑی سلیں میرے پاس لے آؤ (اتونی ذہرا الحدید)۔ "ذہرہ" "ذہرہ" (بروزن "غرفہ") کی جمع ہے۔ یہ لوہے کے بڑے اور ضخیم ٹکڑے کے معنی میں ہے۔ جب لوہے کی سلیں آگئیں تو انہیں ایک دوسرے پر پھینک کر حکم دیا "یہاں تک کہ دونوں پہاڑوں کے درمیان کی جگہ پوری طرح چھپ گئی (حتی اذا سادی بین الصدین)۔

"صدف" یہاں پہاڑ کے کنارے کے معنی میں ہے۔ اس لفظ سے واضح ہوتا ہے کہ پہاڑوں کے دو کناروں کے درمیان ایک کھلی جگہ تھی اور یہیں سے یا جوج ماجوج داخل ہوتے تھے۔ ذوالقرنین نے پروردگار بنایا کہ اس خالی جگہ کو بھر دیا جائے۔

یہ بات آئوسی نے درج المعانی میں فیض کاشانی نے صافی میں اور فردوسی نے تفسیر کبیر میں کی ہے۔

اور میرے رب کا، وعدہ حق ہے (وکان وعدہ ربی حقاً)۔

یہ کہہ کر ذوالقرنین نے اس امر کی طرف اشارہ کیا کہ اختتام دنیا اور قیامت کے موقع پر یہ سب کچھ درہم برہم ہو جائے گا۔ البتہ بعض مفسرین نے وعدۃ الہی کو انسانی علم کی ترقی کی طرف اشارہ سمجھا ہے یعنی علمی ترقی کے بعد پھر ناقابل عبور دیوار کا کوئی مضموم نہیں رہے گا مثلاً ہوائی جہاز اور جیل کا پٹرکے ذریعہ ایسی رکاوٹوں کو ختم کر دیں گے لیکن یہ تفسیر بعید معلوم ہوتی ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ اس داستان کے تاریخی اور تربیتی نکات : ذوالقرنین کون تھے، مشرق و مغرب کی طرف انہوں نے کس طرح سفر کیا اور ان کی بنائی ہوئی دیوار کہاں ہے؟ اس سلسلے میں ہم انشاء اللہ بعد میں بحث کریں گے۔ قطع نظر اس کی تاریخی مطابقت کے، خود یہ داستان بہت سے تربیتی اور تعمیری نکات کی حامل ہے۔ سب سے زیادہ ان نکات پر غور کیا جانا چاہیے اور یہی درحقیقت قرآن کا اصل مقصد ہے۔

(۱) اسباب کے بغیر کوئی کام ممکن نہیں، پہلا درس کہ جو ہمیں یہ داستان سکھاتی ہے یہ ہے کہ اسباب و وسائل سے کام لے بغیر عالم میں کچھ نہیں ہو سکتا لہذا اللہ تعالیٰ نے حضرت ذوالقرنین کو کام کرنے اور کامیابی حاصل کرنے کے لیے اسباب و وسائل عطا کیے۔ جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

وأتیناہ من کل شیء سبباً

ہم نے اسے ہر طرح کے اسباب عطا کیے۔

نیز فرمایا:

فأتبع سبباً

اُس نے بھی ان اسباب سے استفادہ کیا۔

لہذا جو لوگ توقع رکھیں کہ درکار اسباب و وسائل مہیا کیے بغیر کامیابی تک پہنچ جائیں وہ کہیں نہیں پہنچ سکتے، چاہے وہ ذوالقرنین ہی کیوں نہ ہوں۔

(۲) گناہ بڑی شخصیت بھی غروب ہو جاتی ہے: سورج کا کیچڑ آلود چہنچے میں غروب ہو جاتا ہے اگرچہ فریب نظر کا پہلو دکھتا ہے لیکن اس کے باوجود یوں لگتا ہے جیسے سورج اتنا بڑا ہو کہ اس کے باوجود کیچڑ بھرے چہنچے میں چھپ سکتا ہے جیسے ایک با عظمت انسان اور ایک بلند مقام شخصیت بعض اوقات کسی ایک بڑی لغزش کی وجہ سے اپنے مقام سے گر جاتی ہے اور اس کی شخصیت نگاہوں سے غروب ہو جاتی ہے۔

(۳) تحسین اور سزا دونوں کی ضرورت ہے: کوئی حکومت اپنے اچھے لوگوں کی تحسین و

کے بغیر اور خطا کاروں کو سزا دینے اور باز پرس کیے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتی۔ یہی وہ اصول ہے جس سے حضرت ذوالقرنین نے استفادہ کیا اور کہا:

جنہوں نے زیادتی اور ظلم کیا ہے انہیں ہم سزا دیں گے اور جو ایمان لائے ہیں اُوّلٰیچھے عمل کرتے ہیں انہیں ہم اچھی جزا دیں گے۔

حضرت علی علیہ السلام نے مالک اشتر کے نام ایک فرمان جاری کیا۔ یہ فرمان نظام مملکت کا ایک جامع دستور العمل ہے۔ اس مشہور حکم میں آپت فرماتے ہیں:

ولا یكون المحسن والمسيء عندك بمنزلة سواء، فان في ذلك ترهيد للاهل

الاحسان في الاحسان، وتدریب لاهل الاساسۃ علی الاساسۃ

تیری نگاہ میں نیک اور بد بھی ایک نہیں ہونے چاہئیں کیونکہ اس طرح تو نیک لوگ اپنے کام سے بد دل ہو جائیں گے اور بُرے بے پرواہ۔

(۴) اتنا بوجھ ڈالنا جو قابل برداشت ہو: عدل الہی کا تقاضا یہ ہے کہ کسی پر اتنا بوجھ اور ذمہ داری ڈالی جائے کہ جو اس کے لیے تکلیف دہ نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ذوالقرنین نے تصحیح کی میں ظالموں کو سزا دوں گا اور نیک لوگوں کو اچھی جزا دوں گا اور پھر فرمایا:

فان ان کے سامنے آسان پروگرام رکھوں گا۔

یعنی ان کے ذمہ آسان کام لگاؤں گا تاکہ وہ شوق اور رغبت سے یہ کام سرانجام دے سکیں۔

(۵) مختلف علاقے، مختلف حالات اور مختلف تقاضے: ایک وسیع اور ہمہ گیر مملکت مختلف علاقوں میں لوگوں کے مختلف حالات سے بے اعتنا نہیں رہ سکتی۔ ذوالقرنین کہ جو ایک حکومت الہی کے سربراہ تھے۔ ان کی مملکت کے مختلف خطوں میں مختلف قومیں بستی تھیں۔ ہر قوم کا اپنا رہن سہن اور تمدن تھا۔ ذوالقرنین ان میں سے ہر ایک کے ساتھ اس کے حسب حال سلوک کرتے اور ان سب کو گویا اپنے پردوں کے نیچے رکھتے۔

(۶) ہر قوم کے مسائل حل کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے: ایک قوم کہ جو قرآن کے بقول:

لا یکادون بفقہون قولاً

یعنی۔ بات تک نہ سمجھتی تھی۔ حضرت ذوالقرنین نے اسے بھی اپنی نگاہ کرم سے دور نہیں رکھا اور جیسے بھی ممکن ہوا ان کا درد دل سنا اور ان کی احتیاج کو پورا کیا۔ آپ نے ان کے اور ان کے دشمن کے درمیان مضبوط دیوار بنادی۔ ظاہر نظر نہیں آتا کہ حکومت کے لیے ایسی قوم کوئی فائدہ مند تھی اس کے باوجود

حضرت ذوالقرنین نے ان کے ساتھ یہ حسن سلوک رکھا اور ان کے مسائل حل کیے۔ ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے :

اسماع الاصر من غیر تصخر صدقة ھنیئة

اتنی بلند آواز سے بات کرنا کہ بہرہ شخص بھی سُن لے، اچھے صدقے کی مانند ہے بشرطیکہ

یہ بلند آواز غصے کے طور پر نہ ہو بلکہ

(۷) امن صحیح معاشرے کیلئے بنیادی شرط ہے، ایک صحیح معاشرے کی زندگی کے لیے امن اولین اور اہم ترین شرط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قیام امن اور مفسدین کو رد کرنے کے لیے حضرت ذوالقرنین نے بہت باعث زحمت کام اپنے ذمے لیا اور نہایت مضبوط دیوار کھڑی کر دی۔ ایسی دیوار جو تاریخ میں ضرب المثل ہو گئی۔ جیسے کہتے ہیں ”دیوار اسکندر کی طرح“ (اگرچہ ذوالقرنین سکندر نہ تھے)۔

اسی بنا پر حضرت ابراہیمؑ نے تعمیر کعبہ کے وقت اس سرزمین کیلئے جو چیز سب سے پہلے اللہ سے مانگی وہ نعمت امن و امان ہی تھی۔ آپؑ نے بارگاہ الہی میں عرض کیا :

رَبِّ اجْعَلْ هَذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا

بارگاہ! اس شہر کو امن کا گھوارہ بنا دے۔ (ابراہیم - ۲۵)

اسی لیے فقہ اسلام میں ان لوگوں کے لیے سخت ترین منازعت کی گئی ہے جو معاشرے کے امن و امان کو خطرے میں ڈال دیں (سورہ مائدہ - آیہ ۳۳ کی طرف رجوع کریں)۔

(۸) صاحب مسئلہ کو خود بھی شریک کار ہونا چاہیئے: اس تاریخی واقعے سے ایک اور سبق یہ لیا جاسکتا ہے کہ جن کا کوئی مسئلہ ہے اور جو کسی درد میں مبتلا ہیں انہیں بھی اپنے مسئلے کے حل اور درد کے علاج میں شریک ہونا چاہیئے کیونکہ :

آہ صاحب درد را باشد اثر

جو خود درد میں مبتلا ہو اس کی آہ اثر رکھتی ہے۔

اسی لیے جنہوں نے وحشی قوموں کے حملے کی شکایت کی تھی سب سے پہلے حضرت ذوالقرنین نے انہیں حکم دیا کہ وہ لوہے کی بلیں لے آئیں۔ اس کے بعد آپؑ نے انہیں لوہے کی دیوار کے گرد آگ روشن کرنے کا حکم دیا۔ پھر پگھلا ہوا تانبا لانے کے لیے کہا تاکہ اسے لوہے پر لپیٹ دیا جائے۔

اصولی طور پر جنہیں کوئی مسئلہ درپیش ہو، جب کام ان کی شراکت سے انجام پاتا ہے تو ان کی صلاحیتیں بھی ابھرتی ہیں، کام کی کوئی قدر و قیمت بھی ہوتی ہے اور پھر وہ اس کی حفاظت بھی کرتے ہیں کیونکہ اس میں

ان کی زحماتیں بھی شامل ہوتی ہیں۔

فنی طور پر اس سے یہ بھی اچھی طرح واضح ہوتا ہے کہ ایک پسماندہ قوم کو بھی جب کوئی صحیح سرپرست اور منصوبہ بندی میسر آجائے تو وہ بھی بڑے اہم اور غیر العقول کام کر سکتی ہے۔

(۹) خدائی رہبر کی مادیات سے بے اعتنائی: ایک سبق اس داستان سے یہ حاصل ہوتا ہے کہ ایک خدائی رہبر کو مال دنیا اور مادیات سے بے پرواہ اور بے اعتناء ہونا چاہیئے اور جو کچھ اللہ نے اسے عطا کیا ہے اسی پر قناعت کرنا چاہیئے۔ بادشاہ ہر طرف سے اور ہر کسی سے عجیب عجیب ہتھکنڈے استعمال کر کے مال جمع کرنے کی لاپرواہ کرتے ہیں لیکن اس کے برعکس ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت ذوالقرنین کو جب مال کی پیشکش کی گئی تو آپؑ نے یہ کہہ کر قبول نہ کی کہ :

ما مکنی فیہ ربی خیر

جو کچھ میرے رب نے مجھے دیا ہے وہ بہتر ہے۔

قرآن مجید میں واقعات انبیاء میں ہم بار بار دیکھتے ہیں کہ ان کی یہ بات بہت بنیادی ہوتی تھی کہ ہماری دعوت تم سے کسی اجر و صلہ کے لیے نہیں اور ہم تم سے کسی اجر کی خواہش نہیں کرتے۔ یہ بات قرآن مجید میں پیغمبر اسلامؐ اور دیگر انبیاء کے بارے میں گیارہ مرتبہ دکھائی دیتی ہے۔ کبھی اس جملے کے ساتھ یہ فرمایا گیا ہے کہ :

ہماری جزا تو خدا کے ذمہ ہے۔

قل لا اسئلكم علیہ اجرا الا المودة فی القربی (التوری - ۲۳)

میں تم سے اپنے اقرباء سے محبت و مودت کے علاوہ کسی چیز کا تقاضا نہیں کرتا۔

اہل بیت سے مودت و محبت کا یہ تقاضا بھی دراصل آئندہ رہبری کی بنیاد کے طور پر ہے۔

(۱۰) کام ہر لحاظ سے ٹھوس اور مضبوط ہونا چاہیئے: کام کو ہر لحاظ سے ٹھوس اور پائیدار کرنا اس داستان کا ایک اور سبق ہے۔ ذوالقرنین نے دیوار تعمیر کرنے کے لیے لوہے کی بڑی بڑی بلیں استعمال کیں اور انہیں آپس میں ملانے اور جوڑنے کے لیے آگ میں پگھلایا۔ نیز دیوار کو نہوا، رطوبت، بارش وغیرہ کے اثرات سے محفوظ رکھنے کے لیے اس پر تانبے کا لیپ کر دیا تاکہ لوہا بوسیدہ اور زنگ زدہ نہ ہو۔

(۱۱) شکور۔ انسان کو زیبا نہیں: انسان کتنا بھی طاقتور اور صاحب قدرت ہو اور بڑے بڑے کام کر گزرے پھر بھی اسے ہرگز اپنے اوپر غرور اور ناز نہیں کرنا چاہیئے۔ یہ وہ درس ہے جو حضرت ذوالقرنین نے سب کو دیا ہے۔ وہ ہر مقام پر قدرت پر بھروسہ کرتے تھے۔ جب دیوار مکمل ہو گئی تو انہوں نے کہا :

ھذا رحمة من ربی

یہ میرے رب کی رحمت ہے۔

جب انہیں مالی کمک کی پیش کش ہوئی تو کہا:

ما مکنی فیہ ربی خیر

جو کچھ اللہ نے مجھے بخشا ہے وہ اس سے بہتر ہے۔

اور جب آپ نے اس مضبوط دیوار کے درہم برہم ہو جانے کی بات کی تو بھی پروردگار کے وعدہ حق کا سہارا لیا۔

(۱۲) اس جہان کی ہر چیز فنا پذیر ہے: آخر کار تمام چیزیں زائل ہو جائیں گی۔ اس جہان کی مضبوط ترین عمارتیں بھی آخر کار تباہ ہو جائیں گی، اگرچہ وہ لمبے اور فولاد کی بنی ہوں۔ یہ اس داستان کا آخری درس ہے۔ یہ ان تمام لوگوں کے لیے درس ہے جو عملی طور پر دنیا کو جادوئی سمجھتے ہیں اور مال جمع کرنے، منصب و مقام حاصل کرنے کے لیے کسی قانون اور قاعدے کی پرواہ نہیں کرتے اور دنیا کے لیے ایسی اڑھانہ کوشش کرتے ہیں کہ گویا موت اور فنا ہے ہی نہیں جبکہ دیوار ذوالقرنین تو معمولی چیز ہے، سورج اتنا بڑا ہونے کے باوجود خاموش اور فنا ہو جائے گا۔ پہاڑ اپنی اتنی مضبوطی کے باوجود ڈھنی ہوئی رولی کی مانند اڑھانے گئے ان سب چیزوں میں انسان تو بہت ہی کمزور سی مخلوق ہے۔ کیا اس حقیقت کے بارے میں غور و خوض انسان کو خود غرضیوں اور خود پرستیوں سے روکنے کے لیے کافی نہیں ہے۔

۲۔ ذوالقرنین کون تھا؟ جس ذوالقرنین کا قرآن مجید میں ذکر ہے، تاریخی طور پر وہ کون شخص ہے، تاریخ کی مشہور شخصیتوں میں سے یہ داستان کس پر منطبق ہوتی ہے، اس سلسلے میں مفسرین کے باہم اختلاف ہے۔ اس سلسلے میں جو بہت سے نظریات پیش کیے گئے ہیں ان میں سے یہ تین زیادہ اہم ہیں:

پہلا: بعض کا خیال ہے کہ سکندر مقدونی ہی ذوالقرنین ہے لہذا وہ اسے سکندر ذوالقرنین کے نام سے پکارتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اس نے اپنے باپ کی موت کے بعد روم، مغرب اور مصر پر تسلط حاصل کیا۔ اس نے اسکندریہ شہر بنایا۔ پھر شام اور بیت المقدس پر اقتدار قائم کیا۔ وہاں سے ارمنستان گیا۔ عراق و ایران کو فتح کیا۔ پھر ہندوستان اور چین کا قصد کیا۔ وہاں سے خراسان پلٹ آیا۔ اس نے بہت سے نئے شہروں کی بنیاد رکھی۔ پھر وہ عراق آگیا۔ اس کے بعد وہ شہر زور میں بیمار پڑا اور مر گیا۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کی عمر چھتیس سال سے زیادہ نہ تھی۔ اس کا جسد خاکی اسکندریہ لے جا کر دفن کر دیا گیا۔

دوسرا: مورخین میں سے بعض کا نظریہ ہے کہ ذوالقرنین یمن کا ایک بادشاہ تھا۔ (یمن کے بادشاہ کا "تبع" کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ اس کی جمع "تبايع" ہے)۔ اہمسی نے اپنی تاریخ عرب قبل از اسلام میں

ملے تفسیر غزالی، زیر بحث آیات کے ذیل میں اور کالی، ابن اثیر، ج ۱، ص ۲۸۷۔ بعض کہتے ہیں کہ سب سے پہلے بعل سینا پر اپنی کتاب الشفاریں اس نظریے کا اظہار کیا۔

ابن ہشام نے اپنی مشہور تاریخ "سیرۃ" میں اور البرہان بیرونی نے "الانار الباقیہ" میں یہی نظریہ پیش کیا ہے۔ یہاں تک کہ یمن کی ایک قوم "حیرہ" کے شعراء اور زمانہ جاہلیت کے بعض شعراء کے کلام میں دیکھا جا سکتا ہے کہ انہوں نے ذوالقرنین کے اپنے میں سے ہونے پر فخر کیا ہے۔ اس نظریے کی بنیاد پر ذوالقرنین نے جو دیوار بنائی وہ دیوار مارب ہے۔

تیسرا: یہ جدید ترین نظریہ ہے جو ہندوستان کے مشہور عالم ابوالکلام آزاد نے پیش کیا ہے۔ ابوالکلام آزاد کسی دور میں ہندوستان کے وزیر تعلیم تھے۔ اس سلسلے میں انہوں نے ایک تحقیقی کتاب لکھی ہے۔ اس نظریے کے مطابق ذوالقرنین، کورش کبیر بادشاہ ہخامنشی ہے۔

پہلے اور دوسرے نظریے کے لیے کوئی خاص تاریخی مدرک نہیں ہے۔ اس کے علاوہ قرآن نے ذوالقرنین کی جو صفات بیان کی ہیں ان کا حامل اسکندر مقدونی ہے نہ کوئی بادشاہ یمن۔ اس پر مستزاد یہ کہ اسکندر مقدونی نے کوئی معرفت دیوار بھی نہیں بنائی۔

رہی وہ یمن کی دیوار مارب، تو اس میں ان صفات میں سے ایک بھی نہیں جو قرآن کی ذکر کردہ دیوار میں ہیں۔ کیونکہ قرآن کے مطابق دیوار ذوالقرنین لمبے اور تانبے سے بنائی گئی ہے اور یہ دیوار وحشی اقوام کو روکنے کے لیے بنائی گئی تھی جبکہ دیوار مارب عام مصالحے سے بنائی گئی ہے اور اس کی تعمیر کا مقصد پانی کا ذخیرہ کرنا اور سیلابوں سے بچنا تھا۔ اس کی وضاحت خود قرآن نے سورہ سبا میں کی ہے۔

لہذا ہم اپنی بحث کو زیادہ تر تیسرے نظریے پر مرکوز کرتے ہیں۔ یہاں ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ چند امور کی طرف خوب توجہ دی جائے:

(۱۔) پہلی بات تو یہ ہے کہ "ذوالقرنین" کا معنی ہے "دو سینگوں والا"۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انہیں اس نام سے کیوں موسوم کیا گیا۔

بعض کا نظریہ ہے کہ یہ نام اس لیے پڑا کہ وہ دنیا کے مشرق و مغرب تک پہنچے کہ جسے "قونی ایش" (سورج کے دو سینگ) سے تعبیر کرتے ہیں۔

بعض کہتے ہیں کہ یہ نام اس لیے ہوا کہ انہوں نے دو قرن زندگی گزاری یا حکومت کی۔

پھر یہ کہ قرن کی مقدار کتنی ہے، اس میں بھی مختلف نظریات ہیں۔

بعض کہتے ہیں کہ ان کے سر کے دونوں طرف ایک خاص قسم کا اجمار تھا اس وجہ سے ذوالقرنین

فارسی میں اس کتاب کے ترجمے کا نام "ذوالقرنین یا کورش کبیر" رکھا گیا ہے۔ بہت سے معاصر مفسرین اور مؤرخین نے اپنی کتب میں اس نظریے کی موافقت کی ہے اور اس پر اپنے خیالات کا تفصیل سے اظہار کیا ہے۔

مشہور ہو گئے۔

بعض کا نظریہ یہ ہے کہ ان کا خاص تاج دو شاخوں والا تھا۔

اس کے علاوہ بھی نظریات ہیں، جن کا ذکر بات کو طویل کرے گا۔ بہر حال ہم دیکھیں گے کہ ذوالقرنین کی شخصیت کے بارے میں تیسرا نظریہ پیش کرنے والے یعنی ابو الکلام آزاد نے اپنے نظریے کے اثبات کے لیے اس لقب "ذوالقرنین" سے بہت استفادہ کیا ہے۔

(ب) قرآن مجید سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ ذوالقرنین ممتاز صفات کے حامل تھے۔ اللہ تعالیٰ نے کامیابی کے اسباب ان کے اختیار میں دیئے تھے۔ انہوں نے تین اہم لشکر کشیاں کیں۔ پہلے مغرب کی طرف پھر مشرق کی طرف اور آخر میں ایک ایسے علاقے کی طرف کہ جہاں ایک کستانی ورہ موجود تھا۔ ان مسافرت میں وہ مختلف اقوام سے ملے۔ ان کی تفصیل آیات کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔

وہ ایک مرد مومن، موحد اور مہربان شخص تھے۔ وہ عدل کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے تھے۔ اسی بنا پر اللہ کا لطف خاص ان کے شامل حال تھا۔ وہ نیکوں کے دوست اور ظالموں کے دشمن تھے۔ انہیں دنیا کے مال و دولت سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ وہ اللہ پر بھی ایمان رکھتے تھے اور روزِ جزا پر بھی۔ انہوں نے ایک نہایت مضبوط دیوار بنائی۔ یہ دیوار انہوں نے اینٹ اور پتھر کی بجائے لوسہ اور تانبے سے بنائی (اور اگر دوسرے مصالح بھی استعمال ہوئے ہوں تو ان کی بنیادی حیثیت نہ تھی)۔ اس دیوار بنانے سے ان کا مقصد مستضعف اور ستم رسیدہ لوگوں کی یا جوج و ماجوج کے ظلم و ستم کے مقابلے میں مدد کرنا تھا۔

وہ ایسے شخص تھے کہ نزولِ قرآن سے قبل ان کا نام لوگوں میں مشہور تھا۔ لہذا قریش اور یہودیوں نے ان کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کیا تھا، جیسا کہ قرآن کتا ہے:

یٰسٰلُوْنٰہٗ عَنْ ذٰی الْقُرْنَيْنِ

تجھ سے ذوالقرنین کے بارے میں پوچھتے ہیں۔

البتہ قرآن سے کوئی ایسی چیز نہیں ملتی جو صراحت سے ان کے نبی ہونے پر دلالت کرے اگرچہ ایسی تعبیرات قرآن میں موجود ہیں کہ جو اس مطلب کی طرف اشارہ کرتی ہیں، جیسا کہ آیات کی تفسیر میں گزر چکا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ اہل بیت علیہم السلام سے بہت سی ایسی روایات منقول ہیں جن میں ہے کہ:

وہ نبی نہ تھے بلکہ اللہ کے ایک صالح بندے تھے۔

(ج) یہ نظریہ کہ ذوالقرنین۔ کورش کبیر۔ کو کہتے ہیں، اس کی دو بنیادیں ہیں:

پہلی: یہ کہ اس کے بارے میں رسول اسلام سے سوال کرنے والے یہودی تھے یا یہودیوں کی تحریک پر قریش تھے۔ جیسا کہ ان آیات کی شانِ نزول کے بارے میں منقول روایات سے ظاہر ہوتا ہے۔ لہذا اس سلسلے میں کتب یہود کو دیکھا جانا چاہیئے۔

یہودیوں کی مشہور کتابوں میں سے کتاب دانیال کی آٹھویں فصل میں ہے:

"بل شقرہ کی سلطنت کے سال مجھ دانیال کو خواب دکھایا گیا۔ جو خواب مجھے دکھایا گیا اس کے بعد اور خواب میں، میں نے دیکھا کہ میں ملک "عیلام" کے "تھر شوشان" میں ہوں۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں "دریائے ولادی" کے پاس ہوں۔ میں نے آنکھیں اٹھا کر دیکھا کہ ایک مینڈھا دریا کے کنارے کھڑا ہو گیا ہے۔ اس کے ددینگ تھے۔ اور یہ بلند مینگ تھے۔ اور اس مینڈھے کو میں نے مغرب، مشرق اور جنوب کی سمت مینگ مارتے ہوئے دیکھا۔ کوئی جانور اس کے مقابلے میں ٹھہر نہیں سکتا تھا اور کوئی اس کے ہاتھ سے بچانے والا نہ تھا۔ وہ اپنی راسے پر ہی عمل کرتا تھا اور وہ بڑا ہوتا جاتا تھا۔۔۔"

اس کے بعد اسی کتاب میں دانیال کے بارے میں ہے:

جبریل اس پر ظاہر ہوا اور اس کے خواب کی یوں تعبیر کی:

دو شاخوں والا مینڈھا جو تُو نے دیکھا ہے وہ مدائن اور فارس (یا ماد اور فارس) کے بادشاہ ہیں۔

یہودیوں نے دانیال کے خواب کو بشارت قرار دیا۔ وہ سمجھے کہ ماد و فارس کے کسی بادشاہ کے قیام اور بابل کے حکمرانوں پر ان کی کامیابی سے یہودیوں کی غلامی اور قید کا دودھ ختم ہو گا اور وہ اہل بابل کے جنگل سے آزاد ہوں گے۔

زیادہ دیر نہ گزری کہ "کورش" نے ایران کی حکومت پر کنٹرول حاصل کر لیا۔ اس نے ماد اور فارس کو ایک ملک کر کے دونوں کو ایک عظیم سلطنت بنا دیا۔ جیسے دانیال کے خواب میں بتایا گیا تھا کہ وہ اپنے مینگ مغرب، مشرق اور جنوب کی طرف مارے گا، کورش نے تینوں سمتوں میں عظیم فتوحات حاصل کیں۔

اس نے یہودیوں کو آزاد کیا اور فلسطین جانے کی اجازت دی۔

یہ بات لائقِ توجہ ہے کہ تورات کی کتاب اشعیا، فصل ۴۴، شمارہ ۲۸ میں ہے:

اس وقت خصوصیت سے کورش کے بارے میں فرماتا ہے کہ میرا چر دالا دی ہے میری مشیت کو اس نے پورا کیا ہے۔ اور شلیم سے گے گا کہ تو تعمیر ہو گا۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ تورات کی بعض تعبیرات میں کوروش کے بارے میں ہے کہ :

عقاب مشرق اور مرد تدبیر کہ جو بڑی دُور سے بلایا جائے گا۔

دوسری بنیاد یہ ہے کہ انیسویں عیسوی صدی میں استخر کے قریب دریائے مرغاب کے کنارے کوروش کا مجسمہ دریافت ہوا ہے۔ یہ ایک انسان کے قد و قامت کے برابر ہے۔ اس میں کوروش کے عقاب کی طرح کے دو پر بنائے گئے ہیں اور اس کے سر پر ایک تاج ہے۔ اس میں مینڈھے کے سینگوں کی طرح کے دو سینک نظر آتے ہیں۔

یہ مجسمہ بہت قیمتی ہے اور قدیم فن سنگ سازی کا نمونہ ہے۔ اس نے ماہرین کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لی ہے۔ جرمنی کے ماہرین کی ایک جماعت نے صرف اسے دیکھنے کے لیے ایران کا سفر کیا۔

تورات کے مندرجات کو جب اس مجسمے کی تفصیلات کے ساتھ ملا کر دیکھا تو ابوالکلام آزاد کو مزید یقین ہوا کہ کوروش کو ذوالقرنین (دو سینگوں والا) کہنے کی وجہ کیا ہے۔ اسی طرح یہ بھی واضح ہو گیا کہ کوروش کے مجسمے میں عقاب کے دو پر کیوں لگائے گئے ہیں۔ اس سے علماء کے ایک گروہ کے لیے ذوالقرنین کی تاریخی شخصیت پوری طرح واضح ہو گئی۔

ایک چیز کہ جو اس نظریے کی تائید کرتی ہے وہ کوروش کے تاریخ میں لکھے گئے اخلاقی اوصاف ہیں۔

یونانی مورخ ہرودوت لکھتا ہے :

کوروش نے حکم جاری کیا کہ اس کے سپاہی سوائے جنگ کرنے والوں کے کسی کے سامنے تلوار نہ نکالیں اور دشمن کا جو سپاہی اپنا نیزہ خم کر دے اسے قتل نہ کریں۔ کوروش کے لشکر نے اس کے حکم کی اطاعت کی۔ اس طرح سے کہ ملت کے عام لوگوں کو مصائب جنگ کا احساس تک نہ ہوا۔

ہرودوت اس کے بارے میں مزید لکھتا ہے :

کوروش کریم، سخی، بہت نرم دل اور مہربان بادشاہ تھا۔ اسے دوسرے بادشاہوں کی طرح مال جمع کرنے کی حرص نہ تھی بلکہ اسے یہ لالچ تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ کرم دے کر دے۔ وہ ستم رسیدہ لوگوں کے ساتھ عدل و انصاف کرتا تھا اور جس چیز سے زیادہ خیر اور بھلائی ہوتی اسے پسند کرتا تھا۔

ایک اور مورخ ذی فون لکھتا ہے :

کوروش ماعقل اور مہربان بادشاہ تھا۔ اس میں بادشاہوں کی عظمت، حکماء کے فضائل

کے ساتھ ساتھ تھی۔ اُس کی ہمت بلند تھی اور اُس کا جود و کرم زیادہ تھا۔ اس کا شمار انسانیت

کی خدمت تھا اور عدالت اُس کی عادت تھی۔ وہ تکبر کی بجائے انکاری کا مرتفع تھا۔

یہ بات جاذبِ نظر ہے کہ کوروش کی اس قدر تعریف و توصیف کرنے والے مؤرخین غیر ہیں، کوروش کی قوم اور وطن سے ان کا تعلق نہیں ہے بلکہ اہل یونان ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ یونان کے لوگ کوروش کی طرف دوستی اور محبت کی نظر سے نہ دیکھتے تھے کیونکہ کوروش نے لیدی یا کوچ کر کے اہل یونان کو بہت بڑی شکست دی تھی۔

اس نظریے کے حامی کہتے ہیں کہ قرآن مجید میں ذوالقرنین کے جو اوصاف بیان کیے گئے ہیں وہ کوروش کے اوصاف سے مطابقت رکھتے ہیں۔

ان تمام باتوں سے قطع نظر کوروش نے مشرق، مغرب اور شمال کی طرف سفر بھی کیے ہیں۔ ان سفروں کا حال اس کی تاریخ میں تفصیل طور پر مذکور ہے۔ یہ سفر قرآن میں ذکر کیے گئے ذوالقرنین کے سفروں سے مطالبہ رکھتے ہیں۔ کوروش نے پہلی لشکر کشی لیدیا پر کی۔ یہ ایشیائے کوچک کا شمالی حصہ ہے۔ یہ ملک کوروش کے مرکزِ حکومت سے مغرب کی طرف تھا۔

ایشیائے کوچک کے مغربی ساحل کا نقشہ سامنے رکھیں تو ہم دیکھیں گے کہ ساحل کے زیادہ تر حصے چھوٹی چھوٹی غلیجوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ خصوصاً از میر کے قریب کہ جہاں غلیج ایک چشمنے کی صورت دھار لیتی ہے۔ قرآن کتا ہے کہ ذوالقرنین نے اپنے مغرب کے سفر میں محسوس کیا کہ جیسے سورج کیچڑ آلود چشمنے میں ڈوب رہا ہے۔ یہ وہی منظر ہے جو کوروش نے غروبِ آفتاب کے وقت ساحلی غلیجوں میں دیکھا تھا۔

کوروش کی دوسری لشکر کشی مشرق کی طرف تھی جیسا کہ ہرودوت نے کہا ہے کہ کوروش کا یہ مشرقی حملہ لیدی کی فتح کے بعد ہوا خصوصاً بعض بیابانی وحشی قبائل کی سرکشی نے کوروش کو اس حملے پر اکسایا۔

قرآن کے الفاظ میں :

حتیٰ اذا بلغ مطلع الشمس وجدها تطلع علی قوم لم نجعل لهم من دونها سترا

پھر سورج کے مرکزِ طلوع تک جا پہنچا۔ وہاں اس نے دیکھا کہ سورج ایسے لوگوں پر طلوع کر رہا ہے کہ جن کے پاس سورج کی کرنوں سے بچنے کیلئے کوئی سایہ نہ تھا۔

یہ الفاظ کوروش کے سفرِ مشرق کی طرف اشارہ کر رہے ہیں جہاں اس نے دیکھا کہ سورج ایسی قوم پر طلوع کر رہا ہے کہ جن کے پاس اس کی تیش سے بچنے کیلئے کوئی سایہ نہ تھا۔ یہ اس نظرِ اشارہ ہے کہ وہ قوم صحرا نورد تھی اور بیابانوں میں رہتی تھی۔

کوروش نے تیسری چڑھائی شمال کی طرف قفقاز کے پہاڑوں کی جانب کی۔ یہاں تک کہ وہ دو پہاڑوں

کے درمیان ایک درے میں پہنچا۔ یہاں کے رہنے والوں نے وحشی اقوام کے حملوں اور غارتگری کو روکنے کی درخواست کی۔ اس پر کورش نے اس تنگ درے میں ایک مضبوط دیوار تعمیر کر دی۔

اس درے کو آج کل درہ داربال کہتے ہیں۔ موجودہ نقشوں میں یہ "ولادی کیوکز" اور "تفلیس" کے درمیان دکھایا جاتا ہے۔ وہاں اب تک ایک آہنی دیوار موجود ہے۔ یہ وہی دیوار ہے جو کورش نے تعمیر کی تھی۔ قرآن نے ذوالقرنین کی دیوار کے جو اوصاف بتائے ہیں وہ پوری طرح اس دیوار پر منطبق ہوتے ہیں۔

تیسرے نظریے کی تقویت کے لیے ہم نے خلاصے کے طور پر یہ کچھ بیان کیا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس نظریے میں بھی ابہام کے ابھی بہت سے پہلو موجود ہیں لیکن عملاً ذوالقرنین کی تاریخ کے بارے میں ابھی تک جتنے نظریے پیش کیے گئے ہیں اسے ان میں سے بہترین کہا جاسکتا ہے۔ ۳۔ دیوار ذوالقرنین کہاں ہے؟ بعض لوگ چاہتے ہیں کہ اسے مشرق دیوار چین پر منطبق کریں کہ جو اس وقت موجود ہے اور کئی سو کلومیٹر لمبی ہے لیکن واضح ہے کہ دیوار چین لوسہ اور تانبے سے نہیں بنی ہوئی اور نہ وہ کسی پھوٹے کوہستانی درے میں ہے۔ وہ تو ایک عام مصلحے سے بنی ہوئی دیوار ہے۔ اور جیسا کہ ہم نے کہا ہے کئی سو کلومیٹر لمبی ہے اور اب بھی موجود ہے۔

بعض کا اصرار ہے کہ یہ وہی دیوار مادرب ہے کہ جو چین میں ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ دیوار مادرب ایک کوہستانی درے میں بنائی گئی ہے لیکن وہ سیلاب کو روکنے کے لیے اور پانی ذخیرہ کرنے کے مقصد سے بنائی گئی ہے اور دیسے بھی وہ لوسہ اور تانبے سے بنی ہوئی نہیں ہے۔

جبکہ عملاً، محققین کی گواہی مطابق سرزمین قفقاز میں دریائے خزر اور دریائے سیاه کے درمیان پہاڑوں کا ایک سلسلہ ہے کہ جو ایک دیوار کی طرح شمال اور جنوب کو ایک دوسرے سے الگ کرتا ہے اس میں ایک ہی دیوار کی طرح کا درہ موجود ہے جو مشہور درہ داربال ہے۔ یہاں اب تک ایک قدیم تاریخی لوسہ کی دیوار نظر آتی ہے۔ اسی بنا پر بہت سے لوگوں کا نظریہ ہے کہ دیوار ذوالقرنین یہی ہے۔

یہ بات جاذب نظر ہے کہ وہیں قریب ہی "سائرس" نامی ایک نہر موجود ہے اور "سائرس" کا معنی "کودش" ہے (کہو کہ یونانی "کودش" کو "سائرس" کہتے تھے)۔

ارمنی کے قدیم آثار میں اس دیوار کو "بھاگ گورانی" کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ اس لفظ کا معنی ہے "درہ کوہ شمس" یا "مہر کودش" (کودش کے عبور کرنے کی جگہ)۔ یہ سند نشاندہی کرتی ہے کہ اس دیوار کا بانی کودش ہی تھا۔

۴۔ یا جوج ماجوج کون ہیں؟ قرآن مجید کی دوسروں میں یا جوج ماجوج کا ذکر آیا ہے ایک

لے وٹے مزید وضاحت کے لیے کتاب "ذوالقرنین یا کورش کبیر" اور "فرہنگ قصص قرآن" کی طرف رجوع فرمائیں۔

ذیر بحث آیات میں اور دوسرا سورہ انبیاء کی آیت ۹۶ میں۔

آیات قرآن واضح طور پر گواہی دیتی ہیں کہ یہ دو وحشی غوغوار قبیلوں کے نام تھے وہ لوگ اپنے ارد گرد رہنے والے پر بہت زیادتیاں اور ظلم کرتے تھے۔

تورات کی کتاب حزقیل فصل ۳۸ اور ۳۹ میں نیز کتاب "رویائے یوحنا" کی بیسویں فصل میں انہیں "گوگ" اور "ماگوگ" کہا گیا ہے کہ عربی میں جنہیں "یا جوج ماجوج" ہی کہا جائے گا۔

عظیم مفسر علامہ طباطبائی نے المیزان میں لکھا ہے کہ تورات کی ساری باتوں سے مجموعی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ ماجوج یا جوج و ماجوج ایک یا کئی ایک بڑے بڑے قبیلے تھے۔ یہ شمالی ایشیا کے دور دراز علاقے میں رہتے تھے۔ یہ جنگجو، غارت گرد اور ڈاکو قسم کے لوگ تھے۔

بعض کا نظریہ ہے کہ یہ عبرانی زبان کے الفاظ ہیں لیکن دراصل یونانی زبان سے عبرانی میں منتقل ہوئے ہیں۔ یونانی میں ان کا تلفظ "گاگ" اور "ماگاگ" تھا۔ دیگر یونانی زبانوں میں بھی یہ الفاظ اسی شکل میں منتقل ہوئے ہیں۔

تاریخ کے بہت سے دلائل کے مطابق زمین کے شمال مشرق مغولستان کے اطراف میں گزشتہ زانوں میں انسانوں کا گویا جوش مارتا ہوا چشمہ تھا۔ یہاں کے لوگوں کی آبادی بڑی تیزی سے پھلتی اور پھولتی تھی۔

آبادی زیادہ ہونے پر یہ لوگ مشرق کی سمت یا نیچے جنوب کی طرف چلے جاتے تھے اور ایل روال کی طرح ان علاقوں میں پھیل جاتے تھے اور پھر تدریجاً وہاں سکونت اختیار کر لیتے تھے۔ تاریخ کے مطابق سیلاب کی مانند ان قوموں کے اٹھنے کے مختلف دور گزرے ہیں۔ ان میں ایک حملہ ان وحشی قبائل نے چوتھی صدی مسیح میں

آئیلکا کمان میں کیا۔ اس حملے میں روم کا شاہی تمدن خاک میں مل گیا۔

ایک اور دور کہ جو ان کے حملوں کا تقریباً آخری دور شمار ہوتا ہے وہ بارہویں صدی ہجری میں چنگیز خاں کی سرپرستی میں ہوا۔ انہوں نے مسلمان اور عرب ممالک پر حملہ کیا۔ اس حملے میں بغداد سمیت بہت سے شہر تباہ و برباد ہو گئے۔

کورش کے زمانے میں بھی ان کی طرف سے ایک حملہ ہوا۔ یہ تقریباً پانچ سو سال قبل مسیح کی بات ہے لیکن اس زمانے میں ماد اور فارس کی متحدہ حکومت معرض وجود میں آچکی تھی لہذا حالات بدل گئے اور مغربی ایشیا ان قبائل کے حملوں سے آسودہ خاطر ہو گیا۔

لہذا یہ زیادہ صحیح لگتا ہے کہ یا جوج اور ماجوج انہی وحشی قبائل میں سے تھے جب کورش ان علاقوں کی طرف گئے تو قفقاز کے لوگوں نے درخواست کی کہ انہیں ان قبائل کے حملوں سے بچایا جائے۔ لہذا اس نے وہ مشہور دیوار تعمیر کی ہے جسے "دیوار ذوالقرنین" کہتے ہیں۔

المیزان، ج ۱، ص ۱۱۳۔

تفصیل کے لیے مذکورہ کتابوں کی طرف رجوع کریں۔

۹۹) وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَمُوجُ فِي بَعْضٍ وَنَفَخَ فِي الصُّورِ فَجَمَعْنَهُمْ جَمْعًا ۝

۱۰۰) وَعَرَضْنَا جَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ لِلْكَافِرِينَ عَرْضًا ۝

۱۰۱) الَّذِينَ كَانَتْ أَعْيُنُهُمْ فِي غِطَاءٍ عَنْ ذِكْرِي وَكَانُوا لَا يَسْتَطِيعُونَ سَمْعًا ۝

۱۰۲) اَفَحَسِبَ الَّذِينَ كَفَرُوا اَنْ يَتَّخِذُوا عِبَادِي مِنْ دُوْنِي اَوْلِيَاءَ اِنَّا اَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكَافِرِينَ نُزُلًا ۝

ترجمہ

۹۹) اس دن (کہ جب یہ دنیا ختم ہو جائے گی) ہم انہیں اس طرح سے چھوڑ دیں گے کہ وہ باہم موجزن ہوں گے۔ اس روز صور پھونکا جائے گا اور ہم انہیں نئی زندگی عطا کر کے سب کو جمع کریں گے۔

۱۰۰) اس روز ہم جہنم کو کافروں کے سامنے پیش کریں گے۔

۱۰۱) وہی کہ جن کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا تھا، جو مجھے یاد نہیں کرتے تھے اور جو کچھ نہ سن سکتے تھے۔

۱۰۲) کیا کافروں کو یہ گمان ہے کہ وہ مجھے چھوڑ کر میرے بندوں کو اپنا سرپرست بنا سکتے ہیں اور ہم نے جہنم کو کافروں کی منزل قرار دے رکھا ہے۔

تفسیر

بے ایمانوں کا ٹھکانا

گزشتہ آیات میں بتایا گیا تھا کہ یا جوج و ماجوج کو روکنے کے لیے ایک دیوار بنائی گئی تھی اور یہ دیوار قیامت کے موقع پر درہم برہم ہو جائے گی۔ اسی مناسبت سے زیر بحث آیات میں قیامت کے بارے میں گفتگو جاری ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: اس روز کہ جب یہ دنیا ختم ہو جائے گی تو ہم انہیں چھوڑ دیں گے اور وہ باہم موجزن ہوں گے (و تَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَمُوجُ فِي بَعْضٍ)۔

”یعوج“ اس موقع پر لوگوں کی کثرت کی وجہ سے استعمال ہوا ہے۔ جیسا کہ ہسم عام طور پر کہتے ہیں کہ فلاں موقع پر لوگوں کا دریا موجزن تھا یا پھر یہ لفظ اضطراب اور لرزے کی طرف اشارہ ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ اس دن لوگوں کے بدن پر کپکپی طاری ہوگی گویا اُن کے جسم پانی کی لہروں کی طرح لرز رہے ہوں گے۔

البتہ ان دونوں تفسیروں میں کوئی باہمی تضاد نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے اس تعبیر سے یہ دونوں پہلو مراد ہوں۔ اس کے بعد فرمایا گیا ہے: اس دن صور پھونکا جائے گا۔ ہم انہیں نئی زندگی بخشیں گے اور ان سب کو جمع کریں گے (و نَفَخَ فِي الصُّورِ فَجَمَعْنَاهُمْ جَمْعًا)۔ اس میں شک نہیں کہ تمام انسان اس میدان میں جمع ہوں گے اور کوئی اس قانون سے مستثنیٰ نہیں ہوگا۔

”جمعناہم جمعًا“ کی تعبیر بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

آیات قرآن سے مجموعی طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس جہان کے اختتام اور دوسرے جہان کے آغاز میں دو بڑی عظیم تبدیلیاں عالم میں رونما ہوں گی۔

پہلی عظیم تبدیلی یہ ہوگی کہ تمام موجودات اور انسان فنا ہو جائیں گے۔ یہ ایک ضرب کا پروگرام ہے۔ دوسری عظیم تبدیلی معلوم نہیں کہ پہلے تحول و تغیر سے کتنی دیر بعد ہوگی اور وہ ہے مردوں کا قبروں سے اٹھنا۔ یہ بھی ایک ضرب کا پروگرام ہے۔

قرآن نے ”نَفَخَ فِي الصُّورِ“ کہ کر ان پروگراموں کی طرف اشارہ کیا ہے ————— ارشاد اللہ ہم سورہ زمر کی آیت ۶۸ کے ذیل میں اس کی تفصیل بیان کریں گے۔

اس مقام پر ایک روایت ہے کہ جو اصبح نبیؐ نے حضرت علیؑ علیہ السلام سے نقل کی ہے۔ امام نے ”تَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَمُوجُ فِي بَعْضٍ“ کی تفسیر میں فرمایا:

اس سے مراد قیامت ہے یہ

ہو سکتا ہے کہ یہ سمجھا جائے کہ ہم نے جو کچھ کہا ہے یہ روایت اس کے منافی ہو کیونکہ ہم نے اسے فنا بردار دنیا کا ایک مرحلہ قرار دیا ہے (جیسا کہ قبل اور بعد کی آیات کا ظاہری مفہوم نکلتا ہے)۔ لیکن ایک نکتہ کی طرف توجہ سے یہ اشکال ختم ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ بعض اوقات ”یوم قیامت“ وسیع معنی میں استعمال ہوتا ہے کہ جس میں قیامت کے مقدمات بھی شامل ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ اس کے مقدمات میں فنا بردار دنیا کے مرحلے بھی شامل ہیں۔

اس کے بعد کفار کے حالات کے بارے میں بات شروع ہوتی ہے۔ ان کی صفات جو ان کے انجام کی موجب ہیں، وہ بھی بیان کی گئی ہیں اور ان کے اعمال کا انجام بھی۔ ارشاد ہوتا ہے: ہم اس روز جہنم ان کے سامنے پیش کر دیں گے (و عرضنا جہنم یومئذ للکافرین عرضاً)۔

جہنم اپنے طرح طرح کے عذاب اور مختلف دردناک سزاؤں کے ساتھ ان کے سامنے پوری طرح آشکار ہوگی۔ اسے دیکھنا بھی ان کے لیے ایک دردناک اور جانکاه عذاب ہے چہ جائیکہ گرفتار عذاب جہنم ہونا۔ یہ کون سے کافروں کا ذکر ہے اور وہ اس انجام کو کیوں پہنچیں گے، اس سلسلے میں قرآن ان کا یوں تعارف کر دیتا ہے: وہی کہ جن کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا تھا اور جو حق کا چہرہ نہیں دیکھ سکتے تھے کہ انہیں میری یاد آتی (الذین کانوا عینہم فی غطاء عن ذکرى)۔

وہی کہ جن کے کان تو سنتے لیکن تاب سماعت نہ تھی (و کانوا لا یستطیعون سمعاً)۔ دراصل وہ لوگ تلاش حق اور ادراک حقائق کا نہایت اہم وسیلہ کہ جو خوش بختی و بد بختی کا عامل ہے بے کار کر چکے ہیں۔ یعنی ان کی دیکھنے والی آنکھیں اور سننے والے کان بیکار ہو چکے ہیں۔ غلط افکار، تعصب، کینہ پروری اور بُری صفات کی وجہ سے ان کی بصارت اور سماعت گویا بے کار ہو چکی ہے۔

یہ بات لائق توجہ ہے کہ آنکھ کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

ان کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا تھا لہذا انہیں میری یاد سبھائی نہیں دیتی تھی۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ چونکہ وہ غفلت کے پردے میں تھے اس لیے انہوں نے آثار الہی نہیں دیکھے اس لیے حقیقت کو افسانہ سمجھ کر اللہ کو بھول چکے ہیں۔

جی ہاں! حق کا چہرہ آشکار ہے اور اس جہان کی ہر چیز انسان کے ساتھ بات کرتی ہے۔ صرف چشم بینا اور گوش شنوا کی ضرورت ہے۔

دوسرے لفظوں میں یاد خدا کوئی ایسی چیز نہیں کہ جو آنکھ سے دیکھی جائے۔ جو کچھ دیکھا جاتا ہے وہ

تفسیر المیزان، زیر بحث آیت کے ذیل میں، بحوالہ تفسیر عیاشی۔

اس کے آثار ہیں اور یہی آثار اس کی یاد کا سبب ہیں۔

اگلی آیت میں ان کے انحراف کی بنیادی وجہ بتائی گئی ہے۔ یہی وہ انحراف ہے جو دیگر انحرافات کا باعث ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: کیا کافروں نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ وہ میری بجائے میرے بندوں کو اپنا دلی دسر پرست بنا سکتے ہیں (افحسب الذین کفروا ان یتخذوا عبادى من دونى اولیاء)۔

یہ بندے کہ جنہیں معبود بنایا گیا ہے مثلاً حضرت عیسیٰ اور فرشتے، ان کا مقام جس قدر بھی بلند ہو، کیا ان کے پاس کوئی چیز خود اپنی طرف سے بھی ہے کہ وہ کسی کی خدا کی بجائے سرپرستی کر سکیں یا اس کے برعکس جو کچھ بھی ان کے پاس ہے وہ بھی خدا کی طرف سے ہے۔ یہاں ہم کہہ رہے ہیں کہ وہ خود بھی اس کی ہدایت کے محتاج ہیں۔

یہ ایسی حقیقت ہے جو کافروں نے ٹھٹھا رکھی ہے اور شرک میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ آیت کے آخر میں مزید تاکید کے لیے فرمایا گیا ہے: جہنم کو ہم نے کافروں کی منزل کے طور پر تیار کیا ہے اور اسی منزل پر ان کا استقبال ہوگا (انا اعتدنا جہنم للکافرین نزلاً)۔

”منزل“ (بروزن) ”مُسل“ منزل کے معنی میں بھی آیا ہے اور اس چیز کے لیے بھی جو مہمان کی پذیرائی کے لیے تیار کی جائے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ پہلی چیز ہے کہ جو مہمان کو پیش کی جاتی ہے مثلاً شربت یا پھل وغیرہ کہ جو مہمان کو آنے سے پہلے پیش کرتے ہیں۔

- ۱۰۳ قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا ۝
- ۱۰۴ الَّذِينَ ضَلَّ سَعِيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا ۝
- ۱۰۵ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ وَزَنًا ۝
- ۱۰۶ ذَٰلِكَ جَزَاءُ وَهُمْ جَهَنَّمُ بِمَا كَفَرُوا وَاتَّخَذُوا آيَاتِي وَرُسُلِي هُزُوًا ۝
- ۱۰۷ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنَّاتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ۝
- ۱۰۸ خَالِدِينَ فِيهَا لَا يَبْغُونَ عَنْهَا حَوْلًا ۝

ترجمہ

- ۱۰۳ کہہ دو: کیا ہم تمہیں خبر دیں کہ زیادہ خسارے میں کون لوگ ہیں؟
- ۱۰۴ وہ کہ جن کی ساری کوششیں دنیاوی زندگی میں بھٹک کے رہ گئی ہیں اور اس کے باوجود وہ سمجھتے ہیں کہ وہ اچھے کام انجام دے رہے ہیں۔
- ۱۰۵ وہ ایسے لوگ ہیں کہ جنہوں نے آیاتِ ربانی اور اللہ کی ملاقات کا انکار کیا ہے۔ اسی بنا پر ان کے سارے اعمال اکارت ہو گئے ہیں لہذا قیامت کے دن ان کے لیے ہم میزانِ حساب قائم نہیں کریں گے۔

- ۱۰۶ ان کی سزا جہنم ہے کیونکہ انہوں نے کفر اختیار کیا اور یہ لوگ میری آیتوں اور میرے رسولوں کا مذاق اڑاتے تھے۔
- ۱۰۷ رہے وہ لوگ کہ جو ایمان لائے اور نیک کام کیے تو باغاتِ فردوس ان کی منزل ہے۔
- ۱۰۸ اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے اور کبھی یہاں سے کہیں اور جانے کی خواہش نہیں کریں گے۔

تفسیر

سب سے زیادہ خسارے میں کون لوگ ہیں؟

ان آیات میں اور ان کے بعد سورہ کے آخر تک بے ایمان لوگوں کی صفات بیان کی گئی ہیں ان آیات میں بلکہ اس پوری سورت میں مختلف جگہوں پر جو بحثیں آئی ہیں انہیں جمع کر دیا گیا ہے۔ خصوصاً اصحابِ کھف، موسیٰ و خضر اور ذوالقرنین کی جدوجہد اور مخالفین کے مقابلے میں ان کے طرزِ عمل سے مربوط مباحث کا ان آیات میں ایک طرح سے تجرُّد آگیا ہے۔

سب سے پہلے تو ان لوگوں کا ذکر ہے کہ جو زیادہ خسارے میں ہیں اور انسانوں میں سب سے زیادہ بدبخت ہیں۔ لیکن سننے والوں کے احساسِ جستجو کو تحریک دینے کے لیے اس اہم مسئلے پر گفتگو سوائے انداز میں کی گئی ہے۔ رسول اللہ کو علم دیا گیا ہے کہ کہہ دو: کیا ہمیں ان لوگوں کے بارے میں خبر دوں کہ جو لوگوں میں سب سے زیادہ خسارے میں ہیں (قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا)۔

فرمانِ ہی خود جواب دیا گیا ہے تاکہ سننے والا زیادہ دیر تک متحیر نہ رہے۔ زیادہ خسارے میں وہ لوگ ہیں جن کی ساری کوششیں حیاتِ دنیا میں بھٹک کے رہ گئی ہیں مگر پھر بھی ان کا خیال ہے کہ وہ اچھے کام انجام دے رہے ہیں (الَّذِينَ ضَلَّ سَعِيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا)۔

یقیناً نقصانِ صرف یہ نہیں ہے کہ انسان مادی مفادات گنوا بیٹھے بلکہ حقیقی نقصان تو یہ ہے کہ انسان اصل سرمایہ ہی کھودے۔ عقل و ہوش، خدا داد صلاحیتیں، عمر، جوانی اور صحت و سلامتی سے بڑھ کر کون سا سرمایہ ہو سکتا ہے۔ یہی چیزیں ہیں کہ جن کا حاصل انسانی اعمال ہیں اور ہمارے عمل ہماری استعداد اور طاقت کی ایک عجمِ شکل کے ہوتے ہیں۔

جب یہ قوتیں اور صلاحیتیں بے ہودہ اعمال کی شکل اختیار کر لیں تو گویا یہ سب ضائع ہو گئیں اور راہ گم کردہ ہو گئیں۔ یہ بالکل ایسے ہے کہ انسان بہت زیادہ دولت لے کر بازار کو نکلے لیکن اسے راستے میں گنوا دے اور خالی ہاتھ لوٹ آئے۔ البتہ جب انسان سمجھ جائے کہ میں اپنا سرمایہ گنوا بیٹھا ہوں تو نقصان زیادہ خطرناک نہیں کیونکہ یہ نقصان اس کے لیے آئندہ سبق بن جائے گا۔ یہ درس بعض اوقات اس کو بھول جانے والے سرمائے کے برابر ہوتا ہے اور کبھی اس سے بھی زیادہ قیمتی۔ ایسا کہ گویا اس نے کچھ نہیں گنویا۔ لیکن حقیقی اور کسی گنا نقصان اس صورت میں ہے کہ انسان اپنا مادی اور روحانی سرمایہ کسی غلط اور گم راستے پر گنوا دے اور خیال کرے کہ اس نے اچھا کام کیا ہے، وہ اپنے کاموں سے کوئی نتیجہ حاصل کرے، اس نقصان سے کوئی سبق اور نہ ایسے کاموں کے تکرار سے بچے۔

یہ بات لائق توجہ ہے کہ یہاں ”آخرین اعمال“ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں حالانکہ آخرین عملاً ہونا چاہیے تھا (کیونکہ تیز عام طور پر مفرد ہوتی ہے)۔

ہو سکتا ہے یہ تعبیر اس طرف اشارہ ہو کہ وہ ایک ہی بازار عمل میں نقصان کا شکار ہوئے بلکہ ان کا جملہ رعب زندگی کے تمام پہلوؤں اور تمام اعمال میں نقصان کا سبب بنا ہے۔ دوسرے لفظوں میں انسان کسی ایک تجارت میں نقصان کر بیٹھتا ہے اور دوسرے کاروبار میں فائدہ حاصل کر لیتا ہے۔ سال کے آخر میں حساب کرتا ہے تو دیکھتا ہے کہ کوئی زیادہ نقصان نہیں ہوا لیکن بدبختی یہ ہے کہ انسان جہاں بھی سرمایہ کاری کرتا ہے تمام شعبوں میں نقصان اٹھاتا ہے۔

ضمناً ”ضل“ یعنی گم کر بیٹھنا اور بھٹک جانا کی تعبیر اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ انسان کے اعمال بالکل ختم اور نابود نہیں ہو جاتے۔ جیسے مادہ اور توانائی ہمیشہ شکل بدلتے رہتے ہیں ختم نہیں ہوتے لیکن کبھی گم ہو جاتے ہیں۔ ان اعمال کے آثار چونکہ دکھائی نہیں دیتے اور ان سے کسی قسم کا فائدہ حاصل نہیں ہوتا تو یہ گویا گمشدہ سرمایہ ہیں جو ہماری دسترس میں نہیں ہے اور نہ ہمارے کسی کام کا ہے۔

اس سلسلے میں کہ انسان کی نفسیاتی طور پر یہ کیفیت کیوں ہوتی ہے ہم چند اہم نکات کے ذیل میں بات کریں گے۔ اگلی آیات میں اس نقصان اٹھانے والے گردہ کی صفات اور عقائد و نظریات بیان کیے گئے ہیں اور چند ایسی صفات بیان کی گئی ہیں جو تمام بدبختیوں کی جڑ ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے: وہ ایسے لوگ ہیں جو اپنے پروردگار کی آیات کو لٹکارتے ہیں (اولئک الذین کفروا بآیات دہجو)۔

وہ ان آیات سے کفر کرتے ہیں کہ جو آنکھ کو بصارت اور کان کو شنوائی عطا کرتی ہیں، وہ آیات کہ جو غرور کے پردوں کو چاک کر کے حقیقت کا چہرہ انسان کے سامنے نمایاں کر دیتی ہیں۔ مختصر یہ کہ وہ آیات جو نور اور روشنی ہیں اور جو انسان کو ادھام کے غلغلات سے باہر نکال دیتی ہیں اور سر زمین حقانیت پر ہدایت کرتی ہیں آیات الہی سے کفر اختیار کرنے اور خدا کو فراموش کرنے کے بعد وہ لغائے الہی کے بھی منکر ہو گئے

ہیں (ولعاشد)۔

جی ہاں! جب ہمک معاد پر ایمان مبداء پر ایمان کے ساتھ نہ ہو اور انسان یہ احساس نہ کر لے کہ کوئی طاقت اس کے اعمال کی نگران ہے اور سب اس کی عظیم، دقیق اور سخت عدالت میں پیش ہوں گے، وہ اپنے اعمال کی صحیح جانچ پرکھ نہیں کرے گا اور اس کی اصلاح نہیں ہو سکے گی۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: مبداء و معاد اسی انکار اور کفر کی وجہ سے ان کے اعمال اکارت ہو گئے ہیں (فجسط اعمالہم)۔ جیسے ایک تیز رفتار آندھی تھوڑی سی خاکستر کو نابود کر دیتی ہے۔

اور چونکہ ان کا کوئی ایسا عمل نہیں کہ جو ناپ تول کے لائق ہو یا جس کی کوئی اہمیت ہو لہذا ان کیلئے روز قیامت کوئی میزان قائم نہیں کی جائے گی (فلا نقیم لہم یوم القیامۃ وزناً)۔

کیونکہ وزن اور ناپ تول تو وہاں ہوتا ہے جہاں بساط میں کچھ ہو۔ جن کی بساط میں کچھ بھی نہیں ان کیلئے میزان اور ناپ تول کی کیا ضرورت ہے۔

اس کے بعد ان کے اخراجات، بدبختی اور نقصان کا تیسرا حال بیان کیا گیا ہے نیز ان کا کفر و دار بھی بتایا گیا ہے: ارشاد ہوتا ہے: ان کی سزا جہنم ہے، اس لیے کہ وہ کافر ہو گئے ہیں میری آیتوں اور میرے رسولوں کا مذاق اڑاتے ہیں (ذلک جزاؤہم جہنم بما کفروا واتخذوا آیاتی درسی ہزوا)۔ اس طرح انہوں نے نہ صرف عقائد کے بنیادی اصولوں، توحید، نبوت اور قیامت سے کفر اختیار کیا ہے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ان کا مذاق اڑایا ہے۔

ان آیات سے کفار اور ان لوگوں کا کردار و انجام واضح ہو گیا کہ جو زیادہ خسارے میں ہیں۔ اب مومنین اور ان کے انجام کی باری ہے تاکہ دونوں کا موازنہ ہو جائے اور اس طرح صورت حال بالکل واضح ہو جائے۔ قرآن کتنا ہے: وہ لوگ کہ جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کیے باغات فردوس ان کی منزل ہے (ان الذین آمنوا و عملوا الصالحات کانت لہم جنات الفردوس نزلاً)۔

۱۔ ذلک جزاؤہم جہنم کی ترکیب اور جمع بندی کے بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض ”ذلک“ کو مبتدا اور ”جزاؤہم“ کو خبر اور ”جہنم“ کو ”ذلک“ کا بدل سمجھتے ہیں۔

جبکہ بعض دوسرے علماء مبتدا کو محذوف اور ”ذلک“ کو اس کی خبر جانتے ہیں اور ”جزاؤہم جہنم“ کو بھی وہ دوسرا مبتدا خبر سمجھتے ہیں۔ ان کے لحاظ سے تقدیر یوں ہو گا۔

الامر ذلک جزاؤہم جہنم

معاد کہ یوں ہے کہ ان کی جزا جہنم ہے۔

لیکن واضح ہے کہ پہلا بیان زیادہ مناسب ہے۔

جیسا کہ بعض بزرگ مفسرین نے کہا ہے "فردوس ایک ایسا باغ ہے جس میں تمام ضروری نعمتیں جمع ہیں اور اس طرح سے "فردوس" جنت کے بہترین باغوں میں سے ہے، اور کسی نعمت کا کمال بھی ہوگا جب اسے زوال نہ ہو لہذا ساتھ ہی فرمایا گیا ہے "وہ ان باغات بہشت میں سدا رہیں گے (خالدین فیہا)۔ انسان کی طبیعت اگرچہ حدت پسند اور وہ ہمیشہ تنوع، تغیر اور تبدل چاہتا ہے لیکن فردوس کے باقی بھی بھی نقل مکانی اور تبدیلی کی خواہش نہیں کریں گے۔ (لا یغنون عنہا حوالاً)۔ اس بنا پر کہ وہ جو کچھ چاہیں گے وہاں موجود ہے یہاں تک کہ تنوع اور تکال بھی۔ جیسا کہ "چند اہم نکات" کے ذیل میں ہم وضاحت کریں گے۔

چند اہم نکات

۱۔ "اخسرین اعمالاً" کون لوگ ہیں؟ ہم نے اپنی اور دوسروں کی زندگی میں بہت دیکھا ہے کہ کبھی انسان غلط کام انجام دیتا ہے جبکہ وہ سمجھتا رہتا ہے کہ اس نے اچھا اور اہم کام انجام دیا ہے۔ ایسا جہل مرکب غلط فہمی کے لیے بھی ہو سکتا ہے، سال بھر کے لیے بھی اور بھر بھر کے لیے بھی اور واقعاً اس سے بڑی بد بختی کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ ایسے لوگوں کے بارے میں قرآن کتا ہے کہ وہ سب سے زیادہ نقصان میں ہیں تو اس کی وجہ واضح ہے۔ جو لوگ گناہ کے مرکب ہوتے ہیں لیکن یہ جانتے ہیں کہ غلط کام کر رہے ہیں اکثر وہ اپنے غلط کام کی ایک حد مقرر کر لیتے ہیں اور بسا یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ حق کی طرف پلٹ آتے ہیں اور اس کی قربانی کے لیے توبہ کرتے ہیں اور نیک اعمال انجام دیتے ہیں۔ لیکن وہ گنہگار کہ جو اپنے گناہ کو عبادت اور برے اعمال کو صالحات اور نیک کو درست خیال کرتے ہیں وہ نہ صرف قربانی کے لیے کوشش نہیں کرتے بلکہ شدت کے ساتھ اپنے کام کو جاری رکھنے کی سعی کرتے ہیں یہاں تک کہ وہ اپنا تمام سرمایہ وجود اس راستے پر صرف کرنے کے لیے آمادہ ہوتے ہیں۔ قرآن نے ان لوگوں کے بارے میں کیا عمدہ الفاظ کہے ہیں،

اخسرین اعمالاً

جو اعمال کے لحاظ سے سب سے زیادہ خسارے میں ہیں۔

اسلامی روایات میں "اخسرین اعمالاً" کی مختلف تفسیریں آئی ہیں ان میں سے ہر ایک پر بیسیع مفہوم کے کسی واضح مصداق کی طرف اشارہ ہے اور یہ تفسیریں اس کے وسیع مفہوم کو محدود نہیں کر دیتی۔ ابن عربین نہایت نے ایک حدیث امیر المؤمنین علیہ السلام سے روایت کی ہے اس آیت کی تفسیر کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا،

اس سے مراد یہودی اور عیسائی ہیں۔ پہلے یہ لوگ حق پر تھے بعد میں انہوں نے اپنے دین میں بدعتیں ایجاد کر لیں۔ یہ بدعتیں انہیں اخراقی راستے کی طرف لے جاتی ہیں لیکن وہ سمجھتے ہیں کہ ہم نیک کام انجام دے رہے ہیں۔ ایک اور حدیث امام امیر المؤمنین ہی سے منقول ہے کہ مذکورہ بالا گفتگو کے بعد فرمایا: خوارج ہندوان بھی ان سے کوئی زیادہ دور نہیں ہیں۔ ایک اور حدیث میں خاص طور پر رہبانوں (تارک الدنیا مردوں اور عورتوں) اور مسلمانوں میں سے بدعتی گروہوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ بعض روایات میں بتایا گیا ہے کہ ان لوگوں سے مراد امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام کی ولایت کے منکر ہیں۔ راہب ایک مگر گرجے میں طرح طرح کی خردموں کے ساتھ گزرا دیتے ہیں، شادی نہیں کرتے، اچھا لباس اور اچھی غذا ترک کر دیتے ہیں، گرجے میں بیٹھے رہنے کو ہر کام پر ترجیح دیتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ ان کی یہ خردمیاں قرب خدا کا باعث ہیں۔ کیا یہ لوگ "اخسرین اعمالاً" کا مصداق نہیں ہیں۔ کیا ممکن ہے کہ کوئی الہی دین عقل و فطرت کے قانون کے برخلاف انسان کو معاشرتی زندگی سے نکال کر گوشہ نشینی کی دعوت دے اور اس کام کو قرب الہی کا سرچشمہ قرار دے۔ اسی طرح وہ لوگ کہ جنہوں نے اللہ کے دین میں کسی بدعت کی بنیاد رکھی ہے۔ توحید کی جگہ تثلیث کے عقیدے کو دے دی ہے اور اللہ کے بندے حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا قرار دے دیا ہے اور اللہ کے پاک دین میں اسی طرح کی اور بدعتیں داخل کر دیں، اس گمان سے کہ وہ ایک خدمت انجام دے رہے ہیں۔ کیا ایسے لوگ دنیا کے سب سے زیادہ نقصان اٹھانے والے نہیں ہیں۔ ہندوان کے تہی مغز اور عقل دشمن جو سب سے بڑے گناہ (مثلاً حضرت علیؑ اور مسلمانوں کے نیک افراد کو شہید کرنے کو) موجب تقرب خدا سمجھتے تھے، یہاں تک کہ جنت کو صرف اپنے لیے مختص سمجھتے تھے کیا یہ سب سے زیادہ خسارے والے لوگ نہیں ہیں۔ خلاصہ یہ کہ آیت ایسا وسیع مفہوم رکھتی ہے کہ بہت سی گزشتہ، موجودہ اور آئندہ اقوام اس میں شامل ہیں۔

اب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اس خطرناک حالت کا سرچشمہ کیا ہے؟

یقیناً ان غلط خیالات کے اہم ترین عوامل میں شدید تعصب، غرور، ہٹ دھرمی، خود پرستی اور حب ذات شامل ہے۔

کبھی دوسروں کی چال پلوسی، گوشہ نشینی اور اکیلے ہی خود سے فیصلہ کرنا بھی اس منزلت کے پیدا ہونے کا سبب بنتا ہے۔ اس حالت میں انسان کو اپنے تمام اخلاقی اور بُرے اعمال و افکار اچھے لگتے ہیں وہ ان پر احساسِ ندامت کی بجائے احساسِ تفرح کرنے لگتا ہے جیسا کہ ایک اور جگہ قرآن فرماتا ہے:

أَفَمَنْ زُيِّنَ لَهُ سُوءُ عَمَلِهِ فَرَآهُ حَسَنًا

کیا وہ شخص کہ جسے اپنے بُرے عمل چھلے لگتے ہیں اور وہ انہیں اچھا سمجھتا ہے (فاطر - ۸)۔

قرآن حکیم کی بعض دیگر آیتوں میں ان برائیوں کی تہذیب کا عامل شیطان کو قرار دیا گیا ہے اور تسلیم ہے کہ انسانی وجود میں شیطان کا ظہور بُرے اخلاق اور غلط عادات میں۔ قرآن کہتا ہے:

وَإِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَإِنِّي جَارٌ لَّكُمْ

وہ وقت یاد کرو جب شیطان نے مشرکین کے اعمال کو ان کی نظر میں زینت دی اور (جنگِ بدر کے) میدان میں ان سے کہا کہ کوئی شخص تم پر فتح حاصل نہیں کر سکتا اور میں خود اس میدان میں تمہارے ساتھ شریک ہوں۔ (انفال - ۴۸)

قرآن مجید فرعون کے مشرور برج کا واقعہ بیان کر کے کہتا ہے:

وَكَذَّبَتْ ثَمُودُ بِطَغْوَاهُ إِذِ اعْتَكَبَ مَوْجِدَهَا

اس طرح فرعون کو اس کا بُرا عمل اچھا لگا (کہ وہ ایسے احمقانہ اور مضحکہ خیز کاموں کو ذریعہ

اللہ کا مقابلہ کرتا اور گمان کرتا کہ وہ کوئی اہم کام انجام دے رہا ہے)۔ (مومن - ۳۷)

۲۔ لقاء اللہ کیا ہے؟ بعض عالمِ نابینا یہودہ افراد نے اس قسم کی آیات سے یہ مطلب نکالا ہے کہ اللہ کو دوسرے جہان میں دیکھا جاسکتا ہے۔ ان لوگوں نے یہاں لقائے الہی سے حسی ملاقات مراد لی ہے۔

لیکن واضح ہے کہ حسی ملاقات کے لیے جسمِ ضروری ہے اور جسم کے لیے محدود ہونا، محتاج ہونا اور فنا پذیر ہونا ضروری ہے اور ہر مخلوق جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان صفات کا حامل نہیں ہو سکتا۔

لہذا اس میں شک نہیں کہ قرآن حکیم میں جہاں جہاں "ملاقات" اور "لڑیت" کی نسبت اللہ کی طرف دی گئی ہے وہاں ملاقات حسی مراد نہیں ہے بلکہ شہودِ باطنی مراد ہے یعنی قیامت میں انسان آثارِ خداوندی کو ہر زمانے سے زیادہ بہر طور پر دیکھ سکے گا، اسے دل کی آنکھ سے دیکھ سکے گا اور وہاں

اللہ پر اس کا ایمان شہودی ہوگا۔

یہی وجہ ہے کہ آیاتِ قرآن کے مطابق ہٹ دھرم ترین منکرینِ خدا قیامت میں اعتراف کر لیں گے

کیونکہ انہیں انکار کی کوئی راہ سمجھائی نہ دے گی بلکہ

بعض مفسرین نے اس تعبیر کا یہ مفہوم سمجھا ہے کہ وہاں انسان نعمتیں اور جزا و ثواب دیکھے گا اور اسی طرح اللہ کے عذاب و سزا کا مشاہدہ کرے گا۔ انہوں نے درحقیقت نعمت و ثواب و جزا کو مقدم سمجھا ہے۔ یہ دو تفاسیر اگرچہ ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں تاہم پہلی زیادہ واضح معلوم ہوتی ہے۔

۳۔ اعمال کا وزن: اس امر کی ضرورت نہیں کہ اعمال کے وزن کے مسئلے کی قیامت میں تجزیم اعمال کے حوالے سے تفسیر کی جائے اور یہ کہیں کہ قیامت میں انسانی اعمال وزن والے جسم کی صورت اختیار کر لیں گے کیونکہ وزن کرنا "ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے اور اس میں ہر قسم کا اندازہ لگانا اور وزن کرنا شامل ہے مثلاً جن افراد کی کوئی حیثیت نہ ہو انہیں بے وزن یا ہلکے لوگ کہتے ہیں حالانکہ مراد ان کی حیثیت کی نفی ہے نہ کہ ان کے وزن کی۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ زیر بحث آیات میں "اخرین اعمال" کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

روزی قیامت ان کے لیے میزان و ترازو قائم نہیں کیا جائے گا۔

جبکہ ایسی آیات بھی ہیں جو کہتی ہیں:

وَالْوِزْنُ يَوْمَ مِيزَانٍ

اس روز وزن حق ہے۔ (اعراف - ۸)

کیا یہ آیات ایک دوسرے کے منافی ہیں؟ یقیناً نہیں کیونکہ وزن تو ان کے اعمال کا بوجھنوں نے ایسے اعمال کیے ہیں جو وزن کرنے کے قابل ہیں لیکن وہ شخص کہ جس کا سارا وجود اور جس کے انکارِ اعمال ایک کھجی کے پز کے برابر بھی وزن نہیں رکھتے۔ اس کے لیے وزن کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

اسی لیے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ایک مشہور روایت ہے:

انہ لیا فی الرجل العظیم السمین یوم القیامة لا یزین جناح بعوضۃ

روزِ قیامت کچھ موٹے تازے افراد لائے جائیں گے جن کا وزن عدالت میں چھپر کے

پز کے برابر بھی نہیں ہوگا۔

کیونکہ اس جہان میں ان کی شخصیت، اعمال اور افکار سب کھوکھلے ہوں گے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہاں مختلف قسم کے لوگ ہوں گے:

(۱) وہ افراد کہ جن کی نیکیاں اتنی وزنی ہوں گی کہ ان کے وزن اور حساب کی ضرورت نہیں ہوگی۔ یہ

لوگ بغیر حساب کے جنت میں داخل ہوں گے۔

(۱۱) وہ افراد کہ جن کے اعمال بالکل ضبط اور باطل ہو جائیں گے یا پھر جن کے لیے کوئی نیکی ہوگی ہی نہیں کہ جس کے لیے میزان کی ضرورت پڑے۔ یہ لوگ بھی بغیر حساب کے جہنم میں داخل ہو جائیں گے۔ (۱۲) تیسرا گروہ ان افراد کا ہوگا جن کی کچھ نیکیاں ہوں گی اور کچھ بدیاں۔ میزان اور ترازو کی ضرورت ان کے لیے ہوگی اور شاید بیشتر لوگ اسی تیسری قسم میں شامل ہوں گے۔

۴۔ "لا یبغون عنہا حولا" کی تفسیر: "حول" (بروزن "مئل") مصدری معنی رکھتا ہے اس کا معنی ہے "تحول" اور نقل مکانی۔ جیسا کہ ہم نے آیات کی تفسیر میں کہا ہے کہ "فردوس جنت کا ایسا باغ ہے جس میں سب نعمات الہی موجود ہیں اسی بنا پر فردوس اس جہان کی بہترین جگہ ہوگی۔ لہذا اس کے ساکنین وہاں سے نقل مکانی کی ہرگز تمنا نہ کریں گے۔

ہو سکتا ہے سوال کیا جائے کہ پھر تو وہاں کی زندگی کیسایت اور جود کا شکار ہوگی اور یہ خود ایک بہت بڑا عیب ہے۔

ہم جواب میں کہیں گے کہ اس میں کوئی مانع نہیں کہ تحول و تکال کا عمل اسی مقام دائمی پر جاری ہے۔ یعنی تکال و ارتقار کے اسباب وہاں موجود ہوں گے اور انسان نے اس جہان میں جو اعمال انجام دیئے ہیں اور اللہ نے اسے جو اس جہان میں نعمتیں عطا کی ہیں سب ہمیشہ تکال پذیر رہیں گی۔

معلقہ آیات کے ذیل میں انشاء اللہ تکال انسان کے بارے میں ہم تفصیل سے بحث کریں گے نیز بہشت میں تکال کا یہ عمل جاری رہنے سے متعلق گفتگو کریں گے۔

۵۔ فردوس جہنم کا مقام ہے؟ جیسا کہ کہا گیا ہے فردوس جنت میں بہترین اور افضل ترین مقام ہے۔

ذریعہ بحث آیات میں ہم نے پڑھا ہے کہ فردوس با ایمان اور اعمال صالح انجام دینے والے لوگوں کا ٹھکانا ہے اور اگر ایسا ہے تو پھر سوال پیدا ہوگا کہ کیا جنت کے دوسرے علاقوں میں رہنے والا کوئی نہیں ہوگا کیونکہ غیر مومن تو جنت میں جا ہی نہیں سکتا۔

اس سوال کے جواب میں کہا جاسکتا ہے کہ ذریعہ نظر آیات ہر اس شخص کی طرف اشارہ نہیں کر رہیں کہ جو با ایمان ہے اور نیک کام کرتا ہے بلکہ ایمان اور عمل صالح کے لحاظ سے جو افراد بلند درجے پر فائز ہوں گے وہی فردوس میں داخل ہو سکیں گے۔ ظاہر آیت اگرچہ مطلق ہے لیکن فردوس کے مفہوم کی طرف توجہ کی جائے تو آیت کا مفہوم متعین و محدود ہو جاتا ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ اصل میں یہ لفظ دو زبان سے لیا گیا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ یہ جنت کی زبان سے عربی میں منتقل ہوا ہے (تفسیر فرازی اور تفسیر مجمع البیان)۔

اسی لیے سورہ مومنین میں جہاں فردوس کے وارثوں کی صفات بیان کی گئی ہیں وہاں مومنین کی نہایت اعلیٰ صفات کا ذکر ہے اور یہ صفات سب میں نہیں ہوتیں۔ یہ امر خود اس بات کے لیے قرینہ ہے کہ فردوس میں رہنے والے افراد ایمان اور عمل صالح کے علاوہ ممتاز صفات کے حامل ہوں گے۔ اسی بنا پر ایک حدیث کہ جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہم پہلے نقل کر چکے ہیں، اُس میں ہم نے پڑھا ہے کہ آپ فرماتے ہیں:

جب اللہ سے جنت کا تقاضا کرو تو خصوصیت سے فردوس کا تقاضا کرو کہ جو جنت کی جامع ترین اور اکمل ترین منزلوں میں سے ہے۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ با ایمان افراد کی ہمت ہر چیز کے بارے میں اور ہر حالت میں عالی ہونا چاہیئے یہاں تک کہ بہشت کی تمنا میں بھی نچلے مراحل پر قناعت نہیں کرنا چاہیئے اگرچہ نچلے مرحلے بھی نعمات الہی سے معمور ہیں۔

یہ بات واضح ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے اس قسم کا تقاضا کرتا ہے تو ضروری ہے کہ اپنے آپ کو ایسے مقام تک پہنچانے کے لیے تیار رہی کرے، بہترین انسانی صفات اپنائے اور صالح ترین اعمال سرانجام دے۔

لہذا جو لوگ کہتے ہیں کہ اللہ کرے ہمیں جنت میں ٹھکانا مل جائے چاہے نچلے درجے میں ہی ہو وہ سچے مومنین کی اعلیٰ ہمت سے پوری طرح بہرہ ور نہیں ہیں۔

قُلْ لَوْ كَانَ الْبَحْرُ مَدَادًا لَكَلِمَتِ رَبِّي لَنَفَذَ الْبَحْرُ قَبْلَ
 أَنْ تَنْفَذَ كَلِمَتُ رَبِّي وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهِ مَدَدًا ○
 قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ أَنَّمَا إِلَهُكُمُ إِلَهُ
 وَاحِدٌ ۖ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا
 وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا ○

ترجمہ

۱۰۹ کہہ دو: سمندر میرے پروردگار کے کلمات (لکھنے کے لیے) سیاہی بن جائیں تو سمندر ختم ہو جائیں گے میرے پروردگار کے کلمات ختم نہیں ہوں گے اگرچہ ایسے ہی (سمندر) ان کے ساتھ اور بڑھا دیئے جائیں۔

۱۱۰ کہہ دو: میں تو تم جیسا بشر ہوں (البتہ میری خصوصیت یہ ہے کہ) مجھ پر وحی نازل ہوتی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی ہے۔ پس جو شخص اپنے رب کے ملاقات کی امید رکھتا ہے اسے چاہیے کہ عمل صالح انجام دے اور کسی کو اپنے رب کی عبادت میں شریک نہ کرے۔

شان نزول

اس آیت کی شان نزول کے بارے میں ابن عباس سے منقول ہے:

یودیوں نے جب پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے یہ آیت سنی:

ما اوتیت من العلم الا قليلاً
 تمہیں تو تمہارا اس علم دیا گیا ہے۔

تو انہوں نے کہا یہ بات کیونکر صحیح ہو سکتی ہے جبکہ ہمیں تورات دی گئی ہے اور جسے تورات دی گئی ہے اس کے پاس غیر کثیر ہے اس وقت یہ (مندرجہ بالا پہلی) آیت نازل ہوئی (اور بتایا کہ ہمارے پاس جو علم ہے وہ اللہ کے لامتناہی علم کے مقابلے میں ناچیز ہے)۔
 بعض کہتے ہیں کہ یہودیوں نے پیغمبر اسلام سے کہا:

خدا نے تجھے حکمت دی ہے۔ ومن یؤت الحکمة فقد اوتی خیرا کثیرا (اور جسے حکمت دی گئی ہے اُسے تو غیر کثیر مل گیا) لیکن جب ہم تجھ سے روح کے بارے میں پوچھتے ہیں تو تو ہم سے جواب دیتا ہے۔

اس پر یہ آیت نازل ہوئی (اور اس نے نشاندہی کی ہے کہ انسان کے پاس جتنا بھی علم ہو اللہ کے ناپیدا کان علم کے مقابلے میں ناچیز ہے)۔

تفسیر

جولقائے الہی کی امید رکھتے ہیں

یہ آیات مستقل اور جاری بحث کا حصہ ہیں اور ان کا تعلق اس سورت کے تمام مباحث سے ہے۔ کیونکہ اس سورہ میں مذکورہ تینوں اہم واقعات نئے اور عجیب و غریب مطالب سے پردہ ہٹاتے ہیں۔ گویا قرآن ان آیات میں یہ کہنا چاہتا ہے کہ خدا کے علم کے مقابلے میں اصحاب کف، مومن و فاجر اور ذوالقرنین کے واقعات سے آگاہی کوئی اہمیت نہیں رکھتی کیونکہ تمام کائنات اور عالم ہستی کا ماضی، حال اور مستقبل اس کے علم کا حصہ ہیں۔

بہر حال قرآن زیر بحث پہلی آیت میں رسول اکرم سے کہتا ہے: کہہ دو: اگر سمندر میرے رب کے کلمات لکھنے کے لیے سیاہی بن جائیں تو سمندر ختم ہو جائیں گے میرے رب کے کلمات ختم نہیں ہوں گے اگرچہ ہم ان جیسے سمندروں کا اضافہ بھی کر دیں (قل لو کان البحر مدادا لکلما تری ربی لنفد البحر قبل ان تنفد کلمات ربی ولوجئنا بمثلہ مددا)۔

”مداد“ سیاہی کے معنی میں ہے یا پھر اس کا معنی ہے وہ رنگین مادہ جس کے ساتھ لکھا جائے۔ دراصل یہ لفظ ”مد“ بمعنی کشش سے لیا گیا ہے کیونکہ اس کی کشش سے خطوط آشکار اور واضح ہوتے ہیں۔

ترجمہ: ۱۰۹ ص ۱۱۰ اور مش ۱۱۰ زیر بحث آیت کے ذیل میں اور تفسیر صافی سورہ بن اسرائیل آیہ ۱۰۹ کے ذیل میں۔

طہرین راوی نے ”مداد“ کے مفہوم کے بارے میں ایک اور معنی بھی نقل کیا ہے اور وہ ہے ”ایسا تیل جو چرخ میں ڈالتے ہیں اور روشنی کا سبب بنتا ہے“ خورشید معلوم ہوتا ہے کہ دونوں معانی کی بنیاد ایک ہی ہے۔

”کلمات“ (کلمہ کی جمع) ان الفاظ کے معنی میں ہے کہ جن کے ذریعے بات کی جاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ وہ لفظ ہے جو معنی پر دلالت کرتا ہے۔ اس جہان کی ہر چیز کیونکہ پروردگار کے علم و قدرت پر دلالت کرتی ہے لہذا بعض اوقات ہر موجود پر ”کلمۃ اللہ“ کا اطلاق ہوتا ہے۔ زیادہ تر یہ تعبیر اہم اور با عظمت موجودات کے لیے استعمال ہوتی ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں قرآن حکیم کہتا ہے:

إِشْمَاعِيلَ يُعِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ رُسُولُ اللَّهِ وَكَلِمَتُهُ أَلْقَاهَا فِي مَرْيَمَ
عیسیٰ اللہ کا کلمہ تھا کہ جو مریم کی طرف القاء کیا گیا۔ (نساء: ۱۷۱)

زیر بحث آیت میں بھی ”کلمہ“ اسی معنی میں ہے یعنی جہان ہستی کے موجودات کی طرف اشارہ ہے کہ جن میں سے ہر ایک پروردگار کی گوناگوں صفات کی حکایت کرتا ہے۔
در اصل اس آیت میں قرآن اس حقیقت کی طرف توجہ دلاتا ہے کہ یہ گمان نہ کرو کہ عالم ہستی ہی کچھ ہے جو تم دیکھ رہے ہو یا جانتے ہو یا محسوس کرتے ہو بلکہ یہ کائنات اس قدر وسیع و عظیم ہے کہ اگر تمام مہذبہ سیاحی بن جائیں اور اس سے ان موجودات کے نام، صفات اور خصوصیات لکھیں تو سمندر ختم ہو جائیں گے لیکن جہان ہستی کے موجودات کا احصاء و شمار نہیں ہو پائے گا۔

اس نکتے کی طرف بھی توجہ ضروری ہے کہ ”البحر“ یہاں جنس کا مفہوم رکھتا ہے۔ اسی طرح ”ولو جئنا بمثله ممدداً“ میں لفظ ”مثل“ بھی جنس کا معنی دیتا ہے یہ اس طرف اشارہ ہے کہ اگر سمندروں کی مثل و مانند کا اضافہ بھی کر دیا جائے تو بھی کلمات الہی ختم نہیں ہوں گے۔ اسی بنا پر زیر بحث آیت سورہ لقمان کی اس سے ملتی جلتی آیت سے کوئی تضاد نہیں رکھتی۔ سورہ لقمان کی وہ آیت یہ ہے:

وَلَوْ أَنَّ مَا فِي الْأَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ أَقْلَامٌ وَالْبَحْرُ يَمْدُ مِنْ بَعْدِهِ سَبْعَةُ أَبْحُرٍ
مَا نَفِدَتْ كَلِمَاتُ اللَّهِ

روئے زمین کے سب درخت قلمیں بن جائیں اور سمندر اور ان کے علاوہ سات سمندر اور سیاحی بن جائیں (تاکہ کلمات الہی کو لکھ سکیں) تو اس کے کلمات ہرگز ختم نہیں ہوں گے (لقمان: ۲۷)۔

یعنی یہ قلمیں گھس جائیں گی اور ان سیاحیوں کا آخری قطرہ تک ختم ہو جائے گا لیکن جہان ہستی کے اسرار و حقائق ابھی باقی ہوں گے۔

ایک اہم بات کہ جس کی طرف اس مقام پر توجہ ضروری ہے یہ ہے کہ زیر بحث آیت ماضی حال اور مستقبل کے لحاظ سے جہان ہستی کی وسعت کی غماز ہونے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کے لاعلمی علم کی بھی ترجمان ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ وہ تمام چیزیں جو عالم ہستی کی وسعت میں تھیں، یا اس وقت

ہیں اللہ تعالیٰ ان کا علم احاطہ رکھتا ہے بلکہ اس کا علم چونکہ حضوری علم ہے اس لیے ان موجودات سے جدا نہیں ہو سکتا (غور کیجئے)۔

دوسرے لفظوں میں کہا جاسکتا ہے کہ اگر زمین کے تمام سمندر سیاحی بن جائیں اور تمام درخت قلمیں بن جائیں تو ہرگز اس پر قادر نہیں کہ جو کچھ اللہ کے علم میں ہے اسے رقم کر سکیں۔

لامتناہی کی تصویر کشی

اس مقام پر قرآن مجید نے لامتناہی تعداد کا تصور، اللہ کے علم سے پائیاں کا مفہوم اور جہان ہستی کی وسعت کو ہمارے افکار و اذہان سے قریب کرنے کے لیے بہت ہی فصیح و بلیغ انداز اختیار کیا ہے اور زندہ و جاندار اعداد سے استفادہ کیا ہے۔
لیکن کیا اعداد بھی زندہ اور مردہ ہوتے ہیں؟

جی ہاں! وہ اعداد جو ریاضیات میں استعمال ہوتے ہیں صحیح اعداد کی دائیں طرف بہت سارے صفر لگا کر جو اعداد بنتے ہیں درحقیقت مردہ اعداد ہیں۔ وہ ہرگز کسی چیز کی عظمت مجسم نہیں کرتے۔ جن لوگوں کا ریاضیات سے تعلق ہے وہ جانتے ہیں اگر ایک کے دائیں طرف ایک کلومیٹر تک صفر لگا دیئے جائیں تو یہ بہت بڑا اور پریشان کن عدد بن جائے گا اور واقعاً اس کی بڑائی کا تصور مشکل ہے لیکن کن اشخاص کے لیے؟۔ ریاضی دانوں کے لیے۔ جبکہ عام لوگوں کے لیے اس سے کوئی عظمت مجسم نہیں ہوتی۔

زندہ عدد وہ ہے جو جہاں تک خود آگے بڑھے ہماری فکر کو بھی اپنے ساتھ لے جائے اور جس طرح کی حقیقت ہے اسے اسی طرح نظروں کے سامنے مجسم کر دے۔ ایسا عدد زندہ ہے جو روح رکھتا ہو، عظمت رکھتا ہو اور زبان رکھتا ہو۔

قرآن یہ نہیں کہتا کہ عالم ہستی کی وسعت میں خدا کی مخلوقات اس عدد سے بھی زیادہ ہیں کہ جس کی دائیں طرف ایک سو کلومیٹر تک صفر لگے ہوں بلکہ قرآن کہتا ہے کہ اگر روئے زمین کے تمام درخت قلم بن جائیں اور تمام سمندر سیاحی بن جائیں تو قلمیں ختم ہو جائیں گی اور سیاحی تمام ہو جائے گی لیکن عالم ہستی کے حقائق و اسرار، موجودات عالم اور معلومات الہی ختم نہیں ہوں گی۔

خوب غور کیجئے۔ ایک قلم لکھنے کی کس قدر طاقت رکھتا ہے۔ پھر غور کیجئے۔ ایک درخت کی ایک پوٹی سی شاخ سے کتنے قلم بنتے ہیں۔ پھر ایک تو مند بہت بڑے درخت سے کتنے ہزار یا کتنے لاکھ قلم بن سکتے ہیں۔ پھر روئے زمین پر باغوں اور جنگلوں میں موجود سارے درختوں پر ایک نظر ڈالیے اور ان سے قلم تیار ہو سکتے ہیں۔ ان کا اندازہ کیجئے۔

اب سوچئے سیما ہی کے ایک قطرے سے کتنے لفظ لکھے جاسکتے ہیں پھر اس عدد کو ایک تالاب کے قطروں سے ضرب دیجئے۔ اسی طرح ایک دریا، ایک سمندر کا حساب کیجئے اور آخر کار دوسرے زمین کے تمام دریاؤں اور سمندروں کے قطروں کا اندازہ کیجئے۔ اب دیکھئے کیسا عجیب و غریب عدد بنتا ہے۔ اس بات کی عظمت اور بھی واضح ہوگی جب ہم اس حقیقت کی طرف توجہ دیں کہ "سبح" (سات) کا عدد یہاں تعداد کے لیے نہیں بلکہ تکثیر کے مفہوم میں آیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بہت سے دریا اور سمندر اور بھی آملیں اور سیما ہی بن جائیں تو بھی کلمات الہی ختم نہیں ہوں گے۔ غور کیجئے کہ یہ عدد کس قدر زندہ اور جاندار ہے۔ یہ وہ عدد ہے جو فکر انسانی کو اپنے ساتھ ساتھ لیے چلتا ہے اور لامتناہی عدد کی طرف آگے لے جاتا ہے۔

یہ ایسا عدد ہے کہ ریاضی دان ہو یا کوئی اُن پڑھ۔ اس کی عظمت کا ادراک کر سکتا ہے اور اس کی وسعت اور بڑائی سے آشنا ہو سکتا ہے۔

جی ہاں! علم خدا اس عدد سے بھی بالاتر ہے۔

اس کا علم۔ لامحدود اور بے انتہا ہے۔

ایسا علم کہ جس کی قلمرو۔ تمام عالم هستی ہے۔ اس میں تاریخ عالم کا ماضی بھی ہے اور مستقبل بھی اور اس میں تمام اسرار و حقائق موجود ہیں۔

زیر نظر دوسری آیت سورہ کہف کی آخری آیت ہے۔ یہ دینی عقائد کے بنیادی اصولوں کا مجموعہ ہے۔ اس میں توحید، رسالت، پیغمبر اور معاد سب کا ذکر موجود ہے۔ درحقیقت سورہ کہف کی ابتدا بھی اسی سے ہوئی تھی۔ ابتدا میں بھی اللہ، وحی، عمل کی جزاء اور قیامت کے بارے میں گفتگو تھی۔ اس سورت کا اہم حصہ چونکہ انہی تین موضوعات پر مشتمل ہے اس لحاظ سے یہ آخری آیت اس سورت کا خلاصہ ہے۔

نبوت کے بارے میں پوری تاریخ انسانی میں بہت غلو اور مبالغہ ہوا ہے اس لیے قرآن کہتا ہے: کہ دو آدمی تو تم جیسا ایک بشر ہوں۔ میرا امتیاز اور خصوصیت صرف یہ ہے کہ مجھ پر وحی آئی ہے (قل انما انا بشر مثلكم یوحی الی)۔

یہ کہہ کر قرآن نے ان تمام مشرکانہ خیالی امتیازات پر خط بطلان کھینچ دیا ہے کہ جو انبیاء کو مرسلہ بشریت سے مرسلہ الوہیت کی طرف لے جاتے ہیں۔

اس کے بعد جن مسائل کی انبیاء پر وحی ہوتی ہے ان میں سے مسئلہ توحید کی نشاندہی کی گئی ہے: پر وحی ہوتی ہے کہ تمہارا معبود صرف ایک ہے (انما الہکم اللہ واحد)۔

صرف اسی مسئلہ کی طرف اشارہ کیوں کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ توحید تمام عقائد اور انسانوں کے تمام سعادت بخش انفرادی و اجتماعی پروگراموں کا پتھر ہے۔

ہم نے ایک اور جگہ بھی کہا ہے کہ توحید فقط اصول دین میں سے ایک اصل ہی نہیں بلکہ اسلام کے تمام اصول و فروع کی روح ہے۔

اگر دینی تعلیمات کو موتیوں کی لڑی کہا جائے تو توحید کو وہ دھاگا کہیں گے جو ان موتیوں کو باہم ملا رکھتا ہے۔ لہذا کہنا چاہیے کہ توحید وہ روح ہے جو اس پیکر اسلام میں چھوٹی گئی ہے۔

معاد و نبوت کی بحثوں میں یہ حقیقت ثابت ہو چکی ہے کہ یہ مسائل توحید سے جدا نہیں ہیں یعنی اگر اللہ کو ہم اس کی صفات کے ساتھ پہچان لیں تو پھر ہم جان لیتے ہیں کہ ایسے خدا کو نبی بھیجنے چاہئیں نیز اس کی حکمت و عدالت کا تقاضا ہے کہ کوئی عدالت پر پا ہو اور قیامت وجود پذیر ہو۔

اجتماعی مسائل، پورا انسانی معاشرہ اور جو کچھ اس سے مربوط ہے اسے توحید و وحدت کے سائے میں ہونا چاہیے تاکہ وہ اپنے لوازمات سے آراستہ ہو سکے۔

یہی وجہ ہے کہ احادیث میں ہے کہ:

«لا الہ الا اللہ» پر دروگاہ کا حکم قلعہ ہے جو شخص اس میں داخل ہو گیا وہ عذاب

الہی سے مامون ہو گیا۔

نیز ہم سب نے سن رکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ابتدائے اسلام میں فرماتے تھے:

«تولوا لا الہ الا اللہ تفلحوا»

اگر فلاح کے طالب ہو تو پرچم توحید کے تلے جمع ہو جاؤ۔

اس آیت کا تیسرا جملہ مسئلہ قیامت کی طرف اشارہ کرتا ہے اور "فار قریح" کے ذریعے اسے مسئلہ توحید سے منسلک کر دیتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: لہذا جو شخص بھی اپنے رب کی لقاء کا امیدوار ہے اسے چاہیے کہ عمل صالح انجام دے (فعن کان یرجو لقاء ربہ فلیعمل عملاً صالحاً)۔

لقائے پروردگار دراصل اس کی ذات پاک کا باطنی مشاہدہ ہے۔ یہ دل کی آنکھ اور داخلی بصیرت سے ہوتا ہے۔ اگرچہ اس دنیا میں بھی حقیقی توحید کے لیے یہ ممکن ہے لیکن یہ معاملہ چنگ نہ بہت روشن، زیادہ واضح ہو کر عموماً اختیار کر لے گا لہذا قرآن میں یہ تعبیر زیادہ تر روز قیامت کے بارے میں استعمال ہوتی ہے۔

دوسری طرف یہ امر فطری ہے کہ اگر انسان محسوس کے انتظار میں ہے اور اسے اس کی امید ہو تو وہ اس کے استقبال کے لیے اپنے آپ کو تیار کرے گا۔

جو شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ میں فلاں چیز کے انتظار میں ہوں لیکن اس کے عمل میں اس کا اثر نہ ہو تو اس کا دعویٰ غلط ہے۔ اسی لیے "فلیعمل عملاً صالحاً"۔

یہاں صیغہ امر آیا ہے۔ وہ امر کہ جو لقاء الہی کی امید اور انتظار کا لازمہ ہے۔

آخری جملے میں عمل صالح کی حقیقت کو مختصر طور پر اس طرح واضح کیا گیا ہے: کسی کو پروردگار کی عبادت

میں شریک نہیں کرنا چاہیے (ولایشرك بعبادة ربہ احداً)۔

زیادہ واضح غفلتوں میں۔ جب تک عمل میں خلوص پیدا نہ ہو وہ صالح نہیں ہو سکتا اور الہی اور خدائی رنگ اختیار نہیں کر سکتا۔ خلوص انسانی عمل کو گہرائی بخشتا ہے، نورانیت عطا کرتا ہے اور صحیح سمت دیتا ہے اور خلوص ختم ہو جائے تو عمل زیادہ تر ظاہری پہلو اختیار کر لیتا ہے اور اس کا جھکاؤ ذاتی مفاد کی طرف ہو جاتا ہے۔ ایسا عمل گہرائی اور صحیح سمت کھو بیٹھتا ہے۔

درحقیقت وہ عمل صالح جس کا سرچشمہ رضائے الہی ہو اور جو اخلاص گوندھا ہوا ہو وہ لغائے الہی کا پاسپورٹ ہے۔

جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے کہ عمل صالح وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ اس میں تمام انفرادی و اجتماعی مفید، اصلاحی اور تعمیری کام شامل ہیں چاہے وہ زندگی کے کسی پہلو سے متعلق ہوں۔

اخلاص یا عمل صالح کی رُوح

اسلامی روایات میں "نیت" کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ اسلام کا یہ بنیادی اصول ہے کہ وہ ہر عمل کو اس کی نیت اور مقصد کے ساتھ قبول کرتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مشہور حدیث ہے:

لا عمل الا بالنیۃ

نیت کے بغیر کوئی عمل نہیں۔

یہ حدیث اسی حقیقت کی ترجمان ہے۔

نیت کے بعد اخلاص کی باری آتی ہے۔ اگر وہ ہو تو عمل بہت اہمیت اور قیمت رکھتا ہے ورنہ اس کی کوئی قدر و قیمت نہ ہوگی۔

اخلاص یہ ہے کہ محرک انسان ہر قسم کے غیر الہی شائبہ سے پاک ہو اور اسے توحید نیت کہتے ہیں یعنی کام میں صرف رضائے الہی کو ملحوظ رکھا جائے۔

یہ بات لائق توجہ ہے کہ زیر بحث آیت کی شان نزول کے بارے میں منقول ہے:

ایک شخص رسول اللہ (م) کی خدمت میں آیا۔ اس نے عرض کی: یا رسول اللہ! میں راہِ خدا میں خرچ کرتا ہوں، صلہ رحمی کرتا ہوں اور یہ اعمال صرف اللہ کے لیے بجا لاتا ہوں لیکن جب لوگ میرے ان اعمال کے بارے میں بات کرتے ہیں اور ان کی تعریف کرتے ہیں تو مجھے

خوشی ہوتی ہے۔ میرے یہ اعمال کیسے ہیں؟

رسول اللہ خاموش رہے اور کچھ نہ کہا یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی جس میں اس

شخص کے سوال کا جواب دیا گیا (کہ صرف وہ عمل مقبول بارگاہِ الہی ہو گا کہ جو اخلاص کامل کے ساتھ بجا لایا جائے گا)۔

اس میں شک نہیں کہ یہ روایت غیر اختیاری مسرت کی نفی نہیں کرتی بلکہ اس کا تقاضا ہے کہ لوگوں کی طرف سے کسی کام کی تعریف اس کے کرنے کا سبب نہ ہو۔

اسلام میں اخلاص عمل خالص اتنی اہمیت رکھتا ہے کہ ایک حدیث میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

من اخلص لله اربعین یوماً فجر الله ینا بیع الحکمة من قلبه علی لسانہ

جو شخص چالیس دن اپنے اعمال خالص اللہ کے لیے انجام دے تو اللہ اس کے دل سے اس کی زبان پر حکمت و دانش کے چشمے جاری کر دے گا۔

✽ ✽ ✽

پروردگار! تمام اعمال میں ہماری نیت کو اس طرح سے خالص کر دے کہ ہم تیرے علاوہ کسی کے لیے نہ سوچیں اور تیرے علاوہ کسی کے لیے قدم نہ اٹھائیں۔

اور اگر تیرے علاوہ کسی کو چاہیں تو وہ بھی تیری رضا کے لیے ہو اور اس لیے ہو کہ اس کا تجھ سے تعلق ہے۔

آمین یا رب العالمین

سورہ کھف کی تفسیر

اختتام کو پہنچی
محکم جہادی الشان ۱۴۰۲ ہجری قمری
بمطابق ۷ فروردین ۱۳۹۱ ہجری شمسی

مجمع البیان، مذکورہ بالا آیت کے ذیل میں نیز تفسیر قرطبی، اسی آیت کے ذیل میں۔

سفینۃ البحار، ج ۱ صفحہ ۳۰۔

اس سورہ کے مضامین

یہ سورہ مضامین کے لحاظ سے چند اہم حصوں کی حامل ہے :-

- ۱۔ اس سورہ کا اہم ترین حصہ جناب زکریا، حضرت مریم، حضرت عیسیٰ، حضرت یحییٰ اور توحید کے میر و حضرت ابراہیم اور ان کے فرزند حضرت اسماعیل، حضرت ادریس اور خداداد تعالیٰ کے بعض دوسرے بزرگ انبیاء کے کچھ حالات پر مشتمل ہے کہ جو خاص تربیتی نکات کا حامل ہے۔
- ۲۔ اس سورہ کا دوسرا حصہ کہ جو پہلے حصہ کے بعد سب سے اہم ہے وہ قیامت سے مربوط مسائل اور دوبارہ اٹھائے جانے کی کیفیت مجرموں کی سزا، پرستار گاہوں کی جزا اور اسی قسم کے دوسرے مسائل کے ساتھ مربوط ہے۔
- ۳۔ ایک اور حصہ مواظف و نصاب کا ہے کہ جو فی الحقیقت گزشتہ حصوں کی تکمیل کرتا ہے۔
- ۴۔ آخری حصہ قرآن، خداداد تعالیٰ سے اولاد کی نفی اور مسئلہ شفاعت سے مربوط اشارے ہیں کہ جو مجموعی طور پر نفوس انسانی کو ایمان، پاکیزگی اور تقویٰ کی طرف راہنمائی کے لیے ایک منظر تربیتی پروگرام پر مشتمل ہے۔

اس سورہ کی فضیلت

پیغمبر اکرمؐ سے اس طرح نقل ہوا ہے کہ :-

جو شخص اس سورہ کو پڑھے اُسے ان اشخاص کی تعداد کے برابر کچھوں نے زکریا کی تصدیق یا تکذیب کی ہے اور اسی طرح سے یحییٰ، مریم، عیسیٰ، موسیٰ، ہارون، ابراہیم، اسمعیل، یعقوب اور اسمعیل (کی تصدیق یا تکذیب کی ہے) ان میں سے ہر ایک کی تعداد سے دس گنا نیکیاں خداداد تعالیٰ اس کے نامہ اعمال میں درج کر دے گا۔ اسی طرح ان اشخاص کی تعداد کہ جو (محیوث اور ہست طور پر) خدا کے لیے اولاد کے قائل ہوئے ہیں اور ان اشخاص کی تعداد کہ جو خدا کے لیے اولاد کے قائل نہیں ہوئے سے دس گنا نیکیاں عطا کرے گا۔

حقیقت میں یہ حدیث دو مختلف خطوط میں حقیق اور کوشش کرنے کی دعوت دے رہی ہے۔ ان میں سے ایک انبیاء، مصومین اور نیک لوگوں کی حمایت کا خط ہے اور دوسرا مشرکین، مغربین اور گمراہوں کے خلاف قیام کرنے کا راستہ ہے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ یہ اتنے عظیم ثواب ان لوگوں کو نہیں دیتے جتنے اللہ - مع انبیاء و ذلیل آیت -

سُورَةُ مَرْيَمَ

① مکہ میں نازل ہوئی

② اس کی ۹۸ آیات ہیں

کہ جو صرف الفاظ کو پڑھ لیں اور اس کے مطابق عمل نہ کریں بلکہ یہ مقدس الفاظ تو عمل کے لیے ایک مقدمہ اور تہیہ ہیں۔
ایک دوسری حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے :-

جو شخص اس سورہ کو مسلسل پڑھتا رہے وہ اس دنیا سے نہیں جائے گا مگر یہ کہ خداوند تعالیٰ اس سورہ کی برکت سے اُسے جان و مال اور اولاد کے لحاظ سے بے نیاز کر دے گا۔

یہ غنا اور بے نیازی انسان کے اس سورہ کے معانی کو جان و دل سے اپنانے کا نتیجہ ہے اور یہ دراصل اس کے معانی میں جو اس کے اعمال و گفتار کے اندر منکس ہو رہے ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

۱۔ کَہْلِیْعَصَّ

۲۔ ذِکْرُ رَحْمَتِ رَبِّکَ عَبْدُہُ زَکَرِیَّا

۳۔ اِذْ نَادٰی رَبَّہُ نِدَآءً خَفِیًّا

۴۔ قَالَ رَبِّ اِنِّیْ وَہْنُ الْعِظْمِ مَیِّیْ وَاشْتَغَلَ الرَّاسُ شِیْبًا وَلَمْ اَکُنْ بِدُعَاۃِکَ رَبِّ شَقِیًّا

۵۔ وَاِنِّیْ خِفْتُ الْمَوَالِیْ مِنْ قُرْآئِیْ وَكَانَتْ اُمْرَآئِیْ عَاقِرَافْہَبٍ لِّیْ مِنْ لَّدُنْکَ وَلِیًّا

۶۔ یٰرَبِّیْ نِیْثِیْ وَیَرِثُ مِنْیْ اِلٰی یَعْقُوبَ وَاَجْعَلْہُ رَبِّ رَضِیًّا

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان درحیم ہے۔

۱۔ کَہْلِیْعَصَّ

۲۔ یہ تیرے پروردگار کی رحمت کی اس کے بندے زکریا کے بارے میں ایک یاد ہے۔

۳۔ اُس وقت جبکہ اُس نے (عبادت کی) غفلت گاہ میں اپنے پروردگار کو پکارا۔

۴۔ اُس نے کہا پروردگار! میری ہڈیاں کمزور ہو گئی ہیں اور بڑھاپے کے شعلے نے میرے تمام سر کو گھیر لیا ہے اور میں تجھ سے دعا کرتا کہ میری عمر میں بھی عافیت ہو۔

۵۔ اور میں اپنے بعد اپنے رشتہ داروں سے خوفزدہ ہوں (کہ وہ تیرے دین کی پاسداری کا حق ادا نہیں کریں گے) اور میری بیوی بچہ ہے پس تو اپنی قدرت سے مجھے جانشین عطا فرما۔

۶۔ کہ جو میرا بھی وارث ہو اور اہل یعقوب کا بھی وارث بنے اور اس کو تو اپنی رضا و پسندیدگی سے نواز۔

تفسیر

حضرت زکریا کی پُر اثر دعا :

پھر ایک دفعہ اس سورہ کی ابتدا میں ہمیں حروف مقطعه کا سامنا ہے "کَافٍ يٰعِصٰی" اور چونکہ ہم سابقہ قرآن کی تین مختلف سورتوں (سورہ بقرہ، آل عمران اور اعراف) کی ابتدا میں ان حروف مقطعه کے بارے میں تفصیل کے ساتھ بحث کر چکے ہیں لہذا ہم یہاں پر تکرار کی ضرورت نہیں سمجھتے۔

جس بیان کی اس مقام پر ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ اسلامی منابع و مصادر میں اس سورہ کے حروف مقطعه کے بارے میں دو قسم کی روایات نظر آتی ہیں۔ پہلی روایات تو وہ ہیں کہ جو ان حروف مقطعه میں سے ہر ایک کو خداوند تعالیٰ کے عظیم اسماء حسنی میں سے ایک اسم کی طرف اشارہ قرار دیتی ہیں "کاف" اشارہ ہے "کافی" کی طرف کہ جو خداوند تعالیٰ کا ایک عظیم نام ہے اور "ھ" اشارہ ہے "ھاوی" کی طرف اور "یاء" اشارہ ہے "ولی" اور "عین" اشارہ ہے "عالم" کی طرف اور "ص" اشارہ ہے "صادق الوعد" (وہ جو اپنے وعدہ کا پتہ ہے) کی طرف ہے۔

دوسری قسم ان روایات کی ہے کہ جو ان حروف مقطعه کی کربلا میں امام حسینؑ کے قیام کی داستان کے ساتھ تفسیر کرتی ہیں یا ان کے مطابق "کاف" اشارہ ہے "کربلا" کی طرف "ھاء" اشارہ ہے خاندانِ پیغمبر کے ہلاک اور شہید ہونے کی طرف اور "یا" "یزید کی طرف اور "عین" "سلطنت (پس) کی طرف اور "ص" امام حسینؑ اور ان کے جاننا یار و انصار کے "صبر" و استقامت کی طرف۔

البتہ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں قرآن مجید کی آیات مختلف معانی کی حامل ہو سکتی ہیں اور بعض اوقات گزشتہ اور آئندہ کے معانی بیان کرتی ہیں کہ جو متنوع ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے اختلاف نہیں رکھتے جبکہ اگر معنی کو ایک تفسیر میں مندرج کر دیں تو ہو سکتا ہے کہ ہم آیت کی وضاحت نہ کر سکیں اور اس کے نمانے کے لحاظ سے کئی ایک اشکالات میں گرفتار ہو جائیں۔

حروف مقطعه کے ذکر کے بعد سب سے پہلی بات حضرت زکریا کی داستان سے شروع ہوتی ہے۔ خدا فرماتا ہے :- یہ باوجود اس رحمت کی جو تیرے پروردگار نے اپنے بندے زکریا پر کی (ذکر رحمۃ ربک عبیدہ زکریا) تیرے اس وقت جبکہ وہ کوئی فرزند نہ ہونے کی وجہ سے سخت پریشان اور غمناک تھے تو انہوں نے درگاہِ خدا کی طرف رخ کیا، اس وقت غلوت گاہیں اور دہان پر کہ جہاں کوئی ان کی آواز نہیں سن رہا تھا اپنے پروردگار کو پکارا اور اس سے دعا کی (اذ نادى ربہ عند الخفیۃ)۔

"اس نے کہا پروردگار! میری بیویاں جو میرے جسم کا ستون اور میرے بدن کے محکم ترین اعضاء ہیں، مگر وہ بے گھر ہیں (قال رب انی وھن العقم مفعول) اور بڑھاپے کے شعلوں نے میرے سر کے تمام بالوں کو گھیر لیا ہے (واشعل الرأس شیباً) بڑھاپے کے آثار کو ایسے شعلے سے تشبیہ دینا کہ جو

۱۔ تفسیر نمونہ جلد سورہ ہود کی ابتدا اور دوسری جلد سورہ آل عمران کی ابتدا اور جلد ۳ سورہ اعراف کی ابتدا کی طرف رجوع فرمائیں۔

۲۔ زراعتین جلد ۲ ص ۲۲۰۔

۳۔ در حقیقت لفظ ذکر معذوف بہت نام کی خبر ہے اور تقدیر اس کی اس طرح ہے :-

"هذا ذکر رحمۃ ربک"۔

تمام سر کو گھیر لے ایک جاذبِ نظر اور عمدہ تشبیہ ہے۔ کیونکہ ایک طرف تو آگ کے شعلے کی خاصیت یہ ہے کہ وہ جلدی پھیل جاتا ہے اور جگہ جگہ اس کے اطراف میں بڑا سے گھیر لیتا ہے اور دوسری طرف آگ کے شعلے ایک خاص قسم کی روشنی اور چمک کے حامل ہوتے ہیں اور دور سے توجہ مبذول کر لیتے ہیں اور میری طرف جس وقت آگ کسی جگہ کو گھیرتی ہے تو جو چیز اس سے باقی رہ جاتی ہے وہ یہی خاکستری ہوتی ہے۔

حضرت زکریاؑ نے بڑھاپے کے گھیر لینے اور سر کے تمام بالوں کی سفیدی کو آگ کے شعلہ درہونے اور اس کے چمکنے اور سفید خاکستری کو اس کی جگہ پر پانی رہنے کے ساتھ تشبیہ دی ہے اور یہ تشبیہ بہت ہی رسا اور زیبا تشبیہ ہے۔

اس کے بعد مزید کہتے ہیں :- پروردگار! میں ہرگز ان دعاؤں میں جو میں نے تیری بارگاہ میں کہی تھیں محروم نہیں ہونا، و لعل اکن بعد عایدک رتاً۔ گزشتہ زمانے میں تو نے مجھے ہمیشہ دعاؤں کی عبادت و قبولیت کا عادی بنایا ہے اور کہیں مجھے محروم نہیں کیا۔ اب جبکہ میں بڑھاپا اور ناتوان ہوں گیا ہوں تو اب اور بھی زیادہ اس بات کا حقدار ہوں کہ تو میری دعا قبول فرمائے اور مجھے ناسید نہ ہلائے۔

حقیقت میں "شفاعت" یہاں پر تعجب اور رنج و تکلیف کے معنی میں ہے۔ یعنی میں کہیں اپنی درخواستوں میں تجھ سے زحمت و مشقت نہیں پڑا، کیونکہ وہ بہت جلد تیری بارگاہ میں قبول ہو جایا کرتی تھیں۔

اس کے بعد اپنی حاجت کی اس طرح تشریح کرتے ہیں: پروردگار! میں اپنے بعد اپنے عزیز و اقارب سے غمزدہ ہوں، ہو سکتا ہے وہ فقر و فساد سے اپنے ہاتھ آلودہ کریں، اور میری بیوی بچہ ہے، تو اپنی طرف سے مجھے ولی اور یارِ شائین بخش دے۔

(وانی خفت الموالی من ورائی وکانت امواتی عاقراً فخب لی من لدنک ولیاً)۔

ایسا یارِ شائین کہ جو میرا بھی وارث بنے اور اسی طرح آل یعقوب کا بھی وارث ہو۔ پروردگار! میرے اس یارِ شائین کو اپنا پسندیدہ بنا۔

(یرشخی ویرث من آل یعقوب واجعلہ رب رضیاً)۔

چند نکات :

۱۔ یہاں میراث کیا مراد ہے؟ مفسرین اسلام نے اس سوال کے بارے میں بہت بحث کی ہے۔ ایک گروہ کا یہ نظریہ ہے کہ یہاں ارث سے مراد مال کی میراث ہے، اور ایک گروہ اسے مقامِ نبوت کی طرف اشارہ سمجھتا ہے۔

بعض نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ اس سے ایک ایسا جامع معنی مراد ہے جس میں دونوں معانی شامل ہیں۔

بہت سے شیعہ علماء نے پہلے معنی کو انتخاب کیا ہے جبکہ علماء اہل سنت کی ایک جماعت نے دوسرے معنی کو، اور بعض نے بیباک یہ کہ یہ قطب نے فی ظلال میں اور آلوسی نے "روح المعانی" میں تیسرے معنی کو انتخاب کیا ہے۔

جن لوگوں نے اسے ارثِ مال میں مندرج کیا ہے۔ انہوں نے یہ معنی ملا لینے میں لفظ "ارث" کے ظاہر سے استناد کیا ہے۔ کیونکہ یہ لفظ جب تک دوسرے قرائن سے خالی ہو تو ارثِ مال ہی کے معنی دیتا ہے اور اگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ قرآن کی چند ایک آیات میں یہ لفظ معنوی امور میں استعمال ہوا ہے۔ تو یہ

عالمی مقرر قرآن کی بنا پر ہے؛ مثلاً سورہ فاطر کی آیہ ۲۲ :-

ثم اورثنا الكتاب الذین اصطفینا من عبادنا

ہم نے آسمانی کتاب کو اپنے برگزیدہ بندوں کی طرف بطور ارث منتقل کیا ہے ؛

علاوہ ازیں چند ایک روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس نسل نے بنی اسرائیل بہت سے دلیا اور ندیں "اجار" (علماء یہود کے لیے لائے تھے) حضرت زکریاؑ اجار کے سردار تھے۔

اس سے بھی بڑھ کر یہ ہے کہ حضرت زکریاؑ کی زوجہ جو کہ حضرت سلیمان بن داؤدؑ کی اولاد میں سے تھیں، حضرت سلیمان اور داؤدؑ کی مالی حیثیت کو بہ نظر رکھتے ہوئے، انہوں نے بہت سے اموال میراث میں پائے تھے۔

حضرت زکریاؑ اس بات سے غور فرماتے، کہ مہادیہ مال غیر صالح، مطلب پرست، فخریہ اندوز یا فاسق و فاجر افراد کے ہاتھ میں پہنچ جائیں اور وہ معاشرے میں بُرائی کی ترویج کریں۔ لہذا اپنے پروردگار سے صالح اور نیک بیٹے کی درخواست کی تاکہ وہ اُن اموال کی نگہبانی کرے اور انہیں بہترین طریقہ سے خرچ کرے۔

وہ مشہور روایت، کہ جو پیغمبر اسلامؐ کی پاک بیٹی جناب فاطمہ زہراؑ سے مذکور لینے کے سلسلے میں، خلیفہ اولؓ کے سامنے، اس آیت سے استدلال کے واسطے میں نقل ہوئی ہے، خود اس دعوے کی ایک شاہد ہے۔

مروم طبری کتاب احتجاج میں بانوئے اسلام حضرت فاطمہ زہراؑ سے اس طرح نقل کرتے ہیں کہ : جس وقت خلیفہ اولؓ نے ذک کو جناب فاطمہ سے چھین لینے کا مصمم ارادہ کر لیا اور یہ خبر اس بی بی محسنؑ کو آپ اس کے پاس آئیں اور اس طرح فرمایا : اے ابابکر !

افکتاب اللہ ان توث اباک ولا ارث ابی لقد جئت شیئا فریئا ؟ افعلی عمد

تو کتب کتاب اللہ و نبذ تمسوه و راء ظہور ککو ؟ اذ یقول فیما اقتص

من خبہ یحییٰ بن زکریاؑ اذ قال رب ہب لی من لدنک ولیا یرثنی و یرث من الی بعدی

"کیا یہ بات کتاب خدا میں لکھی ہوئی ہے کہ تو اپنے باپ کی میراث پائے اور میں اپنے باپ کی میراث

نہوں یہ تو عجیب و غریب چیز ہے۔ کیا تم لوگوں نے جان بوجھ کر کتاب خدا کو چھوڑ دیا ہے اور اسے

اپس پشت ڈال دیا ہے ؟ جبکہ وہ یحییٰ بن زکریاؑ کے قصہ میں کہتا ہے کہ "ذکر لائے کما کہ خداوند! تو مجھے

اپنی طرف سے جانشین عطا فرما تاکہ وہ میرا اور آل یعقوب کا وارث بنے جو

لیکن وہ لوگ کہ جن کا یہ نظریہ ہے کہ یہاں پر وہی معنوی مراد ہے تو انہوں نے ایسے قرآن سے، کہ جو خود آیت میں یا اس سے باہر ہیں تک کیلئے مثلاً :-

۱۔ یہ کہ یہ بات بعید نظر آتی ہے کہ حضرت زکریاؑ عظیم پیغمبر اس سن و سال میں اپنی ثروت کے وارثوں کے بارے میں اس قدر فکر مند نہ ہوں خصوصاً جبکہ "یرثنی و یرث من الی بعدی" کے جملے کے ذکر کرنے کے بعد اس جملہ کا اضافہ کرتے ہیں (والجملہ رب رضیاً)

"خداوند! اُسے اپنا پسندیدہ بنا" اس میں شک نہیں کہ یہ جملہ اس وارث کی معنوی صفات کی طرف اشارہ ہے۔

۲۔ آئندہ آیات میں جہاں خداوند تعالیٰ انہیں یحییٰ کے پیدا ہونے کی بشارت دیتا ہے وہاں عظیم معنوی مقامات کے متعلق تمام نصوص قرآن کے لیے

۱۔ قرآن تفسیریں، جلد ۳، ص ۳۲۳-۳۲۴

۲۔ قرآن تفسیریں، جلد ۳، ص ۳۲۳-۳۲۴

ذکر کرتا ہے۔

۳۔ سورہ آل عمران کی آیہ ۳۹ میں جبکہ خداوند تعالیٰ زکریاؑ کی طرف سے فرزند کے قلعہ کی تشریح میں یہ اشارہ کرتا ہے کہ وہ اس وقت اس سوچ میں پڑے کہ جب انہوں نے جناب مریمؑ کے مقامات اور مراتب کا مشاہدہ کیا کہ پروردگار کے لطف و کرم سے جنت کے کھانے اور پل ان کی محراب عبادت پر آجاتے تھے۔

هنا لک دعا زکریا ربہ قال رب ہب لی من لدنک ذریۃ طیبۃ انک سمیع الدعاء

۴۔ چند ایک احادیث میں پیغمبر اکرمؐ سے ایک مطلب نقل ہوا ہے جو اس بات کی تائید کرتا ہے کہ میراث یہاں معنوی پہلو کی طرف اشارہ ہے۔ اس حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ امام صادقؑ پیغمبر اکرمؐ سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ بن مریمؑ ایک ایسی قبر کے نزدیک سے گزرے کہ جس میں ہر شخص عذاب میں گرفتار تھا۔

اگلے سال بھی آپ کا گزر وہاں سے ہوا تو آپ نے ملاحظہ کیا کہ وہ صاحب قبر عذاب میں مبتلا نہیں ہے۔ تو انہوں نے اپنے پروردگار سے اس بارے میں سوال کیا تو ان کی طرف خداوند تعالیٰ کی طرف سے وحی ہوئی کہ صاحب قبر کا ایک نیک بیٹا تھا اُس نے ایک راستہ درست کیا تھا اور ایک تیسرے کو پتہ دی تھی خداوند تعالیٰ نے اسے اس کے بیٹے کے عمل کی وجہ سے بخش دیا ہے۔ اس کے بعد پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا :

خداوند تعالیٰ کی اس کے سون بندے کے لیے میراث یہ ہے کہ اسے ایسا بیٹا دے کہ جو اُس کے بعد حکم خدا

کا مطیع و فرمانبردار ہو۔

اس کے بعد حضرت امام صادقؑ نے اس حدیث کے نقل کرنے کے موقع پر حضرت زکریاؑ سے متعلق آیت کی تلاوت فرمائی :

ہب لی من لدنک ولیا یرثنی و یرث من الی بعدی و اجعلہ رب رضیاً

اور اگر یہ کہا جائے کہ لفظ ارث کا ظاہری معنی دہی میراث اموال ہے تو وہ جواب میں کہیں گے کہ یہ ظاہری معنی قطعی و یقینی نہیں ہے کیونکہ قرآن میں بارہا معنوی ارث میں استعمال ہوا ہے (مثلاً سورہ فاطر کی آیہ ۳۲ اور سورہ مؤمن کی آیہ ۵۳)۔

علاوہ ازیں اگر فرض کریں کہ خلافت ظاہر جو تو قرآن بالا کے ہوتے ہوئے کوئی مشکل باقی نہیں رہتی۔

لیکن پہلے نظریے والے استدلال کا جواب دے سکتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ کے یہ عظیم پیغمبر اموال کے بارے میں ذاتی غرض سے پریشان نہ تھے بلکہ اسے معاشرے کے لیے بُرائی کا مٹنے نہیں دینا چاہتے تھے ان کی غرض یہ تھی کہ یہ صلاح و درست کے راستے میں استعمال ہو کر نیکو بیٹا کو اُپر بیان کیا جا سکے، کہ (بنی اسرائیل) اجار و عدا کے لیے بہت زیادہ ہدیہ اور ندیں لائے تھے کہ جو حضرت زکریاؑ کے سپرد ہوئی تھیں اور شاید بہت سے اموال کی بیوی کی طرف سے بھی کہ جو حضرت سلیمان بن داؤدؑ کی اولاد میں سے تھی باقی رہ گئے تھے، اب یہ بات صاف طور پر واضح ہے کہ ان (اموال) کے اُپر ایک غیر صالح شخص کا ہونا عظیم مناسد کا سبب ہوتا۔ اور یہی چیز تھی کہ جس نے حضرت زکریاؑ کو پریشان کر رکھا تھا۔

باقی رہیں حضرت یحییٰ کے لیے معنوی صفات کہ جو اس آیت میں اور دوسری آیات قرآن میں ذکر ہوئی ہیں، وہ نہ صرف یہ کہ اس بات کے منافی نہیں بلکہ اس سے ہم آہنگ بھی ہیں۔ کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ یہ عظیم ثروت ایک مرد خدا پرست اور برگزیدہ الہی کے ہاتھ میں جائے اور وہ اس سے معاشرے کو سعادت دہ پر چلانے کے لیے استفادہ کرے۔

۱۔ قرآن تفسیریں، جلد ۳، ص ۳۲۳-۳۲۴

لیکن ہمارے نظریے کے مطابق اگر ہم اوپر کی مجموعی بحث سے یہ نتیجہ نکالیں کہ لفظ "ارث" یہاں پر وسیع مفہوم رکھتا ہے کہ جس میں ارث اسٹالین اور مقامات معنوی کی میراث بھی تو یہ کوئی غلط بات نہیں ہوگی۔ کیونکہ ہر طرف کے لیے قرآن موجود ہیں اور قبل و بعد کی آیات اور تمام تر روایات کی طرف توجہ کرنے سے یہ نتیجہ بالکل طور پر صحیح مفہوم کے قریب نظر آتی ہے۔

باقی رہا (انی خفت الموالی من وراثی) "مجھے اپنے بعد اپنے رشتہ داروں کا ڈر ہے کہ جلد تو وہ دونوں معانی کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے کیونکہ اگر فاسد اور بے لوگ ان امرا میں صاحب اختیار ہو جائے تو واقعتاً یہ پریشان کرنے والی بات تھی۔ اور اگر ہمیری و ہدایت غیر صالح افراد کے ہاتھ جا پڑتی تو بہت ہی پریشان اور مصیبت کا سبب بنتی۔ اس بنا پر حضرت زکریا کا خوف دونوں صورتوں میں قابل توجہ ہے۔

بالخصوص اسلام حضرت فاطمہ زہرا کی مشہور حدیث بھی اس معنی کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔

۲۔ اذ نادى ربه نداء خفياً کا مفہوم: اس جملہ میں مفسرین کے لیے یہ سوال سامنے آیا ہے کہ "نادی" بلند آواز سے دعا کرنے کے معنی میں ہے جبکہ "خفی" آہستہ و خفی کے معنی میں ہے اور یہ دونوں ایک دوسرے سے ہم آہنگ نہیں ہیں لیکن اس نکتے کی طرف توجہ کرنے سے کہ "خفی" آہستہ کے معنی میں نہیں ہے بلکہ پوشیدہ اور خفی کے معنی میں ہے۔ اس بنا پر یہ بات ممکن ہے کہ حضرت زکریا نے اپنی خلوت گاہ میں کہ جہاں ان کے علاوہ کوئی دوسرا موجود نہیں تھا خداوند تعالیٰ کو بلند آواز میں پکارا جو۔ بعض نے کہا ہے کہ ان کی یہ درخواست رات کی تاریکی اور سبب شب میں تھی کہ جس وقت لوگ خواب غفلت میں آرام کر رہے تھے۔

نیز بعض نے (فخرج علی قومہ من المحراب) "زکریا اپنی محراب سے نکل کر اپنی قوم کے پاس آئے" کے جملہ کو، کہ جو آئندہ کی لکات میں آئے گا اس دعا کے غلط گاہ میں ہونے کی دلیل قرار دیا ہے۔

۳۔ ویرث من آل یعقوب کا مطلب: "مجھے ایسا فرزند عنایت کر جو آل یعقوب کا وارث بنے،" کا جملہ اس بنا پر ہے کہ زکریا کی بیوی حضرت عیسیٰ کی والدہ جناب مریم کی خالہ تھیں اور اس قانون کا نسب حضرت یعقوب تک پہنچتا تھا، کیونکہ وہ حضرت سلیمان بن داؤد کی اولاد میں سے تھیں جو "یہودا" فرزند یعقوب کی اولاد میں سے تھے۔

۴۔ یزکریا انا نبشرك بِعِلْمِ اسْمِهِ یحییٰ لَوْ جَعَلْهُ مِنْ قَبْلُ سَمِیًّا

۸۔ قَالَ رَبِّ اَنۡی یَکُونُ لِی غُلَامٌ وَکَانَ اِمْرًا قَرِیۡۤا وَقَدْ بَلَغْتُ

مِنَ الْکِبَرِ عَتِیًّا

۹۔ قَالَ کَذٰلَکَ قَالَ رَبُّکَ هُوَ عَلٰی هَمِّیۡنٍ وَقَدْ خَلَقْتُکَ مِنْ قَبْلُ وَاَنتَ شَیْءٌ

لَوۡ تَکُ شَیْءًا

۱۔ تفسیر طبری جلد ۶ ذیل یہ محل بحث۔

۲۔ تفسیر البیان جلد ۱۳ ذیل آیت۔

۳۔ تفسیر البیان جلد ۶ ذیل آیت۔

۱۔ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّیۡ اٰیَةً ؕ قَالَ اٰیَتُکَ اَلَا تَکْفُوۡنَ اَلَّا تَسْـَٔلُوۡا ثَلٰثَ لَیَالٍ سَوِیًّا

۱۱۔ فَخَرَجَ عَلٰی قَوْمِہٖ مِنَ الْمِحْرَابِ فَاُوْحٰی اِلَیْہِمَا اَنْ سَبِّحُوۡا بُکْرَۃً وَّاَعِشِیَّا

ترجمہ

۷۔ اے زکریا! ہم تجھے ایک لڑکے کی بشارت دیتے ہیں کہ جس کا نام یحییٰ ہے۔ ہم نے اس سے پہلے کوئی لڑکا اس کا ہم نام قرار نہیں دیا۔
۸۔ اُس نے کہا پروردگار! میرے لڑکا کیسے ہوگا جبکہ میری بیوی بالکل بے رحم اور میں بھی بہت زیادہ بڑھاپے کو پہنچ چکا ہوں۔
۹۔ فرمایا: اسی طرح تیرے پروردگار نے کہا ہے (اور ارادہ کیا ہے) یہ میرے لیے آسان ہے اور میں نے تجھے پہلے غفلت کیا تھا جبکہ تو کوئی چیز نہیں تھا۔

۱۰۔ عرض کیا پروردگار! میرے لیے کوئی نشانی قرار دے۔ کہ تیری نشانی یہ ہے کہ تو تین شبانہ روز لوگوں سے بات نہیں کرے گا (جبکہ تیری زبان سالم ہے)۔

۱۱۔ وہ اپنی محراب عبادت سے لوگوں کی طرف نکلا اور اشارہ کے ساتھ انہیں کہا کہ اس نعمت کے شکرانے کے طور پر صبح شام خدا کی تسبیح کرو۔

تفسیر

زکریا کی آرزو پوری ہو گئی :

یہ آیات حضرت زکریا کی دعا کی بارگاہ پروردگار میں قبولیت کی بیان کر رہی ہیں یہ ایسی استجاب و قبولیت تھی جو اس کے منہوس لطف و عنایت سے تھی فرمایا گیا ہے : اے زکریا! ہم تجھے ایک فرزند کی بشارت دیتے ہیں کہ جس کا نام یحییٰ ہے، ایسا لڑکا کہ جس کا پہلے کوئی ہم نام نہیں ہوا۔
یہ آیت انا نبشرك بِعِلْمِ اسْمِهِ یحییٰ لَوْ جَعَلْهُ مِنْ قَبْلُ سَمِیًّا۔

کس قدر عجب اور عمدہ چیز ہے کہ خداوند تعالیٰ اپنے بند کی دعا اس طرح قبول کرے، اور بشارت دے کہ اس کی دعا کے نتیجے سے اُسے لڑکے کی فراغت کے جواب میں ایک بیٹا عنایت کرے اور اس کا نام بھی خود ہی رکھ دے۔ اور مزید کہ یہ فرزند کئی جہات سے مفرد ہے اور اس سے

میکونکہ (لَوْ جَعَلْهُ مِنْ قَبْلُ سَمِیًّا) کا جملہ اگرچہ ظاہراً اس معنی میں ہے کہ اب تک کوئی اس کا ہم نام نہیں تھا۔ لیکن چونکہ بعض نام حقیقت کی دلیل نہیں ہے۔ لہذا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اسم مستثنیٰ کی طرف اشارہ ہے یعنی اس جیسی امتیازی خصوصیات کا حامل اس سے پہلے کوئی نہیں بنے۔ مفردات میں مراحت کے ساتھ یہ معنی بیان کیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ حضرت یحییٰ سے پہلے بہت سے بزرگ پیغمبر گزرے ہیں جو ان سے بالاتر اور افضل تھے۔ لیکن اس بات میں کوئی امر مان نہیں ہے کہ یحییٰ کو چھائی امتیازی خصوصیات رکھتے ہوں کہ جو انہیں کے ساتھ مخصوص ہوں۔ جیسا کہ بعد میں اس کی طرف اشارہ ہوگا۔

لیکن حضرت زکریاؑ جو کہ ایسے مطلوب تک پہنچنے کے لیے ظاہری اسباب کو کارآمد نہیں سمجھتے تھے لہذا انہوں نے بارگاہِ پروردگار میں وضاحت کا تقاضا کیا۔ انہوں نے کہا پروردگار! یہ کیسے ممکن ہے کہ مجھے کوئی بیٹا نصیب ہو۔ جبکہ میری بیوی بانجھ ہے اور میں بھی سن و سال کے لحاظ سے اس حد کو پہنچ گیا ہوں (قال رب انی یسکون لی غلام وکانتم امرأتی عاقراً وقد بلغت من الكبر عتیا)۔

”عاقراً“ اصل میں عقر کے مادہ سے بڑا اور بیاؤ کے معنی میں یا جس بیوی بند ہو جانے کے معنی میں ہے اور یہ جو بانجھ عورتوں کو ”عاقراً“ کہتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اولاد کے قابل نہیں رہی ہو تو یہ یا یہ کہ ان کے بچہ کی پیدائش بند ہو گئی ہوگی۔

”عتی“ اس شخص کو کہتے ہیں کہ زیادہ عمر ہو جانے کے سبب سے جن کا بدن خشک ہو گیا ہو۔ وہی حالت جو بہت زیادہ سن مدیدہ ہونے کی وجہ سے انسان میں پیدا ہو جاتی ہے۔

لیکن بہت جلدی حضرت زکریاؑ کو ان کے سوال کے جواب میں بارگاہِ خداوندی سے یہ پیغام مل گیا ”فرایا: معاملہ اسی طرح ہے کہ جیسا تیرے پردہ گار نے کہا ہے اور یہ میرے لیے آسان بات ہے (قال کذلک قال ربک هو علیٰ ہین)۔ یہ مسئلہ کوئی عجیب و غریب نہیں ہے کہ تجھ جیسے بزرگ مرد اور ظاہر بانجھ بیوی سے بچہ پیدا ہو اور میں نے تجھے پہلے پیدا کیا تھا جبکہ تو کچھ بھی نہیں تھا۔

(وقد خلقناک من قبل و لست ک شئیاً)۔

وہ خدا جو یہ قدرت و توانائی رکھتا ہے کہ بغیر کسی چیز کے تمام چیزوں کو پیدا کرے یہ کوئی تعجب کی بات ہے کہ اس سن و سال میں امدان حالات میں تجھے فرزند عنایت کر دے۔

اس میں شک نہیں ہے کہ پہلی آیت میں بشارت دینے والا اور کلام کرنے والا خداوند عالم ہے۔ لیکن یہ کہ تیسری زیر بحث آیت (قال کذلک قال ربک) میں گفتگو کرنے والا کون ہے۔ بعض اسے فرشتوں کی گفتگو سمجھتے ہیں کہ جو زکریاؑ کو بشارت دیتے کا ذریعہ بنے تھے اور سورہ آل عمران کی آیت ۳۹ کر اس کا گواہ سمجھا جاسکتا ہے۔

فنادتہ الملائکۃ وھو قاضی یصل فی المحراب ان اللہ یشیرک بیتی
فرشتوں نے زکریاؑ کو نواہی جبکہ وہ محراب میں کھڑے ہوئے تھے اور مشغول نماز تھے کہ خدا تجھے بیتی کی بشارت دیتا ہے۔

لیکن ظاہر یہ ہے کہ ان تمام جملوں کا کہنے والا خدا ہے اور کوئی دلیل ایسی نہیں ہے کہ ہم اس کے ظاہر کے خلاف معنی کریں۔ اگر فرشتے بشارت دینے کے واسطے تھے تو بیتی کوئی امر مان نہیں ہے کہ خداوند تعالیٰ اصل پیغام کو اپنی طرف نسبت دے، خصوصاً جبکہ ہم اسی سورہ آل عمران کی آیت ۲۰ میں یہ پڑھتے ہیں
قال کذلک اللہ یفعل ما یشاء
خدا اسی طرح سے جو کچھ چاہتا ہے انجام دیتا ہے۔

مشرقی کے درمیان مشہور یہ ہے کہ ”کذلک“ کا جملہ تفسیر میں (الامر کذلک) تھا یعنی طلب اسی طرح ہے۔ یہ احتمال بھی ہے کہ کذلک کا تعلق بعد والے جملے کے ساتھ ہو اور اس کا مندرجہ یہ ہو کہ اس طرح تیرے پردہ گار نے کہا ہے۔

بہر حال حضرت زکریاؑ بہت ہی مسرور ہوئے، فرمایا میں نے ان کے سراپا کو گمیر لیا، لیکن یہ پیغام ان کی نظر میں بہت ہی اہم اور ان کے مستقبل گردش کرنے والا تھا، لہذا خداوند تعالیٰ سے اس کام کے لیے کسی نشانی کا تقاضا کیا اور کہا پروردگار! میرے لیے کوئی نشانی قرار دے۔ (قال رب اجعل لی آیۃ)۔

اس میں شک نہیں کہ حضرت زکریاؑ خداوندی وعدہ پر ایمان رکھتے تھے اور وہ بالکل مطمئن تھے۔ لیکن جس طرح حضرت ابراہیمؑ نے جو معاد پر ایمان کامل رکھتے تھے زیادہ سے زیادہ اطمینان قلب کی خاطر اسی زندگی میں مہمان کی صورت کا مشاہدہ کرنے کا تقاضا کیا تھا، اسی طرح زکریاؑ نے بھی زیادہ سے زیادہ حصول اطمینان کے لیے اس قسم کی نشانی کا تقاضا کیا تھا۔

خداوند تعالیٰ نے فرمایا: تمہاری نشانی یہ ہے کہ باوجود اس کے کہ تمہاری زبان صبح و سہم ہے۔ تم مکمل تین دن رات لوگوں سے گفتگو نہیں کر سکو گے اور تمہاری زبان صرف ذکر خدا اور اس سے مناجات کر کے گی (قال آیتنا ان لا تکلم الناس ثلاث لیلال سویتاً)۔

لیکن یہ کتنی عجیب و غریب نشانی تھی۔ یہ ایک ایسی نشانی تھی کہ جو ایک طرف تو اس کی مناجات و دعا کے ساتھ ہم آہنگ تھی اور دوسری طرف اس کو تمام مخلوق سے منقطع کر رہی تھی اور خدا کے ساتھ اس کا تعلق قائم کر رہی تھی تاکہ اس حال میں اس ظہیر نعمت کا شکر بجالائے اور اسے زیادہ سے زیادہ خداوند تعالیٰ کی حمد و ثنا پر آمادہ کرے۔

یہ ایک واضح اور آشکار نشانی ہے کہ انسان صبح و سہم زبان رکھتے ہوئے اور پردہ گار کے ساتھ ہر قسم کی مناجات و حمد و ثنا کرنے کی طاقت رکھنے کے باوجود لوگوں سے بات کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو۔

اس بشارت اور اس واضح نشانی کے بعد حضرت زکریاؑ اپنی محراب عبادت سے لوگوں کے پاس آئے اور انہیں انعام کے ساتھ اسی طرح کہا: صبح شام خدا کا شکر کرو (فخرج علی قومہ من المحراب فاوحی الیہم ان سبحو بکرة و عشیاً)۔

کیونکہ وہ عظیم نعمت جو خداوند تعالیٰ نے زکریاؑ کو عطا فرمائی تھی اس کی وسعت پوری قوم کے لیے تھی اور ان سب کے مستقبل پر اثر انداز ہونے والی تھی۔ اسی بنا پر اس لائق تھی کہ اس نعمت کے شکر کرنے میں سب کے سب خداوند تعالیٰ کی شکر کے لیے اٹھ کھڑے ہوں اور خداوند تعالیٰ کی حمد و ثنا کریں۔ اس سے بھی بڑھ کر بات یہ ہے کہ عیساؑ جو ایک مجروحہ تھی افزا و بھر کے دلوں میں ایمان کی جڑیں راسخ کر سکتی تھی۔ یہ بھی ایک اور نعمت تھی۔

چند نکات :

۱۔ حقیقی، حقیقی، حقیقی میں سرشار پیغمبر: حضرت یحییٰ کا نام سورہ آل عمران، انعام، مرم اور انبیاء میں مجموعی طور پر پانچ مرتبہ آیا ہے۔ وہ اللہ کے ایک عظیم پیغمبر تھے اور ان کی خصوصیات میں سے ایک یہ تھی کہ وہ ہمہ گیر میں تمام نبوت پر فائز ہوئے۔ خداوند تعالیٰ نے انہیں اس سب سے مخلص کر دیے اور ان کی تابناک فہم و فراست عطا فرمائی کہ وہ اس عظیم منصب کو قبول کرنے کے لائق قرار پائے۔

۲۔ پیغمبر کی امتیازی خصوصیات میں سے ایک کے بارے میں قرآن نے سورہ آل عمران کی آیت ۳۹ میں اشارہ کیا ہے، اور ان کی ”صورہ کے ساتھ“ (مرتبہ) ہے۔ جیسا کہ ہم نے اسی آیت کے ذیل میں بیان کیا ہے کہ ”صورہ“: ”صورہ کے مادہ سے اس شخص کے معنی ہیں کہ جو کسی جہت سے بزرگ رہے، اور اس مقام پر بعض روایات کے مطابق شادی سے اجتناب کرنے کے معنی میں ہے۔

یہ کام ان کے لیے اس معاملہ سے امتیاز تھا کہ یہ ان کی انتہائی عفت و پاکیزگی کو بیان کرتا ہے یا وہ زندگی کے مخصوص حالات کی بنا پر دین الہی کی تبلیغ کھیلے متعدد سفر پر جانے پر مجبور تھے اور حضرت عیسیٰ مسیح کی طرح مجبور زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے۔

یہ تفسیر بھی ممکن ہے کہ اس آیت میں "حصہ" سے مراد وہ شخص ہے کہ جس نے دنیاوی خواہشات اور ہوا و ہوس کو ترک کر دیا ہو اور درحقیقت یہ نبی کا ایک اعلیٰ درجہ ہو۔

بہر حال مناجات اسلامی اور مناجات مسیحی سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یحییٰ حضرت عیسیٰ کی مثال کے بیٹے تھے۔

مناجات مسیحی میں تصریح ہوتی ہے، کہ حضرت یحییٰ نے حضرت عیسیٰ کو غسل تعمید دیا اور اسی لیے انہیں "بہی" تعمید و ہندہ "کے نام سے پکارتے ہیں۔ غسل تعمید ایک مخصوص غسل ہے کہ جو عیسائی اپنے بیٹوں کو دیتے ہیں اور ان کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ اُسے گناہ سے پاک کرتا ہے، اور جب حضرت یحییٰ نے اعلان نبوت کیا تو حضرت یحییٰ ان پر ایمان لائے۔

اس میں شک نہیں کہ حضرت یحییٰ کوئی خاص آسمانی کتاب نہیں رکھتے تھے اور یہ جو بعد کی آیات میں ہم پڑھتے ہیں۔

يَا يَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ

اے یحییٰ! کتاب کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ لو۔

یہ حضرت موسیٰ کی کتاب قرأت کی طرف اشارہ ہے۔

اہمیت کچھ لوگ حضرت یحییٰ کے پیرو ہیں وہ ان کی طرف ایک کتاب کی نسبت بھی دیتے ہیں اور شاید "مصحف مہین" حضرت یحییٰ کے پیرو ہیں۔ حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ میں بعض چیزیں قدر مشترک تھیں۔ انتہائی زیادہ زہد و تقویٰ، مذکورہ بالا اسباب کی بنا پر ترک ازدواج، مجبوراً طور پر بیکار

اور اسی طرح بہت ہی زیادہ قریبی نسب۔

اسلامی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امام حسین اور حضرت یحییٰ میں بھی بعض باتیں مشترک تھیں، لہذا امام علی بن الحسین زین العابدین سے اس طرح نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا:

خرجنا مع الحسين بن علي (ع) فما نزل منزلاً ولا رحل منه الا ذكر يحيى بن

زكريا و قتله، وقال ومن هوان الدنيا على الله ان لا يسبح في ذكره احد على ابي من بغايا بني اسرائيل

ہم امام حسین کے ساتھ (کر بلا کی طرف جاتے ہوئے) باہر نکلے تو امام جن منزل میں نزل اہل اہل فرماتے یا

اُس سے گنج کرتے تو یحییٰ اور ان کے شہید ہونے کو یاد کرتے اور فرماتے کہ خداوند تعالیٰ کے نزدیک دنیا کی

بے قدری کے لیے یہی کافی ہے کہ یحییٰ بن زکریا کا سر بنی اسرائیل کے جگہ بدل میں سے ایک بدکار کے

پاس ہونے کے طور پر لایا گیا ہو۔

۱۔ اس بارے میں کہ شخص ترک ازدواج کیلئے باعث فضیلت نہیں ہو سکتا اور قانون اسلام نے ازدواج کے سلسلے میں تاکید کی ہے۔ تفسیر نمونہ

۱۹ (اردو ترجمہ) میں ہم نے تفصیل سے بحث کی ہے۔

۲۔ اعلام ستران ۶۶۶۔

۳۔ تراشیدین ج ۳ ص ۳۲۴۔

حضرت امام حسین کی شہادت بھی کئی ایک جہات سے حضرت یحییٰ کی شہادت کی مانند تھی۔ (حضرت یحییٰ کے قتل کی کیفیت ہم بعد میں تفصیل سے بیان کریں گے)۔

امام حسین کا نام بھی حضرت یحییٰ کے نام کی طرح بے سابقہ تھا (اور پہلے کسی کا یہ نام نہیں تھا) اور ان کی مدت حمل (جس وقت جنم ہوا وہیں تھے) مول کی نسبت بہت کم تھی۔

۲۔ محراب ۱: یہ ایک ایسی مخصوص جگہ ہوتی ہے کہ جو عباد و نگاہ میں امام یا پیش نماز کے لیے مخصوص کر دی جاتی ہے اور اس کا نام رکھنے کی دو وجوہات بیان کی جاتی ہیں۔

پہلی یہ ہے کہ یہ ماوراء "حرب" ہے جو جنگ کے معنی میں ہے لیا گیا ہے کیونکہ محراب درحقیقت شیطان اور ہوائے نفس کے ساتھ مبارزہ اور جنگ کرنے کی جگہ ہے۔

دوسرے یہ کہ محراب لغت میں مجلس کے سب سے بلند مقام کے معنی میں ہے اور چونکہ محراب کی جگہ عبادت گاہ کے اوپر والے حصہ میں ہوتی تھی لہذا اُسے یہ نام دیا گیا۔

بعض یہ کہتے ہیں کہ، چونکہ ہمارے ہاں معمول ہے، اُس کے برعکس بنی اسرائیل میں "محراب" سطح زمین سے کچھ اوپر ہوتی تھی اور اُس میں کچھ فرشتے ہوتے تھے اور اس کے چاروں طرف دیوارچی ہوتی ہوتی تھی، اس طرح سے کہ جو لوگ محراب میں ہوتے تھے وہ باہر سے دکھائی نہیں دیتے تھے، خلیج علی

قبوہ من الصحراب کا جگہ جو ہم نے مذکورہ بالا آیات میں پڑھا ہے لفظ "علی" پر توجہ کرتے ہوئے کہ جو عام طور پر اوپر کی سمت کے لیے استعمال ہوتا ہے اس معنی کی تاکید کرتا ہے۔

۱۱۔ يَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ وَاَتَيْنَهُ الْهُكْمَ صَبِيًّا ۝

۱۲۔ وَحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكٰوَةً وَكَانَ ثَقِيًّا ۝

۱۳۔ وَبَرًّا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا ۝

۱۴۔ وَسَلَّمْ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا ۝

ترجمہ

۱۱۔ اے یحییٰ! (اتذکر) کتاب کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ لو اور ہم نے فرمان نبوت (اور کائنات میں غم) اسے بچپن میں عطا کیا۔

۱۲۔ اور اُسے اپنی بارگاہ سے رحمت و محبت عطا کی اور (مذہب و عمل کی) پاکیزگی بھی اور وہ پرہیزگار تھا۔

۱۳۔ وہ اپنے ماں باپ کے لیے نیکو کار تھا اور جبار (و تکبر) اور عاصی و نافرمان نہیں تھا۔

۱۴۔ اور اُس پر سلام ہے، اُس دن جبکہ وہ پیدا ہوا اور اُس دن جبکہ وہ مرے گا اور اُس دن جبکہ وہ زندہ کر کے اٹھایا جائے گا۔

تفسیر

حضرت یحییٰ کی عمدہ صفات :

گزشتہ آیات میں ہم نے دیکھا ہے کہ خداوند تعالیٰ نے کس طرح حضرت زکریاؑ کو بڑھاپے میں حضرت یحییٰؑ کا سا فرزند سعید مرحمت فرمایا۔ اس کے بعد ہم ان آیات میں خداوند تعالیٰ کا اہم فرمان یحییٰؑ سے خطاب کی صورت میں پڑھتے ہیں : اے یحییٰ ! کتاب خدا کو مستبیطی کے ساتھ پکڑ لو (یا یحییٰ) خذ الكتاب بقوة۔

مفسرین کے درمیان مشہور یہ ہے کہ یہاں کتاب سے مراد "تورات" ہے۔ یہاں تک کہ انہوں نے اس سلسلے میں اجماع و اتفاق کا دعویٰ کیا ہے۔ لیکن بعض نے یہ احتمال ظاہر کیا ہے کہ وہ خود ایک مخصوص کتاب رکھتے تھے۔ (داؤد کی زبور کی طرح) البتہ وہ ایسی کتاب نہیں تھی کہ جو کسی نئے دین یا جدید مذہب کو پیش کرتی ہو۔

بہر حال کتاب کو مستبیطی کے ساتھ پکڑنے سے مراد یہ ہے کہ آسمانی کتاب تورات اور اس کے مطالب و احکام کا اجازت رکھ کر اور قطعی صورت میں علم حاصل اور آہنی ارادہ کے ساتھ کریں، اس ساری کتاب پر عمل کریں، اسے عام کرنے کے لیے ہر قسم کی مادی و روحانی اور اخلاقی و اجتماعی قوت سے فائدہ اٹھائیں۔ اصولی طور پر کسی کتاب اور کسی مکتب و مسلک کو اس کے پیروکاروں کی قوت طاقت اور قابلیت کے بغیر جاری نہیں کیا جاسکتا۔ یہ تمام مومنین اللہ کی راہ کے تمام راہبوں کے لیے ایک درس ہے۔

اس حکم کے بعد ان دس نعمات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جو خدا نے حضرت یحییٰؑ کو عطا فرمائی تھیں یا انہوں نے قرین الہی سے کسب کی تھیں :

- ۱۔ ہم نے اسے بچپن میں فرمان نبوت اور عقل و ہوش و درایت عطا کی (واتینہ الحکوم حسب ما)۔
 - ۲۔ ہم نے اپنی طرف سے اسے بندوں کے لیے رحمت و رحمت بخشی (وحننا من لدنا)۔ "حنان" اصل میں رحمت شہت نبوت اور لوگوں کے ساتھ تعلق و میلان کے اظہار کے معنی میں ہے۔
 - ۳۔ ہم نے اسے روح و جان اور عمل کی پاکیزگی عطا کی (وزکوة)۔
- مفسرین نے "زکوة" کے مختلف معانی کیے ہیں۔ بعض نے اس کی عمل صالح سے بعض نے اطاعت و اخلاص سے، بعض نے مال یا سے نیکی کرنے سے، بعض نے حسن شہرت سے اور بعض نے ہر دو کا دل کی پاکیزگی سے تفسیر کی ہے، لیکن ظاہر یہ ہے کہ لفظ زکات ایک وسیع معنی رکھتا ہے کہ جس میں یہ تمام پاکیزگیاں شامل ہیں۔

- ۴۔ وہ پرہیزگار تھے اور جو بات فرمان پروردگار کے خلاف ہوتی تھی اس سے دوری اختیار کرتے تھے۔ (وکان قتیلاً)۔
- ۵۔ اسے ہم نے اپنے مال باپ کے ساتھ خوش گذار، نیکو کار اور محبت کرنے والا پایا۔ (ویرثا بوالدینہ)۔
- ۶۔ وہ خلق خدا سے خود کو برتر سمجھنے والا اور ظالم و مستکبر نہیں تھا (ولویکبر جباراً)۔

۱۔ تفسیر "آزادی" اور تفسیر "فسرہ ملی" کی طرف زبردست آیہ کے ذیل میں رجوع کریں۔

۲۔ تفسیر "امیہ زبان" کی طرف زبردست آیہ کے ذیل میں رجوع کریں۔

۴۔ وہ صحبت کار اور گناہ سے آلودہ نہیں تھا (عصیا)۔

۸۔ ۱۰۰۹۰۔ اور چونکہ وہ ان عظیم افتخارات اور عمدہ صفات کا مالک تھا، لہذا جس دن وہ پیدا ہوا اس دن بھی اور جس دن اس کو موت آئے اس دن بھی اور جس دن وہ دوبارہ زندہ کر کے قبر سے اٹھایا جائے گا اس دن بھی، اس پر پہلا درود و سلام ہو، (و سلام علیہ یوم ولد و یوم بیوت و یوم بیعت حیاً)۔

چند نکات

۱۔ آسمانی کتاب کو قوت و طاقت کے ساتھ پکڑ لو، جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں "یا یحییٰ خذ الكتاب بقوة" کے جملے میں لفظ "قوة" مکمل طور پر ایک وسیع معنی رکھتا ہے جس میں تمام مادی و معنوی اور روحانی و جسمانی قوتیں جمع ہیں اور یہ چیز خود اس حقیقت کو بیان کرتی ہے کہ دین الہی اور اسلام و قرآن کی حفاظت و کردی و بنسبتی و کمالی، نگہ رے نوے بن کر پڑے رہنے اور غفلت شکاری کے ساتھ ممکن نہیں ہے، بلکہ یہ قوت و طاقت اور قابلیت کے طاقتور قلعے کے اندر بھی ہو سکتی ہے۔

اگرچہ یہاں پر مخاطب حضرت یحییٰؑ ہیں۔ لیکن قرآن مجید کے دوسرے مواقع پر یہ تعبیر دوسرے تمام لوگوں کے لیے بھی صادق آتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ سورہ اعراف کی آیہ ۱۴۵ میں حضرت موسیٰؑ کو یہ حکم دیا جاتا ہے کہ وہ تورات کو قوت کے ساتھ پکڑیں

فخذها بقوة

اور سورہ بقرہ کی آیہ ۹۲ اور ۹۳ میں بھی خطاب تمام بنی اسرائیل کے لیے ہے :

خذوا ما آتیناکم بقوة

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک عام حکم ہے جو سب کے لیے ہے نہ کہ کسی خاص شخص یا اشخاص کے لیے۔

اتفاق کی بات ہے کہ یہی مضمون دوسرے نطقوں میں سورہ انفال کی آیہ ۶۰ میں تمام مسلمانوں کے لیے بیان ہوا ہے :

واعذوا لله وما استطعت من قوۃ

جس قدر قوت و طاقت تمہارے بس میں ہو دشمنوں کو مرعوب کرنے کے لیے فراہم کرو۔

بہر حال یہ بیان سب لوگوں کا جواب ہے کہ جو یہ گمان کرتے ہیں کہ کردی اور ضعف کے ساتھ بھی کوئی کام سر انجام دیا جاسکتا ہے یا جو یہ ہیں کہ تمام حالات میں حالات کے ساتھ بھرتہ کرتے ہوئے مشکلات کو حل کریں۔

انسان کی سر نوشت کے تین مشکل دن : سلام علیہ یوم ولد و یوم بیوت و یوم بیعت حیاً کی تعبیر اس کی نشاندہی کرتی ہے کہ انسان کی زندگی کی تاریخ میں اور اس کے ایک عالم سے دوسرے عالم کی طرف منتقل ہونے میں تین دن بہت سخت ہیں :

۱۔ اس دنیا میں قدم رکھنے کا دن (یوم ولد)

۲۔ موت اور عالم برزخ کی طرف منتقل ہونے کا دن (یوم بیوت)

۳۔ اور دوبارہ زندہ کئے جانے کا دن (یوم بیعت حیاً)

یہ تین مشکل دنوں میں غفلت یا کوتاہی کے برائیاں کا سامنا کرنا پڑتا ہے لہذا خداوند تعالیٰ ان میں اپنے مخصوص بندوں کو سلامتی اور عافیت عطا

فرماتا ہے اور انہیں ان تینوں طوفانی مرحلوں میں اپنی حمایت کے جملوں سے لیتا ہے۔

اگرچہ قرآن مجید میں یہ تعبیر صرف دو مقام پر آئی ہے۔ ایک حضرت یحییٰ کے بارے میں اور دوسرے حضرت عیسیٰ کے بارے میں لیکن حضرت یحییٰ کے بارے میں قرآن مجید کی یہ تعبیر ایک خاص امتیاز رکھتی ہے، کیونکہ یہاں اس بات کا کہنے والا خدا ہے جبکہ حضرت عیسیٰ کے لیے کہنے والے خود حضرت عیسیٰ ہیں۔

یہ بات بغیر کئے واضح و روشن ہے کہ جو لوگ اپنے حالات میں ان دونوں بزرگواروں سے مشابہت رکھتے ہیں وہ بھی اس سلامتی میں شامل کیجے جائیں گے۔

یہ بات باذنب نظر ہے کہ امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام سے منقول ایک روایت میں ہے کہ:

ان اوحش ما یقوم علی هذا الخلق فی ثلاث مواطن : یوم یلد و یموت
من یطن امه فیبری الدنیا ، و یوم یموت فیعاین الاخرة و اهلها ، و یوم
یبعث حیاً ، فیبری احکامنا لورہا فی دار الدنیا و قد سلوا اللہ علی یحییٰ فی
ہذہ المواطن الثلاث و امن روعتہ فحقا و سلام علیہ
انسان کے لیے وحشت ناک ترین مرحلے تین ہیں :-

"اقل" وہ دن کہ جس دن وہ پیدا ہوتا ہے اور اس کی نظر دنیا پر پڑتی ہے۔

"دوسرے" وہ دن کہ جس میں وہ مرتا ہے اور آخرت اور اہل آخرت کو دیکھتا ہے۔

"تیسرے" وہ دن کہ جس میں وہ قبر سے زندہ کر کے اٹھایا جائے گا اور وہ ایسے احکام و قوانین دیکھے گا کہ جو اس جہاں میں حکم فرما نہیں تھے۔ خداوند تعالیٰ نے ان تینوں مرحلوں میں سلامتی کو حضرت یحییٰ کے شامل حال کیا ہے اور انہیں وحشتوں کے مقابلے میں امن و امان اور راحت و آرام دیا اور فرمایا:

و سلام علیہ

بار الہا ! ان تینوں حساس اور پُرانی مراحل میں ہمیں بھی سلامتی مرحمت فرما۔

۳- پیچیدگی میں نبوت : یہ درست ہے کہ انسان کی عقل کے ارتقا کا دور عام طور پر ایک خاص صبر پر ہوتا ہے۔ لیکن ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ انسان میں ہمیشہ ہی بعض مستثنیٰ افراد موجود رہے ہیں۔ تو اس بات میں کوئی امر مانع ہے کہ خداوند تعالیٰ (عقل کے ارتقا کے) اس دور کو بعض بزرگوں کے لیے کچھ مصالح کی بنا پر زیادہ مختصر کر دے اور کم سے کم عرصہ میں اسے مکمل کر دے۔ جیسا کہ بچوں کے لیے ہولنا کیوں کے لیے عام طور پر ایک دو سال کا گزرنا ضروری ہوتا ہے جبکہ ہم جانتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ نے بالکل ابتدائی دنوں میں بات کی، اور وہ ایسی بات تھی جو بہت ہی پُر معنی تھی، اور معمول کے مطابق بڑی عمر کے افراد کے شاہانِ شان تھی جیسا کہ، انشاء اللہ، آئندہ آیات کی تفسیر میں بیان ہوگا۔

یہاں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے، کہ وہ اشکال جو کچھ افراد نے شیعوں کے بعض ائمہ کے بارے میں کیا ہے کہ ان میں سے بعض کم عمری میں مقامِ امامت پر کیسے پہنچ گئے، درست نہیں ہے۔

تفسیر برہان ج ۲ ص ۸

ایک روایت میں امام جواد حضرت محمد بن علی النقی علیہ السلام کے ایک صحابی سے کہ جس کا نام علی بن اسباط تھا منقول ہے کہ:

میں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا (جبکہ آپ کا سن بہت پھرنا تھا) میں ان کے قد و قامت میں گم ہو گیا تاکہ اُسے اپنے ذہن میں بٹھاؤں اور جب میں واپس ممرورٹ کر جاؤں تو اپنے دوستوں سے اس بات کے کم و کیف کو بیان کروں۔ عین اُسی وقت جب کہ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ حضرت بیٹھ گئے (گویا آپ نے میری تمام سوچ کا مطالعہ کر لیا تھا) میری طرف رخ کیا اور فرمایا اسے علی بن اسباط! خداوند تعالیٰ نے سلسلہ امامت میں جو کام کیا ہے وہ اُسی کام کی طرح ہے کہ جو نبوت میں کیا ہے وہ فرماتا ہے :-

وانتیناہ الحکوم صبیحا

"ہم نے بچپن کو بچپن میں فرما کر نبوت و عقل و دانش عطا کی :-

اور کبھی انسانوں کے بارے میں فرماتا ہے ،

حق اذ ابلیغ اشدہ و یبلغ اربعین سنۃ

"جس وقت انسان کامل عقل کی حد بلوغ، چالیس سال کو پہنچ گیا

بنابری جس طرح یہ بات ممکن ہے کہ خداوند تعالیٰ کسی انسان کو حکمت و دانائی بچپن میں عطا فرما دے اسی طرح اس کی قدرت میں ہے کہ چالیس سال کی عمر میں دے۔

ضمنی طور پر یہ آیت اُن اعتراض کرنے والوں کے لیے ایک دُعا بن گئی جو اب یہ جوبہ کہتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام مردوں میں سے تھے اگرچہ پر ایمان لانے والے پہلے شخص نہیں تھے کیونکہ وہ تو اس وقت دس سال کے بچے تھے اور دس سال بچے کا ایمان قابل قبول نہیں ہے۔

اس نکتے کا ذکر کرنا بھی یہاں پر غیر مناسب نہیں ہوگا کہ ایک حدیث میں امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام کے بارے میں منقول ہے :

آپ کے بچپن کے زمانہ میں کچھ بچے آپ کے پاس آئے اور آپ سے کہا :

اذھب بنا فلعب

ہمارے ساتھ آؤ تاکہ ہم مل کر کھیلیں۔

تو آپ نے جواب میں فرمایا :

ما للعب خلقتنا

ہم کیلئے کئے لیے پیدا نہیں ہوئے۔

اسی سلسلے میں اللہ نے فرمایا ہے : وانتیناہ الحکوم صبیحا

البتہ یہ بات ذہن میں رہے کہ یہاں "لعب" سے مراد ہیروہ اور فضول قسم کی سرگرمیاں ہیں۔ دوسرے لفظوں میں، ہیروہ مشاغل میں مشغول ہونا ہے۔ لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کھیل کود کا کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے۔ ایسا مقصد کہ جو منطقی و عقلی ہو تو مسخرہ طور پر ایسے کھیل کود اس حکم سے مستثنیٰ ہیں۔

۴۔ حضرت یحییٰ کی شہادت : نہ صرف حضرت یحییٰ کی پیدائش تعجب خیز تھی بلکہ ان کی موت بھی کئی لحاظ سے عجیب تھی۔ اکثر مسلمان مؤرخین اور اسی طرح مشہور کئی منابع ان کی شہادت کے واقعہ کو اس طرح نقل کرتے ہیں (اگرچہ اس کی خصوصیات میں کچھ تھوڑا بہت تفاوت دکھائی دیتا ہے) حضرت یحییٰ اپنے زمانے کے ایک طاغوت کے اپنی ایک محرم سے غیر شرعی روابط کے خلاف آواز کی بنا پر شہید ہوئے۔ ہوا یہ کہ تیس ہزار فلسطین کا جس پرست بادشاہ تھا۔ وہ اپنے بھائی کی بیٹی "ہیرودیا" پر عاشق ہو گیا۔ وہ بہت خوبصورت تھی۔ اس کے سن نے اس کے دل میں عشق کی آگ بھڑکادی۔ بادشاہ نے اس سے شادی کرنے کا پکا ارادہ کر لیا۔

یہ خبر جب خداوند تعالیٰ کے بزرگ پیغمبر حضرت یحییٰ کو پہنچی تو انہوں نے صراحت کے ساتھ اعلان فرمایا کہ یہ شادی ناجائز ہے اور تورات کے احکام کے خلاف ہے اور میں ایسے کام کی اپنی پوری ملاق کے ساتھ مخالفت کر دوں گا۔

اس مسئلہ کی تمام شہرت ہو گئی، اور یہ خبر اس لڑکی "ہیرودیا" کے کانوں تک بھی پہنچی۔ وہ حضرت یحییٰ کو اپنے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھنے لگی۔ اُس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ کسی مناسب موقع پر ان سے اختتام لے گی اور اپنی ہوا دہوں کی راہ سے اس رکاوٹ کو مٹا دے گی۔ اُس نے اپنے چچا کے ساتھ اپنے راہ رسم میں اضافہ کر دیا اور اپنے دشمن و جال کو اس کے لیے ایک جال بنادیا اور اُس پر اس طرح سے اثر انداز ہوئی کہ ایک دن ہیرودیس نے اُس سے کہا کہ تیری جو بھی آرزو ہے مجھ سے مانگ تو جو کچھ چاہے گی وہ تجھے ملے گا۔

ہیرودیا نے کہا : میں چچی کے سر کے سوا اور کچھ نہیں چاہتی، کیونکہ اُس نے مجھے اور تجھے بدنام کر کے رکھ دیا ہے۔ تمام لوگ ہماری عیبی کر رہے ہیں۔ اگر تو یہ چاہتا ہے کہ میرے دل کو سکون حاصل ہو اور میرا دل خوش ہو تو تجھے یہ کام انجام دینا چاہیے۔

ہیرودیس نے اُس عورت کا دلایز تھا انجام پر غور کیے بغیر یہ کام کرنے پر تیار ہو گیا۔ اور ابھی دیر نہ گزری تھی کہ حضرت یحییٰ کا سر اُس بدکار عورت کو پیش کر دیا۔ لیکن آخر کار اس کے لیے اس کام کے ہر لاکھ ناسخ ٹکڑے

اسلامی روایات میں ہے کہ سالار شہیدان امام حسین علیہ السلام فرماتے تھے :

دُنیا کی پستیوں میں سے یہ امر ہے کہ یحییٰ بن زکریا کا سر بنی اسرائیل کی ایک بدکار عورت کے لیے ہریر کے طور پر لے جایا گیا۔

یعنی میرے اور یحییٰ کے حالات اس لحاظ سے بھی ایک دوسرے سے مشابہ ہیں کیونکہ میرے قیام کا ایک ہدف میرے زمانے کے طاغوت یزید کے شرمناک اعمال کے خلاف قیام ہے۔

۱۶۔ وَادْكُرْ فِي الْكِتَابِ مَرْيَمَ إِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ أَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا ۝

۱۷۔ فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُونِهِمْ حِجَابًا فَأَرْسَلْنَا إِلَيْهَا رُوحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ۝

بعض اناجیل اور کچھ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہیرودیس نے اپنے بھائی کی بیوی کے ساتھ جو تورات کے مطابق ممنوع تھی شادی کر لی تھی اور حضرت یحییٰ نے اُسے اس کام پر سخت لعنت طاعت کی۔ اس کے بعد اس عورت نے اپنی بیٹی کے دشمن و جال کے ذریعے ہیرودیس کو حضرت یحییٰ کے قتل کرنے پر اکسایا۔ (تفسیر ص ۱۲۴، ذیل مرقس باب ۶ بند ۱۷ اور اس کے بعد تک)۔

۱۸۔ قَالَتْ إِنِّي أَعُوذُ بِالرَّحْمَنِ مِنْكَ إِنْ كُنْتَ تَقِيًّا ۝

۱۹۔ قَالَ إِنَّمَا أَنَا رَسُولُ رَبِّكِ لِأَهَبَ لَكَ غُلَامًا زَكِيًّا ۝

۲۰۔ قَالَتْ أَنَّى يَكُونُ لِي غُلَامٌ وَلَمْ يَمْسَسْنِي بَشَرٌ وَلَوْ أَنَّكِ لَبَيِّنٌ ۝

۲۱۔ قَالَ كَذَلِكَ ۚ قَالَ رَبِّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَلِنَجْعَلَهُ آيَةً لِلنَّاسِ وَرَحْمَةً ۖ مِنَّا ۚ وَكَانَ أَمْرًا مَقْضِيًّا ۝

ترجمہ

۱۶۔ اس کتاب (قرآن) میں مرم کو یاد کرو، اس وقت جبکہ وہ اپنے گھر والوں سے جدا ہوئی اور شرق کی جانب (ایک مقام پر) جا کر ٹھہری

۱۷۔ اور اپنے اور ان کے درمیان پردہ ڈال لیا (تاکہ اس کی غلط نگاہ ہر لحاظ سے عبادت کے لیے ہو) اُس وقت ہم نے اپنی روح اس کی طرف بھیجی اور وہ بے عیب و نقص انسانی شکل میں مرم کے سامنے حاضر ہوئی۔

۱۸۔ (وہ بہت ڈری اور) اُس نے کہا : میں خدا کے دشمن کی طرف تجھ سے پناہ مانگتی ہوں، اگر تو پرہیزگار ہے۔

۱۹۔ اُس نے کہا : میں تیرے پروردگار کا بھیجا ہوا ہوں (میں اس لیے آیا ہوں) تاکہ تجھے ایک پاک و پاکیزہ بیٹا بخشوں۔

۲۰۔ اُس نے کہا : یہ کیسے ممکن ہے کہ میرے ہاں بیٹا ہو حالانکہ اب تک مجھے کسی انسان نے چھوا تک نہیں اور میں بدکار عورت بھی نہیں ہوں۔

۲۱۔ اُس نے کہا : بات یہی ہے کہ تیرے پروردگار نے کہا ہے کہ یہ کام میرے لیے آسان ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اسے لوگوں کے لیے نشانی قرار دیں اور وہ ہماری طرف سے رحمت ہو اور یہ فیصلہ شدہ امر ہے (اور اس میں گنگو کی گنجائش نہیں ہے)۔

تفسیر

حضرت عیسیٰ کی ولادت :

حضرت یحییٰ کا قصہ بیان کرنے کے بعد حضرت عیسیٰ کی ولادت کی داستان اور ان کی والدہ حضرت مرم کا قصہ شروع کیا گیا ہے کیونکہ ان دونوں قصوں کے درمیان بہت قریبی تعلق ہے۔ اگر حضرت یحییٰ کی پیدائش ایک ایسے بڑے اور ضعیف باپ سے اور ایک ایسی ماں سے جو بالآخر تھی عجیب تھی تو حضرت عیسیٰ کا بغیر باپ کے ماں سے پیدا ہونا اس سے بھی زیادہ تعجب خیز ہے۔ اگرچہ یہاں میں عقل اور نبوت کے تمام کم پینا حیرت انگیز ہے، تو گوارے میں گنگو کرنا اور وہ بھی کتاب و نبوت کے بارے میں اس سے

چند نکات :

۱۔ رُوحِ خدا سے کیا مراد ہے ؟ تقریباً تمام مشہور مفسرین نے یہاں پر رُوح کی خداوند تعالیٰ کے بزرگ فرشتے جبریل سے تفسیر کی ہے اور اسے رُوح سے تعبیر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ روحانی ہے۔ وہ ایک ایسا وجود ہے جو حیات بخش ہے۔ چونکہ وہ انبیاء و مرسلین کے پاس خداوند تعالیٰ کی ہدایت کا پہنچانے والا ہے لہذا تمام لائق انسانوں کے لیے حیات بخش ہے اور یہاں پر رُوح کی خدا کی طرف انصاف اس رُوح کی حکمت و شرافت کی دلیل ہے کیونکہ انصاف کی ایک قسم انصافِ تشریفاتی ہے۔

ضمنی طور پر اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جبریل کا نازل ہونا انبیاء کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ البتہ شریعت اور کتبِ آسمانی لانے والے وحی کے عنوان سے صرف انہیں کے اوپر نازل ہوا کرتا تھا لیکن دوسرے پیغمبات پہنچانے کے لیے (جیسا کہ مندرجہ بالا بیانات حضرت مریم کو پہنچایا) کوئی مانع نہیں ہے کہ انبیاء کے علاوہ دوسروں کے سامنے بھی ظاہر ہو۔

۲۔ تشل کیا ہے ؟

”تشل“ اصل میں مادہ تشول سے کسی شخص یا چیز کے سامنے کھڑا ہونے کے معنی میں ہے، اور تشل اس چیز کو کہتے ہیں کہ جو کسی دوسرے کی شکل میں ظاہر ہو۔ اس بنا پر ”تشل لہا لبشر“ اسوئاً کا معنوم یہ ہے کہ وہ خدائی فرشتہ انسانی شکل میں ظاہر ہوا۔ اس میں شک نہیں ہے کہ اس گفتگو کا یہی معنی نہیں ہے کہ جبریل صورت اور سیرت کے اعتبار سے بھی ایک انسان میں بدل گیا تھا کیونکہ اس قسم کا انقلاب اور تبدیلی ممکن نہیں ہے، بلکہ مراد یہ ہے کہ وہ (بظاہر) انسان کی شکل میں نمودار ہوا، اگرچہ اس کی سیرت وہی فرشتہ جیسی تھی، لیکن حضرت مریم کو ابتدائی امر میں چونکہ یہ غیر نہیں تھی لہذا انہوں نے یہی خیال کیا تھا کہ ان کے سامنے ایک ایسا انسان ہے جو باعتبار صورت بھی انسان ہے اور باعتبار سیرت بھی انسان ہے۔

اسلامی روایات اور تواتر میں ”تشل“ اس لفظ کے وضع معنی میں بہت نظر آتا ہے۔

ان میں سے ایک یہ ہے کہ : جس دن مشرکین مکہ دارالندوہ میں جمع ہوئے تھے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نابود کرنے کے لیے سازش کر رہے تھے تو ابلیس ایک غیر انڈیش و غیر عوام آدمی کے لباس میں ظاہر ہوا اور سردارانِ قریش کو بھانسنے میں مشغول ہو گیا۔ یا دوسری روایت یہ ہے کہ دنیا اور اس کی باطنی حالت حضرت علی علیہ السلام کے سامنے ایک حسین و جمیل دلربا عورت کی شکل میں ظاہر ہوئی، لیکن وہ آپ پر کچھ بھی اثر نہ کر سکی۔ یہ واقعہ مفصل اور مشہور ہے۔

تیسرے روایات میں یہ بھی ہے کہ انسان کے مال و اولاد و عملِ موت کے وقت مختلف اور مخصوص چہروں میں اس کے سامنے مجسم ہوتے ہیں۔ چوتھے یہ کہ انسان کے اعمالِ قبر میں اور قیامت کے دن مجسم ہو کر ظاہر ہوں گے اور ہر عمل ایک خاص شکل میں ظاہر ہوگا۔ ان تمام مواقع پر تشل کا معنوم یہ ہے کہ کوئی چیز یا کوئی شخص ظاہری طور پر دوسرے کی شکل میں نمودار ہوتا ہے نہ یہ کہ اس کا باطن یا اس کی اہمیت جی تبدیل ہو جاتی ہے۔

- ۲۱۔ فَحَلَّتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهِ مَكَانًا قَصِيًّا ۝
 ۲۲۔ فَاجَاءَهَا الْمَخَاضُ إِلَى جِذْعِ النَّخْلَةِ قَالَتْ يَلَيْتُنِي مِتُّ قَبْلَ هَذَا وَكُنْتُ نَسِيًّا مَنْسِيًّا ۝
 ۲۳۔ فَنَادَاهَا مِنْ تَحْتِهَا أَلَا تَحْزَنِي قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا ۝
 ۲۴۔ وَهَزَمْنِي أَلَيْكَ الْجِذْعُ النَّخْلَةُ تُسْقِطُ عَلَيْكَ رَطْبًا جَنِيًّا ۝
 ۲۵۔ فُكِّلَ وَأَشْرَبِي وَقَرِّي عَيْنًا ۚ فَمَا تَرَيْنَ مِنَ الْبَشَرِ أَحَدًا ۚ فَقَوْلِي إِنِّي نَذَرْتُ لِلرَّحْمَنِ صَوْمًا فَلَنْ أُكَلِّمَ الْيَوْمَ إِنْسِيًّا ۝

ترجمہ

- ۲۱۔ آخر کار (مریم) حاملہ ہو گئی اور وہ کسی دور دراز مقام کی طرف چلی گئی۔
 ۲۲۔ دردِ زہ کی تکلیف اسے ایک گھبر کے تنے کی طرف لے گئی (۵۵ اس قدر پریشان ہوئی کہ) اُس نے کہا کہ اے کاش میں اس سے پہلے ہی مر گئی ہوتی اور بالکل فراموش ہو گئی ہوتی۔
 ۲۳۔ اچانک اس کے پاؤں کے نیچے کی طرف سے (کسی نے) اسے پکار کر کہا کہ گھبراؤ نہ ہو تیرے پروردگار نے تیرے پاؤں کے نیچے (خوشگوار) پانی کا چشمہ جاری کر دیا ہے۔
 ۲۴۔ اور گھبر کے اس درخت کو ہلاتا کہ تیرا تازہ گھبر ہی تجھ پر گریں۔
 ۲۵۔ اس (الذی غذا) میں سے کھا اور اس (خوشگوار پانی) میں سے پی اور اپنی آنکھوں کو (اس نئے مولود سے) روشن رکھ۔ اور جب تو انسانوں میں سے کسی کو دیکھے تو اشارے سے کہہ دے کہ میں نے خدا کے رخصت کے لیے روزہ رکھا ہوا ہے اور میں آج کسی کے ساتھ بات نہیں کر سکی۔ (یہ نو مولود خود ہی تیرا دفاع کر لے گا)۔

تفسیر

مریم سخت طوفانوں کے تھپیڑوں میں :

”سرا انجام مریم حاملہ ہو گئی“ اور اُس مولود پہنچنے سے اس کے دم میں گھبراہٹ (فحلتہ)۔

اس بارے میں کہ یہ کس طرح وجود میں آیا، کیا جبریل نے مریم کے پیڑائیں میں پھونک دیا ان کے منہ میں قرآن مجید میں اس کے متعلق بات نہیں ہے کیونکہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ اگرچہ مفسرین کے اس بارے میں مختلف اقوال ہیں۔

ہر حال اس امر کے سبب وہ بیت المقدس سے کسی دور دراز مقام پر چلی گئی (فانتبت ذلہ مکاناً قصیاً)۔

وہ اس حالت میں ایک اسید ویم کے درمیان پریشانی و غشی کی بلی بلی کیفیت کے ساتھ وقت گزار رہی تھی، کبھی وہ یہ خیال کرتی کہ یہ محل ظاہر ہو جائے گا، مانا کہ چند دن یا چند مہینے اُن لوگوں سے دور رہ لوں گی اور اس مقام پر ایک اجنبی کی طرح زندگی بسر کروں گی مگر آخر کار یہ کون میری بات قبول کرے گا کہ ایک عورت بغیر شوہر کے حاملہ ہو گئی۔ سوائے اس کے کہ اس کا واس آلودہ ہو، میں اس اتہام کے متحمل نہیں کیا کروں گی۔ واقعہ لڑکی کہ جو سالہا سال سے پاکیزگی و عفت اور تقویٰ و برہنہ کاری کی علامت تھی اور خدا کی عبادت و بندگی میں نوز تھی اس کے پیچھے میں کفالت کرنے پر بنی اسرائیل کے زائد و عابد فکر کرتے تھے۔ اور جس نے ایک عظیم پیغمبر کے زیر نظر پرورش پائی تھی، خلاصہ یہ ہے کہ جو اس کے اخلاق کی دھرم اور پاکیزگی کی شہرت ہو چکی تھی اُس کے لیے یہ بات بہت ہی دردناک تھی کہ ایک دن وہ یہ محسوس کرے کہ اُس کا سبب معنوی سرمایہ غلط سے میں پراگیا ہے اور وہ ایک ایسی تمست کے گرداب میں چھن گئی ہے کہ جو بہترین تمست شمار ہوتی ہے۔ اور یہ تیرا لڑکا کہ جو اس کے جسم پر طاری ہوا۔

لیکن دوسری طرف وہ یہ محسوس کرتی تھی کہ یہ فرزند خداوند تعالیٰ کا موعود پیغمبر ہے۔ یہ ایک عظیم آسمانی تحفہ ہوگا، وہ خدا کو جس نے مجھے اپنے فرزند کی بشارت دی ہے اور ایسے بھراؤ طریقے سے اسے پیدا کیا ہے مجھے اکیلا کیسے چھوڑے گا؟ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ وہ اس قسم کے اتمام کے مقابل میں سیراد فراع نہ کرے؟ میں نے تو اس کے لطف و کرم کو ہمیشہ آزمایا ہے اور اس کا دستِ رحمت ہمیشہ اپنے سر پر دیکھا ہے۔

اس بات پر کہ مریم کی مذمت محل کس قدر تھی، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے، اگرچہ قرآن میں سب سے زیادہ بیان ہوا ہے (پھر بھی بعض نے اسے ایک گھنڈہ، بعض نے ٹوٹنے والے چھوٹے چھوٹے بعض نے سات ماہ بعض نے آٹھ ماہ اور بعض نے دوسری عورتوں کی طرح نو بیٹے کہا ہے لیکن یہ موضوع اس واقعے کے متعصب پراثر نہیں رکھتا۔ روایات بھی اس سلسلہ میں مختلف ہیں۔

اس بارے میں کہ یہ جگہ "قصی" (دور دراز) کہاں تھی، بہت سے لوگوں کا نظریہ یہ ہے کہ شہر "نامرو" تھا اور شاید اس شہر میں بھی وہ مسلسل گھری میں رہتی تھیں اور بہت کم باہر نکلتی تھیں۔

جو کچھ بھی خدا مذمت محل ختم ہوئی اور مریم کی زندگی کے طوفانی لمحات شروع ہو گئے انہیں سخت درد و آواز ہو گیا۔ ایسا درد جو انہیں ابلیس کے بیابان کی طرف لے گیا۔ ایسا بیابان جو انسانوں سے خالی، خشک اور سب سے آب تھا۔ جہاں کوئی جانے نہ پتا نہ تھی۔

اگرچہ اس حالت میں عورتیں اپنے قریبی اعزہ کی پناہ لیتی ہیں تاکہ وہ بچے کی پیدائش کے سلسلے میں ان کی مدد کریں، لیکن مریم کی حالت چونکہ ایک استثنائی کیفیت تھی، وہ ہرگز نہیں چاہتی تھیں کہ کوئی ان کے وضع محل کو دیکھے لہذا درد و زحمت کے شروع ہوتے ہی انہوں نے بیابان کی راہ لی۔

قرآن اس سلسلے میں کہتا ہے: وضع محل کا وہ دہر اسے مجبور کے درخت کے پاس کھینچ لے گیا۔ (فلجاً تمھا المصاخص الی جذع النخلۃ)۔

"جذع النخلۃ" کی تعبیر: اس بات کو مد نظر رکھتے ہوئے کہ "جذع" درخت کے تنہا کے معنی میں ہے، یہ نشانہ ہی کرتی ہے کہ:

خدا کا خوف تنہا رہ گیا تھا یعنی وہ خشک شدہ درخت تھا۔

اس حالت میں غم و اندوہ کا ایک طوفان تھا جو مریم کے پورے وجود پر طاری تھا، انہوں نے محسوس کیا کہ جس لمحے کا خوف تھا وہ آن پہنچا۔ کہ جس میں وہ سب کچھ آشکار ہو جائے گا جو اب تک چھپا ہوا ہے اور یہ ایمان لوگوں کی طرف سے ان پر تمت کے تیروں کی بارش شروع ہو چکی۔ یہ طوفان اس قدر سخت تھا اور یہ باران کے دوش پر اتنا سنگین تھا کہ بے اختیار ہلکے ہو گئیں، اسے کاش! میں اس سے پہلے ہی مر گئی ہوتی۔

محل جلا دی جاتی۔ (قالت یالیتنی مت قبل ھذا وکنت نسیاً منسیاً)۔

یہ بات صاف طور پر ظاہر ہے کہ حضرت مریم کو صرف آئندہ کی تمسوں کا خوف ہی نہیں تھا کہ جو ان کے دل کو بے چین کیے ہوئے تھا، بلکہ ان سب سے زیادہ فکر اس بات کا تھا کہ دوسری مشکلات بھی تھیں۔ کسی دایہ اور ہمدرد و دعا کے بغیر وضع محل، منسلان بیابان میں بالکل ناممکن، آرام کے لیے کوئی جگہ نہ ہونا، پینے کے لیے پانی اور کھانے کے لیے غذا کا فقدان اور نوزاد کو کسی دیکھ بھال کے لیے کسی دیکھ بھال کا نہ ہونا یہ ایسے دھڑکے کہ جنہوں نے انہیں سخت پریشان کر رکھا تھا۔

اور وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ حضرت مریم نے ایمان اور توحید کی ایسی معرفت کے ہوتے ہوئے اور خداوند تعالیٰ کے اتنے لطف و کرم اور احسانات دیکھنے کے باوجود ایسا جملہ زبان پر کیسے جاری کیا کہ "اے کاش! میں مر گئی ہوتی اور فراموش ہو چکی ہوتی" انہوں نے اس وقت میں جناب مریم کی حالت کا تصور ہی نہیں کیا۔ اور اگر وہ خود ان مشکلات میں سے کسی چھوٹی سی مشکل میں بھی گرفتار ہو جائیں تو ان کے ایسے ہاتھ پاؤں پھول جائیں گے کہ انہیں خود اپنی جگہ پر نہ رہے گی اور وہ خود کو بھی بھول جائیں گے۔

لیکن یہ حالت زیادہ دیر تک باقی نہ رہی اور امید کا وہی روشن نقطہ جو ہمیشہ اُن کے دل کی گہرائیوں میں رہتا تھا پھلنے لگا۔ یہ ایک ایک آواز ان کے کان میں آئی جو ان کے پاؤں کے نیچے سے بلند ہو رہی تھی اور واضح طور پر کہہ رہی تھی کہ تمہیں نہ ہو۔ ذرا غور سے دیکھو تیرے پردہ نگار نے تیرے پاؤں کے نیچے ایک خوشگوار پانی کا چشمہ جاری کر دیا ہے۔ (فخذا مھامن تحتھا ان لا تحزنی قد جعل ربک تحتک سریاً)۔

ایک نظر اپنے سر کے اوپر ڈالو اور غور سے دیکھو کہ کس طرح خشک تنہا باراد مجبور کے درخت میں تبدیل ہو گیا ہے، کہ پھلوں نے اس کی شاخوں کو زینت بخشی ہے اور اس مجبور کے درخت کو بلاؤ تاکہ تازہ کھجوریں تم پر گرنے لگیں (وھزی الیک بجذع النخلۃ تساقط علیک (طیاً جنتیاً)۔ اس لذیذ اور وقت بخش غذا میں سے کھاؤ اور اس خوشگوار پانی میں سے پیو (فکلی واشرب)۔

اور اپنی آنکھوں کو اس نور وود سے روشن رکھو (وقری عیناً)۔

اور اگر اندک حالات سے پریشانی ہے تو مطمئن رہو۔ جب تم کسی بشر کو دیکھو اور وہ تم سے اس بارے میں وضاحت چاہے تو اشارہ کے ساتھ اس سے کہہ دینا کہ میں نے خدا کے رحمت کے لیے روزہ رکھا ہوا ہے، خاموشی کا روزہ اور اس سبب سے میں آج کسی سے بات نہیں کروں گی (فاما توین من البشر احداً فقولی انی نذرت للرحمن صوماً فلن اکلوا الیوم نسیاً)۔

ظاہر ہے کہ اس بات کی کئی ضرورت نہیں ہے کہ تم آپنا دفاع کرو۔ وہ ذات کہ جس نے یہ نور وود تمہیں عطا کیا ہے اس نے تیرے دفاع کی تمام ذمہ داریاں اٹھائی ہیں۔ اس لیے تم ہر طرح سے مطمئن رہو اور غم و اندوہ کو اپنے دل میں جگہ نہ دو

تجذع۔ برون "ذبح" اصل میں "جذع" (بروز من) ہے جس کا معنی کاٹنا اور قطع کرنا ہے۔

ان پہلے درجہ واقعات نے جو ایک انتہائی تاریک فضا میں روشن شعلوں کی طرح چمکنے لگے تھے۔ ان کے دل کو پھر بھی روشن کر دیا تھا۔ انہیں ایک سکون بخش دیا تھا۔

چند اہم نکات :

۱۔ حضرت مریمؑ کی مشکلات میں تربیت : وہ حادثات جو اس مخمور سی مدت میں حضرت مریمؑ پر گزرے اور اعلیٰ خدا کے حیرت انگیز مناظر جو ان کے سامنے آئے، وہ سب اس پر انہیں ایک اولوالعزم پیغمبر کی پودش کے لیے تیار کر رہے تھے۔ تاکہ وہ اس عظیم کام کی انجام دہی کے لیے اپنی مادی ذمہ داریوں کو اچھی طرح سے ادا کر سکیں۔

حادثات کی رفتار انہیں مشکلات کے آخری مرحلہ تک لے گئی یہاں تک کہ انہیں اپنے اور زندگی کے اختتام کے درمیان ایک قدم سے فاصلہ دکھائی نہ دیتا۔

لیکن اچانک برق اُلٹ جاتا اور تمام چیزیں ان کی مدد کے لیے دوڑ پڑیں اور وہ ہر لحاظ سے آرام و سکون اور طہن ماحول میں قدم رکھ رہی تھیں۔ "هَذِي إِلَيْكَ بِجَذَعِ النَخْلَةِ" کا جملہ کہ جو حضرت مریمؑ کو یہ حکم دے رہا ہے کہ وہ مجھ کے درخت کو بلا لیں تاکہ اُس کے پھل سے فائدہ اٹھائیں۔ انہیں اور تمام انسانوں کو یہ سبق سکھاتا ہے کہ زندگی کے سخت ترین لمحات میں بھی تلاش اور کوشش سے ہاتھ نہیں ڈالنا چاہیے۔ یہ بات اُن لوگوں کا جواب ہے کہ جو یہ سوچتے ہیں کہ اس بات کی کیا ضرورت تھی کہ مریمؑ اس حالت میں کہ انہیں ابھی وضع حمل ہوا تھا، اُٹھیں اور مجھ کے درخت کو بلا لیں؟ کیا یہ بہتر نہیں تھا کہ وہ خدا جس کے حکم سے خشک درخت بھی بار آور ہو گیا تھا، ہر کوچیچ دیتا تاکہ وہ اس کی شاخوں کو بلا لیں اور مریمؑ کے گرداگرد مجھ کو گرائی، یہ کیا ہوا کہ جب مریمؑ صبح و سالم عقیں تو جنت کے پھل ان کی محراب کے پاس آجاتے ہیں اس وقت جبکہ وہ اس شدید شکل میں گرفتار تھیں تو انہیں خود پھل پھینچنے پڑے؟

ہاں! مریمؑ کو خداوند تعالیٰ کا یہ حکم اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ جب تک ہماری طرف سے حرکت نہیں ہوگی کئی برکت نہیں ملے گی۔ دوسرے الفاظ میں ہر شخص کو مشکلات کے وقت زیادہ سے زیادہ کوشش کرنی چاہیے اور اس کے علاوہ جو باتیں اس کی قدرت و طاقت سے باہر ہیں ان کے لیے خداوند تعالیٰ کے حضور میں دعا کرے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے :

برخیز و فشاں درخت خرم تا سیر شوی رسی بارشش
کان مریم تا درخت فشاں فرما فشاں در کنارشش

۲۔ مریمؑ نے موت کی تمنا کیوں کی؟ اس میں شک نہیں ہے کہ خداوند تعالیٰ سے موت کا تقاضا کرنا اچھا کام نہیں ہے لیکن مریمؑ کی زندگی میں ایسے سخت حادثات بھی پیش آجاتے ہیں کہ جس سے زندگی کا ذائقہ بالکل تلخ اور ناگوار ہو جاتا ہے۔ خصوصاً ایسے مواقع پر کہ وہاں انسان مقدس مقام یا اپنے شرف و حیثیت کو خطرے میں دیکھتا ہے اور دفاع کی طاقت نہیں رکھتا، ایسے مواقع پر بعض اوقات روحانی اوقیت سے رہائی کے لیے موت کا تقاضا کرتا ہے۔

لیکن اس قسم کے افکار جو کہ شاید بہت ہی مخمور سی مدت کے لیے صورت پذیر ہوئے تھے زیادہ دیر تک نہ رہے اور خداوند تعالیٰ کے عجزات یعنی پانی کا چشمہ چھوٹے اور مجبور کا خشک درخت بلبل ہو جاتے دیکھا تو یہ تمام افکار بظرف ہو گئے، اور اطمینان و سکون کا فرمان کے دل

ایک سوال کا جواب : بعض لوگ پوچھتے ہیں کہ اگر مجبورہ انبیاء اور ائمہ کے ساتھ مخصوص ہے تو پھر جناب مریمؑ کے لیے ایسے عجزات کی ضرورت پذیر ہوئے۔

بعض مفسرین نے اس سوال کے جواب کے لیے ان کو حضرت عیسیٰؑ کے عجزات میں سے قرار دیا ہے کہ جو تمہید کے طور پر وقوع پذیر ہوئے تھے انہیں "ارھاض" سے تعبیر کرتے ہیں۔ (ارھاض مقدمہ کے طور پر ظاہر ہونے والے مجبورے کے معنی میں ہے)۔ لیکن اس قسم کے جوابات کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ عجزات کا ظہور انبیاء اور ائمہ کے علاوہ کسی کے لیے کوئی مانع نہیں رکھتا، یہ وہی مجبورہ ہے کہ جس میں "تحدی" یعنی جلیج اذعائے نبوت و امامت کے ساتھ ہو۔

۲۔ خاموشی کا روزہ : مذکورہ بالا آیات کا ظاہری مضمون اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ حضرت مریمؑ ایک خاص مصلحت کی خاطر خاموشی پر مجبور تھیں اور خداوند تعالیٰ کے حکم سے اس خاص مدت میں بات کرنے سے اجتناب کر رہی تھیں تاکہ ان کا نور و پیر عیسیٰؑ بات کرنے کے لیے اب کشائی کرے اور ان کی پاکیزگی کا دفاع کرے۔ کیونکہ یہ بات ہر لحاظ سے مؤثر تر اور بہت سے امور پر محیط تھی۔

لیکن آیت کی تعبیر سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ سکوت (خاموشی کے روزے کی منت ماننا) اُس قدم اور جمیعت کے لیے ایک جانا پہانا کام تھا، اسی وجہ سے اس کام کے لیے انہوں نے جناب مریمؑ پر کوئی اعتراض نہ کیا۔

لیکن اس قسم کا روزہ شریعت اسلام میں مشروع اور جائز نہیں ہے۔ حضرت امام علی بن الحسین علیہ السلام سے ایک حدیث میں منقول ہے :

صوم السکوت حرام

خاموشی کا روزہ حرام ہے۔

یہ بات ظہور اسلام کے زمانے اور اُس زمانے کی شرائط میں اختلاف اور فرق کی وجہ سے ہے۔

ہاں البتہ اسلام میں کامل روزہ کے آداب میں سے ایک بات یہ ہے کہ انسان روزے کی حالت میں اپنی زبان کو گناہ اور مکروہات کی آلودگی سے بچائے اور اسی طرح اپنی آنکھوں کو ہر قسم کی آلودگی سے بند رکھے، جیسا کہ ہم امام صادق علیہ السلام سے منقول ایک حدیث میں پڑھتے ہیں :

ان الصوم ليس من الطعام والشراب وحده، ان مريدو قالت لى نذرت
لرحمن صوما، اى صمتا، فاحفظوا السكوت و غصوا البصار كرو ولا
تحاسدوا ولا تبتازعوا :

روزہ صرف کمانے اور پینے سے ہی نہیں ہے، حضرت مریمؑ نے کہا : کہ میں نے خدا کے رخص

اٹھایا جاتل گا۔

تفسیر

حضرت مسیح کی گوارے میں باتیں :

آخر کار حضرت مریمؑ اپنے بچے کو گرو میں لیے ہوئے بیابان سے آبادی کی طرف لوٹیں اور اپنی قوم اور رشتہ وادوں کے پاس آئیں۔ (فائتہ بد قومہا تحملہ)۔

جونی انہوں نے ایک فرمولہ پڑھ کر ان کی گرو میں دیکھا تعجب کے مارے ان کا منہ کھلا کھلا رہ گیا۔ وہ لوگ کہ جو مریمؑ کی پاکدامنی سے بھی طرح واقف تھے اور ان کے تقویٰ و کرامت کی شہرت کو سن چکے تھے سخت پریشان ہوئے۔ یہاں تک کہ ان میں سے کچھ تو خشک و شبہ میں پگھلے اور بعض ایسے لوگ کہ جو فیصلہ کرنے میں جلد باز تھے انہوں نے اُسے برا بھلا کہنا شروع کر دیا اور کہنے لگے اس بیکاری کے ساتھ تبار سے مدش ماضی پر بہت افسوس ہے اور صد افسوس اس پاک خاندان پر کہ جو اس طرح بدنام ہوا۔ کہنے لگے اے مریمؑ تو نے یقیناً بہت ہی عجیب اور بڑا کام انجام دیا ہے (قالوا یا مریم ولقد جئت شبیثاً خریثاً) ۱

بعض نے ان کی طرف لٹک کیا اور کہا : "اے ہارون کی بہن چچا اب کو کوئی بڑا آدمی نہیں تھا اور تیری ماں بھی بیکار نہیں تھی۔"

(یا اخت ہرون ماکان ابوہ اسراً سوء وماکانت املک نبیاً)۔

ایسے پاک و پاکیزہ ماں باپ کے ہوتے ہوئے ہم یہ تیری کیا حالت دیکھ رہے ہیں۔ تو نے اپنے باپ کے طریقہ اور ماں کے سہل سہل کوئی بڑائی دیکھی تھی کہ تو نے اُس سے روگردانی کر لی !

یہ بات کہ جو انہوں نے مریمؑ سے کہی کہ "اے ہارون کی بہن" مفسرین کے درمیان مختلف تفاسیر کا موجب بنی ہے، لیکن جو بات سب سے زیادہ صحیح نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ ہارون ایک ایسا پاک و صالح آدمی تھا کہ وہ بنی اسرائیل کے درمیان ضرب المثل ہو گیا تھا۔

وہ جس شخص کا پاکیزگی کے ساتھ تعارف کروانا چاہتے تھے تو اس کے بارے میں کہتے تھے کہ وہ ہارون کا بھائی ہے یا ہارون کی بہن ہے۔ ہر طرح طبری نے صریح بیان میں اس معنی کو ایک مختصر حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کیا ہے ۲

ایک اور حدیث میں کہ جو کتاب "سعد السعود" میں آئی ہے اس میں ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مغیرہ کو (عیسائیوں کو اسلام کی دعوت دینے کے لیے) نجران بھیجا تو عیسائیوں کی ایک جماعت نے قرآن پر اعتراض کے طور پر کہا، کیا تم اپنی کتاب میں یہ نہیں پڑھتے کہ "یا اخت ہارون" حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ اگر ہارون سے مراد حضرت موسیٰؑ کے بھائی ہیں تو ہم اور ہارون کے درمیان تو بہت فاصلہ تھا۔

مغیرہ کو جواب دے سکا۔ لہذا اُس نے اس بارے میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کیا، تو آپؐ نے فرمایا :

تو نے اُن کے جواب میں یہ کیوں نہ کہا کہ بنی اسرائیل کے درمیان یہ قول تھا کہ نیک افراد کو نبی اور صالحین

۱۔ فری۔ کتاب منوات میں انب کے قول کی بنا پر، عظیم باعجب کے معنی میں ہے اور اصل میں فری کے ساتھ سے چڑھ کے چلا کر غراب کرنے کیلئے پادہ پاؤں کرنے کے

۲۔ معنی میں ہے۔

۳۔ تفسیر تفسیر ۲۵، ۲۲۲۔

کے ساتھ نسبت دیا کرتے تھے ۳۔

اس وقت جناب مریمؑ نے خدادادہ تعالیٰ کے حکم سے خاموشی اختیار کی، صرف ایک کام جو انہوں نے انجام دیا یہ تھا کہ اپنے فرمولہ پچھلے صلیبی کی طرف اشارہ کیا (فاشارت الیہ)۔

لیکن اس کام نے اُن کے تعجب کو اور بھی بڑھائی نہ کر دیا اور شاید ان میں سے بعض نے اس بات کو ان کے ساتھ ٹھٹھ کرنے پر محمول کیا اور وہ غصے میں نگر ہوئے : اے مریم ! ایسا کام کر کے تو اپنی قوم کا مذاق بھی اڑا رہی ہے۔

بہر حال انہوں نے اُس سے کہا : ہم ایسے بچے کے ساتھ کہ جو ابھی گوارہ میں ہے کیسے باتیں کریں۔ (قالوا کیف نکلمو من کان فی المہد صبیئاً)۔

مفسرین نے لفظ "کان" کے بارے میں کہ جو ماضی پر دلالت کرتا ہے اس مقام پر بہت بحث کی ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پر یہ لفظ موجود وصف کے ثبوت و لزوم کے لیے ہے اور زیادہ واضح الفاظ میں انہوں نے جناب مریمؑ سے یہ کہا کہ ہم اس بچے سے کہ جو ابھی تک گوارے میں ہے کیسے بات کریں ؟

قرآن مجید کی دوسری آیات اس معنی پر شاہد ہیں مثلاً :

كنت وخیر امة اخرجت للناس

"تم بہترین امت ہو کہ جو انسانی معاشرے کے فائدہ کے لیے وجود میں آئے ہو (آل عمران-۱۱)۔

مسلک طور پر لفظ "کنتم" (تم تھے) یہاں پر ماضی کے معنی میں نہیں ہے بلکہ یہ اسلامی معاشرے کے لیے ان صفات کے تسلسل اور ثبوت کا بیان ہے۔

اس کے علاوہ انہوں نے "مہد" (گوارہ) کے بارے میں بھی بحث کی ہے، کہ ابھی تک حضرت عیسیٰؑ گوارہ تک نہیں پہنچے تھے، بلکہ آیات کا ظاہر یہ ہے کہ حضرت مریمؑ کے اُس جمعیت کے پاس پہنچے ہی، جبکہ حضرت عیسیٰؑ اُن کی آغوش میں تھے، اُن کے اور لوگوں کے درمیان باقی نہیں رہیں۔

لیکن لغت عربی میں لفظ "مہد" کے معنی کی طرف توجہ کرتے ہوئے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے۔

لفظ "مہد" جیسا کہ راجع مفردات میں لکھا ہے ایسی جگہ کے معنی میں ہے کہ جو بچے کے لیے تیار کی جاتی ہے۔ چاہے وہ گوارہ ہو یا ماں کی گود یا بستر اور مہد اور مہاد دونوں ہی لغت میں (المکان المہد الموطأ) : " (آرام اور سونے کے لیے) تیار کی جاتی ہے اور

بچی ہوئی جگہ کے معنی میں "۔

بہر حال وہ لوگ اس کی یہ بات سن کر پریشان ہو گئے، بلکہ شاید غضب ناک ہو گئے۔ جیسا کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ایک دوسرے سے یہ کہا کہ اس کا تفسیر اور استہزاء کرنا، جادہ عفت و پاکدامنی سے اس کے انحراف کی نسبت ہمارے لیے زیادہ سخت اور گہن ہے۔

لیکن یہ حالت زیادہ دیر تک قائم نہ رہی۔ کیونکہ اس فرمولہ پچھلے نے بات کرنے کے لیے زبان کھولی اور کہا : میں اللہ کا بندہ ہوں (قالن عبد اللہ)۔ اُس نے مجھے آسمانی کتاب مرحمت فرمائی ہے (اتانی الکتاب)۔ اور مجھے پیغمبر قرار دیا ہے۔ (وجعلنی نبیاً)۔

اور خدا نے مجھے ایک بابرکت وجود قرار دیا ہے، خواہ میں کہیں بھی ہوں۔ میرا وجود بندوں کے لیے ہر لحاظ سے مفید ہے۔ (وجعلنی مبارکاً نافعاً)۔

اور اس نے مجھے تاحیات نماز پڑھتے رہنے اور زکوٰۃ دینے کی وصیت کی ہے۔ (واوصانی بالصلوٰۃ والزکوٰۃ مادامت حیاء)۔

اور اس کے علاوہ مجھے اپنی والدہ کے بارے میں نیکوکار، قدر دان کرنے والا اور خیر خواہ قرار دیا ہے (وہو ابا والدتی)۔ اور اس نے مجھے جبار و شقی قرار نہیں دیا ہے (ولسو یجعلنی جباراً شقیّاً)۔

جبار اُس شخص کو کہتے ہیں جو اپنے لیے تو لوگوں پر ہر قسم کے حقوق کا قائل ہو۔ لیکن کسی دوسرے کے لیے اپنے آپ کو کسی بھی حق کا قائل نہ اس کے علاوہ "جبار" اُس شخص کو بھی کہتے ہیں جو بغض و عناد کے عالم میں لوگوں کو مارتا اور نابود کرتا ہو۔ اور فحان عجل کی پروردگار یا وہ یہ چاہتا ہو کہ اپنی کمی اور نقص کو خیر اور برائی کے دعوے کے ذریعے بڑا کرے۔ یہ ساری کی ساری صفات ایسی ہیں جو ہر انسان کے ظاہر اور مخبرین سے ظاہر ہوتی رہتی ہیں۔

"شقی" اُس شخص کو کہا جاتا ہے جو معصیت و بلا اور سزا کے اسباب اپنے لیے فراہم کرتا ہے اور بعض نے کہا ہے اس سے مراد ایسا شخص ہے جو نصیحت قبول نہیں کرتا۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں معانی ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہیں۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت عیسیٰ فرماتے ہیں:

میرا دل نرم ہے اور میں اپنے آپ کو اپنے نزدیک چھوٹا سمجھتا ہوں۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ دونوں صفات جبار و شقی کا لفظ مقابل ہیں۔

آخر میں یہ نو مولود کو کہتا ہے: "خدا کا مجھ پر سلام و درود ہو اس دن کہ جب میں پیدا ہوا اور اُس دن کہ جب میں مرے گا اور اُس دن کہ جب میں زندہ کر کے اٹھایا جاؤں گا" (والسلام علی یوم ولدت و یوم اموت و یوم ابعث حیثاً)۔ جیسا کہ ہم نے حضرت یحییٰ سے منسوب آیات کی شرح میں بیان کیا ہے، یہ تین دن انسان کی زندگی میں۔ زندگی ساز اور خطرناک دن ہیں جن میں سوائے لطف خدا کے سلامتی میسر نہیں ہوتی۔ اسی لیے حضرت یحییٰ کے بارے میں بھی یہ جملہ آیا ہے اور حضرت عیسیٰ صلی علیہ وسلم کے بارے میں بھی، لیکن اس فرق کے ساتھ کہ پہلے موقع پر خداوند تعالیٰ نے یہ بات کہی ہے اور دوسرے موقع پر حضرت یحییٰ نے یہ تعاضل کیا ہے۔

چند اہم نکات:

۱۔ قرآن کا ضمن بیان اور ولادت عیسیٰ: قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت اس قسم کے اہم مسائل میں خصوصیت کے ساتھ دیکھی

لے "ہو" (بار بار ذکر کے ساتھ) نیکوکار شخص کے معنی میں ہے جبکہ "ہو" (ہمارے زیر کے ساتھ) نیکوکاری کی صفت کے معنی میں ہے۔ اس بات پر توجہ رکھنی چاہیے کہ یہ لفظ اولیٰ آیت میں مبالغہ پر حملت ہے نہ کہ صلوٰۃ و زکوٰۃ پر اور اسی لائق معنی اس طرح ہے جعلائی ہوا "بوالدتی" (مجھے اپنی والدہ کے لیے نیکوکار قرار دیا ہے)۔

جبار کے بارے میں مزید وضاحت اور اس سوال کے جواب کے لیے کہ کس طرح خدا کی ایک صفت جبار ہے۔ تفسیر نمونہ جلد ۵ ص ۲۹۵ (اردو ترجمہ) کی طرف رجوع فرمائیں۔ تفسیر نمونہ الدین رازی ذیل آیہ زیر بحث۔

ہے۔ دیکھیے کس طرح قرآن اس قدر غرائف سے مخلوط ہے کہ مختصر، مگر، زندہ، پُر معنی، منہ لہجی اور ناطق عبارات کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ طرح سے کہ ہر قسم کی غرائف اور بیروہ باتوں کو اس سے علیمہ اور دُور کر دیتا ہے۔

جاذبِ نظرات یہ ہے کہ مذکورہ بالا آیات میں سات نمایاں صفات، دو اعمال اور ایک دعا کا ذکر ہوا ہے۔ سات صفات کی تفصیل یہ ہے:

پہلی صفت: خدا کا بندہ ہونا کہ جس کا ذکر تمام اوصاف کی ابتدا میں ہے۔ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آدمی کا عظیم ترین مقام تمام عبودیت ہی ہے۔

دوسری صفت: اُس کے بعد کتاب آسمانی کا حامل ہونا ہے۔

تیسری صفت: مقامِ نبوت ہے۔ (البتہ ہم مانگتے ہیں کہ تمام نبوت کے لیے یہ بات لازم نہیں ہے کہ وہ ہمیشہ آسمانی کتاب کا حامل ہو)۔

چوتھی صفت: مقامِ عبودیت درہمیری کے بعد مبارک ہونے کا بیان ہے یعنی معاشرے کی حالت کے لیے مفید ہونے کو یہ کیا گیا ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ مبارک کا معنی نفع ہے (یعنی زیادہ نفع مند ہونا)۔

پانچویں صفت: ماں کے لیے نیکو کاری بیان کی گئی ہے۔

چھٹی اور ساتویں صفت: جبار و شقی نہ ہونا اور ان کے بجائے متواضع، حق شناس اور سعادت مند ہونا ہے۔ تمام کاموں میں سے صرف دو یعنی پروردگارِ عالم کی طرف سے نماز و زکوٰۃ کی وصیت کے بیان پر انحصار کرتے ہیں اور یہ ان دونوں پروردگار اور کاموں کی انتہائی اہمیت کی وجہ سے ہے کیونکہ یہ دونوں کام خالق و مخلوق کے ساتھ ارتباط کی ریز ہیں۔ ایک لحاظ سے تمام مذہبی پروگراموں کو انہیں دو میں خلاصہ کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ ان میں سے بعض انسان کا رشتہ مخلوق سے اور بعض خالق سے جوڑتے ہیں۔

اب رہے گی وہ دعا کہ جو وہ اپنے لیے کرتے ہیں اور وہ اہم جو وہ اپنی زندگی کے آغاز میں خدا سے کرتے ہیں یہ ہے: یا ربّ خدایا! اِنّ یمین و اِلٰہ کو میرے لیے سلامتی والا قرار دے اول ولادت کا دن، دوسرے موت کا دن اور تیسرے وہ دن جبکہ قیامت میں مجھے زندہ ہونا ہے اور مجھے اِنّ یمین خناس مرحلون میں امن و امان مرحمت فرما۔

۲۔ ماں کا مقام: اگرچہ حضرت عیسیٰ پروردگارِ عالم کے نافرمانی فرمان سے ماں سے، بغیر باپ کے پیدا ہوئے۔ لیکن یہ بات کہ مذکورہ بالا آیت میں وہ اپنے انتظامات کو گنتے ہوئے ماں کے لیے نیکو کاری کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ بات ماں کے مقام اور تربیت کی اہمیت پر ایک روشن دلیل ہے۔ غرضی طور پر یہ اس بات کی بھی نشاندہی ہے کہ یہ نو مولود بچہ ایک مجروحہ کے مطابق بول اٹھا ہے۔ اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ وہ انسان کے لیے ایک نمونہ ہے کہ جو صرف ماں سے پیدا ہوا ہے اور اس میں باپ کا دخل نہیں ہے۔

بہر حال اگرچہ آج کی دنیا میں ماں کے مقام و مرتبہ کے بارے میں بہت کچھ کہا جاتا ہے، یہاں تک کہ (سال میں) ایک دن کو روزِ مادر (ماں کا دن) کے نام سے منسوب کر دیا گیا ہے، لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ شہنی تمدن کی وضع کچھ ایسی ہے کہ یہ ماں باپ کا اولاد سے رابطہ بہت ہی جلدی منقطع کر دیتا ہے۔ اس طرح سے کہ بڑا ہونے کے بعد اولاد میں یہ رابطہ احساس بہت ہی کم باقی رہتا ہے۔ اس سلسلے میں اسلام میں حیرت انگیز روایات ہیں جو مسلمانوں کو ماں کے مقام و مرتبہ کی اہمیت کے بارے میں بہت زیادہ وصیت کرتی ہیں۔

تاکہ صرف زبانی طور پر ہی نہیں بلکہ عملی طور پر بھی وہ اس سلسلے میں کوشش کریں۔
ایک حدیث۔ امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ :

یا رسول اللہ من ابر قال امك قال شع من قال امك قال شع من قال امك
قال شع من قال ابك ۔

اے پیغمبر خدا! میں کس کے ساتھ نیکی کروں۔ آپ نے فرمایا : اپنی ماں سے۔ عرض کیا اس کے
بعد کس سے؟ پھر فرمایا اپنی ماں سے۔ تیسری مرتبہ اس نے پھر عرض کیا اس کے بعد کس سے؟
فرمایا اپنی ماں سے۔ چوتھی مرتبہ جب اس نے اس سوال کو دہرایا تو آپ نے فرمایا : اپنے
باپ سے۔

ایک اور حدیث میں یہ منقول ہے کہ ایک نوجوان جہاد میں شرکت کے لیے پیغمبر کی خدمت میں حاضر ہوا (چونکہ جہاد واجب غری نہیں تھا
اس لیے) رسول اللہ نے فرمایا :

الک والدة قال نعم قال فالزمها فان الجنة تحت قدمها

کیا تیری ماں زندہ ہے؟ اُس نے عرض کیا : جی ہاں۔ فرمایا : ماں کی خدمت میں رہو کیونکہ جنت
ماؤں کے قدموں کے نیچے ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اگر ہم اُن بے شمار رحمتوں کو، جو ماں تل کے زلمے میں، وضع حمل تک پھر دھڑلہ پڑنے کے زلمے میں اور
— دیکھ بھال کرنے میں اس کے بڑے ہونے تک برواشت کرتی ہے اور طرح طرح کے رنج اور دکھ میں راتوں کو جاگنے اور اس کی بیابیلیں
فرزند کے لیے کھلی آغوش کے ساتھ لگی رہنے کو۔ دیکھیں تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ انسان اس راہ میں جس قدر بھی کوشش کرے پھر بھی وہ ماں کے
حقوق کے بارے میں قرضدار ہے۔

بناظر نظر بات یہ ہے کہ ایک حدیث میں ہے کہ جناب ام سلمہ پیغمبر اکرم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا :
تمام افتخارات تو مردوں کے حصے میں آگئے، بیچاری عورتوں کا ان اعزازات میں کیا حصہ ہے؟
پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا :

لی اذا حملت المریئة كانت بمنزلة الصائغ القادح المجاهد بنفسه
وماله في سبيل الله فاذا وضعت كان لها من الاجر ما لا يدري احد ما
هو لعظمته ، فاذا ارضعت كان لها بكل مصصة كعدل عتق محرر من
ولد اسمعيل ۔ فاذا فرغت من رضاعه ضرب ملك كريم على جنبها
وقال استأنفى العمل فقد غفر لك ۔

ماں (عورتیں بھی بہت سے اعزاز رکھتی ہیں) جس وقت عورت حاملہ ہوتی ہے تو وہ تمام مدت عمل

میں روزہ دار، شب زندہ دار اور جان و مال کے ساتھ خدا کی راہ میں جہاد کرنے والے کی منزلت
میں ہوتی ہے اور جس وقت اس کا وضع حمل ہوتا ہے، اللہ اسے اس قدر اجر دیتا ہے کہ
کوئی شخص عظمت کی بنا پر اس کی حد کو نہیں جانتا اور جس وقت وہ اپنے بچے کو دودھ پلاتی ہے
تو خداوند تعالیٰ بچے کی طرف سے ہر جسے کے مقابلے میں اولاد الملیح میں سے ایک غلام آزاد کرنے
کا اجر اسے عطا کرتا ہے۔ اور جس وقت بچے کے دودھ پلانے کا زمانہ ختم ہو جاتا ہے خدا کے کرم
فرشتوں میں سے ایک اس کے پہلو پر ہاتھ مارتا ہے اور کہتا ہے کہ اپنے اعمال کو نئے سرے سے
شروع کر کیونکہ خداوند تعالیٰ نے تیرے سب گناہ بخش دیئے ہیں۔ (گویا تیرا نام نہ عمل نئے سرے
سے شروع ہو رہا ہے؟)

تفسیر نمونہ کی جلد ۶ میں سورۃ بنی اسرائیل کی آیہ ۲۳ کے ذیل میں بھی ہم نے اس سلسلہ کی کچھ بحثیں کی ہیں۔

۳۔ باکرہ سے بچہ پیدا ہونا : مذکور بالا آیات سے ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا علمی لحاظ سے یہ بات ممکن ہے کہ باپ
کے بغیر بچہ پیدا ہو۔ کیا حضرت عیسیٰ کا صرف آئیں ماں سے پیدا ہونے کا مسئلہ اس بارے میں سائنس دانوں کی تحقیقات کے مخالف نہیں ہے؟
اس میں شک نہیں کہ یہ کام معجزانہ طور پر نمود۔ نہ یہ ہوا تھا، لیکن موجودہ زمانے کا علم اور تحقیق اس قسم کے امر کے امکان کی نفی نہیں کرتا۔
بلکہ اس کے ممکن ہونے کی تصریح کرتا ہے۔

خاص طور پر نر کے بغیر بچہ پیدا ہونا : بت سے جانوروں میں دیکھا گیا ہے اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ نطفے کے انعقاد کا مسئلہ
صرف انسانوں کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے۔ اس امر کے امکان کو عمومی حیثیت سے ثابت کرتا ہے۔

”ڈاکٹر الکس کارل“ مشہور فرانسیسی ذیوقہ جیٹ اور حیات شناس اپنی کتاب ”انسان موجود ناشاختہ“ میں لکھتا ہے :

جس وقت ہم اس بارے میں غور کرتے ہیں۔ تولید مثل میں ماں اور باپ کا کتنا کتنا حصہ ہے تو ہمیں ”لوب“ اور ”بائالون“ کے تجربوں
کو بھی نظر میں رکھنا چاہیے کہ قربانہ کے بعد نہ ہوتے چھوٹے سے تخم کو سپر باؤنڈ کے داخل کے بغیر ہی خاص تکنیک کے ذریعہ ایک جدید
قربانہ کو وجود میں لایا جاسکتا ہے۔

اس ترتیب سے کہ ممکن ہے کہ کسی سنہ ذیوقہ کے ایک عامل کو ”فرسٹل“ کا بائشین بنا دیا جائے لیکن ہر حالت میں ہمیشہ ایک عامل یا وہ
کا وجود ضروری ہے۔

اس بنا پر وہ چیز جو سائنسی یحوت سے بچے کے تولد میں قطعیت رکھتی ہے وہ ماں کے نطفہ (اول) کا وجود ہے۔ ورنہ نر کے نطفہ (سپر باؤنڈ)
کی جگہ پر دوسرا عامل اس کا بائشین بنایا جاسکتا ہے۔ اسی بنا پر نر کے بغیر بچے کی پیدائش کا مسئلہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جو آج کی دنیا میں ڈاکٹروں
کے نزدیک قابل قبول قرار پائی ہے۔ اگرچہ یہ ایک تحقیق شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔

ان سب باتوں سے قطع نظر یہ مسئلہ نہایت علمی و تحقیقی کے قرائین آفرینش کے سامنے ایسا ہے جیسا کہ قرآن کہتا ہے :

ان مثل عیسیٰ عند اللہ کمثل آدم خلقہ من تراب شوقالہ کن
فیكون :

عیسیٰ کی مثال خدا کے نزدیک آدم جیسی ہے کہ اُسے مٹی سے پیدا کیا پھر اس کو حکم دیا کہ ہوجا تو
وہ بھی ایک کامل موجود ہو گیا۔ (آل عمران - ۵۹)

یعنی یہ خالق عادت اس خالق عادت سے زیادہ اہم نہیں ہے۔

۲۔ نوزائیدہ بچہ کس طرح بات کر سکتا ہے ؟ یہ بات سمجھنے کے بغیر ظاہر ہے کہ معمول یہ ہے کہ کوئی نوزائیدہ بچہ قولہ کے ابتدائی
گھٹنوں یا دونوں بات نہیں کرتا، کیونکہ بات کرنا دماغ کی کافی نشو و نما اور اس کے بعد زبان و جگر کے عضلات کا بڑھنا اور انسانی بدن کے
مختلف اعضا کی ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگی کا محتاج ہے۔ اور ان امور کے لیے حسب معمول کئی مہینے گزرنے چاہئیں تاکہ یہ بتدریج اور
آہستہ آہستہ پتھلوں میں فراہم ہوں۔

لیکن پھر بھی کوئی علمی دلیل اس امر کے محال ہونے پر ہمارے پاس نہیں ہے صرف یہ ایک غیر معمولی کام ہے اور تمام معجزات اس قسم
کے ہوتے ہیں یعنی سب ہی غیر معمولی کام ہوتے ہیں مگر محال عقلی، اس امر کی تشریح ہم نے انبیاء کے معجزات کی بحث میں کر دی ہے۔

۳۴۔ ذٰلِكَ عِيسٰی ابْنُ مَرْيَمَ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِي فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ
۳۵۔ مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَلَدٍ سُبْحٰنَہٗ اِذَا قَضٰی اَمْرًا فَاِنَّمَا
يَقُوْلُ لَہٗ کُنْ فَيَکُوْنُ ۝

ترجمہ

۳۴۔ یہ ہے عیسیٰ ابن مریم، وہ حق بات کہ جس میں وہ شک کرتے ہیں۔

۳۵۔ خداوند تعالیٰ کے لیے ہرگز یہ بات لائق نہیں ہے کہ اس کا کوئی بیٹا ہو۔ وہ منزہ ہے، جس وقت وہ کسی کام (کے کرنے)
کا فیصلہ کرتا ہے تو وہ کہتا ہے ہوجا۔ پس وہ ہوجاتا ہے۔

تفسیر

کیا خدا کا بیٹا ممکن ہے؟

قرآن مجید سابقہ آیات میں عیسیٰ کی پیدائش کے واقعہ کی بہت ہی عمدہ اور روشن و واضح تصویر کشی کرنے کے بعد اُن مشرک اہل باطلوں

فرخانات کی نفی کرتے ہوئے جو اُن لوگوں نے عیسیٰ کے بارے میں کسی میں اس طرح کہتا ہے عیسیٰ ابن مریم (ذالک عیسیٰ ابن مریم)
اس عبارت میں ان کے مریم کا بیٹا ہونے پر خصوصیت کے ساتھ تاکید کرتا ہے۔ تاکہ یہی بات خدا کا بیٹا ہونے کی نفی کی تمہید اور
مقدم بن جائے۔

اور اس کے بعد مزید کہتا ہے کہ "یہ وہ قول حق ہے کہ جس میں انہوں نے شک و شبہ کا اظہار کیا ہے اور ہر ایک نے انحراف کی راہ اختیار
کر لی ہے" (قول الحق الذی فیہ یسترون) ۱

یہ عبارت درحقیقت حضرت عیسیٰ کے بارے میں تمام گزشتہ مطالب کی صحت پر ایک تاکید ہے اور یہ کہ ان مطالب میں تھوڑی سی بھی
غلطی نہیں ہے۔

باقی رہی یہ بات کہ قرآن جو یہ کہتا ہے کہ : وہ اس بارے میں شک و شبہ میں ہیں، یہ حضرت مسیح کے دوستوں اور دشمنوں یا دوسرے
الفاظ میں عیسائیوں اور یہودیوں کی طرف اشارہ ہے ایک طرف سے ایک گمراہ گروہ نے ان کی والدہ کی پاکیزگی میں شک و شبہ کیا، اور دوسری طرف سے
ایک گروہ نے ان کے ایک انسان ہونے میں انکار شک کیا۔ یہاں تک کہ پھر یہی گروہ مختلف شمول اور قسوں میں تقسیم ہو گیا۔ بعض نے انہیں
صراحت کے ساتھ خدا کا بیٹا سمجھ لیا روحانی و جسمانی اعتبار سے حقیقی بیٹا، نہ کہ مجازی بیٹا) اور اس کے ساتھ تین خداؤں اور تثلیث کا مسئلہ اٹھا۔
بعض نے مسئلہ تثلیث کو عقلی طور پر ناقابل فہم کہہ کر یہ اعتقاد رکھ لیا کہ اسے تعبداً قبول کر لیا جائے اور بعض نے اس کی منطقی توجیہ کے لیے
بے بنیاد باتوں پر طعن مارا۔ خلاصہ یہ کہ جب وہ حقیقت کو نہ پا سکے، یا جب انہوں نے حقیقت کو اختیار کرنا نہ چاہا۔ تو افسانے کی راہ پر
چل نکلے ۲

۱۔ اہل آیت میں قرآن صراحت کے ساتھ کہتا ہے : خدا کے لیے یہ امر ہرگز شائستہ نہیں ہے کہ اس کا کوئی بیٹا ہو، وہ ایسی باتوں
سے پاک اور منزہ ہے۔ (مَا كَانَ لِلّٰہِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَلَدٍ سُبْحٰنَہٗ)۔

بلکہ وہ تو جس وقت بھی کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے اور اسے حکم دیتا ہے تو کہتا ہے ہوجا تو وہ ہوجاتی ہے۔ (اِذَا قَضٰی اَمْرًا فَاِنَّمَا
یَقُوْلُ لَہٗ کُنْ فَيَکُوْنُ)۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ صاحبِ فرزند ہونا۔ جیسا کہ عیسائی خدا کے بارے میں خیال کرتے ہیں۔ پروردگارِ عالم کے مقام
مقدس سے مطابقت نہیں رکھتا، کیونکہ ایک طرف تو اس کا لازم یہ ہے کہ اس کا جسم ہو، دوسری طرف سے محدودیت اور تیسری طرف سے
اعتیاج، خلاصہ یہ ہے کہ ان کے عقیدے کا تقیید خداوند تعالیٰ کو اس کے مقامِ مقدس سے کھینچ کر عالمِ مادہ کے قوانین کے ماتحت لانا اور اسے ایک
۱۔ اس جگہ کی ترکیب میں مفسرین نے بہت اشکات کیا ہے، لیکن اہل لحاظ سے اور گزشتہ آیات کو مدنظر رکھتے ہوئے جو بات زیادہ صحیح دکھائی
دیتی ہے وہ یہ ہے کہ "قول الحق" منقول ہے فعلِ مذکور کا اور "الذی فیہ یسترون" اس کی صفت ہے اور تقدیر میں اس طرح تھا :
"اقول قول الحق الذی فیہ یسترون"۔ نہیں حق کی بات کہتا ہوں جس میں وہ شک کرتے ہیں۔

۲۔ نصاریٰ کی تثلیث اور اس بارے میں جو فرخانات انہوں نے گھڑے ہیں ان کی مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ کی جلد ۲ سورہ نساء کی
آیہ ۱۶۱۔ ص ۶۵۲ (اُردو ترجمہ) کی طرف رجوع فرمائیے۔

ضعیف و محدود مادی وجود کے زمرہ میں قرار دینا ہے۔

وہ خدا کو جو اس قدر قدرت و توانائی رکھتا ہے کہ اگر وہ ارادہ کرے تو اس وسیع و عریض عالم کہ جس میں ہم رہ رہے ہیں کی مانند ہزار عالم محض اس کے ایک فرمان اور صرف اشارہ سے عالم ظہور میں آجائیں۔ کیا یہ بات شکر نہیں ہے اور اصول توحید و خدا شناسی سے انحراف نہیں ہے کہ ہم اُسے ایک انسان کی طرح صاحبِ فرزند سمجھ لیں اور وہ بیٹا بھی ایسا بیٹا کہ جو باپ کا ہم مرتبہ اور ہم پلہ ہو۔

”کن فیکون“ کی تعبیر جو قرآن مجید کی آیات میں آٹھ مواقع پر آئی ہے، امر غفلت میں خداوند تعالیٰ کی قدرت کی وسعت اور اس کے تسلط و حاکمیت کی بہت ہی عمدہ تصویر ہے۔ فرمان ”کن“ کی تعبیر سے زیادہ مختصر کا تصور نہیں ہو سکتا اور کوئی نتیجہ ”فیکون“ سے زیادہ جامع نظر نہیں آتا۔ خصوصاً ”فناء فصر یبع“ کی طرف توجہ کرتے ہوئے جو اس مقام پر فوری عمل درآمد کو ظاہر کرتی ہے۔ یہاں تک کہ اس مقام پر فناء تعریض فلاسفہ کی تعبیر کے مطابق تاخر زمانی پر بھی دلیل نہیں ہے بلکہ یہی تاخر زبانی کو بیان کرتی ہے جو معلول کے علت پر ترتیب میں پائی جاتی ہے (موجودیجے گا)

فرزند کی نفی یعنی خدا سے ہر قسم کے احتیاج کی نفی۔

اصلی طور پر نہ موجودات کو اولاد و فرزند کی احتیاج کس لیے ہوتی ہے؟ کیا اس کے علاوہ بھی کوئی اور وجہ ہو سکتی ہے کہ ان کی عمر محدود ہوتی ہے اور اس غرض سے کہ ان کی نسل منقطع نہ ہو اور ان کی حیات نوعی جاری و ساری رہے لہذا ضرورت ہے اس بات کی کہ ان سے اولاد پیدا ہوجے اجتماعی نقطہ نظر سے، ایسے کام جن میں انسانی قوت کے اکمال کو سر انجام دینے کی ضرورت ہوتی ہے، اس بات کا زیادہ سبب بنتی ہے کہ انسان کا تعلق فرزند کے ساتھ قائم رہے۔

اس کے علاوہ جذباتی و نفسیاتی ضرورتیں اور تنہائی کی وحشت کو دور کرنے کی احتیاج اسے اس کام کی دعوت دیتی ہے۔ لیکن اُس خدا کے بارے میں کہ جو ازلی وابدی ہے، جس کی قدرت کی کوئی انتہا نہیں ہے اور نہ جذباتی و نفسیاتی احتیاج کا سلسلہ اس کی پاک ذات کے لیے کوئی مفہوم رکھتا ہے، کیا یہ امور تصور کیے جاسکتے ہیں؟

اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ وہ لوگ جو خدا کے لیے فرزند کے قائل ہیں، انہوں نے اُس کا اپنے اوپر قیاس کر لیا ہے اور انہوں نے اُس میں بھی وہی باتیں سمجھ لی ہیں کہ جن باتوں کو وہ اپنے اندر سمجھتے ہیں حالانکہ ہماری کوئی بھی چیز خدا کی مانند نہیں ہے (لیس کے مشابہ شئی نہ)

پہلی ہجرت کے بارے میں ایک اہم تاریخی نکتہ:

پہلی ہجرت جو اسلام میں واقع ہوئی وہ مسلمانوں کے ایک اچھے خاصے گروہ کی جہت کی طرف ہجرت تھی۔ یہ گروہ چند مردوں اور چند عورتوں پر مشتمل تھا۔ انہوں نے مشرکین قریش کے چنگل سے رہائی پانے اور اسلام کے آئندہ کے پروگراموں پر عمل درآمد اور زیادہ سے زیادہ تیار کرنے کے لیے ”کن فیکون“ کے معنی کے بارے میں خدا سے نفی فرزند کے دلائل سے متعلق ہم جلد اول سورہ بقرہ کے آیت ۱۱۶ اور ۱۱۷ کے ذیل میں بھی بحث کر چکے ہیں۔

خدا کے قصد سے کمزور چھوڑ دیا، اور جیسا کہ ان کا اندازہ تھا، دلوں پر انہیں یہ موقع مل گیا کہ امن و سکون کے ساتھ زندگی گزار سکیں اور سلامتی و آرام اور خود سازی کے کاموں میں مشغول ہو سکیں۔

یہ خبر مکہ میں قریش کے سرداروں تک بھی پہنچ گئی، انہوں نے اس مسئلہ کو اپنے لیے خطرے کا اعلان سمجھا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ جہت مسلمانوں کے لیے ایک پناہ گاہ بن جائے گا اور شاید وہ قوت و طاقت حاصل کرنے کے بعد مکہ کی طرف پلٹ آئیں، اور ان کے لیے بڑی مشکلات پیدا کر دیں۔

صلح و مشورہ کے بعد انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ خاندانوں میں سے دو افراد کو منتخب کر کے نجاشی کے پاس بھیجیں تاکہ وہ دلوں پر مسلمانوں کے وجود کے خطرات کے بارے میں نجاشی کو تفصیل سے آگاہ کریں۔ اور انہیں اس اطمینان و سکون کی سرزمین سے باہر نکال دیں۔

قریش نے عمرو بن عاص اور عبداللہ ابن ابی رسیعہ کو نجاشی اور اس کے لشکر کے بڑے بڑے افسروں کے لیے بہت سے ہدایوں اور تحفوں کے ساتھ روانہ کیا۔

اُم سلمہ زوجہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتی ہیں کہ ہم جب سرزمین حبشہ میں پہنچے تو ہم نے نجاشی کا حسن سلوک دیکھا۔ ہمیں کسی قسم کی مذہبی پابندی نہیں تھی، کوئی ہمیں تکلیف نہیں پہنچاتا تھا، لیکن قریش نے اس مسئلہ سے آگاہ ہونے کے بعد دو آدمیوں کو بہت سے ہدایا و تحائف کے ساتھ بھیج کر انہیں یہ حکم دیا تھا کہ خود نجاشی سے ملاقات کرنے سے پہلے اس کے بڑے بڑے منصب داروں سے ملاقات کرنا اور ان کے وسیلے اور تحائف انہیں پیش کرنا، اس کے بعد نجاشی کے ہدایا اور تحائف کو اُس کی خدمت میں پیش کرنا اور اُس سے یہ تقاضا کرنا کہ مسلمانوں کو ان سے کوئی بات کیے بغیر ان کے سپرد کر دیں۔

انہوں نے اس پروگرام پر پورا پورا عمل کیا۔ پہلے نجاشی کے منصب داروں سے مل کر انہیں یہ بتایا کہ: چند بے وقوف جوانوں کے ایک گروہ نے تمہاری سرزمین میں پناہ لے لی ہے، انہوں نے اپنا دین و آئین ترک کر دیا ہے اور تمہارے دین میں بھی داخل نہیں ہوئے۔ انہوں نے ایک نئے دین کو بدعت کے طور پر جاری کیا ہے، جو ہمارے اور تمہارے لیے غیر معروف ہے۔

اشراف قریش نے ہمیں تمہارے پاس بھیجا ہے تاکہ ہم ان کے شر کو اس ملک سے کم کر دیں اور انہیں ان کی قوم کی طرف واپس لوٹا دیں۔ انہوں نے منصب داروں سے یہ وعدہ لیا کہ جس وقت نجاشی اُن سے مشورہ کرے تو وہ اس نظریے کی تائید کریں گے اور اُس سے یہ کہیں گے کہ ان کی قوم ان کے حالات سے زیادہ بہتر طور پر آگاہ ہے۔

اس کے بعد انہوں نے نجاشی کے دربار میں باریابی حاصل کی اور وہی پُر فریب باتیں اُس سے بھی کہیں۔ ان کا یہ پروگرام بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا اور ان کی یہ پُر فریب باتیں اُن کو بکثرت ہدایا و تحائف کے ساتھ سبب بنیں کہ نجاشی کے مصاحبین نے بھی ان کی تائید و تصدیق کر دی۔

اچانک ورق اٹھا اور نجاشی سنت غضب ناک ہوا اور کہنے لگا خدا کی قسم میں ایسا کام نہیں کروں گا۔ یہ ایک ایسا گروہ ہیں کہ جنہوں نے میری پناہ لی ہے، اور انہوں نے میرے ملک کو اس کے امن و امان کی وجہ سے دوسرے ملکوں پر ترجیح دی ہے۔ جب تک میں انہیں دعوت نہ دے لوں اور تحقیق نہ کروں میں تمہاری اس تجویز پر عمل نہیں کروں گا۔

اگر واقعہ معاملہ اسی طرح ہوا کہ جیسے یہ کہتے ہیں تو پھر میں انہیں ان دو افراد کے حوالے کر دوں گا اور انہیں اپنے ملک سے نکال دوں گا۔

۳۸۔ اس روز ان کے کیسے سننے والے کان اور کسی دیکھنے والی آنکھیں ہوں گی جبکہ وہ ہمارے پاس آئیں گے، لیکن آج یہ کھلی گمراہی میں ہیں۔

۳۹۔ (قیامت کا دن کہ جو سب کے لیے مائے ناسف ہے) انہیں اس یومِ حسرت سے ڈرا، وہ دن کہ جس میں ہر چیز ختم ہو جائے گی۔ حالانکہ وہ غفلت میں ہیں اور وہ ایمان نہیں لاتے۔

۲۰۔ ہم زمین کے بھی اور اس پر موجود تمام لوگوں کے بھی وارث ہو جائیں گے۔ اور سب کے سب ہماری طرف ہی لوٹ کر آئیں گے۔

قیامت، حسرت کا دن :

منکوحہ صفات کے ساتھ اپنا تعارف کرانے کے بعد حضرت عیسیٰ نے مسئلہ توحید پر خاص طور پر عبادت کے سلسلے میں تاکید کیا اور فرمایا: اور تمہارا پروردگار ہے، پس تم اسی کی عبادت و پرستش کرو، یہی سیدھی راہ ہے۔ (اولیٰ اللہ ربی و ربکم فاعبادوا خدا صراط مستقیم)۔

اس طرح حضرت عیسیٰ نے اپنی زندگی کی ابتداء سے ہی ہر قسم کے شرک اور دویا دوسے زیادہ خدائوں کی عبادت و پرستش سے بیکار اور ہر جگہ توحید پر تکیہ کیا۔ اس بنا پر تثلیث کے عقائد سے عیسائیوں کے درمیان کج جو کچھ نظر آتا ہے یہ قطعی طور پر حضرت عیسیٰ کے بعد پیدا ہونے والی بدعت ہے۔ ہم اس کی تفصیل سورہ نسا کی آیت ۱۷۱ کے ذیل میں بیان کر چکے ہیں۔

الرحمہ بعض محرمین نے یہ احتمال ذکر کیا ہے کہ یہ جملہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان سے بیان ہوا ہو اس معنی میں کہ خدا نے اس آیت میں حکم دیا ہے کہ لوگوں کو توحید کی عبادت کی دعوت دو اور اس کا صراطِ مستقیم کے عنوان سے تعارف کراؤ۔

نیلین خزان بمیل دی دوسری آیات اس بات پر گواہ ہیں کہ یہ جملہ حضرت عیسیٰ کی گفتگو اور ان کی گزشتہ باتوں کا آخری حصہ ہے۔ یوں
 کی آیت ۶۳ تا ۶۴ میں ہم پڑھتے ہیں :

"ولما جاء عيسى بالبينات قال قد جئكم بالحكمة والبر
لكم لئلا تفرقوا فيه فآقوا الله وأطيعوا الله وأطيعوا
رئيسكم فاعبدوه هذا صراط مستقيم"

”اور جس وقت عیسیٰ ان کے لیے واضح اور روشن دلائل لے کر آئے تو کہا کہ میں تمہارے لیے حکمت و دانش لے کر آیا ہوں، میں اس لیے آیا ہوں کہ جن باتوں میں تم اختلاف رکھتے ہو ان میں سے بعض امور کی تمہارے لیے وضاحت کروں، پس تم خدائے ڈرو اور میری اطاعت کرو“

۱۔ جملہ بندی اور ترکیب کے لحاظ سے یہ جملہ حضرت عیسیٰ کی گزشتہ باتوں پر عطف ہے جو "قال اے عبد اللہ" سے شروع ہوئی ہیں اور اس جملہ پر ختم۔

تفسیر نمونہ جلد ۲ صفحہ ۶۵۳ (اُردو ترجمہ) کی طرف رجوع فرمائیں۔

خدا ہی میرا اور تمہارا پروردگار ہے، پس تم اسی کی عبادت کرو، یہی سیدھی راہ ہے۔
 یہاں ہم تقریباً مین دی جملہ دیکھ رہے ہیں کہ جو حضرت عیسیٰؑ کی زبان سے نکل جوا ہے۔ (اسی قسم کا مضمون سورہ آل عمران کی آیہ
 ۵۰ میں بھی آیا ہے)۔

لیکن اس نام تاکید کے باوجود کہ جو حضرت عیسیٰؑ توحید اور خدا کے یگانہ کی پرستش کے بارے میں کیا کرتے تھے "ان کے بعد ان کے
 ملاں میں سے کئی گروہوں نے مختلف راستے اختیار کر لیے " (اور خاص طور پر عیسیٰ کے بارے میں بھی انہوں نے کئی قسم کے عقائد تراش لیے)
 "مجلس الاحزاب من بینہم"۔ قیامت کے عظیم دن کے مشاہدے سے ان کی حالت پر کہ جنہوں نے کفر و شرک کی راہ اختیار کی
 ہے۔ (فویل للذین کفروا من مشہد یوم عظیم)۔

میں ہے۔ (خویشامدین ہمدانی)۔
 مسیحیت کی تاریخ بھی اس بات کی اچھی طرح گواہی دیتی ہے کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ کے بعد ان کے بارے میں اور مسئلہ توحید کے بارے میں کس مذہب کی اختلاف کیا۔ یہ اختلافات اس قدر بڑھ گئے کہ "قططین" شہنشاہ روم نے "اسقفوں" (مسیحیت کے بڑے بڑے علماء) کا ایک اجتماع بلایا کہ جو ان کے تین مشہور تاریخی اجتماعات میں سے ایک تھا کہ جس کے ارکان کی تعداد دو ہزار ایک سو ستر تک جا پہنچی تھی۔ سب کے سب ان کے بزرگوں میں سے تھے۔ جب حضرت عیسیٰ کے بارے میں بحث شروع ہوئی تو موجود علماء نے اس کے بارے میں بالکل مختلف نظریات کا اظہار کیا اور ہر گزہ کا اپنا ایک الگ ہی عقیدہ تھا۔

ان میں سے بعض نے کہا کہ وہ خدا ہے کہ جو زمین پر نازل ہوا ہے۔ ایک گروہ کو اُس نے زندہ کیا اور بہت سے لوگوں کو موت دے دی۔ اُس کے بعد آسمان کی طرف صعود کر گیا ہے۔

بعض دوسروں نے کہا کہ وہ خدا کا بیٹا ہے۔

بعض نے یہ کہا کہ وہ تین اقانیم (تین مقدس ذاتیں میں سے) ایک تھا، باپ، بیٹا اور روح القدس (باپ خدا۔ بیٹا خدا اور روح القدس)۔

کچھ لوگوں نے یہ بھی کہا کہ وہ بندہ خدا ہے اور اس کا بھیجا ہوا رسول ہے۔

دوسرے فرقوں نے بھی ایک ایک بائیں ملیں۔ اس طرح کے درجہ بندی کے بعد ان کے عقیدے کے عقائد سے
ایک عقیدے کے طرفداروں کی ۳۰۸ ہتی کہ جس کو بادشاہ نے نسبتاً اکثریت کے عقیدہ کے عقائد اور اس کا قانونی و فرائض عقیدے کے عقائد سے
معارضہ کرنا شروع کر دیا اور باقی عقیدوں کو چھوڑ دیا لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ توحید کا عقیدہ جس کے طرفداروں کی تعداد بہت ہی کم تھی اقلیت میں قرار پایا۔
چونکہ اصل ترجیح سے انحراف، عیسائیوں کا سب سے بڑا انحراف شمار ہوتا ہے، مندرجہ بالا آیت کے ذیل میں ہم نے دیکھا کہ خداوند تعالیٰ
انہیں کس طرح سے تہدیکر رہا ہے، کہ وہ قیامت کے عظیم دن میں، سب لوگوں کی موجودگی میں اور پروردگار کی عدالت عادلہ کے سامنے بہت بڑے
لہجہ و رنگ انجام سے دوچار ہوں گے۔

۱۔ تفسیر فی ظلال، جلد ۵ ص ۴۳۶ -

”مشہد“ اور ذوالِ آیتین میں بیکر صدر مہینے ”شہود کے معنی میں جو یا اسم مکان یا اسم زمان، محل یا زمانہ شہود کے معنی میں جو ہر خدا ان کے عالیٰ حضرت میں تین تہ کے اعتبار سے کوئی خاص فرق نہیں ہے۔

بعد والی آیت میں ان کی حالت کو بیان کر رہی ہے۔ اور یہ کہتی ہے کہ "اُس دن جب وہ ہمارے پاس آئیں گے کیسے سننے والے کان اور کسی دیکھنے والی آنکھیں ہو جائیں گی۔ لیکن یہ ظالم آج جبکہ دنیا میں ہیں تو کھلی گمراہی میں ہیں (اسمع والبصر یوم یا توننا لکن الظالمون الیوم فی ضلال مبین)۔"

یہ بات واضح ہے کہ نشاۃ آخرت میں آنکھوں کے سامنے سے تمام پردے ہٹ جائیں گے، اور کانوں کی ٹٹنے کی صلاحیت ہو جائے گی کیونکہ وہاں حق کے آثار دنیا کی نسبت کئی گنا زیادہ واضح و آشکار ہوں گے۔ اصولی طور پر اس عدالت اور اعمال کے آثار کا مشاہدہ کی آنکھوں اور کانوں سے غفلت کے پردے دور کر دے گا۔ یہاں تک کہ دل کے اندھے بھی آگاہ اور دانہ ہو جائیں گے، لیکن کیا فائدہ کیونکہ بیماری اور آگاہی ان کی حالت کے لیے مفید نہ ہوگی۔

بعض مفسرین نے "لکن الظالمون الیوم فی ضلال مبین" کے جملہ میں لفظ "الیوم" قیامت کے دن کے معنی میں لیا ہے کہ جس سے آیت کا مضمون یہ بن جاتا ہے: وہ وہاں بننا دشوار ہو جائیں گے لیکن یہ بینائی اور شعور اس دن ان کی حالت کے لیے فائدہ مند نہیں ہوگی اور وہ واضح گمراہی میں ہوں گے۔ لیکن پہلی تفسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

ایک مرتبہ پھر اس روز ہے ایمان اور شکر لوگوں کے انجام کو نظر رکھتے ہوئے قرآن کہتا ہے: ان دل کے (انھوں کو) جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں اور ایمان نہیں لاتے روزِ حسرت (قیامت کے دن) سے کہ جس میں تمام چیزیں اختتام کو پہنچ جائیں گی اور تکلفی اور بازگشت کے لیے کوئی راستہ نہیں ہوگا۔ ذرا (وانفر هو یوم الحسرة اذ تقصوا الامر وهو فی غفلة وهو لا یؤمنون)۔ ہم جانتے ہیں کہ قرآن مجید میں قیامت کے دن کے کئی نام ہیں۔ ان میں سے ایک "یوم الحسرة" ہے کیونکہ اس دن نیکو لوگوں کی افسوس کریں گے کہ اُسے کاش ہم زیادہ سے زیادہ نیک اعمال بجالائے ہوتے اور بدکار بھی افسوس کریں گے۔ کیونکہ نظروں کے سامنے سے تمام پردے ہٹ جائیں گے اور ہر شخص پر اعمال کے حقائق اور ان کے نتائج آشکار ہو جائیں گے۔

بعض مفسرین نے "اذ قضی الامر" کے جملے کو قیامت کے دن حساب و کتاب، جزا و سزا اور تکلیف و ذمہ داری کے پروگراموں کے اختتام پذیر ہونے سے مراد سمجھا ہے اور بعض اسے دنیا کے فنا ہونے کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں۔ اس تفسیر کے مطابق آیت کا معنی اس طرح ہوگا: انہیں حسرت کے دن سے ڈراؤ وہ وقت جب کہ دنیا ان کی غفلت اور ایمان نہ لانے کی حالت میں اختتام کو پہنچ جائے گی (لیکن پہلی تفسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے، خاص طور پر جبکہ ایک روایت میں "اذ قضی الامر" کی تفسیر امام صادق علیہ السلام سے اس طرح نقل ہوئی ہے: ای قضی علی اهل الجنة بالخلود فیها، وقضی علی اهل النار بالخلود فیها یعنی مخلوق عالم اہل جنت کے لیے (جنت میں) اور اہل جہنم کے لیے (جہنم میں) ہمیشہ رہنے کا حکم صادر فرمائے گا۔

۱۔ "اعت دلام" "الیوم" میں "عمرہ" کا اعت لام ہے لیکن پہلی تفسیر کے مطابق عمرہ ضروری "اور دوسری تفسیر کے مطابق" عمرہ درکار ہے۔
۲۔ مجمع البیان آیہ بالا کے ذیل میں۔

آخری زیر بحث آیت تمام ظالموں اور شکرلوں کو خبردار کر رہی ہے کہ یہ اموال جو ان کے قبضے میں ہیں، ہمیشہ ان کے پاس نہیں رہیں گے۔ خود ان کی زندگی جاودانی اور ہمیشہ رہنے والی نہیں ہے بلکہ ان سب کا اصلی مالک خدا ہے لہذا فرماتا ہے: ہم زمین کے بھی اور تمام ان کے بھی جو اس پر رہتے ہیں وارث ہو جائیں گے۔ اور آخر کار وہ سب کے سب ہماری طرف پلٹ کر آئیں گے۔ (انا نحن نورث من ومن علیہا والیسا یرجعون)۔

حقیقت میں یہ آیت سورہ مؤمن کی آیہ ۱۶ کی ہم وزن ہے کہ جو کہتی ہے:

لنمین الملک الیوم للہ الواحد القہار

آج (قیامت کے دن) کس کی ملکیت و حکومت ہے، ایک اکیلے غالب و مسلط خدا کی۔

اگر کوئی شخص اس حقیقت پر ایمان رکھتا ہو اور اس کا معتقد ہو، تو پھر وہ کس لیے اُن اموال اور تمام مادی چیزوں کے لیے کہ جو ہندردوں کے لیے ہیں امانت کے طور پر سپرد کی گئی ہیں، اور بہت جلد ہی ہمارے ہاتھ سے نکل جائیں گی، ظلم و ستم کرے گا اور حقیقت یا دوسرے لوگوں کے حقوق کو ہمال کرنے کو جائز سمجھے گا۔

۴۱۔ وَادْکُرْ فِی الْکُتُبِ اِبْرٰہِیْمَ اِنَّہٗ کَانَ صَدِیْقًا نَّبِیًّا ۝

۴۲۔ اِذْ قَالَ لِاَبِیْہِ یٰاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا یَسْمَعُ وَلَا یُبْصِرُ وَلَا یُعْزِیْ

عَنْکَ شَیْئًا ۝

۴۳۔ یٰاَبَتِ اِنِّیْ قَدْ جِئْتُکَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَوْ اَبَیْتُکَ فَاتَّبَعْنِیْ اٰمِدْکَ ۝

۱۔ آیا یہ آیت قیامت کی طرف اشارہ ہے یا دنیا کے فنا ہونے کے وقت کی طرف؟ اگر یہ قیامت کی طرف اشارہ ہو تو یہ "والیسا یرجعون" (ہماری طرف پلٹائے جائیں گے) کے جملے سے مطابقت نہیں رکھتی۔ اور اگر دنیا کے ختم ہونے کے وقت کی طرف اشارہ ہو تو "ومن علیہا" (وہ کہ جو زمین کے اُدھر ہیں) کے جملہ کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتی کیونکہ دنیا کے ختم ہونے کے وقت تو زمین پر کوئی زندہ نہیں ہوگا جس کے بارے میں من علیہا کا تکرار درست ہو۔ شاید اسی وجہ سے بعض مفسرین مثلاً طاہر طباطبائی نے اس جملہ کا یہ معنی لیا ہے۔

"انا نحن نورث عنہم الارض" ہم ان کی طرف سے زمین کے وارث ہوں گے، لیکن یہ تفسیر بھی کچھ خلاف ظاہر ہے کیونکہ "من علیہا" کا واؤ کے ساتھ عطف ہوا ہے۔ ایک اور احتمال جو اس مقام پر موجود ہے یہ ہے کہ "نورث" کا مفعول کبھی تو وہ شخص ہوتا ہے جو مال چھوڑ جاتا ہے، مثلاً: "وورث سلیمان داؤد" اور کبھی وہ اموال ہوتے ہیں کہ جو میراث کے طور پر باقی رہ جاتے ہیں، مثلاً: "نورث الارض" اور اُدھر والی آیت میں دونوں تفسیریں آئی ہیں۔

صِرَاطًا سَوِيًّا ۝

۲۳- يٰۤاَبَتِ لَا تَقْبُدِ الشَّيْطٰنَ ۚ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا

۲۵- يٰۤاَبَتِ اِنِّیْۤ اَخَافُ اَنْ یَّمْسَكَ عَذَابُ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ

لِلشَّيْطٰنِ وَلِيًّا ۝

ترجمہ

۲۱- اس کتاب میں ابراہیم کو یاد کرو، وہ خدا کا بہت ہی سچا نبی تھا۔

۲۲- جب اُس نے اپنے باپ سے کہا: اے بابا! تو ایسی چیز کی عبادت کرتا ہے کہ جو نہ سنی ہے اور نہ ہی دیکھی اور تیری کوئی مشکل بھی حل نہیں کرتی۔

۲۳- اے بابا! مجھے ایسا علم و دانش عطا ہوا ہے جو تجھے نصیب نہیں ہوا لہذا تو میری پیروی کر کہ میں تجھے سیدھے راستے کی ہدایت کروں۔

۲۴- اے بابا! شیطان کی پرستش نہ کر کیونکہ شیطان خدا کے رشتے کا نا فرمان ہے۔

۲۵- اے بابا! مجھے اس بات کا خوف ہے کہ خدا کے رشتے کی طرف سے تجھ پر کوئی عذاب نازل ہو جائے۔ جس کے نتیجے میں تو شیطان کا دوست بن کر رہے۔

ابراہیم (ع) کی مؤثر منطق:

حضرت عیسیٰ کی سرگزشت کے کچھ حصے کا تعلق ان کی والدہ جناب مریم کی زندگی کے ساتھ تھا۔ گزشتہ آیات میں اس کا ذکر اس کے بعد زیر بحث آیات اور آگے آنے والی آیات میں توحید کے ہیرو ابراہیم خلیل کی زندگی کے کچھ حصے کا تذکرہ ہے۔ ان آیات میں تاکید کی گئی ہے کہ اس عظیم پیغمبر کی دعوت بھی۔ تمام رہبران الہی کی دعوت کی طرح۔ نقطہ توحید ہی سے شروع ہوتی ہے۔

پہلی آیت میں قرآن لکھا ہے: اس کتاب (قرآن) میں ابراہیم کو یاد کرو (واذکرفی الکتاب ابراہیم)۔ کیونکہ وہ بہت ہی سچا تھا، خدا کی تعلیمات و فرامین کی تصدیق کرنے والا تھا اور خدا کا پیغمبر تھا (انہ کان صدیقاً نبیاً)۔

لفظ "صدیق" صدق سے ماخوذ ہے اور ایسے شخص کے معنی میں جو بہت ہی سچا ہو۔ بعض کہتے ہیں کہ ایسے شخص کے معنی میں جو کبھی جھوٹ نہ بولتا ہو، یا اس سے بالاتر، جو جھوٹ بول ہی نہ سکتا ہو کیونکہ

اس نے ساری عمر جھوٹ بولنے کی عادت بنالی ہے۔ نیز بعض اسے ایسے شخص کے معنی میں سمجھتے ہیں کہ جس کا عمل اس کے قول اور اعتقاد کی تصدیق

۲۷۴

لیکن صاف ظاہر ہے کہ یہ تمام معانی تقریباً ایک ہی معنی کی طرف لڑتے ہیں۔

بہر حال یہ صفت اس قدر اہمیت رکھتی ہے کہ اوپر والی آیت میں صفت نبوت سے بھی پہلے بیان ہوئی ہے۔ گویا یہ نبوت کو قبول کرنے کی اہمیت پیدا کی ہے۔ اس کے علاوہ پیغمبروں اور وحی الہی کے حاملین میں جو عمدہ ترین اور بہترین صفت ہوئی چاہیے وہ یہی ہے کہ وہ خداوند تعالیٰ کے فرمان کو بے کم و کاست خدا کے بندوں تک پہنچادیں۔

اس کے بعد ان کی اپنے باپ آزد کے ساتھ گفتگو بیان کی گئی ہے۔ (ہاں باپ سے مراد چچا ہے اور لفظ "ابا" جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں۔ عربی لغت میں کبھی باپ کے معنی میں اور کبھی چچا کے معنی میں آتا ہے)۔

قرآن کہتا ہے: اُس وقت جبکہ اُس نے اپنے باپ سے کہا: اے بابا! تو ایسی چیز کی عبادت کیوں کرتا ہے جو تو سنی ہے اور نہ ہی دیکھی چھاوری تیری کوئی مشکل حل کرتی ہے لہذا قال لابیہ یا ایت لہو تعبد ما لا یسمع ولا یتصو ولا ینفک عنک شیئاً)۔

یہ مختصر اور زوردار بیان خشک اور ریت پرستی کی نفی کرنے والی دلیل میں سے ایک بہترین دلیل ہے۔ کیونکہ انسان کو پروردگار عالم کی معرفت کے بارے میں اُجھارنے والی چیزوں میں سے ایک نفع و نقصان کا احتمال ہے اسے ملے جاتا ہے "وہ ضرر متحمل" سے تعبیر کرتے ہیں۔

ابراہیم کہتے ہیں کہ تو ایسے سمجھوتہ کی طرف کیوں جاتا ہے کہ جو نہ صرف یہ کہ تیری کسی مشکل کو حل نہیں کر سکتا، بلکہ وہ تو اصل اسے اور دیکھنے کی قدرت ہی نہیں رکھتا۔

دوسرے نغظوں میں عبادت الہی ہستی کی کرنی چاہیے کہ جو مشکلات حل کرنے کی قدرت رکھتی ہو، اپنی عبادت کرنے والے اور اس کی عبادت و منوریات کو جانتی ہو۔ دیکھ سکتی ہو لیکن ان باتوں میں یہ تمام باتیں مضبوط ہیں۔

درحقیقت ابراہیم یہاں اپنی دعوت اپنے چچا سے شروع کرتے ہیں کیونکہ قریبی رشتہ وادوں میں اثر و نفوذ پیدا کرنا زیادہ ضروری ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی اس بات پر مامور ہوئے تھے کہ پہلے اپنے نزدیک رشتہ وادوں کو اسلام کی دعوت دیں جیسا کہ

سورۃ شاعر کی آیت ۲۱۴ میں ہم پڑھتے ہیں:

وانذر عشیرتک الاقربین۔

یعنی اپنے قریبیوں کو خوف خدا دلاؤ۔

اس کے بعد ابراہیم واضح منطق کے ساتھ اُسے دعوت دیتے ہیں کہ وہ اس امر میں ان کی پیروی کرے۔ فرماتے ہیں: اے بابا! مجھے وہ علم و دانش ملی ہے جو تجھے نصیب نہیں ہوئی۔ اس بنا پر تو میری پیروی کر اور میری بات سن (یا ایت انی قد جئت من العلم ما لو یأتک فاتبعنی)۔

میری پیروی کر تاکہ میں تجھے سیدھی راہ کی طرف ہدایت کروں (اهدک صراطاً سَوِيًّا)۔

میں نے حق الہی کے ذریعہ بہت علم و آگہی حاصل کی ہے اور میں پُر سے الہیوں کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں خدا کے راستے

۱۔ اس بارے میں تفصیلی بحث جلد ۳ ص ۳۶۲ تفسیر نمونہ (اردو ترجمہ) سورہ انعام کی آیہ ۷۴ میں ہو چکی ہے۔

پر نہیں چلوں گا۔ تجھے بھی ہرگز غلط راستے کی دعوت نہیں دوں گا۔ میں تیری خوش بختی و سعادت کا خواہاں ہوں تو میری بات مان لے تاں فلاخ و نجات حاصل کر سکے اور اس صراطِ مستقیم کو طے کر کے منزلِ مقصود تک پہنچ جائے۔

اس کے بعد اس اثباتی پہلو کو منہی پہلو اور ان آثار کے ساتھ ملاتے ہوئے، کہ جو اس دعوت پر مرتب ہوتے ہیں کہتے ہیں: اسے باطنی شیطان کی پریشانی کہہ کر یہ کہہ دیتے ہیں کہ خدا نے رحمن کا نافرمان رہا ہے۔ (یا ابت لا تعبد الشیطان ان الشیطان کان للرحمن عصیاً)

البتہ ظاہر ہے کہ یہاں عبادت سے مراد شیطان کے لیے سجدہ کرنے اور نماز روزہ بجالانے والی عبادت نہیں ہے بلکہ اطاعت اور اس کے حکم کی پیروی کرنے کے معنی ہیں اور یہ بات خود ایک قسم کی عبادت شمار ہوتی ہے۔ عبادت و پرستش کے معنی اس قدر وسیع ہیں کہ کسی کی باتوں کو عمل کرنے کی نیت سے سننا تک بھی اس کے معنی میں شامل ہے اور کسی کے قانون کو قابلِ نفاذ سمجھنا بھی اس کی ایک طرح کی عبادت و پرستش شمار ہوتی ہے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک حدیث میں اس طرح نقل ہوا ہے:

من اصغى الى ناطق فقد عبده فان كان الناطق عن الله عز وجل فقد عبد الله وان كان الناطق عن ابليس فقد عبد ابليس: جو شخص کسی بات کرنے والے کی بات کی طرف کان لگائے (تسلیم و رضا کے ساتھ) تو اس نے اس کی پرستش کی ہے۔ اگر یہ بولنے والا خدا کی طرف سے بول رہا ہے تو اس نے خدا کی عبادت کی ہے اور اگر بولنے والا ابلیس کی طرف سے بول رہا ہے تو (پھر اس سننے والے نے) ابلیس کی عبادت کی ہے۔

بہر حال ابراہیمؑ اپنے بچا کو اس حقیقت کی تعلیم دینا چاہتے ہیں کہ انسان اپنی زندگی میں بغیر کسی قانون یا راستے کے نہیں چل سکتا۔ (اب قانون یا راستے صرف وہی ہیں) یا قانونِ الہی اور صراطِ مستقیم ہے اور یا نافرمان و گمراہ شیطان کا قانون اور راستہ ہے۔ چاہیے کہ انسان اس سلسلے میں شک و شبہ سے سوچ بچار کرے اور اپنے لیے سچائی کو اختیار کرے اور اپنی خیر و صلاح کو تصبات اور اندھی تقلید سے دور رکھتے ہوئے نظر میں لائے۔

ایک مرتبہ پھر اسے شرک اور بت پرستی کے بُرے نتائج کی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: اے بابا! میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ تیری اختیار کردہ شرک و بت پرستی کے سبب خدا نے رحمن کی طرف سے تجھ پر عذاب آئے اور تو اولیائے شیطان میں سے ہو جائے۔ (یا ابت اف الخاف ان یسلک عذاب من الرحمن فتکون للشیطان واثق)

یہاں حضرت ابراہیمؑ کی اپنے بچا کو آگے بڑھانے کی تعبیر بہت ہی باذہن نظر اور عمدہ ہے کہ ایک طرف اسے تسلیم کیا کہ "یا ابت" (اے بابا!)

یہ خطاب سے کہ جو ادب و احترام کی نشانی ہے غالب کیسے جا رہے ہیں اور دوسری طرف "ان یسلک" کا حملہ زخمی کرتا ہے کہ "عذاب من الرحمن" کی تعبیر اس نکتے کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ تیرا معاملہ اس شرک و بت پرستی کی وجہ سے اس مقام تک پہنچ چکا ہے کہ وہ خدا کو جس کی رحمت عامر سب چیزوں پر چھائی ہوئی ہے تجھ پر نازل ہے اور وہ تجھے عذاب دے گا، اب تو ہی دیکھ کہ تو کس قسم کا وحشت ناک کام انجام دے رہا ہے۔ چوتھی طرف سے اسے متوجہ کیا کہ تیرا یہ ایک ایسا کام ہے کہ جس کا انجام شیطان کی دوستی کے زیر سایہ قرار پائے۔

چند نکات:

۱۔ دوسروں پر اثر انداز ہونے کا طریقہ: روایات کے مطابق آذر ایک بت پرست، بت تراش اور بت فروش آدمی تھا اور اس معاملے میں فساد کا ایک عظیم عامل شمار ہوتا تھا۔ حضرت ابراہیمؑ کی اس سے گفتگو کی کیفیت اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ خوف و اذہار پر اثر انداز ہونے کے لیے خشونت اور سختی اختیار کرنے سے پہلے مطلق و دلیل کے طریقے سے استفادہ کرنا چاہیے۔ مطلق بھی ایسی جواہرِ احترام و محبت، شفقت اور ہمدردی کے انداز میں ہو اور ساتھ ساتھ اس میں قاطعیت بھی ہو۔ کیونکہ اس طریقہ سے بہت سے گروہ حتیٰ کہ اگلے تسلیم و تمکیر کریں گے، اگرچہ کچھ لوگ اس روش کے اختیار کرنے کے باوجود بھی اپنے متوقف پر اڑے رہیں گے۔ یقیناً ان کا معاملہ آگ ہو گا اور ان کے ساتھ دوسری قسم کا سلوک کرنا چاہیے۔

۲۔ عالم کی پیروی کرنے کی ابتیل: ہم نے اوپر والی آیات میں پڑھا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ آذر کو اپنی پیروی کی دعوت دے رہے تھے مالاکھن کا چچا حسن وصال کے اعتبار سے قاعدتاً ان سے بہت بڑا تھا اور اس معاشرے کا نہایت معروف آدمی تھا۔ چچا کی طرف سے اپنی پیروی کے لیے وہ یہ دلیل دیتے ہیں: میں ایسے علوم کا حامل ہوں کہ جو تیرے پاس نہیں ہیں (قد جاشی من العلم والعیان تک)۔ یہ تمام لوگوں کے لیے ایک عمومی قانون ہے کہ جن امور سے وہ آگاہ اور باخبر نہیں ہیں ان میں وہ ان کی پیروی کریں جو آگاہ و باخبر ہیں۔ یہ بات حقیقتاً ہر فن میں خصوصی مہارت رکھنے والے افراد کی طرف رجوع کرنے کو واضح کر رہی ہے اور ان میں سے ایک فروعِ احکام اسلامی میں مجتہد کی تقلید کا مسئلہ بھی ہے البتہ حضرت ابراہیمؑ کی بحث فروعِ دین کے مسائل سے مربوط نہیں تھی بلکہ وہ اصولِ دین کے سب سے زیادہ بنیادی مسئلہ کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ لیکن اس قسم کے مسائل تک میں بھی علماء اور دانشمندان کی رہنمائی سے ہی استفادہ کرنا چاہیے، تاکہ صراطِ سوس (درست راستے) کی طرف ہدایت حاصل ہو۔ وہ صراطِ سوس کی جو صراطِ مستقیم ہی ہے۔

۳۔ رحمت اور یاد آوری کی سورت: اس سورہ میں حضرت مریمؑ اور بزرگ پیغمبروں کا قصہ شروع کرتے وقت پانچ مرتبہ "اذکر" (یا یاد کرو) آیا ہے اور اس بنا پر اس سورہ کو یاد آوری کا سورہ کہا جاسکتا ہے۔ یہ پیغمبروں اور عظیم مردوں اور عورتوں کی یاد آوری اور توحید کے بارے میں ان کی جدوجہد اور شرک و بت پرستی اور ظلم و ستم و گمراہی کے خلاف ان کی سعی و کوشش کی یاد آوری ہے۔ چونکہ عام طور پر ذکر، بھول جانے کے بعد یاد دلانے کے معنی میں ہے اس لیے ممکن ہے کہ اس واقعیت کی طرف بھی اشارہ ہو کہ توحید کی بنیادوں اور مردانِ حق کا شوق اور راہِ حق میں عین کی جدوجہد پر ایمان لانا، ہر انسان کی فطرت میں اُتر جاتا ہے اور ان کی باتیں

کرناد ا تھا ایک طرح کا ذکر اور یاد آوری ہے ،

خداوند تعالیٰ کی "رحمت" کے عنوان سے توصیف اس سورہ میں شکر مرتبہ آئی ہے، کیونکہ یہ سورہ اپنے آغاز سے ہی رحمت کے ذکر کے ساتھ شروع ہوئی ہے۔ خدا کی نکر کیا؟ پر رحمت، خدا کی مہربان اور وسیع پر رحمت، اور اس سورہ کا اہتمام بھی اسی رحمت کے ساتھ ہے کیونکہ اس کے آخر میں فرمایا گیا ہے :

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لّٰهُمُ الرِّحْضٰنَ وَاٰلَ اَرْوَاحِهِمْ ذٰلِكَ جَزَاؤُهُمْ لِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ
 جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے عمل صالح انجام دیئے خدا نے رحمن ان کی محبت کو اپنے نیکوں کے دل میں قرار دے دیتا ہے۔

۴۶- قَالَ ارَاغِبْ اَنْتَ عَنِ الْيَمِّ يَا بُرْهِيْمُ لَنْ نَمُوتَنَّهُ لَارْحَمَكَ
وَاهْجُرْنِي مَلِيًّا ۝

۴۷۔ قَالَ سَلِّمْ عَلَيْكَ سَأَسْتَغْفِرُكَ رَبِّي إِنَّهُ كَانَ بِي حَفِيًّا ۝

۴۸- وَاعْتِزُّ لَكُمْ وَمَاتَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَاَدْعُوا رَبِّي عَلَى الْآ
اَكُونُ بِدَعَاءِ رَبِّي شَقِيًّا ○

۴۹۔ فَلَمَّا اعْتَزَلُوا وَمَا يَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَهَبْنَا لَهُ إِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ ۚ وَكُلًّا جَعَلْنَا نَبِيًّا ۝

٥. وَوَهَبْنَا الْمُؤْمِنِينَ رَحْمَتَنَا وَجَعَلْنَا أَلْسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا ۝

زیر

۳۶۔ اُس نے کہا اے ابراہیم! کیا تو میرے خدائے خدائوں سے لڑ کر دلائل ہے، اگر تو (اس کام سے) دستبردار نہ ہوا، تو میں تجھے سنگسار کر دوں گا، تو مجھ سے ایک طویل مدت کے لیے دُور ہو جا۔

۲۷۔ (ابراہیم نے) کہا: تجھ پر سلام ہو، میں عنقریب اپنے پروردگار سے تیرے لیے غنود (بخشش) کی درخواست کروں گا کیونکہ وہ مجھ پر بہت مہربان ہے۔

۲۸۔ اور میں تم سے بھی اور جنہیں تم خدا کے علاوہ پکارتے ہو ان سے بھی کٹناو کٹ کر رہا ہوں اور میں تو اپنے پروردگار ہی کو پکارتا ہوں اور مجھے امید ہے کہ میری دعا میرے پروردگار کی باگاہ میں قبول ہوئے بغیر نہ رہے گی۔

۴۹۔ جس وقت (ابراہیم نے) خود اُن سے اور بن جن چیزوں کی وہ خدا کے علاوہ پرستش کرتے تھے اُن سے بھی کنارہ کشی اختیار کر لی تو ہم نے اُسے اسحق (سابیٹا) اور یعقوب (ساہرانا) عطا فرمایا اور ہم نے (ان میں سے) ہر ایک کو بزرگ بیٹے قرار دیا۔

۵۰۔ اور ان پر اپنی رحمت کی انزال کی اور انہیں ہم نے نیک نام (تمام اسموں کے درمیان) مقبول و پسندیدہ مقام عطا کیا۔

شکر اور مشرکین سے دُوری کا نتیجہ :

گزشتہ آیات میں حضرت ابراہیمؑ کی ان کے چچا کی ہدایت کے سلسلے میں منطقی باتیں جو خاص لطف و محبت کی آمیزش رکھتی تھیں گزری چکی ہیں۔ اب آئرز کے جوابات بیان کرنے کی نوبت ہے تاکہ ان دونوں کا آپس میں موازنہ کرنے سے حقیقت اور واقعیت ظاہر ہو جائے۔ قرآن کسکے ہے کہ نہ صرف ابراہیمؑ کی دل سوز مایاں اور ان کا مکمل بیان آنہر کے دل پر اثر انداز نہ ہو سکا بلکہ وہ ان باتوں کو سن کر سخت برہم ہوا، اہل اُس نے کہا :

”اے ابراہیمؑ کیا تو میرے خداؤں سے زکوٰۃ مانگ رہا ہے۔ (قال اراغب انت عن الہی یا ابراہیم۔)

اگر تو اس کام سے باز نہیں آئے گا تو میں ضرور تجھے سنگسار کروں گا۔ (لکڑی لٹختے لڑجھکتے)۔
 "اور تو اب مجھ سے دُور ہو جا میں پھر تجھے نہ دیکھوں (واحد جھرف مٹا)۔ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اولاً آذر یہ یک کھنے کے لیے تیار نہیں تھا کہ بہتوں کے انگاری یا مخالفت اور ان کے بارے میں بیگونی کا ذکر زبان پر لائے، بلکہ بس اتنا کہا: کیا تو بہتوں سے بیگور دان ہے؟ تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ بہتوں کے حق میں جبارت ہو جائے۔ ثانیاً ابراہیم کو تہدید کرتے وقت اسے سنگسار کرنے کی تہدید کی۔ وہ بھی اُس تاکید کے ساتھ کہ جو "لام" اور "نون" تاکیدیں تھیں جو "لار" جیک "میں وارد ہے، اور ہم جانتے ہیں کہ سنگسار کرنا مکمل کرنے کی ایک بدترین قسم ہے۔ ثالثاً اس شرط تہدید اور دھمکی پر ہی قناعت نہیں کی بلکہ اس حالت میں جناب ابراہیم کو ایک ناقابلِ برواشت وجود شمار کرتے ہوئے ان سے کہا کہ تو ہمیشہ کے لیے میری نظروں سے دُور ہو جا (مٹا) "مفادات میں راغب کے کہنے کے مطابق" "املا" کے مادہ سے طولانی نفلت دینے کے معنی

میں ہے اور یہاں اس کا مضمون یہ ہے کہ کوئی انسان اس لیے پیدا نہیں کیا گیا کہ وہ اپنے لیے ہی رہے، بلکہ اس کا مقصد ہے کہ وہ اپنے لیے اور دوسروں کے لیے بھی کام کرے۔ یہ تعبیر بہت ہی توہین آمیز ہے، کہ جسے سخت مزاج افراد اپنے مخالفین کے لیے استعمال کرتے ہیں، اور فارسی زبان میں اس کی جگہ "مگورت" یا "گم کن" کہتے ہیں، یعنی صرف اپنے آپ کو بھروسے ہمیشہ کے لیے پھیلانے بلکہ کسی ایسی جگہ چلے جاؤ کہ میں تمہاری قبر تک کو بھی نہ دیکھوں۔ بعض مفسرین نے "لا رجعتک" کو سنگسار کرنے کے معنی میں نہیں لیا بلکہ انہوں نے اس کی تفسیر "مگورتی" کرنے یا ستم کرنے کے معنی میں کی ہے لیکن یہ تعبیر بے نظر آتی ہے۔ قرآن کریم کی تمام آیات کا مطالعہ کر جو اسی تعبیر کے ساتھ وارد ہوئی ہیں، اسی بات کی گواہی دیتا ہے کہ جو ہم نے کسی ہے۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود حضرت ابراہیمؑ نے تمام پیغمبروں اور آسمانی رسلوں کی مانند اپنے اعصاب پر کنٹرول رکھا، اور تنہی اور تیزی اور شدید خشم و سختی کے مقابلے میں انتہائی بزرگواری کے ساتھ "کما : تمہ پر سلام" (قال سلام علیک)۔ لیکن چونکہ یہ سلام الوداعی اور خداوندی کا سلام ہو، کیونکہ اس کے بعد کے چند جملوں کے کھنکھانے کے بعد حضرت ابراہیمؑ نے آرزو کی یہ بھی ممکن ہے کہ یہ ایسا سلام ہو کہ جو دعویٰ اور بحث کو ترک کر دے کیلئے کہا جاتا ہے جیسا کہ سورہ قصص کی آیہ ۵۵ میں ہے :

لَنَا اَعْمَلْنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجَاهِلِينَ

اب جبکہ تم ہماری بات قبول نہیں کرتے ہو، تو ہمارے اعمال ہمارے لیے ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے لیے، تم پر سلام ہے ہم جاہلوں کے ہوا خواہ نہیں ہیں۔

اس کے بعد مزید کہا : میں غریب تیرے لیے اپنے پروردگار سے بخشش کی درخواست کروں گا، کیونکہ وہ میرے لیے حرم و ملین اور مہربان ہے۔ (مَسْأَلَتُكَ رَجُلًا لَّكَ اَنْدَ كَانَتْ حَقِيًّا)۔

حقیقت میں حضرت ابراہیمؑ نے آزر کی خشم و سختی اور تہدید و دھمکی کے مقابلے میں اسی جیسا جواب دینے کی بجائے اس کے برخلاف جواب دیا اور اُس کے لیے پروردگار سے استغفار کرنے اور اس کے لیے بخشش کی دعا کرنے کا وعدہ کیا۔ یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ ابراہیمؑ نے اس سے استغفار کا وعدہ کیوں کیا حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ آزر ہرگز ایمان نہیں لایا اور مشرکین کے لیے استغفار سورہ توبہ کی صریح آیہ ۱۱۳ کے مطابق ممنوع ہے۔

اس سوال کا جواب ہم سورہ توبہ کی اسی آیت کے ذیل میں تفصیل کے ساتھ بیان کر چکے ہیں۔ (توبہ جلد ۵ صفحہ ۲۹ اردو ترجمہ)

اس کے بعد یہ فرمایا کہ : میں تم سے (تمہ سے اور اس بُت پرست قوم سے) کنارہ کشی کرتا ہوں اور اسی طرح اُن سے بھی کہ بتئیں تم خدا کے علاوہ پکارتے ہو، یعنی بتوں سے بھی (کنارہ کشی کرتا ہوں) (واعتزل لکم وعاتدعون من دون اللہ)۔ اور میں تو صرف اپنے پروردگار کو پکارتا ہوں اور مجھے اُمید ہے کہ میری دعا میرے پروردگار کی بارگاہ میں قبول ہوئے بغیر نہیں ہے (وَادْعُوا رَبِّي عَنِّي اَنْ لَا اَكُونَ بَدْعًا رَجُلًا شَقِيًّا)۔

یہ آیت ایک طرف حضرت ابراہیمؑ کے آزر کے مقابلے میں اُوب کی نشاندہی کرتی ہے۔ کہ اُس نے کہا کہ مجھ سے دور ہو جا تو ابراہیمؑ نے بھی اُسے قبول کر لیا اور دوسری طرف ان کی اپنے عقیدہ میں قاطعیت اور یقین کو واضح کرتی ہے۔ یعنی وہ واضح کر رہے ہیں کہ میری تم سے یہ دوری اس بنا پر نہیں ہے کہ میں نے اپنے توحید پر اعتقاد واضح سے دست برداری اختیار کر لی ہے بلکہ اس بنا پر ہے کہ میں تمہارے نظریے کو حق تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں، لہذا میں اپنے عقیدے پر اسی طرح قائم ہوں۔

ضمنی طور پر یہ کہتے ہیں کہ اگر میں اپنے خدا سے دعا کروں تو وہ میری دعا کو قبول کرتا ہے لیکن تم تجارے تو اپنے سے زیادہ پیچلوں کو پکارتے ہو۔ اور تمہاری دعا ہرگز قبول نہیں ہوتی یہاں تک کہ وہ تو تمہاری باتوں کو سُنتے تک نہیں۔

ابراہیمؑ نے اپنے دل کی وفا کی اور اپنے عقیدہ پر جتنا زیادہ سے زیادہ استقامت کے ساتھ رہا جا سکتا ہے، باقی رہے۔ ہمیشہ توحید کی منادی کرتے رہے۔ اگرچہ اس وقت کے تمام فاسد اور بُرے معاشرے نے ان کے خلاف قیام کیا لیکن وہ جانبِ بالآخر کیلئے مزہدے اور

ہم دونوں و اعصار میں بہت سے پیروکار پیدا کر لیے اس طرز پر کہ دنیا جہان کے تمام خدا پرست لوگ ان کے وجود پر غور کرتے ہیں۔ قرآن اس بارے میں کہتا ہے : جس وقت ابراہیمؑ نے ان بت پرستوں سے اُن تمام چیزوں سے کہ جن کی وہ اللہ کے سوا پرستش کیا کرتے تھے کنارہ کشی اختیار کر لی تو ہم نے اُسے اسحاق سابیٹا اور یعقوب ساپڑتا عطا فرمایا اور اُن میں سے ہر ایک کو ہم نے عظیم پیغمبر قرار دیا۔ (فَلَمَّا اعْتَرَاهُ وَهَابُ الْعَدُوِّ وَمَا يَكْفُرُ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَهَبْنَا لَهُ إِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَكُلًّا جَعَلْنَا نَبِيًّا)۔

اگرچہ بہت زیادہ مدت گزر جانے کے بعد خداوند تعالیٰ نے ابراہیمؑ کو اسحقؑ اور اس کے بعد یعقوبؑ (اسحق کا بیٹا) عطا فرمایا۔ لیکن ہر حال یہ بزرگ انعام یعنی اسحقؑ جیسا بیٹا اور یعقوبؑ جیسا پڑتا، کہ اُن میں سے ہر ایک عالی مقام پیغمبر تھا، اسی استقامت کا نتیجہ تھا کہ جو ابراہیمؑ نے بتوں سے مبارزہ اور اس دینِ باطل سے کنارہ کشی کرنے میں اپنی طرف سے دکھائی۔

علاوہ ازیں ہم نے انہیں اپنی رحمت کا ایک حصہ بخشا۔ (وَوَهَبْنَا لَهُمْ مِنْ رَحْمَتِنَا)۔

وہ خاص رحمت کہ جو خالصین و مخلصین، مہمان و مہاجر اور راہِ خدا میں مبارزہ کرنے والوں ہی کا حصہ ہے۔

اور بالآخر ہم نے اس باب اور اس کے بیٹوں کے لیے تمام اُمّتوں کے درمیان نیک نام، اچھی زبان اور اعلیٰ مقام قرار دیا (وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا)۔

درحقیقت یہ حضرت ابراہیمؑ کی اُس درخواست کا جواب ہے کہ جو سورہ شعرا کی آیہ ۸۴ میں بیان ہوئی ہے :

وَجَعَلْ لِي لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْآخِرِينَ

خدا ! میرے لیے آئندہ آنے والی اُمّتوں میں لسانِ صدق (سچی زبان) قرار دے۔

واقع میں وہ یہ چاہتے تھے کہ حضرت ابراہیمؑ اور اُن کی اولاد کو اس طرح سے السانی معاشرے میں سے نکال دیا جائے کہ ان کی کوئی خبر اور ان کا معمولی سا بھی اثر باقی نہ رہے اور وہ ہمیشہ کے لیے بھلا دیے جائیں۔ لیکن اس کے برعکس خداوند تعالیٰ نے ان کے اثر و اثرِ خدا گاری اور اُس رسالت کی ادائیگی میں اُن کی استقامت کی وجہ سے کہ جو اُن کے دُشمن تھے، ان کی شہرت کو ایسا بامِ عروج تک پہنچایا کہ ہمیشہ دنیا جہان کے لوگوں کی زبان پر ان کا تذکرہ تھا اور اب تک ہے۔ وہ خدا شناسی و جہاد، پاکیزگی و تقویٰ، اور مبارزہ و جہاد کے اسوہ اور نمونہ کے طور پر پہچانے جاتے ہیں۔

"لسان" (زبان) ایسے مواقع پر ایک ایسی "یاد" کے معنی میں ہے کہ جو انسان کی لوگوں کے درمیان رہ جانے اور جب ہم اس کی "صدق" کی طرف اضافت کریں اور (لسان الصدق) کہیں تو اس کا معنی اچھی یاد، نیک نامی اور لوگوں کے دلوں میں اچھا مقام ہے اور جس وقت "علیاً" کے لفظ کے ساتھ کہ جو عالی اور عمدہ کے معنی میں ہے ضمیر ہو جائے تو اس کا مضموم یہ ہو گا کہ کسی کی بہت ہی اچھی یاد لوگوں کے درمیان رہ جائے۔

یہ بات کے بغیر ہی واضح ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اس درخواست سے یہ نہیں چاہتے کہ اپنے دل کی خواہش کو پورا کریں، بلکہ ان کا اصل مقصد یہ ہے کہ دشمن ان کی تاریخِ زندگی کو کہ جو نہایت انسان ساز معنی فرہوشی کی بھٹی میں نہ ڈال سکیں اور وہ زندگی جو عالم کے لوگوں کے لیے نور بن سکتی ہے اسے کہیں ہمیشہ کے لیے لوگوں کے دلوں سے محو نہ کر دیں۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام سے ایک روایت میں یہ بیان ہوا ہے کہ :-

لسان الصدق للمرء يجعله الله في الناس خيرا من المال يأكله
ويورثه :

اچھی یاد اور نیک نامی کہ جو خدا کسی شخص کے لیے لوگوں کے درمیان قرار دے، اس فرد اور
دولت و ثروت سے بہتر و برتر ہے کہ جس سے انسان خود بھی فائدہ اٹھائے اور اُسے میراث
کے طور پر بھی چھوڑ جائے۔

اصلی طور پر، روحانی پہلوؤں سے قطع نظر بھی بعض اوقات اچھی ثمرت لوگوں کے درمیان خود انسان کے لیے اور اس کی اولاد کے لیے
عظیم سرمایہ ہو سکتی ہے کہ جس کے ہم نے بکثرت نمونے دیکھے ہیں۔

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے کہ اس آیت میں حضرت اسماعیلؑ کے وجود کی نعمت، کہ جو حضرت ابراہیمؑ کے پہلے فرزند بزرگوار تھے،
کیوں بالکل ہی بیان نہیں ہوئی جب کہ حضرت یعقوبؑ کا نام جو کہ حضرت ابراہیمؑ کے پوتے تھے صراحت کے ساتھ آیا ہے۔

لیکن قرآن میں ایک دوسرے مقام پر، حضرت ابراہیمؑ کے افعالت کے ضمن میں حضرت اسماعیلؑ کے وجود کا بیان ہوا ہے جہاں
حضرت ابراہیمؑ کی زبان سے کہتا ہے :

الحمد لله الذي وهب لي على الكبر اسماعيل واسحق .

شکریہ اُس خدا کا کہ جس نے مجھے بڑھاپے میں اسماعیل اور اسحق بخشے۔ (ابراہیم - ۳۱)

اس سوال کا جواب اس طرح ہے کہ علاوہ اس کے کہ بعد کی دو تین آیات میں حضرت اسماعیلؑ کا نام ان کی بعض اعلیٰ صفات کے
ساتھ مستقل طور پر آیا ہے، اور پر والی آیت سے مقصود یہ ہے کہ اولاد ابراہیمؑ میں نبوت کے جاری رہنے اور تسلسل کو بیان کرے اور نشاندہی
کرے کہ کس طرح یہ سن نبوت، نیک نامی اور ان کی عظیم تادیخ، ان انبیاء کے ذریعے کہ جو ان کی اولاد میں سے یکے بعد دیگرے آئے، تحقق
پزیر ہوئی اور ہم جانتے ہیں کہ طویل اودار میں حضرت اسحقؑ اور حضرت یعقوبؑ کی اولاد میں سے بہت سے پیغمبر آئے ہیں، اگرچہ اسماعیلؑ کی اولاد
میں سے بھی تمام پیغمبروں میں سے سب سے بزرگ ترین پیغمبر یعنی پیغمبر اسلامؐ نے عرصہ ہستی میں قدم رکھا لیکن تسلسل اور یکے بعد دیگرے آنے
رہنا اولاد اسحقؑ میں ہی تھا۔

اسی لیے سورہ عنکبوت کی آیت ۲۷ میں یہ بیان ہوا ہے :

وهبنا له اسحق ويعقوب وجعلنا في ذريته النبوة والكتاب

ہم نے اُسے اسحق و یعقوب بخشے اور اس کی ذریت میں نبوت اور آسمانی کتاب قرار دی۔

۵- وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ مُوسَىٰ إِنَّهُ كَانَ مُخْلَصًا وَكَانَ رَسُولًا نَّبِيًّا

۱۔ اصل کافی (طاب نقل تفسیر زراعتین، جلد ۲، ص ۳۲۹)۔

۵۲- وَنَادَيْنَاهُ مِنْ جَانِبِ الطُّورِ الْأَيْمَنِ وَقَرَّبْنَاهُ نَجِيًّا

۵۳- وَوَهَبْنَا لَهُ مِنْ رَحْمَتِنَا أَخَاهُ هَارُونَ نَبِيًّا

ترجمہ

۵۱- اس (آسمانی) کتاب میں موسیٰ کو یاد کرو کہ وہ مخلص تھا اور بلند مرتبہ رسول اور پیغمبر تھا۔

۵۲- ہم نے اُسے (کوہ) طور کی دائیں طرف سے پکارا اور اسے قریب کیا اور اُس سے ہم نے گفتگو کی۔

۵۳- اور ہم نے اپنی رحمت سے اُسے اس کا بھائی ہارون جو کہ نبی تھا بخشا۔

تفسیر

موسیٰ ایک مخلص و برگزیدہ پیغمبر :

زیر نظر تین آیات حضرت موسیٰؑ کی طرف ایک متعسرا اشارہ کرتی ہیں، جو حضرت ابراہیمؑ کی ذریت میں سے ہیں اور ان بزرگوار پر
ہونے والی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہیں، کہ جنہوں نے ابراہیمؑ کے مسلک کی پیروی کرتے ہوئے اس کی تکمیل کی۔

پہلے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف روئے سخن کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے : اپنی آسمانی کتاب میں موسیٰؑ کو یاد کرو (واذکر
في الكتاب موسیٰ)۔

اس کے بعد ان نعمتوں میں سے جو اللہ نے اس عظیم پیغمبر کو مرحمت فرمائی ہیں پانچ قسم کی نعمتوں کو بیان کیا گیا ہے :

۱- وہ خدا کی اطاعت اور بندگی کی وجہ سے اس مقام کو پہنچا کہ پروردگار نے اُسے خالص اور پاک بنا دیا (انہ کان مخلصا)۔
اور تین ہی طور پر جو شخص ایسے مقام پر فائز ہو جائے وہ انحراف اور آلودگی کے خطرے سے محفوظ رہتا ہے، چونکہ شیطان خدا کے بندوں
کو منحرف کرنے پر اپنے تمام تر اصرار کے باوجود اعتراف کرتا ہے کہ وہ "مخلصین" کو گمراہ کرنے کی قدرت نہیں رکھتا :
"قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَا غُيُوبَ لَهُمْ جَمِيعُ الْأَعْبَادِ مَنْ مَنِسُوا فَلَنْ نَكْتُمُ لَهُمْ جَهَنَّمَ" (سج ۸۲، ۸۳)
اُس نے کہا تیری عزت کی قسم تیرے مخلص بندوں کے سوا اُن سب کو گمراہ کر دوں گا۔

۲- وہ بلند مرتبہ پیغمبر اور رسول ہے۔ (وکان رسولاً نبیاً)۔

حقیقت رسالت یہ ہے کہ کسی کے ذمہ کوئی کام کیا جائے اور وہ اس ماموریت کی تبلیغ اور ادائیگی کا پابند ہو اور یہ وہ مقام ہے
کہ جو ان تمام انبیاء کو حاصل تھا جو دعوت دینے پر مامور تھے۔

"نبیاً" کا یہاں اس پیغمبر کے بلند مقام اور رُحبت شان کی طرف اشارہ ہے کیونکہ یہ لفظ دراصل "نبوہ" (بروزن نعمہ) جو مقام

کی رفت و آمد کی سنی میں ہے۔ البتہ اس کی ایک دوسری اصل بھی ہے کہ جو نبیؐ نے خبر کے معنی میں ہے، اگرچہ یہ خبر کی طرف سے خبر حاصل کرتا ہے اور دوسرے کو خبر دیتا ہے، لیکن یہاں پہلا معنی زیادہ مناسب ہے۔

۳۔ بعد والی آیت موسیٰ کی رسالت کے آغاز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتی ہے: ہم نے اُسے کو طرہ کی دامتیں طرف سے بلند ہوا (وَنَادَيْنَاهُ مِنْ جَانِبِ الطُّورِ الْأَيْمَنِ)۔

اس تاریک اور چھوٹی دشت میں جبکہ وہ اپنی زوجہ کے ساتھ عین کے بیابانوں سے گزر کر مصر کی طرف جا رہے تھے، قرآن کی زبردستی حمل کی تکلیف شروع ہو گئی اور وہ خود ایک شدید سردی کی لپیٹ میں آ گیا اور ایک آگ کے شعلے کی تلاش میں جا رہا تھا کہ کیا کچھ اور دور سے ایک بجلی چمکی اور ایک آواز آئی اور موسیٰ کو رسالت کا فیان دیا اور یہ اس کی زندگی کا عظیم ترین افتخار اور شیریں ترین لمحہ تھا۔

۴۔ علاوہ انہیں "ہم نے اُسے قریب کیا (اِیْنَا تَقَرَّبْنَا) اور اس سے گفتگو کی" (وَقَرَّبْنَاهُ نَجِيًّا)۔ خداوند تعالیٰ کی ندا ایک نعمت تھی اور اُس سے منظم و گفتگو دوسری نعمت۔

اور آخر میں "ہم نے اپنی رحمت سے اسے ہارون جیسا بھائی عطا کیا کہ جو خود بھی پیغمبر تھا۔ (وَوَهَبْنَا لَهُ مِنْ رَحْمَتِنَا اخَاهُ هَارُونَ نَبِيًّا)۔

چند اہم نکات :

۱۔ غصص کہے کتے ہیں؟ اوپر والی آیت میں ہم نے پڑھا ہے کہ خدا نے موسیٰ کو اپنے "غصص" (لام کی زبردستی) سے ہندوں میں سے قرار دیا اور یہ مقام بھی کہ ہم نے اشارہ کیا ہے، بہت ہی با عظمت مقام ہے۔ یہ ایک ایسا مقام ہے کہ جہاں خدا کی طرف سے انسان کے لیے لعنہ و لعنت اور آخرات سے پہلے کا گناہ میر ہو جاتا ہے، ایسا مقام جہاں شیطان کا کوئی اثر نہیں، یہ مقام مسلسل نفس کے ساتھ جہاد کے اور لگاؤ کا خداوند تعالیٰ کے فرمان کی اطاعت کے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔

علم اخلاق کے بزرگ علماء اس مقام کو بہت اعلیٰ اور بلند سمجھتے ہیں۔ قرآن کریم کی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ "مخلصین" خاص سنت اور امتحانات کے حامل ہوتے ہیں جو انشاء اللہ متعلقہ آیات کے ذیل میں آئیں گی۔

۲۔ رسول اور نبی میں فرق: رسول دراصل اُس شخص کے معنی میں ہے جس کے ذمے کوئی ماموریت یا پیغام رسائی کا کام لگایا گیا ہو تاکہ وہ اس کو پہنچائے۔ اور نبی ایک تفسیر کی بنا پر اُس شخص کے معنی میں ہے کہ جو وحی الہی سے آگاہ ہے اور اس کی خبر دیتا ہے اور دوسری تفسیر کے پر ایک عالم مقام شخص کے معنی میں ہے۔ (دونوں کا مادہ اشتقاق پہلے بیان ہو چکا ہے) یہ تو لغت کے لحاظ سے ہے۔

لیکن قرآنی تعبیرات اور روایات کی زبان کے لحاظ سے بعض کا نظریہ یہ ہے:

۱۔ "نبی" کے معنی میں وہ شخص ہے کہ جو دوسرے کے کان میں کوئی بات کہے، یہاں خدا نے پہلے موسیٰ کو دوسرے کے واسطے سے مبعوث کیا اور ان کے نزدیک آنے کے بعد ان سے "نبی" (سرگوشی) میں بات کی۔ (یہ بات کہے بغیر واضح ہے کہ خدا نے زبان رکھتا ہے اور نہ مکالمہ کرتا ہے)۔

پہلے وہ شخص ہے کہ جو صاحب دین و آئین ہو اور تبلیغ کرنے پر مامور ہو۔ یعنی وحی الہی کو حاصل کر کے لوگوں کو اس کی تبلیغ کرے، باقی رہا تو وہ وحی کو حاصل تو کرتا ہے لیکن تبلیغ کرنا اس کی ذمہ داری نہیں ہوتی بلکہ وہی حرف الہی کی اپنی ذمہ داری انجام دینے کے لیے ہوتی ہے یا اس سے کوئی سوال کریں تو وہ اس کا جواب دیتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں "نبی" اس آگاہ طیب کی طرح ہے کہ جو اپنے مقام پر بیادوں کی پڑائی کے لیے آمادہ ہے لیکن وہ بیادوں کے میں جاتا۔ لیکن اگر بیمار اس کی طرف رجوع کریں تو پھر ان کا علاج کرنے میں کوتاہی نہیں کرتا۔

لیکن رسول اُس طیب کی مانند ہے کہ جو سترتا رہے (یعنی بیماروں کے پاس علاج کرنے کے لیے چل کر جاتا ہے) اور اُس تعبیر کے مطابق جو حضرت نے نبی البلاغہ میں پیغمبر اسلام کے بارے میں فرمایا ہے۔ (طیب دُورِ طیب)۔

وہ شہر میں دیہات میں کوہ و دشت و بیابان میں، ہر جگہ جاتا ہے تاکہ بیماروں کو تلاش کرے اور ان کا علاج کرے۔ وہ ایک ایسا پیغمبر جو پیادوں کے پیچھے دوڑتا ہے۔ وہ ایسا پیغمبر نہیں ہے کہ جسے پیادے تلاش کرتے پھریں۔

ان روایات سے کہ جو اس سلسلے میں ہم تک پہنچے ہیں اور مروجہ تفسیر نے کتاب "اصول کافی" کے باب "طبقات الانبیاء والرمسل" میں بیان کیا ہے کہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ نبی وہ ہوتا ہے کہ جو حقائق وحی کو عالم خواب میں دیکھتا ہے اور پھر حضرت ابراہیم کا خواب تھا) یا خواب کے علاوہ بیداری میں بھی وحی کے فرشتے کی آواز سنتا ہے۔

لیکن رسول وہ ہوتا ہے کہ عالم خواب میں وحی حاصل کرنے اور فرشتے کی آواز سننے کے علاوہ خود اس کا بھی مشاہدہ کرتا ہے۔ البتہ ان روایات میں جو کچھ بیان ہوا ہے، اُس تفسیر کے منافی نہیں جو ہم نے بیان کی ہے کیونکہ ممکن ہے کہ نبی و رسول کی ماموریت کا اختلاف و تفاوت وحی حاصل کرنے کے طریقہ پر بھی اثر انداز ہوتا ہو اور دوسرے لفظوں میں ماموریت کا ہر مرحلہ وحی کے ایک مخصوص مرحلہ کے ساتھ ہو (غور کیجئے گا)۔

۵۴۔ وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِسْمَاعِيلَ إِنَّهُ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُولًا نَبِيًّا ۝

۵۵۔ وَكَانَ يَأْمُرُاهُ بِالصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهِمْ مَرْضِيًّا ۝

ترجمہ

۵۴۔ اپنی (آسانی) کتاب میں اسماعیل کو یاد کرو۔ وہ اپنے وعدوں میں سچا اور ایک بزرگ پیغمبر اور رسول تھا۔

۵۵۔ نبی البلاغہ۔ خطبہ ۱۰۸۔

اصول کافی، جلد اول، ص ۱۳۳-۱۳۴ (چاپ دار کتب الاسلامیہ)۔

۵۵۔ وہ ہمیشہ اپنے گھر والوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا کرتا تھا اور ہمیشہ اپنے پروردگار کی رضا و کرم کا حامل تھا۔

تفسیر

اسمعیلؑ، صادق الوعد پیغمبر:

ابراہیمؑ اور ان کی فداکاریوں، اور اسی طرح موسیٰؑ کی زندگی کے بارے میں مختصر اشارہ کرنے کے بعد، قرآن ابراہیمؑ کے بزرگ ترین اسمعیلؑ کے بارے میں گفتگو شروع کرتا ہے، اور ابراہیمؑ کی یاد کے ساتھ اور ان کے پروگراموں کی اسمعیلؑ کے پیچھے کے ساتھ تحلیل کرتا ہے۔ یہاں حضرت اسمعیلؑ کی اعلیٰ صفات میں سے پانچ صفات جو سب لوگوں کے لیے نمونہ بن سکتی ہیں بیان کی گئی ہیں۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف روئے سخن کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: اپنی آسمانی کتاب میں اسمعیلؑ کو یاد کرو (واذکر فی الكتاب اسمعیل)۔

وہ اپنے وعدوں میں سچا تھا (انہ کان صادق الوعد)۔

اور اعلیٰ مقام پیغمبر تھا (وکان رسولاً نبیاً)۔

وہ ہمیشہ اپنے گھر والوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتا تھا (وکان یأمر اہلہ بالصلوٰۃ والزکوٰۃ)۔

اور ہمیشہ اپنے پروردگار کی رضا کا حامل رہتا تھا (وکان عند ربہ مرضیاً)۔

ان دو آیات میں صادق الوعد ہونا، اعلیٰ مقام پیغمبر ہونا، نماز کا حکم دینا اور خالق کے ساتھ ربط و تعلق رکھنا، زکوٰۃ کا حکم دینا اور مخلوق خدا کے ساتھ رابطہ برقرار رکھنا اور آخر کار ایسے کام انجام دینا کہ جن میں خداوند تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہو، خداوند تعالیٰ کے اس عظیم پیغمبر کی صفات شمار ہوتے ہیں۔

عہد و پیمان کی وفا اور گھر والوں کی تربیت پر توجہ، ان دو فرائض الہی کی انتہائی اہمیت کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ ان میں سے ایک مقام نبوت سے پہلے اور دوسرا بلا فاصلہ مقام نبوت کے بعد ذکر ہوا ہے۔

حقیقتاً جب تک انسان صادق نہ ہو حال ہے کہ رسالت کے اعلیٰ مقام تک پہنچے کیونکہ اس مقام و مرتبہ کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ وحی الہی کرے کم و کاست اس کے بندوں تک پہنچائے۔ لہذا ان گنے گنے چند افراد کو جسے بھی کہ جو انبیاء کے لیے ان کی عمر کے کسی حصہ میں مقام عصمت کا انکار کرتے ہیں، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صادق ہونے کے مسئلے کو ایک شرط اساسی کے طور پر قبول کر لیا ہے یعنی خبروں میں بھی صداقت و راستی، وعدوں میں بھی صداقت و راستی اور تمام چیزوں میں صداقت و راستی۔

ایک روایت میں ہے کہ یہ جو خداوند تعالیٰ نے اسمعیلؑ کو صادق الوعد قرار کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے وعدہ کی وفا کرنے میں اس قدر پابند تھے کہ انہوں نے کسی آدمی سے ایک جگہ اس کے انتظار کا وعدہ کر لیا تھا، وہ شخص وہاں نہ آیا، لیکن اسمعیلؑ ایک سال تک اس کا انتظار کرتے رہے، اس طویل عرصے کے بعد جس وقت وہ وہاں آیا تو اسمعیلؑ نے فرمایا کہ میں تو ہمیشہ تیرے انتظار میں رہا۔

اصول کافی، جلد دوم، صفحہ ۲۸۷

یہ بات ظاہر ہے کہ اس سے ہرگز یہ منظور نہیں ہے کہ اسمعیلؑ نے اپنی زندگی کے دیگر کاموں کو ہی سہل کر دیا تھا، بلکہ اس کا مقصد یہ ہے اپنے دیگر پروگرام جاری رکھتے ہوئے مذکورہ شخص کا انتظار کرتے رہے۔

ایقانے عہد کے سلسلے میں (تیسری جلد ص ۲۸۵، اردو ترجمہ سورۃ مائدہ کی پہلی آیہ کے ذیل میں ہم تفصیلی بحث کرتے ہیں۔

دوسری طرف سے تبلیغ رسالت کا پہلا مرحلہ اپنے خاندان اور گھر والوں سے شروع کرنا ہے، کیونکہ وہ انسان کے سب سے زیادہ بڑھتے ہیں۔ اسی بنا پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی پہلے اپنی دعوت اپنی زوجہ گرامی قدر جناب خدیجہ کرام اللہ علیہا اور بچے پیچازاد بھائی حضرت علی علیہ السلام سے شروع کی اور اس کے بعد "وانذر عشیرتک الاقربین" لے کے فرمان کے مطابق اپنے قریبی رشتہ وادوں کو دعوت دی۔

سورہ طہ کی آیہ ۱۳۲ میں بھی ہے:

وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلَاةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا

اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دو اور خود بھی نماز کی ادائیگی پر پابند رہو۔

ایک اور نکتہ جو یہاں قابل ذکر ہے یہ ہے کہ حضرت اسمعیلؑ کی رضائے الہی کا حامل ہونے کے ساتھ توصیف، واقعاً اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ انہوں نے اپنے سارے امور رضائے الہی کے سانچے میں ڈھال رکھے تھے۔

امولاً کوئی نعمت اس سے بالاتر نہیں ہے کہ انسان کا سمود و مولا اور اس کا خالق اُس سے راضی و خوشنود ہو۔ اسی بنا پر سورۃ مائدہ کی آیہ ۱۱۹ میں خدا کے مخصوص بندوں کے لیے بہشت ہادوں کا بیان کرنے کے بعد آخر میں فرمایا گیا ہے:

رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ذَلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ

خدا اُن سے راضی و خوش ہوا اور وہ بھی اُس سے خوش ہوں گے اور یہ ایک عظیم کامیابی اور

ایک بہت بڑی نجات ہے۔

۵۶۔ وَادْكُرْ فِي الْكِتَابِ اِذْ لَيْسَ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيقًا نَّبِيًّا

۵۷۔ وَرَفَعْنَاهُ مَكَانًا عَلِيًّا

۵۸۔ اُولَٰئِكَ الَّذِيْنَ اَعْمَلَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيْنَ مِنْ ذُرِّيَةِ اٰدَمَ

وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ وَمِنْ ذُرِّيَةِ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْرٰءِيْلَ وَمِمَّنْ

سورہ شعرا، آیہ ۲۱۴۔

اس سلسلے میں ہم تفسیر نمونہ کی جلد ۳ ص ۲۸۱ (اردو ترجمہ) میں تفصیلی بحث کر چکے ہیں۔

مَدِينًا وَاجْتَبَيْنَا اِذَا تَلَّ عَلَيْهِمْ هَوَايْتُ الرَّحْمٰنُ خَرُّوْا سَجْدًا
وَبُكْيًا ۝

۵۹۔ فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهْوٰتِ

فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غِيًّا ۝

۶۰۔ اِلَّا مَنْ تَابَ وَامِنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلِیْكَ یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا

یُظْلَمُوْنَ شَیْئًا ۝

ترجمہ

۵۹۔ اور اس کتاب میں اور میں کو بھی یاد کرو وہ بہت ہی سچا اور عظیم پیغمبر تھا۔

۵۷۔ اور ہم نے اُسے بلند مقام پر پہنچایا۔

۵۸۔ وہ سب کے سب ایسے پیغمبر تھے کہ خداوند تعالیٰ نے انہیں اپنی نعمت سے نوازا تھا۔ یہ ان انبیاء میں سے تھے کہ جو آدم کی اولاد میں سے تھے اور ان لوگوں میں سے تھے کہ جنہیں ہم نے نوح کے ساتھ کشتی میں سوار کیا تھا اور وہ ابراہیم و یعقوب کی ذریت میں سے تھے اور ایسے تھے کہ جنہیں ہم نے ہدایت کی تھی اور بجز یہ کیا تھا۔ وہ ایسے افراد تھے کہ جس وقت خدا نے رحمت کی آیات ان کے سامنے پڑھی جاتی تھیں تو وہ زمین پر گر پڑتے تھے اور سجدے میں گرے کیا کرتے تھے۔

۵۹۔ لیکن ان کے بعد ناشائستہ اور ناخلف اولاد نے ان کی جگہ لے لی، انہوں نے نماز کو ضائع کیا اور شہوات کی پیروی کی اور وہ عنقریب اپنی گمراہی (کی سزا) کو دیکھیں گے۔

۶۰۔ مگر جو لوگ توبہ کر لیں، ایمان لے آئیں اور عمل صالح بھی انجام دیں تو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر معمولی سا بھی ظلم نہیں ہوگا۔

تفسیر

یہ سچے پیغمبر تھے، لیکن

اس سورہ کی یاد آوریل کے آخری حصے میں، حضرت اور میں پیغمبر کے بارے میں بات کی گئی ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: اپنی آسمانی کتاب (قرآن) میں اور میں کو یاد کرو وہ صدیق اور پیغمبر تھا (واذکر فی الکتاب ادیس انہ کان صدیقاً نبیاً)۔

• صدیق: بیا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں۔ بہت ہی سچ بولنے والے، خداوند تعالیٰ کی آیات کی تصدیق کرنے والے اور حقیقت کے سامنے سر تسلیم خم کرنے والے شخص کو کہتے ہیں۔

اس کے بعد اس کے بلند پایہ مقام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: ہم نے اُسے ایک بلند مقام تک پہنچا دیا (ورفعناہ مکاناً علیاً)۔

اس بارے میں کہ اس سے حضرت اور میں کے مقام معنوی کی عظمت مراد ہے۔ یا حسی مکان کی بلندی مراد ہے، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ ہماری طرح بعض نے اس عظیم پیغمبر کے معنوی مقامات اور روحانی درجات کی طرف اشارہ سمجھا ہے۔ بعض کا نظریہ ہے کہ خداوند تعالیٰ حضرت اور میں کو حضرت عیسیٰ کی طرح آسمان کی طرف لے گیا اور وہ (مکاناً علیاً) کی تفسیر کو اُپر والی آیت میں اسی کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں لیکن لفظ "مکان" کا اطلاق معنوی مقامات کے معنی میں عام چیز ہے۔ سورہ یوسف کی آیہ ۷۷ میں ہے کہ حضرت یوسف نے اپنے بھائیوں سے کہ جنہوں نے غلط کام انجام دیا تھا کہا:

انتھو شمر مکانا

تم مقام و منزلت کے لحاظ سے بدترین آدمی ہو۔

بہر حال حضرت اور میں خداوند تعالیٰ کے ایک بلند مقام اور عالی مرتبہ پیغمبر ہیں کہ جن کے حالات کی تفصیل حکمت کے ضمن میں آئے گی۔

اس کے بعد ان تمام افتخارات و اعزازات کو، جو گزشتہ آیات میں عظیم انبیاء کے سلسلے میں اور ان کی صفات و حالات اور ان نعمتوں کے بارے میں جو خداوند تعالیٰ نے انہیں عطا فرمائی تھیں، اجتماعی صورت میں بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا: وہ ایسے انبیاء تھے کہ جنہیں خدا نے اپنی رحمت سے نوازا تھا۔ (أُولَٰئِكَ الذِّیْنَ اَعَزَّ اللّٰهُ عَلَیْہِمْ مِنَ النَّاسِ)۔

انہیں سے بعض آدم کی اولاد میں سے تھے اور بعض ان لوگوں کی اولاد میں سے تھے جن کے ساتھ کشتی میں سوار ہوئے تھے اور بعض ابراہیم اور اسماعیل کی ذریت میں سے تھے۔ (من ذریتِ ادم ومن ذریتِ نوح ومن ذریتِ ابراہیم واسرائیل)۔

بادجو اس کے کہ یہ سب کے سب انبیاء آدم کی اولاد سے تھے ان کی کسی نہ کسی بزرگ پیغمبر سے نزدیکی کو مد نظر رکھتے ہوئے انہیں ذریت ابراہیم واسرائیل سے یاد کیا ہے اور اس آیت کی ترتیب میں ذریت آدم سے مراد اور میں ہیں جو مشہور قول کے مطابق نوح پیغمبر کے بچہ امجد تھے اور نوح کے ساتھ کشتی میں سوار ہونے والوں کی اولاد سے مراد ابراہیم ہیں کیونکہ ابراہیم نوح کے بیٹے سام کی اولاد میں سے تھے۔

اور ذریت ابراہیم سے مراد اسحاق، یعقوب اور یعقوب میں اور اسرائیل کی ذریت سے مراد موسیٰ، ہارون، زکریا، عیسیٰ اور عیسیٰ ہیں جن کے حالات اور بہت سی صفات کی طرف گزشتہ آیات میں اشارہ ہوا ہے۔

اس کے بعد اس بحث کی ان عظیم انبیاء کے سچے پیروکاروں کی یاد سے عمیل کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: اور ان لوگوں میں سے کہ جنہیں ہم

نے ہدایت کی ہے اور انہیں منتخب کیا ہے ایسے لوگ ہیں کہ جب خدا تعالیٰ کی آیات ان کے سامنے پیش ہوتی ہیں تو وہ خاک پر گر پڑتے اور سجدہ ریز ہو جاتے ہیں اور ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہہ نکلتا ہے (وَمَنْ هَدَيْنَا وَاجْتَبَيْنَا إِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُ الرَّحْمَنِ خَرَوْا سُجَّدًا وَبُكِيًّا)۔

بعض مفسرین نے "مَنْ هَدَيْنَا وَاجْتَبَيْنَا" ... کے جملے کو انہی انبیاء کے بارے میں کر جن کی طرف آیت کے آغاز میں اشارہ ایک دوسرا بیان کیا ہے، لیکن ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔
اس بات کی گواہ وہ حدیث ہے کہ جو امام زین العابدین علی بن الحسین علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے کہ آپ نے اس آیت کی تلاوت کے وقت فرمایا:

نَحْنُ عَنْتِنَا بِهَا

اس آیت سے مراد ہم اہل بیت ہیں۔

ظاہر ہے کہ اس جملے سے ہرگز انحصار مراد نہیں ہے بلکہ یہ انبیاء کے سچے پیروکاروں کے واضح مصداق کا بیان ہے اور ہم نے تفسیر نمونہ میں بار بار اس مطلب کے بہت سے نمونے پیش کیے ہیں۔

لیکن اس حقیقت پر توجہ نہ کرنا اس بات کا سبب بنا کہ آلوسی جیسے مفسرین روح المعانی میں اشتباہ کا شکار ہو گئے اور اس حدیث پر طعن کرنے لگے اور اسے احادیث شیعہ کے مستبرہ ہونے کی دلیل سمجھنے لگے۔ اور یہی متبیروان روایات کے واقعی مفہوم سے واقف نہ ہونے کا ہے کہ جو آیات کی تفسیر میں وارد ہوئی ہیں۔

یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ: گذشتہ آیات میں حضرت مریم کے بارے میں بھی گفتگو ہوئی ہے، حالانکہ وہ انبیاء میں سے نہیں ہیں وہ بھی ان افراد میں سے ہیں کہ جو "مَنْ هَدَيْنَا وَاجْتَبَيْنَا" کے جملے کا مصداق ہیں اور ہر جگہ ایک یا کئی مصداق رکھتا تھا اور کتبائے یہی وجہ ہے کہ ہم سورہ نساء کی آیہ ۶۹ میں بھی یہ مشاہدہ کرتے ہیں کہ اس میں خداوند تعالیٰ کی نعمتوں کو صرف انبیاء تک منحصر نہیں کیا گیا بلکہ صدیقین و شہداء کو بھی اس میں شامل کیا گیا ہے:

"فَاُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ لَهُمْ أَجْرٌ كَثِيرٌ وَكَانُوا يَرْغَبُونَ فِي الْآيَاتِ"

سورہ آمدہ کی آیہ ۷۵ میں بھی حضرت عیسیٰ کی والدہ مریم کو "صدیقہ" سے تعبیر کیا گیا ہے اور فرمایا گیا ہے:

وَامْدُ صَدِيقَةٍ

اس کے بعد اس گروہ کے بارے میں کہ جو انبیاء کے انسان ساز کتب سے الگ ہو کر ناخلف پیروکار بن گئے انھوں کی گنتی ہے۔ قرآن ان کے کچھ نمونے اعمال کو شمار کرتا ہے اور کہتا ہے: ان کے بعد ایسی ناخلف اولاد ہوئی کہ جنہوں نے ناز کو ضائع کر دیا۔

۱۔ "سَجَّاد" ساجد (سجدہ کرنے والا) کی جمع ہے اور "بُكِيًّا" باکی (گریہ کرنے والا) کی جمع ہے۔

۲۔ کیونکہ اگر گذشتہ انبیاء کی طرف اشارہ ہو تو فعل مضارع "تُتْلَىٰ" جو آئندہ کے زمانہ کے ساتھ مربوط ہے ہم آہنگ نہیں ہوگا۔ سوائے اس صورت کے کہ "كَانُوا" یا اسی جیسا کہ لفظ متقدم ہیں، جو کہ غلط ظاہر ہے۔

۳۔ جمع السبلان، محل بحث آیہ کے ذیل میں۔

فرشتوں کی پیروی کرنے لگے یہ لوگ جلد ہی اپنی گمراہی کی سزا پالیں گے۔ (فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ أَضَاعُوا الصَّلَاةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهْوَاتِ فَسُوفَ يَلْعَنُونَ غَيًّا)۔

"خَلْفٌ" (بروزن برف) غیر صالح اولاد کے معنی میں ہے اور اصطلاحاً اس کو "خَلْفٌ" کہتے ہیں جبکہ "خَلْفٌ" (بروزن ہند) نیک اور صالح فرزند کے معنی میں ہے۔

ممکن ہے یہ جملہ اس گروہ کی طرف اشارہ ہو کہ جو بنی اسرائیل میں سے گمراہی کی راہ پر چل نکلا تھا۔ انہوں نے خدا کو بھلا دیا تھا، خواہشات کی پیروی کو ذکر خدا پر ترجیح دینے لگ گئے تھے۔ انہوں نے دنیا کو فساد سے بھر دیا اور آخر کار دنیا میں بھی انہوں نے اپنے بُرے اعمال کا نتیجہ دیکھ لیا اور آخرت میں بھی ان کا نتیجہ دیکھیں گے۔

اس بابے میں کہ اس مقام پر "أَضَاعُوا صِلَاةً" سے مراد ناز کو ترک کرنا ہے یا اس کے وقت سے تاخیر کرنا ہے یا ایسے اعمال بجالانے جس کی وجہ سے معاشرے میں ناز ضائع ہو جائے، مفسرین نے مختلف احتمال پیش کیے ہیں لیکن آخری معنی ہی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

اس مقام پر تمام عبادات میں سے صرف نماز ہی کا ذکر کیوں کیا گیا؟ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ نماز، جیسا کہ ہم جانتے ہیں انسان کو گناہوں سے روکتی ہے۔ جب یہ رکاوٹ دور ہو جاتی ہے تو اس کا قطعی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان خواہشات میں غرق ہو جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں جس طرح پیغمبروں نے اپنے مقام کے ارتقا کو یا خدا سے شروع کیا تھا اور جس وقت خدا کی آیات ان کے سامنے پیش ہوتی تھیں تو وہ خاک پر گر جاتے تھے اور گریہ کرتے تھے، ان ناخلف پیروکاروں نے اپنی تباہی کا آغاز یا خدا کو بھلا دینے سے کیا۔

قرآن یہی چاہتا ہے کہ ایمان و حق کی طرف آنے کی راہ کھلی رکھے یہاں بھی ناخلف نسلوں کے انجام کا ذکر کرنے کے بعد قرآن اس طرح کہتا ہے: مَرَدُّهُ لَكَ جَوْزِيَّةً كَرِيمَةٍ لِّكَ، ایمان لے آئیں گے اور عمل صالح انجام دیں گے وہ جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر ذرا سا ظلم بھی نہ ہوگا: (الْأَمِنْ تَابَ وَأَمِنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَأُولَٰئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُونَ شَيْئًا)۔

اس بنا پر یہ بات نہیں ہے کہ اگر کوئی شخص ایک دن خواہشات کی پیروی کر بیٹھے تو ہمیشہ کے لیے ہی اس کی پیشانی پر رحمت خلیفہ ناپیسی اور ناسیدی کی ہر گج جائے گی، بلکہ جب تک سانس باقی ہے اور انسان دنیا میں زندہ ہے اس کے لیے توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔

چند نکات:

اور پس کون تھے؟

بہت سے مفسرین کے قول کے مطابق اور پس، نوح کے پروردگار تھے ان کا نام تودیت میں "اخنوخ" اور عربی میں اور پس ہے جسے بعض "دوس" کے مادہ سے سمجھتے ہیں کیونکہ وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے قلم کے ساتھ خط لکھا۔ وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے انسان کو لباس سینے کا طریقہ سکھایا۔

اس عظیم پیغمبر کے بارے میں قرآن میں صرف دو مرتبہ، وہ بھی مختصر سے اشاروں کے ساتھ، بیان آیا ہے۔ ایک انہیں زیر بحث میں اور دوسرا سورہ انبیاء کی آیات ۸۵-۸۶ میں۔ مختلف روایات میں ان کی زندگی کے بارے میں تفصیلی طور پر بیان کیا گیا ہے کہ جسے ہم اپنا پورا معجز نہیں سمجھ سکتے۔ اسی وجہ سے ہم مذکورہ اشارے پر قناعت کرتے ہوئے اس بحث کو ختم کرتے ہیں۔

۲۔ ایک حدیث میں کہ جو علمائے اہل سنت کی بہت سی کتابوں میں لکھی ہوئی ہے، یہ کہا گیا گیا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے جب آیہ "فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِ خُلَفَاءُ" کی تلاوت کی تو فرمایا:

يَكُونُ خَلْفُ مَنْ بَعْدَ سِتِّينَ سَنَةً اَضَاعُوا الصَّلَاةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ فَسُوفَ يَلْقَوْنَ غِيَاثًا يَكُونُ خَلْفُ يَوْمَئِذٍ الْقُرْآنَ لَا يَمْدُوْنَ وَتَرَاهُمْ وَاَقْبَهُمْ وَيَقْرَأُ الْقُرْآنَ ثَلَاثَةَ مِائَاتٍ وَمَنَافِقُ وَفُلَجَر :

ساتھ سال کے بعد ایسے لوگ ظاہر ہوں گے جو نماز کو ضائع کر دیں گے اور شہوات میں غرق ہو جائیں گے اور بہت جلدی اپنی گمراہی کا نتیجہ پالیں گے۔ ان کے بعد اور گروہ ظاہر ہوگا۔ یہ لوگ قرآن کو (بڑی شان کے ساتھ) پڑھیں گے۔ لیکن وہ ان کے شانوں سے اوپر نہ جائیں گے۔ کیونکہ نہ اس میں اخلاص ہوگا، نہ غور و فکر ہوگا، نہ عمل کرنے کے لیے سوچ ہوگا بلکہ وہ بے باکائی اور کھادے کے طور پر ہوگا۔ یا صرف الفاظ پر قناعت ہوگی اور اسی وجہ سے ان کے اعمال خدا کی بارگاہ میں نہ پہنچ پائیں گے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اگر ہم ساٹھ سال کی ابتداء پیغمبر اکرمؐ کی ہجرت سے لیں تو یہ ٹھیک وہ زمانہ بنتا ہے کہ جب بڑی سخت سلطنت پر بیٹھا۔ اور سید الشہداء امام حسین علیہ السلام اور ان کے یار و انصاف نے جام شہادت نوش فرمایا اور اس کے بعد باقی ماندہ زمانہ بنی امیہ اور بنی عباس کا دور ہے کہ جنہوں نے اسلام کے صرف نام پر قناعت کر لی تھی اور قرآن کے صرف الفاظ پر ہم غلامی سے پناہ مانگتے ہیں کہ ہم اس قسم کے ناخلف گروہ میں سے ہوں۔

۶۱۔ جَنَّتِ عَدْنِ الَّتِي وَعَدَ الرَّحْمَنُ عِبَادَهُ بِالْغَيْبِ إِنَّهُ كَانَ وَعْدُهُ مَأْتِيًا ۝

۶۲۔ لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا وَلَا سُلْهًا وَلَهُمْ فِيهَا زُكُوفٌ مِنْ ثَمَرِهِمْ وَمِنْ عَشْيَا ۝

۶۳۔ تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي نُورِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًا ۝

ترجمہ

۶۱۔ دائمی باغات ہیں جن کا خدائے رحمان اپنے بندوں سے وعدہ کیا ہے۔ اگرچہ ان کو انہوں نے دیکھا نہیں ہے، لیکن

لہ تفسیر الریزان، جلد ۱۴، ص ۸۲۔

خدا کا وعدہ حتمی طور پر پورا ہو کر رہے گا۔
۶۲۔ وہ وہاں ہرگز نہ لو اور بے ہودہ گفتگو نہیں سنیں گے، اور سوائے سلام کے کوئی بات نہیں ہے، اور اس میں ہر صبح و شام ان کے لیے روزی مقرر ہے۔
۶۳۔ یہ وہی جنت ہے کہ جو ہم بطور میراث اپنے پرہیزگار بندوں کو دیں گے۔

تفسیر

جنت کی توصیف :

ان آیات میں جنت اور جنتوں کی تعریف و توصیف کی گئی ہے جس کا بیان آیات گزشتہ میں آیا ہے۔ پہلے بہشت موعود کی اس طرح توصیف کی گئی ہے، ہمیشہ رہنے والے باغات ہیں کہ جن کا خدائے رحمن نے اپنے بندوں سے وعدہ کیا ہے اور انہوں نے انہیں دیکھا نہیں ہے، (لیکن ان پر ایمان رکھتے ہیں) (جنان عدن التي وعد الرحمن عباده بالغيب)۔ خدا کا وعدہ حتمی طور پر پورا ہو کر رہے گا (انہ كان وعده مآثيًا)۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ گزشتہ آیات میں توبہ، ایمان اور عمل صالح کے بارے میں گفتگو تھی اور اس کے بعد بہشت کا وعدہ منور "جنت" کی صورت میں آیا تھا لیکن یہاں جنت "جنات" کی صورت میں ہے کیونکہ "جنت" درحقیقت بہت زیادہ پر نعمت متعدد باغات کا مرکب ہے جو صالح مومنین کے لیے ہے۔

"عدن" کے ساتھ ان کی توصیف جو ہمیشگی اور جاودانی کے معنی میں ہے، اس امر کی دلیل ہے کہ "جنت" اس جہان کے باغات اور نعمتوں کی طرح نہیں ہے کہ جو زائل ہونے والی ہو کیونکہ جو چیز انسان کو اس جہان کی عظیم نعمتوں کے بارے میں پریشان کرتی ہے، یہ ہے کہ سب آخر کار زوال پذیر ہیں لیکن "جنت" کی نعمتوں کے بارے میں یہ پریشانی نہیں ہے۔

عبادہ کا لفظ خدا کے مومن بندوں کے معنی میں ہے نہ کہ تمام بندوں کے معنی میں اور بالغیب کی تعبیر جو اس کے بعد ہے اس کا معنی ہے کہ وہ ان کی آنکھوں سے پوشیدہ ہیں اس کے باوجود وہ ان پر ایمان رکھتے ہیں۔ سورہ فجر کی آیت ۳۰ میں بیان ہوا ہے :

فَادْخُلِي فِي عِبَادِي وَادْخُلِي جَنَّتِي

میرے بندوں میں داخل ہو جا اور میری جنت میں وارد ہو۔

"بالغیب" کے معنی میں یہ احتمال بھی ہے کہ جنت کی نعمتیں ایسی ہیں کہ جنہیں کسی آنکھ نے دیکھا اور نہ کسی کان نے سنا۔ یہاں تک کہ کسی انسان کے دہم دماغ میں بھی نہیں آئیں۔ اس کی نعمتیں کامل طور پر ہماری حس و ادراک سے غائب ہیں۔ وہ ایک ایسا جہان ہے جو اس جہان سے بڑا، وسیع تر اور بالاتر ہے۔ اس کا ہم صرف زوہالی آنکھ کے ساتھ ذوق سے ایک دھندلا سا تصور ہی کر سکتے ہیں۔

لہ محمد بن " : لغت کے لحاظ سے اقامت کے معنی میں ہے اور یہاں یہ مفہوم رکھتا ہے کہ اس کے ساکن ہمیشہ اس میں مقیم رہیں گے۔

اس کے بعد بہشت کی عظیم نعمتوں میں سے ایک اور نعمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے : وہ وہاں کوئی لغو اور بیہودہ بات نہیں سنیں گے (لا یسمعون فیہا لغواً) نہ کوئی جھوٹ، نہ کالی گلوئی، نہ تمتم، نہ زبان کے زخم، نہ کوئی تسخر اور فراق اڑانے کی بات یہاں تک کہ کوئی بیہودہ بات نہیں ہوگی۔

صرف ایک چیز جو وہاں ہمیشہ کان میں آتی رہے گی وہ سلام ہے (السلام)۔ سلام : اپنے وسیع معنی میں جو اہل بہشت کی رُوح، فکر، کردار اور گفتار کی سلامتی پر دلالت کرتا ہے۔ ایسا سلام کہ جس نے اس ماحول کو ایک بہشت بنا دیا ہے اور ہر قسم کی اذیت و تکلیف اُس سے ختم کر دی ہے۔ ایسا سلام جو امن و سلامتی کے ماحول کا ایک نمونہ اور صفا و صمیمیت، پاکیزگی و تقویٰ، صلح و آشتی اور آرام و سکون کے ماحول کی ایک نشانی ہے۔

قرآن کی دوسری آیت میں بھی یہی حقیقت مختلف تعبیروں کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔ سورہ زمر کی آیہ ۸۳ میں ہے :
”وقال لہم خزنتہا سلام علیکم طیبتم فادخلوها خالدين“
جنت کے خزانہ دار جنت میں داخل ہوتے وقت اُن سے کہیں گے : آپ پر سلام ہو، ہمیشہ خوش و خرم رہیں، پاک و پاکیزہ رہیں، آئیے تشریف لائیے، جنت میں داخل ہو جائیے اور ہمیشہ ہمیشہ اسی میں قیام فرمائیے۔

سورہ ق کی آیہ ۳۴ میں ہے :

ادخلوها بسلام ذالک یوم الخلود

سلام و سلامتی کے ساتھ اس میں داخل ہو جائو۔ آج ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جنت میں داخلے کا دن ہے۔ نہ صرف فرشتے اُن پر اور نہ خود ایک دوسرے پر درود و سلام بھیجیں گے بلکہ خدا بھی ان پر درود و سلام بھیجے گا۔ جیسا کہ سورہ یسین کی آیہ ۵۷ میں اُن پر سلام بھیج رہا ہے :

سلام قولاً من رب رحیم

تم پر سلام جو یہ مہربان پروردگار کی طرف سے تم بہشتیوں پر ایک سلام ہے۔

کیا سلام و سلامتی سے سمجھو اس ماحول سے بڑھ کر باصفا اور زیبا اور بھی کئی ماحول ہے؟

اس نعمت کے بعد ایک اور نعمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے : ہر صبح و شام ان کی روزی بہشت میں ان کے لیے حاضر ہے۔ (ولہم روزقہم فیہا بکرة وعشیاء)۔

اس جملے سے دو سوال پیدا ہوتے ہیں :

پہلا سوال یہ ہے کہ کیا جنت میں صبح و شام ہوتی ہے؟

اس سوال کا جواب اسلامی روایات میں اس طرح آیا ہے :

اگرچہ بہشت میں ہمیشہ نور اور روشنی ہوتی ہے لیکن ہشتی اُس کے نور اور سائے کے کم و زیادہ

ہونے سے رات اور دن کی تفریق کریں گے۔

دوسرا سوال : یہ ہے کہ آیات قرآن سے صاف ظاہر ہے کہ اہل بہشت جس نعمت اور جس روزی کی خواہش کریں گے ہمیشہ اور ہر وقت اسے حاصل کر سکیں گے۔ یہ کوئی رزق ہوگا جو صرف صبح و شام اُنہیں ملے گا؟
اس سوال کا جواب ایک لطیف حدیث سے ہے جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل ہوئی ہے، معلوم کیا جاسکتا ہے، جس میں آپ فرماتے ہیں :

وتعطیہم طرف الہدایا من اللہ لمواقیت الصلوۃ الذی کانوا یصلون فیہا فی الدنیا۔

خداوند تعالیٰ کی طرف سے ایسے عمدہ عمدہ تحفے اور ہدیے انہیں اُن اوقات میں دیئے جائیں گے جن اوقات میں وہ دنیا میں نماز پڑھا کرتے تھے۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ متاخر ہدیے جن کی ماہیت و حقیقت کو قیاس اور انداز سے سے بھی بیان نہیں کیا جاسکتا، ایسی قیمتی نعمتیں ہوں گی جو جنت کی عام نعمتوں کے علاوہ صبح و شام اُنہیں بطور ہدیہ دی جائیں گی۔
کیا مذکورہ بالا آیت کی تعبیر اور مذکورہ بالا حدیث اس بات کی دلیل نہیں ہیں کہ اہل بہشت کی زندگی ایک ہی طرز پر نہیں ہوگی بلکہ ہر روز اور ہر صبح و شام نئی نئی نعمتیں اور تازہ بہ تازہ لطف ان کے شامل حال ہوگا؟

اور کیا اس بات کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ وہاں انسان کا ارتقا جاری رہے گا۔ اگرچہ وہ وہاں کوئی نیا عمل نہ بنائیں لائے گا لیکن اپنے عقائد و اعمال کا جو مرکب اس نے اس جہان میں بنایا ہے اس کے ذریعے اپنی ارتقا کی منزل میں طے کرتا رہے گا۔

جنت اور اس کی مادی و روحانی نعمتوں کی اجمالی تعریف و توصیف کے بعد اہل جنت کا ایک مختصر سے جملے میں تعارف کرواتے ہوئے قرآن کہتا ہے : یہ وہی جنت ہے کہ جو ہم اپنے پرہیزگار بندوں کو میراث کے طور پر دیں گے (تلك الجنة التي نورث من عبادنا من کانوا تقیاً)۔

گویا اتنی نعمتوں سے ہماری جنت کے دروازے کی کلید ”تقویٰ“ کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

اگرچہ ”عبادنا“ (ہمارے بندوں) کی تعبیر میں ایمان و تقویٰ کی طرف تو ایک اجمالی اشارہ موجود ہے لیکن یہ ایسی جگہ نہیں ہے کہ جہاں اجمالی اشارہ کو کافی سمجھ لیا جائے، بلکہ یہاں صراحت کے ساتھ یہ حقیقت بیان ہوئی چاہیے کہ جنت صرف پرہیزگاروں کی جگہ ہے۔ یہاں پھر لفظ ”ارث“ (میراث) کے ساتھ ہمیں سابقہ پڑتا ہے جو عام طور پر ایسے مال کے لیے بولا جاتا ہے جو کسی سے اس کی موت کے بعد کسی دوسرے تک پہنچتا ہے، حالانکہ جنت کسی کی ملکیت نہیں ہے اور ظاہری طور پر کسی سے کسی کو کچھ پہنچنے کی کوئی بات نہیں ہے۔

اس سوال کا جواب دو طریقے سے دیا جاسکتا ہے :

۱۔ ”ارث“ لغت میں ”تملیک“ کے معنی میں آیا ہے اور مرنے والے کے مال کے اس کے پیمانہ گان کی طرف منتقل ہونے پر

منہر نہیں ہے۔

شل و مانند ہے کہ جس کی طرف تم دست سوال دراز کرو اور اس کی عبادت کرو؟

لفظ "سعی" اگرچہ نام کے معنی میں ہے لیکن یہ بات صاف طور پر واضح و روشن ہے کہ اس مقام پر صرف نام مراد نہیں ہے، بلکہ نام کا معنی و مفہوم مراد ہے، یعنی کیا خدا کے سوا کوئی اور خالق، رازق، معی، میت، ہر چیز کا عالم اور ہر چیز پر قادر نہیں مل سکتا ہے؟

۶۶۔ وَيَقُولُ الْإِنْسَانُ إِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ أُخْرَجُ حَيًّا ۝

۶۷۔ أَوَلَا يَذْكُرُ الْإِنْسَانُ أَنَّا خَلَقْنَاهُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْئًا ۝

۶۸۔ فَوَرَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ وَالشَّيَاطِينَ ثُمَّ لَنُحْضِرَنَّهُمْ حَوْلَ

جَهَنَّمَ حَيًّا ۝

۶۹۔ ثُمَّ لَنُنْزِعَنَّ مِنْ كُلِّ شِيعَةٍ أَيُّهُمْ أَشَدُّ عَلَى الرَّجُلِ عِتِيًّا ۝

۷۰۔ ثُمَّ لَنَحْنُ أَعْلَمُ بِالَّذِينَ هُمْ أَوْلَىٰ بِمَا صِلِيًّا ۝

ترجمہ

۶۶۔ انسان کہتا ہے کہ کیا میں مرنے کے بعد آئندہ (قبر سے) زندہ ہو کر باہر نکلوں گا؟

۶۷۔ کیا انسان اس بات کو یاد نہیں کرتا کہ ہم نے اس سے پہلے اُسے (اس حال میں) خلق کیا تھا جبکہ وہ کوئی چیز تھا ہی نہیں۔

۶۸۔ تیرے پروردگار کی قسم ہم ان سب کو اور شیاطین کو بھی ضرور زندہ کر کے اٹھائیں گے۔ اس کے بعد ہم ان سب کو جہنم کے گرد و گھٹنوں کے بل حاضر کریں گے۔

۶۹۔ پھر ہم ہر گروہ اور جماعت میں سے ان لوگوں کو جو عدائے رمل کے مقابل میں سب سے زیادہ سرکش تھے، الگ کر لیں گے۔

۷۰۔ پھر ہم ان افراد کے بارے میں بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ جو سب سے پہلے جہنم میں جلتے کے سزاوار ہیں۔ (اور ہم انہیں دوسروں کی نسبت پہلے سزا دیں گے)۔

شان نزول :

مفسرین کی ایک جماعت کے قول کے مطابق پہلی آیات "ابی بن خلف" یا ولید بن مغیرہ کے بارے میں نازل ہوئی ہیں جو ایک بوسیدہ بڑی کاٹھواں تھا جس میں لیے ہوئے تھے اور اسے اپنے ہاتھ سے گڑا کر ہوا میں بکھیر رہے تھے تاکہ اس کا ہر ہر ذرہ کسی نہ کسی گوشہ میں بکھریں۔

تھے کچھ کی طرف دیکھو جس کا گمان یہ ہے کہ خدا ہیں مرنے اور اس بڑی کی طرح ہماری بڑیوں کے بوسیدہ ہو جانے کے بعد دوبارہ زندہ ہو گا۔ یہ بات قطعاً ممکن نہیں ہے۔

اس پر یہ آیات نازل ہوئیں اور انہیں دندان شکن جواب دیا، ایسا جواب جو تمام انسانوں کے لیے ہر قرن اور ہر زمانے میں مفید اور آموز ہے۔

تفسیر

دو چیزوں کی کچھ توصیف :

گزشتہ آیات میں قیامت اور بہشت و دوزخ کے بارے میں بحث ہوئی تھی۔ زیر بحث آیات بھی اسی بارے میں گفتگو کرتی ہیں۔ پہلی آیت میں قیامت کا انکار کرنے والوں کی گفتگو کو اس طرح سے بیان کیا گیا ہے : انسان کہتا ہے کہ کیا مرنے کے بعد آئندہ زمانے میں قبر سے زندہ ہو کر باہر نکلوں گا (وَيَقُولُ الْإِنْسَانُ إِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ أُخْرَجُ حَيًّا)۔

البتہ یہ استقامت ایک استقامت انکار ہے۔ یعنی ایسی بات ممکن نہیں ہے کہ "انسان" کے ساتھ تعبیر (خصوصاً الف اور لام) کہ جو جنس کے طور پر آتے ہیں (جبکہ مناسب یہ تھا کہ اس کی بجائے "کافر" کہا جاتا۔ یہ بات شاید اس وجہ سے ہو کہ ابتداء میں یہ سوال کم و بیش ہر انسان کی طبیعت میں مخفی ہوتا ہے اور (موت کے بعد زندہ ہونے) کو سنتے ہی فوراً استقامتی علامت اس کے ذہن میں ابھر آتی ہے؟

بلافاصلہ اسی لب و لہجے اور اسی تعبیر کے ساتھ اُسے جواب دیا گیا ہے : کیا انسان اس حقیقت کو یاد نہیں کرتا کہ ہم نے اس سے پہلے اُسے (اس حال میں) پیدا کیا تھا جبکہ وہ مطلقاً کوئی چیز ہی نہیں تھا (أَوَلَا يَذْكُرُ الْإِنْسَانُ أَنَّا خَلَقْنَاهُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْئًا)۔

یہاں بھی "الانسان" کی تعبیر ممکن ہے، اس نکتے کی طرف اشارہ ہو کر انسان کو اس خدا داد استعداد اور ہوش و حواس کے ساتھ ایسے سوال کے جواب میں خاموش ہو کر نہیں بیٹھنا چاہیے، بلکہ اُسے چاہیے کہ وہ اپنی پہلی خلقت کو یاد کرے خود اس کا جواب دے، ورنہ اُس نے اپنی "انسانیت" کی حقیقت کو استعمال نہیں کیا۔

یہ آیات بھی معاد سے مربوط بہت سی دوسری آیات کی طرح معادِ جہانی کو ثابت کر رہی ہیں۔ ورنہ اگر یہ بنا ہوئی کہ صرف زندہ باقی ہے اور ہم کا دوبارہ زندہ کر کے اٹھایا جانا مطلوب نہ ہوتا تو پھر نہ اس سوال کا کوئی موقع تھا نہ اس جواب کا۔

بہر حال قرآن نے معاد کو ثابت کرنے کے لیے جو دلیل اس مقام پر دی ہے، یہی دلیل قرآن میں دوسرے مواقع پر بھی بیان ہوئی ہے

ان میں سے ایک سورہ یس میں ہے :

أَوَلَمْ يَرِ الْإِنْسَانُ أَنَّا خَلَقْنَاهُ مِنْ نَظْفَةٍ فَذَاهُو خَصِيمٍ مَبِينٍ وَ
ضَرَبَ لَنَا مِثْلًا وَنَسِيَ خَلْقَهُ قَالَ مِنْ عِجَالٍ وَهِيَ رَمِي قَوْلٍ يُحْيِيهَا الَّذِي

انشأها اول مرة وهو بكل خلق عليم

کیا انسان یہ نہیں سوچتا کہ ہم نے اسے لفظ سے پیدا کیا ہے پھر یہ ناچیز لفظ اپنے فاعل میں بولنے والے انسان کی شکل میں بدل گیا لیکن اس انسان نے اس حالت کے باوجود ہمارے لیے ایک مثال پیش کی اور اپنی پیدائش کو بالکل ہی بھول گیا، اس نے کہا کہ: "ان بوسیدہ ہڈیوں کو کون دوبارہ زندہ کرے گا؟" کہہ دو کہ انہیں وہی خدا زندہ کرے گا جس نے انہیں پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا اور وہ اپنی تمام مخلوقات کا علم رکھتا ہے۔ (یس - ۷۷ تا ۷۹) ۱

بعض مفسرین نے اس مقام پر ایک سوال اٹھایا ہے کہ اگر یہ دلیل درست ہو کہ جس شخص نے کوئی کام انجام دیا ہو وہ اسی کام بھی کرنے کی قدرت رکھتا ہے تو پھر ہم کچھ کاموں کو انجام دینے کے بعد انہی جیسے کاموں کو دوبارہ کرنے پر قادر کیوں نہیں ہوتے؟ مثلاً ہم بعض اوقات بہت عمدہ شعر کہہ لیتے ہیں یا بہت خوشخط لکھ لیتے ہیں لیکن بعد میں بہت کوشش کے باوجود دوسرا کام نہیں کر سکتے۔

اس سوال پر ہمارا جواب یہ ہے کہ ہم اپنے اعمال اپنے ارادہ و اختیار سے انجام دیتے ہیں لیکن بعض اوقات غیر اختیاراً اور کا ایک سلسلہ ہمارے بعض افعال کی خصوصیات پر اثر انداز ہوتا ہے۔ کبھی ہمارے ہاتھوں کی غیر محسوس لرزش حروف کی دہری شکل پر اثر انداز ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں ہماری قدرت و استعداد ہمیشہ ایک جیسی نہیں ہوتی۔ کبھی ایسے عوامل پیدا ہو جاتے ہیں کہ جو ہمارے تمام اندرونی قوی کو اکٹھا کر دیتے ہیں جس سے ہم ایک شاہکار پیدا کر سکتے ہیں لیکن بعض اوقات عوامل محرک زور ہوتے ہیں اور ہمارے قوی بچتے نہیں ہو پاتے اور اسی بنا پر دوسری مرتبہ کیا ہوا کام پہلی مرتبہ کیے ہوئے کام جتنا اچھا نہیں ہوتا۔

لیکن وہ خدا جس کی قدرت کی کوئی حد نہیں ہے اس کے لیے اس قسم کے مسائل پیدا نہیں ہوتے۔ وہ جو کام بھی انجام دے بالکل اسی جیسا ہے کم و کاست دوبارہ سرانجام دے سکتا ہے۔

بعد والی آیت میں مخبرین معاد اور بے ایمان گنہگاروں کو انتہائی یقینی انداز میں تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: تیرے پروردگار کی قسم ہم ان سب کو ان شیاطین کے ساتھ کر جائیں دوسرے میں ڈالتے تھے یا ان کے منہ ہوتے سب کو محسوس کریں گے (خودک لکھنا) والشیاطین)۔

پھر ہم ان سب کو جہنم کے گرد و گشتوں کے بل حاضر کریں گے: (شولنحضر نہو حول جہنم جثیاً)۔

یہ آیت اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ بے ایمان اور گنہگار لوگوں کی داد گاہ جہنم کے نزدیک ہے۔

"جثیاً" کی تعبیر (اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ "جثی" جاتی کی جمع، اس شخص کے معنی میں ہے کہ جو گشتوں کے بل بیٹھا ہو) شاید یہ ان کے ضعف و ناتوانی اور وقت و غمراہی کی طرف اشارہ ہو۔ گویا ان میں یہ قدرت نہیں ہے کہ وہ پاؤں پر کھڑے ۱

ہم اس دلیل کے سلسلے میں تفسیر نمونہ کی چھٹی جلد میں (اردو ترجمہ) "معاد کی مختصر ترین دلیل" کے حوالے سے بحث کر چکے ہیں (اور اسی طرح تفسیر نمونہ کی تیسری جلد کے (اردو ترجمہ) سے آگے بھی۔

۱۔ البتہ اس لفظ کے اور معانی بھی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ بعض نے "جثی" کو "گردہ گردہ" کے معنی میں تعبیر کیا ہے اور ۲۔ انہوہ اور ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے مثلاً سٹی اور پتھر دل کے معنی میں، لیکن پہلی تعبیر زیادہ مناسب اور زیادہ مشہور ہے۔

۱۔ اس داد گاہ عدل میں چونکہ اولیت کا لحاظ رکھا جائے گا، لہذا بعد والی آیت میں فرمایا گیا ہے: ہم سب سے پہلے ان لوگوں کو میں لیں گے جو سب سے زیادہ سرکش اور سب سے بڑھ کر باغی ہیں۔ ہم ہر گردہ اور جماعت میں سے ایسے افراد کو کہ جو غلٹے دشمن اپنے سب سے زیادہ سرکش ہوں گے علیحدہ کر لیں گے (شولننزعن من کل شیعة ایتھوا شد علی الرحمن شتاً)۔ ۱

وہی بے شرم لوگ کہ جنہوں نے خدا سے رحمت کی نعمتوں تک کو بھلا دیا اور اپنے ولی نعمت کے مقابلے میں گستاخی، نافرمانی اور طغیان شئی پر اتر آئے۔ ہاں! ہاں! یہی لوگ سب سے زیادہ جہنم کے سزاوار ہیں۔

۱۔ پھر اسی معنی کی تاکید کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: ہم ان لوگوں سے کہ جو جہنم کی آگ میں جلنے کے لیے اول نمبر پر ہیں اچھی طرح ہمیں۔ (شولننزعن بالذین هو اولی بھا صلیاً)۔

ہم انہیں انتہائی دقت نظر کے ساتھ چھانٹ کر نکال لیں گے اور اس میں کسی قسم کی غلطی یا اشتباہ نہیں ہوگا۔ صلی ہ مصدر ہے کہ جو آگ روشن کرنے کے معنی میں بھی آیا ہے اور اس پیر کے معنی میں بھی کہ جسے آگ میں جلاتے ہیں۔

۱۔ **وَإِنْ مِنْكُمْ آلَاءُ وَارِدُهَا كَانَ عَلَى رَبِّكَ حَتْمًا مَقْضِيًّا ۝**

۲۔ **ثَوْنُ نَجِّي الَّذِينَ اتَّقَوْا وَنَذَرُ الظَّالِمِينَ فِيهَا جِثِيًّا ۝**

ترجمہ

۱۔ اور تم سب کے سب (بلا استثنا) جہنم میں جاؤ گے یہ تیرے پروردگار کا حتمی امر اور قطعی فیصلہ ہے۔

۲۔ پھر ہم ان لوگوں کو جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا ہے راہی بخشیں گے اور ظالموں کو اسی میں رہنے دیں گے جبکہ وہ (مذہبی) اور دولت کے باعث (گشتوں کے بل کھڑے ہوں گے)۔

۱۔ لفظ "شیعہ" اصل لغت میں اس گردہ کے معنی میں ہے کہ جو کسی کام کی انجام دہی میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں اور مذکورہ بالا آیت میں اس تعبیر کا انتخاب ممکن ہے کہ اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ یہ بے ایمان اور گمراہ لوگ ظلم و سرکشی کے کام میں ایک دوسرے کا ساتھ دیا کرتے تھے اور ہم پہلے اسی گردہ کا حساب لیں گے کہ جو سب سے زیادہ سرکش تھے۔

تفسیر

کیا سب جہنم میں جائیں گے ؟

مذکورہ بالا آیات بھی قیامت کی خصوصیات اور جزا و سزا کے بارے میں ہیں۔ پہلے تو ایک ایسے مطلب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جہنم میں سے کچھ لوگوں کے لیے حیرت انگیز ہوا اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے : تم سب کے سب بلا استثنا جہنم میں جاؤ گے (منكوا لا واردها)۔

یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک حتمی امر ہے اور ایک قطعی فیصلہ ہے : (كان على ربك حتماً مقضياً)۔

پھر ہم ان لوگوں کو کہ جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا نجات دے دیں گے اور ظالموں اور سنگدلوں کو جبکہ وہ کمزوری اور ذلت کی گھنٹوں کے بل کھڑے ہوں گے اسی میں رہنے دیں گے۔ (شعورنجی الذین اتقوا ونذر الظالمین فیہا جشیئا)۔

ان دونوں آیات کی تفسیر میں مفسرین کے درمیان ایک بہت بڑی بحث ہے۔ اس بحث کی بنیاد یہ ہے کہ "ان منکوا" کے جملے میں "درد" سے کیا مراد ہے ؟

بعض مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ "درد" اس مقام پر نزدیک ہونے اور بھانکنے کے معنی میں ہے۔ یعنی تمام لوگ اچھے اور بلا استثنا حساب کتاب کے لیے یا بدکاروں کے آخری انجام کا مشاہدہ کرنے کے لیے جہنم کے نزدیک آئیں گے۔ اس کے بعد خدا پر ہرگز کو نجات بخشے گا اور سنگدلوں کو اسی میں چھوڑ دے گا۔

وہ اس تفسیر کے لیے سورہ قصص آیہ ۲۳ : ولما ورد ماء مدین ... جس وقت موسیٰ مدین کے پانی کے پاس پہنچے ... سے استدلال کرتے ہیں کہ یہاں بھی "درد" اسی معنی میں ہے۔

دوسری تفسیر کہ جسے اکثر مفسرین نے انتخاب کیا ہے یہ ہے کہ "درد" اس مقام پر دخول کے معنی میں ہے، اور اس طرح تمام افراد نیک و بد، بلا استثنا جہنم میں وارد ہوں گے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ دوزخ نیک لوگوں پر سرد و سالم رہے گی، جیسا کہ فردوسی آگ ابلا کر سرد و سالم رہی :

(یا نار کونی بردا و سلاماً علی ابراہیم)۔

کیونکہ آگ کا ان سے کوئی میل نہیں، اس لیے ان سے دور ہو جائے گی اور فرار کرے گی، اور جس جگہ وہ ٹھہرے گی وہاں ناپوش ہو جائے گی لیکن دوزخی چونکہ جہنم کی آگ کے ساتھ مناسبت رکھتے ہیں لہذا قابل اشتعال مادہ کی طرح جب وہ آگ کے قریب پہنچیں گے تو فوراً جھوک اٹھیں گے۔

اس بات سے قطع نظر کہ اس کام کا فلسفہ کیا ہے (جس کی ہم انشاء اللہ آگے چل کر تشریح کریں گے) بلا شک مذکورہ بالا آیت کی دوسری تفسیر کے ساتھ ہم آہنگ ہے، کیونکہ درد کا اصلی معنی دخول ہی ہے اور اس کے علاوہ معنی مراد لینے کے لیے قرینہ کی ضرورت ہے

ہم بھی اللہ تعالیٰ پر ہم پر ہرگز کو نجات نہیں گے کا جملہ ہی طرح نذر الظالمین فیہا شعورنجی کو ہم نہیں دینگے کا جملہ پر سب ہی معنی کے ساتھ ہیں۔ اس کے علاوہ اس آیت کی تفسیر کے ضمن میں بہت سی روایات بھی ہیں جو مکمل طور پر اسی معنی کی تائید کرتی ہیں۔ ان میں سے ایک روایت جابر بن عبد اللہ انصاری سے اس طرح نقل ہوئی ہے کہ ایک شخص نے ان سے اس آیت کے بارے میں پوچھا کہ میں نے اپنے دونوں انگلیوں کے ساتھ اپنے دونوں کانوں کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ میں نے جو مطلب اپنے ان دونوں کانوں سے سنا ہے وہ یہ ہے کہ اگر جبروت ہوں تو یہ دونوں ہرے ہو جائیں، آپ فرماتے تھے :

الورود الدخول، لا یبقی بر ولا فاجر لا یدخلہا فیکون علی المؤمنین برداً و سلاماً حکما کانت علی ابراہیم حتی ان للشار اوقال لجهنم ضعیفاً من بردھا، شعورنجی الذین اتقوا ونذر الظالمین فیہا جشیئا : درود و بیاں و دخول کے معنی میں ہے، کوئی نیکو کار یا بدکار نہیں مگر یہ کہ وہ جہنم میں داخل ہوگا۔ آگ مومنین کے لیے سرد و سالم ہو جائے گی، جیسا کہ ابراہیم کے لیے ہو گئی تھی۔ یہاں تک کہ "آگ" یا "جہنم" (یہاں خود جابر کو لفظ کے بارے میں تردد ہوا ہے) سردی کی شدت سے فریاد کرے گی، پھر خدا پر ہرگز کو نجات دے گا اور ظالموں کو ذلت کے ساتھ اسی میں چھوڑ دے گا۔ ایک اور حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے :

"تقول النار للمؤمن یوم القیامة جز، یا مؤمن ! فقد اطفأ نورک لہی" : روز قیامت آگ مومن سے کہے گی، مجھ سے بجلی گزر جائے گی، کہ تیرے نور نے میرے شعلے کو بجھا دیا ہے۔

بعض دیگر روایات سے بھی اس معنی کی تصدیق ہوتی ہے۔ بل صراط کے بارے میں جو پُر معنی تعبیر روایات میں بیان کی گئی ہے کہ وہ جہنم کے اوپر واقع ہے، بال سے زیادہ باریک ہے اور طول سے زیادہ تیز ہے، اس تعبیر کا ایک دوسرا شاہد اور گواہ ہے کہ وہ گئی یہ بات جو بعض کہتے ہیں کہ سورہ انبیاء کی آیہ ۱۰۱ پہلی تفسیر پر دلالت کرتی ہے۔ آیت یہ ہے :

أو لئلا عنہا مبعدون

وہ (مومنین) جہنم کی آگ سے دور ہوں گے۔

یہ بات صحیح معلوم نہیں ہوئی کیونکہ یہ آیت تو مومنین کی دائمی جگہ اور ابدی مقام کے بارے میں بیان کر رہی ہے، یہاں تک کہ ہم اس سے بعد والی آیت میں یہ پڑھتے ہیں کہ :

لا یسمعون حیثہا

مومنین آگ کے شعلوں کی آواز تک بھی نہیں سنیں گے۔

اگر زیر بحث آیت میں "درو" نزدیک ہونے کے معنی میں ہو تو نہ لفظ مبعدون کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے اور نہ "لا یسمعون حبیبھا" کے جملہ کے ساتھ۔

ایک سوال کا جواب

صرف ایک سوال جو یہاں باقی رہ جاتا ہے یہ ہے کہ پروردگار کی حکمت کے لحاظ سے اس کام کا فلسفہ کیا ہے؟ اس کے علاوہ کیا مومنین کو اس کام سے کوئی تکلیف اور عذاب نہیں پہنچے گا؟

اس سوال کا جواب جو دونوں پہلوؤں سے اسلامی روایات میں آیا ہے، معمولی سے غور کے ساتھ واضح ہو جاتا ہے۔ حقیقت میں دوزخ اور اس کے عذابوں کا مشاہدہ اس بات کے لیے ایک مقدمہ ہو گا کہ مومنین جنت کی خداوندانہ نعمتوں سے زیادہ سے زیادہ لذت حاصل کریں کیونکہ عافیت کی قدر اسی کو ہوتی ہے جو کسی مصیبت میں گرفتار ہوا ہو۔ (وہا لا تضداد تعرف الاشیاء) یہاں مومنین مصیبت میں گرفتار نہیں ہوں گے بلکہ صرف مصیبت کا منظر دیکھیں گے اور جیسا کہ ہم نے مذکورہ بالا روایات میں پڑھا ہے، آگ ان پر سرد و سالم ہو جائے گی اور ان کا ڈر آگ کے شعلوں پر غالب آجائے اور ان کو ماند کر دے گا۔

اس کے علاوہ وہ آگ سے اتنی تیزی کے ساتھ گزریں گے کہ ان پر معمولی سا اثر بھی نہ ہو گا، جیسا کہ ایک حدیث میں پیغمبر سے نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا:

یرد الناس النار یصدرون باعمالهم فاولم یحکموا لعلہ یبرق شمع
کمثر الریح، شمع حضر الفرس، شمع التراکب، شمع کثند
الرجل شمع کمشیه :

"سب کے سب لوگ جہنم کی آگ میں جائیں گے، اس کے بعد اپنے اعمال کے مطابق اس سے باہر نکلیں گے، بعض بجلی کے کوندے (پچکنے) کی طرح، ان کے بعد ان سے کم درجے والے تیز آندھی کی طرح، بعض گھوڑے کے تیز دوڑنے کی طرح، بعض معمولی سواری کی طرح، بعض تیز زور پھیل چلنے والے کی طرح، اور بعض معمولی رفتار سے چلنے والوں کی طرح"۔

علاوہ ازیں دوزخ میں بھی اس منظر کے مشاہدہ سے کہ ہر شے اتنی تیزی کے ساتھ گزر رہے ہیں اور وہ اسی میں رہیں گے زیادہ سزا اور تکلیف محسوس کریں گے اور اس طرح سے دونوں سوالات کا جواب واضح ہو جاتا ہے۔

۴۳۔ **وَإِذَا نُفِثَ عَلَيْهِمْ أَيْتَانِیَّتِ قَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا**

أَيُّ الْفَرِیقَیْنِ خَیْرٌ مَّقَامًا وَآحْسَنُ نَدِیًّا

۴۲۔ **وَكَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِنْ قَرْنٍ هُمْ أَحْسَنُ أَثَاثًا وَرِیًّا**

۴۵۔ **قُلْ مَنْ كَانَ فِي الضَّلَالَةِ فَلِیْسَ دُلَّهِ الرَّحْمَنُ مَدًّا**

حَتَّىٰ إِذَا رَأَوْا مَا يُوعَدُونَ إِمَّا الْعَذَابَ وَإِمَّا السَّاعَةَ

فَسِیَعْلَمُونَ مَنْ هُوَ شَرٌّ مَّكَانًا وَأَضْعَفُ جُندًا

۴۶۔ **وَنَزِیْدُ اللَّهُ الَّذِينَ اهْتَدَوْا هُدًی وَالْبَقِیَّتُ الصَّالِحَتُ**

خَیْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَخَیْرٌ مَرَدًّا

ترجمہ

۴۲۔ اور جس وقت ہماری واضح آیات انہیں سنائی جاتی ہیں تو کافر مومنوں سے کہتے ہیں کہ دونوں گروہوں (ہم اور تم) میں سے کونسا گروہ تمہارے مقام کے لحاظ سے بہتر ہے اور کس کی محبت و مشاورت کی محفلوں کی سچ و سچ بہتر ہے اور کس کی سعادت بڑھ کر ہے۔

۴۴۔ ہم نے ان سے پہلے بہت سی قوموں کو ہلاک کیا ہے کہ جن کا مال و ثروت بھی ان سے زیادہ تھا اور ظاہری سچ و سچ میں بھی جو ان سے زیادہ تھے۔

۴۵۔ تم کہہ دو کہ جو شخص گمراہی میں ہے خدا اُسے اس وقت تک مہلت دیتا ہے کہ وہ اس چیز کو اپنی آنکھوں سے خود دیکھ لے جس کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے اور وہ ہے اسی دنیا کا عذاب یا آخرت کا عذاب۔ وہ ایسا دن ہو گا کہ جب وہ یہ جان لیں کہ کس شخص کا مقام زیادہ برا ہے اور کس کا لشکر زیادہ کمزور ہے؟

۴۶۔ لیکن جن لوگوں نے ہدایت کی راہ اختیار کی، خداوند تعالیٰ ان کی ہدایت کو اور بڑھا دیتا ہے، وہ آثار و اعمال صالحہ جو انسان باقی رہ جاتے ہیں تیرے پروردگار کی بارگاہ میں ان کا ثواب اچھا اور انجام زیادہ قدر و قیمت والا ہے۔

تفسیر

گزشتہ آیات میں بے ایمان ظالموں کے بارے میں بحث تھی۔ زیر بحث آیات میں ان کی منطقی اور انجام کے ایک گوشہ کی تفصیل دی گئی ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ وہ پہلا گروہ جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لایا تھا، ایسے پاک دل مستضعفین کا تھا جن کا ہاتھ وہ کے مال و وسائل سے خالی تھا۔ وہی مظلوم و محروم لوگوں کا گروہ جن کی ظالموں اور سنگدلوں کے ہاتھوں سے نجات کی خاطر ادیان الہی آئے۔ پہلی اور صاحبان ایمان مرد اور عورتیں جیسے بلال، سلمان، عمار، خباب، سمیہ وغیرہ۔

چونکہ اُس زمانے کے جاہلانہ معاشرے میں — ہر دوسرے جاہلانہ معاشرے کی طرح — قدر و قیمت کا معیار وہی زر و زیور دولت و ثروت، مقام و منصب اور ظاہری ہیبت تھی لہذا فقرین عمارت اور اُسی جیسے سنگار ثروت مند لوگ غریب و فقیر مومنین پر فخر و ناز کرتے ہوئے کہتے تھے کہ ہماری حیثیت اور شخصیت کی نشانی تو ہمارے ساتھ موجود ہے اور تمہاری کوئی حیثیت و شخصیت نہ ہونے کی نشانی وہی تمہارا فقر و فاقہ اور تمہاری خودیت ہے۔

وہ کہتے تھے کہ یہی بات خود ہماری حقانیت اور تمہارے حق پر نہ ہونے کی دلیل ہے۔

جیسا کہ قرآن پہلی زیر بحث آیت میں کہتا ہے: جس وقت ہماری واضح آیات انہیں سنائی جاتی ہیں تو مغرور و سنگدلوں کا فرسوسن سے کہتے ہیں کہ دونوں گروہوں (ہم اور تم) میں سے کونسا گروہ مرتبہ و مقام کے لحاظ سے بہتر ہے، اور کس کی محبت و مشاشرت کی غفلتیں سچ و صحیح ہیں بہتر ہیں اور کس کی سخاوت زیادہ ہے: (واذا تتلى عليه آياتنا بينات قال الذين كفو للذين آمنوا اى الفضليتين خيرا مقاما واحسن منديا)۔

خصوصاً اسلامی روایات میں منقول ہے کہ یہ سرمایہ دار نہایت خوبصورت لباس پہن کر اور خوب سچ و صحیح کرا صاحب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آگے آگے چلتے تھے اور سخاوت اور سخاوت آمیز نگاہ سے ان کی طرف دیکھا کرتے تھے۔

جی ہاں! ہر زمانے میں اس طبقے کا یہی چلن رہا ہے۔

”ندی“ اصل میں ”ندی“ معنی طوبت سے لیا گیا ہے اور بعد ازاں نصیح اور سنوڑ لوگوں کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ کیونکہ کلام کرنے کے لیے لعاب و بہن کا کافی مقدار میں ہونا بھی ضروری ہے۔ لہذا ”ندا“ آپس میں بیٹھ کر باتیں کرنے کے معنی میں بھی استعمال ہونے لگا۔ یہاں تک کہ جس مغل میں کچھ لوگ باہمی محبت کے طور پر جمع ہوں یا مشاشرت کے لیے مل بیٹھیں اسے ”نادی“ کہا جانے لگا۔

مکہ میں ایک جگہ تھی جہاں سردارانِ مکہ جمع ہوتے تھے اور مشورے کرتے تھے اسے ”دار الندوہ“ کہتے تھے۔ یہ لفظ بھی اسی مفہوم میں لیا گیا ہے۔

ضمنی طور پر کبھی سخاوت و بخشش کو ”ندی“ سے تعبیر کرتے ہیں۔

مذکورہ بالا آیت ممکن ہے کہ ان سب کی طرف اشارہ ہو یعنی ہائی گروہ کی غفلت پر ہماری تباہی و دکھائی ہے، اور ہماری دولت و ثروت، شان و شوکت اور ہمارے لباس تم سے زیادہ جاذبِ نظر ہیں اور ہماری گفتگو اور فصیح و بلیغ اشعار تم سے کہیں بہتر ہیں۔

لیکن قرآن انہیں ایک بہت مدلل، قاطع اور خاموش کر دینے والا جواب دیتا ہے: گویا انہوں نے بشر کی گزشتہ تاریخ کو بھلا دیا ہے

لہٰذا منقولات راعناب مامہ ”ندی“۔

ان سے پہلے بے شمار قومیں ایسی تھیں کہ جن کا مال و دولت اور وسائل زندگی ان سے بہتر تھے اور وہ لوگ ظاہری شان و شوکت کے اعتبار سے بھی ان سے زیادہ آراستہ و پیراستہ تھے لیکن ہم نے ان ستم کامل اور ظالموں کو نابود کر دیا ”وَكَمْ اهلْكنا قبلكم من قرون (هو احسن انشا وروایا)۔

کیا ان کا مال و دولت، ان کی ندق برق منطیں، ان کے فاخو لباس اور خوبصورت چہرے ان سے خدا کے عذاب کو روک سکتے ہیں، اگر یہ چیزیں بارگاہِ خدا میں ان کی حیثیت اور مقام کی دلیل تھیں تو پھر وہ ایسے بُرے انجام سے کیوں دوچار ہوئے۔ دنیا کی شان و شوکت ایسی ناپائیدار ہے کہ ہوا کے ایک معمولی جھونکے سے نہ صرف اس کا دفتر الٹ جاتا ہے بلکہ کبھی اس کا طومار ہی درہم برہم ہو جاتا ہے۔

”قرون“ جیسا کہ ہم نے پہلے بھی (تفسیر نمونہ جلد ۳، ص ۲۸۳) (اردو ترجمہ) پر بیان کیا ہے، عام طور پر ایک طولانی زمانہ کے معنی میں ہے۔ لیکن چونکہ ”اقران“ کے مادہ سے (نزدیکی کے معنی میں) لیا گیا ہے، لہذا ایسی قوم و جماعت جو ایک ہی زمانہ میں جمع ہو، کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

اس کے بعد قرآن انہیں ایک اور تنبیہ کرتا ہے کہ تم ان سے یہ کہہ دو کہ اے بے ایمان ظالمو! تم یہ گمان نہ کر لینا کہ یہ تمہارا مال و دولت مایہِ رحمت ہے، بلکہ اکثر اوقات یہ عذاب الہی کی دلیل ہوتا ہے۔ جو شخص گمراہی میں مبتلا ہے اور اسی راستے پر چلتے رہتے پر ٹھہرے، خدا اسے ہمت دیتا ہے اور یہ غرورِ شمال زندگی اسی طرح جاری و ساری رہتی ہے۔ (قل من كان في الضلالة فليمدد له الرحمن مدداً)۔

”یہ ہمت“ اُس زمانے تک (ہوگی) کہ یہ خود اپنی آنکھوں سے خدا کے وعدوں کو دیکھ لیں، اس دنیا کا عذاب یا آخرت کا عذاب (حتى اذا راوا ما وعدون اما العذاب و اما الساعة)۔

”اُس دن انہیں معلوم ہو جائے گا کہ کس کی جگہ اور منزل زیادہ بری ہے۔“

اور کس کا لشکر زیادہ کمزور ہے۔ (فيعلمون من هو شر مكانا و اضعف جنداً)۔

درحقیقت اس قسم کے مغرور افراد کو جو پھر ہدایت کے قابل نہیں ہیں، اس بات پر توجہ رکھیں کہ قرآن ”من كان في الضلالة“ کہتا ہے جو گمراہی میں استمرار کی طرف اشارہ ہے۔ اس نقطہ نظر سے کہ وہ خدا کا دردناک ترین عذاب دیکھیں، بعض اوقات خدا انہیں اپنی نعمتوں سے مالا مال کر دیتا ہے، جو ان کے لیے غرور و غفلت کا سبب بھی بن جاتی ہیں اور عذاب الہی اُن نعمتوں کے سلب ہونے کو اور بھی زیادہ دردناک بنا دیتا ہے۔ یہ وہی چیز ہے جو بعض قرآنی آیات میں تدریجی سزا کے عنوان سے بیان کی گئی ہے۔

”فليمدد له الرحمن مدداً“ کا جملہ اگرچہ صیغہ امر کی صورت میں ہے لیکن یہ خیر کے معنی میں ہے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ خدا انہیں ہمت اور پہلے درپے نعمتیں عطا کرتا ہے۔

بعض مفسرین نے اسے اسی امر کے معنی میں لیا ہے جو یہاں نفیر میں ہے یا خدا پر اس قسم کا سلوک کرنے کے لازم ہونے

۱۔ ”اثاث“ مال و متاع اور دینیت دنیا کے معنی میں ہے اور ”رئی“ ہیبت و منظر کے معنی میں ہے۔

۲۔ تفسیر نمونہ کی چوتھی جلد میں سورہ اعراف کی آیات ۱۸۲، ۱۸۳ کی طرف رجوع فرمائیں۔

کے معنی میں ہے، لیکن پہلی تفسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

مذکورہ بالا آیت میں "عذاب" کا لفظ اس قرینہ کی بنا پر کہ وہ "الساعة" کے مقابل میں آیا ہے، عالم دنیا میں خدا کے عذابوں کی طرف اشارہ ہے، ایسے عذاب جیسے طوفان فوج، زلزلہ اور آسمانی پتھر جو قوم نوح پر نازل ہوئے یا ایسے عذاب جو موسیٰ اور حق کے پیروں پر نازل ہوئے۔ عذاب کے معنی میں "سیرا" سورہ توبہ کی آیت ۱۲ میں بیان ہوا ہے،

قاتلوہم ویذہبوا اللہ بایدیکو :

اُن سے جنگ کرو کیونکہ خدا تمہارے ہاتھوں سے ان پر عذاب کرے گا۔

"الساعة" یہاں یا تو اختتام دنیا کے معنی میں ہے یا قیامت میں خدائی عذابوں کے معنی میں (دوسرا معنی زیادہ مناسب نظر آتا ہے)۔

یہ سنگروں اور دنیا کی شان و شوکت اور لذت کے شیدائیوں کا انجام ہے۔ لیکن جن لوگوں نے ہدایت کی راہ اختیار کی خدا ان کی ہدایت میں مزید اضافہ کر دیتا ہے (ویزید اللہ الذین اہتدوا ہدی)۔

یہ بات واضح ہے کہ ہدایت کے کئی درجے ہوتے ہیں، جس وقت انسان اُس کے ابتدائی درجوں کو غور سے طے کر لیتا ہے تو خدا اس کی مدد فرماتا ہے اور اسے اعلیٰ سے اعلیٰ درجوں پر فائز کر دیتا ہے اور پھر اُس کی مانند جو ہر روز اپنے ارتقا کا ایک نیا مرحلہ طے کرتے ہیں یا یہ ہدایت پاتے والے بھی اپنے ایمان اور اعمال صالحہ کے مطابق ہر روز ایک اونچے سے اونچے مرحلے میں قدم رکھتے چلے جاتے ہیں۔

آیت کے آخر میں اُن لوگوں کو کہ جنہوں نے دنیا میں ناپائیدار زیب و زینت پر ہر دوسرا لیا تھا اور ان کے ذریعہ دوسروں پر فخر کیا کرتے تھے قرآن یہ جواب دیتا ہے : وہ آثار و اعمال صالحہ جو انسان سے باقی رہ جاتے ہیں تیرے پروردگار کی بالگاہ میں ان کا ثواب پیش تر اور ان کا انجام زیادہ قیمتی ہے (والباقیات الصالحات خیر عند ربک ثواباً وخیر مرداً)۔

۴۴۔ اَفَرَأَيْتَ الَّذِي كَفَرَ بِآيَاتِنَا وَقَالَ لَأُوتِيَنَّ مَالًا وَوَلَدًا ۝

۴۸۔ اَطَّلَعَ الْغَيْبِ اِمَّا اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمَنِ عَهْدًا ۝

۴۹۔ كَلَّا سَنَكْتُبُ مَا يَقُولُ وَنَمُدُّ لَهُ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا ۝

۸۰۔ وَنَزِّلُ مَا يَقُولُ وَيَأْتِينَا فَرْدًا ۝

۸۱۔ وَاتَّخِذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ إِلَهًا لِّيَكُونُوا لَهُمْ عِزًّا ۝

۱۔ "مرد" (بروزن غمد) وال کی تشدید کے ساتھ یا تو مصدر ہے رد اور بازگشت کے معنی میں، یا اسم مکان ہے (مقام پرگشت) کے معنی میں کہ جس سے یہاں جنت مقصود ہے، لیکن پہلا احتمال آیت کے معنی کے ساتھ زیادہ مناسب رکھتا ہے۔

۴۸۔ كَلَّا سَيَكْفُرُونَ بِعِبَادَتِهِمْ وَيَكُونُونَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا ۝

ترجمہ

۴۸۔ کیا تو نے اُس شخص کو نہیں دیکھا کہ جس نے ہماری آیات کا انکار کیا اور یہ کہا کہ مجھے تو بہت سال مال اور اولاد عطا کی جائے گی۔

۴۸۔ کیا وہ غیب کے بھیدوں کو جان گیا ہے یا اُس نے خدا سے کوئی عہدہ بہیمان لے لیا ہے۔

۴۹۔ ہرگز ایسا نہیں ہے۔ جو کچھ وہ کہتا ہے ہم اُسے عقرب لکھ لیں گے اور اس پر دائمی عذاب کریں گے۔

۸۰۔ اور (مال و اولاد کے بارے میں) جو کچھ وہ کہہ رہا ہے اُس کے ہم وارث ہو جائیں گے اور وہ تنہا ہمارے پاس آئے گا۔

۸۱۔ انہوں نے خدا کے سوا کچھ معبود اپنے لیے منتخب کر لیے ہیں تاکہ وہ ان کی عزت کا سبب بنیں (کسی خام خیالی ہے؟)۔

۸۲۔ ہرگز ایسا نہیں ہے، عقرب ان کے معبودان کی عبادت کے منکر ہو جائیں گے بلکہ وہ ان کے برخلاف قیام کریں گے۔

تفسیر

ایک بیہودہ اور انحرافی خیال

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ایمان و پاکیزگی اور تقویٰ ان کے لیے مناسب نہیں ہے اور ان کی وجہ سے وہ دنیا سے محروم رہ جاتے ہیں۔ جب کہ ایمان و تقویٰ کو چھوڑ دینے سے دنیا ان کا رُخ کر لیتی ہے اور وہ مالدار بن جاتے ہیں۔

یہ سوچ غواہ سادہ لوحی اور عرفات کی پیروی کی وجہ سے ہو یا خدائی عہد و پیمان اور ذمہ داریوں سے دور بھاگنے کے لیے ایک بہانہ ہو، یہ جو کچھ بھی ہو ایک خطرناک طرز فکر ہے۔

بعض اوقات یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ ایسا گمان کرنے والے بے ایمانوں کی مال و دولت اور کچھ زمینیں کے فقر و فاقہ کو اپنی اس بیہودہ سوچ کے لیے ایک دستاویز بنا لیتے ہیں۔ حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ وہ مال جو ظلم و کفر کرنے اور تقویٰ کے اصولوں کو چھوڑنے سے انسان کو ملتا ہے نہ وہ سبب افتخار ہے اور نہ ہی ایمان و پرہیزگاری مشروع اور صلاح کامل کے راستے میں کسی طرح سے رکاوٹ بنتے ہیں۔

ہر حال ہمارے زمانے کی طرح پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں بھی کچھ نادان لوگ موجود تھے جو اس قسم کی سوچ رکھتے تھے یا کم از کم اس طرح کا اظہار کرتے تھے۔

قرآن زیر بحث آیات میں اس بحث کی مناسبت سے کہ جو فحار اور ظالموں کے انجام کے سلسلے میں اس سے پہلے بیان ہو چکی ہے۔ اس طرز فکر اور اس کے انجام کے بارے میں بیان کر رہا ہے۔

پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے: کیا تو نے اُس شخص کو نہیں دیکھا جو ہماری آیات کو جھٹلاتا ہے، اور اُن سے کفر کرتے ہوئے کہتا ہے: مجھے بہت زیادہ مال و اولاد حاصل ہو گا۔ (احصایٰ الذی کفر بآیاتنا وقال لا وتین مالاً وولداً) اس کے بعد قرآن انہیں اس طرح جواب دیتا ہے: کیا وہ اسرار غیب سے آگاہ ہو گیا ہے یا اُس نے اس بارے میں خدا سے عہد دیربان لے لیا ہے۔ (اطلع الغیب ام اتخذ عند الرحمن عهداً)۔

اس قسم کی پیشین گوئی تو وہی شخص کر سکتا ہے، اور وہی شخص مال و اولاد کے ہونے کے ساتھ کفر کے کسی رابطہ کا قائل ہو سکتا ہے کہ اسرار غیب سے آگاہ ہو، کیونکہ ہمیں قرآن و دلائل کے درمیان کوئی رابطہ نظر نہیں آتا۔ یا پھر اُس نے خدا سے کوئی عہد دیربان لیا ہو جبکہ اس کی بات بھی بے معنی ہے۔

اس کے بعد قطعی الفاظ کے ساتھ قرآن مزید کہتا ہے: ایسا نہیں ہے (کفر دے ایمانی ہرگز کسی کے مال و اولاد میں زیادتی کا سبب نہیں ہوگی) ہم تعزیر یہ جو کچھ کہتا ہے اُسے لکھ لیں گے۔ (کلا منکتاب مایقول)۔

ہاں یہ بات ممکن ہے کہ یہ بے بنیاد باتیں بعض سادہ لوح افراد کے انحراف کا سبب بن جائیں، یہ سب باتیں ان کے نامہ اعمال میں لکھی جائیں گی۔ اور اس پر ہم اپنے عذاب کو دائمی بنا دیں گے (پہلے در پہلے اور یکے بعد دیگرے عذاب) (ونصلہ من العذاب مڈاً)۔

مکن ہے یہ جملہ آخرت کے دائمی و دائمی عذاب کی طرف اشارہ ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ اُن عذابوں کی طرف اشارہ ہو جو اسی دنیا میں اس کے کفر و دے ایمانی کی وجہ سے دامن گیر ہوں گے۔ یہ احتمال بھی قابل ملاحظہ ہے کہ یہی مال و اولاد جو غرور و مکرابی کا سبب بنے ہوئے ہیں خود اس کے لیے ایک دائمی عذاب بن جائیں گے۔

(مال و اولاد کے بارے میں) وہ جس چیز کا ذکر کر رہا ہے اس کے تو ہم وارث بن جائیں گے اور قیامت کے دن وہ یکہ و تنہا ہر پاس آئے گا۔ (ونوشہ مایقول ویأتینا ضرراً)۔

ہاں انجام کار یہ ہے کہ وہ ان تمام مادی وسائل کو یہیں چھوڑ کر چلتا بیٹے گا اور پروردگار کی داد کا وہ عدل میں غلطی ہاتھ حاضر ہو گا۔ اس وقت اس کی حالت یہ ہوگی کہ اس کا نامہ اعمال گناہوں سے سیاہ اور نیکیوں سے خالی ہو گا۔ دلائل پر وہ دنیا میں اپنی ان بے بنیاد و کھمی ہوتی باتوں کا نتیجہ

بعض مسخرین نے مذکورہ بالا آیت کی ایک شان نزول بیان کی ہے۔ وہ یہ کہ ایک مسخر نے جس کا نام "خباہ" تھا ایک مشرک سے جس کا نام "عاص بن دائل" تھا اپنا دیا ہوا قرض واپس لینا تھا۔ متوجہ نے استہزا کے طور پر اُس سے کہا: "دوسرے جہان میں جب میں ملایں اور لو کا ذکر بھی اس میں موجود ہے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ دار آخرت میں اولاد نہیں ہوگی۔ علاوہ ازیں بعد کی آیات میں صراحت کے ساتھ اشارہ کیا گیا ہے کہ جس مال کا وہ ذکر کرتا ہے اس کے تو ہم وارث بن جائیں گے، اس تعبیر سے اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ اس سے مراد دنیا کے اعمال ہیں نہ کہ آخرت کے لیے اعمال مسخرین کی ایک جماعت نے اس شان نزول کی بنا پر آیت کو آخرت کی طرف اشارہ سمجھا ہے لیکن حق وہی ہے کہ جو بیان کیا جا چکا ہے۔

لے گا۔

بعد والی آیت میں ان کی بُت پرستی کے ایک اور سبب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے: انہوں نے خدا کے سوا کچھ اور معبود اپنے لیے بنائے ہیں تاکہ وہ ان کی عزت کا سبب بنیں (واتخذوا من دون اللہ آلہ لیکونوا لهم عزراً)۔

تاکہ وہ خدا کی بارگاہ میں ان کی شفاعت کریں، اور محکلات میں ان کی مدد کریں لیکن یہ کتنی نا سمجھی اور خام خیالی کی بات ہے؟ جیسا کہ انہوں نے سمجھا ہے ہرگز ایسا نہیں ہے۔ نہ صرف یہ کہ بُت ان کے لیے باعث عزت نہیں ہوں گے بلکہ وہ تو ذلت اور عذاب کا سرچشمہ ہیں۔ اسی وجہ سے "جلد ہی یعنی قیامت کے دن یہ معبودان عبادت کرنے والوں کی عبادت کے منکر ہو جائیں گے اور اُن سے سلطان میراثی کریں گے، بلکہ ان کے خلاف ہو جائیں گے۔" (کلا سیکفرون لعباد تھو ویکلون علیھوضلاً)۔

یہ جملہ بھی اُسی مطلب کی طرف اشارہ ہے کہ جو منہ فاطر کی آیتیں ہیں بیان ہوا ہے:

والذین تدعون من دونہ ما یملکون من قطع میران تدعوہم
لا یسمعون دعا لھمکو ... ویوم القیامۃ یمکفرون بشرکھم
جنہیں تم خدا کے سوا پکارتے ہو وہ کسی حقیر سی چیز کے بھی مالک نہیں ہیں۔ اگر تم انہیں پکارو تو وہ تمہاری باتوں کو نہیں سنتے۔ اور وہ روز قیامت تمہارے شرک کا انکار کر دیں گے۔

نیز سورہ احقاف کی آیہ ۶ میں ہے:

واذا حشر الناس کانوا لھم اعداء

جس وقت لوگ زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے تو یہ معبود ان کے دشمن ہو جائیں گے۔

بعض بزرگ مسخرین نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ مذکورہ بالا آیت سے مراد یہ ہے کہ قیامت کے دن جبکہ پورے ہٹ جائیں گے اور تمام حقائق آشکار ہو جائیں گے اور بتوں کی عبادت کرنے والے خود کو رسوا اور ذلیل دیکھیں گے تو وہ بتوں کی عبادت کرنے کا انکار کر دیں گے اور ان کے خلاف باتیں کریں گے جیسا کہ آیہ ۲۳ سورہ انعام میں بیان ہوا ہے کہ بُت پرست قیامت میں کہیں گے:

واللہ ربنا ما کانوا مشرکین

اس خدا کی قسم جو ہمارا پروردگار ہے۔ ہم ہرگز مشرک نہیں تھے۔

لیکن پہلی تفسیر آیت کے ظاہر کے ساتھ زیادہ مطابقت رکھتی ہے، چونکہ بتوں کی عبادت کرنے والے یہ چاہتے تھے کہ ان کے معبودان کچھ باعث عزت ہوں لیکن آخر کار وہی ان کے خلاف ہو جائیں گے۔

البتہ وہ معبود کہ جو فرشتوں، شیطانوں اور جنوں کی مانند عقل و شعور رکھنے والے ہیں ان کی وضع تو ظاہر و روشن ہے لیکن ایسے معبود کہ جو بے جان ہیں، ممکن ہے کہ اس دن حکم خدا سے باتیں کرنے لگیں اور اپنی عبادت کرنے والوں سے اپنی بیزاری کا اعلان کریں۔

وہ حدیث کہ جو امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے اس سے بھی اسی تفسیر کی تائید ہوتی ہے کیونکہ امام مذکورہ بالا آیت کی تفسیر میں فرمایا:

یکون هؤلاء الذین اتخذوا ہوا الہمۃ من دون اللہ ضللاً یوم القیامۃ

ویتبرئون منہو ومن عباد تھو لالیوم القیامۃ:

قیامت کے دن وہ مجبور کہ جو خدا کے علاوہ انہوں نے بنا رکھے تھے وہ ان کے خلاف ہو جائینگے اور ان سے اور ان کی عبادت سے بیزاری کا اظہار کریں گے۔

جاذب توجہ بات یہ ہے کہ اس حدیث کے ذیل میں عبادت کی حقیقت کے بارے میں ایک مختصر اور جامع و پرچشمی جملہ منقول ہے۔

ليس العبادة هي السجود ولا الركوع ، وانما هي طاعة الرجال ، من اطاع مخلوقا فمعصية الخالق فقد عبدده :

”عبادت صرف سجدے اور رکوع کا ہی نام نہیں ہے، بلکہ عبادت کی حقیقت یہ ہے کہ کسی کی اطاعت کرنے لگے، جو شخص خالق کی معصیت میں مخلوق کی اطاعت کرے تو اس نے اس کی پرستش و عبادت کی ہے اور اس کا انجام بھی وہی مشرکین اور بت پرستوں کے انجام جیسا ہوگا۔“

- ۸۲۔ المَوتِرَانَا أَرْسَلْنَا الشَّيْطَانِ عَلَى الْكُفْرَيْنِ تَوَزُّهُمَ آذًا ۝
 ۸۳۔ فَلَا تَجْعَلْ عَلَيْهِمْ إِيمَانَهُمْ لَهْمُ عَذَابٍ ۝
 ۸۵۔ يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِينَ إِلَى الرَّحْمَنِ وَفْدًا ۝
 ۸۶۔ وَلَسَوْقُ الْمُجْرِمِينَ إِلَى جَهَنَّمَ وَرُودًا ۝
 ۸۷۔ لَا يَمْلِكُونَ الشَّفَاعَةَ إِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمَنِ عَهْدًا ۝

ترجمہ

- ۸۲۔ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ ہم نے شیطانوں کو کافروں کی طرف بھیجا ہے تاکہ وہ انہیں شہادت کے ساتھ تحریک کریں۔
 ۸۳۔ اس لیے تو ان کے بارے میں جلدی نہ کر ہم انہیں (اور ان کے اعمال کو) بڑی باریک بینی کے ساتھ شمار کریں گے۔
 ۸۵۔ جس دن ہم بے ہیز گاروں کو خدا کے رحمن (اور ان کی جزا) کی طرف رہنمائی کریں گے۔
 ۸۶۔ اور مجرموں کو (ان پیلے سے اذیت کی طرح برپائی کے گھاٹ کی طرف جاستے ہیں) جہنم کی طرف لائیں گے۔
 ۸۷۔ انہیں ہرگز شفاعت کا اختیار نہیں ہے۔ سوائے اس شخص کے کہ جو خدا کے رحمن کی طرف سے کوئی عہد و پیمان رکھتا ہے۔

تفسیر

شفاعت کیسے لوگ کر سکتے ہیں؟

اس بحث کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ جو گزشتہ آیات میں مشرکین کے بارے میں بیان ہوئی ہے، زیر بحث آیات و حقیقت ان کے انحراف کے بعض علل و اسباب اور پھر ان کی بدبختی اور بُرے انجام کی طرف اشارہ کرتی ہیں اور اس حقیقت کو بھی ثابت کرتی ہیں کہ دوسرے مجبور نہ صرف ان کی عزت و وقار کا باعث نہیں تھے بلکہ وہ تو ان کی بدبختی اور ذلت کا سبب بن گئے ہیں۔

پہلے فرمایا گیا ہے: کیا تو نے نہیں دیکھا کہ ہم نے شیطانوں کو کافروں کی طرف بھیجا تاکہ وہ انہیں غلط راستوں پر جن پر وہ چل رہے ہیں تیز کر دیں، تاکہ وہ بالاکروں (الْمُوتِرَانَا أَرْسَلْنَا الشَّيَاطِينَ عَلَى الْكُفْرَيْنِ تَوَزُّهُمَ آذًا)۔

”آؤ“ جیسا کہ راغب مفردات میں لکھا ہے۔ اصل میں دو یک میں اُبال آنے اور جو کچھ اُس کے اندر ہے اُبال کی شدت کے وقت اُس کے زیر و زبر ہونے کے معنی میں ہے اور یہاں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ شیاطین ان پر اس طرح سے مسلط ہو جائیں گے کہ جس راستے پر وہ چاہیں گے انہیں چلا لیں گے اور جس شکل میں چاہیں گے انہیں متحرک کریں گے اور انہیں تہ و بالا کر دیں گے۔

یہ بات واضح ہے۔ اور ہم نے بار بار لکھا ہے۔ کہ شیاطین کا انسانوں پر تسلط ہونا جبری اور بے خبری کا تسلط نہیں ہے، بلکہ یہ خود انسان ہی ہے کہ جو شیاطین کو اپنے قلب و دُوح کے اندر داخل ہونے کی اجازت دیتا ہے، ان کی ہنگامی کا طوق اپنے گلے میں ڈالتا ہے اور ان کی اطاعت کو قبول کرتا ہے جیسا کہ قرآن سورہ نحل کی آیت ۱۰۰ میں لکھا ہے:

أَفَمَا سُلْطَانَهُ عَلَى الَّذِينَ يَتَوَلَّوْنَهُ وَالَّذِينَ هُمْ بِهِ مُشْرِكُونَ
 شیطان کا تسلط صرف ان ہی لوگوں پر ہوتا ہے کہ جو اس کی ولایت و حکومت کو قبول کرتے ہیں اور جو اُسے اپنا بُت اور معبود بناتے ہیں۔

اس کے بعد دُوسرے سُورن پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ان کے بارے میں جلد بازی سے کام نہ لو۔ ہم ان کے تمام اعمال کو انتہائی باریکی کے ساتھ شمار کر لیں گے (فَلَا تَجْعَلْ عَلَيْهِمْ إِيمَانَهُمْ لَهْمُ عَذَابٍ)۔

اور اُن سب کو اس دن کے لیے کہ جس دن عدل الہی کی داو گاہ قائم ہوگی، ثبت اور محفوظ کر لیں گے۔
 اس آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ہے کہ اس سے مراد ان کی زندگی کے دنوں کو شمار کرنا، بلکہ ان کے سانسوں کو گننا ہو، یعنی ان کی ہر آنکھ کی دُور تفریح اور گننے اور شمار کرنے میں آجالی ہے کیونکہ کسی چیز کا معدود اور گنا ہونا عام طور پر اس کے متوڑے اور مختصر ہونے کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔

ایک روایت میں ”(أَفَمَا نَعْدُ لَهُمْ عَذَابًا) کی تفسیر کے بارے میں امام صادق علیہ السلام سے اس طرح منقول ہے کہ آپ نے اپنے ایک صحابی سے سوال کیا:

تیسری نظر میں اس آیت میں پروردگار کی مراؤ کس چیز کو شمار کرتا ہے؟

اس نے جواب میں عرض کیا: " دونوں کی تعداد۔"

امام نے فرمایا:

"اولاد کی عمر کے دنوں کا حساب تو مال باپ بھی رکھتے ہیں۔ ولکنہ عدد الانفاس اس کے شمار کرنے سے مراد سانسوں کی گنتی ہے۔"

امام کی یہ تعبیر ممکن ہے کہ پہلی یا دوسری یا دونوں تفسیروں کی طرف اشارہ ہو۔

بہر حال اس آیت میں بیان کردہ مطالب میں غور و خوض انسان کو ہلاک رکھ دیتا ہے کیونکہ یہ اس بات کو ثابت کر رہی ہے کہ ہماری ہر چیز بیان تک کہ ہماری سانسوں بھی حساب شدہ اور گنتی ہوئی ہیں اور ایک دن ہمیں ان سب کے لیے جواب دہ ہونا پڑے گا۔

اس کے بعد "متقین" اور "مجرمین" کی آخری منزل کو مختصر اور فصیح عبارت میں اس طرح بیان کرتا ہے: "ہم نے ان تمام اعمال کو اس دن کے لیے ذخیرہ کر لیا ہے جس دن ہم پر ہیزگاروں کو عزت و احترام کے ساتھ خداوند رحمان کی طرف یعنی جنت اور اس کے نعمات کی طرف اجتماعی طور پر رہنمائی کریں گے۔ (یوم نخسر المتقین الی الرحمن وفداً)۔"

"وفد" "بروزن" "وعد" اصل میں ایسے گروہ یا بیعت کو کہتے ہیں جو اپنی مشکلات کے حل کے لیے بزرگوں کے پاس جاتے ہیں اور ان کے نزدیک محرم و محترم قرار پاتے ہیں۔ اس بنا پر یہ لفظ ضمنی طور پر احترام کا مضمون اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ بعض روایات میں ہے کہ ہیزگار سواروں پر سوار ہوں گے اور بہت ہی عزت و احترام کے ساتھ جنت میں جائیں گے۔ امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں، کہ علی علیہ السلام نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس آیت "یوم نخسر المتقین الی الرحمن وفداً" کی تفسیر کو بھی تو آپ نے فرمایا:

"یا علی الوفاء لا یكون الا رکبانا اولئك رجال اتقوا الله عز وجل

فاحبهم واخترهم ورضی اعمالهم فسامو متقین۔"

مئے علی! وفاء "مسلم طور پر ایسے افراد کو کہتے ہیں کہ جو سواروں پر سوار ہوں۔ وہ ایسے افراد ہیں کہ

جنہوں نے تقویٰ کو اختیار کیا ہے، خدا نے انہیں دوست بنالیا ہے اور انہیں اپنے لیے مخصوص کر

لیا ہے اور ان کے اعمال سے راضی ہو کر انہیں متقین کا نام دیا ہے۔

یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ مذکورہ بالا آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ:

ہم پر ہیزگاروں کو خدا نے رحمن کی طرف لے جائیں گے، جب کہ بعد والی آیت میں مجرموں کو جہنم کی طرف انکس کی بات ہے۔ کیا یہ زیادہ مناسب نہیں تھا کہ رحمان کے بجائے یہاں جنت کہا جاتا۔ لیکن یہ تعبیر حقیقت میں ایک اہم نکتہ کی طرف اشارہ ہے اور یہ ہے کہ ہیزگار دہلیز جنت

۱۔ فرائض تین، ج ۲، ص ۳۵۷

۲۔ فرائض تین، ج ۲، ص ۳۵۸

سے بھی زیادہ بلند مقام پر فائز ہوں گے، وہ قریب خدا کے مقام اور اس کے خاص جملوں کے نزدیک ہوں گے اور خدا کی رضا جو بہشت سے بھی بہت بڑھ کر ہے حاصل کر لیں گے، (وہ تیسری جو اوپر بیان کردہ حدیث میں پیغمبر اکرمؐ سے نقل کی گئی ہیں وہ بھی اسی معنی کی طرف اشارہ کرتی ہیں)۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ اس کے مقابلے میں "ہم مجرموں کو اس حالت میں کہ وہ پیاسے ہوں گے جہنم کی طرف لائیں گے" (ونسوق المجرمین لی جہنم ورداً)۔

جیسا کہ پیاسے اونٹوں کو پانی کی طرف لکھتے ہیں لیکن یہاں پانی نہیں بلکہ آگ ہوگی۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ لفظ "ورد" انسانوں یا جانوروں کے ایسے گروہ کے معنی میں ہے کہ جو پانی کے گھاٹ پر آتے ہیں اور چونکہ یہ گروہ حقیقی طور پر پیاسا ہوتا ہے لہذا مسخرین نے اس تعبیر کو یہاں پیاسوں کے معنی میں لیا ہے۔

کتنا فرق ہے ان لوگوں کے درمیان کہ جنہیں عزت و احترام کے ساتھ خدا نے رحمن کی طرف لے جایا جائے گا اور فرشتے ان کے استقبال کے لیے دوڑ رہے ہوں گے اور ان پر درود و سلام بھیج رہے ہوں گے اور اس گروہ کے درمیان کہ جنہیں تشنگی کا کام جانوروں کی طرح جسم کی آگ کی طرف ہلک رہے ہوں گے، جبکہ وہ سر پیچھے کیے ہوئے، شرمسار، رسوا اور حقیر ہوں گے۔

اور اگر وہ یہ تصور کرتے ہوں کہ دہلیز شفاعت کے ذریعے کسی جگہ پہنچ سکتے ہیں، تو انہیں جان لینا چاہیے کہ وہ ہرگز دہلیز شفاعت کے مالک نہیں ہوں گے (لا یصلحون الشفاعة)۔

نہ تو کوئی اور ان کی شفاعت کرے گا اور نہ وہ بطریق اولیٰ اس بات پر قادر ہوں گے کہ خود کسی دوسرے کی شفاعت کریں۔

صرف انہی لوگوں کو شفاعت کا اختیار ہوگا کہ جو خدا نے رحمن کے ہاں کوئی عہد و پیمان رکھتے ہوں گے۔ (الامن عند عند الرحمن عہداً)۔

صرف یہی لوگ ایسے ہوں گے کہ جنہیں شفاعت کرنے والوں کی شفاعت حاصل ہو سکے گی، یا ان کا مرتبہ و مقام اس سے بالاتر و برتر ہے اور وہ یہ قدرت و اختیار رکھتے ہیں کہ ایسے گنہگاروں کی کہ جو شفاعت کے لائق ہیں شفاعت کریں۔

"عہد" کا معنی کیا ہے؟

مفسرین کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ مذکورہ بالا آیت جو یہ کہتی ہے "صرف انہی لوگوں کو شفاعت کا اختیار ہوگا جو خدا کے ہاں کوئی عہد رکھتے ہیں" عہد سے کیا مراد ہے؟

بعض نے تو یہ کہا ہے کہ: "عہد" سے مراد پھر دہلیز پر ایمان، اس کی صداقت و یگانگی کا اقرار اور خدا کے پیغمبروں کی تصدیق ہی ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہاں "عہد" سے مراد حق تعالیٰ کی صداقت کی شہادت، اور ایسے لوگوں سے بیزار ہے کہ جو خدا کے مقابلے میں کسی پناہ گاہ اور قدرت کے قائل ہیں۔ اسی طرح "اللہ" کے سوا کسی اور سے امید نہ رکھنا ہے۔

امام صادق علیہ السلام نے اپنے ایک صحابی کے مذکورہ بالا آیت کی تفسیر کے بارے میں سوال کے جواب میں فرمایا:

من دان بولاية امير المؤمنين والائمة من بعده فهو العهد عند الله :

”جو شخص امیر المؤمنین اور ان کے بعد آنے والی بیت کی ولایت کا عقیدہ رکھتا ہو، یہ خدا کے نزدیک عہد ہے۔“
ایک اور روایت میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے :

من ادخل علی مؤمن معوزا فقد سرنی ومن سرنی فقد اتخذ عند الله عهدا .

جو شخص کسی مومن کو خوش کرے اس نے مجھے خوش کیا اور جس نے مجھے خوش کیا اس کا عہد خدا کے پاس ہے۔

ایک اور حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے :

”عہد کی حفاظت پانچوں وقت کی نمازوں کی حفاظت ہی ہے۔“

تلفٹ اسلامی منابع میں بیان کردہ مذکورہ بالا روایات کے مطالعہ اور ان میں غور و خوض کرنے سے اور اسی طرح بزرگ اسلامی مفسرین کے اقوال سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ خدا کے نزدیک عہد جیسا کہ اس کے لغوی معنی سے معلوم ہوتا ہے۔ ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے کہ جس میں بزرگ سے ہر قسم کا رابطہ اور اس کی معرفت و اطاعت اور اسی طرح اولیائے حق کے مکتب سے وابستگی اور ہر قسم کا عمل صالح جمع ہے اگرچہ ہر روایت میں اس کا ایک حصہ یا ایک واضح و روشن مصداق کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

لہذا ایک اور حدیث میں جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وصیت کرنے کی کیفیت کے بیان میں نقل ہوئی ہے تقریباً تمام اعتقادی مسائل جمع ہیں اس میں آپ فرماتے ہیں :

”مسلمان کو چاہیے کہ موت سے پہلے اس طرح وصیت کرے اور کہے :

پروردگارا ! تو ہی آسمانوں اور زمین کا خالق ہے، ظاہر و باطن کا جاننے والا ہے، نور و جان و جسم ہے، میں اس دنیا میں تجھ سے عہد کرتا ہوں، اور گواہی دیتا ہوں کہ تیرے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے، تو واحد و یکتا ہے، تیرا کوئی شریک نہیں ہے، تجھ پر بندہ اور تیرا بیجا ہوا ”رہل“ ہے، بہشت حق ہے، دوزخ حق ہے، قیامت اور حساب و کتاب حق ہے، اعمال کی جانچ کے لیے میزان حق ہے، دین اسی طرح ہے جیسا کہ کائنات نے بیان کیا ہے اور اسلام وہی ہے جس کی شریعت کائنات نے مقرر فرمائی ہے، (حق) بات وہی ہے کہ جو کائنات نے کہی ہے، قرآن اسی طرح ہے کہ جیسے کائنات نے نازل کیا ہے، تو حق اور آشکار خدا ہے۔ پروردگارا ! تم کو ہماری طرف سے بہترین جزا دے اور ان پر

۱۔ تدریثیں، جلد ۳، ص ۶۲۔

۲۔ المسببان، زیر بحث آیت کے ذیل میں، بحوالہ رشتہ۔

۳۔ در الشوریہ

اور ان کی آل پر درود و سلام بھیج۔

پروردگارا ! مشکلات میں تو ہی میرا سایہ اور خدا میں تو ہی میرا پادرو مددگار ہے۔ تو ہی میرا ولی نعمت ہے، تو ہی میرا اور میرے آباء اجداد کا معبود ہے، تو ایک چشم زن کے لیے بھی مجھے میرے حال پر نہ چھوڑ۔ اگر تو مجھے خود میرے حال پر چھوڑ دے گا تو میں برائتوں سے نزدیک اور نیکوں سے دور ہو جاؤں گا، اے میرے خدا ! تو ہی قبر میں میرا مونس بن جا اور میرے لیے ایک عہد قرار دے جسے میں قیامت کے دن کھلا ہوا دیکھوں۔

اس کے بعد پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا :

ان حقائق کا اعتراف کرنے کے بعد جو کچھ انسان ضروری سمجھے وصیت کرے۔ اس وصیت کی تصدیق سورہ بقرہ کی اس آیت میں ہے :

لَا يَمْلِكُونَ الشفاعة الا من اتخذ عند الرحمن عهدا

یہ عہد وصیت ہے۔

یہ بات صاف طور پر ظاہر ہے کہ اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ مذکورہ بالا مطالب کو عربی یا فارسی (یا کسی بھی زبان میں) اولاد کی طرح پڑھے یا کہے بلکہ خلوص دل کے ساتھ ان پر ایمان رکھتا ہو۔ ایسا ایمان کہ جس کے آثار اس کی زندگی کے پورے طرز عمل میں دکھائی دیں۔

۸۸۔ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمَنُ وَلَدًا ۚ

۸۹۔ لَقَدْ جَعَلُوا شَيْئًا إِدًّا ۚ

۹۰۔ تَكَادُ السَّمَوَاتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْأَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ۚ

۹۱۔ اَنْ دَعَا لِلرَّحْمَنِ وَلَدًا ۚ

۹۲۔ وَمَا يَنْبَغِي لِلرَّحْمَنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا ۚ

۹۳۔ اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ اِلَّا اَتَى الرَّحْمَنَ عَبْدًا ۚ

۹۴۔ لَقَدْ أَحْصَوْا وَعَدَّهُمْ عَدًّا ۝
۹۵۔ وَكَلَّمُوا آتِيهِ يَوْمَ الْقِيَمَةِ فَرْدًا ۝

ترجمہ

- ۸۸۔ انہوں نے کہا کہ خدائے رحمن نے کسی کو اپنا بیٹا بنالیا ہے۔
۸۹۔ تم نے یہ کیسی بُری اور وطن کی بات کی ہے۔
۹۰۔ قریب ہے کہ اس بات پر آسمان پھٹ پڑیں اور زمین شق ہو جائے اور پہاڑ شقت کے ساتھ گر پڑیں۔
۹۱۔ اس لیے کہ انہوں نے خدائے رحمن کے لیے بیٹے کا ادا کیا ہے۔
۹۲۔ اور یہ بات تو ہرگز سزاوار نہیں ہے کہ وہ کسی کو بیٹا بنائے۔
۹۳۔ آسمانوں میں اور زمین میں جو کوئی بھی ہے سب اس کے بندے ہیں۔
۹۴۔ اس نے ان سب کا احصاء کر رکھا ہے اور ابھی طرح سے شمار کیا ہوا ہے۔
۹۵۔ اور وہ سب کے سب قیامت کے دن یکہ دہما اس کے پاس حاضر ہوں گے۔

تفسیر

خدا اور اولاد کا ہونا ؟

چونکہ گزشتہ آیات میں شرک اور مشرکین کے انجام کے بارے میں گفتگو تھی لہذا بحث کے آخر میں شرک کی ایک شاخ یعنی خدا کی اولاد ہونے کے اعتقاد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس کی قباحیت اور بُرائی کو نہایت قاطع انداز میں واضح کیا گیا ہے : انہوں نے کہا کہ خدائے رحمن نے کسی کو اپنا بیٹا بنالیا ہے۔ (وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمَنُ وَلَدًا)۔
صرف عیسائی یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ حضرت عیسیٰ خدا کے حقیقی بیٹے ہیں بلکہ یہودی بھی حضرت عزیر کے بارے میں یہی عقیدہ رکھتے تھے نیز بُت پرست فرشتوں کے بارے میں اس قسم کا عقیدہ رکھتے تھے اور انہیں خدا کی بیٹیاں خیال کرتے تھے۔
اس کے بعد آسمانی سخت لہجے میں فرمایا گیا ہے : تم نے یہ کیسی بُری اور بُری سنت بات کی ہے۔ (لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا إِثْرًا)۔
”اد“ (بروزن ”خدا“ اصل میں ایسی بُری اور کبردار آواز کہتے ہیں کہ جو شدید صولتی امواج کی گردش کی وجہ سے آواز کے گلے سے نکلے گا)۔
کان تک پہنچے۔ بعد ازاں اس لفظ کا بہت ہی بُرے اور دشت ناک کا محول پر اطلاق ہونے لگا۔

۱۔ حضرت عزیر کے بارے میں سورہ قوبہ کی آیہ ۲۰ اور فرشتوں کے بارے میں سورہ زمرہ کی آیہ ۱۷ میں گفتگو آئی ہے۔

چونکہ یہ ناروا نسبت اصل توحید کے خلاف ہے، کیونکہ نہ کوئی اس کا مثل و نظیر ہے اور نہ ہی اسے اولاد کی ضرورت ہے اور نہ ہی وہ جسم اور جسمانیت کے عوارض رکھتا ہے۔ گویا تمام عالم ہستی جس کی بنیاد توحید پر قائم ہے اس ناروا نسبت سے دشت واضطراب میں ڈوب جاتے گا۔

لہذا بعد والی آیت میں قرآن مزید کہتا ہے : قریب ہے کہ اس بات پر آسمان پھٹ پڑیں اور زمین شق ہو جائے اور پہاڑ شقت کے ساتھ گر پڑیں۔ (تَكَادُ السَّمُوتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْأَرْضُ وَتَخِرُ الْجِبَالُ هَدًّا)۔

پھر تاکید کے لیے اور موضوع کی اہمیت کے بیان کی خاطر کہتا ہے : ”اس لیے کہ انہوں نے خدائے رحمن کے لیے بیٹے کا ادا کیا ہے۔ (ان دعوا للرحمن ولدا)۔“

درحقیقت انہوں نے خدا کو کسی طرح سے پہچانا ہی نہیں ورنہ وہ یہ جان لیتے کہ ”خدائے رحمن کے لیے ہرگز یہ بات سزاوار نہیں کہ وہ کسی کو بیٹا بنائے“ (وَمَا يَنْبَغِي لِلرَّحْمَنِ أَنْ يَتَّخِذَ وَلَدًا)۔
انسان چند چیزوں میں سے کسی ایک کے لیے اولاد کی خواہش کرتا ہے یا تو وہ اس بنا پر کہ اُس کی زندگی ختم ہونے والی ہے لہذا اسے بہارِ نسل کے لیے تولیدِ نسل کی ضرورت ہے۔
یا وہ ملک اور یا روم و دگر کار طالب ہے کیونکہ اس کی قوت و طاقت محدود ہے یا اُسے آسمانی سے دشت ہے لہذا اسے کسی محول کی تلاش ہے۔

لیکن خدا کے بارے میں ان طالب کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ نہ تو اس کی قدرت محدود ہے، نہ اس کی زندگی ختم ہونے والی ہے، نہ اس کے وجود میں ضعف و کمزوری کا نام و نشان ہے، نہ آسمانی کا کوئی احساس اور نہ ہی اسے کوئی ضرورت و استیلاج ہے۔
علاوہ ازیں اولاد کا ہونا، جسم ہونے اور بیوی رکھنے کی دلیل ہے اور یہ تمام باتیں اس کی پاک ذات سے بعید ہیں۔
اسی بنا پر بعد والی آیت میں فرمایا گیا ہے : آسمانوں میں اور زمین میں جو کوئی بھی ہے سب اس کے بندے ہیں اور اس کے تابع ہیں (ان كل من في السموات والارض الا اتي الرحمن عبداً)۔
اور باوجود اس کے کہ تمام بندے اُس کے مطیع اور تابع فرمان ہیں، اُسے ان کی اطاعت و فرمانبرداری کی ضرورت نہیں ہے بلکہ خود ہی اس کے نیکر مند اور محتاج ہیں۔

وہ ان سب پر عظیم اور ان کی تعداد کو پوری طرح سے جانتا ہے۔ (لَقَدْ احصاهم وعدهم عدداً)۔
یعنی اس بات کا ہرگز تصور نہ کرنا کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ اتنے بندوں کا اس نے حساب رکھا ہوگا۔ اس کا علم اس قدر وسیع و عظیم ہے کہ صرف وہ ان کے اعداد و شمار جانتا ہے بلکہ ان کی تمام خصوصیات سے بھی آگاہ ہے۔ نہ تو وہ اس کی حکومت کی حدود سے بھاگ کر باہر نکل سکتے ہیں، اور نہ ہی ان کے اعمال میں سے کوئی چیز اُس سے چھپی ہوئی ہے۔

”وہ سب کے سب قیامت کے دن یکہ و تنہا اس کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے۔“ (وکلھو انہیہ یوم القیامۃ فرداً)۔
اس بنا پر سچ بھی، غریب بھی، فرشتے بھی اور تمام کے تمام انسان بھی اس کے اس ہر گریہ حکم میں شامل ہیں۔ اس حالت میں یہ بات کہیں قدر نامناسب ہے کہ ہم اس کے لیے اولاد کا عقیدہ رکھ کر اور اس کی ذات پاک کو عظمت کی بلندئیں سے اس قدر نیچے لے آئیں اور اس کے صفات جلال و جمال کا انکار کر دیں۔

چند اہم نکات :

۱۔ اب بھی اُسے خدا کا بیٹا خیال کرتے ہیں : مذکورہ بالا آیات میں جو کچھ بیان ہوا ہے وہ قاطع ترین الفاظ میں خدا کی اولاد ہونے کی نفی کرتا ہے۔ یہ وہ آیات ہیں جو چودہ سو سال پہلے کا واقعہ بیان کر رہی ہیں جبکہ آج کے زمانے میں اور علم و دانش کی دنیا میں بھی بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ جو حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا سمجھتے ہیں۔ مجازی بیٹا نہیں بلکہ حقیقی بیٹا اور اگر ان کی کچھ تحریروں میں تبلیغی مقصد سے لکھی گئی ہیں اور اسلامی علاقوں کے لیے خاص طور پر ترتیب دی گئی ہیں، اس بیٹے کو اعلازی یا مجازی بیٹا لکھا گیا ہے۔ تو وہ ان کی کتب اعتقادی کے اصلی متن سے کسی طرح بھی موافق نہیں ہے۔

یہ معاملہ سچ کے خدا کا بیٹا ہونے تک منحصر نہیں ہے بلکہ وہ تثلیث کا عقیدہ رکھتے ہیں کہ جو سطر طور پر تین خداؤں کے معنی میں ہے اور ان کے متنی و قطعی حقائق میں سے ہے، مسلمان چونکہ اس قسم کی شرک آمیز بات سُننے سے وحشت کرتے ہیں۔ لہذا انہوں نے اسلامی علاقوں میں اپنے لب و لہجہ کو تبدیل کر دیا ہے اور اسے تشبیہ اور مجازی کی قسم قرار دیتے ہیں۔ (مزید وضاحت کے لیے قاموس کتاب مقدس کی طرف ”سیح“ اور ”تین اقانیم“ کے بارے میں رجوع کریں)۔

۲۔ آسمان پھٹ کر ریزہ ریزہ کیسے ہوں گے ؟ مذکورہ بالا آیت میں جو یہ بیان ہوا ہے کہ ”قریب ہے کہ آسمان اس ٹروا نسبت سے پھٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائیں اور زمین شق ہو جائے اور پہاڑ گر پڑیں“ اس سے کیا مراد ہے؟ اس سے یا تو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ قرآن مجید کی تعبیرات کے مطابق، عالم ہستی کا مجموعہ ایک قسم کی حیات اور عقل و شعور رکھتا ہے اور کہ ایک ایک آیت کے مطابق خدا تعالیٰ کی شانِ قدس کی طرف یہ ناروا نسبت دینے سے پورا عالم سخت وحشت میں پڑ جاتا ہے۔ جیسے سورہ بقرہ کی آیہ ۲۲ میں ہے :

وان منها لما یهبط من خشية الله
بعض پھر خوف خدا سے پہاڑوں سے گر پڑتے ہیں۔

اور جیسے سورہ حشر کی آیہ ۲۱ میں ہے :

”لو انزلنا هذا القرآن علی جبل لرائتہ خاشعاً متصدعاً من خشية الله“

خدا سے بیٹے کی نفی کے بارے میں تفسیر نور جلال سورہ بقرہ کی آیہ ۱۱۶ کے ذیل میں اور آٹھویں جلد سورہ یونس کی آیہ ۶۸ کے ذیل میں بھی بحث کی گئی ہے۔

اگر ہم اس قرآن کو پہاڑوں پر نازل کر دیتے تو وہ خدا کے خوف سے پھٹ پڑتے۔
یا پھر یہ اس بات کی انتہائی زیادہ قہاحت اور بڑائی کی طرف اشارہ ہے۔ عربی اور فارسی زبان میں ایسی مثالیں عام ملتی ہیں مثلاً ہم کہتے ہیں تو نے ایسا کام کیا ہے کہ گویا آسمانوں اور زمین کو میرے سر پر گرا دیا ہے۔
انشاء اللہ ہم اس بارے میں متعلقہ آیات کے ذیل میں پھر بھی بحث کریں گے۔

- ۹۶۔ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا
۹۷۔ فَاِنَّمَا یَسِّرُنَاۤ اِلٰی سَبٰۤیِٕکَ لِتُبَشِّرَہٗ الْمُتَّقِیْنَ وَتُنذِرَہٗ قَوْمًا لَّدَا
۹۸۔ وَکَۤوۡمًا لَّکُنَّا قَبْلُہُمْ مِّنْ قَرْنٍ ۚ هَلْ تُحِیۡسُ مِنْہُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَوْ
تَسْمَعُ لَہُمْ رُکُزًا ۙ

ترجمہ

- ۹۶۔ جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے خدا نے رحمن ان کی محبت دلوں میں ڈال دے گا۔
۹۷۔ ہم نے قرآن کو تیری زبان پر آسان کر دیا ہے تاکہ اس کے ذریعے تو پرہیزگاروں کو بشارت دے اور سخت قسم کے دشمنوں کو ڈرائے۔
۹۸۔ ہم نے اُن سے پہلے کتنی ہی (بے ایمان اور گنہگار) قوموں کو ہلاک کیا ہے۔ کیا تم اُن میں سے کسی کو بھی دیکھتے ہو یا ان کی نحیف سی آواز بھی سُننے ہو؟

تفسیر

ایمان محبوبیت کا سرچشمہ ہے :

مذکورہ بالا تین آیات میں جو سورہ مریم کی آخری آیات میں پھر اہل ایمان مومنین اور بے ایمان منکروں کی بات ہو رہی ہے اور قرآن اور اس کی بشارتوں اور اس کی تنبیہوں سے متعلق گفتگو ہے۔ درحقیقت یہ پہلی سچوں کا تازہ نکات کے ساتھ ایک پھر ہے۔
پہلے فرمایا گیا ہے : وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے اعمال صالح انجام دیے۔ خداوند رحمان ان کی محبت دلوں میں ڈال دے گا (ان الذین آمنوا وعملوا الصالحات سیجعل لهم الرحمن ودا)۔
بعض مفسرین، اس آیت کو امر المؤمنین علی التواکد اور کہ انہوں نے ایمان لیا اور انہوں نے اعمال صالح انجام دیے۔

بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ خدا ان کے دشمنوں کے دلوں میں ان کی محبت ڈال دے گا اور یہ محبت ان کے ایک ایسی دُوری بن جائے گی جو انہیں ایمان کی طرف کھینچ لے لے گی۔

بعض نے اسے مومنین کی ایک دوسرے سے محبت کے معنی میں سمجھا ہے کہ جو قدرت و قدرت اور اتحاد کا سبب ہوگی۔ بعض نے اس سے آخرت میں مومنین کی ایک دوسرے سے دوستی کی طرف اشارہ خیال کیا ہے اور یہ کہتے ہیں کہ ان کا آپس میں تعلق ہو جائے گا کہ وہ ایک دوسرے کا دیدار کر کے انتہائی خوشی اور سرور محسوس کریں گے۔ لیکن اگر ہم وسعت نظر کے ساتھ آیت کے وسیع مفہیم پر غور کریں تو ہم دیکھیں گے کہ آیت کے منہم میں یہ تمام تفسیریں جمع ہیں ان میں آپس میں کوئی تضاد بھی نہیں ہے۔

اس کا اصلی نکتہ یہ ہے کہ "ایمان اور عمل صالح" ایک غیر معمولی قوت جذب و کشش رکھتے ہیں۔ خدا کی وحدانیت اور انبیاء کی دعوت پر ایمان و اعتقاد کی چمک انسان کے قلب و روح، فکر و نظر اور گفتار و کردار میں اعلیٰ انسانی اخلاق، تقویٰ، پاکیزگی، سچائی، امانت، شجاعت، ایثار و درگزر کی صورت میں جلوہ گر ہے اور عظیم مقناطیسی قوتوں کی مانند اپنی طرف کھینچنے والی ہے۔ یہاں تک کہ ناپاک اور گناہ سے آلودہ لوگ بھی پاک لوگوں سے خوش رہتے ہیں اور اپنے ہی جیسے ناپاک لوگوں سے نفرت کرتے ہیں۔ اسی بنا پر، مثال کے طور پر جب بیوی یا شوہر یا کسی شریک کار کا انتخاب کرنا چاہتے ہیں تو تاکید کرتے ہیں کہ وہ پاک و نجیب، امین اور اچھے کردار کا ہو۔

یہ فطری بات ہے، اور حقیقت میں یہ پہلی جزا ہے کہ جو خدا مومنین اور صالحین کو دیتا ہے، کہ جس کا دامن دنیا سے لے کر آخری جہان تک کھینچا ہوا ہوتا ہے۔

ہم نے اکثر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ اس قسم کے پاک لوگ جب دنیا سے آنکھ بند کرتے ہیں تو بہت سی آنکھیں ان کے لیے رہی جوتی ہیں چاہے وہ ظاہری طور پر کم حیثیت دکھائی دیتے ہوں اور کوئی اجتماعی مقام و منزلت نہ رکھتے ہوں۔ تمام لوگ ان کا خلا محسوس کرتے ہیں اور سب لوگ اپنے آپ کو ان کے سوگ میں ڈوبا ہوا پاتے ہیں۔

اب رہی یہ بات کہ بعض اس آیت کو امیر المومنین علی علیہ السلام کے بارے میں سمجھتے ہیں اور بہت سی روایات میں بھی اس کی طرف اشارہ ہوا ہے تو بلا شک و شبہ اس کا اعلیٰ درجہ اور بلند ترین مقام اس امام متقین کے ساتھ مخصوص ہے۔ (چند اہم نکات کے ذیل میں ہم ان روایات کے بارے میں تفصیل کے ساتھ بحث کریں گے) لیکن یہ امر اس بات سے مانع نہیں ہوگا کہ دوسرے مہلکوں میں تمام مومنین اور صالحین بھی اس محبت و عجز بیت کا مزہ چکھیں اور اس مودت الہی سے کچھ حصہ حاصل کریں۔ اور یہ امر اس میں بھی مانع نہیں ہوگا کہ دشمن بھی اپنے دلوں میں ان کے لیے محبت و احترام محسوس کریں۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ ایک حدیث میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ :-

ان الله اذا احب عبداً دعا جبرئيل ، فقال يا جبرئيل اني احب فلاناً فاحبه ، قال فيحبه جبرئيل شوينادي في اهل السماء ان الله يحب فلاناً فاحبوه ، قال فيحبه اهل السماء شوينادي له القبول في الارض ! وان الله اذا ابغض عبداً دعا جبرئيل ، فقال يا جبرئيل اني ابغض

فلاناً فابغضه ، قال فيبغضه جبرئيل ، شوينادي في اهل السماء ان الله يبغض فلاناً فابغضوه ، قال فيبغضه اهل السماء شوينادي له البغضاء في الارض !

"خدا جس وقت اپنے بندوں میں سے کسی سے محبت کرتا ہے تو اپنے عظیم فرشتے جبرئیل سے کہتا ہے کہ میں فلاں شخص کو محبوب رکھتا ہوں تو بھی اسے دوست رکھ تو جبرئیل اس سے محبت کرنے لگتا ہے۔ پھر وہ آسمانوں میں منادی کرتا ہے کہ اے اہل آسمان! خداوندِ عالم فلاں شخص کو پسند کرتا ہے۔ تم بھی اسے محبوب رکھو تو اس کے بعد تمام اہل آسمان اُس سے محبت کرنے لگتے ہیں پھر اس محبت کی قبولیت کا عمل زمین پر جاری ہوتا ہے۔ اور جب خدا کسی کو دشمن رکھتا ہے تو وہ جبرئیل سے کہتا ہے کہ میں فلاں شخص سے نفرت کرتا ہوں تم بھی اُس سے دشمنی رکھو تو جبرئیل اس سے دشمنی رکھتے ہیں پھر وہ اہل آسمان میں منادی کرتے ہیں کہ خدا فلاں شخص سے نفرت کرتا ہے تم بھی اُس سے دشمنی رکھو تو تمام اہل آسمان اُس سے متنفر ہو جاتے ہیں اس کے بعد اس متنفر کا عمل زمین پر جاری ہوتا ہے۔

اس کے بعد قرآن کی طرف کہ جو ایمان اور عمل صالح کی ہدایت کا سرچشمہ ہے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ہم نے قرآن کو تیری زبان پر آسان کر دیا ہے تاکہ تو پرہیزگاروں کو اس کے ذریعے بشارت دے اور سخت مزاج اور ہٹ دھرم دشمنوں کو ڈرائے (فانما يسرناه بلسانك للتبشير بالمتقين وتذيريه قومالذنا)۔

"لَا" (لام کی پیش اور وال کی شد کے ساتھ) اَلَّذِي جمع ہے (عدد کے وزن پر) جو ایسے دشمن کے معنی میں ہے جو سخت دشمنی رکھتا ہو اور ایسے اشخاص کے لیے بولا جاتا ہے جو دشمنی کرنے میں متعصب، ہٹ دھرم اور بے منطق ہوں۔

زیر بحث آخری آیت میں جناب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مومنین کی دلجوئی کے لیے (خصوصاً اس نکتہ کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہ سورہ مکہ میں نازل ہوئی اور اُس وقت مسلمان انتہائی سخت دباؤ میں تھے) اور تمام ہٹ دھرم دشمنوں کو تنبیہ اور تہدید کے لیے قرآن کہتا ہے: ہم نے اُن سے پہلے کتنی ہی بے ایمان اور گنہگار قوموں کو ہلاک و نابود کیا ہے، وہ اس طرح نابود اور جھلی بھری ہو گئیں کہ ان کا نام دشمن تک باقی نہ رہا۔

"اے پیغمبر! کیا تو اُن میں سے کسی کو محسوس کرتا ہے یا ان کی کوئی خفیت سی آواز سناتا ہے؟" (وَكَا اِهْلَكَ نَاقِلَهُ مِنْ قَوْمٍ هَلْ تَحْسُ مِنْهُمْ اَحَدًا وَتَسْمَعُ لَهُمْ رَكْزًا)۔

"رکز" آہستہ آواز کے معنی میں ہے۔ اور جن چیزوں کو زمین میں چھپاتے ہیں انہیں "رکاز" کہا جاتا ہے یعنی یہ سنگر تو ہیں اور حق حقیقت کے سخت دشمن اس طرح سے درہم برہم ہوتے کہ ان کی خفیت سی آواز تک بھی سنائی نہیں دیتی۔

سورہ قمر میں متعدد آیات میں یہ جملہ دہرایا گیا ہے :

ولقد یسرنا القرآن للذکر فهل من مدکر

ہم نے قرآن کو تذکر اور یاد دہانی کے لیے آسان کیا ہے، تو کیا کوئی پسند و نصیحت لینے والا ہے؟

پروردگارا ! ہمارے دل کو نور ایمان کے ساتھ اور ہمارے تمام وجود کو عمل صالح کے نور کے ساتھ روشن کر دے۔ ہمیں مومنین و صالحین خصوصاً امام المتقین امیر المومنین علی علیہ السلام کے دوستوں میں سے قرار دے اور ہماری محبت بھی تمام مومنین کے دلوں میں مثال دے بارالہما ! ہمارا عظیم اسلامی معاشرہ اتنی بڑی تعداد میں جوئے اور لستہ و سیع مادی و معنوی وسائل رکھنے کے باوجود دشمنوں کے ہتھے میں گرفتار ہے۔ اور آپس کے انتشار اور پھوٹ کی وجہ سے کمزور ہو گیا ہے۔ تو مسلمانوں کو ایمان اور عمل صالح کی مشعل کے گرد اکٹھا کر دے۔ خداوند ! جس طرح تو نے پہلے زمانے کے سرکشوں اور جابروں کو ایسا ہلاک و محو اور نابود کیا ہے کہ ان کی پینک بھی کانوں میں نہیں پڑتی اسی طرح ہمارے زمانہ کی پُسر طاقتوں کو بھی نیست و نابود کر دے۔ ان کے شر کو مستضعفین کے سر دل سے ٹال دے اور ان منکبیرین کے خلاف مومنین کی جدوجہد کو حتیٰ کامیابی سے ہمکنار کر دے۔

آمین یا رب العالمین

سورہ مريم کا اختتام

جمعہ ۲۳ / مہینہ ۱۳۶۰

۱۴ ربیع الثانی ۱۴۰۳

سُورَةُ طه

○ مکہ میں نازل ہوئی

○ اس کی ۱۳۵ آیات ہیں

جو شخص اسے پڑھے گا اسے روز قیامت ہمارے انصار کے برابر ثواب ملے گا۔

ہم پھر یہ بات ضروری سمجھتے ہیں کہ اس حقیقت کو دہرائیں کہ تمام ایسے عظیم ثواب جو پیغمبرؐ اور ائمہؑ سے ان سورتوں کی تلاوت کے بارے میں ہم تک پہنچے ہیں، ان کا مرکز یہ مطلب نہیں کہ صرف تلاوت کرنے سے انسان کو یہ سب نتائج حاصل ہو جائیں گے بلکہ اس سے مراد وہ تلاوت ہے جو غور و فکر کا مقدمہ بنے، ایسا غور و فکر کہ جس کے آثار انسان کے تمام اعمال و گفتار سے ظاہر ہوں اور اگر ہم اس سورہ کے اجمالی مطالب پر نظر کریں تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ مذکورہ بالا روایات اس سورہ کے مطالب کے ساتھ کامل مناسبت رکھتی ہیں۔

اس سورہ کے مضامین :

تمام مفسرین کے قول کے مطابق سورہ طہ مکہ میں نازل ہوئی ہے۔ اس کے مضامین بھی باقی تمام مکی سورتوں کی مانند ہیں جو زیادہ تر مبادیہ و معاد کے بارے میں ہیں اور توحید کے نتائج اور شرک کی بدبختیوں کو ایک ایک کر کے بیان کرتی ہیں۔

پہلے حصہ میں عظمت قرآن اور پروردگار کی کچھ صفات جلال و جمال کی طرف مختصر اشارہ ہے۔ دوسرے حصہ میں کہ جو آیتیں سے زیادہ آیات پر مشتمل ہے، موسیٰؑ کی داستان بیان ہوئی ہے۔ یہ اس زمانے کی داستان ہے جب موسیٰؑ نبوت پر مبعوث ہوئے اور اس کے بعد جابر فرعون کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ آپؑ نے فرعونوں کے ہاتھوں بہت سے مصائب بھیلے۔ یاد رکھیں کہ ساتھ مقابلہ ہوا۔ وہ ایمان لے آئے۔ اس کے بعد خدا نے سبب از طریقے سے فرعون اور اس کے حواریوں کو دریا میں غرق کر دیا اور موسیٰؑ اور مومنین کو رمانی بخشی۔

اس کے بعد بنی اسرائیل کی پھر سے کہ جو بننے کی داستان بیان کی گئی چاروں تائیا گیا ہے کہ بارون و موسیٰؑ کو کس طرح سے ان سے بھی اچھا پڑا۔ تیسرے حصہ میں کچھ معاد کے بارے میں بیان ہے اور کچھ قیامت کی خصوصیات کا ذکر ہے۔

چوتھے حصہ میں قرآن اور اس کی عظمت کا بیان ہے۔ پانچویں حصہ میں جنت میں آدم و حوا کی سرگزشت بیان کی گئی ہے۔ اہلبیس کی دوسرا گھڑی کا ماجر بیان کیا گیا ہے اور انجام کا ان کے زمین پر اترنے کا ذکر ہے۔

آخری حصہ میں مومنین کے لیے بیاد کن ہند و نصائح ہیں جو کہ جن میں سے اکثر کا ذکر نے سن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف ہے۔

سورہ طہ کی فضیلت

منابع اسلامی میں اس سورہ کی عظمت اور اہمیت کے بارے میں متعدد روایات وارد ہوئی ہیں۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ خدا نے سورہ طہ اور ایں کو خلقت آدم سے دو ہزار سال پہلے فرشتوں کے سامنے بیان کیا جس وقت فرشتوں نے قرآن کا یہ حصہ سنا تو انہوں نے کہا :

طوبی لامة ينزل هذا عليا، وطوبى لاجواف تحمل هذا، وطوبى لالسن تكلم بهذا

کیا کتنا اس اہمیت کا کہ جن پر یہ آیتیں نازل ہوں گی، کیا کتنا ان دلوں کا جو ان آیات کو قبول کریں گے اور کیا کتنا ان زبانوں کا کہ جن پر یہ آیات جاری ہوں گی۔

ایک اور حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے :

لا تدعوا قرآن سورة طه، فان الله يجيبها ويعب من قراها، ومن اذمن قرأها اعطاه الله يوم القيامة كتابه بيمينه، ولو يحاسبه بما عمل في الاسلام، واعطى في الآخرة من الاجر حتى يرضى

سورہ طہ کی تلاوت ترک نہ کرو، کیونکہ خدا اسے اور اس کی تلاوت کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ جو شخص ہمیشہ اس کی تلاوت کرتا رہے خدا قیامت کے دن اس کا نام اعمال اس کے دائیں ہاتھ میں دے گا اور وہ بغیر حساب کے جنت میں داخل ہوگا اور آخرت میں اسے اتنا اجر ملے گا کہ وہ راضی ہو جائے گا۔

ایک اور حدیث میں پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے :

من قراها اعطى يوم القيامة ثواب المهاجرين والانصار

۱۔ مجمع البیان، جلد ۱، ص ۱۔

۲۔ تفسیر زاد المعاد، جلد ۳، ص ۳۳۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

۱۔ طه ۰

۲۔ مَا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لِتَشْقَى ۰

۳۔ إِلَّا تَذْكُرَةً لِّمَنْ يَخْشَى ۰

۴۔ تَنْزِيلًا مِّمَّنْ خَلَقَ الْأَرْضَ وَالسَّمَوَاتِ الْعُلَى ۰

۵۔ الرَّحْمَنِ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوَى ۰

۶۔ لَهُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرَى ۰

۷۔ وَإِنْ تَجْهَر بِالْقَوْلِ فَإِنَّهُ يَعْلَمُ السِّرَّ وَأَخْفَى ۰

۸۔ اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ لَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَى ۰

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ طه -

۲۔ ہم نے قرآن کو تجھ پر اس لیے نازل نہیں کیا کہ تو خود کو مشقت میں ڈال دے۔

۳۔ اسے تو صرف اُن لوگوں کی یاد آوری اور تذکرہ کے لیے نازل کیا ہے جو (خدا سے) ڈرتے ہیں۔

۴۔ یہ قرآن اس کی طرف سے نازل ہوا ہے جو زمین اور بلند آسمانوں کا خالق ہے۔

۵۔ وہ خدا ہے رحمن ہے جو عرش پر مستطو ہے۔

۶۔ جو کچھ آسمانوں میں، زمین میں، ان دونوں کے درمیان اور زمین کی گہرائیوں میں موجود ہے سب اسی کا ہے۔

۷۔ اگر تم اونچی آواز سے بات کرو گے (یا پوشیدہ طور پر بات کرو گے) تو وہ تمام پہنچی ہوئی باتوں کو بلکہ خفیہ ترین باتوں کو بھی جانتا ہے۔

۸۔ وہی وہ خدا ہے جس کے سوا کوئی اور معبود نہیں ہے، اس کے اچھے اچھے نام ہیں۔

شان نزول :

مذکورہ بالا پہلی آیات کی شان نزول میں بہت سی روایات بیان ہوئی ہیں کہ جن سے مجموعی طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وسلم وحی و قرآن کے نازل ہونے کے بعد بہت ہی زیادہ عبادت کرنے لگے تھے، خاص طور پر کھڑے کھڑے عبادت میں مشغول رہتے تھے۔ یہاں تک کہ آپ کے پاؤں پر درم آگئے تھے۔ کبھی اس غرض سے کہ عبادت جاری رکھ سکیں، اپنے جسم کا سارا بوجھ ایک پاؤں پر ڈال دیتے اور کبھی دوسرے پاؤں پر کبھی پاؤں کی اڑھیل پر کھڑے ہو جاتے اور کبھی پاؤں کی انگلیوں پر۔

تو مذکورہ بالا آیات نازل ہوئیں اور آپ کو حکم دیا گیا کہ اپنے اوپر اتنی مشقت نہ ڈالیں۔

تفسیر

خود کو اتنا مشقت میں نہ ڈالو :

اس سورہ کے آغاز میں ہمیں پھر حروف مقطعه کا سامنا ہے جو انسان کے احساس جو کچھ کو ابھارتے ہیں (طہ)۔

البتہ ہم نے قرآن کے حروف مقطعه کی تفسیر کے بارے میں تین سورتوں کے آغاز میں کافی بحث کی ہے۔

لیکن اس مقام پر ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ اس مطلب کا اضافہ کریں کہ ممکن ہے کہ تمام ہی یا کم از کم ان حروف مقطعه میں سے کچھ ایک خاص معنی و مفہوم رکھتے ہوں۔ ٹھیک ایک لفظ کی مانند جس کا کوئی کوئی معنی و مفہوم ہوتا ہے۔

اتفاقاً ہمیں بہت سی روایات نیز اس سورہ اور سورہ یس کے آغاز میں جنس کے کلمات سے اس مطلب کا ثبوت ملتا ہے کہ طہ "یا راجل" (اے مرد) کے معنی میں ہے۔ کچھ عربی اشعار بھی ایسے ملتے ہیں جن میں "طہ" "یا راجل" یا اس کے نزدیک کے معنی میں استعمال ہوا۔

ان میں سے بعض اشعار ممکن ہے آغاز اسلام یا قبل از اسلام کے زمانے سے تعلق رکھتے ہوں۔

اور جیسا کہ ایک باخبر شخص نے مجھ سے بیان کیا ہے کہ بعض مغربی دانشوروں نے کہ جو اسلامی مسائل کے سلسلے میں مطالعہ کرتے رہتے ہیں اس

مطلب کو قرآن کے تمام حروف مقطعه کے لیے عام سمجھا ہے اور ان کا نظریہ ہے کہ حروف مقطعه ہر سورہ کی ابتدا میں ایک مستقل لفظ ہے، اس کا

ایک خاص معنی ہے ان میں سے بعض نماز گزار جانے سے متروک ہو گئے ہیں اور بعض ہم تک پہنچ گئے ہیں، ورنہ یہ بات بعید نظر آتی ہے کہ مشرکین

عرب حروف مقطعه کو سنیں اور وہ اس کا کوئی مفہوم نہ سمجھیں پھر بھی اس کا مذاق نہ اڑائیں حالانکہ کسی تاریخ میں یہ بات نظر نہیں آتی کہ ان پر مدافع بااثر

نے حروف مقطعه کو مذاق اڑانے کے لیے عنوان بنایا ہو۔

البتہ اس نظریہ کو بطور کلی اور تمام حروف مقطعه کے بارے میں قبول کرنا مشکل ہے لیکن بعض کے بارے میں قابل قبول ہے اور اسلامی

ان روایات سے آگاہی کے لیے تفسیر نور الثقلین اور تفسیر دانشور میں سورہ طہ کی ابتدا سے رجوع کریں۔

۱۔ سورہ بقرہ، جلد اول، آل عمران، جلد دوم، اور اعراف جلد چارم (تفسیر نمونہ)۔

۲۔ تفسیر مجمع البیان زیر بحث آیہ کے ذیل میں۔

تاکہ وہ یہ جان لیں کہ یہ شیطانی طاقتیں خدا کی قدرت کے مقابلے میں ٹھہرنے کی تاب نہیں رکھتیں اور ان کی یہ سب سازشیں نفع بخش برکت مند تاکہ اس داستان سے، جو بہت سے سبق آموز مطالب سے معمور ہے، توحید و خدا پرستی کی جدوجہد میں اپنی منزل کو پالیں۔ زمانے کے رولز اور جلاور گول کے خلاف معرکہ جاری رکھیں اور اسی طرح داخلی انحرافات اور انحرافی میلانات کے خلاف یہ کار میں اپنی منزل مقصود کو پالیں۔ ایسے درس ہیں کہ جو ان کے لیے انقلاب اسلامی کے سارے دور میں راہ نما اور راہ کشا ہو سکتے ہیں۔

موسوی دینی اسرائیل اور آل فرعون کے واقعات پر مشتمل ان آیات کو چار حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلے حصہ میں۔ حضرت موسیٰ کی نبوت و نبیت کے آغاز اور وحی کی پہلی شامحل کا بیان ہے۔ یہ وہ دور ہے جس کی ثبت کم ہے اور مطالب زیادہ ہیں۔ یہ وہ دن ہیں جو حضرت موسیٰ نے اس "وادی مقدس" میں، اس بیابان تاریک میں اور غلوت میں گزارے۔ دوسرے حصہ میں۔ حضرت موسیٰ اور ان کے بھائی ہارون کی طرف سے فرعون اور اس کے خواریلوں کو توحید پرستی کے دین کی دعوت دینے کا ذکر ہے اور اس کے بعد دشمنوں کے ساتھ ان کی معرکہ آرائی کو بیان کیا گیا ہے۔

تیسرے حصہ میں۔ موسیٰ اور بنی اسرائیل کے مصر سے نکلنے اور فرعون اور اس کے خواریلوں کے جنگل سے ان کے نجات پانے کی کیفیت اور دشمنوں کے غرق ہونے کا ذکر ہے۔

چوتھے حصہ میں۔ بنی اسرائیل کے دین توحید سے شرک کی طرف بڑی تیزی سے انحراف کرنے، اور سامری کے دوسلوں کو جہل کرنے کا ذکر ہے۔ نیز اس انحراف پر حضرت موسیٰ کے قاطع اور شدید رد عمل کا ذکر ہے۔

اب ہم زیر بحث آیات کی طرف کہ جو پہلے حصے کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں متوجہ ہوتے ہیں۔ یہ آیات ایک بااذب و لطیف تعبیر کے ساتھ کہتی ہیں: کیا تمہیں موسیٰ کی خبر پہنچی ہے (وہل آتھک حدیث موسیٰ)۔

یہ بات عجیب و غریب نہیں کہ یہ استقامت حصول خبر کے لیے نہیں ہے کیونکہ خدا تو تمام اسرار سے آگاہ ہے، بلکہ مشورہ تعبیر کے مطابق یہ استقامت تقریری یا دوسرے لفظوں میں ایک ایسا استقامت ہے کہ جو ایک اہم خبر بیان کرنے کے لیے تہیہ اور مقدمہ کے طور پر بولا جاتا ہے۔ جیسا کہ ہم اپنی روزمرہ کی زبان میں بھی ایک اہم خبر کو شروع کرتے وقت کہتے ہیں: کیا تم نے یہ خبر سنی ہے کہ۔۔۔؟

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: جب اُسے (دور سے) آگ دکھائی دی تو اس نے اپنے گھر والوں سے کہا کہ تم تھوڑی دیر کے لیے لگ جاؤ، میں نے آگ دیکھی ہے۔ شاید میں اُس سے تمہارے لیے ایک چنگاری لے آؤں، یا اس آگ کے ذریعے راستہ معلوم کر لوں (مقام رسالت کے لیے) منتخب کر لیا ہے۔ اب جو کچھ بھی تیری طرف وحی کی جائے اُسے فوراً سن۔

قیامت (جنت) آئے گی میں اسے اس لیے چھپا کر رکھنا چاہتا ہوں تاکہ ہر شخص اپنی سعی و کوشش کے بدلے اپنی جزا دیکھے۔ اور جو لوگ قیامت پر ایمان نہیں رکھتے اور انہوں نے اپنی خواہشات کی پیروی کی ہے تجھے ہرگز اُس سے باز نہ رکھیں ورنہ تو ہلاک ہو جائے گا۔

نثار مہدی۔

"قبس" (بروزن "قبس") تھوڑی سی آگ کے معنی میں ہے کہ جسے کچھ زیادہ آگ سے آگ کر لیتے ہیں۔ بیابان میں آگ کا دکھائی دینا عام طور پر اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ کچھ لوگ اس کے گرد جمع ہیں یا یہ بلندی پر آگ کا شعلہ اس لیے روشن کیا جاتا ہے تاکہ قافلے والے رات کے وقت ہینک نہ جائیں۔

- ۱۳۔ وَأَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوحَىٰ
۱۴۔ إِنِّي أَنَا اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدْنِي وَأَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِي
۱۵۔ إِنَّ السَّاعَةَ آتِيَةٌ أَكَادُ أُخْفِيهَا لَتَجْزِيَنَّهُ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعَىٰ
۱۶۔ فَلَا يَصُدُّكَ عَنْهَا مَنْ لَا يُؤْمِنُ بِهَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ فَتَرْدَىٰ

ترجمہ

- ۹۔ اور کیا موسیٰ کی خبر تم تک پہنچی ہے۔
۱۰۔ جب اُسے (دور سے) آگ دکھائی دی تو اس نے اپنے گھر والوں سے کہا کہ تم (تھوڑی دیر کے لیے) لگ جاؤ، میں نے آگ دیکھی ہے۔ شاید میں تمہارے لیے اس میں سے ایک چنگاری لے آؤں یا اُس آگ کے ذریعے راستہ معلوم کر لوں
۱۱۔ جس وقت وہ آگ کے پاس آیا تو اُسے ندا دی گئی: اے موسیٰ!
۱۲۔ میں تیرا پروردگار ہوں! اپنے بھوتے اُٹار دے کیونکہ تو مقدس سرزمین "طوی" میں ہے۔
۱۳۔ اور میں نے تجھے (مقام رسالت کے لیے) منتخب کر لیا ہے۔ اب جو کچھ بھی تیری طرف وحی کی جائے اُسے فوراً سن۔
۱۴۔ میں اللہ ہوں میرے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے۔ پس تو میری ہی عبادت کر اور میری یاد کے لیے نماز قائم کر۔
۱۵۔ قیامت (جنت) آئے گی میں اسے اس لیے چھپا کر رکھنا چاہتا ہوں تاکہ ہر شخص اپنی سعی و کوشش کے بدلے اپنی جزا دیکھے۔
۱۶۔ اور جو لوگ قیامت پر ایمان نہیں رکھتے اور انہوں نے اپنی خواہشات کی پیروی کی ہے تجھے ہرگز اُس سے باز نہ رکھیں ورنہ تو ہلاک ہو جائے گا۔

تفسیر

بیابان میں آگ کا شعلہ:

یہاں سے خدا کے عظیم پیغمبر حضرت موسیٰ کی داستان شروع ہوتی ہے۔ اتنی سے زیادہ آیات میں ان پر گزرنے والے واقعات کے اہم حصوں کی تفصیل بیان کی گئی ہے تاکہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مومنین کے لیے جو ان دنوں مکہ میں دشمنوں کی طرف سے سخت دباؤ میں تھے، یہ داستان نبوی اور دلا سے کام لے سکیں۔

موسیٰ اپنے بیوی اور بچے کے ساتھ اندھیری رات میں بیابان سے گزر رہے تھے۔ رات ایسی سرد اور تاریک تھی کہ وہ وہاں انہیں دُور سے آگ کا ایک شعلہ دکھائی دیا۔ یہ شعلہ دیکھتے ہی حضرت موسیٰ نے اپنے گھروالوں سے کہا: تمہاری سی میں نے آگ دیکھی ہے، میں جا کر اس میں سے تھوڑی سی آگ تمہارے لیے لے آؤں یا آگ کے ذریعے یا ان لوگوں جو وہاں ہیں راستہ معلوم کر لوں۔

تو اس میں بھی ہے کہ جب موسیٰ کی شعیب کے ساتھ معاہدہ کی مدت میں پوری ہو گئی تو وہ اپنے بیوی بچے کو لے کر مدین سے مصر کی طرف روانہ ہوئے تو راستہ بھل گئے، رات ایسی تاریک اور اندھیری تھی کہ چھڑیں بیابان میں بھگڑ گئیں چاہا کہ آگ روشن کریں تاکہ اس سردرات میں وہ خود اور ان کے بال بچے گرم ہوں، لیکن آگ جلانے والی چیز سے آگ روشن نہ ہو سکتی تھی ان کی حائل بیوی کو وضع حمل کی تکلیف شروع ہو گئی۔

گویا مصائب کا ایک طوفان تھا جس نے انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا۔ یہ وقت تھا جبکہ انہیں دُور سے ایک شعلہ دکھائی دیا۔ لیکن یہ آگ نہیں تھی بلکہ خدائی نور تھا۔ موسیٰ اس گمان میں کہ وہ آگ ہے راستہ معلوم کرنے یا آگ لینے کے لیے اس آگ کی چل پڑے۔

اب اس سرگزشت کا آخری حصہ قرآن کی زبان سے سُنتے ہیں :

جب موسیٰ آگ کے پاس آئے تو ایک آواز سُنی جو انہیں مخاطب کر کے کہہ رہی تھی۔ اے موسیٰ (فلما آتانا فودى یا موسیٰ)۔

میں تیرا پروردگار ہوں، اپنے جوتے اُتار دے کیونکہ تو مقدس سرزمین طوی میں ہے (ان انا ربك فاخلع نعليك انا بالواد المقدس طوى)۔

سُورہ قصص کی آیہ ۲۰ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ نے یہ ندا اس درخت کی طرف سے جو وہاں تھائی تھی :

نودی من شاطئ الوادي الامين في البقعة المباركة من الشجرة

ان یا موسیٰ انا اللہ رب العالمین

مجموعی طور پر ان دونوں تعبیروں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ جس وقت قریب گئے تو آگ کو درخت کے اندر دیکھا (جو مغرب کے قول کے مطابق عناب کا درخت تھا) اور یہ خود ایک واضح روشن قرینہ تھا، اس بات کا کہ یہ آگ کوئی عام آگ نہیں ہے، بلکہ یہ خدائی نور ہے، کہ جو نہ صرف یہ کہ درخت کو نہیں جلاتا بلکہ اس کے ساتھ کعبان و آتش ہے یہ نور حیات ہے۔

موسیٰ نے یہ آواز کر "میں تیرا پروردگار ہوں" سنی تو حیران رہ گئے اور ایک ناقابل بیان چرکیف حالت اُن پر طاری ہو گئی، یہ کون ہے جو مجھ سے باتیں کر رہا ہے؟ یہ میرا پروردگار ہے، کہ جس نے لفظ "ربك" کے ساتھ مجھے اختیار بخشا ہے تاکہ میرے لیے اس بات کی نشاندہی کرے کہ میں نے آغازِ پچھن سے لے کر اب تک اس کی آغوشِ رحمت میں پرورش پائی ہے اور ایک عظیم رسالت کے لیے تیار ہوں۔

حکم ملا کہ پاؤں سے اپنا جوتا اُتار دو، کیونکہ تُو نے مقدس سرزمین میں قدم رکھا ہے وہ سرزمین کہ جس میں نور الہی جلوہ گر ہے، وہاں یہ مقام منشا ہے، اور رسالت کی ذمہ داری کو قبول کرنا ہے، لہذا انتہائی خضوع اور انکساری کے ساتھ اس سرزمین میں قدم رکھو۔ یہ ہے کہ پاؤں سے جوتا اُتارنے کی۔

اس بنا پر بعض مفسرین نے جوتا اُتارنے کے سلسلے میں تفصیلی بحث کی ہے۔ انہوں نے بعض چند و چند و سروں کے اقوال نقل کیے ہیں جو بہت زیادہ ہیں۔ ان میں بہت سی ایسی باتیں ہیں جو بہت بعید معلوم ہوتی ہیں۔ البتہ جو روایات اس آیت کی تاویل کے سلسلے میں نقل ہوئی ہیں وہ ہم نکات کے ذکر کے موقع پر ان کے بارے میں بحث کریں گے۔

"طوی" کی تعبیر یا تو اس بنا پر ہے کہ اس سرزمین کا نام طوی تھا، جیسا کہ اکثر مفسرین نے بیان کیا ہے اور یا یہ بات ہے کہ "طوی" جو کہ اصل میں لپیٹنے کے معنی میں ہے، یہاں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس سرزمین کو موسیٰ برکات نے ہر طرف سے گھیر رکھا تھا۔ اسی بنا پر سورہ قصص کی آیہ ۲۰ میں اُسے "البقعة المباركة" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اس کے بعد اُسی کتنے والے سے یہ بات بھی سُنی : اور میں نے تجھے مقام رسالت کے لیے چُن لیا ہے، اب جو بھی دلی تیری طرف ہوتی ہے اُسے غور سے سنو (وانا اخترتك فاستمع لما یوحی)۔

اور اس کے بعد موسیٰ نے وحی کا پہلا جملہ اس صورت میں حاصل کیا : میں اللہ ہوں، میرے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے (اننى انا الله لا اله الا انا)۔

اب جبکہ یہ بات ہے تو صرف میری ہی عبادت کر، ایسی عبادت کہ جو ہر قسم کے شرک سے پاک ہو۔ (فاعبدنى)۔ اور نماز قائم کر تاکہ ہمیشہ میری یاد میں رہے (واقم الصلوة لذکرى)۔

اس آیت میں انبیاء کی دعوت کی اہم ترین بنیاد یعنی مسئلہ توحید کو بیان کرنے کے بعد خدائے یگانہ کی عبادت کا موضوع، ایمان و توحید کے درخت کے ایک ثمر کے عنوان سے بیان ہوا ہے اور اس کے بعد عظیم ترین عبادت اور خلق کا خالق کے ساتھ اہم ترین تعلق اور اس کی ذات پاک کو فراموش نہ کرنے کی مؤثر ترین راہ یعنی نماز کا حکم دیا گیا ہے۔

قرآن رسالت کے ساتھ، جو اس سے پہلی آیت میں آیا ہے، ان میں احکام کا بیان اور مسئلہ معاہدہ کا بیان جو اس سے بعد والی آیت میں آیا ہے، اصول و فروع دین کے ایک کامل اور متفقہ مجموعہ کو بیان کرتا ہے۔ اور استقامت کے حکم کے ساتھ جو زیر بحث آیات کی آخری آیت میں آئے گا ہر لحاظ سے اس سلسلہ کلام کی تکمیل ہو جاتی ہے۔

اور چونکہ "توحید" اور اس کی فروعات کے ذکر کے بعد دوسرا بنیادی مسئلہ معاہدہ ہے لہذا بعد والی آیت میں قرآن کتاب ہے قیامت یقیناً آئے گی، میں چاہتا ہوں کہ اُسے مخفی رکھوں تاکہ ہر شخص اپنی سعی و کوشش کے مطابق جزا پائے (ان الساعة آتیة اکاد اخفیها لالتجرى کل نفس بما تسعی)۔

اس جملہ میں دو نکات ہیں کہ جن کی طرف توجہ کرنا ضروری ہے :

پہلا نکتہ : یہ ہے کہ (احکاد اخفیہا) کے جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ "نزدیک" ہے کہ میں قیام قیامت کی تاریخ کو پہنچوں اور اس تعبیر کے لیے یہ بات لازم آتی ہے کہ میں نے (ابھی تک) مخفی نہیں رکھا ہے، حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ قرآن کی بہت سی صریح واضح آیات کے مطابق کوئی شخص بھی تاریخ قیامت سے آگاہ نہیں ہے۔ جیسا کہ سورۃ الاعراف کی آیت ۱۸۷ میں بیان ہوا ہے :

لَسْتُ لَکُمْ عَنْ السَّاعَةِ اِیَّانَ سَرِّهَا قُلُوبُ الْعُلَمَاءِ مَا عِنْدَ رَبِّیْ

لوگ قیامت کے بارے میں تجھ سے سوال کرتے ہیں تم کہہ دو کہ اس کا علم تو خدا ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔

مفسرین نے اس سوال کے جواب میں بہت سی باتیں کی ہیں۔ بہت سے مفسرین یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ یہ تعبیر ایک قسم کا ہائپر اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ قیامت کے شروع ہونے کی تاریخ اس قدر مخفی اور پنهان ہے کہ نزدیک ہے کہ میں خود اپنے آپ تک سے بھی اُسے پنهان رکھوں۔ اس بارے میں ایک روایت بھی وارد ہوئی ہے اور احتمال یہی ہے کہ مفسرین کی اس جماعت نے اپنا مطلب اسی روایت سے اخذ کیا ہے۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ "کاد" کے مشتقات ہمیشہ نزدیک ہونے کے معنی میں نہیں ہوتے۔ بلکہ بعض اوقات تاکید کے معنی میں آتے ہیں اور اُس میں نزدیک ہونے کے معنی نہیں ہوتے۔

لہذا بعض مفسرین نے "اکاد" کو "ارید" (میں چاہتا ہوں) کے معنی کے ساتھ تفسیر کیا ہے۔ اور بعض متون لغت میں یہ معنی صراحت کے ساتھ آئے ہیں۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ، زیر بحث آیت کے مطابق قیامت کو مخفی رکھنے کی علت و سبب یہ ہے کہ "خدا یہ چاہتا ہے کہ ہر شخص کو اس کی سنی و کوشش کے مطابق جزا دے" دوسرے لفظوں میں اس کے مخفی رہنے سے سب کے لیے ایک قسم کی آزادی عمل پیدا ہوگی اور دوسری طرف سے چونکہ اس کا کوئی خاص وقت معلوم نہیں ہے اور ہر زمانہ میں اس کا احتمال ہے لہذا اس کا نتیجہ ہمیشہ آمادہ رہنے کی حالت یا تربیتی پروگراموں کو جلد ہی قبول کرنے کی صورت میں نکلتا ہے۔ جیسا کہ "شب قدر" کے پوشیدہ رکھنے کے فلسفہ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ لوگ سال کی تمام راتوں یا ماہ مبارک رمضان کی تمام راتوں کا احترام کریں اور غفلت و لگاؤ میں حاضری دیں۔

آخری زیر بحث آیت میں ایک اساسی مسئلے کی طرف توجہ کرنا ضروری ہے جو تمام مذکورہ عقیداتی اور تربیتی پروگراموں کے اجراء کا ضامن ہے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے : جو لوگ قیامت پر ایمان نہیں رکھتے اور انہوں نے اپنی خواہشات کی پیروی کی ہے تجھے ہرگز اس سے باز نہ رکھیں ورنہ تو ہلاک ہو جائے گا (فلا یصدنک عنہا من لا یدعون بہا واتبیع ہواہ فخرذی)۔

تم بے ایمان لوگوں! ان کے دوسروں اور کاموں میں رکاوٹیں ڈالنے کے مقابلے میں مضبوطی سے کھڑے ہو جاؤ۔ نہ تو ان کی کثرت سے وحشت زدہ ہو، نہ ان کی سازشوں سے کسی قسم کا خوف کرو اور نہ ہی ان کی اس مافوق اور شرور و غل سے اپنی دعوت کی حقانیت اور اپنے مکتب

قاویس لغت میں "کاد" کے مادہ میں آیا ہے : و تکون بمعنی ارادہ اکاد اخفیہا لئلا یسید (کاد کا معنی ہے میں چاہتا ہوں)۔

صالحات میں کسی قسم کا شک و شبہ کرو۔

یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ یہاں پر "لا یدعون" صیغہ مضارع کی صورت میں اور "واتبع ہواہ" صیغہ ماضی کی صورت میں ہے۔ یہ درحقیقت اس نکتے کی طرف اشارہ ہے کہ قیامت کے منکبین کا ایمان نہ لانا ہوائے نفس کی پیروی کی وجہ سے ہے۔ گویا وہ یہ چاہتے ہیں کہ آزاد رہیں اور جو کچھ ان کا دل چاہے کریں، لہذا اس سے بہتر اور کیا ہے کہ قیامت کا ہی انکار کر دیں تاکہ ان کی ہواد ہوس اور خواہشات انسانی کی آزادی میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔

چند اہم نکات :

۱۔ "فاخلع نعلیک" سے کیا مراد ہے ؟ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ آیت کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ بڑی کو اس مقدس سرزمین کے احترام کا حکم دیا گیا کہ اپنے پاؤں سے جوتے اتار دے اور اس داوی میں نہایت عجز و انکساری کے ساتھ قدم رکھنے حق کو سنے اور فرمان رسالت حاصل کرے لیکن بعض مفسرین کچھ روایات کی پیروی کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ : یہ حکم اس وجہ سے دیا گیا تھا چونکہ اس جوتے کا چمڑا مژرہ جانور کا تھا۔

یہ بات خود اپنے طور پر بعید نظر آتی ہے۔ کیونکہ کوئی وجہ نہیں تھی کہ سوئی اس قسم کے آلودہ چمڑے اور جوتے سے استفادہ کرتے۔ بعض دوسری روایات میں اس کا انکار بھی پایا جاتا ہے۔ ایک روایت وہ ہے کہ جو امام زمانہ (ارواحنا للقداد) کے ناحیہ مقدس سے نقل ہوئی ہے کہ جو اس تفسیر کی شدت کے ساتھ نفی کرتی ہے۔

موجودہ قرأت کے سفر فروع فصل سوم میں بھی یہی تعبیر کہ جو قرآن میں ہے، نظر آتی ہے۔

بعض دوسری روایات جن میں آیت کی تاویل اور اس کے بطون کی طرف اشارہ ہے۔ یہ کہتی ہیں کہ :

فاخلع نعلیک ای خوفیک : خوفک من ضیاع اهلك وخوفک من فروع

"فاخلع نعلیک" سے مراد یہ ہے کہ اپنے سے دو خوف و خطر دور کر دے۔ ایک اپنے گھر

والوں کے اس بیابان میں تباہ ہو جانے کا خوف اور دوسرا فروع کا خوف۔

ایک اور حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے حضرت سوئی کی زندگی کے اس واقعہ سے متعلق ایک عمدہ مطلب نقل ہوا ہے،

آپ فرماتے ہیں :

کن لما لا ترجوا ارج منک لما ترجوا فان موسیٰ بن عمران خرج

لیقبس لاهله نارا فرجع الیہم و هو رسول نبی !

جن چیزوں کی تمہیں امید نہیں ہے ان کی امیدیں سے بھی زیادہ امید رکھو کہ جن کی تمہیں

امید ہے کہ چونکہ سوئی بن عمران ایک چنگاری لینے کے لیے گئے تھے لیکن عمدہ نبوت و رسالت کے ساتھ واپس آئے۔

۲۔ تراشیدین ج ۳ ص ۳۳۰

۳۔ تراشیدین ج ۲ ص ۳۳۰

۱۸۔ کہا : یہ میرا عصا ہے، میں اس پر سہارا لیتا ہوں، اس سے اپنی بیڑوں کے لیے درختوں سے پتے جھاڑتا ہوں، اس سے اپنی اور دوسری ضروریات میں پڑا کرتا ہوں۔

۱۹۔ کہا اے موسیٰ ! اسے نیچے پھینک دے۔

۲۰۔ (موسیٰ نے) اُسے پھینکا تو وہ اچانک ایک بہت بڑا سانپ بن گیا اور چلنے لگا۔

۲۱۔ فرمایا اسے پکڑ لے اور ڈر نہیں ہم اسے اس کی اُسی پہلی صورت میں پٹا دیں گے۔

۲۲۔ اور اپنا ہاتھ اپنی بغل کے اندر لے جا، تو وہ بے عیب سفید اور چمکتا ہوا نکلے گا، یہ دوسرا معجزہ ہے۔

۲۳۔ ہم چاہتے ہیں کہ اپنی بڑی بڑی نشانیاں تجھے دکھائیں۔

تفسیر

موسیٰ کا عصا اور یدِ بریضا :

اس میں شک نہیں کہ انبیاء کو اپنا خدا کے ساتھ رابطہ ثابت کرنے کے لیے معجزے کی ضرورت ہے، درجہ ہر شخص پیغمبر کی کا وہی کر سکتا ہے۔ اس بنا پر سچے انبیاء کا جھوٹوں سے امتیاز معجزے کے علاوہ نہیں ہو سکتا، یہ معجزہ خود پیغمبر کی دعوت کے مطالب اور آسمانی کتاب کے اندر بھی ہو سکتا ہے اور جرحی اور جہانی قسم کے معجزات دوسرے امور میں بھی ہو سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں معجزہ خود پیغمبر کی روح پر بھی اثر انداز ہوتا ہے اور وہ اُسے قوتِ قلب، قدرتِ ایمان اور استقامت بخشتا ہے۔

بہر حال حضرت موسیٰ کو فرمانِ نبوت ملنے کے بعد اس کی سند بھی ملنی چاہیے، لہذا اسی پر خطرات جناب موسیٰ نے دو عظیم معجزے خدا سے حاصل کیے۔

قرآن اس ماجرے کو اس طرح بیان کرتا ہے :

خدا نے موسیٰ سے سوال کیا : "اے موسیٰ! یہ تیرے دائیں ہاتھ میں کیا ہے؟" (وما تملک میمنک یا موسیٰ)۔

اس سادہ سے سوال — میں لطف و محبت کی چاشنی مٹی — فطرتاً موسیٰ کی روح میں اس وقت طوفانی لہریں موجزن تھیں۔ اُسے یہ سوال اطمینانِ قلب کے لیے بھی تھا اور ایک عظیم حقیقت کو بیان کرنے کی تہنید بھی تھا۔

موسیٰ نے جواب میں کہا : یہ کمزور میرا عصا ہے (قال ہی عصای)۔

اور چونکہ محبوب نے ان کے سامنے پہلی مرتبہ ان کی اپنا دروازہ کھولا تھا لہذا وہ اپنے محبوب سے باتیں جاری رکھنا اور انہیں طول دینا چاہتے تھے اور اس وجہ سے بھی کہ شاید وہ سوچ رہے تھے کہ میرا صرف یہ کہنا کہ یہ میرا عصا ہے، کافی نہ ہو بلکہ سوال کا مقصد اس عصا کے آثار و فوائد کو بیان کرنا ہو۔ لہذا مزید کہا، میں اس پر قویک لگاتا ہوں (اتوکل علیہا)۔

اور اس سے اپنی بیڑوں کے لیے درختوں سے پتے جھاڑتا ہوں (واھش بھا علی غنمی)۔

(دیکھو سورہ طہ ص ۱۷)

اس کے علاوہ ست دوسرے کام بھی لیتا ہوں۔ (ولم فیہا ما رب الخضر)۔

البتہ یہ بات — یہ درختوں سے پتے جھاڑنے والے عصا سے کون کون سے کام لیتے ہیں — کبھی اس سے موسیٰ جانوروں اور درختوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک دفعہ چھیار کے طور پر کام لیتے ہیں۔ کبھی اس کے ذریعے بیابان میں سائبان بنالیتے ہیں، کبھی اس کے ساتھ برتن باندھ کر گہری تسکین لکھتے ہیں۔

بہر حال حنتِ نبویؐ ایک نئے تعجب میں تھے کہ اس عظیم بارگاہ سے یہ کس قسم کا سوال ہے اور میرے پاس اس کا کیا جواب ہے پہلے جو فرمان دیتے تھے وہ یہ تھے۔ اور یہ پرسش کس لیے ہے؟

اچانک یہ غریب گناہ گار موسیٰ ! اپنا عصا پھینک دے (قال القھا یا موسیٰ)۔

موسیٰ نے اس وقت عصا پھینک دیا، وہ اچانک ایک بہت بڑا سانپ بن گیا، اور وہ چلنے پھرنے لگا۔ (فالقھا فاذا ہی حیة سحر)۔

"تسحر" معنی "کے" سے تیزی کے ساتھ راہ چلنے کے معنی میں ہے جو دوڑنے کی حد تک نہ ہو۔

اس سورۃ بنی کو عموماً یاد کرنا اسے پکڑ لے اور ڈر نہیں، ہم اسے اس کی اُسی پہلی صورت میں پٹا دیں گے (قال خذھا ولا تخف سنعیفہ سنحہا الا ولی)۔

سورۃ قصصہ ۲۱ ہے :

ولی مدبراً ولو یعقب یا موسیٰ اقبل ولا تخف

موسیٰ! ہمیں سانپ کو دیکھ کر ڈر گئے اور پیچھے ہٹے۔ خدا نے دوبارہ اُن سے کہا اے موسیٰ !

پہلے تو اور ڈرو نہیں۔

اگرچہ یہ موسیٰ کے ڈرنے کا مسئلہ بہت سے مفسرین کے لیے سوال کا باعث بن گیا ہے کہ یہ حالت اُس شجاعت کے ساتھ جو حضرت موسیٰ کے بارے میں معلوم ہے میل نہیں کھاتی۔ ہم جانتے ہیں کہ انہوں نے ساری عمر غریبوں کے ساتھ جنگ کرتے ہوئے گزاردی حقیقت شجاعت و عملی طور پر ثبوت دیا، جبکہ یہ بات انبیاء کی شرائط کلی میں سے بھی ہے۔ تو پھر یہاں یہ صورت کس طرح درست ہو سکتی ہے؟

لیکن یہ مسئلہ کی طرف توجہ کرنے سے اس کا جواب واضح ہو جاتا ہے، کیونکہ یہ بات ہر انسان کے لیے فطری ہے۔ چاہے وہ کتنا ہی شجاع ہو۔ "ہش" "ہش" کا شخ کے ساتھ کے مادہ سے درختوں کے پتوں پر مارنے اور انہیں جھاڑنے کے معنی میں ہے۔

عصا جمع ہے "عصا" کی جو حاجت، نیاز اور مقصد کے معنی میں ہے۔

یہ "عصا" عیساء و غیر فرقہ میں کتاب ہے، باطنی حالت کے معنی میں ہے، چاہے وہ حالت غریبی ہو یا اکتالی۔ بعض نے یہاں بیت و صورت کے معنی کیے ہیں۔

کتنی ہی شجاع اور مدبر ہو۔ کہ اگر وہ یہ دیکھ لے کہ لکڑی کا ایک ٹکڑا اپنا تک ایک بہت بڑے سانپ میں بدل گیا ہے، اور وہ تیزی کے ساتھ چلنے لگا ہے تو وہ وقتی طور پر وحشت زدہ ہوگا۔ اور خود کو اس سے بچائے گا، سوائے اس صورت کے کہ اس نظر کو اس کے سامنے بار بار دہرایا جائے۔ اس فطری اثر کا موٹی پر کسی طرح بھی اعتراض نہیں ہو سکتا، اور سورۃ اعراب کی آیہ ۲۹ میں جو یہ بیان ہوا ہے کہ :

الذین يبلغون رسالات الله ويخشونه ولا يخشون احدا الا الله
جو لوگ اللہ کے پیغامات کی تبلیغ کرتے ہیں وہ اسی سے ڈرتے ہیں اور اس کے علاوہ کسی سے نہیں ڈرتے :

اس کے منافی نہیں، چونکہ یہ ایک فطری رد و گزرد اور وقتی وحشت ہے جو ایک ایسے حادثہ سے ہوتی ہے جس سے پہلے کبھی داخل نہیں ہوا اور جو خلافت معمول ہے۔

اس کے بعد حضرت موسیٰ کے دوسرے معجزے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حکم دیا گیا ہے :

اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں لے جاتا کہ سفید چمکدار اور روشن ہو کر باہر آئے اور اس میں کوئی عیب و نقص نہ ہوگا اور یہ تمہارے لیے ایک دوسرا معجزہ ہے (واضح صوبیدک الی جناحک تخرج بیضاء من غیر مسوءۃ ایۃ اخراۃ) اگرچہ (واضح صوبیدک الی جناحک) کے جملہ کی تفسیر میں مفسرین نے مختلف باتیں کی ہیں لیکن سورہ قصص کی آیہ ۳۲ کی طرف توجہ کرنے سے جس میں یہ بیان کیا گیا ہے :

اسلک یدک فی جیبک

اور سورہ نمل کی آیہ ۱۲ جس میں یہ بیان ہوا ہے :

وادخل یدک فی جیبک

بخوبی معلوم ہو جاتا ہے کہ جناب موسیٰ کو اس بات کا حکم دیا گیا تھا کہ وہ اپنا ہاتھ گریبان میں ڈالیں۔ اور اُسے بغل یا پہلو کے نیچے تک لے جائیں کہ چونکہ جناح اصل میں پرندوں کے پر کے معنی میں ہے اور یہاں ہو سکتا ہے کہ زیر بغل کے لیے کنا یہ ہو۔ "بیضاء" سفید کے معنی میں ہے، اور "من غیر مسوءۃ" اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تیرے ہاتھ کی سفیدی برص یا اسی جیسی کسی بیماری کے اثر سے نہ ہوگی، کیونکہ اس میں ایک خاص قسم کی چمک اور روشنی ہوگی، وہ ایک لمحہ کے لیے ظاہر ہوگی اور دوسرے ہی لمحہ میں غائب ہو جائے گی۔

لیکن بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت حضرت موسیٰ کے ہاتھ میں انتہائی زیادہ نورانیت پیدا ہو جاتی تھی، اگر ایسا تھا تو پھر یہ قبول کرنا پڑے گا کہ (من غیر مسوءۃ) کا مفہوم اس کے علاوہ بھی ہے کہ جو ہم نے اوپر بیان کیا ہے یعنی اُس میں ایک ایسی "آیۃ" منسوب ہے، کیونکہ یہ ایک ایسا اسم ہے جو حال کی جگہ آیا ہے، اس ضمیر کا حال ہے کہ جو "تخرج" میں مستتر ہے۔

عجیب نورانیت تھی، جو نہ آنکھ کو تحلیف دیتی تھی نہ اُس کے درمیان کوئی سیاہ دھبہ دکھائی دیتا تھا اور نہ ہی کوئی اور ایسی چیز تھی۔

پہلی آیات میں جو کچھ بیان کیا گیا اُس سے نتیجہ نکالتے ہوئے آخری زیر بحث آیت میں فرمایا گیا ہے : ہم نے ان کو تیسرے اختیار میں دے دیا ہے، تاکہ ہم تجھے اپنی عظیم نشانیاں دکھائیں (لغزیک من ایتنا الکبریٰ)۔

یہ بات صاف ظاہر ہے کہ "آیات کبریٰ" سے مراد وہی دو اہم معجزے ہیں کہ جن کا اوپر ذکر آیا ہے، اور یہ جو بعض مفسرین نے احتمال ذکر کیا ہے کہ یہ دوسرے معجزات کی طرف اشارہ ہے جو خدا نے جناب موسیٰ کو بعد میں عطا فرمائے، یہ بات بہت بعید نظر آتی ہے۔

چند اہم نکات:

۱۔ دو عظیم معجزے : اس میں شک نہیں کہ موسیٰ کے عصا کے ایک بہت بڑے سانپ میں تبدیل ہو جانے کے بارے میں زیر نظر آیات میں جو کچھ کہا گیا ہے یہاں تک کہ سورہ اعراف کی آیات ۱۰۴ میں اُسے "ثعبان" (اڑھوا) سے تعبیر کیا گیا ہے اور اسی طرح ایک مختصر لمحہ کے لیے ہاتھ میں ایک خاص قسم کی چمک پیدا ہونا اور پھر اس کا پہلی حالت کی طرف پلٹ جانا، یہ ایک معمولی یا نادر و کیا ہر امر نہیں ہے، بلکہ یہ دونوں خلافت معمول اور معجزہ شمار ہوتے ہیں۔ جو ایک مافوق بشر قدرت کے ہمارے اور مدد کے سوا یعنی خدا کے عظیم کی قدرت کے بغیر ممکن نہیں ہیں۔

جو لوگ خدا پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کے علم و قدرت کو بے پایاں سمجھتے ہیں وہ ان امور کا ہرگز انکار نہیں کر سکتے، اور نہ ہی مادہ پرستوں کی طرح اسے خرافات کہہ سکتے ہیں۔

معجزہ میں جو بات اہم ہے وہ یہ ہے کہ وہ عقلی طور پر محال نہ ہو اور یہ بات اس مقام پر پورے طور سے صادق آتی ہے، کیونکہ کوئی عقلی دلیل عصا کے بہت بڑے سانپ میں تبدیل ہونے کے امکان کی نفی پر دلالت نہیں کرتی۔

کیا عصا اور بڑا سانپ دونوں ماضی بعید میں مٹی سے ہی پیدا نہیں ہوئے؟ یقینی طور پر شاید لاکھوں یا کروڑوں سال گزر گئے ہوں کہ جب اس قسم کی موجودات وجود میں آتی ہوں (اور اس مسئلہ میں کوئی فرق نہیں ہے خواہ ہم انواع کے ثبوت کو مانیں یا اس کے ارتقا کے قائل ہوں) کیونکہ ہر حال میں درختوں کی لکڑی بھی مٹی سے ہی پیدا ہوتی ہے اور حیوانات بھی)۔

زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ یہ کام معجزانہ طور پر انجام پایا ہے کیونکہ وہ مراحل جو ہزاروں سالوں میں طے ہونے چاہئیں تھے وہ ایک لمحے اور ایک انتہائی کم اور تشعیرت میں انجام پا گئے ہیں، کیا ایسا کام محال نظر آتا ہے؟

ممکن ہے کہ میں تو ایک ضخیم کتاب کو ہاتھ سے ایک سال میں لکھوں، اب اگر کوئی ایسا شخص پیدا ہو جائے کہ وہ اعجاز کے سہارے آتی تیزی کے ساتھ لکھے کہ وہ ایک گھنٹے یا اُس سے بھی کم وقت میں لکھی جائے، تو یہ محال عقلی نہیں ہے، یہ خلافت معمول ہے (فرمائیے گا)۔ ہر حال معجزات کے بارے میں عاجلانہ فیصلے اور خدا نخواستہ ان کو خرافات کہنا منطق اور عقل سے دور ہے، محض ایک چیز جو کبھی کبھی الے

افکار کو جنم دیتی ہے یہ ہے کہ ہم معمول کی علت و معلول کے نوکر ہو گئے ہیں۔ یہاں تک کہ ہم ان کو ایک ضرورت قرار دینے لگ گئے ہیں۔ کچھ اس کے خلاف ہو اسے مخالف ضرورت سمجھنے لگے ہیں، حالانکہ ان طبعی اور عادی علت و معلول کی شکل ہرگز بھی ضرورت کا پہلو نہیں اور اس بات میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ مافوق طبیعت عامل ان میں تبدیلیاں پیدا کر دے۔

۲۔ چیزوں کی فوق العادت استعداد : مسلحہ طور پر جس دن حضرت موسیٰؑ نے ہیرا ہوں والی وہ لاطھی اپنے لیے منتخب کی وہ یہ نہ جانتے تھے کہ یہ سادہ سا وجود خدا کے حکم سے اتنا عظیم کام کرے گا۔ اس طرح سے کہ فرعون کی قدرت کو درہم و برہم کر کے رکھ دے لیکن خالصتہً اسے دکھایا کہ اسی سادہ سے وسیلے کے ذریعہ ایسی خارق العادت قوت پیدا کی جاسکتی ہے۔ یہ دراصل تمام انسانوں کے لیے ایک درس ہے کہ وہ اس دنیا میں کسی چیز کو معمولی نہ سمجھیں۔ کئی دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ جن چیزوں یا افراد کو ہم حقارت سے دیکھ رہے ہوتے ہیں ان کے اندر ایک عظیم طاقت پنہاں ہوتی ہے کہ جس سے ہم بے خبر ہوتے ہیں۔

۳۔ تورات اس بارے میں کیا کہتی ہے : زیر بحث آیات میں بیان ہوا ہے کہ موسیٰؑ نے جس وقت اپنے ہاتھ کو گریبان سے باہر نکالا تو وہ بلا کسی عیب کے سفید اور روشن تھا۔ ممکن ہے یہ جملہ اس تعبیر کی نفی کے لیے ہو جو تورات میں تحریف شدہ دکھائی دیتا ہے چونکہ اس موجودہ تورات میں اس طرح لکھا ہے :

اور خدا نے پھر اس سے کہا : اب تو اپنے ہاتھ کو اپنی بغل میں دے لے، تو موسیٰؑ نے اپنے ہاتھ کو بغل میں دے لیا، اور پھر اس کو باہر نکالا، تو اس کا ہاتھ برف کی مانند مبروص تھا۔

کلمہ "مبروص" "برص" کے مادہ سے کوڑھ کے معنی میں ہے جو ایک قسم کی بیماری ہے، اور مسلحہ طور پر اس تعبیر کا اس موقع پر استعمال غلط اور ناجائز ہے۔

۲۳۔ اِذْ هَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّهُ طَغٰ ۝

۲۵۔ قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ ۝

۲۶۔ وَاٰتِنِيْ اَمْرِيْ ۝

۲۷۔ وَاَحْلِلْ عُقْدَهُ مِنْ لِّسَانِيْ ۝

۲۸۔ يَفْقَهُوا قَوْلِيْ ۝

۲۹۔ وَاجْعَلْ لِّيْ زَنْبِيًْا مِّنْ اٰمِلِيْنَ ۝

۳۰۔ هٰرُونَ اَخِيْ ۝

۱۔ اس کے بارے میں ہم نے جلد ۱، باب ۱ پر بھی بات کی ہے۔

۲۔ تورات سفر خروج فصل ۴۰، جلد ۶۔

۳۱۔ اَشْدُّ دَبِّهٖ اَزْرٰی ۝

۳۲۔ وَاَشْرِكُهُ فِيْ اَمْرِيْ ۝

۳۳۔ كَيْ تَسْبِكَ كَثِيْرًا ۝

۳۴۔ وَنَذْكُرَكَ كَثِيْرًا ۝

۳۵۔ اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِيْرًا ۝

۳۶۔ قَالَ قَدْ اُوْتِيتَ سُوْلُكَ يٰمُوسٰی ۝

ترجمہ

۲۴۔ فرعون کے پاس جا کہ وہ سرکش ہو گیا ہے۔

۲۵۔ عرض کیا، پروردگار! میرے سینے کو کشادہ کر دے۔

۲۶۔ میرے کام کو مجھ پر آسان کر دے۔

۲۷۔ اور میری زبان کی گرہ کو کھول دے۔

۲۸۔ تاکہ وہ میری باتوں کو سمجھیں۔

۲۹۔ میرے خاندان میں سے میرا ایک وزیر قرار دے۔

۳۰۔ میرے بھائی ہارون کو۔

۳۱۔ اس کے ذریعے میری کمر کو مضبوط کر دے۔

۳۲۔ اور اسے میرے کام میں شریک کر دے۔

۳۳۔ تاکہ ہم تیری بہت بہت تسبیح کریں۔

۳۴۔ اور تجھے بہت بہت یاد کریں۔

۳۵۔ کیونکہ تو ہمیشہ ہماری حالت سے آگاہ رہا ہے۔

۳۶۔ فرمایا : اے موسیٰؑ تو نے جتنی درخواستیں کیں وہ سب کی سب تجھے عطا کر دی گئیں۔

تفسیر

موسیٰؑ کے بچے تلکے تقاضے :

نام زبان رسالت صادر ہوتا ہے، ایسی رسالت کہ جو بہت ہی عظیم اور سنگین ہے۔ ایسی رسالت جو علاقے کے طاقتور ترین اور طاقتور ترین لوگوں کو زبان الہی پہنچانے سے شروع ہوتی ہے۔ اللہ فرماتا ہے: فرعون کی طرف جا کر وہ سرکش ہو گیا ہے (اذہب الی فرعون انہ طغی)۔

ہاں ایک فاسد اور غراب شدہ ماحول کی اصلاح اور ہر جہت سے ایک انقلاب برپا کرنے کے لیے فساد کے سرخون اور کنرے سرخون سے کام شروع کرنا چاہیے، ایسے لوگوں سے کہ جو معاشرے کے تمام لوگوں میں انڈر سٹون رکھتے ہیں اور وہ خود یا ان کے افکار و نظریات یا ان کے اخلاق و انصاف ہر جگہ موجود ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ کہ جنہوں نے تمام تبلیغی، نشریاتی، اقتصادی اور سیاسی اداروں کو اپنے قبضہ میں لیا ہوا ہے۔ اگر ان کی اصلاح ہو جائے یا اصلاح نہ ہونے کی صورت میں وہ جڑ سے اکھاڑ پھینکے جائیں تو معاشرے کی نجات کی امید کی جاسکتی ہے، ورنہ جس قسم کی بھی اصلاح ہوگی، وہ وقتی، سطحی اور ناپائیدار ہوگی۔

یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ: فرعون سے شروع کرنے کے لازم ہونے کی دلیل، ایک مختصر سے جملہ "انہ طغی" (اس نے طغیان کیا ہے) میں بیان ہوئی ہے کہ اس کلمہ "طغیان" میں سب کچھ جمع ہے، ہاں طغیان و سرکشی بھی اور زندگی کے تمام شعبوں میں حد سے تجاوز بھی، اور اسی بنا پر اس قسم کے افراد کو "طاغوت" کہا جاتا ہے کہ جو اسی مادہ سے لیا گیا ہے۔

موتیٰ — اس قسم کی سنگین ماموریت پر نہ صرف گھبراتے نہیں، بلکہ موتی کی سختی کے لیے بھی خدا سے درخواست نہ کی، اور کہنے دل سے اس کا استقبال کیا۔ زیادہ سے زیادہ اس ماموریت کے سلسلے میں کامیابی کے وسائل کی تلاش سے درخواست کی اور چونکہ کامیابی کا پہلا ذریعہ عظیم روح، فکر بلند اور عقل توانا ہے، اور دوسرے لفظوں میں سینہ کی کشادگی و شرف صدر ہے، لہذا:

ہاں! ایک رہبر انقلاب کا سب سے اذلیل سرمایہ، کشادہ دل، فراوان حوصلہ استقامت و بردباری اور مشکلات کے بوجھ کو اٹھانا ایسی بنا پر امیر المؤمنین علی علیہ السلام سے ایک حدیث میں منقول ہے کہ:

ألة الرئاسة سعة الصدر

سینہ کی کشادگی رہبری و قیادت کا وسیلہ ہے۔

(شرح صدر اور اس کے مفہوم کے بارے میں ہم اس تفسیر کی جلد ۵ میں سورہ انفام کی آیہ ۲۵ کے ذیل میں بھی بحث کر چکے ہیں)۔ اور چونکہ اس راستے میں بے شمار مشکلات ہیں، جو خدا کے لطف و کرم کے بغیر حل نہیں ہوتیں، لہذا خدا سے دوسرا سوال یہ کیا کہ میرے کاموں کو مجھ پر آسان کر دے اور مشکلات کو راستے سے ہٹا دے۔ آپ نے عرض کیا: میرے کام کو آسان کرنے (ویسر لی امری) اس کے بعد جناب موتیٰ نے زیادہ سے زیادہ قوت بیان کا تقاضا کیا۔ کہنے لگے میری زبان کی گرہ کھول دے۔ (واحلل عقدة من لساني)۔

یہ ٹیک ہے کہ شرح صدر کا ہونا بہت اہم بات ہے، لیکن یہ سرمایہ اسی صورت میں کام دے سکتا ہے، جب اس کو ظاہر کرنے کی قدرت بھی کامل طور پر موجود ہو۔ اسی بنا پر جناب موتیٰ نے شرح صدر اور کادوں کے ذریعے کی درخواستوں کے بعد یہ خاص کیا کہ خدا ان کی زبان کی گرہ کھول دے۔

اللہ تعالیٰ علما و علماء کو ہدایت فرمائے۔ آمین

اور خصوصیت کے ساتھ اس کی علت یہ بیان کی، تاکہ وہ میری باتوں کو سمجھیں (یفقہوا قولی)۔

یہ جملہ حقیقت میں پہلی آیت کی تفسیر کر رہا ہے اور اس سے یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ زبان کی گرہ کے کھلنے سے مراد یہ نہ تھی کہ موتیٰ کی زبان میں بچپن میں جل جانے کی وجہ سے کوئی گنت آگئی تھی — جیسا کہ بعض مفسرین نے ابن عباس سے نقل کیا ہے — بلکہ اس سے گفتگو میں ایسی رکاوٹ ہے جو سننے والے کے لیے سمجھنے میں مانع ہوتی ہے، یعنی میں ایسی فصیح و بلیغ اور ذہین میں بیٹھ جانے والی گفتگو کروں کہ ہر سننے والا میرا مقصد اچھی طرح سے سمجھ لے۔

سورہ قصص کی آیہ ۲۴ اس تفسیر کی شاہد ہے:

واخى هارون هوا فصيح منى لسانا

میرے بھائی ہارون کی زبان مجھ سے زیادہ فصیح ہے۔

یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ "افصح" کے مادہ سے دراصل کسی چیز کے زائد باتوں سے پاک ہونے کے معنی میں ہے۔ بعد میں ایسی گفتگو، کے لیے استعمال ہونے لگا جو مفید، رسا، منہ بولتی اور ہر غرض ضروری چیز سے پاک ہو۔

ہر حال ایک کامیاب رہبر و رہنما وہ ہوتا ہے کہ جو سچی فکر اور قدرتِ روح کے علاوہ ایسی فصیح و بلیغ گفتگو کر سکے کہ جو ہر قسم کے ابہام اور نارسائی سے پاک ہو۔

نیز اس بار سنگین کے لیے — یعنی رسالت الہی، رہبری بشر اور طاغوتوں اور جابرین کے ساتھ مقابلے کے لیے یار و مددگار کی ضرورت ہے اور یہ کام تنہا سر انجام دینا ممکن نہیں ہے لہذا حضرت موتیٰ نے پروردگار سے جو حقیقی درخواست کی وہ یہ تھی: خداوند! میرے لیے میرے خاندان میں سے ایک وزیر اور مددگار قرار دے (واجعل لی وزیرا من اہلی)۔

"وزیر" کے مادہ سے دراصل سنگین بوجھ کے معنی میں ہے اور چونکہ وزیر نظامِ مملکت میں بہت بھاری بوجھ اٹھاتے ہیں لہذا یہ لفظ ان کے لیے بولا جانے لگا۔ نیز لفظ "وزیر" کا معاون اور یار و مددگار پر بھی اطلاق ہوتا ہے۔

البتہ یہ بات کہ حضرت موتیٰ تقاضا کر رہے ہیں کہ یہ وزیر ان ہی کے خاندان سے ہو، اس کی دلیل واضح ہے۔ چونکہ اُس کے بارے میں معرفت اور شناخت بھی زیادہ ہوگی اور اس کی ہمدردیاں بھی دوسروں کی نسبت زیادہ ہوں گی۔ کتنی اچھی بات ہے کہ انسان کسی ایسے شخص کو اپنا شریک کار بنائے کہ جو روحانی اور جسمانی رشتوں کے حوالے سے اُس سے مربوط ہو۔

اس کے بعد خصوصی طور پر اپنے بھائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عرض کیا: یہ ذمہ داری میرے بھائی ہارون کے سپرد کر دے۔ (هارون اخي)۔

ہارون بعض مفسرین کے قول کے مطابق حضرت موتیٰ کے بڑے بھائی تھے اور ان سے تین سال بڑے تھے۔ بلند قامت، فصیح البیان اور اعلیٰ علمی قابلیت کے مالک تھے۔ انہوں نے حضرت موتیٰ کی وفات سے تین سال پہلے رحلت فرمائی۔

وہ پتیلیر مرسل تھے جیسا کہ سورہ مومنون کی آیہ ۴۵ میں بیان ہوا ہے:

شمار سنا موسیٰ و اخاہ ہارون بایاتنا و سلطان مبین

اور وہ نور اور باطنی روشنی کے بھی حامل تھے، اور حق و باطل میں خوب تمیز بھی رکھتے تھے۔ جیسا کہ سورہ انبیاء کی آیہ ۴۸ میں بیان ہوا ہے:

ولقد اتینا موسیٰ و ہارون الفکران و ضیاء

آخری بات یہ ہے کہ وہ ایک ایسے پیغمبر تھے جنہیں خدا نے اپنی رحمت سے موسیٰ کو بخشا تھا:

ووهبنا لہ من رحمنا الخاء ہارون نبیاً (نجم - ۵۳)

وہ اس بھاری ذمہ داری کی انجام دہی میں اپنے بھائی موسیٰ کے دوش بدوش معروف کار رہے۔

یہ شیک ہے کہ موسیٰ نے اس اندھیری رات میں، اس وادی مقدس کے اندر، جب خدا سے فرمان رسالت کے ملنے کے وقت یہ تقاضا کیا، تو وہ اُس وقت دس سال سے بھی زیادہ اپنے وطن سے دور گزار کر رہے تھے، لیکن اصولی طور پر اس عرصہ میں بھی اپنے بھائی کے ساتھ ان کا رابطہ کامل طور پر منقطع نہ ہوا۔ اسی لیے اس صراحت اور وضاحت کے ساتھ ان کے بارے میں بات کر رہے ہیں اور خدا کی درگاہ سے اس عظیم مشن میں اس کی شرکت کے لیے تقاضا کر رہے ہیں۔

اس کے بعد جناب موسیٰ ہارون کو وزارت و معاونت پر متعین کرنے کے لیے اپنے مقصد کو اس طرح بیان کرتے ہیں: خداوند! میری پشت اس کے ذریعے مضبوط کر دے۔ (اشد ذبہ اذری)۔

”ازر“ دراصل ”ازار“ کے مادہ سے لباس کے معنی میں لیا گیا ہے، خاص طور پر اس لباس کو کہا جاتا ہے جس کے بند کی کمر میں گرہ لگائی جاتی ہے۔ اسی سبب سے کبھی یہ لفظ ”کمر“ پر یا ”قوت“ و ”قدرت“ کے معنی میں بھی آتا ہے۔

اس مقصد کی تکمیل کے لیے یہ تقاضا کرتے ہیں: اسے میرے کام میں شریک کر دے (واشکوہ فی امری)۔

وہ مرتبہ رسالت میں بھی شریک ہو اور اس عظیم کام کو رو بہ عمل لانے میں بھی شرکت کرے۔ البتہ حضرت ہارون ہر حال میں تمام پروگراموں میں جناب موسیٰ کے پیرو تھے اور موسیٰ ان کے امام و پیشوا کی حیثیت رکھتے تھے۔

آخر میں اپنی تمام درخواستوں کا نتیجہ اس طرح بیان کرتے ہیں: تاکہ ہم تیری بہت بہت تسبیح کریں (کی نبجاک کثیرا)۔

اور تجھے بہت بہت یاد کریں (ونذ کک کثیرا)۔

کیونکہ ہم ہمیشہ ہی ہمارے حالات سے آگاہ رہا ہے (انک کنت بنا بصیرا)۔

تو ہماری ضروریات و حاجات کو اچھی طرح جانتا ہے اور اس راستے کی مشکلات سے ہر کسی کی نسبت زیادہ آگاہ ہے، ہم تجھ سے یہ چاہتے ہیں کہ تو ہمیں اپنے فرمان کی اطاعت کی قدرت عطا فرما دے اور ہمارے فرائض، ذمہ داریوں، اور فرائض کے انجام دینے کے لیے ہمیں توفیق اور کامیابی عطا فرما۔

چونکہ جناب موسیٰ کا اپنے مخلصانہ تقاضوں میں سوائے زیادہ سے زیادہ اور کامل تر خدمت کے اور کچھ مقصد نہیں تھا، لہذا خدا نے ان کے تقاضوں کو اسی وقت قبول کر لیا: ”اُس نے کہا: اے موسیٰ! تمہاری تمام درخواستیں قبول ہیں“ (قال قد اوتیت سؤلک یا موسیٰ)۔

حقیقت میں ان حساس اور تقدیر ساز لحظات میں چونکہ موسیٰ پہلی مرتبہ خدا سے عظیم کی بساط دہانی پر قدم رکھ رہے تھے، لہذا جس چیز کی انہیں ضرورت تھی ان کا خدا سے کشا ہی تقاضا کر لیا، اور اُس نے بھی عین ان انتہائی احترام کیا، اور اس کی تمام درخواستوں اور تقاضوں کو ایک مختصر سے جملے میں حیات بخش ندا کے ساتھ قبول کر لیا اور اس میں کسی قسم کی قید و شرط عائد کی اور موسیٰ کا نام مقرر لاکر، ہر قسم کے اہام کو دور کرتے ہوئے اس کی تکمیل کر دی، یہ بات کس قدر شوق انگیز اور افتخار آفرین ہے کہ بندے کا نام مولا کی زبان پر بار بار آئے۔

چند اہم نکات:

۱۔ انقلاب کی رہبری کی شرائط: اس میں شک نہیں کہ انسانی معاشرہ میں بنیادی تبدیلیاں اور مادی اور شرک الود قدول کی معنوی اور انسانی قدروں میں تبدیلی، خاص طور پر ایسے مقام پر کہ جس کا راستہ فرعونوں اور خود سر لوگوں کی قہر سے بھر گزرتا ہو، کوئی آسان کام نہیں ہے۔ ایسا کام روحانی و جسمانی آمادگی، قدرت فکر اور قوت بیان راستے سے آگاہی، خدائی امداد و نیز قابل الطینانہ ہمارے یاور و مددگار کا محتاج ہوتا ہے۔

یہ وہی امور ہیں جن کا حضرت موسیٰ نے اس عظیم رسالت کے آغاز میں ہی خدا سے تقاضا کیا۔

یہ امور خود یہ بات واضح کرتے ہیں کہ موسیٰ نبوت سے پہلے بھی بیدار اور آمادہ روح رکھتے تھے اور یہ امور اس حقیقت کو بھی واضح کر رہے ہیں کہ وہ اپنی ذمہ داریوں سے ہر جہت سے اچھی طرح واقف تھے اور وہ یہ جانتے تھے کہ ان حالات میں کن ہتھیاروں کے ساتھ میدان میں آنا چاہیے تاکہ فرعونی نظام کے ساتھ مقابلے کی طاقت موجود ہو۔

اور یہ ہر زمانے میں، تمام خدائی رہبروں اور اس راستے کے تمام راہرو افراد کے لیے ایک نمونہ ہے۔

۲۔ سرکشوں کے خلاف جنگ: اس میں شک نہیں کہ فرعون میں بہت سی انحرافی باتیں موجود تھیں۔ وہ کافرتھا، بُت پرست تھا، ظالم اور بیدار تھا، وغیرہ وغیرہ لیکن قرآن نے ان تمام انحرافات میں سے صرف اس کے ”ظلمان“ کا ذکر کیا ہے: (انہ ظلمی) کیونکہ خدا کے فرمان سے ظلمیان اور سرکشی کی روح ان تمام انحرافات کا بخور اور ان سب باتوں کی جامع ہے۔

ضمنی طور پر یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ پہلے مرحلے میں انبیاء کا جہف و مقصد طاغوتوں اور سرکشوں سے مقابلہ ہوتا ہے اور مارکسٹ مذہب کا جو تجزیہ کرتے ہیں یہ بات اس کے سراسر خلاف ہے۔ کیونکہ وہ مذہب کٹھنیاں گروں اور استعمار پیشہ لوگوں کا خدمت گار سمجھتے ہیں۔

لیکن ہے ان کی یہ باتیں خود ساختہ غیر معقول مذہب کے بارے میں صحیح ہوں۔ لیکن سچے انبیاء کی تاریخ، مذہب آسمانی کے بارے میں ان کے بے ہودہ خیالات کی پوری صراحت کے ساتھ سو فیصد نفی کرتی ہے۔ اس سلسلے میں موسیٰ بن عمران کا قیام خاص طور پر ایک شاہد ناقل ہے۔

۳۔ ہر کام کے لیے پروگرام اور وسائل کی ضرورت ہے: حضرت موسیٰ کی زندگی کا یہ حصہ ہمیں جو دوسرا سبق دیتا ہے وہ یہ ہے کہ انبیاء و مرسلین تک بھی اپنے کاموں کی پیش رفت کے لیے اتنے عہدات رکھنے کے باوجود عام وسائل سے مدد لیتے تھے۔ مژدہ و بیان رسا کے ذریعہ بھی اور معاونین کی فکری و جسمانی قوت و طاقت سے بھی۔

یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم زندگی میں ہمیشہ سعادت کی انتظار میں رہیں بلکہ پرگرام اور وسائل کا کوئی تیار کرنا چاہیے۔ اور طبعی طور پر پیش رفت کو جاری رکھنا چاہیے اور جہاں کاموں میں رکاوٹ پڑ جائے تو وہاں خدائی لطف و کرم کا انتظار کرنا چاہیے۔

۴۔ تبلیغ اور ذکر: جیسا کہ زیر نظر آیات میں ہے کہ حضرت موسیٰ اپنی درخواستوں کا اصلی مقصد یہ قرار دیتے ہیں کہ: تیرے سے زیادہ تبلیغ کریں اور تجھے بہت بہت یاد کریں۔

یہ بات واضح ہے کہ "تبلیغ" کے معنی خدا کو "شکر اور امکانی نقائص" کی تمت سے منزہ و ممتاز قرار دینا ہے اور یہ بات واضح ہے کہ جناب موسیٰ کی مراد یہ تھی کہ "سبحان اللہ" کے جملے کی مسلسل تکرار کرتے رہیں بلکہ اصل مقصد اس زمانہ کے آلودہ معاشرے اس کی حقیقت کو رد یہ عمل لانا تھا یعنی بتوں کو ختم کرنا، بت خالوں کو دھونے کرنا، ذہنوں کو شرک آلود افکار سے پاک کرنا اور مادی و مبنی کو دور کرنا۔ یہ تھی ان کے نزدیک تبلیغ اور یہ تھا ان کے قرن و کرا الہی۔ اس راستے سے گزر کر وہ ذکر خدا، اس کی یاد اور اس کی صفات کی یاد دلوں میں زندہ کرنا چاہتے تھے اور صفات خداوندی کو معاشرے، پر سایہ فگن کرنا چاہتے تھے۔ لفظ "کثیراً" کا استعمال اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ وہ اسے عمومی شکل دینا چاہتے تھے اور ایک محدود دائرے میں مخصوص رہنے سے نکالنا چاہتے تھے۔

۵۔ پیغمبر اسلامؐ بھی موسیٰ کے تقاضوں کی تکرار کرتے ہیں: ان روایات سے کہ جو علمائے اہلسنت کی کتابوں میں بیان ہوئی ہیں اور شیعہ علماء کی کتابوں میں بھی وارد ہوئی ہیں، یہ معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ نے بھی انہی وسائل کی، جو حضرت موسیٰؑ اپنے مقاصد کی پیش رفت کے لیے خدا سے چاہے تھے، تمنا کی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ آپؐ نے ہارونؑ کے نام کی جگہ علیؑ علیہ السلام نام لیا اور اس طرح عرض کیا:

"اللہم اِنِّی اَسْأَلُکَ بِمَا سَأَلَکَ اَخِیْ مُوسٰی اِنْ تَفْجِ لِیْ صَدْرِیْ وَاِنْ تَفْجِ لِیْ اَمْرِیْ وَاِنْ تَحْلِلْ عَقْدَہٗ مِنْ لِسَانِیْ، یَفْقَہُوْا قَوْلِیْ، وَاجْعَلْ لِیْ وَزِیْرًا مِنْ اَہْلِیْ، عَلِیًّا اَخِیْ، اَشَدَّ دَبَّہٗ اَزْرِیْ، وَاشْرَکَہٗ فِیْ اَمْرِیْ کِیْ تَنْجِعَکَ کَثِیْرًا وَتَذْکُرَکَ کَثِیْرًا، اِنَّکَ کُنْتَ بِنَابِصِیْرًا

پروردگارا! میں بھی تجھ سے وہی سوال کرتا ہوں جس کا میرے بھائی موسیٰ نے تجھ سے تقاضا کیا تھا، میں تجھ سے یہ چاہتا ہوں کہ تو میرے سینے کو کشادہ رکھ، کاموں کو مجھ پر آسان کر دے، میری زبان کی گرہ کھول دے تاکہ وہ میری باتوں کو سمجھیں میرے لیے میرے خاندان میں سے ایک وزیر قرار دے، میرے بھائی علیؑ (علیہ السلام) کو، خداوند میری پشت کو اس کے ذریعے مضبوط کر دے اور اسے میرے کام میں شریک کر دے تاکہ ہم تیری بہت بہت تسبیح کریں اور تجھے بہت بہت یاد کریں کیونکہ تو ہمارے حال سے اچھی طرح آگاہ ہے۔"

اس حدیث کو سیوطی نے تفسیر و النشر میں اور مزم طبرسی نے مجمع البیان میں اور بہت سے دوسرے شیعہ بزرگ ملائے کچھ تفادات کے ساتھ نقل کیا ہے۔

اسی حدیث سے مشابہ حدیث منزلت ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علیؑ علیہ السلام سے فرمایا:

"الَا تَرْضٰی اَنْ تَکُوْنَ مِنْ مِصْرَئَیْلَہٗ هَارُوْنَ مِنْ مُوسٰی اَلَا اِنَّہٗ لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ" کیا تم اس بات سے راضی نہیں ہو کہ تمہیں مجھ سے وہی نسبت ہے جو ہارونؑ کو موسیٰؑ سے تھی، سوائے اس کے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔

یہ حدیث جو اہل سنت کی پہلے درجے کی کتب میں بیان ہوئی ہے اور (تفسیر الریزان کے مطابق) محدث ہارون نے اپنی کتاب "غایت المرام" میں اہل سنت کے طرق سے شرطیوں سے اور شیعہ طرق سے شرطیوں سے نقل کیا ہے، اس قدر معتبر ہے کہ اس میں کسی قسم کے انکار کی گنجائش ہی نہیں ہے۔

ہم نے حدیث منزلت کے بارے میں تفسیر نمونہ کی چوتھی جلد میں سورہ اعراف کی آیہ ۱۴۲ کے ذیل میں کافی بحث کی ہے۔ لیکن جس بات کا ذکر کرنا ہم یہاں ضروری سمجھتے ہیں وہ یہ ہے کہ بعض محققین نے (جیسا کہ آدنی نے روح المعانی میں) اصل روایت کو قبول کرنے کے ساتھ اس کی دلالت میں اعتراض کیا ہے اور یہ کہا ہے کہ جملہ (واشرکہ فی امری) اس کو میرے کام میں شریک کر دے، لوگوں کو حق کی طرف دعوت دینے اور ہدایت کرنے کے کاموں میں شرکت کرنے کے سوا اور کسی چیز کو ثابت نہیں کرتا۔ لیکن یہ بات صاف طور پر ظاہر ہے کہ مسئلہ ہدایت و ارشاد میں شرکت، اور دوسرے نفعوں میں امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور حق کی دعوت کو پھیلانا ہر مسلمان کا فرائض فریضہ ہے، اور یہ کوئی ایسی چیز نہیں تھی کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، علیؑ علیہ السلام کے متعلق مانگتے یہ تو ایک توضیح واضح ہے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس دعا کی ہرگز یہ تفسیر نہیں کی جاسکتی۔

دوسری طرف ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اس سے امر نبوت میں شرکت بھی مراد نہیں تھی۔ بنا بریں ہم اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ یہ نبوت کے علاوہ ارشاد و ہدایت کے عمومی فریضہ کے سوا کوئی اور خاص مقام و منصب تھا۔ تو کیا یہ ولایت خاصہ کے مسئلہ کے سوا کوئی اور چیز ہو سکتی ہے؟ کیا یہ وہی خلافت (ایک خاص مفہوم میں جس کے شیعہ قائل ہیں) نہیں ہے؟ اور لفظ "وزیراً" بھی اسی کی تائید اور تقویت کرتا ہے۔

دوسرے نفعوں میں کچھ ذمہ داریاں ایسی ہیں کہ جو تمام لوگوں کا کام نہیں ہے اور وہ ہیں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہر قسم کی تحریف و انحراف سے بچانا اور اس کی حفاظت کرنا اور دین کے مناجیم کے بارے میں ہر قسم کے ابہام کی جو بعض کو لاحق ہو جاتا ہے، تفسیر کرنا اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی غیبت میں اور ان کے بعد امت کی رہبری کرنا اور پیغمبر اکرمؐ کے مقاصد کی پیش رفت کے لیے انتہائی خوش طبعی سے کمک اور مدد کرنا ہے۔ یہ سب کی سب وہی چیزیں ہیں کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے "واشرکہ فی امری" کا جملہ کہہ کر خدا سے علیؑ کے بارے میں مانگی تھیں۔

اور اس سے یہ بات واضح و روشن ہو جاتی ہے کہ ہارونؑ کا موسیٰؑ سے پہلے وفات پا جانا اس بحث میں کوئی مشکل پیدا نہیں کرتا کیونکہ خلافت و جانشینی کبھی تو سیر کی غیبت کے زمانے میں جوتی ہے جیسا کہ ہارونؑ موسیٰؑ کی غیبت میں ان کے خلیفہ و جانشین تھے اور کبھی ہارونؑ کی وفات کے بعد جوتی ہے جیسا کہ علیؑ علیہ السلام پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد جانشین ہوئے۔ دونوں ایک ہی قدر مشرک اور ایک ہی قدر جامع رکھتے ہیں اگرچہ ان کے مصداق مختلف ہیں (مغور کیجئے گا)۔

۳۷۔ وَلَقَدْ مَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً أُخْرَى ۝

۳۸۔ إِذْ أَوْحَيْنَا إِلَىٰ أَمَلِكَ مَا يُؤْوِي ۝

۳۹۔ اِنْ اَقْذَفِيْهِ فِي التَّابُوْتِ فَاَقْذِفِيْهِ فِي الْيَمِّ فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ يَأْخُذْهُ عَدُوٌّ لِّىْ وَعَدُوٌّ لَّهِ ۚ وَالْقِيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّىْ ۚ وَلَوْلَا صَنِْعُ عَلٰى عَيْنِىْ ۝

۴۰۔ اِذْ تَمْشِىْ اُخْتُكَ فَتَقُوْلُ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى مَن يَّكْفُلُهَا فَرَجَعْنَاكَ اِلٰى اَمَلِكَ لِي تَمَرَّعَيْنَهَا وَلَا تَحْزَنَ ۚ وَكَلَّمْتُ نَفْسًا فَنَجَّيْتُكَ مِنَ الْغَمِّ وَفَتَنَّاكَ فُتُوْنًا ۚ فَلَبِثْتَ سِنِيْنَ فِيْ اَهْلِ مَدْيَنَ ثُمَّ جِئْتَ عَلٰى قَدَرٍ يُّمُوْسٰى ۝

۴۱۔ وَاَصْرَطْنٰكَ لِنَفْسِىْ ۝

ترجمہ

۳۷۔ اور ایک مرتبہ اور بھی ہم نے تم پر احسان کیا تھا۔

۳۸۔ اس وقت جبکہ ہم نے تیری ماں کو وہ دجی کی تھی جس کی ضرورت تھی۔

۳۹۔ کہ تم اسے صندوق میں ڈال دو اور اس صندوق کو دیا میں بہادو تو دیا اسے کہ اسے پر جا لگائے گا (وہاں سے) میرا دشمن

اور اس کا دشمن اُسے اُٹھائے گا اور میں نے اپنی طرف سے تجھ پر محبت ڈال دی تھی تاکہ تم میری نگرانی میں پرورش کیے جاؤ۔

۴۰۔ اس وقت جبکہ تیری بہن (فرعون کے محل کے پاس) چل رہی تھی، اور کہہ رہی تھی، کیا میں تمہیں ایک ایسے گھر کی نشاندہی کروں جو اس نوبل و لوہے کے کفالت کرے۔ (اور وہاں اس کے لیے ایک اچھی دایہ ہے) تو پھر ہم نے تجھے تیری ماں کی طرف لوٹا دیا۔ تاکلاس کی آنکھیں تجھ سے ٹھنڈی رہیں اور وہ ٹھگین نہ ہو اور تو نے (فرعونوں میں سے) ایک شخص کو قتل کر دیا تو ہم نے تجھے غم و اندوہ سے نجات دی، اور تمہیں ہر طرح سے آزمایا۔ اس کے بعد تو کئی سال مدین کے لوگوں کے درمیان رہا پھر ایک معین وقت پر (فرمانِ رسالت کے حصول کے لیے) تو اس جگہ آیا۔

۴۱۔ اور میں نے تیری اپنے لیے پرورش کی۔

تفسیر

کتنا مہربان خدا ہے !

ان آیات میں خدا حضرت یوسفؑ کی زندگی کا ایک اور حصے کی طرف اشارہ کر رہا ہے جو ان کے بچپن کے دور اور فرعونوں کے غیض و غضب سے معجزانہ طور پر نجات پانے سے متعلق ہے۔ اگرچہ تاریخی تسلسل کے لحاظ سے یہ حصہ زندگی، رسالت و نبوت کے زمانے سے پہلے تھا لیکن چونکہ موسیٰؑ پر خدا کی نعمتوں کا، موسیٰؑ کی آغاز عمر سے بیان ہو رہا تھا۔ لہذا اہمیت کے اعتبار سے اسے موضوع رسالت سے دوسرے درجہ پر رکھا گیا ہے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے : اے موسیٰ ! ہم نے تجھ پر ایک مرتبہ پہلے بھی احسان کیا تھا اور تجھ کو اپنی نعمتوں سے نوازا تھا (ولقد مَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً أُخْرَى)۔

اس اجمال کے ذکر کے بعد اس کی تفصیل شروع کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے :

اس وقت جبکہ ہم نے تیری ماں کو وہ دجی کی تھی جس دجی کی اس وقت ضرورت تھی :

(إِذْ أَوْحَيْنَا إِلَىٰ أَمَلِكَ مَا يُؤْوِي)۔

۱۔ جیسا کہ ہم نے پہلے ہی بیان کیا ہے۔ لفظ "مَنَّ" اصل میں "مَن" سے لیا گیا ہے۔ اور یہ اُن بڑے بڑے پتھروں کے سختی میں ہے کہ جن کے ساتھ ذلن کیا جاتا ہے۔ اسی بنا پر ہر گز ہانفت بخشے کو منت کہتے ہیں، اور زیر بحث آیت میں یہی معنی ملا ہے اور اس کا یہ مفہوم ایک پرہیزگار و عارف و متواضع ہے لیکن اگر کوئی اپنے جھوٹے کام کو باتوں سے بڑا بنائے اور دوسرے پر احسان جھگڑائے تو یہ ایک بڑا کام ہے اور منت کا قابلِ مذمت مصداق ہے۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس روز، موسیٰ کے فرزندوں کے چٹکل سے نجات پانے کے لیے جس قدر بھائی کی ضرورت تھی وہ سب ہم نے موسیٰ کی ماں کو تعلیم کر دی تھی۔

کیونکہ جیسا کہ قرآن کی دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے۔ فرعون نے بنی اسرائیل کو بڑی سختی کے ساتھ دبا دبا ہوا تھا۔ خاص طور پر اس نے حکم دے رکھا تھا کہ بنی اسرائیل کے لوگوں کو پیدا ہوتے ہی قتل کر دو اور ان کو کینیزی کے لیے باقی رکھو۔ اس نے یہ حکم بنی اسرائیل کی قوت اور ان کی ضرورت کے اختلال سے بچنے کے لیے دے رکھا تھا یا تو رخنیں اور مغربین کی ایک جماعت کے قتل کے مطابق اس بچے کو وجود میں آنے سے روکنے کے لیے کہ جس کے بارے میں یہ پیشین گوئی کی ہوئی تھی کہ وہ بنی اسرائیل سے اٹھے گا، اور فرعون کا تحت حکومت اٹ کے رکھ دے گا۔

فرعون کے جاسوس بنی اسرائیل کے غلوں اور گھروں کی سختی کے ساتھ ٹکرانی کیا کرتے تھے اور لوگوں کی پیدائش کی اطلاع دارالحکومت کو دیا کرتے تھے اور وہ بھی بہت جلد انہیں ہلاک کر دیا کرتے تھے۔

بعض مغربین نے کہا ہے کہ ایک طرف تو فرعون یہ چاہتا تھا کہ بنی اسرائیل کی قوت کو ختم کر کے رکھ دے اور دوسری طرف ان کی نسل کے کلی طور پر خاتمہ پر بھی آمادہ نہیں تھا کیونکہ وہ اس کے لیے مہیا غلاموں کا کام دیتے تھے، لہذا اُس نے یہ حکم دے رکھا تھا کہ ایک سال کے پیدا ہونے والے بچوں کو زندہ رکھیں اور دوسرے سال کے لوگوں کو تہ تیغ کر دیں۔ اتفاق سے موسیٰ اس سال پیدا ہوئے جو لوگوں کے قتل عام کا سال تھا۔

بہر حال ماں نے محسوس کیا کہ اس کے نوزاد بچے کی جان خطرے میں ہے اور اسے وقتی طور پر مخفی رکھنے سے بھی مشکل حل نہیں ہوگی۔ ایسے وقت میں اُس خدا نے کہ جس نے اس بچے کو ایک عظیم قیام کے لیے نامزد کیا ہوا ہے، اس ماں کے دل میں الہام کیا کہ اسے اب ہمارے حوالے کر دو اور دیکھو کہ جو ہم اس کی کس طرح حفاظت کریں گے اور اسے تیری طرف واپس لوٹا دیں گے۔

موسیٰ کی ماں کے دل پر یہ الہام ہوا: تم اسے ایک صندوق میں ڈال دو اور صندوق کو دریا میں ڈال دو: (ان اقد فیہ فی التابوت فاقد فیہ فی البیہ)۔

”یہاں پر عظیم دریائے نیل کے معنی میں ہے کہ جس کی وسعت اور بہت زیادہ پانی کی وجہ سے کبھی اس پر سمندر کا اطلاق ہوتا ہے۔ “اقد فیہ فی التابوت“ (اس کو تابوت میں ڈال دو) کی تعبیر شاید اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ کسی قسم کے خوف اور دم کے بغیر دل کو مطمئن رکھو اور پوری جرات و استقامت سے اسے صندوق میں رکھ دو اور کسی قسم کی پروا کیے بغیر اسے دریائے نیل میں چھوڑ دو اور کسی قسم کا خوف نہ کھاؤ۔

لفظ ”تابوت“ کو کسی کے صندوق کے معنی میں ہے۔ بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ یہ ہمیشہ اُس صندوق کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جس میں مژدوں کو رکھا جاتا ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ اس کا ایک وسیع مفہوم ہے کہ جو بعض اوقات دوسرے صندوقوں پر بھی بولا جاتا ہے، جیسا کہ طابوت و جالوت کے واقعہ میں سورۃ بقرہ کی آیت ۲۴۸ کے ذیل میں بیان ہو چکا ہے۔

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے: دریا اس بات پر مامور ہے کہ اس کو ساحل پر ڈال دے تاکہ آخر کار میرا دشمن بھی اور اس کا

تفسیر نمونہ کی پہلی جلد، صفحہ ۳۵۶ (ادو ترجمہ) — کی طرف رجوع کریں۔

دشمن بھی اسے اٹھائے (اور اپنے دامن میں اس کی پرورش کرے) (فلیلقہ الیہ ویالساحل یاخذہ وعد ولہ)۔ یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ اس مقام پر لفظ ”عدو“ مکرر آیا ہے اور یہ درحقیقت فرعون کی خدا کے بارے میں بھی اور موسیٰ اور بنی اسرائیل کے بارے میں بھی دشمنی پر ایک تاکید ہے، اور یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جو شخص دشمنی اور عداوت میں اس حد تک پہنچا ہوا تھا اسی نے موسیٰ کی خدمت اور پرورش اپنے ذمہ لے لی تاکہ خاکی بشر اس بات کو اچھی طرح سمجھ لے کہ نہ صرف یہ کہ وہ فرمانِ خدا کے مقابلے میں کھڑا ہونے کی قدرت نہیں رکھتا، بلکہ خدا اس کے دشمن کی اسی کے ہاتھوں سے اور اُس کے دامن میں پرورش کرا سکتا ہے۔ اور جس وقت خدا ظالم سرکشوں کی نابودی کا ارادہ کرے، تو انہیں انہیں کے ہاتھوں سے نابود کر دے اور جو لوگ انہوں نے خود بھلائی ہے اسی کے ذریعے اُن کو ہلا کر رکھ دے، کسی عجیب قدرت کا مالک ہے وہ!

موسیٰ کو اس نشیب و فراز سے پر راستے میں ایک ڈھال کی ضرورت تھی لہذا خدا نے اپنی بھت کا سایہ اُن پر ڈال دیا۔ اس طرح سے کہ جو بھی انہیں دیکھے ان کا فریقتہ اور گردیدہ ہو جائے، نہ صرف یہ کہ ان کے قتل کیے جانے پر راضی نہ ہو بلکہ وہ اس بات پر بھی راضی نہ ہو کہ ان کا کوئی بال بھی بیکا ہو جائے، جیسا کہ قرآن ان آیات کو جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے:

میں نے اپنی طرف سے تیرے اوپر بھت ڈال دی (والقی علیک صحبۃ منی)۔

کتنی عجیب و غریب ڈھال ہے کہ جو بالکل دکھائی نہیں دیتی، لیکن فولاد اور لوہے سے بھی زیادہ مضبوط ہے۔

کہتے ہیں کہ موسیٰ کی دایہ آل فرعون میں سے تھی، اور اس کا یہ بچا ارادہ تھا کہ اس کی ولادت کی خبر جابر فرعون کے دربار میں جا کر دے، لیکن جب اس کی نگاہیں پہلی مرتبہ نوزاد کی آنکھوں پر پڑیں، تو اسے ایسے لگا جیسے اس کی آنکھوں میں ایک بجلی کووندی تھی جو جس نے دایہ کے دل کو دشمن و متوکر دیا اور وہ موسیٰ کی فریقتہ ہو گئی اور ہر قسم کا بڑا ارادہ اس کے دماغ سے نکل گیا۔

اس سلسلے میں ایک حدیث میں امام باقر علیہ السلام سے منقول ہے:

جب موسیٰ پیدا ہوئے اور ان کی والدہ نے دیکھا کہ یہ نوزاد لڑکا ہے تو اُن کے چہرے کا رنگ

اُڑ گیا، اس پر دایہ نے بچہ کو تیرا رنگ اس طرح سے کیوں زندہ ہو گیا تو، اُنہوں نے کہا مجھے

اس بات کا خوف ہے کہ میرے بیٹے کا سر قلم کر دیا جائے گا، لیکن دایہ نے کہا: تم ہرگز اس

قسم کا خوف نہ کرو۔

وکان موسیٰ لا یراہ احد الا احبہ

موسیٰ کی حالت یہ تھی کہ جو شخص بھی انہیں دیکھتا تھا ان سے محبت کرنے لگ جاتا تھا۔

اور یہی محبت کی وہ ڈھال تھی کہ جس نے ان کی فرعون کے دربار میں بھی پوری طرح حفاظت کی۔

اس آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: اس سے مقصد یہ تھا کہ تو میرے حضور میں میری (علم کی) نگاہوں کے سامنے پرورش پائے

(ولتضع علی عینی)۔

اس میں شک نہیں ہے کہ آسمان و زمین کا کوئی بھی ذرہ خدا کے علم سے پوشیدہ نہیں ہے اور سب اُس کی بارگاہ میں حاضر ہیں لیکن یہ تعبیر

لہ تراشتہیں، جلد ۲، ص ۳۵۸۔

اس جگہ ایک خاص عنایت کی طرف اشارہ ہے کہ جو خدا نے حضرت موسیٰ پر ان کی پرورش کے سلسلے میں کی۔

اگرچہ بعض مفسرین نے "ولتصنع علی عینی" کو حضرت موسیٰ کی شیر خوار و غیرہ کے زمانے تک محدود سمجھا ہے لیکن یہ بات ظاہر ہے کہ یہ جملہ ایک وسیع معنی رکھتا ہے اور اس میں ہر قسم کی پرورش و تربیت اور موسیٰ کا پروردگار کی خاص عنایت سے پرچہ رسالت اعلیٰ کے لائق اور اہل فناء تک شامل ہے۔

ان آیات اور قرآن مجید کی ان ہی جیسی دوسری آیات میں موجود قرآن سے اور روایات و تفسیر میں جو کچھ بیان ہوا ہے، اُس سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ موسیٰ کی ماں نے آخر کار وحشت و پریشانی کے ساتھ اس صندوق کو جس میں موسیٰ کو رکھا گیا تھا، دریائے نیل میں ڈال دیا۔ نیل کی موجوں نے اسے اپنے کندھوں پر اٹھالیا، ماں جو اس منظر کو دیکھ رہی تھی، وہ غم اور حسرت سے دیکھتی رہ گئی۔ لیکن خدا نے اس کے دل میں الہام کیا، کہ تم اپنے دل میں کسی قسم کا غم نہ کرو، ہم بالآخر اسے صبح و سالم تیری طرف لوٹا دیں گے۔

فرعون کا کل دریائے نیل کے ایک کنارے پر بنا ہوا تھا۔ ایک احتمال یہ ہے کہ اس غم پر ایک ایک شاخ اس کے محل کے اندر سے گزرتی تھی بانی کی وجہ سے موسیٰ کی نجات کے صندوق کو اپنے ساتھ اس شاخ کی طرف کھینچ لائیں۔ اس وقت فرعون اور اس کی بیوی پانی کے کنارے دریائے نیل کا نظارہ کر رہے تھے۔ اچانک اس پراسرار صندوق نے ان کی توجہ کو اپنی طرف موڑ لیا۔ فرعون نے اپنے لوگوں کو حکم دیا کہ صندوق کو پانی سے نکال لائیں۔ جب صندوق کو کھولا گیا تو انہوں نے انتہائی تعجب کے ساتھ اس میں ایک خوبصورت نومولود بچے کو دیکھا۔ اور یہ ایسی چیز تھی کہ جس کا انہیں گمان تک بھی نہ تھا۔

فرعون کو خیال آیا کہ ہونہ ہو یہ نومولود بچہ ضروری طور پر بنی اسرائیل میں سے ہے جو ماورین دربار کے خوف سے اس قسم کے انجام سے دوچار ہوا ہے، لہذا اس نے اس کے قتل کرنے کا حکم دے دیا لیکن اس کی بیوی جو بالآخر حقیقی وہ بچہ کی محبت میں گرفتار ہو گئی اور ایک ایسی پراسرار شعلہ اس نومولود بچہ کی آنکھ سے نکلی جو اُس عورت کے دل کی گہرائیوں میں اترتی چلی گئی اور اسے اپنا گرویدہ اور فریفتہ بنا لیا۔ اس نے فرعون کا وہاں پر لیا وہ کہہ رہی تھی یہ بچہ تو آنکھ کی شنک ہے۔ اُس نے تقاضا کیا کہ وہ اس بچے کے قتل سے باز آجائے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر اس نے درخواست کی کہ ہم اسے اپنا بیٹا بنا لیں اور اسے اپنے مستقبل کی امیدوں کے سرمایہ کے طور پر اپنے دامن میں پروان چڑھا لیں۔ آخر کار وہ بڑے اصرار سے اپنی بات کو بادشاہ کے دل میں بٹھانے میں کامیاب ہو گئی۔

دوسری طرف بچے کو بھوک لگ گئی۔ وہ دودھ کے لیے بے چین تھا، دربار ہے، آنسو بہا رہا ہے۔ فرعون کی بیوی سے اس کے آنسو دیکھے نہ گئے۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہ تھا کہ ملازمین دربار متناجلی ہو سکے دایہ کی تلاش میں نکلیں لیکن وہ جس دایہ کو بھی لے کر آئے، نومولود نے اس کا دودھ پینے سے انکار کر دیا کیونکہ خدا نے یہ مقدر کر دیا تھا کہ وہ اپنی ہی ماں کے پاس لوٹ کر جائے۔ ملازمین دربار پھر تلاش کے لیے نکلے، اور کسی اور دایہ کو لانے کے لیے دربار مارے مارے پھرتے گئے۔

اب ہم باقی داستان آیات کی زبانی بیان کرتے ہیں۔

ملائ ! اے موسیٰ ہم نے یہ مقدر کر دیا تھا کہ تم ہماری (علم کی) نگاہوں کے سلسلے پرورش پاؤ، اس وقت جب کہ تمہاری بہن (فرعون کے محل کے پاس سے) چلی جا رہی تھی اور ماں کے حکم کے مطابق تیرے حالات کی غرائی کر رہی تھی (اذ تھشی اختک)۔

وہ فرعون کے مامورین سے کہنے لگی: کیا میں تمہیں ایک ایسی عورت کا تعارف کراؤں، جو اس نومولود کی سرپرستی کر سکے (ختقول حل لکھو علی من یکفلہ)۔

اور شاید اُس نے یہ بھی کہا کہ اس عورت کا دودھ پاک و پاکیزہ ہے اور مجھے اطمینان ہے کہ یہ نومولود بچہ اس کا دودھ پلے لے گا۔ مامورین دربار اس پر بہت خوش ہوئے اور اس امید پر کہ شاید جس کی انہیں تلاش ہے، اس طریقے سے وہ مل جائے، اس کے ساتھ چل پڑے۔ موسیٰ کی بہن جو خود کو ایک اجنبی ظاہر کر رہی تھی اس نے ماں کو ساری مرکزیت سے آگاہ کیا، ماں بھی اپنے جوش و خروش کو قائم رکھتے ہوئے، محبت اور امید کا ایک طوفان دل میں لیے فرعون کے دربار میں آئی۔ انہوں نے بچے اس کی گود میں ڈال دیا۔ بچے نے ماں کی خوشبو سونچی۔ آشنا خوشبو۔ اچانک اس کے پستان کو جان شیریں کی طرح کپڑ لیا اور انتہائی شوق اور رغبت کے ساتھ دودھ پینے میں مشغول ہو گیا۔ حاضرین میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اور فرعون کی بیوی کی آنکھیں بھی خوشی اور شوق سے چمک اٹھیں۔

بعض کہتے ہیں کہ فرعون کو اس واقعے پر تعجب ہوا اور اس سے پوچھا کہ تو کون ہے کہ اس نومولود بچے نے تیرا دودھ قبول کر لیا ہے، جب کہ دوسری تمام عورتوں کو اُس نے رد کر دیا تھا؟ ماں نے جواب دیا کہ میں ایک ایسی عورت ہوں جس میں پاکیزہ خوشبو ہے اور میرا دودھ بہت اچھا ہے اور کوئی بچہ میرا دودھ رو نہیں کرتا۔

بہر حال فرعون نے بچے کو اس کے سپرد کر دیا اور اس کی بیوی نے اس کی حفاظت و غرائی کی بہت زیادہ تاکید کی اور اسے حکم دیا کہ وہ تھوڑے تھوڑے وقفے سے بچہ اسے دکھانے کے لیے لایا کرے۔

اس مقام پر قرآن کہتا ہے: ہم نے تجھے تیری ماں کے پاس لوٹا دیا، تاکہ اس کی آنکھیں تیری وجہ سے ٹھنڈی رہیں، اور اس کے دل میں کوئی غم نہ آنے پائے: (خرجناک الی امک کی تفسیر عینہا ولا تحزن)۔

اور پوری و جمعی اور آل فرعون کی طرف سے کسی قسم کا کوئی خطرہ محسوس نہ کرتے ہوئے، اطمینان کے ساتھ بچے کی پرورش کر سکے۔ مذکورہ بالا جملے سے یہ مطلب لیا جاسکتا ہے کہ فرعون نے بچے کو ماں کے سپرد کر دیا تاکہ وہ اُسے اپنے گھر لے جائے لیکن فطری طور پر ایسا بچہ جو فرعون کا منسوب لایا گیا ہو اور اس کی بیوی اُسے بہت ہی زیادہ چاہتی ہو اس کا تھوڑے تھوڑے وقفے سے اُنہیں دکھانے کے لیے لانا ضروری تھا۔

سالہا سال گز گئے اور موسیٰ نے خدا کے لطف و محبت کے سائے اور امن و امان کے ماحول میں پرورش پائی اور رفتہ رفتہ وہ جوان ہونے لگے۔

ایک دن موسیٰ ایک راستے سے گزر رہے تھے کہ دو آدمیوں کو اپنے سامنے لڑتے جھگڑتے دیکھا۔ اُن میں سے ایک بنی اسرائیل میں سے تھا اور دوسرا قبطیوں (مصریوں اور فرعون کے ہوا خواہوں) میں سے بنی اسرائیل ہمیشہ ہی ظالم قبطیوں کے دباؤ اور تشدد کا شکار رہے تھے۔ ان میں سے بھی مظلوم بنی اسرائیل میں سے تھا۔ حضرت موسیٰ اس کی مدد کے لیے چلے اور اُس کا دفاع کرتے ہوئے ایک زوردار منکاح قبطی کو رسیا کیا لیکن مظلوم کے دفاع میں یہ (منکاح) کسی نازک جگہ پر جا لگا، اور اس ایک جگہ سے قبطی کا کام تمام ہو گیا۔

موسیٰ اس واقعے سے پریشان ہو گئے۔ چونکہ بالآخر فرعون کے مامورین کو اس بات کا پتہ چل گیا کہ یہ قتل کس کے ہاتھوں ہوا ہے۔ لہذا وہ بڑی شدت کے ساتھ آپ کے تعاقب میں نکل پڑے۔

لیکن حضرت موسیٰ اپنے بعض دوستوں کی نصیحت کے مطابق، پوشیدہ طور پر مصر سے باہر نکل گئے اور مدین کی طرف تہل پڑے۔ حضرت شعیب پیغمبر کے پاس اس زمانہ کا ایک ماحول مل گیا۔ جس کی تفصیل انشاء اللہ سورہ قصص کی تفسیر میں آئے گی۔ اس مقام پر قرآن کہتا ہے: تو نے ایک شخص کو قتل کر دیا اور غم و اندوہ میں ڈوب گیا، لیکن ہم نے تجھے اس غم و اندوہ سے بہت بخیر (و قتلْتَ نَفْسًا فَجَعَلْنَاكَ مِنَ الْغَافِرِينَ)۔

اس کے بعد ہم نے تجھے حادثات کے ذریعہ یکے بعد دیگرے آزمایا: (و فتنَّاكَ فَتُوتَا)۔

پھر نو سالہ مدین کے لوگوں میں طرار بار: (فَلَبِثْتَ سِنِينَ فِي أَهْلِ مَدْيَنَ)۔

یہ طوفانی راستے کرنے اور روحانی و جسمانی طور پر آزمادہ ہونے اور حادثات کے طوفانوں سے کامیابی و کامرانی کے ساتھ باہر نکلنے کے بعد تو اس زمانہ میں کہ جو قرآن رسالت لینے کے لیے مقدر تھا یہاں آیا: (شَرَّحْنَا عَلَى قَدَرٍ يَامُوسَى)۔

لفظ "قدر" بہت سے معنوں کے قول کے مطابق اس زمانے کے معنی میں ہے کہ جس میں حضرت موسیٰ کے لیے یہ مقدر کیا گیا تھا کہ وہ رسالت پر مبعوث کیے جائیں، لیکن بعض دوسرے معنوں نے اسے "مقدار" کے معنی میں لیا ہے جبکہ بعض قرآنی آیات میں بھی یہ لفظ اسی معنی میں آیا ہے (مثلاً حجر - ۲۱)۔ اس تفسیر کے مطابق جملے کا معنی اس طرح ہوگا: اے موسیٰ! تو بہت سے نشیب و فراز اور طرح طرح کے استحقاقات کے بعد اور شعیب جیسے عظیم پیغمبر کے جوار میں طویل مدت گزار کر پرورش پانے کے بعد آخر کار اس قدر و مقام اور شخصیت کا مالک بن گیا کہ وہی کے قبول کرنے کے لائق ہو گیا۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: میں نے تجھے اپنے لیے پرورش کیا اور بنایا سفورار ہے: (وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِي)۔ میں نے تیری پرورش وہی حاصل کرنے کی سگیں و ضروری کے لیے، رسالت قبول کرنے کے لیے اور اپنے بندوں کی ہدایت و رہبری کے لیے کی ہے اور میں نے تجھے حادثات کی کشالیوں میں آزمایا ہے تجھے قوت و طاقت عطا کی ہے اور اب جبکہ یہ عظیم و ضروری تیرے کندھے پر ڈالی جا رہی ہے تو تو ہر طرح سے تیار ہو چکا ہے، اور بنایا سفورار جا چکا ہے۔

"اصطناع" "صنع" کے مادہ سے کسی چیز کی اصلاح کے لیے پُر تاکید اقدام کے معنی میں ہے (جیسا کہ راغب نے مفردات میں کہا ہے)۔ یعنی میں نے تیری ہر طرح سے اصلاح کر دی ہے، گویا میں تجھے اپنے لیے چاہتا ہوں، اور یہ انتہائی محبت آمیز بات ہے کہ جو خدا نے اس عظیم پیغمبر کے حق میں کی ہے، اور بعض کے قول کے مطابق یہ اس بات کے ساتھ مشابہت رکھتی ہے کہ جو حکمائے کئی ہے کہ: "ان الله تعالى اذا احب عبداً اقتضاه كما يقتضد الصديق صديقه"۔

خدا جب کسی بندہ کو دوست رکھتا ہے تو اس طرح سے اس کی دیکھ بھال کرتا ہے جیسا کہ کوئی مہربان دوست اپنے دوست کی کرتا ہے۔

۲۲۔ اِذْ هَبْ أَنْتَ وَأَخُوكَ بِآيَتِي وَلَا تَنفِيَا فِي ذِكْرِي ۚ

۲۳۔ اِذْ هَبْ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغَىٰ ۖ

۲۴۔ فَقُولْ لَهُ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهُ يَتَذَكَّرُ وَيَنْشِي ۖ

۲۵۔ قَالَ رَبِّ إِنَّا نَخَافُ أَنْ يُفْرِطَ عَلَيْنَا أَوْ أَنْ يَطْغَىٰ ۖ

۲۶۔ قَالَ لَا تَخَافَا إِنَّنِي مَعَكُمَا أَسْمَعُ ۖ وَارَىٰ ۖ

۲۷۔ فَأَتَيْنَاهُ فَقُولَا إِنَّا رَسُولَا رَبِّكَ فَأَرْسِلْ مَعَنَا بَنِي إِسْرَءِيلَ وَلَا تَعْذِّبْهُمْ ۖ

۲۸۔ قَدْ جِئْنَاكَ بِآيَةٍ مِّنْ رَبِّكَ وَالسَّلَامُ عَلَيَّ مَنِ اتَّبَعَ الْمُدَىٰ ۖ

۲۹۔ إِنَّا قَدْ أُوحِيَ إِلَيْنَا أَنَّ الْعَذَابَ عَلَىٰ مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلَّىٰ ۖ

ترجمہ

۲۲۔ تو اور تیرا بھائی (دونوں) میری آیات کے ساتھ فرعون کے پاس جاؤ اور میری یاد میں کوتاہی نہ کرو۔

۲۳۔ تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ کیونکہ وہ سرکش ہو گیا ہے۔

۲۴۔ لیکن اُس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا شاید وہ متوجہ ہو یا (خدا سے) ڈرے۔

۲۵۔ (موسیٰ اور ہارون) دونوں نے کہا، پروردگار! ہم اس بات سے ڈرتے ہیں کہ وہ ہم پر زیادتی کرے گا، یا سرکشی کرے گا

۲۶۔ فرمایا دونوں، میں تمہارے ساتھ ہوں، میں (ہر چیز کو) سن رہا ہوں اور دیکھتا ہوں۔

۲۷۔ تم اس کے پاس جاؤ اور اس سے کہو: ہم تیرے پروردگار کے بھیجے ہوئے (رسول) ہیں، بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دو

اور ان پر تشدد و آزار نہ کرو۔ ہم تیرے پروردگار کی طرف سے تیرے لیے واضح نشانی لے کر آئے ہیں اور سلام و درود ہو اس پر

کہ جو ہدایت کی پیروی کرے۔

۲۸۔ (اس سے کہو) کہ ہماری طرف یہ وحی ہوئی ہے کہ اُس شخص پر عذاب ہوگا کہ جو (آیات الہی) کو جھٹلائے گا اور لوگوں کو دانی کرے گا

تفسیر

جابر فرعون کے ساتھ پہلی ٹکڑ:

اب جب کہ تمام چیزیں مہیا ہو چکی ہیں اور تمام ضروری وسائل حضرت موسیٰ کو حاصل ہو چکے ہیں تو انہیں اور ان کے بھائی

۱۔ اذہب انت و اخولک یا یاقی۔ "تو اور تیرا بھائی دونوں جو آیات میں نے نہیں دی ہیں ان کے ساتھ اب نکل چلو۔"

وہ آیات جن میں موسیٰ کے یہ دو عظیم جہزے بھی اور پروردگار کی وہ تمام نشانیاں، تعلیمات اور وہ سارے پروگرام بھی ہیں کہ جو خود بھی اس کی دعوت کی حقانیت بیان کرتے ہیں۔ خصوصاً جبکہ ان پر مغز تعلیمات کا ایسے شخص کے ذریعے اظہار ہو رہا ہے جس نے ظاہراً اپنی عکا اہم حصہ بیڑ بکریاں چرانے میں گزارا ہے۔

ادراں کی روحانی تقویت کے لیے اور زیادہ سے زیادہ سعی و کوشش کی تاکید کرنے کی خاطر مزید فرمایا: میرے ذکر اور میری اور میرے احکام کے اجراء میں سستی نہ کرنا (ولاتن فی ذکری)۔

کیونکہ سستی اور قاطعیت کو ترک کرنا، تمہاری ساری زحمات کو برباد کر دے گا۔ لہذا مضبوطی کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ اور کسی ہیئت سے ہراساں نہ ہو، اور کسی بھی طاقت کے مقابلہ میں سستی اور کمزوری نہ دکھاؤ۔

اس کے بعد ان کے پیچھے کا اصل مقصد اور وہ خاص بات جس کی طرف انہیں توجہ رکھنا ہے۔ بیان کرتے ہوئے فرمایا: تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ کیونکہ وہ سرکش ہو گیا ہے۔ (اذہب الی فرعون انہ طغی)۔

اس وسیع و عریض سرزمین کی عام بد بختیوں کا عامل اور اصل سبب وہی ہے اور جب تک اس کی اصلاح نہ ہوگی کوئی کام نہیں ہو سکتا کیونکہ کسی قوم کی پیش رفت یا پسماندگی اور خوش بختی یا بد بختی کا اصل عامل ہر چیز سے زیادہ اس قوم کے رہنما اور سرور اہی ہوا کرتے ہیں۔ لہذا سب سے پہلے تمہارا ہدف انہی کو ہونا چاہیے۔

یہ ٹھیک ہے کہ بارون اس وقت اس بیابان میں موجود نہیں تھے اور جیسا کہ سفر میں نے کہا ہے کہ خدا نے انہیں اس ماجرے سے آگاہ کیا اور وہ اس فترت داری کی ادائیگی کے لیے اپنے بھائی موسیٰ کے استقبال کی خاطر مصر سے باہر آئے۔ لیکن ہر حال اس بات میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ مخاطب تو وہ افراد ہوں جبکہ اس وقت صرف ایک حاضر تبار فلسی روزمرہ میں ہی (اور اردو میں بھی) ایسے نمونے عام ہیں مثلاً ہم کہتے ہیں: تم اور تمہارا بھائی جو کل سفر سے واپس آئے گا دونوں میرے پاس آنا۔

اس کے بعد آغاز کار میں فرعون سے ملاقات کے مؤثر طریقے کی تشریح اس طرح کی گئی ہے اس غرض سے کہ تم اس پر اثر انداز ہو سکو "نرم انداز سے اس سے گفتگو کرنا، شاید وہ متوجہ ہو یا خدا سے ڈرے (فقل لہ قولا لہ لیسنا لعلہ یتذکر او یخشی)۔ یہاں "یتذکر" اور "یخشی" کے درمیان فرق یہ ہے کہ اگر تم نرم اور ملائم انداز میں بات کرو اور طالب بھی صراحت اور قاطعیت کے ساتھ بیان کرو تو ایک احتمال تو یہ ہے کہ وہ تمہارے منطقی دلائل کو دل سے قبول کرے اور ایمان لے آئے اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ کم از کم دنیا یا آخرت میں خدا کے عذاب کے خوف سے اور اپنی طاقت کے برباد ہو جانے کے ڈر سے سر تسلیم خم کرے اور تمہاری مخالفت نہ کرے البتہ ایک تیسرا احتمال بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ نہ وہ متوجہ ہو اور نہ خدا سے ڈرے بلکہ مخالفت اور مقابلہ کا راستہ اختیار کرے۔

۲۔ لعل۔ (شاید) کی تفسیر سے اس کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ تو اس صورت میں اس کے لیے اتمام محنت ہو جائے گی۔ یعنی اس انداز پر

۱۔ کسی مال میں بھی بے فائدہ نہیں ہے۔

اس میں شک نہیں کہ خدا کو علم تھا کہ اس کا انجام کار کیا ہو گا لیکن مذکورہ تعبیرات میں موسیٰ و ہارون اور وہ خدا کے تمام رہبروں کے لیے ایک درس ہے۔

لیکن اس کے باوجود موسیٰ و ہارون اس بات پر پریشان تھے کہ کہیں یہ سرکش و زورمند اور سبکدوش جس کی سخت گیری اور سخت مزاجی ہر جگہ چرچا ہے، اس سے پہلے کہ موسیٰ و ہارون اسے دعوت دیں وہ پیش قدمی کرتے ہوئے انہیں ختم ہی نہ کر دے۔ لہذا "عزل کی" رو دکھا! ہم اس بات سے ڈرتے ہیں کہ کہیں وہ ہماری بات سننے سے پہلے ہی ہمیں سزا دینے کا حکم صادر نہ کر دے اور تیرا پیغام اس کے اور اس کے مصاحبین کے کانوں تک پہنچنے ہی نہ پائے یا سننے کے بعد سرکشی کرنے لگے۔ "قالا ربنا انت اخاف ان یفرط علینا وان یطغی"۔

"یفرط" "فط" (بروزن شرط) کے مادہ سے آگے بڑھنے کے معنی میں ہے۔ اسی بنا پر اس شخص کو کہ جو سب سے پہلے پانی کے گھاٹ پر پہنچے "فارط" کہتے ہیں۔ علی علیہ السلام کے کلمات، جو آپ نے دروازہ کوڑے کے پیچھے قبول کے سامنے کھڑے ہو کر فرمائے تھے، میں ہے کہ:

انت حولنا فرط سابق

تم اس قافلے سے آگے بڑھ جانے والے ہو اور ہم سے پہلے دیار آخرت کی طرف روانہ ہو گئے ہو۔

ہر حال موسیٰ اور ان کے بھائی ہارون کو وہ باتوں کا ڈر تھا۔ پہلی بات یہ کہ فرعون ان کی باتیں سننے سے پہلے ہی کہیں سختی پر نہ اتر آئے اور یا سننے ہی بلا فاصلہ اور بلا تاہل اس قسم کا اقدام کر بیٹھے اور دونوں صورتوں میں ان کا کام خطرے میں پڑ جائے گا اور نامکمل رہ جائے گا۔

لیکن خدا نے قطعی انداز میں ان سے فرمایا: تم بالکل نہ ڈرو، میں خود تمہارے ساتھ ہوں، سنا ہوں اور دیکھتا بھی ہوں: (قال لا تخافا انی معكما اسمع وانی)۔

اس بنا پر ایسے خدا نے تو ان کے ہوتے ہوئے کہ جو ہر جگہ تمہارے ساتھ ہے اور اسی وجہ سے ہر چیز اور ہر بات کو سن رہا ہے، ہر چیز کو دیکھ رہا ہے اور تمہارا حامی و مددگار ہے، ڈرنے اور گھبرانے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

اس کے بعد اپنی دعوت کو فرعون کے سامنے پیش کرنے کی کیفیت انتہائی باریکی کے ساتھ پانچ مختصر، قاطع اور پُر معنی و مطلب جملوں

۱۔ لعل۔ کے معنی کے بارے میں اردو قرآن میں کس معنی میں آیا ہے، ہم نے تفسیر نمونہ، جلد ۲ میں سورۃ نسا کی آیہ ۸۴ کے ذیل میں تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔

۲۔ نوح الباطنہ کلمات قصار، شمارہ ۱۳۰۔

میں بیان فرماتا ہے۔ ان میں سے ایک اصل ماموریت کے ساتھ مربوط ہے، دوسرے میں ماموریت کا معنی و مفہوم اور مطلب بتلا دینے میں دلیل و سند کا بیان ہے، چوتھے میں قبول کرنے والوں کو شوق دلایا گیا ہے اور پانچویں اور آخری جملہ میں مخالفت کرنے والا کیا گیا ہے۔

پہلے کہتا ہے: تم اس کے پاس جاؤ اور اس سے کہو کہ ہم تیرے پروردگار کے (بھیجے ہوئے) رسول ہیں: (فانتباہ انارسلو ربک)۔

یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ ہمارا پروردگار کی بجائے تیرا پروردگار کہا گیا ہے تاکہ فرعون کے ذہن کو اس نکتے کی طرف کیا جائے کہ اس کا ایک پروردگار ہے۔ اور یہ اس کے پروردگار کے نمائندے ہیں اور معنی طور پر اشاروں ہی اشاروں میں اسے یہ بار بار کہہ کر کسی بھی شخص کے لیے دلربیت کا دعویٰ کرنا صحیح نہیں ہے اور یہ صرف خدا ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔

دوسرے یہ کہ: بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دے اور انہیں اذیت و تکلیف نہ پہنچا (فارسل معنا بنی اسرائیل ولا تعذبھو)۔

یہ ٹھیک ہے کہ موسیٰ کی دعوت صرف بنی اسرائیل کو آل فرعون کے چنگل سے نجات دلانے کے لیے نہیں تھی بلکہ قرآن کی دوسری آیات کی گواہی کے مطابق، خود فرعون اور اس کے خواروں کو شرک و بت پرستی کے چنگل سے نجات دلانے کے لیے بھی تھی لیکن اس امر کا ہر اور اس کے موسیٰ کے ساتھ منطقی تعلق کی وجہ سے آپ نے یہ مسئلہ خاص طور پر پیش کیا چونکہ بنی اسرائیل سے خدمات لینا اور ان کو امتی تکلیف اور عذاب کے ساتھ اپنا غلام بنانے رکھنا، ایسا کام نہیں تھا کہ جس کی توجہ کی جاسکے۔

پھر اپنی دلیل اور ثبوت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خدا کہتا ہے کہ اس سے کہو: ہم تیرے پروردگار کی طرف سے تمہارے لیے نشان (اور دلیل) لے کر آئے ہیں: (قد جئناک بأیۃ من ربک)۔

ہم بیہودہ اور فضول بات نہیں کرتے اور بغیر دلیل کے کوئی گفتگو نہیں کرتے۔ لہذا عقل مند کا تقاضا یہ ہے کہ کم سے کم ہماری بات پر غور تو کرے اور اگر ٹھیک ہو تو انہیں قبول کرے۔

اس کے بعد مومنین میں شوق پیدا کرنے کے لیے مزید ارشاد ہوتا ہے: جو ہدایت کی پیروی کرتے ہیں ان پر سلام ہے: (والسلام علی من اتبع الهدی)۔

یہ جملہ ممکن ہے کہ ایک دوسرے معنی کی طرف بھی اشارہ ہو اور وہ یہ کہ اس جہاں میں بھی اور دوسرے جہاں میں بھی تکلیف نرسج خدا کے دردناک عذاب اور انفرادی و اجتماعی زندگی کی مشکلات سے سلامتی صرف انہیں لوگوں کے لیے ہے جو خدائی ہدایت کی پیروی کرتے ہیں اور درحقیقت یہ موسیٰ کی دعوت کا آخری نتیجہ ہے۔

انہیں حکم دیا گیا کہ انہیں اس دعوت سے ڈر کر دانی کا بڑا انجام بھی اسے بھادیں اور اس سے کہیں کہ: ہماری طرف وحی ہوئی ہے کہ عذاب الہی ان لوگوں کے دامن گیر ہوگا جو اس کی آیات کو جھٹلائیں گے اور اس کے فرمان سے ڈر کر دانی کریں گے۔ (انا قد اوحی الینان العذاب علی من کذب وتولى)۔

مکن ہے کسی کو یہ گمان ہو کہ اس جملہ کا ذکر اس نرم گفتار کے مطابق نہیں ہے جس پر وہ مامور تھے لیکن یہ اشتباہ ہے کیونکہ اس بات کا اصرار مانع ہے کہ ایک ہمدرد و طیب نرم لہجے میں اپنے مریض سے کہے کہ جو شخص اس دوا کو استعمال کرے گا وہ نجات پائے گا یعنی باب ہو جائے گا اور جو نہ کرے گا وہ تیرا اجل بن جائے گا۔

اس بیان میں کوئی شدت عمل والی بات نہیں بلکہ اس کے طرز عمل کے پیش نظر یہ ایک حقیقت ہے جو اس کے سامنے داشتگاف انگو میں بیان کی جا رہی ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ خدا کی عجیب قدرت نمائی: تاریخ میں بہت سے واقعات ایسے گزرے ہیں کہ خود سر اور طاقتور افراد قدرت خدا کے مقابلے میں اٹھ کھڑے ہوئے ہیں لیکن خدا نے کسی موقع پر بھی زمین و آسمان کے کوئی خاص لشکر ان کی سرکوبی کے لیے جمع نہیں کیے بلکہ ایسے سادہ اور آسان طریقے سے انہیں مغلوب کیا جس کا کسی شخص کو تصور بھی نہیں تھا۔

خصوصیت کے ساتھ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انہیں کو اپنی موت کے ذرائع کی طرف بھیج دیتا ہے اور ان کی نابودی خود انہیں کے سپرد کر دیتا ہے۔

فرعون کی یہی داستان گواہ ہے کہ اس کے اصلی دشمن یعنی موسیٰ کو خود اسی کے دامن میں پرورش کرانی اور لاشے میں خود اسی کی حفاظت میں رکھا۔

سب سے بڑھ کر قابل توجہ بات یہ ہے کہ تاریخ کے مطابق موسیٰ کی دایہ بھی قبطیوں میں سے تھی۔ وہ بڑھی کر جس نے ان کی نجات کا صندوق بنایا تھا وہ بھی ایک قبطی ہی تھا۔ صندوق کو پانی سے نکالنے والے فرعون کے ملازم تھے۔ صندوق کو کھولنے والی خود اس کی بیوی تھی۔ فرعون کے دربار کی طرف سے ہی موسیٰ کی ماں کو دودھ پلانے والی کی حیثیت سے دعوت دی گئی اور قبطی کے قتل کے واقعے کے بعد فرعون نے پانی کی طرف سے تعاقب آپ کی مدین کی طرف ہجرت اور شعیب جیسے پیغمبر کے مکتب میں مکمل تعلیم و تربیت کا ایک دور گزارنے کا سبب بنا۔ بلکہ جب خدا چاہتا ہے کہ اپنی قدرت کو ظاہر کرے تو وہ اسی طرح سے کیا کرتا ہے تاکہ سارے کے سارے سرکش جان لیں کہ ان کی حیثیت اس سے کہیں کمتر و حقیر ہے کہ اس کے ارادہ اور مشیت کے مقابلے میں ان کی کچھ پیش جاسکے۔

۲۔ دشمنوں کے ساتھ مدارات: لوگوں کے دلوں میں اثر و نفوذ پیدا کرنے کے لیے (چاہے وہ کتنے ہی گمراہ اور گنہگار کیوں نہ ہوں) قرآن کا سب سے پہلا دستور یہ ہے کہ ان سے ملائیت اور مہر و محبت کے ساتھ ملاقات کی جائے۔ خیریت اور سستی بعد کے مراحل سے تعلق رکھتی ہے اور اس وقت ہے جب دوستانہ طریقے سے ملاقات کرنے کا کوئی اثر نہ ہو۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ لوگ ان کی طرف کھنپیں نصیحت حاصل کریں اور ہدایت پائیں۔ یا اپنے مجسے کام کے انجام سے ڈریں۔

(لعلہ یتدحکرونیخی)

ہر کتب کے لیے ضروری ہے کہ اس میں جنب و کوشش ہو اور بلاوجہ لوگوں کو اپنے سے دور نہ جگائے۔ انبیاء اور ائمہ علیہم السلام کے حالات زندگی اسی طرح سے اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنی پوری زندگی میں کبھی بھی اس طرز عمل سے انحراف نہیں کیا۔

ہاں! یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی محبت آمیز طرز عمل بھی بعض لوگوں کے ساتھ دل پر اثر انداز نہ ہو اور شہوت اور سختی کے سوا اور کچھ ہی نہ ہو۔ تو یہ بات اپنی جگہ پر صیح ہے لیکن ایک اصل نکتی اور ابتداء کار میں نہیں۔ پہلا قرینہ محبت اور ملائمت ہی ہے اور یہ وہی درجہ جو زیر نظر آیات ہمیں واضح طور پر دے رہی ہیں۔

یہ بات جو بعض روایات میں منقول ہوئی ہے قابل توجہ ہے :

موسیٰ کریم حکم تھا کہ فرعون کو اس کے بہترین نام کے ساتھ پکاریں۔

شاید اس کے تاریک دل پر یہ بات اثر کر جائے۔

۳۔ کیا انبیاء کے علاوہ کسی اور پر وحی ہو سکتی ہے : اس میں شک نہیں کہ قرآن میں وحی کا لفظ مختلف معانی میں استعمال ہوا ہے۔ کبھی یہ آہستہ آواز کے معنی میں یا کسی بات کو آہستہ سے کہنے کے معنی میں آیا ہے۔ (یہ عربی زبان میں اس کا اصل معنی ہے)۔

کبھی کسی رمزیہ اشارہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے مثلاً :

فاوخی الیہم ان سبحوا بکرة وعشیا

زکریا نے جو اس وقت بولنے سے قاصر تھے، بنی اسرائیل سے اشارہ کے ساتھ کہا کہ صبح

شام خدا کی تسبیح کرو۔ (ہرم - ۱۱)

کبھی فطری الہام کے معنی میں بیان ہوا ہے، مثلاً :

اوخی ربک الی الفحل

تیرے رب نے شہد کی مکھی کو فطری الہام کیا۔ (غل - ۶۸)

کبھی حکم تکوینی کے معنی میں آیا ہے۔ یعنی وہ فرمان جو خلقت و آفرینش کی زبان سے دیا جاتا ہے۔ مثلاً :

لیؤمنذ تحدث اخبارها بان ربک اوخی لها

قیامت کے دن زمین اپنی خبریں بیان کرے گی کیونکہ تیرے رب نے اسے وحی کی ہے۔ (ززال - ۵)

اور کبھی الہام کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ایسا الہام جو صاحب ایمان لوگوں کے دل پر ہوتا ہے۔ چلے وہ پیغمبر اور امام نبی ہیں

اذ اوحینا الی امک مایوخی

اے موسیٰ ہم نے تیری ماں کی طرف جس وحی کی ضرورت تھی وہ اُسے کی۔ (طرہ - ۳۸)

لیکن اس کا ایک اہم ترین مقام استعمال قرآن مجید میں خدا کے وہ پیغامات ہیں کہ جو پیغمبروں کے ساتھ ہی مخصوص ہیں مثلاً :

انا اوحینا الیک کما اوحینا الی نوح والنبین من بعدہ :

ہم نے تیری طرف اسی طرح سے وحی بھیجی ہے جس طرح سے کہ نوح اور اس کے بعد والے

انبیاء کی طرف وحی بھیجی تھی۔ (نساء - ۱۶۳)

اس بنا پر لفظ وحی ایک وسیع اور جامع مفہوم رکھتا ہے کہ جو ان تمام مواقع پر استعمال ہوتا ہے۔ اس طرح ہمیں اس بات پر کوئی عجب نہیں کرنا چاہیے کہ اگر زیر بحث آیات میں موسیٰ کی ماں کے بارے میں وحی کا لفظ استعمال ہو گیا ہے۔

۴۔ ایک سوال کا جواب : ممکن ہے کہ بعض لوگوں کے ذہن میں اوپر والی آیات کے مطالعہ سے یہ سوال پیدا ہو کہ موسیٰ ان خلای وعدوں کے باوجود پریشانی، شک اور تشویش سے کیوں دوچار ہوئے۔ یہاں تک کہ خدا نے انہیں صراحت کے ساتھ کہا کہ جاؤ میں ہر جگہ تمہارے ساتھ ہوں، تمام باتوں کو سننا ہوں اور تمام چیزوں کو دیکھنا ہوں اور پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے

اس سوال کا جواب اس بات سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ ماموریت حقیقت میں بہت ہی سنگین تھی۔ موسیٰ بظاہر ایک پرجوش تھے۔ اب انہیں صرف اپنے بھائی کو ساتھ لے کر ایک خود سر طاقتور اور سرکش آدمی سے جنگ کرنے کے لیے جانا تھا کہ جس کے

قبضہ میں اس زمانے کے عظیم ترین طاقتور وسائل جمع تھے اور عجیب بات یہ ہے کہ حکم انہیں یہ ملا کہ پہلی دعوت خود فرعون سے شروع کرنا۔ مزید کہ پہلے دوسروں کے پاس جائیں اور لشکر اور بارود کا فراہم کریں بلکہ پہلا وار ہی فرعون کے دل پر کریں۔ یہ ماموریت واقعا ایک

بہت ہی پیچیدہ اور انتہائی زیادہ مشکل تھی۔ علاوہ ازیں ہم جانتے ہیں کہ علم و آگاہی کے کسی مراتب و مدارج ہوتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان ایک بات کو یقینی طور پر جانتا ہے لیکن وہ چاہتا ہے کہ علم الیقین اور عینی الطمینان کے مرحلے میں پہنچ جائے۔ جیسا کہ حضرت

ابراہیم نے معاویہ پر قطعی ایمان ہونے کے باوجود خدا سے یہ درخواست کی کہ اسی دنیا میں مردوں کے زندہ ہونے کا منظر میری آنکھوں کو دکھانا کہ زیادہ سے زیادہ اطمینان قلب پیدا ہو۔

۴۹۔ قَالَ فَمَنْ رَّبُّكُمْ اَيُّمُوسَىٰ

۵۰۔ قَالَ رَبُّنَا الَّذِي اَعْطٰی كُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهُ ثُمَّ هَدٰی

۵۱۔ قَالَ فَمَا بَالُ الْمُشْرُوْنَ الْاُولٰٓئِی

۵۲۔ قَالَ عَلِمَهَا عِنْدَ رَبِّیْ فِیْ کِتٰبٍ لَا یَضِلُّ رَبِّیْ وَلَا یَنۡسِی

۵۳۔ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ مَهۡدًا وَّوَسَّلَ لَکُمۡ فِیۡهَا سُبُلًا وَّ

نَزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخۡرَجۡنَا بِہٖۤ اَزۡوَاجًا مِّنۡ ثَبَاتٍ شَیْ

۵۴۔ کَلُّوْا وَاَرْعَوْا اَنْعَامَكُمْ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاَوَّلِي النَّهْيِ ۝

۵۵۔ مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَفِيْهَا نَعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اٰخَرٰی

ترجمہ

- ۴۹۔ (فرعون نے) کہا : اے موسیٰ ! تمہارا پروردگار کون ہے ؟
 ۵۰۔ (موسیٰ نے) کہا : ہمارا پروردگار تو وہ ہے کہ جس نے ہر موجود کو وہ کچھ دیا جو اس کی خلقت کے لیے لازم تھا پھر اس کو ہدایت کی۔
 ۵۱۔ اس نے کہا، پھر ہم سے پہلے لوگوں کا حال کیا ہوگا ؟
 ۵۲۔ موسیٰ نے کہا : ان کا علم میرے پروردگار کے پاس ایک کتاب میں ثبت ہے۔ سیرا پروردگار نہ تو گمراہ ہوتا ہے اور نہ ہی بھولتا ہے۔
 ۵۳۔ وہ خدا وہی تو ہے کہ جس نے زمین کو تمہارے لیے آرام و آسائش کی جگہ قرار دیا اور اس میں تمہارے لیے راستے بنائے اور آسمان سے پانی برسایا کہ جس کے ذریعے ہم نے انواع و اقسام کے نباتات (الذہیری خاک سے) نکالے۔
 ۵۴۔ تم خود اس میں سے کھاد اور اپنے چوپاؤں کو بھی چراؤ۔ بیشک اس میں صاحبان عقل کے لیے واضح نشانیاں ہیں۔
 ۵۵۔ ہم نے تمہیں اسی (خاک) سے پیدا کیا ہے اور اسی میں ہم تم کو پھر لوٹا دیں گے۔ اور اسی سے تمہیں دوبارہ بھی (زندہ کر کے) نکال کر اُکریں گے۔

تفسیر

تمہارا پروردگار کون ہے ؟

یہاں قرآن مجید نے اپنے طریقے کے مطابق ان مطالب کو حذف کر دیا ہے جو اس داستان میں آئندہ آنے والی بحث میں بھی جاسکتے ہیں۔ اور موسیٰ اور ہارون کی فرعون کے ساتھ گفتگو کو براہ راست بیان کرنا شروع کر دیا ہے۔
 درحقیقت معاملہ یہ ہے کہ :

موسیٰ فرمان رسالت حاصل کرنے اور فرعون کے ساتھ مقابلہ کرنے کے بارے میں ایک ہمدگیر، مشکل اور جامع دستور العمل لینے کے بعد اس مقدس سرزمین سے چل پڑتے ہیں اور موضعین کے قول کے مطابق مصر کے قریب اپنے بھائی ہارون کے ساتھ چلے جاتے ہیں۔ ہارون فرعون کے پاس جانے کے لیے روانہ ہو جاتے ہیں۔ بہت سی مشکلات کے بعد فرعون کے افسانوی عمل کے اندر کہ جس میں بہت سی

گمراہی آجا سکتے تھے پہنچ جاتے ہیں۔

جس وقت موسیٰ فرعون کے سامنے جا کر کھڑے ہوئے، تو وہی ٹوڑ اور پچھے تلے ٹٹلے جو خدا نے فرمان رسالت دیتے وقت انہیں تعلیم کیے تھے بیان کرنا شروع کر دیتے۔

ہم تیرے پروردگار کے بھیجے ہوئے رسول ہیں۔

بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دے اور انہیں آزار نہ دے۔

ہم تیرے پروردگار کے پاس سے دلیل اور واضح معجزہ اپنے ساتھ لے کر آئے ہیں۔

جو شخص ہدایت کی پیروی کرے اس پر سلام ہے۔

اور تو یہ بات بھی جان لے کہ ہمیں یہ وحی ہوئی ہے کہ عذاب خدا ان لوگوں کی انتظار میں ہے کہ جو تکذیب کریں اور فرمان خدا سے روگردانی کریں۔

جس وقت فرعون نے یہ باتیں سنیں تو اس کا پہلا ردِ عمل یہ تھا کہ اس نے کہا : اے موسیٰ ! بتاؤ تمہارا پروردگار کون ہے ؟
 وقال فسن ربکم یا موسیٰ۔

تعبیر کی بات یہ ہے کہ مغرور اور غرور فرعون یہ تک کہنے کے لیے تیار نہ ہوا کہ سیرا پروردگار کہ جس کے تم مدعی ہو کون ہے ؟ بلکہ یہ کہا کہ تمہارا پروردگار کون ہے ؟

موسیٰ نے فوراً ہی پروردگار کا بہت ہی جامع اور انتہائی مختصر تعارف کر دیا :

”کہا، ہمارا پروردگار تو وہی ہے جس نے ہر موجود کو وہ کچھ عطا کیا جو اس کی خلقت کا لازم تھا اور اس کے بعد مختلف مراحل ہستی میں اس کی پروری اور ہدایت کی“ : (قال ربنا الذی اعطی کل شیء خلقه شہو ھدی)۔

اس مختصر سی گفتگو میں حضرت موسیٰ آفرینش اور عالم ہستی کے دو بنیادی اور اساسی اصولوں کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ جن میں سے ہر ایک معرفت پروردگار کے لیے ایک واضح اور مستعمل دلیل ہے۔

پہلی بات یہ کہ ہر موجود کو جس چیز کی اسے ضرورت و احتیاج تھی اُسے دی ہے۔ یہ وہی مطلب ہے کہ جس کے بارے میں کتابوں کی کتابیں لکھی جاسکتی ہیں بلکہ لوگوں نے بے شمار کتابیں لکھی ہیں۔

اگر ہم نباتات اور ان جانداروں کے بارے میں کہ جو مختلف علاقوں میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ خواہ وہ پتہ بند ہوں یا چند، دریائی جاندار ہوں یا صحرائی، ان میں سے ہر ایک اپنے محیط اور ماحول کے ساتھ مکمل ہم آہنگی رکھتا ہے اور جس چیز کی اسے ضرورت ہے وہ اسے حاصل ہے۔

پرنمذوں کی ساخت ایسی بنائی گئی ہے کہ جو انہیں شکل، وزن اور مختلف حواس کے لحاظ سے پروانے کے لیے درکار ہے۔ سمندروں کی گہرائیوں میں رہنے والے جانوروں کی ساخت بھی ان کے مطابق رکھی گئی ہے۔

ظاہر ہے ان سب کے بارے میں بحث کرنے کی اس کتاب میں گنجائش نہیں ہے۔

دوسرا مسئلہ : موجودات کی ہدایت و رہبری کا ہے کہ جسے قرآن نے ”شعور“ کے لفظ سے ان کی ضروریات و حاجات پورا کرنے کے بعد والے درجہ میں قرار دیا ہے۔

ممكن ہے کہ کوئی شخص یا چیز زندگی کے وسائل سے مالا مال تو ہو لیکن ان سے استفادہ کرنے کے طریقوں سے واقف نہ ہو۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ ان سے کام لینے کے طریقوں سے آشنا ہو اور یہ وہی چیز ہے جو مختلف موجودات میں واضح طور پر دکھائی دیتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک اپنی زندگی کا سفر جاری رکھنے کے لیے کیسے بہترین طریقے پر اپنی قوتوں کو استعمال کرتا ہے۔ بالآخر کس طرح سے اپنا ٹھکانا بناتے ہیں، کیسے اولاد پیدا کرتے ہیں، کیسے اپنے بچوں کی تربیت کرتے ہیں، کس طرح دشمنوں کی دھمکیوں سے بچتے ہیں اور دشمنوں سے مقابلے کے لیے کیسے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔

انسان بھی اس ہدایت نگاہ میں کا حامل ہے لیکن چونکہ انسان ایک ایسا موجود ہے کہ جو عقل و شعور رکھتا ہے لہذا خدا نے اس کی ہدایت نگاہ کو اس کی ہدایت تشریفی کے ساتھ جو انبیاء کے ذریعہ کی جاتی ہے ملا دیا ہے اور اگر وہ اس راستے سے منحرف نہ ہو تو یقیناً مقصد کو پالے۔

دوسرے نظروں میں انسان عقل و شعور اور ارادہ و اختیار رکھنے کی وجہ سے کچھ فرائض اور ذمہ داریاں رکھتا ہے اور ان کی تکمیل کیلئے کچھ ارتقائی پروگراموں کا حامل ہے جو حیوانات نہیں رکھتے۔ اسی بنا پر انسان نگاہی ہدایت کے ساتھ ساتھ تشریفی ہدایت کی احتیاج بھی رکھتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ موسیٰ فرعون کو یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ یہ عالم ہستی نہ تو تجھ میں منحصر ہے اور نہ ہی سرزمین مصر میں، نہ آج کے زمانے کے ساتھ مخصوص ہے اور نہ ہی گزشتہ زمانہ سے۔

اس وسیع عالم کا گزشتہ زمانہ بھی تھا اور آئندہ بھی ہوگا۔ گزشتہ زمانے میں نہ میں تھا اور نہ تو اور اس عالم کے دو بنیادی مسائل کا ایک ضروریات کو مہیا کرنا اور دوسرے موجودات کی پیش رفت کے لیے قوت اور وسائل کو بروئے کار لانا۔ یہ دونوں چیزیں تجھے ہمارے پروردگار سے اچھی طرح سے آشنا کر سکتی ہیں اور اس سلسلے میں تو جتنا زیادہ غور و فکر کرے گا اس کی عظمت و قدرت کے بیشتر دلائل تجھے ملتے چلتے جائیں گے۔

فرعون نے یہ جاسع اور عمدہ جواب سن کر ایک اور سوال پیش کیا : ”اس نے کہا اگر ایسا ہے تو پھر ہم سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کی ذمہ داری کیا ہوگی؟“ (قال فما بال القرون الاولیٰ)۔

اب یہ بات کہ فرعون کی اس جملے سے کیا مراد تھی، مفسرین نے مختلف نظریات پیش کیے ہیں :

۱۔ بعض نے کہا ہے کہ چونکہ موسیٰ نے اپنے آخری جملے میں توحید کے سب مخالفین کے لیے عذاب الہی کا ذکر کیا تھا۔ لہذا فرعون نے سوال کیا کہ پھر وہ تمام مشرک قومیں کہ گزشتہ زمانے میں تھیں، اس قسم کے عذاب میں کیوں مبتلا نہیں ہوئیں؟

۲۔ بعض کہتے ہیں کہ چونکہ موسیٰ نے خداوند عالم کا سب کے لیے پروردگار اور معبود ہونے کا تعارف کرایا تھا، لہذا فرعون نے سوال کیا کہ پھر ہمارے بڑے اور سب گزشتہ قومیں کیوں مشرک تھیں؟ یہ بات نشانہ ہی کرتی ہے کہ مشرک اور بت پرستی کو غلط کام نہیں ہے۔

۲۔ بعض نے کہا ہے کہ چونکہ موسیٰ کی گفتگو کا مقصد یہ تھا کہ آخر کار سب کے سب اپنے اعمال کے نتیجے کو پہنچیں گے اور جنہوں نے خدا کے فرمان سے روگردانی کی ہے انہیں عذاب و سزا ہوگی۔ تو فرعون نے پوچھا کہ پھر ان کی ذمہ داری کیا ہوگی کہ جو فنا ہو گئے ہیں اور دوبارہ اس زندگی کی طرف پلٹ کر نہیں آئیں گے؟

بہر حال موسیٰ نے جواب دیا کہ گزشتہ اقوام کے تمام امور میرے پروردگار کے پاس ایک کتاب میں ثبت ہیں، میرا پروردگار بھی انہیں سنبھال رکھنے میں مگراہ نہیں ہوتا اور نہ ہی بھولتا ہے۔ (قال علمہما عند ربی فی کتاب لا یضل ربی ولا ینسئ)۔

اس بنا پر ان کا حساب کتاب محفوظ ہے اور آخر کار وہ اپنے اعمال کی جزایا سزا سمک پہنچ جائیں گے۔ اس حساب کتاب کی نگہداشت کرنے والا وہ خدا ہے کہ جس کے کسی کام میں نہ تو کوئی غلطی ہے اور نہ ہی بھول چوک۔

اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ موسیٰ نے اصل توحید اور خدا کے تعارف کے بارے میں جو کچھ بیان کیا ہے وہ پورے طور پر اس بات کو واضح کرتا ہے کہ اس ہستی کے لیے جس نے ہر چیز کو اس کی ضروریات اور احتیاجات کا مل طور پر عطا کی ہیں اور پھر اس کی ہدایت بھی کرتا ہے۔ اس حساب کی نگہداشت کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

”لا یضل“ اور ”لا ینسئ“ کے مفہوم میں کیا فرق ہے، اس بارے میں مفسرین کی مختلف آراء ہیں لیکن ظاہر یہ ہے کہ ”لا یضل“ پروردگار سے ہر قسم کے اشتباہ اور غلطی کی نفی کی طرف اشارہ ہے اور ”لا ینسئ“ نسیان کی نفی کی طرف اشارہ ہے یعنی نہ تو وہ ابتدائے میں افراد کے حساب میں اشتباہ اور غلطی کرتا ہے اور نہ ہی وہ ان کے حساب کی نگہداشت کرنے میں بھول چوک کرتا ہے۔

اس طرح موسیٰ ضمنی طور پر ہر چیز پر پروردگار کے علمی اعطائی کی نشاندہی کر رہے ہیں۔ تاکہ فرعون اس واقعیت کی طرف توجہ ہو کہ اس کے اعمال میں سے ذرہ برابر بھی خدا کے علم کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں ہے اور وہ سراسر نہیں بچ سکتا۔ حقیقت میں خدا کا یہ اعطاء علمی اس بات کا نتیجہ ہے کہ جو موسیٰ نے سب سے پہلے کسی ہے اور وہ یہ ہے کہ خدا کہ جس نے ہر موجود کو اس کی ضرورت و حاجت کی ہر چیز دی ہے اور اسے ہدایت بھی کی ہے، وہ ہر شخص اور ہر چیز سے آگاہ اور باخبر ہے۔

حضرت موسیٰ کی گفتگو کا ایک حصہ چونکہ مسئلہ توحید اور خدا شناسی کے بارے میں تھا، لہذا قرآن اس مقام پر ایک اور بات بھی کرتا ہے کہ جس نے زمین کو تیار کیے لیے مہر آسائش بنایا اور اس میں راستے پیدا کیے اور آسمان سے پانی برسا یا انزل الذی جعل لکم الارض مہداً و سلك لکم فیہا سبلاً و انزل من السماء ماء۔

ہم نے اس پانی کے ذریعے انواع و اقسام کی مختلف نباتات مٹی سے نکالیں اور فاختہ جتنا بد ازواجنا بد ازواجنا من نبات یشئ)۔

۱۔ بیان لفظ ”کتاب“ تکرار کی ضرورت میں ذکر ہوا ہے چونکہ اس کتاب کی عظمت کی طرف اشارہ ہے جس میں بندوں کے اعمال ثبت ہیں۔ جیسا کہ ایک دوسری آیت میں آیا ہے :

لا یفادر صغیرہ ولا کبیرہ الا احصاھا

کوئی چھوٹا یا بڑا عمل نہیں ہے مگر یہ کہ اس کتاب میں اس کا حساب موجود ہے۔ (کہف - ۱۸)

منہا فخر جکو تارة اخیری

یہ انسان کے گزشتہ، موجودہ اور آئندہ کے بارے میں کتنی جتنی تلی اور منہ براتی ہوئی تعبیر ہے۔ ہم سب مٹی سے پیدا ہوئے ہیں سب کے سب پھر مٹی ہی میں مل جائیں گے اور پھر سب کے سب دوبارہ مٹی ہی سے (زندہ کر کے) اٹھا کر کھڑے کیے جائیں گے۔ ہم سب کا مٹی میں مل جانا، یا مٹی سے دوبارہ اٹھانے جانا بالکل واضح اور روشن ہے۔ لیکن یہ بات کہ ہم سب کی ابتدا مٹی سے کس طرح ہوئی، اس سلسلے میں دو تفسیریں ہیں۔ پہلی یہ کہ ہم سب آدم سے ہیں اور آدم مٹی سے پیدا ہوئے اور دوسری یہ کہ ہم خود بھی مٹی ہی سے پیدا ہوئے ہیں کیونکہ تمام غذائی مواد کہ جس سے ہمارے اور ہمارے ماں باپ کے بدن بن کر تیار ہوئے ہیں وہ اسی مٹی سے حاصل ہوتے ہیں۔

ضمنی طور پر یہ تعبیر تمام سرکشوں اور فرعون صفت لوگوں کے لیے ایک تنبیہ ہے۔ کردہ یہ بات نہ بھولیں کہ وہ کہاں سے آئے ہیں اور انہیں کہاں جانا ہے۔ یہ سب غرور و نخوت اور سرکشی و طغیان، اس موجود کے لیے کہ جو کل تک مٹی تھا اور کل مٹی ہو جائے گا، کس لیے؟

چند اہم نکات :

۱۔ لفظ "مہد" و "مہاد" کا مضموم : دونوں ایسی جگہ کے معنی میں ہیں کہ جو بیٹھنے، سونے اور آرام کرنے کے لیے تیار کی گئی ہو اور اصل میں لفظ "مہد" اس جگہ کو کہا جاتا ہے کہ جس میں بچہ کو سلاتے ہیں (گہوارہ یا اسی قسم کی کوئی چیز)۔ گویا انسان ایک ایسا بچہ ہے کہ جسے زمین کے گہوارے کے سپرد کیا گیا ہے۔ اور اس گہوارے میں غذا اور اس کی زندگی کے تمام وسائل موجود ہیں۔

۲۔ لفظ "ازواجاً" کا مطلب : یہ "زوج" کے مادہ سے لیا گیا ہے۔ یہ نباتات کے مختلف اصناف کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے اور عالم نباتات میں مسکن زوجیت (نر اور مادہ ہونے) کی طرف بھی ایک سرسبز اشارہ ہو سکتا ہے جس کے بارے میں ہم انشاء اللہ متعلقہ آیات کے ذیل میں گفتگو کریں گے۔

۳۔ اولوالنہی کی تفسیر : اس سلسلے میں اصول کافی میں پیغمبر اکرم سے ایک حدیث نقل ہوئی ہے کہ :

ان خياركم اولوا النہی، قیل یا رسول اللہ ومن اولوا النہی؟

قال هو اولوا الاخلاق الحنة والاحكام الرزينة وصلوة الارحام والبر بالانہات

والاباء والمتعاهدین للفقراء والجیدان والیتامی ویطعمون الطعام

ولیفشون السلام فی العالو، ویصلون والناس نیام غافلون :

"تم میں سے سب سے بہتر اولوالنہی (صاحبان فکر و اندیشہ مسئول) ہیں۔

لوگوں نے پوچھا : یا رسول اللہ ! اولوالنہی کون ہیں؟

فرمایا : وہ لوگ کہ جو اخلاق حسنہ اور عقل سلیم کے مالک ہیں اور صلہ رہی کرنے والے ہیں باپ سے نیکی کرنے والے، فقیروں، ضرورت مند، مساکین اور یتیموں کی مدد کرنے والے ہیں اور

اس ساری آیت میں خدا کی عظیم نعمتوں میں سے چار حصوں کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

۱۔ زمین : کہ جو انسان کے لیے آرام و آسائش کا گہوارہ ہے۔ قانونِ جاؤب کی برکت سے اور اسی طرح عظیم ہوائی تشر سے کہ جس نے اس کے اطراف کو گھیر رکھا ہے، انسان راحت اور امن و امان کے ساتھ اس پر زندگی گزار سکتا ہے۔

۲۔ راستے : جو خدا نے زمین میں پیدا کیے ہیں کہ جو اس کے تمام مظہروں کو ایک دوسرے سے ملاتے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے اکثر دیکھا ہے کہ سربلک پہاڑوں کے سلسلوں کے درمیان اکثر راستے اور راستے موجود ہیں کہ جن میں سے انسان گزر سکتا ہے اپنے مقصد اور منزل تک پہنچ سکتا ہے۔

۳۔ پانی : جو مایہ حیات اور تمام برکات کا سرچشمہ ہے، آسمان سے نازل فرمایا۔

۴۔ چارے اور طرح طرح کی نباتات : جو اس پانی کے ذریعہ زمین سے آگتی ہیں۔ جن کے ایک حصہ سے انسان کے چلنے و غذائی سامان تیار ہوتا ہے کچھ حصہ دروازوں کے طور پر کام آتا ہے، کچھ حصہ کو انسان لباس بنانے کے کام میں لاتا ہے اور دوسرے حصہ کو وسائل زندگی (مثلاً، دروازے، گھڑی کے گھر، کشتیاں، جہاز اور بہت سے ذرائع نقل و حمل) کے لیے استعمال کرتا ہے۔

بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ چاروں عظیم نعمتیں اسی ترتیب سے کہ جس ترتیب کے ساتھ زیر بحث آیت میں بیان ہوئی ہیں، انسانی زندگی کی سب سے اول اور سب سے مقدم ضرورتیں ہیں۔ سب چیزوں سے پہلے سکون و آرام کی جگہ کی ضرورت ہے، اس کے بعد ایک علاقہ کو دوسرے سے ملانے والے راستوں کی ضرورت ہے، پھر پانی اور پھر نباتات اور زرعی محصولات کی۔

آخر میں خدا کی ان تمام نعمتوں میں سے پانچویں اور آخری نعمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے : ان نباتات سے حاصل ہونے والی چیزوں میں سے تم خود بھی کھاؤ اور اپنے چوپاؤں کو بھی ان میں سے غذا فراہم کرو : (کلوا وارعوا الفامکو)۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تمہارے حیوانات اور جانور بھی جو تمہاری غذا، لباس اور زندگی کے دوسرے وسائل کے ایک اہم حصہ کو مہیا کرتے ہیں، وہ بھی اسی زمین اور اسی پانی کی برکت سے ہیں کہ جو آسمان سے نازل ہوتا ہے۔

اور آخر میں جب ان تمام نعمتوں کی طرف اشارہ کر چکا تو فرماتا ہے : ان چیزوں میں صاحبانِ عقل کے لیے واضح و روشن نشانیاں ہیں ان فی ذلک لآیات لا ولی النہی)۔

قلیل توجہ بات یہ ہے کہ "نہی" جمع "نہیہ" (بروزن کپیٹیف) اصل میں نہی کے مادہ سے (ہوہ کی مذہب) لیا گیا ہے اور عقل و دانش کے معنی میں ہے جو انسان کو نباتات سے نہی کہتی ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہر قسم کی فکر اور دانش ہی حقیقت کو سمجھ سکتی ہے۔

اس مناسبت سے کہ ان آیات کے توحیدی بیان میں زمین اور اس کی نعمتوں کی پیدائش کا ذکر کیا گیا ہے، معاذ کو بھی آخری زیر بحث آیت میں اسی زمین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بیان کیا گیا ہے، فرماتا ہے : اسی سے ہم نے تمہیں پیدا کیا ہے اور اسی میں ہم تمہیں دوبارہ لوٹا دیں گے اور اسی سے تمہیں (زندہ کر کے) نکال کھڑا کریں گے (منہا خلقنا کھو و فیہا نعید کھو

وہ لوگ کہ جو جھوٹوں کو سیر کرتے ہیں۔ عالم میں صلح و آشتی پھیلاتے ہیں اور جب لوگ غافل سوتے ہوئے ہوتے ہیں تو وہ نماز پڑھ رہے ہوتے ہیں۔
ایک اور حدیث میں امیر المومنین علی علیہ السلام سے اس طرح نقل ہوا ہے کہ :
ایک شخص نے ان بزرگوار سے نماز کی ہر رکعت میں دو سجدے کرنے کا مطلب پوچھا تو امام نے فرمایا :

”پہلے سجدہ کا مطلب : جب تو زمین پر سر رکھتا ہے۔ یہ ہے کہ پروردگار! میں ابتداء میں اسی مٹی سے تھا اور جس وقت تو سراٹھاتا ہے تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ تو نے مجھے اسی مٹی سے باہر بھیجا ہے اور دوسرے سجدہ کا مفہوم یہ ہے کہ تو مجھے اسی مٹی کی طرف پلٹانے کا اور جس وقت تو دوسرے سجدہ سے سراٹھاتا ہے تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ دوبارہ مجھے اسی مٹی سے (زندہ کر کے) اٹھا کر اکرے گا۔“

- ۵۶۔ وَلَقَدْ آتَيْنَاهُ آيَاتِنَا كُلَّهَا فَكَذَّبَ وَأَبَىٰ
۵۷۔ قَالَ أَجْتَنَّا لَشُرَّهَا مِنْ أَرْضِنَا بِسِحْرِكُ يَمْ مُوسَىٰ
۵۸۔ فَلَنَأْتِيَنَّكَ بِسِحْرٍ مِّثْلِهِ فَأَجْعَلْ بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ مَوْعِدًا لَا نُخْلَفُهُ نَحْنُ وَلَا أَنْتَ مَكَانًا سُوًى
۵۹۔ قَالَ مَوْعِدُكُمْ يَوْمَ الزَّيْنَةِ وَإِنَّ تُخْشِرَ النَّاسَ ضُحًى
۶۰۔ فَتَوَلَّىٰ فِرْعَوْنُ فَجَمَعَ كَيْدَهُ ثُمَّ أَتَىٰ
۶۱۔ قَالَ لَهُمُ مُوسَىٰ وَيْلَكُمْ لَا تَفْتَرُوا عَلَيَّ اللَّهُ كَذِبًا فَيُسْحِتَكُمْ بِعَذَابٍ وَقَدْ خَابَ مَنْ افْتَرَىٰ
۶۲۔ فَتَنَازَعُوا أَمْرَهُم بَيْنَهُمْ وَأَسْرُوا النَّجْوَىٰ

۱۔ اصول کافی، جلد ۲، باب : ”المنون وعلاماته وصفاته“ ص ۳۲۔

۲۔ بحار الانوار، چاپ جدید، ج ۸۵، ص ۱۳۲۔

۶۳۔ قَالُوا إِنَّ هَذَا مِنْ لَسْحِدِنِ يُرِيدُ أَنْ يُخْرِجَكُمْ مِنْ أَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا وَيَذْهَبَ بِطَرِيقَتِكُمُ الْمُثْلَىٰ
۶۴۔ فَاجْمَعُوا كَيْدَكُمْ ثُمَّ أَتَوْا صَفَاً وَقَدْ أَفْلَحَ الْيَوْمَ مَنْ اسْتَعْلَىٰ

ترجمہ

- ۵۶۔ ہم نے اپنی ساری نشانیاں اُسے دکھائیں لیکن اُس نے تکذیب کی اور انکار کیا۔
۵۷۔ اُس نے کہا : اے موسیٰ! کیا تو اس لیے آیا ہے کہ ہمیں ہماری سرزمین سے اپنے اس جادو کے ذریعہ نکال باہر کرے۔
۵۸۔ ہم بھی یقینی طور پر اُسی جیسا جادو تیرے لیے لے آئیں گے، ابھی سے (اس کی تاریخ معین کر لے اور) ہمارے اور اپنے درمیان مدت مقرر کر لے، کہ ہم اور تم، دونوں جس کی خلاف ورزی نہ کریں، ایسی جگہ طے کرو جو سب کے لیے یکساں ہو۔
۵۹۔ (موسیٰ نے) کہا : ہمارا، تمہارا وعدہ زینت کے دن (روزِ عید) کا ہوا۔ شرط یہ ہے کہ سب کے سب لوگ دن چڑھتے ہی جمع ہو جائیں۔
۶۰۔ فرعون اُس مجلس سے اٹھا اور اُس نے اپنے تمام کرد و فریب جمع کیے اور پھر (مقررہ دن) ان سب کو لے آیا۔
۶۱۔ موسیٰ نے اُن سے کہا : تم پر وائے ہو، خدا پر جھوٹ نہ باندھو، کہ وہ تمہیں اپنے عذاب کے ساتھ نابود کر دے گا اور نا اُمید (اور شکست) اُسی شخص کے لیے ہے کہ جو (خدا پر) افترا باندھے۔
۶۲۔ ان کے درمیان آپس میں اُن کے کام کے سلسلے میں نزاع پیدا ہو گیا اور وہ آپس میں سرگشی کے ساتھ چپکے چپکے باتیں کرنے لگے۔
۶۳۔ انہوں نے کہا کہ : سلسلہ طور پر یہ دونوں کے دونوں جادو گر ہیں، یہ چاہتے ہیں کہ تمہیں اپنے جادو کے ذریعے تمہاری سرزمین سے نکال دیں اور تمہارے بلند مرتبہ دین کو ختم کر دیں۔
۶۴۔ (اب جبکہ یہ بات ہے تو) اپنی تمام قوت و تدبیر جمع کر لو (اور مقابلے کے میدان میں) صفت باندھ کر کھڑے ہو جاؤ اور کامیابی تو آج اسی کی ہے کہ جو اپنی برتری ثابت کر دے۔

تفسیر

آخری مقابلے کے لیے فرعون کی تیاری :

آیات کے اس حصے میں موسیٰ اور فرعون کے مقابلے کے ایک اور مرحلہ کا بیان ہو رہا ہے۔ قرآن مجید اس حصے کو اس جگہ کے ساتھ شروع کرتا ہے : ہم نے اپنی بھی نشانیاں فرعون کو دکھائیں، لیکن ان میں سے کوئی بھی اس کے سیاہ دل پر اثر نہ کر سکی۔ اُس نے سب کی تکذیب کی اور انہیں قبول کرنے سے انکار کر دیا (ولقد ارمیناہ اایاتنا کلھا فکذب وابی)۔

یقینی بات ہے کہ ان آیات سے یہاں وہ تمام معجزات مراد نہیں ہیں جو حضرت موسیٰ کی پوری زندگی میں مصر میں اُن سے ظاہر ہوئے، بلکہ یہ ان معجزات کے ساتھ مربوط ہے جو انہوں نے ابتداً دعوت میں فرعون کو دکھائے تھے یعنی "مجزہ عصا"، "یہنا" اور ان کی آسمانی دعوت کے مطالب "جو کہ خود ان کی حقانیت کی ایک زندہ دلیل ہے۔

اسی لیے اس واقعے کے بعد جادو گروں کے ساتھ حضرت موسیٰ کے مقابلہ اور ان کے نئے معجزات کا ذکر ہے۔

آب آئیے، دیکھتے ہیں کہ سرکش، منکبہ اور ہٹ دھرم فرعون نے حضرت موسیٰ اور ان کے معجزات کے جواب میں کیا کیا؟ —

تمام جھوٹے صاحبان اقتدار کی طرح انہیں کس طرح — متم کیا؟ قرآن کہتا ہے : اُس نے کہا : اے موسیٰ ! کیا تو اس لیے آئیے کہ ہمیں ہماری سرزمین اور وطن سے اپنے جادو کے ذریعے باہر نکال دے : (قال اجئت لانتخرجنا من ارضنا لبحرک یا موسیٰ)۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ : ہم جانتے ہیں کہ دعویٰ نبوت، دعوت توحید اور یہ مجرہ کافی، سب حکومت پر قبضے اور ہمیں اور قبیلوں کو سارے آباد اجداد کی زمین سے نکلنے کے لیے ایک سازش ہے۔ تیرا مقصد دعوت توحید ہے اور نہ بنی اسرائیل کی نجات۔ تیرا مقصد صرف حکومت حاصل کرنا، اس سرزمین پر تسلط جانا اور مخالفین کو باہر نکال دینا ہے۔

یہ تمہمت بالکل وہی حربہ ہے جو پوری تاریخ میں، سب صاحبان اقتدار اور استعمارگر استعمال کرتے رہے ہیں۔ جس وقت وہ اپنے آپ کو خطرے میں پاتے، تو اپنے بچاؤ اور محاذ کی خاطر، لوگوں کو تحریک کرنے کے لیے "ملک خطرے میں ہے" کا ہوا کر دیتے، ملک یعنی ان صاحبان اقتدار کی حکومت اور اس مملکت کی بقا ؛ یعنی خود ان کی اپنی بقا۔

بعض مسخری کا نظریہ ہے کہ اصل میں بنی اسرائیل کو مہر لانے اور ان کی اس سرزمین میں گمراہی صرف ان سے غلاموں کی شکل میں ان کی کام کی طاقت سے فائدہ اٹھانے کے لیے نہیں تھی بلکہ اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی چاہتے تھے، کہ بنی اسرائیل جو کہ ایک طاقتور قوم تھے، طاقت پیدا کر کے کہیں خطرے کا سبب نہ بن جائیں اسی طرح ان کے لوگوں کو قتل کرنے کا حکم بھی، صرف موسیٰ کے پیدا ہونے کے خوف سے نہیں تھا بلکہ وہ بھی ان کی طاقت و قوت کو ختم کرنے کے لیے تھا۔ اور یہ وہ کام ہے کہ جسے تمام خود سراسر انجام دیتے ہیں۔ اس بنا پر — موسیٰ کی خواہش کے مطابق — باہر جانے کا مطلب، اس وقت کا طاقت حاصل کرنا تھا۔ اس صحت میں فراموش کا تاج و تخت خطرے میں پڑ جاتا تھا۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ اس مختصر عبارت میں فرعون نے موسیٰ کو جادو کی تمہمت بھی دی، وہی تمہمت جو تمام انبیاء پر ان کے واضح معجزات کے جواب میں لگائی گئی۔

جیسا کہ سورہ فاطرات کی آیہ ۵۲ اور ۵۳ میں بیان ہوا ہے :

کذالك ما اتى الذين من قبلهم من رسول الا قالوا سلحوا وبعثوا

بلہ بلہ قوم طاعون
کوئی پیغمبران سے پہلے نہیں آیا مگر یہ کہ انہوں نے کہا کہ یہ جادو گر ہے یا دیوانہ ہے کیا وہ
اس (تمہمت وافر) کی ایک دوسرے کو وحیت کرایا کرتے تھے (کہ وہ سب اس میں
ہم آواز تھے) بلکہ وہ ایک سرکش قوم ہیں۔

یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ایسے موقعوں پر جب الوطنی کے احساسات و جذبات کا دامن تھامنا، بڑی سچی کجی بات تھی،
کیونکہ اکثر لوگ اپنے وطن کی سرزمین کو اپنی جان کی طرح عزیز رکھتے ہیں۔ اسی لیے قرآن کی کچھ آیات میں یہ دونوں باتیں ایک دوسرے کے
ساتھ ساتھ بیان ہوئی ہیں :

ولو انا كنا علىٰ عاصان
ما فعلوه الا قليل منهمو

اگر ہم نے اُن پر یہ واجب کر دیا ہوتا کہ وہ اپنے آپ کو قتل ہونے کے لیے پیش کریں، یا اپنے
وطن اور گھر سے باہر نکل جائیں، تو صرف تھوڑے سے افراد ہی اس پر عمل کرتے۔ (نما ۶۶)

فرعون نے اس کے بعد مزید کہا : تم یہ گمان نہ کر لینا، کہ ان جادوؤں کی مانند (جادو) پیش کرنا ہمارے بس میں نہیں۔ یقیناً جان لو
کہ ہم عنقریب تیرے جواب میں اسی قسم کا جادو لے آئیں گے : (فلناتینک لبحر مثله)۔

اور اس غرض سے کہ زیادہ سے زیادہ قاطعیت کا اظہار کرے، اس نے کہا : ابھی اسی وقت اس کی تاریخ مقرر کر، ہمارے آؤ
تیرے درمیان وعدہ ہونا چاہیے کہ جس سے نہ ہم ادھر ادھر ہوں اور نہ تو، وہ ہو بھی ایسی جگہ کہ جو ہم سب کے لیے برابر ہو : (فلجعل
بیننا و بینک موعدا لا تخلفه نحن ولا انت مکننا سوی)۔

"مکانا سوی" کی تفسیر میں بعض نے یہ کہا ہے کہ اس سے مراد یہ تھا کہ اس جگہ کا فاصلہ تھوڑے سے برابر ہو۔
بعض نے کہا ہے کہ اس کا فاصلہ شہر کے تمام لوگوں کے لیے یکساں ہو، یعنی ایسی جگہ جو ٹھیک شہر کے مرکز میں ہو، اور بعض نے یہ کہا ہے کہ
اس سے مراد ایک ہموار زمین ہے کہ جس پر تمام لوگ آسکیں اور بلند دست اس میں یکساں ہوں۔ ہم کہتے ہیں ان تمام معانی کو سمجھنی ضروری
سمجھا جاسکتا ہے۔

اس نکتے کی طرف توجہ کرنا بھی ضروری ہے کہ طاقتور برسر اقتدار لوگ اس غرض سے کہ وہ اپنے حریف کو میدان سے باہر نکال سکیں،
اور اپنے مساحبین اور رivalوں میں جو بعض اوقات متاثر ہو گئے ہوتے ہیں (اور موسیٰ کا واقعہ اور ان کے معجزات سے وہ حتیٰ طور پر متاثر ہو
گئے تھے) طاقت و قوت اور جبر پتہ کریں۔ ظاہر بڑے اتحاد کا مظاہرہ کرتے ہیں اور بہت زیادہ شور و غل کرتے ہیں۔

(وقد خاب من افترى).

یہ بات واضح ہے کہ موسیٰ کی خدا پر افتراء سے مراد یہ ہے کہ کسی شخص کو یا کسی چیز کو اس کا شریک قرار دینا، خدا کے جیسے ہوئے بات کو جادو سے تعبیر کرنا اور فرعون کو اپنا سمود اور الٰہ خیال کرنا تھا۔ یقیناً جو شخص خدا پر اس قسم کے افتراء باندھے گا اور لہری قوت کے ذریعہ کو بھانسنے کی کوشش کرے گا۔ خدا اسے بغیر سزا دینے نہ چھوڑے گا۔

حضرت موسیٰ کی یہ دو لوگ باتیں جو جادو گروں کی باتوں کے ساتھ کوئی مشابہت نہیں رکھتی تھیں۔ بلکہ اس کا طریقہ تمام سچے پیغمبروں والا تھا اور موسیٰ کے پاکیزہ دل سے نکلی ہوئی باتیں بعض کے دلوں پر اثر کرتی تھیں اور اس پر ان لوگوں میں اختلاف پڑ گیا۔ بعض شدت عمل کے طریقہ سے من شک و شبہ میں پڑ گئے، اور کہنے لگے ہو سکتا ہے موسیٰ خدا کے عظیم پیغمبر ہوں اور اگر ایسا ہوا ان کی تہدید اور دھمکیاں مؤثر ہو کر رہیں گی۔ خاص طور پر، ان کا اور ان کے بھائی ہارون کا وہی چرواہوں والا سادہ لباس تھا۔ ان کے چہرے پر عزم ماسخ کی جھلک تھی۔ تنہا ہونے کے باوجود ان میں کوئی کمزوری اور کسی قسم کا تفسیر نظر نہیں آ رہا تھا۔ ان کی گفتگو، ان کی سچائی کی ایک اور دلیل تھی۔ لہذا قرآن کہتا ہے: وہ آپس میں اپنے کاموں کے بارے میں نزاع میں پڑ گئے اور ایک دوسرے کے ساتھ سرگوشیاں کرنے لگے، (فتنازعوا امرہو بینہما واسروا الخبوی).

ممکن ہے کہ یہ سرگوشی اور پوشیدہ باتیں موسیٰ کے سامنے ہو رہی ہوں۔ یہ احتمال بھی ہے کہ یہ باتیں فرعون کے سامنے ہوں اور ایک احتمال یہ بھی ہے کہ اس منظر سے متاثر ہونے والوں نے غرضی طور پر عوام سے اس قسم کی سرگوشی اور نزاع شروع کر دیا ہو۔

لیکن بہر حال مقابلہ جاری رکھنے اور شدت عمل کے طرفدار کامیاب ہو گئے۔ انہوں نے گفتگو کا سلسلہ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور مختلف طریقوں سے، موسیٰ کے ساتھ مقابلہ کرنے والوں کو تحریک کرنے لگے پہلے، "انہوں نے کہا یہ دونوں جادو گرو ہیں" (قالوا ان هذان ساحران).

اس بنا پر ان کے مقابلہ میں گھبرانا نہیں چاہیے کیونکہ تم اس وسیع و عریض ملک میں جادو گروں کے سردار اور بزرگ ہو اور تمہاری قوت طاقت ان سے زیادہ ہے۔

دوسرے یہ کہ: "وہ یہ چاہتے ہیں کہ تمہیں تمہاری سرزمین سے جادو کے ذریعہ باہر نکال دیں" وہ سرزمین کہ جو تمہیں جان کی طرح عزیز، اطمینان بخش تھی، ہر اور دم تھیں تھی یہاں پیدا ان ان یخرجاکو من ارضکوبحرما).

علاوہ ازیں وہ صرف تمہیں تمہارے وطن سے نکال دینے پر ہی قانع نہیں ہیں، بلکہ وہ چاہتے ہیں کہ تمہارے مقدسات کا بھی مٹان اڑائیں اور تمہارے بلند مرتبہ دین اور سچے مذہب ہی کو ختم کر دیں (ویدہبا بطریقکوا المثل).

یہ جملہ اعراب کے لحاظ سے اس طرح ہے کہ "ان" "ان" "ان" کا منف ہے، اور اسی وجہ سے اس نے اپنے بائد پر عمل نہیں کیا۔ علاوہ ازیں "ان" کے اسم کا رفع نسبت عرب میں کیاب نہیں ہے۔

"طریقہ" روش کے معنی میں ہے، اور یہاں مذہب مراد ہے۔ اور "مثلی" مثل کے مادہ سے یہاں عالی اور افضل کے معنی میں ہے۔ (ای الاشبه بالفضیلة).

لیکن حضرت موسیٰ نے عمل اور بردباری کا دامن نہ چھوڑا اور فرعون کے شور و غل پر ہرگز نہ گھبراتے اور لہری مراحت اور قلعہ ساتھ کیا: میں بھی تیار ہوں! ابھی اسی وقت، دن اور وقت کا تعین کیے دیتا ہوں۔ ہمارا اور تمہارا وعدہ زینت کے دن (وقد خاب من افترى) کا ہوا۔ شرط یہ ہے کہ تمام لوگ دن چڑھے تک اس جگہ جمع ہو جائیں: (قال موعدا کو یوم الزینة وان یحشرنا ضحوا).

"یوم الزینة" (زینت کا دن) کی تفسیر سادہ طور پر کسی عید کے دن کی طرف اشارہ ہے۔ جسے ہم مخصوص طور پر معین نہیں لیکن اہم بات یہ ہے کہ لوگ اس دن اپنے کا دوبار کی چھٹی کیا کرتے تھے۔ لہذا اس قسم کے پروگرام میں شرکت کے لیے وہ طبعی طور پر تیار بہر حال فرعون نے موسیٰ کے حیرت انگیز ہجرت اور اپنے حواریوں میں ان معجزات کے نفسیاتی اثرات دیکھے تو پختہ ارادہ کر لیا اور اس کی مدد سے اس کا مقابلہ کرے گا۔ لہذا اس نے موسیٰ کے ساتھ معاہدہ کیا اور "اس مجلس سے اٹھ کر ہوا اور اپنے تمام مکرو فریب سے سب کو متحرک رہنے کو پہنچ گیا: (فتوتی فرعون فجمع کیدہ فتواتی).

اس مختصر سے جملے میں وہ تمام حالات و واقعات، جو سورہ اعراف و شعراء میں مفصل اور مبسوط طور پر بیان کیے گئے، بطور خلاصہ بیان ہوئے ہیں۔ چونکہ فرعون نے اس مجلس سے اٹھنے اور موسیٰ و ہارون سے جدا ہونے کے بعد، اپنے مخصوص مشیروں اور مستغیر جاسیوں کے ساتھ مختلف میٹنگیں کیں۔ اس کے بعد اس نے سارے ملک مصر سے جادو گروں کو دارالحکومت میں آنے کی دعوت دی۔ اس نے بہت شوق انگیز ذرائع سے انہیں اس قدر ساز متیلے کی دعوت دی۔ ان کے علاوہ باتیں بھی ہیں جن کی بحث کے لیے یہاں پر گنجائش نہیں ہے۔ البتہ قرآن نے ان تمام باتوں کو، ان تین جملوں میں جمع کر دیا ہے: فرعون موسیٰ سے ٹہرا ہوا، اپنے تمام گروں کو جمع کیا، اور پھر تیار ہو کر آ گیا۔

آخر کار متردون آپہنچا۔ حضرت موسیٰ لوگوں کے اس عظیم اجتماع کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ مد مقابل گروہ میں سے کچھ لوگ جادو کرتے۔ ان کی تعداد بعض مسخرین کے قول کے مطابق ۲۰ افراد تھی، بعض کے مطابق چار سو افراد تک تھی، اور بعض دوسروں نے اس سے بہت زیادہ تعداد بھی بیان کی ہے۔

ان میں سے کچھ افراد فرعون اور اس کے مصاحبین اور اطرافین پر مشتعل تھے۔ باقی اکثریت ناشانی عوام تھے۔ حضرت موسیٰ نے اس موقع پر جادو گروں کی طرف، یا فرعونوں اور جادو گروں کی طرف رخ کیا، اور ان سے کہا: دلوں سے ہر دم پر، تم خدا پر جھوٹ نہ بانڈھو کیونکہ وہ تمہیں اپنے عذاب سے تباہ و برباد کر دے گا" (قال لہو موسیٰ ویلکوا لعناتہ وعلی اللہ کذباً فیستکوبمذاب).

"اور شکست و نا اُمید ی اور خسارہ اُس کے لیے ہے کہ جو خدا پر افتراء باندھتا ہے، اور اس کی طرف باطل کی نسبت دیتا ہے:

۱۔ "ضحیٰ" لغت میں سورج کے پھیلنے کے معنی میں ہے، یا سورج کا اُڑ پھرتا ہے، اور "وان یحشر الناس ضحیٰ" میں "واو" میت کی دلیل ہے۔

۲۔ اگرچہ لفظ "توتی" یہاں پر، موسیٰ سے ٹہرا ہونے یا اُس مجلس سے اٹھنے کے معنی میں تفسیر ہوا ہے، لیکن ممکن ہے کہ اس کی لغت کی طرف توجہ کرتے ہوئے فرعون کے موسیٰ پر اعزاز کرنے، ناراض ہونے، اور اس کی سائنہ نگہ مینے کے لیے بھی استعمال ہوا ہو۔

اب جب کہ یہ بات ہے تو شک و شبہ کو کسی طرح بھی اپنے قریب نہ پھینکنے دو اور اپنی تمام طاقت، منصوبہ، مہارت و قوت جمع کرو، اور کام میں لاؤ، (فاجمعوا کیدکم)۔

اس کے بعد سب کے سب متحد ہو کر ایک ہی صف میں، میدانِ مقابلہ میں قدم رکھو، (شواشتوا حفا)۔ کیونکہ اس قدر ساز و مقابلے میں دھت و احماد ہی، تمہاری کامیابی و کامرانی کا ضامن ہے۔ اور آخر میں، "کامیابی تو آج اسی کے لیے ہوگی جو اپنی برتری اپنے حریف پر ثابت کر دے گا" (وقد افلح الیوم من سبقکم)۔

۶۵۔ قَالُوا يَمُوسَىٰ اِمَّا اَنْ تُلْقٰى وَ اِمَّا اَنْ نَّكُونَ اَوَّلَ مَنْ اَلْقٰى ۝

۶۶۔ قَالَ بَلْ اَلْقُوا ۚ فَاِذَا جِئَالَهُمْ وَعَصِيَهُمْ يُخَيَّلُ اِلَيْهِمْ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهُمْ اَلْتَسٰى ۝

۶۷۔ فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهِ خِيفَةً مُّوسٰى ۝

۶۸۔ قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى ۝

۶۹۔ وَاَلْقٰى مَا فِيْ يَمِيْنِكَ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا اِنَّمَا صَنَعُوْا كَيْدُ سِحْرٍ ۚ وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ اَلٰى ۝

ترجمہ

۶۵۔ (جادوگروں نے) کہا اے موسیٰ! کیا تو پہلے (اپنے عصا کو) پھینکے گا یا پہلے ہم پھینکیں؟
۶۶۔ (موسیٰ نے) کہا: پہلے تم پھینکو، تو فوراً ہی ان کی رسیاں اور لاشیاں ان کے جادو کی وجہ سے اُسے ایسی نظر آنے لگیں جیسے وہ حرکت کر رہی ہوں۔

۶۷۔ موسیٰ۔ اس وقت اپنے دل میں کچھ ڈرے۔
۶۸۔ ہم نے کہا ڈرو نہیں یقیناً کامیاب تو تم ہی ہو گے۔
۶۹۔ اور جو چیز تمہارے دائیں ہاتھ میں ہے (زمین پر) ڈال دو، یہ اُن تمام چیزوں کو جنہیں انہوں نے بنایا ہے نکل جائے گی کیونکہ وہ تو صرف جادوگر کا معرکہ فریب ہی میں اور جادوگر جہاں کہیں بھی جائے گا فلاح نہیں پائے گا۔

تفسیر

موسیٰ بھی میدان میں آجاتے ہیں:

جادوگر ظاہراً متحد ہو گئے اور انہوں نے عزم باجماع کر لیا کہ موسیٰ کے ساتھ مقابلہ کریں گے۔ جس وقت میدان میں قدم رکھا تو انہوں نے کہا: "اے موسیٰ! کیا تو پہلے جادو کے آلات پھینکے گا یا ہم پہلے پھینکیں (قالوا یا موسیٰ اما انت تلقی و اما ان نکون اول من القی)۔"

بعض مفسرین نے یہ بیان کیا ہے کہ جادوگروں کی یہ تحریک کہ موسیٰ پہلے اقدام کریں، یا وہ پہل کریں، ان کی طرف سے یہ موسیٰ کا ایک قسم کا احترام تھا۔ اور شاید یہی چیز تھی کہ جس نے اس حقیر کے بعد انہیں ایمان لانے کی توفیق فراہم کی۔ لیکن یہ بات بہت بید نظرائی ہے کیونکہ وہ پوری قوت کے ساتھ یہ کوشش کر رہے تھے کہ موسیٰ اور ان کے بھروسے کو درہم برہم کر دیں۔ بنا بریں یہ تعبیر شاید اس لیے ہو کہ وہ عوام پر اپنی خود اعتمادی ظاہر کریں۔

لیکن موسیٰ نے جلد بازی نہ کی کیونکہ انہیں اپنی کامیابی کا پورا اطمینان تھا اور اس سے قطع نظر، اس قسم کے متبادل میں عموماً وہ بازی لے جاتا ہے کہ جو پیش قدمی نہ کرے۔ انہوں نے ان سے "کما تم پہلے پھینکو" (قال بل القوا)۔ اس میں شک نہیں کہ حضرت موسیٰ کی طرف سے ان کو یہ دعوت متبادل، حق کے آشکار ہونے کی ایک تمہید تھی اور جناب موسیٰ کی نظر میں یہ کام نہ صرف یہ کہ کوئی امر قبیح نہیں تھا بلکہ ایک امر واجب کا مقدمہ تھا۔

جادوگروں نے بھی اس بات کو قبول کر لیا اور یقیناً لاشیاں اور رسیاں وہ جادو کرنے کے لیے اپنے ہمارہ لائے تھے، ان سب کو ایک ہی بلد میدان میں ڈال دیا، اور اگر ہم اس روایت کو کہ جس میں یہ بیان ہوا ہے کہ: وہ ہزاروں آدمی تھے، قبول کر لیں، تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ انہوں نے ہزاروں لاشیاں اور رسیاں کر جن کے اندر ایک خاص قسم کا مواد ہوا تھا ایک لمحہ کے اندر میدان میں پھینک دیں۔ "اچانک ان کی رسیاں اور لاشیاں ان کے جادو کی وجہ سے اس طرح نظر آئیں جیسے وہ حرکت کر رہی ہوں (فاذا جبالہم وعصیہم یخیل الیہ من سحرہم اناہا تسلی)۔"

اُن! چھوٹے بڑے، رنگ برنگے مختلف شکلوں کے سانپ اچھلنے کودنے لگے۔ قرآن کی دوسری آیات میں اس سلسلے میں ہے: سحر و اعدین الناس واسترہبہو و جاؤ و بحر عظیم (۱۱۶)۔ انہوں نے لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا اور انہیں دھت و گھبراہٹ میں ڈال دیا۔ اور یہ ان کا بہت ہی بڑا جادو تھا۔

اور سورہ شعرا کی آیہ ۴۴ کی تعبیر کے مطابق: جادوگروں نے پکار کر کہا: وقالوا بعزۃ فرعون انا لنحمرن الغالبون

فرعون کی عزت کی قسم ہم کامیاب ہیں۔

بہت سے معسرتوں نے دکھا ہے، کہ انہوں نے بہت سا ایسا مواد جیسے "پارہ" ان رسیوں اور لٹھیلوں کے اندر جبراً ہوا جس سے سورج کی دھوپ میں اس مادہ کے گرم ہوجانے کی وجہ سے، غیر معمولی دوڑ بھاگ، اور مختلف قسم کی تیز حرکتیں ان میں شروع ہوئیں یہ حرکتیں چلتے پھرتے کی نہیں تھیں، لیکن وہ بات جو جادوگروں نے لوگوں کو پہلے سے بھائی ہوئی تھی، اس کے ساتھ یہ خاص جو وہاں موجود ہیں آیا اس سے لوگوں کو یوں لگا جیسے ان موجودات میں جان آگئی ہے۔ اور وہ چل پھر رہے ہیں۔ "محرو و العین النام" کی تعبیر یعنی "لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا" بھی اسی معنی کی طرف اشارہ ہے۔ اور اسی طرح "عین الیہ" یعنی موسیٰ کو یوں لگا بھی ہو سکتا کہ اسی معنی کی طرف اشارہ ہو۔

بہر حال بہت ہی عجیب منظر تھا، جادوگر کہ جن کی تعداد بھی زیادہ تھی اور اس فن سے ان کی آگاہی بھی کمال درجہ کی تھی اور وہ اجسام کے طبیعی و کیمیائی خواص سے استفادہ کرنے کے طریقوں سے بھی اچھی طرح واقف تھے، لہذا وہ حاضرین پر اس طرح اثر انداز ہونے کے قابل ہو گئے کہ انہیں یہ یقین دلا دیں کہ یہ تمام بے جان چیزیں جادوگر بن گئی ہیں۔ خوشی کا ایک شور و غلہ ان کی طرف سے بلند ہوا۔ کچھ لوگ خوف اور گھبراہٹ کی وجہ سے پیچھے گئے اور دیکھنے کی طرف ہٹ گئے۔

"اس موقع پر موسیٰ نے ایک خفیف سا خوف، اپنے دل میں محسوس کیا" (فاوجس و ففسہ خیفۃ موسیٰ)۔

"اوجس" "ایچاس" کے مادہ سے اصل میں "وجس" (بروزن "جس") سے ہے۔ جو ایک پوشیدہ آواز کے معنی سے لیا گیا ہے اس بنا پر "ایچاس" ایک پوشیدہ اور اندرونی احساس کے معنی میں ہے، اور یہ تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ موسیٰ کا یہ اندرونی خوف بالکل معمولی اور خفیف سا تھا، اور وہ بھی اس وجہ سے نہیں تھا، کہ وہ جادوگروں کے جادو کے اثر سے، جو عجب انگیزہ و جذبہ میں آیا تھا، بلکہ کسی اہمیت کے قائل نہ ہو گئے تھے بلکہ انہیں خوف اس بات کا تھا کہ کہیں لوگ اس منظر سے متاثر نہ ہو جائیں۔ اس طرح سے کہ انہیں وہاں ٹھانا آسان نہ رہے۔

یاد رہے کہ اس سے پہلے کہ موسیٰ کو اپنا معجزہ دکھانے کی مہلت ملے، کچھ لوگ اس میدان سے ہی چلے جاتے، یا انہیں یہاں سے باہر نکال دیا جائے اور جی واضح نہ ہو سکے۔

جیسا کہ نوح البلاغہ کے چھٹے خطبے میں ہے :

لویوجس موسیٰ (ع) خیفۃ علی نفسه بل اشتیق من غلبۃ الجہال و دول الضلال

موسیٰ نے ہرگز اپنے دل میں اپنے لیے خوف محسوس نہیں کیا تھا بلکہ وہ اس بات سے ڈرے کہ جاہل غالب آجائیں اور گمراہ حکومت کامیاب ہو جائے۔

۱۔ حق تعالیٰ نے یہ بات اس وقت فرمائی ہے جبکہ وہ لوگوں کے احوال سے پریشان تھے۔ وہ اس وقت کی طرف اشارہ فرماتے ہیں کہ یہی پریشانی میں بنا رہے ہیں کہ جب تک کہ مسیحیوں نے یہ شہر نہیں چھوڑا جس دن سے جی کو کچھ دیر تک میں نے اس میں رہا، میں لوگوں کے احوال کی وجہ سے پریشان ہوں۔

جو کچھ بیان ہو چکا، اب اس کے بعد، حضرت موسیٰ کے خوف کے بارے میں جو دوسرے جوابات ذکر ہوئے ہیں، ہم ان کی بیان کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔

بہر حال اس موقع پر خدا کی مدد اور نصرت موسیٰ کے پاس آپہنچی اور وہی کے فرمان نے ان کی ذمہ داری واضح کر دی جیسا کہ قرآن کتاب ہے: ہم نے اُس سے کہا، خوف کو اپنے قریب بھی نہ آنے دو، یقیناً تم ہی غالب رہو گے: (قلنا لا تخف انک انت الاعلیٰ)۔ یہ جملہ لفظی قاطعیت کے ساتھ موسیٰ کو ان کی کامیابی کے بارے میں دلی اطمینان دلایا ہے، (لفظ "ان" اور ضمیر کا تکرار دونوں اس معنی پر ایک مستقل تاکید ہیں، اور اسی طرح اس جملے کا جملہ اسمیہ ہونا بھی) اور اس طرح سے موسیٰ نے اپنی قوت قلب کو جو کچھ ہر کے لیے سترزل ہوئی تھی، پھر سے مجتمع کیا۔

پھر ان سے فرمایا گیا جو کچھ تیرے دائیں ہاتھ میں ہے اُسے نیچے ڈال دے۔ جو کچھ انہوں نے بنایا ہے یہ ان سب کو نکل جائے گا۔ (والق ما فی یمینک تلقف ما صنعوا)۔

چونکہ ان کا کام تو صرف جادوگر کا سحر و فریب ہے: (انما صنعوا کید ساحر)۔

اور جادوگر جہاں کہیں بھی جائے گا کامیاب نہ ہوگا۔ (ولا یفلح الساحر حیث اتی)۔

"تلقف" "لقف" کے مادہ سے (جو "وقف" کے وزن پر ہے) نکلنے کے معنی میں ہے۔ لیکن راغب مفردات میں یہ کہتا ہے کہ یہ لفظ اصل میں کسی چیز کو مارت کے ساتھ پکڑنے کے معنی میں ہے، چاہے سحر کے ساتھ ہو یا ہاتھ کے ساتھ اور بعض ارباب لغت نے اسے "تیزی کے ساتھ پکڑنے کے معنی میں سمجھا ہے جیسے فارسی میں اس کی جگہ "درودن" استعمال ہوتا ہے۔

یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ، یہ نہیں فرمایا کہ "اپنا عصا پھینکو" بلکہ فرمایا، "جو کچھ تیرے دائیں ہاتھ میں ہے اسے پھینکو"۔ یہ تعبیر شاید عصا سے بے اعتنائی کے عنوان سے ہو اور اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ عصا کوئی اہمیت نہیں ہے۔ جو بات اہم ہے وہ خدا کا ارادہ اور اس کا حکم ہے۔ اگر اس کا ارادہ ہو تو عصا تو آسان ہے، اس سے پھینکی اور غیر چیز بھی اس قسم کی قدرت نمائی کر سکتی ہے۔

یہ نکتہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ زیر بحث آیت میں لفظ "ساحر" پہلی مرتبہ نکرہ کی شکل میں اور بعد میں اسمِ معرف کی صورت میں اہم نہیں کے ساتھ آیا ہے۔ یہ فرق شاید اس بنا پر ہو کہ پہلی مرتبہ تو قصہ یہ ہے کہ ان جادوگروں کے کام سے بے اعتنائی برتی جائے اور جملے کا منہم یہ ہے کہ جو کام انہوں نے کیا ہے وہ کسی جادوگر کے سحر سے زیادہ کچھ نہیں ہے لیکن دوسری مرتبہ اس حقیقت کو سمجھانا چاہتا ہے کہ نہ صرف یہ جادوگر بلکہ ہر جادوگر، جس زمانہ، اور جس جگہ پیدا ہو، وہ کامیاب اور فلاح یافتہ نہیں ہوگا۔

چند اہم نکات :

۱۔ جادو کی حقیقت کیا ہے؟ اگرچہ ہم اس سے پہلے تفصیل کے ساتھ اس سلسلے میں بحث کر چکے ہیں، لیکن ہم اس مقام پر بھی مختصر وضاحت کے طور پر، چند جملے بیان کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔ "سحر" دراصل ہر اس چیز اور ہر اس کام کے معنی میں ہے کہ

۱۔ اردو میں اسے "ایک لینا گھسنے جی"۔

جس کا مافذ معنی اور پتہ نہ ہو لیکن روزِ مہر کی زبان میں ایسے غیر معمولی کاموں کو کہا جاتا ہے کہ جو مختلف وسائل سے استفادہ کر کے انجام پاتے ہیں۔

کبھی تو اس میں محض پالا لکڑی، دھوکہ، فریب نظر اور ہاتھ کی صفائی ہوتی ہے۔

کبھی بعض اجسام و مواد کے طبیعیاتی و کیمیائی غیر معلوم خواص سے استفادہ کیا جاتا ہے اور کبھی شیاطین سے مدد لی جاتی ہے۔

تاریخ میں ہمیں جادو اور جادوگروں کے بارے میں بہت سے واقعات ملتے ہیں۔ اور آج بھی ہمارے اس زمانہ میں ایسے کام جو اس قسم کے کاموں میں مشغول ہیں کم نہیں ہیں۔ لیکن چونکہ موجودات کے بہت سے خواص جو گزشتہ زمانہ میں عام لوگوں سے مخفی تھے، آج کے زمانے میں واضح اور آشکار ہو گئے ہیں، یہاں تک کہ مختلف موجودات کے تعجب انگیز آثار کے بارے میں بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ لہذا جادوگروں کے جادو کا بہت سا حصہ ان کے ہاتھ سے چھین گیا ہے۔

مثلاً آج ہم علم کیمیاء کے ذریعے بہت سے ایسے اجسام کو جلاتے ہیں کہ جن کا وزن بھروسے بھی زیادہ ہوتا ہے اور اگر انہیں کسی جسم کے ساتھ رکھا جائے تو کم نہیں ہے کہ اس جسم میں حرکت پیدا ہو جائے اور کسی کو اس سے تعجب بھی نہ ہوگا۔ یہاں تک کہ موجودہ زمانے کے بچوں کے بہت سے کھلونے شاید گزشتہ زمانے میں جادو کی کوئی قسم معلوم ہوتے ہوں۔

آج کل سرکسوں میں ایسی نشانیں دکھائی جاتی ہیں، کہ جو گزشتہ زمانے کے جادوگروں کے جادو کے مشابہ ہیں، آئینے، طبیعیاتی اور کیمیائی خواص کے غوامض کی چمک سے، کئی طرح سے استفادہ کرتے ہوئے، عجیب و غریب منظر پیش کیے جاتے ہیں، کہ جنہیں دیکھ کر بعض اشخاص دیکھنے والوں کے منہ کھلنے کے کھلے رہ جاتے ہیں۔

البتہ ریاضت کرنے والوں کے غیر معمولی اعمال اپنے مقام پر خود ایک علیحدہ داستان ہیں۔ جو بہت ہی حیرت انگیز اور تعجب نیز ہیں۔ بہر حال جادو اور سحر کوئی ایسی چیز نہیں کہ جس کا انکار کیا جائے یا اسے عرفات اور فضول باتوں سے نسبت دی جائے، چاہے گزشتہ زمانہ میں ہو یا موجودہ زمانہ میں۔

قابلِ توجہ نکتہ یہ ہے کہ جادو اسلام میں منوع اور گناہانِ کبیرہ میں سے ہے۔ کیونکہ بہت سے موقعوں میں، لوگوں کے گمراہ ہونے، حقائق کی تحریف کرنے اور سادہ لوح افراد کے عقائد کی بنیاد کو متزلزل کرنے کا باعث ہو جاتا ہے۔ البتہ اس اسلامی حکم میں، بہت سے دوسرے احکام کی مانند، استثنائی صورتیں بھی ہیں۔ منجملہ ان کے نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرنے والے کے دعوے کو باطل کرنے کے لیے یا جادو کا اثر کو ان لوگوں سے دور کرنے کے لیے کہ جو اس سے تکلیف اٹھا رہے ہوں، جادو کا سیکنا مستثنیٰ ہے۔

سورۃ بقرہ کی آیت ۱۰۲ و ۱۰۳ کے ذیل میں بھی، اس تفسیر کی پہلی جلد میں، ہم اس بارے میں تفصیل کے ساتھ بات کر چکے ہیں۔

۲۔ جادوگر، کبھی بھی کامیاب نہیں ہوتا؟ بہت سے لوگ پوچھتے ہیں کہ اگر جادوگر خارقِ عادت کام — جو کہ ہرگز سے مشابہ ہیں — انجام دے سکتے ہیں تو پھر ان کے کاموں اور سحر میں کس طرح فرق کیا جاسکتا ہے؟

اس سوال کا جواب ایک نکتے کی طرف توجہ کرنے سے واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ جادوگر کا کام ایک محدود انسانی قوت کے لئے

ہوتا ہے اور سحر خدا کی بے پایاں اور لازوال قدرت سے معروضِ وجود میں آتا ہے۔

لہذا جادوگر کچھ محدود کام ہی سرانجام دے سکتا ہے اور اگر وہ ان کے علاوہ کچھ اور کرنا چاہے تو عاجز ہو جاتا ہے۔ وہ صرف انہی کاموں کو انجام دے سکتا ہے جن کی اُس نے پہلے سے شن کی ہو اور ان کا ماہر ہو اور ان کے بیج و دم سے آگاہ ہو لیکن ان کے علاوہ دوسرے ممکن میں وہ بالکل عاجز و لاچار ہوگا جبکہ انبیاء و رسل چونکہ خدا کی لازوال قدرت سے مدد لیا کرتے تھے، وہ زمین و آسمان میں ہر طرح اور ہر قسم کا خارقِ عادت کام انجام دینے پر قادر تھے۔

جادوگر لوگوں کی فرمائش کے مطابق خارقِ عادت کام انجام نہیں دے سکتا، مگر یہ کہ اتفاقاً طور پر اس کے کام کے مطابق ہو جائے۔ وگرنہ وہ بعض اوقات اپنے ایسے دوستوں و جنہیں لوگ پہچانتے نہیں ہیں یہ بات سکھا دیتے ہیں کہ وہ لوگوں کے درمیان میں سے اٹھ کھڑے ہوں اور وہ فرمائشیں کریں جو پہلے سے ممکن شدہ ہیں۔

لیکن انبیاء بارہا اور کئی اہم ہجرات کہ جو حق کے متلاشی لوگ ان سے سببِ نبوت کے طور پر طلب کیا کرتے تھے انجام دیتے رہے ہیں۔ جیسا کہ ہم حضرت موسیٰ کی اسی سرگزشت میں مشاہدہ کریں گے۔

اس کے علاوہ جادو چونکہ ایک اخلاقی کام ہے اور ایک قسم کا دھوکا اور فریب ہے۔ لہذا فطری طور پر ایسی طبیعتیں چاہتا ہے کہ جو اس سے ہم آہنگ ہوں اور جادوگر بلا استثناء دھوکا باز، سکار اور فریبی قسم کے لوگ ہوتے ہیں، جنہیں ان کے مزاج اور اعمال و کردار کے مطالعے اور تحقیق سے، بہت جلد پہچانا جاسکتا ہے۔ جبکہ انبیاء کا اخلاص و پاکیزگی اور پاکبازی ایک ایسی سند ہے کہ جو ان کے اعجاز کے ساتھ مل کر اس کے اثر کو کئی گنا کر دیتی ہے، (غور کیجئے گا)۔

اور شاید یہی وجہ ہے کہ زیرِ نظر آیت کہتی ہے،

وَلَا يَفْلَحُ السَّاحِرُ حَيْثُ اتَىٰ

جادوگر کہیں بھی ہو، اور جن حالات اور جس زمانہ میں ہو وہ فلاح اور کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔

بقرہ معروف بہت جلد اس کا بھانڈا پھوٹ جاتا ہے، کیونکہ اس کی قوت محدود ہوتی ہے اور اس کے افکار و صفات اخلاقی پختہ ہیں۔ یہ بات صرف انہی جادوگروں کے ساتھ مخصوص نہیں ہے کہ جو انبیاء کے مقابلے میں آتے تھے، بلکہ تمام جادوگروں پر پوری طرح صادق آتی ہے کہ وہ جلد ہی پہچان لیے جاتے ہیں اور کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔

۴۰۔ فَالْقَى السَّحَرَةُ سُجَّدًا قَالُوا آمَنَّا بِرَبِّ هَارُونَ وَمُوسَىٰ ۝

۴۱۔ قَالَ أَمْتُمْ لَمْ قَبْلَ أَنْ أَدْنِ لَكُمْ إِنَّهُ لَكَبِيرُكُمُ الَّذِي عَلَّمَكُمُ الْبَحْرَ

فَلَا قُطْعَنَ أَيْدِيكُمْ وَأَرْجُلُكُمْ مِنْ خِلَافٍ وَلَا صَلْبَتَكُمْ فِي جُذُوعٍ

- ۴۱۔ التَّغْلُ وَلْتَعْلَمَنَّ إِنَّمَا أَشَدُّ عَذَابًا وَأَبْقَىٰ
 ۴۲۔ قَالُوا لَنْ نُؤْثِرَكَ عَلَىٰ مَا جَاءَنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالَّذِي فَطَرَنَا
 فَاقْضِ مَا أَنْتَ قَاضٍ إِنَّمَا تَقْضِي هَذِهِ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا
 ۴۳۔ إِنَّا آمَنَّا بِرَبِّنَا لِنَغْفِرَ لَنَا خَطِيئَاتِنَا وَمَا أَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ
 وَاللَّهُ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ
 ۴۴۔ إِنَّهُ مِنْ رَبِّهِ مُجْرِمًا فَإِنَّ لَهُ جَهَنَّمَ لَا يَمُوتُ فِيهَا
 وَلَا يَحْيَىٰ
 ۴۵۔ وَمَنْ يَأْتِهِ مُؤْمِنًا هَدَعَمَلِ الصَّالِحِينَ فَالْوَلِيكَ لَهُمُ الدَّرَجَاتُ
 الْعُلَىٰ
 ۴۶۔ جَنَّاتُ عَدْنٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَذَلِكَ
 جَزَاءُ مَنْ تَزَكَّىٰ

ترجمہ

- ۴۰۔ (موسیٰ نے اپنا عصا پھینکا اور جو کچھ اُس نے بنا رکھا تھا وہ اسے نکل گیا تو) سب کے سب جادوگر سجدے میں
 گر پڑے اور انہوں نے کہا ہم دُروں اور موسیٰ کے پروردگار پر ایمان لائے ہیں۔
 ۴۱۔ (فرعون نے) کہا: کیا میری اجازت ہے بغیر تم اس پر ایمان لے آئے ہو، یقیناً وہ تمہارا بڑا ہے کہ جس نے تمہیں
 جادو سکھا ہے۔ یقیناً میں تمہارے ایک ٹاٹ کا ٹاٹہ اور دوسری طرف کا پاؤں کاٹ ڈالوں گا اور کھجور کے تنوں کے اوپر
 تمہیں سولی چڑھا دوں گا اور تم جان لو گے کہ ہم تم سے کس کی سزا زیادہ دردناک اور زیادہ پائیدار ہے۔
 ۴۲۔ انہوں نے کہا: اُس خدا کی قسم کہ جس سے ہم پیدا کیا ہے ہم واضح و روشن دلائل پر جو ہم تک پہنچی ہیں، تجھے ہرگز متحم
 نہ رکھیں گے۔ جو حکم تو کرنا چاہے کہ کسی کو تو صرف اس دُنیا کی زندگی میں حکم چلا سکتا ہے۔
 ۴۳۔ ہم اپنے پروردگار پر ایمان لائے ہیں تاکہ وہ ہمارے گناہوں کو اور جو جادو کرنے کے لیے تو نے ہمیں مجبور کیا اسے بخش دے۔

- اور خدا بہتر اور زیادہ باقی رہنے والا ہے۔
 ۴۴۔ جو شخص مجرم ہو کر اپنے پروردگار کی بارگاہ میں حاضر ہوگا، اس کے لیے جہنم کی آگ ہے کہ جس میں وہ نہ تو مرے گا اور
 نہ جیے گا۔
 ۴۵۔ اور جو شخص مومن ہو اور اُس نے نیک عمل انجام دیئے ہوں (جب وہ اس کی بارگاہ میں حاضر ہوگا) تو اس کے لیے
 عالی درجات ہیں۔
 ۴۶۔ جنت کے دائمی باغات کہ جن کے (درختوں کے) نیچے نہریں جاری ہیں وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے اور یہ اس کی جزا ہے کہ
 جو اپنے آپ کو پاک کرے۔

تفسیر

موسیٰ علیہ السلام کی عظیم کامیابی :

- گزشتہ آیات میں ہم یہاں تک پہنچے تھے، کہ موسیٰ کو یہ حکم دیا گیا، کہ وہ اپنا عصا پھینکیں، تاکہ جادوگروں کے جادو کی کارروائیوں
 کا خاتمہ کریں۔
 زیر بحث آیات میں بھی اسی مسئلہ کو بیان کیا جا رہا ہے۔ البتہ جو جملہ واضح تھے وہ حذف کر دیئے گئے ہیں (یعنی موسیٰ نے اپنا
 عصا پھینکا، عصا ایک عظیم سانپ میں بدل گیا اور جادوگروں کے جادو کے تمام اسباب و آلات نکل گیا، تمام لوگوں میں ایک شور و غل مچا
 فرعون سخت پریشان ہوا، اور اس کے مصاحبین کے منہ حیرت سے کھلنے کے کھلے رہ گئے)۔
 جادوگر، جنہوں نے آج تک بھی اس قسم کا منظر نہیں دیکھا تھا اور جو جادو اور دوسری باتوں کا فرق اچھی طرح سے پہچانتے تھے،
 انہوں نے یقین کر لیا کہ یہ کام خدا کے سوا کچھ اور نہیں ہے اور یہ شخص خدا کا بھیجا ہوا ہے کہ جو انہیں اُن کے پروردگار کی
 طرف دعوت دیتا ہے۔ اُن کے دلوں میں ایک طوفان اُٹھا اور ایک عظیم انقلاب ان کی روح میں پھوٹ پڑا۔
 اب اس بات کا آخری حصہ آیات کی زبان سے سُنتے ہیں :
 ”سب کے سب جادوگر سجدے میں گر پڑے اور انہوں نے کہا: ”ہم موسیٰ و دُروں کے پروردگار پر ایمان لے آئے ہیں“
 (فالقی السحرة بقا قالوا آمنا برب ہارون و موسیٰ)۔
 ”القی“ کی تفسیر (فعل) جملوں سے استفادہ کرتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ موسیٰ کی طرف
 ایسے کھینچے اور ان کے مجبور سے ایسے متاثر ہوئے کہ گویا بے اختیار سجدے میں جا پڑے۔
 یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ انہوں نے صرف ایمان لانے پر ہی قناعت نہیں کی بلکہ انہوں نے اس بات کو اپنی ذمہ داری سمجھا،
 کہ وہ موسیٰ و دُروں کے پروردگار پر اس ایمان لانے کا ایک واضح اور روشن صورت میں اور ایسے جملوں کے ساتھ کہ جن میں کوئی کسی قسم کا
 ابہام نہ ہو یعنی پوری تاکید کے ساتھ اظہار کریں تاکہ اگر کچھ لوگ ان کے اس کام سے متاثر ہو کر گمراہ ہو گئے ہوں تو وہ پلٹ آئیں اور اس

معاذ سے کسی قسم کی جلیب ہی ان کے ذمہ باقی نہ رہے۔

یہ بات واضح اور بدیہی ہے کہ جادوگروں کے اس عمل نے فرعون کے پیکر اور اس کی جابر، خود سر اور ظالم حکومت پر ایک ضرب لگائی اور اس کے تمام ارکان کو ہلاک کر رکھ دیا۔

سارے ملک مصر میں اس مسئلے کے بارے میں مذاقوں پر ہنسنے لگا تھا، اور جادوگروں کو ہر گوشہ و کنار سے اکٹھا کیا گیا اور ان کے لیے کامیابی کی صورت میں طرح طرح کے انعامات اور اعزازات کا وعدہ کیا گیا تھا۔

لیکن اب وہ یہ دیکھ رہا ہے کہ جو لوگ مقابلے کے لیے صبح اقل میں کھڑے تھے وہی ایک دم دشمن کے آگے جھک گئے اور نہ صرف یہ کہ وہ ہر تسلیم فرم کر چکے ہیں بلکہ وہ تو بڑی سختی کے ساتھ اس کا دفاع کرنے لگے اور یہ ایک ایسا مسئلہ تھا کہ جس کے بارے میں فرعون سوچ بھی نہیں سکتا تھا اور بلاشبہ دشمن لوگوں میں سے بھی ایک گروہ جادوگروں کی پیروی کرتے ہوئے موسیٰ اور ان کے دین سے وابستہ ہو گیا تھا۔

لہذا فرعون کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ تھا کہ شور و غل اور سخت اور غلیظ قسم کی دھمکیوں کے ساتھ، اپنی رہی ہوئی بات کو بچائے۔ جادوگروں کی طرف رخ کرتے ہوئے اس نے کہا: کیا تم میری اجازت کے بغیر ہی اس پر ایمان لے آئے ہو (قال امعنم له قبل ان اذن لکم)۔

یہ جابر و مستحکم، نہ صرف اس بات کا مدعی تھا، کہ اس کی لوگوں کے جسم و جان پر حکومت ہے بلکہ وہ یہ کہنا چاہتا تھا کہ تمہارے دل بھی میرے ہی قبضہ و اختیار میں ہیں اور مجھ ہی سے تعلق رکھتے ہیں لہذا تمہارے دل کا ارادہ بھی میری اجازت کے ماتحت ہونا چاہیے۔ یہ وہی کام ہے کہ جو ہر زمانے اور ہر عصر کے فرعون اپناتے ہیں۔

ان میں سے بعض تو فرعون مصر کی طرح، پریشانی کے وقت کھلم کھلا، اپنی زبان سے کہہ دیتے ہیں اور بعض پُر اسرار طریقے سے ذرائع ابلاغ اور رابطہ اجتماعی سے استفادہ کر کے اور مختلف قسم کے سسر لگا کر، علی طور پر اپنے لیے اس حق کے قائل ہیں، اور ان کا نظریہ یہ ہے کہ لوگوں کو آزاد و طور پر سوچنے کی اجازت نہیں دینا چاہیے، بلکہ کبھی کبھی تو آزادی فکر کے نام پر، لوگوں کی آزادی کو سلب کر لینا چاہیے۔

بہر حال فرعون نے اسی بات پر تنازعہ نہ کی، بلکہ فوراً ہی جادوگروں پر ایک فقرہ چست کیا، اور ان پر اتمام لگاتے ہوئے کہا کہ: "یہ تمہارا بڑا ہے، اسی نے تمہیں جادو سکھایا ہے اور یہ پہلے سے طے شدہ منصوبے کے تحت ایک سازش ہے" (انہ لکبیکم الذی علمکم الحس)۔

بلاشبہ فرعون کو معلوم تھا اور اسے اس بات کا یقین تھا کہ جو بات وہ کہہ رہا ہے جھوٹ ہے اور بنیادی طور پر اس قسم کی سازش کو جو سارے مصر کو اپنی لپیٹ میں لے لے اور اس کے جاسوسوں اور خفیہ کارندوں کو خبر دینے پر ممکن نہیں ہے۔ اصلی طور پر موسیٰ کو فرعون نے اپنی آغوش میں پالا تھا اور اسے یہ بھی علم تھا کہ وہ مصر سے غائب رہے ہیں اگر وہ مصر کے جادوگروں سے بڑے ہوتے تو ہر جگہ اس عنوان سے مشہور ہو جاتے اور یہ کوئی ایسی چیز نہیں تھی کہ جسے چھپایا جاسکتا۔

لیکن ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ جس وقت بے لگام اور خود سر لوگ اپنی نامشروع بیشیت کو خطرے میں دیکھتے ہیں تو وہ کسی قسم کے جھوٹ اور تہمت لگانے سے باز نہیں کرتے۔

پھر اس بات پر ہی بس ٹکی بلکہ جادوگروں کو نہایت سخت لہجے میں موت کی دھمکی دیتے ہوئے کہا: "میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں تمہارے ایک طرف کے ہاتھوں کو اور دوسری طرف کے پاؤں کو قطع کر دوں گا اور بلند کھجور کے تنے پر تمہیں سولی چڑھا دوں گا تاکہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ میرا عذاب زیادہ دردناک اور زیادہ پائیدار ہے یا موسیٰ و ہارون کے خدا کا عذاب" (فلا قطعن ابیدیکم وارجلکم من خلاف ولا صلیبتکم و جذوع النخل ولتعلمن اننا اشد عذابا و ابطی)۔

درحقیقت "اننا اشد عذابا" کا جملہ اُس تہدید کی طرف اشارہ ہے کہ جو موسیٰ نے پہلے کی تھی اور اس قسم سے پہلے ہی خصوصیت کے ساتھ جادوگروں کو سنائی دی تھی کہ اگر تم خدا پر جھوٹ باندھو گے تو وہ تمہیں اپنے عذاب سے نیست و نابود کر دے گا۔

"من خلاف" کی تعبیر (تمہارے ہاتھ پاؤں ایک دوسرے کے خلاف کاٹوں گا) اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ دائیں ہاتھ کے ساتھ بائیں پاؤں یا اس کے برعکس۔ شاید جادوگروں کے لیے اس قسم کی سزا کا انتخاب اس لیے تھا کیونکہ اس طرح سے انسان زیادہ دیر میں مرتا ہے، یعنی غور زری زیادہ سست ہوگی اور تکلیف بیشتر ہوگی۔ علاوہ ازیں گویا وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ میں تمہارے بدن کو دونوں طرف سے ناقص کر دوں گا۔

باقی رہی یہ دھمکی کہ تمہیں کھجور کے درخت پر سولی دوں گا، تو یہ شاید اس بنا پر ہو کہ یہ درخت زیادہ اونچے اور بلند ہوتے ہیں اور نزدیک دُور سے سب لوگ اس شخص کو دیکھ لیتے ہیں جو اس پر لٹکا یا گیا ہو۔

یہ نکتہ بھی قابل ملاحظہ ہے کہ اس زمانے میں اس طرح سے سولی نہیں چڑھایا جاتا تھا جس طرح سے ہماری زمانہ میں سولی دیا جاتا تھا۔ وہ سولی کی رسی کو اس شخص کی گردن میں جیسے سولی دینا مطلوب ہوتا تھا، نہیں ڈالتے تھے بلکہ اس کے ہاتھوں یا شانوں سے باندھ دیتے تھے تاکہ وہ تکلیف اٹھاتا رہے۔

آئیے اب یہ دیکھتے ہیں کہ فرعون کی ان شدید دھمکیوں کے جواب میں جادوگروں نے کیا رد عمل دکھایا؟ وہ نہ صرف یہ کہ مرعوب نہیں ہوئے اور اپنی جگہ سے نہیں ہلے اور میدان سے باہر نہ نکلے بلکہ وہ میدان میں مضبوطی سے ڈٹے رہے اور کہا: "اُس خدا کی قسم کہ جس نے ہمیں پیدا کیا ہے، ہمیں جو واضح دلائل میسر آتے ہیں، ہم ان پر ہرگز تجھے مقدم نہ رکھیں گے" (قالوا لن نؤثرثک علی ما جاءنا من البینات والذی فطرننا)۔

"تو جو فیصلہ کرنا چاہے کر لے" (فاقض ما انت قاض)۔

"لیکن یہ جان لے کہ تو تو صرف اس دنیوی زندگی کے بارے میں ہی فیصلہ کر سکتا ہے" (مگر آخرت میں ہم کامیاب ہوں گے اور

تو شدید ترین عذاب میں مبتلا ہوگا) (انما تقضی هذه الحیاة الدنیا)۔

اس طرح سے انہوں نے تین، دو لوگ جملے فرعون سے کہے۔ پہلا یہ کہ تم جان لو کہ، ہم نے جو ہدایت پالی ہے، اسے کسی چیز سے

نہیں بدلیں گے۔ دوسرے یہ کہ ہم تیری دھمکیوں سے کبھی بھی ہراساں نہ ہوں گے۔ تیسرے یہ کہ تیری حکومت و فعالیت یہی چار روز ہے۔

۱۔ مشعر یہ ہے "ولا صلیبتکم فی جذوع النخل" میں "فی" کا لفظ "علی" کے معنی میں ہے یعنی تمہیں ہر جگہ کے درختوں پر سولی لٹکانا اور ان کا نظریہ ہے کہ "فی" یہاں پر اپنا ہی معنی دیتا

کیونکہ "فی" غرضیہ ہے تاکہ ہر جگہ کی غرضت اس سے ثابت ہو کہ ہر جگہ سولی کی لٹکانا اس شخص کے لیے شرط استعمال ہوتی ہے کہ جسے سولی چڑھایا جائے (یعنی تیرے کچھ صحیح نظر نہیں آتی)۔

پھر انہوں نے مزید کہا: "اگر تو یہ دیکھ رہا ہے کہ ہم اپنے پروردگار پر ایمان لے آئے ہیں تو یہ اس لیے ہے تاکہ وہ ہمارے گناہوں کو بخش دے۔ (ہم جادو اور جادوگری کی وجہ سے بہت سے گناہوں کے مرتکب ہو چکے ہیں) (انا انما بنو مننا ليعفينا خطايانا)۔ اور اسی طرح "وہ بڑا گناہ (یعنی رسول خدا کے مقابلے میں جادو کا مظاہرہ) جس کے کرنے پر تو نے ہمیں مجبور کیا تھا، اللہ ہمیں بخش دے جو نے اپنی رحمت میں شامل کرے اور نعرہ ہر چیز سے بستر اذ باقی رہنے والا ہے" (وما اكلهتنا عليه من السحر والله خير والحق)۔

مختصر یہ کہ ہمارا مقصد گزشتہ گناہوں سے پاک ہونا ہے۔ ان میں سے (ایک گناہ) خدا کے سچے پیغمبر کے ساتھ مقابلہ کرنا بھی ہے ہم اس طرح سے یہ چاہتے ہیں کہ سعادت ابدی حاصل کر لیں لیکن تو ہمیں اس دنیا کی موت سے ڈرا رہا ہے۔ یہ بھڑا ساحر اُس علیہ صلائی کے مقابلے میں ہمیں قبول ہے۔

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے کہ جادو گروں نے ظاہر خود اپنی خوشی سے اس میلان میں قدم رکھا تھا۔ اگرچہ فرعون نے اُن سے بہت سے وعدے کیے تھے۔ تو پھر زیر بحث آیت میں "اکراہ" (مجبور کرنا) کیوں آ رہا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ کوئی دلیل ایسی نظر نہیں آتی کہ جادوگر شروع سے ہی اس دعوت کو قبول کرنے پر مجبور نہیں تھے بلکہ "یا قوت اکل ساحر علیہ" (ماورین جاکر ہر ماہر جادوگر کو لے آئیں) (۱۱۳-۱۱۴) کے جملہ کا ظاہری مطلب یہ ہے کہ ہر جادوگر کے لیے اس دعوت کو قبول کرنا لازمی و ضروری تھا۔ یقیناً فرعون کی خود سر اور استبدادی حکومت میں یہ کام بالکل طبعی نظر آتا ہے کہ وہ اپنی فراڈ اور ارادوں کی تکمیل کے لیے لوگوں کو مجبور کرتے تھے۔ باقی رہا اُن میں شوق پیدا کرنے کے لیے انعام و اکرام مقرر کرنا۔ تو یہ اس بات کے منافی نہیں ہے کیونکہ ہم نے اکثر دیکھا ہے کہ بے لگام مستحکم حکومتیں زور اور طاقت سے کام لینے کے ساتھ ساتھ مادی لالچ سے بھی استفادہ کرتی ہیں۔

یہ احتمال بھی پیش کیا گیا ہے کہ جادوگر جو نبی حضرت موسیٰ کے سامنے آئے کچھ قرائن سے ان پر یہ واضح ہو گیا تھا کہ موسیٰ حق پر ہیں یا کم از کم وہ شک و شبہ میں پڑ گئے تھے اور اسی بنا پر ان میں گوسگو کی حالت پیدا ہو گئی تھی جیسا کہ ہم نے اسی سورہ کی آیہ ۶۲ میں پڑھا ہے:

فتنازعوا امرہم بینہم

فرعون اور اس کے درباری اس صورت حال سے آگاہ ہوئے تو انہوں نے انہیں مقابلہ جاری رکھنے پر مجبور کیا۔

جادو گروں نے اس کے بعد اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا کہ اگر ہم ایمان لے آئے ہیں تو اس کی دلیل واضح درویش ہے: "کیونکہ جو شخص بے ایمان اور گنہگار قیامت میں خدا کی بارگاہ میں حاضر ہوگا، اُس کے لیے دوزخ کی جلائے والی آگ ہے" (۱)۔ انہ من یاات ربہ مجرمًا فان له جہنم)۔

اور دوزخ میں سب سے بڑی مصیبت اس کے لیے یہ ہے کہ "اس میں نہ تو وہ مرے گا اور نہ زندہ ہوگا" (لا یموت فیہا ولا یحیی)۔

بلکہ وہ ہمیشہ موت اور زندگی کی کشمکش میں رہے گا ایسی زندگی کہ جو موت سے زیادہ تلخ اور تکلیف دہ ہوگی۔

اور جو شخص اس عظیم بارگاہ میں ایمان اور عمل صالح کے ساتھ پہنچے گا، وہ عالی درجوں پر فائز ہوگا: (ومن یااتہ مؤمنًا فہد مل الصالحات فاولئک لہم الدرجات العلی)۔

"ہمیشہ باقی رہنے والی نعمتیں کہ جن کے درختوں کے نیچے نرس جاری ہیں۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ اس میں رہیں گے۔ (جنات عدن جاری من تحتہا الانہار خالدين فیہا)۔

اور یہ اُس شخص کی جزا ہے کہ جو ایمان اور اطاعت پروردگار کے ساتھ اپنے آپ کو پاک و پاکیزہ کرے" (وذا لک جزا من تکی)۔ آخر کی تین آیات جادو گروں کی اس گفتگو کا حصہ ہیں جو انہوں نے فرعون کے سامنے کی تھی یا خدا کی طرف سے مستقل جملے میں کہ جرمیاں اُن کی گفتگو کی تکمیل کے لیے فرمائے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض انہیں جادو گروں کی گفتگو کا آخری حصہ سمجھتے ہیں اور شاید "انہ" سے شروع ہو تاکہ جو واقعہ علت کے بیان کرنے کے لیے آتا ہے، اس نظریہ کی تائید کرتا ہے۔

لیکن وہ تفصیل جو ان تین آیات میں صالح جو زمین اور مجرم کافروں کے مستقبل کے بارے میں بیان ہوئی ہے اور "ذا لک جزا من تکی" ایس کی جزا ہے جو پاکیزگی اختیار کرے) کے جملہ پر منحصر ہوتی ہے اور وہ اوصاف بھی کہ جنت اور دوزخ کے بارے میں اس میں بیان ہوئے ہیں۔ دوسرے نظریہ کی تائید کرتے ہیں کہ یہ خدا کا حکم ہے۔ کیونکہ جادو گروں کی بات جیسی کر سکتے تھے کہ انہوں نے اس مختصر سی مدت میں معرفت و علوم الہی کا دوا حصہ حاصل کر لیا ہو، کہ جس کی بنا پر وہ جنت و دوزخ اور زمین و مجرمین کے انجام کے بارے میں اس قدر کا دود لوگ اور آگاہانہ فیصلہ کر سکیں۔

مگر یہ کہ ہم یہ کہیں کہ خدا نے ان کے ایمان کی وجہ سے یہ پرمعنی باتیں ان کی زبان پر جاری کر دی تھیں۔ اگرچہ یہ بات خدائی ترتیب اور تجویز کے لحاظ سے ہمارے لیے کوئی فرق نہیں والی کہ خدا نے خود فرمایا ہو یا خدا کی طرف سے تعلیم یافتہ مومنین نے خاص طور پر جبکہ قرآن اسے تائید کے لیے میں بیان کر رہا ہے۔

چند اہم نکات :

۱۔ علم، ایمان و انقلاب کا سرچشمہ ہے : سب سے اہم مسئلہ کہ جو زیر بحث آیات میں نظر آتا ہے، موسیٰ کے مقابلے میں آئے پر جملہ گروں میں پیدا ہونے والی گمراہی اور فوری تبدیلی ہے۔ وہ جس وقت حضرت موسیٰ سے مقابلہ کرنے کے لیے کھڑے ہوئے تھے، تو ان کے انتہائی سخت دشمن تھے لیکن حضرت موسیٰ کا پہلا ہی سجدہ دیکھ کر اس طرح سے مل گئے، بیچارہ ہو گئے اور انہوں نے اپنے راستے کو بدل لیا کہ سب لوگ حیران و ششدر رہ گئے۔

کفر سے ایمان کی طرف، انحراف سے درستی و استقامت کی طرف، کجی سے راستی کی طرف اور ظلمت سے نور کی طرف، اس فوری اور تیزی کے ساتھ راستے کی تبدیلی نے سب کو ایسی بوکھلاہٹ میں ڈالا کہ شاید فرعون کو بھی اس بات پر یقین نہیں آتا تھا۔ لہذا اس نے گوشش کی کہ اسے ایک پہلے سے سوچا سمجھا منصوبہ اور سازش قرار دے حالانکہ وہ خود بھی جانتا تھا کہ اس کی یہ بات جھوٹی ہے۔

کونسا عامل اس گمراہی اور سریل انقلاب ذہنی کا سبب بنا اور کونسا عامل نے نور ایمان اس قوت سے ان کے دل میں چمکایا کہ وہ

اپنے وجود اور ہستی تک کو اس کام کی خاطر داؤ پر لگانے کے لیے تیار ہو گئے۔ یہاں تک کہ تاریخ کتنی ہے کہ فرعون نے اپنی دھمکی عملی جامہ پہنایا اور انہیں اس وحشیانہ طریقے سے شہید کر دیا۔

کیا علم و آگاہی کے سوا کوئی اور عامل یہاں دکھائی دیتا ہے؟ وہ چونکہ جادو کے فنون اور نمونے سے آشنا تھے، اور انہوں نے صاف پر جان لیا تھا کہ موسیٰ کا کام جادو نہیں ہے بلکہ خدائی معجزہ ہے۔ لہذا انہوں نے بڑی جرأت سے اور قاطع انداز میں اپنا راستہ تبدیل کر لیا۔ اس سے ہمیں یہ اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ افراد یا معاشرے میں تبدیلی لانے اور ایک تیز اور سچا انقلاب پیدا کرنے کے لیے ہر چیز سے پہلے انہیں علم و آگاہی دینے کی ضرورت ہے۔

۲۔ ہم تجھے "بیّنات" پر مقدم نہیں کرتے : یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ انہوں نے بے منطق و دلیل فرعون کے مقابلے میں منطقی ترین تصویر کو اختیار کیا۔ پہلے انہوں نے کہا کہ ہم نے موسیٰ کی حقانیت اور اس کی خدائی دعوت پر روشن اور واضح دلائل پیش کیے ہیں اور ہم کسی بھی چیز کو ان روشن اور واضح دلائل پر مقدم نہیں کریں گے۔ اس کے بعد انہوں نے "والذی فطرنا" (وہ ہے جس نے ہمیں خلق فرمایا) کہہ کر اس مطلب کی تاکید کی کہ "فطرنا" ان کی فطرت توحیدی کی طرف گویا ایک اشارہ ہے یعنی ہم اپنی زوج کے اندر بھی نور توحیدی جھلک دیکھ رہے ہیں اور دلیل عقل سے بھی کچھ رہے ہیں تو ان واضح و آشکار دلائل کے ہوتے ہوئے، ہم اس سیدھی راہ کو چھوڑ کر تیرے راستوں پر کیسے چل سکتے ہیں؟

اس بحث کی طرف بھی توجہ کرنا ضروری ہے کہ فرعون کی ایک جماعت نے "والذی فطرنا" کو قسم کے معنی میں نہیں لیا بلکہ اسے "ملجائنا من البیّنات" پر غفلت جانا ہے۔ اس بنا پر پورے جملے کا معنی اس طرح ہوگا : "ہم تجھے ان واضح و روشن دلائل اور اُس خدا پر کہ جس نے ہمیں خلق کیا ہے ہرگز مقدم نہ کریں گے۔"

لیکن پہلی تفسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے کیونکہ ان دونوں کا ایک دوسرے پر غفلت کچھ مناسب نہیں ہے (غور کیجئے گا)۔

۳۔ مجرم سے کون مراد ہے؟ : زیر بحث آیات میں ہے : "جو شخص بھی میدانِ محشر میں مجرم (کی حیثیت سے) وارد ہوگا، اس کے لیے جہنم کی آگ ہے۔"

اس کا ظاہری معنی ہمیشہ ہمیشہ کا عذاب ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہر مجرم کا انجام یہی ہے؟ لیکن اس بات پر توجہ کرتے ہوئے کہ بعد والی آیات میں کہ جو اس کے فریقِ مقابل کو بیان کرتی ہیں، لفظ "مومن" آیا ہے۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہاں "مجرم" سے مراد کافر ہے۔ علاوہ ازیں اس لفظ کا کافر کے معنی میں استعمال قرآن مجید کی اور بھی بہت سی آیات میں دکھائی دیتا ہے۔

مثلاً، قوم لوط کے بارے میں کہ جو ہرگز اپنے پیغمبر پر ایمان نہیں لائی، یہ بیان ہوا ہے کہ :

وَامْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَطَرًا فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِينَ

ہم نے اُن پر پتھروں کی بارش کی، پس دیکھو کہ مجرموں کا انجام کیا ہوا؟ (اعراف ۸۴)

۴۔ اس سلسلے میں ہم سورہ اعراف کی آیہ ۱۲۳ تا ۱۲۶ کے ذیل میں بحث کر چکے ہیں دیکھئے جلد ۲

اور سورہ فرقان کی آیہ ۲۱ میں ہے :

وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِينَ

ہم نے ہر نبی کے لیے مجرموں میں سے کچھ دشمن قرار دیئے ہیں۔

ماحول کی مجبوری ایک بہانہ ہے : زیر نظر آیات میں جادوگرد کی سرگزشت نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ ماحول مجبوری کا مسئلہ ایک جھوٹ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ انسان فاعلِ مختار ہے اور ارادے کی آزادی کا مالک ہے۔ جس وقت بھی ہم ارادہ کرے اسی وقت باطل کی طرف سے حق کی جانب اپنے راستے کو بدل سکتا ہے۔ چاہے اس کے ماحول کے تمام لوگ گناہیں رن اور منحرف ہی ہوں۔ وہ جادوگرد جو سالہا سال سے اسی شرک آلود ماحول میں نہایت شرک آمیز اعمال کے خود شریک ہو رہے تھے جس وقت انہوں نے پختہ ارادہ کر لیا کہ وہ حق کو قبول کریں اور اس کے راستے میں عاشقانہ انداز میں ڈٹ جائیں تو وہ کسی دھمکی سے نڈبے اور اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ عظیم مفسر حرم طبری کے قول کے مطابق :

"كَانُوا أَوَّلَ النَّهَارِ كَفَّارًا سَحَرَةً وَأَخِرَ النَّهَارِ شُهَدَاءَ بَرَّةٍ"

وہ صبح کے وقت تو کافر اور جادوگر تھے اور شام کے وقت راہِ حق کے نیکو کار شہید بن گئے۔

اس سے یہ بات بھی اچھی طرح واضح اور روشن ہو جاتی ہے کہ مذہب کی پیدائش کے بارے میں مادیانِ خصوصاً مارکسٹوں کے افسانے کس قدر زور اور بے بنیاد ہیں، وہ ہر تحریک کا عامل اور سبب اقتصادی مسائل ہی کو سمجھتے ہیں۔ جبکہ یہاں معاملہ بالکل برعکس تھا کیونکہ جادوگر شروع میں ایک طرف تو فرعون کے غلبہ و اقتدار کے دباؤ سے، اور دوسری طرف اس کے اقتصادی لالچ میں آکر حق کے ساتھ مقابلہ کرنے کے لیے میدان میں آئے تھے لیکن اللہ پر ایمان نے ان سب چیزوں کو ختم کر دیا۔ انہوں نے مال و مقام کو بھی کر جس کا فرعون نے اُن سے وعدہ کیا تھا ایمان کے قدموں میں ڈال دیا اور اپنی عزیز جان بھی اس عشق میں قربان کر دی۔

۴۴۔ وَلَقَدْ أَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ أَنِ اسْرِ بِعِبَادِي فَاضْرِبْ لَهُم مَّطَرِيقًا

فِی الْبَحْرِ يَبَسًا لَا تَخَفُ دَرَكًا وَلَا تُخْشَىٰ ۝

۴۸۔ فَاتَّبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ بِجُنُودِهِمْ فَغَشِيَهُمْ مِّنَ الْيَمِّ مَوَاطِئُهُمْ ۝

۴۹۔ وَأَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهُ وَمَهْدَىٰ ۝

۵۔ تفسیر مجمع البیان، ج ۴، ص ۴۶ (آیہ ۱۳۶ سورہ اعراف کے ذیل میں)۔

ترجمہ

- ۷۷۔ ہم نے موسیٰ کی طرف وحی کی کہ راتوں رات میرے بندوں کو (مصر سے) اپنے ساتھ لے جا اور ان کے لیے دریا خشک راستہ بنا دے تاکہ نہ تو (فرعونوں کے) تعاقب سے تجھے خوف ہو اور نہ دریا میں غرق ہونے کا ڈر ہو۔
- ۷۸۔ (اس طرح سے) فرعون نے اپنے لشکر کے ساتھ ان کا تعاقب کیا اور دریائے انہیں (اپنی) پرورش و بوجھ کے دریا پر ہی طرح چھپا لیا۔
- ۷۹۔ اور فرعون نے اپنی قوم کو گمراہ کر دیا اور ہرگز ہدایت نہ کی۔

تفسیر

بنی اسرائیل کی نجات اور فرعونوں کا غرق ہونا:

جب حضرت موسیٰ نے جاوگروں پر دو ٹوک اور نمایاں کامیابی حاصل کر لی اور کثیر تعدد میں موجود یہ یادو گر آپ پر ایمان لے آئے تو آپ کا دین باقاعدہ طور پر مصر کے لوگوں کے افکار و اذہان میں داخل ہو گیا۔ اگرچہ قطیوں کی اکثریت نے اسے قبول نہیں کیا لیکن یہ ان کے لیے ہمیشہ ایک سنگ بنیاد بنا رہا۔ مصر میں بنی اسرائیل اقلیت میں تھے تاہم حضرت موسیٰ کی رہبری میں ہمیشہ کے لیے آل فرعون کے ساتھ ان کی معرکہ آرائی شروع ہو گئی۔

کئی سال اسی طرح سے گزر گئے اور کئی تلخ دشیریں حادثات پیش آئے۔ جن کے بعض حصے قرآن نے سورۃ اعراف کی آیہ ۱۲۷ کے بعد بیان کیے ہیں۔

زیر بحث آیات میں ان واقعات کا آخری حصہ یعنی بنی اسرائیل کے مصر سے نکلنے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے :

ہم نے موسیٰ کی طرف وحی کی کہ میرے بندوں کو راتوں رات مصر سے باہر نکال کر لے جا (ولقد اوحیناالی موسیٰ ان اسر بعبادی)۔

بنی اسرائیل، معینہ علاقے (فلسطین) کی طرف چلنے کے لیے تیار ہو گئے لیکن جس وقت وہ دریائے نیل کے کنارے پہنچے تو فرعونوں کو خبر ہو گئی۔ فرعون نے ایک بڑے لشکر کے ساتھ ان کا پیچھا کیا۔ بنی اسرائیل نے اپنے آپ کو دریا اور دشمن کے محاصرہ میں پایا۔ ایک طرف عظیم دریائے نیل اور دوسری طرف خفیف و غضب میں ڈوبا ہوا طاقتور اور خونخوار دشمن۔

لیکن خدا تو یہ چاہتا تھا کہ اس صاحب ایمان و محروم و بترسیدہ قوم کو ظالموں کے چنگل سے نجات بخندے اور لشکروں کو ہلاک و نابود کر دے۔

اُس نے موسیٰ کو حکم دیا : "ان کے لیے دریا میں خشک راستہ بنا دے" (فاضرب لھو طریقا فی البحر یدیا)۔

ایسا راستہ کہ جس وقت تم اس میں قدم رکھو تو "نہ فرعونوں کے پیچھا کرنے کا خوف ہو اور نہ ہی دریا میں غرق ہونے کا"۔

فرد گنا ولا تخشی۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ نہ صرف راستہ بن گیا بلکہ یہ راستہ، خدا کے حکم سے ایک خشک راستہ تھا۔ حالانکہ عموماً ایسا ہوتا ہے کہ اگر نہ دریا کا پانی ٹھٹ بھی جائے تو پھر بھی اس کی نشیبی جگہیں مدقوں قابل عبور نہیں ہوتیں۔

مصر میں "مصرات" میں کتا ہے کہ "دوک" (بروزن "مرگ") سمندر کی گہرائی کے سب سے نچلے حصہ کے معنی میں ہے۔ "بروزن" "دوک" (مرگ) کہا جاتا ہے جسے دوسری ری کے ساتھ اس لیے جوڑتے ہیں تاکہ وہ پانی تک پہنچ جائے۔ اسی طرح "بروزن" "دوک" میں انہیں بھی "دوک" کہتے ہیں۔ "درکات نار" "درجات جنت" کے مقابلہ میں "دورج" کے مراحل کے معنی میں ہے۔

لیکن سورۃ شرا کی آیت ۶۱ کے مطابق۔ جب بنی اسرائیل فرعون کے لشکر کی آمد سے باخبر ہوئے تو انہوں نے موسیٰ سے کہا "المد رکون"۔ "ہم تو فرعونوں کے چنگل میں پھنس گئے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ زیر بحث آیت میں "دوک" سے مراد یہ ہے کہ تمہیں اس طرح سے گرفتار بھی نہیں کیا جائے گا اور "لا تخشی" کا مطلب یہ ہے کہ دریا کا بھی تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔

اس طرح موسیٰ اور بنی اسرائیل ان راستوں میں داخل ہو گئے کہ جو دریا میں پانی کے ٹھٹ جانے کی وجہ سے پیدا ہو گئے تھے اس موقع پر فرعون اپنے لشکر کے ساتھ دریا کے کنارے پہنچ گیا اور اس نے یہ غیر متوقع اور حیرت انگیز منظر دیکھا "اور فرعون نے اپنے لشکر کو بنی اسرائیل کے پیچھے لگا دیا۔ اور خود بھی اسی راستہ پر چلنے لگا" (فاتبعھو فرعون بحیوہ)۔

مسلم طور پر فرعون کا لشکر شروع میں اس بات کو پسند نہیں کرتا تھا کہ اس خطرناک ناشاختہ جگہ میں قدم رکھے اور بنی اسرائیل کا پیچھا کرے۔ کم از کم ایسے عجیب و غریب معجزے کا مشاہدہ انہیں اس راستے پر چلنے سے روکنے کے لیے کافی تھا۔

لیکن فرعون۔ جس کے دماغ میں غرور و نخوت کی ہوا بھری ہوئی تھی۔ ہٹ دھرمی اور سرکشی پر تلا ہوا تھا، وہ ایک ایسے عظیم معجزے کے پاس سے بے اعتنائی کے ساتھ گزر گیا اور اپنے لشکر کو ان انجانے دریا کی راستوں میں داخل ہونے کے لیے ابھارا۔ اور فرعون کے لشکر کا پلا آدی دریا میں اُترا اور اُدھر بنی اسرائیل کا آخری شخص دیا سے باہر نکل گیا۔

اُس وقت پانی کی موجوں کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنی پہلی جگہ پر پلٹ آئیں، موجیں اُس فرسودہ عمارت کی مانند کہ جس کی بنیادیں نکال دی جائیں، ایک دم ان کے اوپر آپڑیں : "اور وہ پوری طرح دریائے نیل کی ٹھاٹھیں مارتی ہوئی موجوں کے نیچے چھپ گئے (فغشیھو من ایوم ما غشیھو)۔

اور اس طرح سے ایک جابر و سنگر اپنے طاقتور اور زبردست لشکر کے ساتھ پانی کی موجوں میں غوطے کھانے لگا۔ اور اُس کے لشکر کی

۱۔ اس جگہ کی تفسیر میں ایک اور احتمال بھی پیش کیا جاتا ہے کہ "با"۔ "بحیوہ"۔ "میں"۔ "مع" کے معنی میں ہے اور اس جگہ کا یہ معنی ہے :

"فرعون نے اپنے لشکر کے ساتھ بنی اسرائیل کا پیچھا کیا" اگرچہ ان دونوں تفسیروں کے درمیان کوئی خاص فرق نہیں ہے۔

۲۔ "یم"۔ سمندر کے معنی میں ہے اور عظیم دریائے نیل کے معنی میں ہے کہ یہ ایک قدیم مصری لفظ کا لفظ ہے ذکر عربی۔ مزید وضاحت کے لیے تفسیر نزہ کی جلد ۳ (۲۳۵) اردو ترجمہ کے حاشیہ کی طرف رجوع کریں۔

دریا کی پھیلیں کا قعر بن گئے۔

ہاں "فرعون نے اپنی قوم کو گمراہ کیا اور ہرگز انہیں ہدایت نہ کی" (واضل فرعون قومہ وما ہدٰی)۔

یہ ٹھیک ہے کہ "اصل" اور "ماہڈی" کے جملے تقریباً ایک ہی مفہوم دیتے ہیں اور شاید اسی بنا پر بعض مفسرین نے اسے تاکید سمجھا ہے لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ دونوں آپس میں فرق رکھتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ "اصل" تو گمراہ کرنے کی طرف اشارہ ہے اور "ماہڈی" گمراہی کے واضح اور روشن ہونے کے بعد ہدایت نہ کرنے کی طرف اشارہ ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ ایک رہبر سے بعض اوقات اشتباہ بھی ہو جاتا ہے اور اپنے پیروکاروں کو غلط اور انحرافی راستے پر چلانے لگتا ہے لیکن جب وہ متوجہ ہو تو فوراً انہیں صحیح راستے کی طرف پلٹا کر لے جاتا ہے لیکن فرعون اس قدر ہٹ دھرم تھا کہ گمراہی کا شاہدہ کرنے کے بعد بھی اس نے اپنی قوم سے حقیقت کو بیان نہیں کیا اور انہیں اس طرح سے بے راہ روی کی طرف کھینچتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ اور اس کی قوم سب نابود ہو گئے۔

بہر حال یہ جملہ درحقیقت فرعون کی اُس بات کی کہ جو سورہ مومن کی آیہ ۲۹ میں بیان ہوئی ہے نفی کرتا ہے:

وما اھدیکموا لاسبیل الرشاد

میں تمہیں سیدھی راہ کی ہی ہدایت کرتا ہوں۔

واقعات نے نشانہ ہی کر دی ہے کہ اس کا یہ جملہ — اس کے دوسرے جھوٹوں کی طرح — ایک بہت بڑا جھوٹ تھا۔

۸۰۔ یٰبَنِی إِسْرَآئِیْلَ قَدْ اٰنْجٰیْنٰکُمْ مِّنْ عَدُوِّکُمْ وَوَعَدْناکُمْ

جَانِبَ الطُّورِ الْاَیْمَنِ وَنَزَّلْنَا عَلَیْکُمُ الْمَنَّٰ وَالسَّلٰوٰی ۝

۸۱۔ کُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰکُمْ وَلَا تَطْغَوْا فِیْہِ فِیْعَلْ عَلَیْکُمْ

غَضَبِیْ وَمِنْ یُّحْلِلْ عَلَیْہِ غَضَبِیْ فَقَدْ هَوٰی ۝

۸۲۔ وَاِنِیْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَامِنْ وَعَمِلْ صَالِحًا ثَوَّاهُ تَدٰی ۝

ترجمہ

۸۰۔ اے بنی اسرائیل ہم نے تمہیں تمہارے دشمن (کے پھیلنے) سے نجات دی اور کوہ طور کی دائیں طرف کے لیے تمہارے ساتھ وعدہ کیا اور تم پر من و سلوٰی نازل کیا۔

۸۱۔ وہ پاکیزہ رزق کر جو ہم نے تمہیں دیا ہے اُس میں سے کھاؤ۔ لیکن اس میں سرکشی نہ کرو (ورنہ) میرا غضب تم پر آئے گا اور جس پر میرا غضب آیا وہ تباہ ہو گیا۔

۸۲۔ میں ان لوگوں کو بخش دوں گا کہ جو توبہ کر لیں، ایمان لے آئیں اور عمل صالح انجام دیں، اس کے بعد ہدایت پر رہیں۔

تفسیر

نجات کی واحد راہ :

گزشتہ آیات میں بنی اسرائیل کی آل فرعون کے پھیلنے سے نجات کا بیان ایک عظیم معجزہ کی صورت میں کیا گیا تھا۔ اب زیر نظر تمیز آیات میں بنی اسرائیل سے عمومی اعتبار سے گفتگو ہو رہی ہے اور انہیں وہ عظیم نعمتیں یاد دلاتی جا رہی ہیں جو خدا نے انہیں بخشی ہیں اور انہیں راہ نجات کی نشاندہی کی جا رہی ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے : اے بنی اسرائیل ! ہم نے تمہیں تمہارے دشمن کے پھیلنے سے روکی بخشی (یا بنی اسرائیل

قد انجیناکم من عدو کو)۔

یہ بات واضح ہے کہ ہر مثبت فعالیت کی بنیاد دوسروں کے تسلط اور غلبہ سے نجات پانا اور استقلال و آزادی کا حصول ہے۔

اسی بنا پر سب سے پہلے اسی چیز کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

اس کے بعد ایک اہم معنوی نعمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے : "ہم نے تمہیں ایک مقدس وعدہ گاہ کی طرف دعوت دی، کوہ طور کے دائیں طرف، جو دہی الہی کا مرکز ہے : (وواعدنا کو جانب الطور الایمن)

یہ حضرت موسیٰ کے بنی اسرائیل کی ایک جماعت کے ساتھ طور کی وعدہ گاہ کی طرف جانے کے واقعے کی طرف اشارہ ہے۔ اسی وعدہ گاہ میں خدا نے موسیٰ پر تورات کی الواح نازل کیں اور اُن سے باتیں کیں اور پروردگار کے جلوہ خاص کا سب نے مشاہدہ کیا۔

اس کے بعد ایک اہم مادی نعمت — کہ جو بنی اسرائیل کے لیے خدا کا ایک نطفہ خاص تھا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے : ہم نے تم پر "من" و "سلوٰی" نازل کیا : (و نزلنا علیکم المَنَّٰ و السَّلٰوٰی)۔

جب تم اُس بیابان میں سرگرداں تھے۔ پاس کوئی مناسب غذا نہیں تھی، تو نطفہ خدا تمہاری مدد کے لیے آگے بڑھا۔ لذیذ اور خوش کھانا اتنی مقدار میں کہ جتنی تمہیں ضرورت تھی، تمہیں مہیا کیا۔ تم اُس سے استفادہ کرتے رہے۔

اِس بارے میں کہ "من و سلوٰی" سے کیا مراد ہے ؟ مفسرین نے بہت بحث کی ہے، جسے ہم نے اسی تفسیر کی پہلی جلد میں (سورہ بقرہ کی آیہ ۵۷ کے ذیل میں) بیان کیا ہے اور مفسرین کے اقوال نقل کرنے کے بعد ہم نے لکھا ہے کہ، بعید نہیں ہے کہ "من" ایک قسم کا طبعی شہد ہو کہ جو اس بیابان کے قریب کے پہاڑوں میں پایا جاتا تھا، یا یہ ایک مخصوص قسم کا قوت بخش نباتی شیرہ ہو، کہ جو اس بیابان کے اطراف میں آگے ہوتے درختوں سے نکلتا تھا اور "سلوٰی" ایک قسم کا حلال گوشت کہوتر کے مشابہ پرندہ تھا (مزید وضاحت

۱۔ اس واقعہ کی تفصیل چوتھی جلد سورہ اعراف کی ۱۵۵، ۱۵۶ کے ذیل میں مطالب فرمائیں۔

کے لیے جلد اول میں مذکورہ آیت کے ذیل میں رجوع کریں۔

بعد والی آیت میں ان تینوں بیش بہا نعمتوں کا ذکر کرنے کے بعد قرآن انہیں اس طرح سے خطاب کرتا ہے: ہم نے جو یہ روزی تمہیں دی ہے اس میں سے کھاؤ، لیکن اس میں سرکشی نہ کرنا (کلوا من طيبات ما رزقناكم ولا تعطوا فيها)۔ نعمتوں میں طغیان یہ ہے کہ انسان ان سے خدا کی اطاعت اور اپنی سعادت کے لیے استفادہ کرنے کی بجائے، ان کو گناہ شکاری، کفرانِ نعمت، سرکشی اور ادھر ادھر کے افکار کا اسیر بننے کا ذریعہ بنالے جیسا کہ بنی اسرائیل نے کیا۔ ان کو یہ تمام خدا نعمتیں حاصل تھیں اور پھر بھی کفر و طغیان و گناہ کی راہ پر چل پڑے۔

اس کے بعد انہیں خبردار کیا گیا ہے: اگر تم طغیان و سرکشی کر دو گے تو میرا غضب تمہیں دامن گیر ہو جائے گا (فيعمل عليكم غضبي)۔

اور جس پر میرا غضب نازل ہو جائے وہ تباہ و برباد ہو جاتا ہے: (ومن يحلل عليه غضبي فقد هوى)۔ "ہوی" دراصل بلندی سے گرنے کے معنی میں ہے، کہ جس کا نتیجہ عام طور پر نابود ہونا ہے۔ علاوہ ازیں یہاں پر تکرار مقام سے گزنا، اور قرب پروردگار سے دوری اور اس کی جناب سے لاندہ درگاہ ہونے کی طرف بھی اشارہ ہے۔

چونکہ یہ بات ہمیشہ ضروری ہے کہ تنبیہ و تہدید کے ساتھ ساتھ تشویق و بشارت بھی ہوتا کہ اسید و بیم کی قوت کو کہ جو افعال و اعمال کے لیے بنیادی عامل ہے۔ یکساں طور پر اُجھارے اور توبہ کرنے والوں کے لیے دالچی کے دروازوں کو کھلا رکھے۔ لہذا بعد والی آیت کہتی ہے: میں ان لوگوں کو بخش دوں گا کہ جو توبہ کر لیں، ایمان لے آئیں، نیک عمل انجام دیں۔ اور اس کے بعد ہدایت پر بھی قائم رہیں: (واني لغفار لمن تاب وامن وعمل صالحا شعرا هتدي)۔

اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ "غفار" مبالغہ کا صیغہ ہے، یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ خدا اس قسم کے لوگوں کو نہ صرف ایک دفعہ بلکہ بار بار، اپنی بخشش اور مغفرت سے نوازتا ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ توبہ کی پہلی شرط گناہ کا ترک کرنا ہے اور جب انسان کی روح سے گناہوں کی آلودگی برطرف ہو جائے تو اس کے بعد دوسری شرط یہ ہے کہ خدا پر ایمان اور توحید کا نور اس میں جلوہ گر ہو۔

اور تیسرے مرحلہ میں ایمان و توحید کے شکوفے جو کہ اعمالِ صالحہ اور پسندیدہ کام ہیں۔ وجود انسان کی شاخوں پر پھوٹنے چاہئیں۔ لیکن قرآن کی دوسری تمام آیات کے برخلاف کہ جو صرف توبہ، ایمان اور عملِ صالح کی بات کہتی ہیں۔ یہاں پر چوتھی شرط کا "شعرا هتدي" کے عنوان کے تحت اضافہ ہو گیا ہے۔

اس کے معنی کے بارے میں مفسرین نے بہت بحث کی ہے۔ اس ضمن میں مفسرین کی مختلف تفسیروں میں دو زیادہ جاذبِ نظر معلوم ہوتی ہیں۔

پہلی تفسیر: توبہ ہے کہ یہ لاد ایمان و تقویٰ اور عملِ صالح کو دوام بخشنے اور جاری رکھنے کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی توبہ گزشتہ گناہوں کو تو دوسروں کی جہاں ہے اور باعثِ نجات بنتی ہے لیکن شرط یہ ہے کہ توبہ کرنے والا شخص پھر اسی شرک و گناہ کے گڑھے میں نہ جا کرے

دورہ ہمیشہ اس بات پر نظر رکھے کہ شیطانی دوسوے اور اس کا نفس اُسے سابقہ راستے پر ہی نہ لے جائیں۔

دوسری تفسیر: یہ ہے کہ یہ جملہ خدائی رہبروں کی رہبری کو قبول کرنے اور ان کی ولایت کو تسلیم کرنے کے وجہ کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی توبہ و ایمان و عملِ صالح اسی وقت باعثِ نجات ہو سکتے ہیں کہ جب یہ خدائی رہبروں کی ہدایت کے زیر سایہ انجام پذیر ہوں۔ وہ ایک زمانے میں موعوتی تھے، دوسرے زمانہ میں پیغمبر اسلام تھے۔ ان کے بعد امیر المؤمنین علی علیہ السلام تھے اور آج حضرت مہدی (سلام اللہ علیہ) ہیں۔

کیونکہ ارکانِ دین میں سے ایک پیغمبر کی دعوت اور ان کی رہبری کو قبول کرنا ہے اور ان کے بعد ان کے جانشینوں کی رہبری کو قبول کرنا ہے۔

مروجہ طبری اس آیت کے ذیل میں امام باقرؑ سے نقل کرتے ہیں کہ آپؑ نے فرمایا:

"شواہتِ دلی کے جملہ سے مراد ہم اہل بیتؑ کی ولایت کی ہدایت ہے۔

اس کے بعد مزید فرمایا:

فوالله لو ان رجلا عبد الله عمره ما بين الركن والمقام شو

مات ولو سجد لولايته لاحببه الله في النار على وجهه

خدا کی قسم اگر کوئی شخص تمام عمر (خانہ کعبہ کے پاس) رکن و مقام کے درمیان عبادت

کرنے اور پھر دنیا سے اس حالت میں جائے کہ ہماری ولایت کو اُس نے قبول نہ کیا ہو، تو

خدا اُسے سزے کے بل جہنم کی آگ میں پھینکے گا۔

اس روایت کو اہل سنت کے مشہور محدث "ابو القاسم حاکم حکامی" نے بھی نقل کیا ہے۔

یہ معلوم کرنے کے لیے کہ اصل کو ترک کرنا، کس حد تک موجبِ ہلاکت و تباہی ہے، بعد کی آیات میں غور و فکر کرنا ہی کافی ہے۔

کہ بنی اسرائیل موعوتی اور ان کے جانشین ہارون کی ولایت کے دامن کو چھوڑنے اور ان کی ہدایت کی پیروی سے باہر نکل جانے کے سبب

کس طرح سے گویا سالہ پرستی اور شرک و کفر میں گرفتار ہو گئے۔

آلوسی نے تفسیر روح المعانی میں ان روایات میں سے کچھ کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ اہل بیتؑ کی محبت واجب ہونے میں تو

ہمارے نزدیک بھی تردید کی گنجائش نہیں ہے لیکن اس کا بنی اسرائیل اور موعوتی کے زمانے سے کوئی ربط و تعلق نہیں ہے۔

ہماری مندرجہ بالا گفتگو سے واضح ہو جاتا ہے کہ آلوسی کا یہ اشکال بے بنیاد ہے۔

چونکہ اقل توحید محبت کے بارے میں نہیں ہے بلکہ بات رہبری کو قبول کرنے سے متعلق ہے اور دوسرے اہل بیتؑ میں

رہبری کو منحصر کرنا مردود نہیں ہے بلکہ موعوتی کے زمانے میں وہ اور ان کے بھائی ہارون رہبر تھے، اور ان کی ولایت کو قبول کرنا واجب تھا

اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں آنحضرتؐ کی ولایت اور ائمہ اہل بیتؑ کے زمانے میں ان کی ولایت کو قبول کرنا

واجب تھا۔

یہ بات بھی بالکل واضح و روشن ہے کہ اس آیت کے مخاطب اگرچہ بنی اسرائیل ہیں لیکن یہ بات انہیں میں سے کسی ایک کو بھی نہیں یا اگر وہ ان پادوں مراحل کو طے کرے گا، خدا کی مغفرت اور بخشش اس کے شامل حال ہوگی۔

۱۳- وَمَا أَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ يَا مُوسَى ۝

۱۴- قَالَ هُمْ أُولَاءِ عَلَىٰ أَثَرِي وَعَجِلْتُ إِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضَىٰ ۝

۱۵- قَالَ فَإِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْ بَعْدِكَ وَأَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ ۝

۱۶- فَرَجَعَ مُوسَىٰ إِلَىٰ قَوْمِهِ غَضْبَانَ أَسِفًا قَالَ يَقَوْمِ الْوَعْدُ كَمْ

رَبُّكُمْ وَعَدَّا أَحْسَنًا أَفَطَالَ عَلَيْكُمُ الْعَهْدُ أَمْ أَرَدْتُمْ أَن يَحِلَّ

عَلَيْكُمْ غَضَبٌ مِّن رَّبِّكُمْ فَاخْلَفْتُمْ مَوْعِدِي ۝

۱۷- قَالُوا مَا أَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلِكِنَا وَلَكِنَّا حَمَلْنَا أَوْزَارًا مِّن

زِينَةِ الْقَوْمِ فَقَدْ تَفَنَّمَا فَكُذِّبَتْكَ أَلَتِي السَّامِرِيُّ ۝

۱۸- فَأَخْرَجَ لَهُمُ عَجَلًا جَدًّا لَهُ خُورٌ فَقَالُوا هَذَا إِلَهُكُمُ

وَاللَّهُ مُوسَىٰ فَتَنَىٰ ۝

۱۹- أَفَلَا يَرَوْنَ أَنَّهُمْ قَوْلُ اللَّهِ قَوْلًا وَلَا يَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَلَا

نَفْعًا ۝

۲۰- وَلَقَدْ قَالَ لَهُمُ هَارُونُ مِن قَبْلُ يَقَوْمِ إِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهِ ۝

وَلَئِنْ رَبُّكُمُ الرَّحْمَنُ فَاتَّبِعُونِي وَأَطِيعُوا أَمْرِي ۝

۲۱- قَالُوا لَنْ نُتَّبِعَ عَلَيْهِ عٰكِفِينَ حَتَّىٰ يَرْجِعَ إِلَيْنَا مُوسَىٰ ۝

ترجمہ

۸۳- اے موسیٰ! کیا سبب ہوا کہ تو (کوہ طور پر آنے کے لیے) اپنی قوم سے جلدی کر کے آگے پہنچ گیا؟

۸۴- عرض کیا: پروردگار! وہ تو میرے پیچھے پیچھے (آ رہے) ہیں اور میں نے تیری طرف (آنے کی اس لیے) جلدی کی ہے تاکہ تُو مجھ سے راضی ہو۔

۸۵- فرمایا: ہم نے تیری قوم کو تیرے بعد آزمائش میں ڈال دیا ہے اور سامری نے انہیں گمراہ کر دیا ہے۔

۸۶- موسیٰ اپنی قوم کی طرف غصہ میں بھرے ہوئے اور افسوس کرتے ہوئے پلٹے اور (ان سے) کہا: اے میری قوم! کیا تمہارے پروردگار نے تمہارے ساتھ اچھا وعدہ نہیں کیا تھا؟ کیا تم سے میری جلدی کی مدت زیادہ ہو گئی ہے یا تم یہ

چاہتے تھے کہ تم پر تمہارے پروردگار کا غضب ٹوٹ پڑے کہ تم نے میرے وعدے کی مخالفت کی ہے۔

۸۷- انہوں نے کہا: ہم نے اپنے ارادہ و اختیار سے تو تیرے وعدہ کی خلاف ورزی نہیں کی بلکہ (ہوا یہ کہ) ہم (فرعون کی) قوم کے کچھ زیورات اٹھا لائے تھے، ہم نے ان کو (آگ میں) ڈال دیا اور سامری نے بھی اسی طرح (زیور آگ میں) ڈال دیا۔

۸۸- پھر اُس نے (اُنہی گچھے ہوئے زیورات سے) ان کے لیے ایک بچھڑا بنا ڈالا وہ ایک ایسی صورت تھی جس میں سے گلے کی سی آواز آتی تھی اور لوگوں نے کہا کہ یہ تمہارا خدا ہے اور موسیٰ کا خدا بھی یہی ہے۔ (مگر) اُس (سامری) نے فراموش کر دیا۔

(اُس عہد و پیمان کو جو اُس نے خدا سے باندھا تھا)۔

۸۹- کیا وہ یہ نہیں دیکھتے کہ (یہ بچھڑا) ان کا جواب تک نہیں دیتا اور نہ وہ انہیں کوئی نقصان پہنچا سکتا ہے اور نہ ہی انہیں کوئی نفع پہنچا سکتا ہے۔

۹۰- اور بادلوں نے اُن سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اے (میری) قوم! تمہاری اس بچھڑے کے ذریعے سے آزمائش کی گئی ہے اور بلاشبہ تمہارا پروردگار (تو) خدا ہے جس سے۔ پس تم میری پیروی کرو اور میرے فرمان کی اطاعت کرو۔

۹۱- (اس پر) انہوں نے یہ کہا تھا کہ ہم تو (عبادت کے لیے) اسی کے گرد گھومتے رہیں گے۔ (اور بچھڑے کی پرستش ہی جاری رکھیں گے) جب تک کہ خود موسیٰ ہمارے پاس پلٹ کر نہ آئیں۔

تفسیر

سامری کا شور و غوغا:

ان آیات میں موسیٰ اور بنی اسرائیل کی زندگی کا ایک اور اہم حصہ بیان کیا گیا ہے۔ یہ حضرت موسیٰ کے بنی اسرائیل کے نمائندوں کے ساتھ کوہ طور کی وعدہ گاہ پر جلتے اور پھر ان کی غیبت کے زمانے میں بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی سے متعلق ہے۔

پروگرام یہ تھا کہ حضرت موسیٰ تورات کے احکام حاصل کرنے کے لیے کوہ طور پر جائیں اور بنی اسرائیل کے کچھ افراد بھی اس سفر

میں ان کے ساتھ رہیں تاکہ اس سفر میں خدا شناسی اور وحی کے بارے میں نئے حقائق ان کے لیے آشکار ہوں۔ پروردگار سے مناجات کا شوق اور وحی کی آواز سننے کا اشتیاق حضرت موسیٰ کے دل میں موجزن تھا۔ اس طرح سے کہ گویا کہ کو اپنی خبر نہ تھی، اور یہاں تک کہ روایات میں ہے کہ آپ کو کھانے پینے اور آرام کا ہوش نہ تھا۔ لہذا انہوں نے بڑی تیزی کے ساتھ یہ راستے طے کیا اور درمیان سے پہلے اکیلے ہی پروردگار کی وعدہ گاہ میں پہنچ گئے۔ یہاں آپ پر وحی نازل ہوئی "اے موسیٰ! کیا سبب ہوا کہ اپنی قوم سے پہلے ہی آپنا اور اس قدر جلدی کی (وما اعجلک عن قومک یا موسیٰ)۔

موسیٰ نے فوراً عرض کیا، پروردگار! وہ میرے پیچھے آرہے ہیں اور میں نے تیری میعاد گاہ اور مقررہ جگہ پہنچنے کے لیے اس لیے جلدی کی ہے تاکہ تو مجھ سے راضی اور خوشنود ہو (قال هو اولاء علی اثری وعجلت الیک رب لترضی)۔ نہ صرف تیری مناجات اور تیری بات سننے کے عشق نے مجھے بے قرار کیا ہوا تھا بلکہ میں مشتاق تھا کہ جتنا جلدی ہو سکے تیرے قوانین و احکام حاصل کروں اور تیرے بندوں تک انہیں پہنچاؤں اور اس طرح خوب تیری رضا حاصل کروں۔ ہاں! میں تیری رضا کا مشتاق ہوں۔

لیکن آخر میں، پروردگار کے معنوی جلوؤں کے دیدار کی مدت تیس راتوں سے بڑھا کر چالیس راتیں کر دی گئی تھی مختلف قسم کے اسباب جو پہلے سے ہی بنی اسرائیل میں اغراف کے لیے موجود تھے، اپنا کام کر گئے۔ سامری جیسا ہوشیار اور خوف آدمی استوں گیا اس نے کچھ چیزوں سے کام لے کر ایک پتھر بنایا اور قوم کو اس کی پرستش کرنے کی دعوت دی۔ ان چیزوں کے بارے میں ہم بعد میں بات کریں گے۔

اس میں شک نہیں کہ چند ایسی باتیں رونما ہوئیں کہ جو بل کر توحید سے کفر کی طرف ان کے عظیم اغراف کا سبب بنیں جیسے مصر لوگوں کی گوسالہ پرستی یا دیاتے نیل کو عبور کرنے کے بعد بُت پرستی (گاؤ پرستی) کا منظر دیکھنا اور ان کا انہیں کی مانند بُت بنانے کی خواہش کرنا اور اسی طرح موسیٰ کی طور پر ٹھہرنے کی مدت بڑھ جانا اور منافقین کی طرف سے ان کی سوت کی خبر اڑانا اور آخر کار اس قوم کی جہالت و نادانی نے اثر دکھایا کیونکہ اجتماعی واقعات و حادثات عام طور پر کسی تہید کے بغیر پیش نہیں آتے۔ زیادہ سے زیادہ ہوتا یہ ہے کہ کبھی تو یہ مہدات آشکار اور واضح ہوتے ہیں اور کبھی چھپے ہوئے۔

بہر حال شکر اپنی بدترین صورت میں بنی اسرائیل کو دامن گیر ہو گیا۔ خاص طور پر جبکہ قوم کے بزرگ بھی حضرت موسیٰ کے ساتھ میعاد گاہ میں موجود تھے اور اس قوم کے رہبر صرف اور صرف ہارون ہی تھے اور ان کا کوئی مؤثر حامی و مددگار بھی موجود نہیں تھا۔ آخر کار یہی موقع تھا کہ خدا نے موسیٰ کو اسی میعاد گاہ میں فرمایا: ہم نے تمہاری قوم کی تمہارے بعد آزمائش کی ہے لیکن وہ اس امتحان میں پھر سے نہیں اُترے اور سامری نے انہیں گمراہ کر دیا ہے: (قال فان اشد ختنا قومک من بعدک واضلھو السامری)۔

حضرت موسیٰ یہ بات سنتے ہی ایسے پریشان ہو گئے گویا ان کے تن بدن میں آگ لگ گئی ہو۔ شاید وہ دل ہی دل میں

کہتے ہوں گے، میں نے سالہا سال تک خون جگر پیا، زحمتیں اٹھائیں، ہر قسم کے خطرے کا سامنا کیا۔ تب جا کر کہیں اس قوم کو توحید سے آشنا کیا لیکن صد افسوس! میری چند روزہ غیبت میں میری محنتیں برباد ہو گئیں۔ لہذا فوری طور پر "موسیٰ غصے میں بھرے ہوئے اور افسوس کرتے ہوئے اپنی قوم کی طرف پلٹے" (فرجع موسیٰ الی قومہ غضبان اسفا)۔

جس وقت ان کی نگاہ، گوسالہ پرستی کے اس تکلیف دہ منظر پر پڑی تو وہ چیخ اُٹھے، اے میری قوم! کیا تمہارے پروردگار نے تمہارے ساتھ اچھا وعدہ نہیں کیا تھا: (قال یا قوم الوبعدک وربکو وعدا حسنا)۔

یہ اچھا وعدہ یا تو وہ وعدہ تھا کہ جو بنی اسرائیل سے تورات کے نزول اور اس میں آسمانی احکام کے بیان کے سلسلے میں کیا گیا تھا یا یہ نجات پانے اور آل فرعون پر کامیابی حاصل کرنے اور زمین کی حکومت کا وارث بن جانے کا وعدہ تھا یا یہ ان لوگوں کے لیے کہ جو توبہ کریں، ایمان لائیں اور عمل صالح بجالائیں، مغفرت اور بخشش کا وعدہ تھا یا ان تمام امور سے تعلق وعدہ تھا۔

اس کے بعد مزید کہا: "کیا تم سے میری جلدی کی مدت زیادہ ہو گئی ہے؟" (افطال علیک والعہد)۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ: میں نے مانا کہ میری واپسی کی مدت تیس دن سے بڑھ کر چالیس دن ہو گئی تھی مگر یہ کوئی ایسا زیادہ طولانی زمانہ نہیں ہے۔ کیا تمہیں خود ہی نہیں چاہیے تھا کہ اس مختصر سی مدت میں اپنے آپ کو محفوظ رکھتے۔ یہاں تک کہ اگر میں سالہا سال بھی تم سے دور رہتا تو بھی خدا کا دین کہ جس کی میں نے تمہیں تعلیم دی ہے اور وہ معجزات کہ جن کا تم نے خود اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا ہے۔ تمہارے پیش نظر ہونے چاہئیں تھے اور تمہیں میری تعلیمات کی پیروی کرنا چاہیے تھی۔

"یا تم اپنے اس قبیح عمل کے ذریعے یہ چاہتے تھے کہ تمہارے پروردگار کا غضب تم پر نازل ہو، جیسی قوم نے مجھ سے باغی ہوئے عہد کی مخالفت کی ہے" (ام اردتھوان یحل علیک وغضب من ربکو فاخلعتم موعدی)۔

میں نے تم سے یہ عہد لیا تھا کہ تم عقیدہ توحید، اور پروردگار کی خالص اطاعت کی راہ پر قائم رہو گے اور اس سے معمولی سا اغراف بھی نہیں کرو گے مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم نے میری عدم موجودگی میں میری ان ساری باتوں کو بھلا دیا اور میرے بھائی ہارون کا حکم ماننے سے بھی تم نے انکار کر دیا۔

بنی اسرائیل نے جب دیکھا کہ موسیٰ ان پر سخت غصے میں ہیں اور اس بات پر متوجہ ہوئے کہ واقعا انہوں نے بہت ہی بڑا کام انجام دیا ہے تو غصہ تراشی پر اُتر آئے اور کہنے لگے: ہم نے اپنے اختیار کے ساتھ تو تیرے عہد کی خلاف ورزی نہیں کی (قالوا ما اخلعنا موعداک بملکنا)۔

یہ بات واضح ہے کہ کسی بھی شخص کا یہ ارادہ نہیں ہوتا کہ وہ اپنے لیے پروردگار کا غضب خریدے لہذا اس عبارت سے مراد یہ ہے کہ تمہارا عمل اس قسم کا ہے کہ گویا تم نے خود اپنے لیے اس قسم کا ارادہ کر لیا ہے۔

"ملک" (بروزن درکن) اور "ملک" (بروزن پلک) دونوں کسی چیز کے مالک ہونے کے معنی میں ہیں اور بنی اسرائیل کی اس سے مراد یہ تھی کہ ہم اس کام کے کرنے میں صاحب اختیار اور مالک نہیں تھے بلکہ ہم اس سے ایسے متاثر ہوئے کہ دین و دل باغی ہو جاتا رہا (انی العیض)۔

(فنی)

بعض مفسرین نے یہاں "نسیان" کی گراہی اور بے راہ روی کے معنی میں تفسیر کی ہے، یا نسیان کا فاعل موسیٰ کو چاہا ہے اور یہ کہا ہے کہ یہ جملہ سامری کا کلام ہے، وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ، موسیٰ اس بات کو بھول گئے ہیں کہ یہی پھر تمہارا خدا ہے لیکن یہ تمام تفسیریں آیت کے ظاہر کے خلاف ہیں کہ سامری نے موسیٰ اور موسیٰ کے خدا سے کیے ہوئے عہد و پیمان کو بھلا دیا اور بت پرستی کا راستہ اختیار کر لیا۔

یہاں خدا ان بت پرستوں کو توبہ و سزائش کے عنوان سے کہتا ہے: کیا وہ یہ نہیں دیکھتے کہ یہ پھر ان کا جواب تک نہیں دیتا۔ نہ تو ان سے کسی قسم کے ضرر کو دور کر سکتا ہے، اور نہ ہی انہیں کوئی فائدہ پہنچا سکتا ہے: (افلا یرون الا یرجع الیہم قولاً ولا یملک لہم ضراً ولا نفعاً)۔

ایک حقیقی معبود کو کم از کم اپنے بندوں کے سوالات کے جواب تو دینے چاہئیں۔ کیا صرف اس مجسمہ طلائی سے آواز کا سنائی دینا۔ ایسی آواز کہ جس میں کسی ارادہ و اختیار کا احساس نہیں ہے۔ پرستش کرنے کی دلیل بن سکتا ہے؟ اور فرض کریں کہ ان کی باتوں کا جواب دے بھی دے، تو زیادہ سے زیادہ وہ ایک ایسا وجود ہوگا، جیسا کہ ایک ناتواں انسان ہو سکتا ہے؟

کونسی عقل اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ انسان ایک بے جان مجسمہ کی کہ جس سے کبھی کبھی بے معنی آواز نکلتی ہو، پرستش اور اس کے سامنے سر تعظیم جھکائے؟

اس میں شک نہیں کہ اس شور و غوغا میں حضرت موسیٰ کے جانشین اور خدا کے بزرگ غیر ہارون نے اپنی رسالت کے فرائض کو پورے طور پر انجام دیا۔ اور انحراف و فساد سے مقابلہ کرنے کا فریضہ جتنا ان کے لیے ممکن تھا ادا کرتے رہے۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے: "ہارون نے موسیٰ کے میعاد گاہ سے واپس آنے سے پہلے بنی اسرائیل سے یہ بات کہی تھی کہ تم سخت آزمائش میں ڈال دیئے گئے ہو۔ لہذا تم دھوکا نہ کھاؤ اور راہ خدا (توحید) سے منحرف نہ ہو" (ولقد قال لہم ہارون من قبل یا قوم افضا فنتوبہ)۔

اس کے بعد مزید کہا: "تمہارا پروردگار مسلماً وہی بخشنے والا خدا ہے کہ جس نے یہ سب نعمتیں تمہیں مرحمت فرمائی ہیں" (وان ربکم الرحمن)۔

تم غلام تھے، اس نے تمہیں آزادی دی۔ تم اسیر تھے، اس نے تمہیں رہائی بخشی۔ تم گمراہ تھے، اُس نے تمہیں ہدایت کی۔ تم پراگندہ اور بکھرے ہوئے تھے، اُس نے تمہیں ایک الہی انسان کی رہبری کے زیر سایہ جمع اور متحد کیا۔ تم جاہل اور بھٹکے ہوئے تھے، اُس نے تمہیں علم کے نور سے اجالا بخشا اور توحید کے صراطِ مستقیم کی طرف تمہاری ہدایت کی۔

در اصل ہم خود اپنے ارادے سے گوسالہ پرستی کی طرف مائل نہیں ہوتے تھے۔ فرعونوں کے کچھ قیمتی زیورات ہمارے ہاتھ تھے کہ جنہیں ہم نے اپنے سے دور پھینک دیا اور سامری نے بھی انہیں پھینک دیا" (ولکننا حملنا اوزاراً من زینۃ القوم فخذفناھا فخذلک القی السامری)۔

اس بارے میں کہ بنی اسرائیل نے کیا کیا اور سامری نے کیا کیا اور اُپر والی آیات کے جملوں کا حقیقتاً کیا معنی ہے؟ اس میں مفسرین کی مختلف آرا ہیں کہ جن میں نتیجہ کے لحاظ سے کوئی زیادہ فرق نظر نہیں ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ "خذفناھا" یعنی ہم نے اُن زیورات کو جنہیں ہمارے چلنے سے پہلے فرعونوں سے لیا تھا، اُگ میں پھینک دیا۔ سامری کے پاس بھی جو کچھ تھا، اُس نے بھی اُگ میں پھینک دیا۔ یہاں تک کہ وہ بچل گئے تو اُس نے اُن سے گوسالہ بنالیا۔

بعض کہتے ہیں کہ اس جملے کا معنی یہ ہے کہ ہم نے زیورات کو اپنے سے دور پھینک دیا اور سامری نے انہیں اٹھا کر اُگ میں ڈال دیا تاکہ اس سے گوسالہ بنائے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ "فخذلک القی السامری" ان سارے منصوبوں کی طرف اشارہ ہو کہ جو سامری نے جاری کیے تھے۔

بہر حال یہ عام معمول ہے کہ جس وقت کوئی بزرگ اپنے سے چھوٹوں کو اس گناہ کے بارے میں کہ جس کے وہ متکبر ہوتے ہیں ملامت کرتا ہے، تو وہ اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ اپنی طرف سے گناہ کی تردید کریں اور کسی دوسرے کی گردن پر ڈال دیں۔ بنی اسرائیل کے گوسالہ پرستی کرنے والوں نے بھی، جو اپنے ارادہ اور رغبت کے ساتھ توحید سے شرک کی طرف مائل ہوئے تھے، یہی چاہا کہ سارا گناہ سامری کی گردن پر ڈال دیں۔

بہر حال سامری نے فرعونوں کے آلاتِ زینت سے کہ جو فرعونوں نے ظلم و ستم کے ذریعے حاصل کیے ہوئے تھے اور جن کا اس کے علاوہ اور کوئی مصروف نہیں تھا کہ وہ اس قسم کے فعلِ حرام پر فخر ہوں، "ان کے لیے ایک پھر دے کا مجسمہ بنایا جو ایک ایسی صورت تھی، جس میں سے گائے کی سی آواز آتی تھی" (فاخرج لہم عجلاً جسداً الہ خواری)۔

بنی اسرائیل نے جب یہ منظر دیکھا تو ایسا تک حضرت موسیٰ کی تمام توحیدی تعلیمات کو بھول گئے۔ اور ایک دوسرے سے کہنے لگے: یہ ہے تمہارا خدا اور موسیٰ کا خدا! (فقالوا ہذا الہکم و الہ موسیٰ)۔

یہ احتمال بھی ہے، کہ یہ بات کہنے والے سامری، اس کے یار و مددگار اور اس کی سب سے پہلے تصدیق کرنے والے تھے۔ "اور اس طرح سامری نے موسیٰ کے ساتھ، بلکہ موسیٰ کے خدا کے ساتھ کیا ہوا اپنا عہد و پیمان بھلا دیا اور لوگوں کو گمراہی میں پھیلایا

(گزشتہ صفحہ کا نتیجہ حاشیہ)

بعض مفسرین نے اس جملہ کو بنی اسرائیل کی ایک اقلیت سے متعلق سمجھا ہے کہ جنہوں نے گوسالہ کی پرستش نہیں کی تھی۔ (کہتے ہیں کہ ان میں سے چھ لاکھ افراد گوسالہ پرستی کرنے لگ گئے تھے۔ صرف بارہ ہزار افراد توحید پر باقی رہے) لیکن جو تفسیر ہم نے اُپر بیان کی ہے وہ زیادہ صحیح نظر آتی ہے۔

۱۔ "غوار" جگہ تھے اور گوسالہ کی آواز کے معنی میں ہے، اور کبھی آواز کی آواز پر بھی بولا جاتا ہے۔

محبوب (اللہ) تک پہنچ جائے۔۔۔ جس طرح سے کہ خدا موسیٰ بن عمران کے بارے میں اس کے پروردگار کی معادگاہ (میں پہنچنے) کے سلسلے میں بیان فرماتا ہے، کہ "عجلت الیک رب لترضی"۔

۲۔ انبیاء کے انقلاب کی مخالف تحریکیں: عام طور پر انقلاب کے مقابلے میں ایک انقلابی تحریک جو دہیں جاتی ہے جو یہ کوشش کرتی ہے کہ انقلاب سے بچنے کیلئے دہم برہم کر دیا جائے اور معاشرے کو انقلاب سے پہلے والی حالت کی طرف پلٹا دیا جائے۔ اس تاریخ کو سمجھنا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے کیونکہ ایک انقلاب کے برپا ہونے سے تمام گزشتہ فاسد عناصر یک دم نابود اور ختم نہیں ہو جاتے بلکہ عام طور پر کچھ نہ کچھ تبصرت اس کی باقی رہ جاتی ہے۔ وہ لوگ اپنے وجود کی حفاظت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور حالات کے آثار چرھاؤ کے مطابق کھلم کھلا یا خفیہ طریقے سے انقلاب دشمن کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔

بنی اسرائیل کی آزادی اور توحید و استقلال کی طرف موسیٰ بن عمران کی انقلابی تحریک میں سامری اس رجعت پسند تحریک کا سربراہ تھا۔ وہ جو کہ تمام رجعت پسند تحریکوں کے لیڈروں کی طرح۔ اپنی قوم کے مکرور پستوں سے اچھی طرح باخبر تھا اور جانتا تھا کہ ان کمزوریوں سے استفادہ کرتے ہوئے کوئی نہ کوئی فتنہ کھڑا کیا جاسکتا ہے، اس نے کوشش کی کہ ان زیورات اور طلائی چیزوں سے کہ جو دنیا پرستوں کا معبود ہے اور عوام انسان کی توجہ کو اپنی طرف کھینچنے والا ہے گڑسالا بنائے اور اسے ایک خاص طریقے سے ہوا کے چلنے کے رخ پر کھڑا کر دے (ایسی اور طریقے سے کام لے تاکہ اُس سے کوئی آواز نہ سکے۔ موسیٰ کی چند روزہ غیبت کو اُس نے غیبت بھانا یہ بات اُس کی نظر میں تھی کہ بنی اسرائیل نے دیا سے نجات پانے کے بعد اور ایک بُت پرست قوم کے قریب سے گزرتے ہوئے موسیٰ سے (اپنے لیے) ایک بُت بنانے کا اتفاق کیا تھا۔ خلاصہ یہ کہ اُس نے تمام نفسیاتی کمزوریوں اور زمانی و مکانی مناسب موقعوں سے استفادہ کرتے ہوئے، اپنے مخالف توحید منسوبے کا آغاز کر دیا اور اس کے سوا کو اس طرح سے ماہرانہ انداز میں منظم کیا کہ تھوڑی سی مدت میں بنی اسرائیل کی ایک بڑی اکثریت کو راہ توحید سے خوف کر کے شرک کی راہ کی طرف کھینچ لے گیا۔

یہ سازش اگرچہ موسیٰ کے واپس آتے ہی اُن کی قدرت ایمانی اور نوروحی کے پرتو میں اُن کی منطقت سے ناکام ہو گئی لیکن ہمیں سوچنا چاہیے کہ اگر موسیٰ واپس نہ آتے تو کیا ہوتا؟ یقیناً یا تو وہ ان کے بھائی ہارون کو قتل کر دیتے یا وہ انہیں اس طرح سے گورنیشن کر دیتے کہ اُن کی آواز بھی کسی کے کالوں تک نہ پہنچتی۔

ہاں! ہر انقلاب کے آغاز میں اسی طرح کی مخالف تحریکیں ہوتی ہیں اور (اُن سے) پورے طور پر خبردار رہنا چاہیے اور رجعت پسندوں کی معمولی سے معمولی شرک آلود حرکتوں کو نظر میں رکھنا چاہیے اور دشمن کی سازشوں کو شروع میں ہی پھیل دینا چاہیے۔ ضمنی طور پر اس حقیقت کی طرف بھی توجہ رکھنا چاہیے کہ بہت سے سچے انقلابات، مختلف دلائل و وجہ کی بنا پر آغاز میں کسی فرد یا کچھ مخصوص افراد کے سہارے برپا ہوتے ہیں اگر وہ بیچ میں نہ رہیں تو انقلاب کے اُلٹ جانے کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے یہ کوشش کرنی چاہیے کہ جتنا بھی جلدی ہو سکے، انقلابی معیادوں کو معاشرے کی گہرائی میں آثار دیں اور لوگوں کی اس طرح سے تربیت کی جائے کہ انقلاب کے مخالف تمام طوفان انہیں کسی طرح بھی اپنے مقام سے نہ ہلا سکیں اور وہ پہاڑ کی مانند ہر رجعت پسند

ت پرست تحریک کے مقابلے میں ڈٹ جائیں۔
۱۔ یاد دہانی: لفظوں میں یہ سچے رہبروں کی ایک ذمہ داری ہے کہ وہ معیاروں کو۔ اپنے معاشرے کی طرف منتقل کریں، اس تک نہیں کہ اس اہم کام کے لیے کچھ مدت چاہیے لیکن کوشش کرنا چاہیے کہ یہ زمانہ جتنا ممکن ہو۔ کم سے کم ہو۔
اس بارے میں کہ سامری کون تھا اور اس کا انجام کیا ہوا، انشاء اللہ ہم بعد والی آیات میں گفتگو کریں گے۔

۲۔ رہبری کے مراحل: اس میں شک نہیں کہ حضرت ہارون نے حضرت موسیٰ کی غیبت کے زمانے میں اپنی رسالت کے انجام دینے میں معمولی سے معمولی سستی بھی نہیں کی لیکن ایک طرف سے تو لوگوں کی جہالت نے اور دوسری طرف سے مصر میں غلامی اور بُت پرستی کے دور کی رشوات نے ان کی کوششوں پر پانی پھیر دیا۔

مذکورہ بالا آیات کے مطابق انہوں نے اپنی ذمہ داری کو چار سطحوں میں پڑا کیا:

پہلا مرحلہ: یہ کہ ان پر یہ ظاہر کیا کہ یہ واقعہ ایک انتہائی راستہ اور تم سب کے لیے ایک خطرناک آزمائش کا میدان ہے تاکہ سوئے ہوئے دماغ بیدار ہوں اور لوگ بیٹھ کر سوچیں اور اہم چیز یہی تھی (یا قوم انما فتنتم بہ)۔
دوسرا مرحلہ: یہ تھا کہ خدا کی وہ قسم قسم کی نعمتیں، جو موسیٰ کے قیام کی ابتدا سے لے کر فرعون کی جنگل سے نجات پانے کے زمانے تک، بنی اسرائیل کے شامل حال ہوئی تھیں، وہ انہیں یاد دلانیں اور خصوصیت کے ساتھ خدا کی عمومی صفت رحمت کے ساتھ اس کی توصیف کی تاکہ اس کا زیادہ گہرا اثر ہو اور انہیں اس بہت بڑی خطا کی بخشش کی بھی اُمید دلائی جاسکے (وان راکم الرحمن)۔
تیسرا مرحلہ: یہ تھا کہ انہیں اپنے مقام نبوت اور اپنے بھائی موسیٰ کی جانشینی کی طرف متوجہ کیا (فاتبعونی)۔
چوتھا مرحلہ: یہ تھا کہ انہیں ان کی الہی ذمہ داریوں سے باخبر کیا (واطیعوا امری)۔

۲۔ ایک اعتراض کا جواب: مشہور مفسر فرالدین لازمی نے یہاں ایک اعتراض پیش کیا ہے۔ وہ کہتا ہے: شیعہ حضرات علی علیہ السلام کے بارے میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مشہور حدیث: انت منی بمنزلہ ہارون من موسیٰ:

”تجھے مجھ سے وہی نسبت ہے جو موسیٰ کو ہارون سے تھی“ سے ولایت علی کہنے استدلال کرتے ہیں، حالانکہ ہارون نے بُت پرستوں کے عظیم انہوہ کے مقابلے میں ہرگز تقیہ اختیار نہیں کیا تھا اور مرحلت کے ساتھ لوگوں کو اپنی پیروی اور دوسروں کی متابعت ترک کرنے کی دعوت دی تھی۔

اگر واقعاً آیت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان کی رحلت کے بعد خطا کی راہ اختیار کر لی تھی، تو علی (علیہ السلام) پر یہ واجب تھا کہ وہ بھی ہارون کا سا طرز عمل اپناتے۔ منہ پر جاتے اور کسی قسم کا خوف اور تقیہ کیے بغیر ”فاتبعونی واطیعوا امری“ کہتے۔ چونکہ انہوں نے ایسا نہیں کیا اس لیے ہم سمجھتے ہیں کہ امت کا طریقہ کار اس زمانے

میں حق اور درست تھا۔

لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فخرالین رازی نے اس بارے میں دو بنیادی نکات سے غفلت کی ہے۔
۱۔ یہ جو انہوں نے کہا ہے کہ علی علیہ السلام نے اپنی خلافت بلا فصل کے متعلق کسی بات کا اظہار نہیں کیا، اشتباہ ہے اور غلط ہے کیونکہ ہمارے پاس بیشمار حوالے لیے موجود ہیں کہ امامؑ نے مختلف مواقع پر اس امر کو بیان فرمایا ہے کہ میری خلافت کا دور دورہ اور کبھی درپردہ طریقے سے۔ کتاب حج البلاغہ میں آپ کے کلام کے مختلف حصے نقل آتے ہیں، مثلاً خطبہ شتقیہ، خطبہ سوم خطبہ ۸۷، خطبہ ۹۷، خطبہ ۹۸، خطبہ ۱۵۴ اور خطبہ ۱۴۷، کہ جو سب کے سب اس سلسلے میں بیان ہوئے ہیں۔
تفسیر نمونہ کی تیسری جلد میں سورہ مائدہ کی آیہ ۶۷ کے ذیل میں واقعہ غدیر کے بیان کرنے کے بعد ہم نے متعدد روایات نقل کی ہیں کہ خود حضرت علیؑ نے بار بار اپنی حیثیت اور خلافت بلا فصل ثابت کرنے کے لیے حدیث غدیر سے استناد کیا ہے (مزید وضاحت کے لیے جلد ۲، ص ۲۸ کے بعد کے صفحات کی طرف رجوع کریں)۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد مخصوص حالات تھے۔ وہ منافق کہ جو وفات پیغمبر کے انتقال میں دن گن رہے تھے انہوں نے خود کو از سر نو اسلام پر آخری ضرب لگانے کے لیے تیار کر لیا تھا۔ لہذا ہم دیکھتے ہیں کہ اصحاب الردہ (اسلامی انقلاب کے مخالف گروہ) نے فوراً ابوبکرؓ کی خلافت کے زمانہ میں قیام کیا۔ اگر مسلمانوں کی وحدت، اجتماعیت اور ہوشیاری نہ ہوتی تو ممکن تھا کہ وہ اسلام پر بغاوت کوئی ضربیں لگاتے۔ علیؑ نے اس امر کی خاطر بھی خاموشی اختیار کی کہ دشمن غلط فائدہ نہ اٹھائے۔
اتفاق کی بات یہ ہے کہ حضرت اہل بیتؑ نے بھی۔ باوجود اس کے کہ موٹے زندہ تھے۔ بھائی کی سرزنش کے جواب میں کہتے تھے کہ تباہی کیوں کی صریحاً یہی کہا کہ :

انی خشیت ان تقول خرقۃ بین بنی اسرائیل
میں اس بات سے ڈرا کہ تو مجھ سے یہ کہے کہ تو نے بنی اسرائیل کے درمیان تفرقہ ڈال دیا۔ (علامہ)

اور یہ بات اس چیز کی نشاندہی کرتی ہے کہ علیؑ نے بھی اختلاف کے خوف سے ایک حد تک خاموشی اختیار کی۔

۹۲۔ قَالَ يَمْشُونَ مَانَعَكَ إِذْ رَأَيْتَهُمْ ضَلُّوا

۹۳۔ أَلَا تَتَّبِعُنَّ أَفْصَيْتَ أَمْرِي

۹۴۔ قَالَ يَنْبَوُّمْ لَا تَلْجُذْ بِلِحِيَّتِي وَلَا بِرَأْسِي إِنْ خَشِيتُ أَنْ تَقُولَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِي إِسْرَءِيلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِي

۹۵۔

۹۶۔

۹۷۔

۹۸۔

ترجمہ

۹۲۔

۹۳۔

۹۴۔

۹۵۔

۹۶۔

۹۷۔

۹۸۔

۹۵۔ قَالَ فَمَا خَطْبُكَ يُسَامِرِي
۹۶۔ قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوا بِهِ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ أَثَرِ الرَّسُولِ فَنَبَذْتُهَا وَكَذَّ لَكَ سَوَّلَتْ لِي نَفْسِي
۹۷۔ قَالَ فَاذْهَبْ فَإِنَّ لَكَ فِي الْحَيَوةِ أَنْ تَقُولَ لَا مِسَاسَ وَإِنَّ لَكَ مَوْعِدًا لَّنْ تَخْلَفَنَّهُ وَانْظُرْ إِلَى إِلَهِكَ الَّذِي ظَلْتَ عَلَيْهِ عَاكِفًا لَّنُحَرِّقَنَّهُ ثُمَّ لَنَنْبِفَنَّهُ فِي الْيَوْمِ نَسْفًا
۹۸۔ إِنَّمَا إِلَهُكُمُ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا

(موسیٰ نے) کہا : اے ہارون ! جس وقت تو نے دیکھا کہ وہ گمراہ ہو گئے ہیں، تو تجھے کس چیز نے روکا کہ تو نے میری پیروی نہ کی۔ کیا تو نے میرے حکم کی نافرمانی کی ہے؟
(ہارون نے) کہا : اے ماں جانے ! میری داڑھی اور سر نہ پکڑو۔ میں تو اس بات سے ڈرا کہ تو یہ کہنے لگے کہ تو نے بنی اسرائیل کے درمیان تفرقہ ڈال دیا اور میری نصیحت پر عمل نہ کیا۔
(پھر موسیٰ نے سامری کی طرف رخ کیا اور) کہا : اے سامری ! تو نے یہ کام کیوں کیا؟
(سامری نے) کہا : میں نے ایسی چیز دیکھی جو انہوں نے نہیں دیکھی۔ میں نے (خدا کے بھیجے ہوئے) رسول کے آثار میں سے کچھ حصہ اٹھالیا۔ اس کے بعد میں نے اس کو ڈال دیا اور میرے نفس نے اس مطلب کو اس طرح خوشامد بنایا۔
(موسیٰ نے) کہا، پھر تو فوراً ہوجا تیرا دنیا کی زندگی میں حصہ (صرف یہ ہے کہ جو شخص تیرے نزدیک ہوگا) تو (اس سے) کہے گا: مجھے منت چھوڑنا اور تیرے لیے (خدا کی طرف سے عذاب کا) ایک وقت مقرر ہے کہ ہرگز اس کے خلاف نہیں ہوگا۔ (آب) تو اپنے معبود کی طرف دیکھ، جس کی تو مسلسل پرستش کرتا رہا ہے اور دیکھ پہلے تو ہم اسے جلا ملیں گے اور پھر اس کے ذرات کو دریا میں بکھیر دیں گے۔
تمہارا معبود تو صرف وہی خدا ہے کہ جس کے علاوہ اور کوئی معبود نہیں ہے۔ اور اس کا علم ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

تفسیر

سامری کا عبرت ناک انجام :

اس بحث کے بعد جو موسیٰ نے بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی کی شدید مذمت کے بارے میں کی تھی اور جو اس سے پہلے آیات میں بیان ہو چکی ہے، زیر بحث آیات میں پہلے موسیٰ کی اپنے بھائی ہارون کے ساتھ گفتگو اور اس کے بعد سامری کے ہارون کے بھائی ہارون کی طرف رخ کر کے "کہا : اے ہارون ! جس وقت تو نے یہ دیکھا کہ یہ قوم گمراہ ہو گئی ہے تو تو نے میری پیروی کیوں نہ کی؟" (قال یا ہارون ما منعک اذ راکہم موصولوا لالبتعن)۔

کیا میں نے اُس وقت جبکہ میں میعاد گاہ کی طرف جانا چاہتا تھا، یہ نہیں کہا تھا کہ تو میرا جانشین ہے اور اس گروہ کے درمیان اصلاح کرنا اور مفسدین کے راستے کو اختیار نہ کرنا؟

تو ان بت پرستوں کے ساتھ مقابلے کے لیے کیوں اٹھ کھڑا نہ ہوا؟

اس بنا پر "الابتعن" کے جملہ سے مراد یہ ہے کہ بت پرستی کے بارے میں میری شدت عمل کی روش کی تو نے پیروی کیوں نہ کی۔

لیکن یہ بات، جو بعض نے بیان کی ہے کہ اس جملے سے مراد یہ ہے کہ تو اُس اقلیت کے ساتھ کہ جو توحید پر باقی رہ گئی تھی، میرے پیچھے پیچھے کوہ طور پر کیوں نہ آیا، بہت ہی بعید نظر آتی ہے اور یہ اُس جواب کے ساتھ کہ جو ہارون نے بعد کی آیات میں دیا ہے، کوئی مناسبت نہیں رکھتی۔

اس کے بعد موسیٰ نے مزید کہا : کیا تو نے میرے فرمان کی خلاف ورزی کی ہے؟ (افصیت امی)۔

موسیٰ انتہائی شدت اور سخت غصہ کی حالت میں، یہ باتیں اپنے بھائی سے کر رہے تھے اور ان کے سامنے چیخ مچھتے تھے جبکہ ان کی داڑھی اور سر کو پکڑا ہوا تھا، اور کھینچ رہے تھے۔

ہارون نے جب اپنے بھائی کو شدید پریشان دیکھا تو اس لیے کہ انہیں لطف و مہربانی کی طرف لائیں اور ان کی بے قراری اور سرگردانی میں کمی کریں اور منہ پر اس واقعے کے سلسلے میں اپنا عند پیش کریں کہا : اے میرے مال جانے ! میری داڑھی اور پڑھنے کا اور میں اس بات سے ڈرا کہ کہیں تو واپسی پر نہ گئے کہ تو نے بنی اسرائیل کے درمیان تفرقہ کیوں ڈالا اور میری غیبت کے زمانے میں میری نصیحت کا خیال نہیں کیا؟ (قال یا بنی ام لا تأخذ بلحیت ولا برأسی انی خشیت ان تقول فرقت بینہ و الخلف فی قومی واصلح ولا تتبع سبیل المفسدین) (۱۶۱-۱۶۲)

بنی اسرائیل ولسو ترقب قولی)۔

در حقیقت حضرت ہارون کی نظر اسی بات کی طرف ہے کہ جو حضرت موسیٰ نے میعاد گاہ کی طرف جانے سے پہلے کسی بھی گمراہ کو دعوت اصلاح کی طرف دعوت دینا ہے۔ (۱۶۱-۱۶۲)

وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اگر میں اُن پر سختی اور گرفت کرتا، تو وہ تیرے حکم کے برخلاف ہوتا اور پھر تجھے یہ جتنی پہنچا کر مجھ سے انکار کرے۔

اس طرح حضرت ہارون نے اپنی بے گناہی کو ثابت کر دیا۔ خصوصاً ایک اور جگہ کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ جو سورہ اعراف کا آیت ۱۵۰ میں آیا ہے :

ان القوم استضعفونی وکادوا یقتلوننی

اس نادان قوم نے مجھے ضعیف کر دیا اور ہم لوگ تھوڑے رو گئے اور قریب تھا کہ وہ مجھے قتل ہی کر دیں، میں بے گناہ ہوں بے گناہ۔

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ موسیٰ و ہارون دونوں بلا شک و شبہ بہت بڑے اور مصمم تھے تو پھر موسیٰ کی طرف سے ایسی کھینچ تانی، بحث اور شدید عتاب و خطاب اور وہ وفاق کو برپا کرنا اور ان کے پاس کس طرح قابل توجہ ہے؟

اس کے جواب میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ موسیٰ کو یقین تھا کہ ان کا بھائی بے گناہ ہے لیکن وہ اس طریقے سے دو باتیں ثابت کرنا چاہتے تھے : پہلی یہ کہ وہ بنی اسرائیل کو یہ سمجھا دیں کہ وہ بہت ہی عظیم گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں۔ ایسا گناہ کہ جو موسیٰ کے بھائی تک کو بھی کہ جو خود ایک عالی قدر پیغمبر تھے سوانحہ کے لیے عدالت کی طرف کھینچ کر لے گیا اور وہ بھی اتنا شدت عمل کے ساتھ یعنی یہ مسئلہ اتنا سادہ نہیں ہے کہ جتنا بعض بنی اسرائیل نے سمجھ لیا ہے۔ توحید سے انحراف اور شرک کی طرف بازگشت، وہ بھی ان تمام تعلیمات اور ان تمام معجزات اور عظمت حق کے آثار دیکھنے کے بعد۔ یہ بات یقین کرنے کے قابل نہیں ہے۔ لہذا جتنا زیادہ سے زیادہ قیامت کے ساتھ ہو سکے اس کا مقابلہ کرنا چاہیے۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب کوئی عظیم حادثہ واقع ہو جاتا ہے تو انسان ہاتھ بڑھا کر اپنا ہی گریبان چاک کر لیتا ہے اور اپنا ہی سر پیٹ لیتا ہے، تو اپنے بھائی کو مورد عتاب و خطاب قرار دینے کی قوت ہی کچھ نہیں اور اس میں شک نہیں کہ ہدف اور مقصد کی مخالفت اور افراد خوف میں نفسیاتی اثر پیدا کرنے کے لیے اور ان پر گناہ کی عظمت ظاہر کرنے کے لیے، اس قسم کا طرز عمل بہت مؤثر ہوتا ہے اور ہارون بھی اس طریقے میں باطل راضی تھے۔

دوسرا یہ کہ ہارون کی بے گناہی ان توضیحات کے ساتھ کہ جو وہ دے رہے تھے، سب پر ثابت ہو جائے اور بعد میں انہیں اپنی رسالت کی ادائیگی میں کوتاہی کرنے کا اہتمام نہ لگائیں۔

اپنے بھائی سے گفتگو کرنے اور ان کے بری الذمہ ثابت ہونے کے بعد، سامری سے باز پرس شروع کی اور کہا : "یہ کام تھا کہ جو تو نے انجام دیا ہے اور اے سامری اچھے کس چیز نے اس بات پر آمادہ کیا؟" (قال فمأخططک یا سامری)۔

اس نے جواب میں کہا: ”میں کچھ ایسے مطالب سے آگاہ ہوا کہ جو انہوں نے نہیں دیکھے اور وہ اس سے آگاہ نہیں (قال بصوت بمالو بصروا بہ)۔“

”میں نے ایک چیز خدا کے بھیجے ہوئے رسول کے آثار میں سے لی اور پھر میں نے اسے دُور پھینک دیا اور میرے نفس بات کو اسی طرح مجھے خوش ناک کر کے دکھایا“ (فقبضت قبضة من اثر الرسول فنبذتها وكذا لك سبيل في نفسي)۔

اس بارے میں کہ اس گشتگو سے سامری کی کیا مراد تھی، مفسرین کے درمیان دو تفسیریں مشہور ہیں:

پہلی یہ کہ اس کا مقصد یہ تھا کہ فرعون کے لشکر کے دریائے نیل کے پاس آنے کے موقع پر میں نے جبریل کو ایک سواری پر دیکھا کہ وہ لشکر کو دریا کے خشک شدہ راستوں پر درود کے لیے تشریف دینے کی خاطر ان کے آگے آگے چل رہا تھا۔ میں نے کچھ مٹی ان کے پاؤں کے نیچے سے یا ان کی سواری کے پاؤں کے نیچے سے اٹھالی اور اسے منبھال رکھا اور اسے سونے کے پچھڑے کے اندر ڈالا اور یہ صدا اسی کی برکت سے پیدا ہوئی ہے۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ میں ابتدا میں خدا کے اس رسول (موسیٰ) کے کچھ آثار پر ایمان لے آیا۔ اس کے بعد مجھے اس میں کچھ شک اور تردد ہوا۔ لہذا میں نے اسے دُور پھینک دیا اور بُت پرستی کے دین کی طرف مائل ہو گیا اور یہ سبیری نظر میں زیادہ پسندیدہ اور زیادہ ہے۔ پہلی تفسیر کے مطابق لفظ ”رسول“ جبریل کے معنی میں ہے جبکہ دوسری تفسیر کے مطابق ”رسول“ موسیٰ کے معنی میں ہے۔ لفظ ”اثر“ پہلی تفسیر کی رو سے ”پاؤں کے نیچے کی مٹی“ کے معنی میں ہے اور دوسری تفسیر میں ”تعلیمات کا کچھ حصہ“ کے معنی میں ہے۔ ”نبذتھا“ کا لفظ پہلی تفسیر میں مٹی کو گتہالہ میں ڈالنے کے معنی میں ہے اور دوسری تفسیر میں تعلیمات موسیٰ کو دُور پھینکنے اور چھوڑ دینے کے معنی میں ہے اور آخر میں ”بصوت بمالو بصروا بہ“ پہلی تفسیر میں جبریل کو دیکھنے کی طرف اشارہ ہے کہ جو ایک گھر سوار کی شکل میں ظاہر ہوئے تھے (شاید کچھ اور لوگوں نے بھی انہیں دیکھا لیکن پہچانا نہیں) لیکن دوسری تفسیر میں دین موسیٰ کے بارے میں کچھ خاص معلومات کی طرف اشارہ ہے۔

بہر حال ان دونوں تفاسیر میں سے ہر ایک کے طرفدار ہیں اور ان میں کچھ روشن یا مبہم نکات موجود ہیں لیکن دوسری تفسیر کی جہات سے بہتر نظر آتی ہے، خاص طور پر جبکہ کتاب ”استیحاظ طبری“ میں ایک حدیث میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ جب اسیر المؤمنین علی علیہ السلام نے بصرہ کو فتح کر لیا تو لوگ آپ کے گرد جمع ہو گئے۔ ان میں حسن بصری بھی تھا اور وہ اپنے ساتھ کچھ حتمتیاں لے کر آیا تھا کہ اسیر المؤمنین جہات کرتے وہ اسے نوراً یادداشت کے طور پر رکھ لیتا۔ امام نے منہ آواز کے ساتھ ان لوگوں میں سے اسے مخاطب کر کے فرمایا: تو کیا کر رہا ہے، تو اس نے عرض کیا کہ میں آپ کے آثار اور ارشادات کو رکھ رہا ہوں تاکہ لوگوں کے لیے انہیں بیان کروں، اسیر المؤمنین نے فرمایا:

اما ان لكل قوم سامريًا، وهذا سامري هذه الامة، انه لا يقول

لامساس ولكن يقول لا قتال:

یہ بات ذہن نشین کر لو کہ ہر قوم اور ہر گروہ میں کوئی نہ کوئی سامری ہوتا ہے اور یہ (حسن بصری)

اس اُمت کا سامری ہے۔ اس کا موسیٰ کے زمانے کے سامری سے صرف اتنا فرق ہے کہ جو شخص اُس سامری کے قریب ہوتا تھا تو وہ کہتا تھا ”لامساس“ (کوئی شخص مجھے نہ پچھنے) لیکن یہ لوگوں سے یہ کہتا ہے کہ ”لا قتال“ (یعنی کسی سے جنگ نہیں کرنا چاہیے، حتیٰ کہ مخرغین سے بھی۔ یہ اُس پر پیغمبر کی طرف اشارہ ہے کہ جو حسن بصری جنگ جمل کے خلاف کرتا تھا)۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ سامری بھی ایک منافق آدمی تھا کہ جس نے حق کے کچھ مطالب سے استفادہ کرتے ہوئے لوگوں کو غم کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ معنی دوسری تفسیر سے زیادہ مناسب رکھتا ہے۔

یہ بات صاف طور پر واضح اور روشن ہے کہ موسیٰ کے سوال کے جواب میں سامری کی بات کسی طرح بھی قابل قبول نہیں تھی لہذا حضرت موسیٰ نے اس کے جرم ہونے کا فرمان اسی عدالت میں صادر کر دیا اور اُسے اور اس کے گوسالہ کے بارے میں تین گم دیئے:

پہلا حکم یہ کہ اس سے کہا ”تو لوگوں کے درمیان سے نکل جا اور کسی کے ساتھ میل ملاپ نہ کر اور تیری باقی زندگی میں تیرا حصہ صرف اتنا ہے کہ جو شخص بھی تیرے قریب آئے گا تو اُس سے کہے گا کہ ”مجھ سے سنو“ (قال فاذهب فان لك في الحياة ان تقول لا مساس)۔

اس طرح ایک قاطع اور دد لوک فرمان کے ذریعہ سامری کو معاشرے سے باہر نکال پھینکا اور اُسے مطلق گوش نشینی میں ڈال دیا۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ”لامساس“ کا جملہ شریعت موسیٰ کے ایک فوجداری قانون کی طرف اشارہ ہے کہ جو بعض ایسے افراد کے بارے میں کہ جو سنگین جرم کے مرتکب ہوتے تھے صادر ہوتا تھا۔ وہ شخص ایک ایسے موجود کی حیثیت سے کہ جو پلیدہ دُشمن و ناپاک ہو، قرار پاتا تھا۔ کوئی اس سے میل ملاپ نہ کرتا اور نہ اُسے یہ حق ہوتا تھا کہ وہ کسی سے میل ملاپ رکھے۔

سامری اس واقعہ کے بعد مجبور ہو گیا کہ وہ بنی اسرائیل اور ان کے شہر و دیار سے باہر نکل جائے اور یا بائوں میں جا رہے اور یہ اُس جاہ طلب انسان کی سزا ہے کہ جو اپنی برکتوں کے ذریعے چاہتا تھا کہ بڑے بڑے گروہوں کو خوف کر کے اپنے گرد جمع کرے۔ اسے ناکام ہی ہونا چاہیے یہاں تک کہ ایک بھی شخص اس سے میل ملاپ نہ کرے۔ اور اس قسم کے انسان کے لیے یہ مکمل بائیکاٹ موت اور قتل ہونے سے بھی زیادہ سخت ہے کیونکہ وہ ایک پلیدہ اور آلودہ وجود کی صورت میں ہر جگہ سے رانہ اور دھتکارا ہوا ہوتا ہے۔ بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ سامری کا بڑا جرم ثابت ہو جانے کے بعد حضرت موسیٰ نے اس کے بارے میں مخرغین کی اور خدا نے اُسے ایک پُر اسرار بیماری میں مبتلا کر دیا کہ جب تک وہ زندہ رہا کوئی شخص اُسے چھو نہیں سکتا تھا اور اگر کوئی اُسے چھو لیتا تو وہ بھی بیماری میں گرفتار ہو جاتا۔

۱۔ فورالثقلین، جلد ۳، ص ۲۹۲۔

۲۔ اس سے کوئی خاص تائید دوسری تفسیر کی نہیں ہوتی اور آیت کا ظاہر پہلی تفسیر کے ساتھ زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے

والله اعلم (مستخرج)۔

۳۔ تفسیر فی ظلال، جلد ۵، ص ۲۹۴۔

یہ کہ سامری ایک قسم کی نفسیاتی بیماری میں جو ہر شخص سے دوسرا شدید اور وحشت کی صورت میں بھی گرفتار ہو گیا۔ اس طرح کہ جو شخص بھی اس کے نزدیک ہوتا وہ چلا تا کہ "لا مصاس" (مجھے مت چھونا)۔

سامری کے لیے دوسری سزایہ بھی کہ حضرت موسیٰ نے اسے قیامت میں ہونے والے عذاب کی بھی خبر دی۔ اور کہا: تیرے آگے ایک وعدہ گاہ ہے۔ خداوندانک عذاب کا وعدہ کہ جس سے ہرگز نہیں بچ سکے گا (وان لك موعد ان تخلفه)۔ تیسرا کام یہ تھا کہ جو موسیٰ نے سامری سے کہا: "اپنے اس عبود کو کہ جس کی تو ہمیشہ عبادت کرتا تھا ذرا دیکھ اور نگاہ کر۔ ہم اس کو جلا رہے ہیں اور پھر اس کے ذرات کو دریا میں بھیر دیں گے" (وانظر الى الهك الذي ظلت عليه عاكفا انصرفه ثم لنسفنه في السيل ونسفنا)۔

یہاں دو سوال سامنے آتے ہیں۔

پہلا سوال یہ ہے کہ "لنحرقنه" (ہم اس کو یقیناً جلا دیں گے) اس بات کی دلیل ہے کہ گوسالہ ایک جلاسنے کے قابل جسم تھا اور یہ چیز ان لوگوں کے نظریہ کی کہ جو یہ کہتے ہیں کہ گوسالہ طلائی نہیں تھا، بلکہ جبریل کے پاؤں کی خاک کی وجہ سے ایک زندہ وجود میں تبدیل ہو گیا تھا، تائید کرتا ہے۔

ہم اس کے جواب میں یہ کہیں گے کہ "جسد اللہ خوار" کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ گوسالہ ایک بے جان جسم تھا، کہ جس سے گوسالہ کی آواز کے مشابہ آواز (جیسا کہ ہم نے پہلے بھی کہلے) نکلتی تھی۔ باقی رہا جلاسنے کا مسئلہ تو ہو سکتا ہے کہ وہ دو اسباب میں سے کسی ایک سبب سے ہوا: ایک تو یہ کہ یہ جسم صرف سونے کا نہیں تھا بلکہ احتمال یہ ہے کہ اس میں لکڑی بھی استعمال ہوئی تھی اور سونا صرف اس کے سر پوش کے طور پر اس پر چڑھا تھا۔ دوسرا یہ کہ فرض کریں کہ وہ سارے کا سارا سونا ہی تھا، تب بھی اس کا جلانا اس کی حقیر و توہین اور اس کی شکل و صورت کو ختم کرنے کے لیے تھا۔ جیسا کہ یہ عمل ہمارے زمانے کے جابر بادشاہوں کے دھات کے کیموں کے بارے میں دہرایا گیا ہے۔ اس بنا پر اسے جلاسنے کے بعد بعض ذرائع سے ریزہ ریزہ کر کے پھر اس کے ذرات کو دریا میں پھینک دیا۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا اس سارے سونے کو دریا میں پھینکنا جائز تھا اور اسراف شمار نہیں ہوتا تھا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ بعض اوقات ایک اہم اور عالی مقصد کی خاطر مثلاً: بُت پرستی کے عقیدہ کی سرکوبی کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ بُت کے ساتھ اس قسم کا سلوک کیا جائے تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ فساد کا مادہ لوگوں کے درمیان باقی رہ جائے اور پھر بعض لوگوں کے لیے دوسرے کا سبب بن جائے۔

زیادہ واضح عبارت میں: اگر موسیٰ اس سونے کو کہ جو گوسالہ کے بنانے میں استعمال ہوا تھا، باقی رہنے دیتے یا اسے لوگوں میں تقسیم کر دیتے تو پھر یہ ممکن تھا کہ کسی دن جاہل اور نادان لوگ اسے ہی مقدس سمجھنے لگ جاتے اور گوسالہ پرستی کی روح نئے سرے سے ان میں زندہ ہو جاتی۔ یہاں پر ضروری تھا کہ اس گران قیمت مادہ کو لوگوں کے اعتقاد کی حفاظت پر قربان کر دیا جائے اور اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں تھا اور تفسیر مسطری، جلد ۶، ص ۲۱۸

۲۔ "لن تخلفه" ایک فعل ماضی ہے کہ جس کا نائب فاعل یہاں سامری ہے اور اس کی خبر دوسرا ماضول ہے اور اس کا فاعل الہامی خدا ہے اور اس کے جملے کا ماضی اس طرح ہے: تیرے لیے ایک وعدہ گاہ کہ جس سے خدا تیرے بارے میں تکلف نہیں کرے گا۔

حضرت موسیٰ نے سامری کے بارے میں بھی اور اس کے گوسالہ کے بارے میں بھی انتہائی قاطع اور سخت روش اختیار کی تھی کہ گوسالہ پرستی کے فتنہ کو ختم کرنے پر قادر ہوئے اور اس کے نفسیاتی اثرات لوگوں کے ذہنوں سے پاک کیے۔ بعد میں بھی ہم دیکھیں گے کہ آپ نے گوسالہ پرستوں کے ساتھ جس دونوں طریقہ سے ٹکری اس نے بنی اسرائیل کے دماغوں میں ایسا نفوذ کیا کہ وہ آگے چل کر کبھی بھی ان اخوانی راستوں پر چلے۔

آخری جملہ میں حضرت موسیٰ نے مسئلہ توحید پر بہت زیادہ تاکید کرتے ہوئے "اللہ" کی حاکمیت کو واضح کیا اور اس طرح کہا: "تمہارا معبود صرف اللہ ہے، وہی اللہ کہ جس کے سوا کوئی اور معبود نہیں ہے، وہی کہ جس کے علم نے تمام چیزوں کا احاطہ کیا ہوا ہے: انما اللہ کعک اللہ الذی لا اله الا هو ومع کل شیء علما"۔

وہ گھڑے ہوئے بتوں کی طرح نہیں ہے کہ جو نہ کسی بات کو سننے میں نہ کوئی جواب دیتے ہیں، نہ کوئی مشکل حل کرتے ہیں اور نہ کسی نقصان کو دور کرتے ہیں۔

واقع میں "و مع کل شیء علما" اس توصیف کے ستر مقابل آیا ہے کہ جو قبل کی چند آیات میں گوسالہ اور اس کی نادانی اور ناتوانی کے بارے میں بیان ہوئی تھی۔

چند اہم نکات:

۱۔ مشکلات کے مقابل ڈٹ جانا چاہیئے: بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی کے مقابلے میں حضرت موسیٰ کی روش، سخت اور پیچیدہ انحرافات کا مقابلہ کرنے کے لیے ہر زمان و مکان کے لیے ایک قابل تقلید روش ہے۔

اگر حضرت موسیٰ یہ چاہتے کہ صرف ہند و نصیحت اور کچھ دعو و استدلال کے لیے لاکھوں گوسالہ پرستوں کے سامنے کھڑے ہوں تو مسلمہ طور پر اس کام کو آگے نہیں بڑھا سکتے تھے۔ انہیں یہی چاہیئے تھا کہ وہ اس موقع پر تین امور کے لیے قاطعانہ اور جرات مندانہ طور پر کھڑے ہوتے: اپنے جانی کے سامنے، سامری کے سامنے اور گوسالہ پرستوں کے سامنے پہلے انہوں نے اپنے بھائی سے کام شروع کیا۔ ان کی ریش مبارک پکڑی اور اسے اپنی طرف کھینچا اور چیخنے اور چلاتے لگے اور حقیقت میں ان کے لیے یہ ایک عدالت قائم کی، (اگرچہ آخر کار ہاروں کی بجائے لوگوں پر ثابت ہو گئی) تاکہ دوسرے اپنا حساب خود سمجھ لیں۔

اس کے بعد اس سازش کے اصلی عامل یعنی سامری کی طرف گئے اور اسے ایسی سزا دی کہ جو قتل کرنے سے بھی بدتر تھی۔ اسے معاصر سے باہر نکال دیا، اس کو گوشہ نشین کر دیا اور اسے ایک نجس اور آلودہ وجود قرار دیا کہ جس سے سب کا فوری اختیار کرنا ضروری ہو گیا اور اس کیلئے

۲۔ اس دونوں ٹکری کی ایک نظیر اخوانی افکار کی بیخ کنی کے لیے مسجد مزار کے بارے میں قرآن میں اشارے کے طور پر اور تاریخ و حدیث میں تفصیل طور پر بیان ہوئی ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے حکم دیا کہ مسجد مزار کو پہلے جلا دیں اور جو کچھ باقی رہ جائے اس کو دریاں کر دیں اور اس کی جگہ کو مدینہ کے لوگوں کے لیے کوڑا کرٹ ڈالنے کی جگہ قرار دیں (مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ جلد ۳ سورہ توبہ کی آیات ۱۰۴ تا ۱۱۰ کے ذیل میں ملاحظہ کریں)۔

پروردگار کی طرف سے دردناک عذاب کی تہدید کی۔

اس کے بعد بنی اسرائیل کے گوسالہ پرستوں کی طرف آئے اور انہیں سمجھایا کہ تمہارا یہ گناہ اس قدر بڑا ہے کہ جس سے توبہ کرنے کے لیے اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے کہ اپنے درمیان تلوار رکھ دو اور ایک گروہ ایک دوسرے کے ہاتھوں قتل ہو اور یہ گندہ خون معاشرے کے جسم سے نکال دیا جائے اور اس طرح گندہ گندل کی ایک جماعت کے لوگ اپنے ہی ہاتھوں سے مارے جائیں تاکہ یہ اخلاقی فکر پیش کرنے کے لیے ان کے دماغ سے نکل جائے۔ اس واقعہ کی تفصیل ہم جلد اول سورہ لقوہ کی آیہ ۵۴ تا ۵۵ کے ذیل میں بیان کر آئے ہیں۔

تو اس طرح سب سے پہلے جمعیت کے رہبر کی جواب طلبی ہوئی چاہیے تاکہ یہ دیکھا جائے کہ اُس نے اپنے کام میں کوتاہی کی ہے یا نہیں اور اس کی بے گناہی ثابت ہونے کے بعد عامل فساد کا پیچھا کیا جائے اور اُس کے بعد فساد کے طرفداروں اور برا خواہوں کا پیچھا کیا جانا چاہیے۔

۲۔ سامری کون ہے؟ اصل لفظ "سامری" عبرانی زبان میں "شہری" ہے اور چونکہ یہ معمول ہے کہ جب عبرانی زبان کے الفاظ عربی زبان میں آتے ہیں تو "شین" کا لفظ "سین" سے بدل جاتا ہے، جیسا کہ "موشی" سے "موسی" اور "یشوع" سے "یسوع" سے تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس بنا پر سامری بھی "شردن" کی طرف منسوب تھا، اور "شردن" کا بیٹا تھا، جو یعقوب کی چوتھی نسل ہے۔

اسی سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ بعض عیسائیوں کا قرآن پر یہ اعتراض بالکل بے بنیاد ہے۔ کہ قرآن نے ایک ایسے شخص کو کہ جو موسیٰ کے زمانہ میں رہتا تھا اور وہ گوسالہ پرستی کا سرپرست بنا تھا، شہر سامرہ سے منسوب "سامری" کے طور پر متعارف کرایا ہے، جب کہ شہر سامرہ اس زمانے میں بالکل موجود ہی نہیں تھا۔ کیونکہ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ "سامری" شردن کی طرف منسوب ہے نہ کہ سامرہ شہر کی طرف۔

بحر حال سامری ایک خود خواہ اور منحرف شخص ہونے کے باوجود بڑا ہوشیار تھا۔ وہ بڑی جرات اور مہارت کے ساتھ بنی اسرائیل کے ضعف کے نکات اور کمزوری کے پہلوؤں سے استفادہ کرتے ہوئے اس قسم کا عظیم فتنہ کھڑا کرنے پر قادر ہو گیا کہ جو ایک قطعی اکثریت کے بُت پرستی کی طرف مائل ہونے کا سبب بنے اور جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے کہ اُس نے اپنی اس خود خواہی اور فتنہ انگیزی کی سزا بھی اسی دنیا میں دیکھ لی۔

۹۹۔ كَذٰلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْبَاءِ مَا قَدْ سَبَقَ وَقَدْ آتَيْنَاكَ مِنْ لَدُنَّا ذِكْرًا ۝

۱۰۰۔ مَنْ اَعْرَضَ عَنْهُ فَاِنَّهُ يَحْمِلُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ وِزْرًا ۝

۱۰۱۔ خَلِدَ فِيْهِ وَاَسَاءَ لَهٗ يَوْمَ الْقِيَمَةِ حِمْلًا ۝

۱۔ اسلام مشرقی ۲۵

۱۰۲۔ يَوْمَ يَنْفَخُ فِي الصُّوْرِ وَنَحْشُرُ الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَ يَمْذِرُ ۝
يَتَخَفَتُوْنَ بَيْنَهُمْ اَنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا عَشْرًا ۝
۱۰۳۔ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ اِذْ يَقُوْلُ اَمْثَلُمْ طَرِيقَةً اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا يَوْمًا ۝

ترجمہ

- ۹۹۔ ہم اسی طرح سے تمہارے لیے گزری ہوئی خبروں کو بیان کرتے ہیں اور ہم نے اپنی طرف سے تجھے ذکر (قرآن) عطا فرمایا۔
۱۰۰۔ جو شخص اس سے منہ پھیر لے وہ قیامت کے دن (گناہ اور جہاد ہی کا) سنگین بوجھ (اپنے کندھے پر) اٹھائے گا۔
۱۰۱۔ وہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے اور قیامت کے دن ان کے اٹھانے کے لیے بہت ہی بڑا بوجھ ہے۔
۱۰۲۔ وہ دن کہ جس میں مورچہ نکلا جائے گا اور اس دن ہم مجرمین کو نیلے بدنوں کے ساتھ جمع کریں گے۔
۱۰۳۔ وہ آپس میں آہستہ آہستہ گفتگو کر رہے ہوں گے (بعض کہیں گے) تم نے (عالم برزخ میں) صرف دس شبانہ روز قیام کیا ہے۔
۱۰۴۔ وہ جو کچھ کہیں گے ہم اُس سے اچھی طرح آگاہ ہیں۔ جب کہ وہ شخص جس کی روش ان میں سے سب سے بہتر ہے کہ

تفسیر

ان کے کندھوں پر بڑترین بوجھ، گزشتہ آیات اگرچہ موسیٰ، بنی اسرائیل، سامری اور فرعونوں کی تاریخ کے بارے میں تھیں۔ ان کے باوجود ان آیات کے متن کی مناسبت سے طرح طرح کی بحثیں ہو چکی ہیں۔ ان مباحث کے اختتام پر قرآن ایک نئی نتیجہ بھی پیش کرتا۔ اور کہتا ہے کہ ہم اسی طرح سے گزری ہوئی خبروں کو کہے بعد دیگرے تیرے لیے بیان کرتے ہیں (کذا لک نقص علیک انباء ما قد سبق)۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: ہم نے اپنی طرف سے تجھے قرآن دیا (وقد آتیناک من لدنا ذکرا)۔ وہ قرآن، کہ جو دروس عبرت، دلائل عقلی، گزشتہ قوموں کی سبق آموز خبروں اور آئندہ آنے والے لوگوں کو بیدار کرنے والے مسائل سے سمجھ رہا ہے۔
اصلی طور پر قرآن مجید کا اہم حصہ گزشتہ لوگوں کی سرگزشت کا بیان ہے۔

قرآن ایک انسان سا کتاب ہے۔ اس میں گزرے ہوئے لوگوں کی یہ تمام تاریخ بلاوجہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کی وجہ ان کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں، کامیابی و شکست کے عوامل اور سعادت و بد بختی کے اسباب سے اور ان کی تاریخ کے صفحات میں چھپے ہوئے فراوان تجربات سے استفادہ کرنا ہے۔

نئی طور پر علوم میں سے سب سے زیادہ قابل اطمینان تجرباتی علوم ہیں کہ جو تجربہ گاہوں میں تجربے سے گزارے جاتے ہیں اور ان کے معنی نتائج کا مشاہدہ کیا جاتا ہے۔

تاریخ، انسانوں کی زندگی کی عظیم تجربہ گاہ ہے اور اس تجربہ گاہ میں، اقوام کی سر بلندی و شکست، کامیابی و ناکامی، خوش بختی و بد بختی سب کی سب تجربے کے لیے رکھی گئی ہیں۔ ان کے معنی نتائج ہماری آنکھوں کے سامنے آ جاتے ہیں، اور ہم زندگی کے مسائل کے سلسلہ میں اپنے علوم و دانش کے زیادہ قابل اطمینان حصہ کو ان سے سیکھ سکتے ہیں۔

دوسرے نظروں میں انسان کی زندگی کا حاصل — ایک لحاظ سے — تجربے کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں ہے۔ اور تاریخ — میں کسی قسم کی تحریف نہ کی گئی ہو تو انسانوں کے ہزاروں سال کی زندگی کا پتہ دیتی ہے اور یہ سب کچھ مطالعہ کرنے والوں کو ایک ہی جگہ سے مل جاتا ہے۔ اسی بنا پر امیر المومنین علی علیہ السلام اپنے فرزند امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کو اپنے حکیمانہ پند و نصائح میں خصوصاً اسی نکتہ کو بے نظر رکھتے ہوئے فرماتے ہیں :

ای بنی! فی وان لو اکن عمرت عمر من کان قبلی، فقد نظرت فی اعمالہم و فکرت فی اخبارہم، و سرت فی آثارہم و حشیت کاحدم و بل کانی بما انتہی الی من امورہم و قد عمرت مع اولہم و الی آخرہم، فعرفت صفو ذلک من کدرہ و نفعہ من ضررہ فاستخلصت لک من کل امر غیلیلہ :

اے بیٹا! یہ ٹھیک ہے کہ میں نے ان تمام لوگوں جتنی، کہ جو مجھ سے پہلے ہو گئے ہیں زندگی نہیں گزاری لیکن میں نے ان کے کردار پر نظر ڈالی اور ان کی خبروں میں غور و فکر کیا اور ان کے آثار میں سیر و سیاحت کی۔ یہاں تک کہ میں ان میں سے ایک کی طرح ہو گیا ہوں، بلکہ چونکہ ان کی تاریخ مجھ تک پہنچی ہے تو گویا میں ان سب کے ساتھ اول دنیا سے لے کر آج کے دن تک رہا ہوں۔ میں نے ان کی زندگی کے صاف و شفاف حصہ کو گولے اور تاریک حصہ سے الگ کر کے پہچان لیا ہے۔ ان کے نفع و نقصان کو جان لیا ہے اور ان تمام میں سے تیرے لیے اہم اور منتخب حصوں کا خلاصہ بیان کیا ہے۔

اس بنا پر تاریخ ایک ایسا آئینہ ہے کہ جو گزشتہ زمانہ کو عیاں کرتا ہے اور ایک ایسا علم ہے کہ جو آج کو کل کے ساتھ متصل کر دیتا ہے۔ تاریخ انسان کی عمر کو اس کے اندازے سے بڑا بنا دیتی ہے۔

نہج البلاغہ، جلد ۳۱ (خطوط کا حصہ)۔

تاریخ ایک ایسا معلم ہے کہ جو امتوں کی عزت اور ذلت کے بھید مل کو کھول کر رکھ دیتا ہے۔ تاریخ سنگردوں کو پہلے زمانے کے ظالموں کے برے انجام سے آگاہ کرتی ہے۔ وہ ظالم جو ان سے زیادہ طاقتور تھے۔ تاریخ مردان حق کو کثافات دیتی ہے اور استقامت اور پامردی کی دعوت دیتی ہے اور انہیں اپنے سفر کے لیے گرماتی ہے۔

تاریخ ایک ایسا چراغ ہے کہ جو انسانوں کی زندگی کے راستوں کو روشن کرتا ہے اور موجودہ زمانے کے لوگوں کے لیے راہیں کھولتا اور ہموار کرتا ہے۔ تاریخ آج کے انسانوں کی تربیت کرتی ہے اور آج کے انسان کل کی تاریخ بناتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ خدائی ہدایت کے امباب میں سے ایک تاریخ ہے۔

لیکن اس بارے میں کوئی اشتباہ اور غلط فہمی نہ ہونے پائے کہ ایک سچی تاریخ کا بیان جس قدر تعمیری اور تربیتی ہے اسی قدر جعلی اور تحریف شدہ تاریخیں گمراہی کا باعث ہوتی ہیں۔ اسی بنا پر جن لوگوں کے دل بیمار ہیں انہوں نے ہمیشہ یہ کوشش کی ہے کہ وہ تاریخ میں تحریف کر کے انسانوں کو دھوکا دیں اور خدا کے راستے سے روکیں۔ ہمیشہ یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ تاریخ میں بہت زیادہ تحریف ہوتی ہے اس نکتے کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ لفظ ”ذکر“ یہاں اور قرآن کی بہت سی دوسری آیات میں خود قرآن کی طرف اشارہ ہے کیونکہ اس کی آیات انسانوں کی بیداری اور ہوشیاری کے لیے تذکر اور یادآوری کا موجب ہوتی ہیں۔

اسی بنا پر بعد والی آیت ایسے لوگوں کے بارے میں گفتگو کر رہی ہے کہ جو قرآن کے حقائق اور تاریخ کے عبرت انگیز سبق کو بھول جاتے ہیں جو قرآن سے سنبھلے لے گا وہ قیامت میں گناہ اور جوارہ جی کا سنگین بوجھ کاندھے پر اٹھائے ہوئے ہوگا :

(من اعرض عنہ فانہ یحمل لیوم القیامۃ وزراً)۔

ہاں! پروردگار سے رُوگردانی، انسان کو اس طرح سے بے راہروی کی طرف کھینچ کر لے جاتی ہے کہ قسم قسم کے گناہوں اور فکری غیبت، انحرافات کا سنگین بوجھ اس کے کندھے پر رکھ دیتی ہے (اصلی طور پر لفظ ”وزر“ خود سنگین بوجھ کے معنی میں ہے اور اسے نکرہ کی شکا میں پیش کرنا، اس بارے میں مزید تاکید ہے)۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے : وہ اپنے ان اعمال کو بوجھ تلے ہمیشہ ہمیشہ دبے رہیں گے : (خالد بن فہ)۔

”اور گناہ کا یہ سنگین بوجھ، ان کے لیے قیامت کے دن بہت ہی بڑا بوجھ ہے“ (وساء لہم لیوم القیامۃ حملاً)۔

یہ بات غور سے سمجھنی چاہیے کہ قرآن میں ”وزر“ کا لفظ صرف دو جگہ آیا ہے اور یہ ہمیشہ سنگین بوجھوں کے معنی میں ہے (ہمارے پاس اس بارے میں کوئی دلیل نہیں ہے کہ ہم یہاں پر کسی چیز کو مقدر مانیں اور یہ کہیں کہ وہ عذاب میں یا جہنم میں ہمیشہ رہیں گے) نیز یہ آیت جو جسم اعمال کے مسئلہ کی طرف ایک اشارہ ہے اور یہ کہ انسان انہی اعمال اور کاموں کی وجہ سے کہ جو اس نے اس جہان میں انجام دیئے قیامت میں اچھی جزا یا بُری سزا دیکھے گا۔

۱۔ ہم نے تاریخ اور اس کی اہمیت کے بارے میں سورہ یوسف کی ابتدا اور آخر میں ”جلد ۵، ۲۲۵۰“ اردو ترجمہ اور جلد ۵، ۲۲۵۰ اور اسی طرح سورہ صمد جلد ۵، ۲۲۵۰ اردو ترجمہ میں بحث کی ہے۔

اس کے بعد قیامت کے دن کی توصیف اور اس کے آغاز کے بیان کو شروع کرتے ہوئے اس طرح کہتا ہے : وہی دن کہ جس میں صور پھونکا جائے گا اور ہم گنہگاروں کو نیلے اور سیاہ بدنوں کے ساتھ ، اس دن جمع کریں گے (یوم یفزع فی الصور و نخس للجرمین یوم یفزع زرقا)۔

جیسا کہ پہلے بھی ہم نے اشارہ کیا ہے۔ آیات قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جہان کا اختتام اور دوسرے جہان کا آغاز ، دو انقلابی اور ناگہانی جنبشوں کے ساتھ صورت پذیر ہوگا کہ جن میں سے ہر ایک کو "فزعہ صور" (صور پھونکنے) سے تعبیر کیا گیا ہے اس کی تشریح ہم انشاء اللہ سورہ زمر کی آیہ ۶۸ کے ذیل میں کریں گے۔

لفظ "زرق" "ازرق" کی جمع ہے جو عام طور پر نیلی آنکھ والے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ لیکن کبھی اس شخص پر بھی کہ جس کا بدن درد اور تکلیف کی شدت کی وجہ سے سیاہ اور نیلا ہو چکا ہو بولا جاتا ہے کیونکہ بدن درد اور تکلیف کے وقت نخیٹ اور کمر درد ہو کر اپنی طراوت اور طربت کو کھو بیٹھتا ہے اور نیلا نیلا سا نظر آتا ہے۔

بعض نے اس لفظ کی "ناہینا" کے معنی سے بھی تفسیر کی ہے کیونکہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ نیلی آنکھ والے افراد کی بینائی بہت کمزور ہوتی ہے اور عام طور پر ان کے بدن کے بال بھی کمزور ہوتے ہیں لیکن جو کچھ ہم نے اوپر کی تفسیر میں بیان کیا ہے ، شاید وہ سب سے بہتر ہو۔

اس حالت میں مجرمین آپس میں عالم برزخ میں اپنے توقف کی مقدار کے بارے میں آہستہ آہستہ گفتگو کریں گے۔ بعض کہیں گے کہ تم تو صرف دس ماہیں (یا دس رات دن) عالم برزخ میں رہے ہو۔ (یتخافتون بینہما ان لبثتم الا عسرا) پہلے اس میں شک نہیں کہ عالم برزخ میں ان کے توقف کی مدت بہت طولانی تھی لیکن قیامت کی عمر کے مقابلہ میں بہت ہی مختصر نظر آتی ہے۔

ان کا یہ آہستہ آہستہ کہنا یا تو اس شدید وحشت اور غصہ کی وجہ سے ہوگا کہ جو قیامت کا منظر دیکھ کر انہیں لاحق ہو گیا یا ضعف و ناتوانی کے اثر سے ہوگا۔

بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ یہ جملہ دنیا میں ان کے توقف کی طرف اشارہ ہے کہ جو آخرت اور اس کے وحشت ناک حواشی کے مقابلہ میں چند منٹوں کا ہی معلوم ہوگا۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے : ہم اُس سے کہ جو وہ کہتے ہیں مکمل طور پر آگاہ ہیں : (نحن اعلم بما یقولون)۔ چاہے وہ آہستہ سے کہیں یا بلند آواز سے۔

"اور اس موقع پر وہ شخص کہ جو سب سے بہتر راہ درویش اور عقل و شعور رکھتا ہے ، یہ کہے گا کہ تم تو صرف ایک ہی دن طے ہوئے

۱۰ عربی ادب کے لحاظ سے جو کہ "عشرا" یہاں مذکر کی شکل میں آیا ہے لہذا یقیناً اس کا مضاف الیہ "لیال" ہونا چاہیے جو کہ مؤنث ہے۔ اور اگر اس کا مضاف الیہ "ایام" ہوتا تو "عشرۃ" کہا جاتا۔ لیکن بعض عرب ادبا کہتے ہیں کہ جس وقت عدد تینا شکل میں ظاہر ہو اور

اس کی تیسرے صفت ہو تو پھر سابقہ قاعدہ جاری نہیں ہوتا۔ لہذا "عشر" یہاں دس دنوں کی طرف اشارہ ہے۔

(اذ یقول امثلہم طریقۃ ان لبثتم الا یوما)۔

مسئلہ طور پر تو دس دن کی طولانی مدت ہے اور نہ ہی ایک دن کی لیکن ان میں یہ فرق ہے کہ ایک دن تو اکائید میں سے سب سے کمتر عدد کی طرف اشارہ ہے اور دس دن وہائید میں سے کم عدد کی طرف۔ لہذا پہلا زیادہ کم مدت کی طرف اشارہ کرتا ہے ، اسی لیے قرآن نے اس کے کہنے والے کے بارے میں "امثلہم طریقۃ" (جس کی روش اور طریقہ بہتر ہے) فرمایا ہے۔ کیونکہ عرب دنیا کی کرتا ہی یا برزخ کا چھوٹا جہان ، آخرت کی زندگی کے مقابلہ میں اور اسی طرح ان کی کینیت کا ناچیز ہونا اُس کی کینیت کے مقابلہ میں کم سے کم عدد کے ساتھ ہی مناسبت رکھتا ہے۔ (غور کیجئے گا)۔

۱-۵ وَلِیَسْأَلُوْكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ یَنْفُسُهَا رَبِّیْ نَسْفًا ۝

۱-۶ فِیْذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا ۝

۱-۷ لَا تَرٰی فِیْهَا عِوَجًا وَّلَا اَمْتًا ۝

۱-۸ یَوْمَیْذٍ یَّتَّبِعُوْنَ الدَّاعِیَ لَا عِوَجَ لَهُ ۚ وَخَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ فَلَا تَسْمَعُ اِلَّا هَمْسًا ۝

۱-۹ یَوْمَیْذٍ لَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اِذْنُ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرَضٰی لَهُ قَوْلًا ۝

۱-۱۰ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا یَحِیْطُوْنَ بِہٖ عِلْمًا ۝

۱-۱۱ وَعَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحٰی الْقَیُّوْمِ ۚ وَقَدْ خَابَ مَنْ جَلَّ ظُلْمًا ۝

۱-۱۲ وَمَنْ یَّعْمَلْ مِنْ الصَّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا یَخِفْ ظُلْمًا وَلَا هَضْمًا ۝

- ۱۰۵۔ اور تجھ سے پہاڑوں کے بارے میں سوال کرتے ہیں تم کہہ دو کہ میرا پروردگار انہیں (ریزہ ریزہ کر کے) تباہ کر دے گا۔
- ۱۰۶۔ پھر زمین کو صاف ہموار اور بے آب و گیاہ چھوڑ دے گا۔
- ۱۰۷۔ (اس طرح سے کہ تو اس میں کسی قسم کی پستی اور بلندی نہیں دیکھے گا۔
- ۱۰۸۔ اس دن سب کے سب خدائی دعوت کرنے والے کہہ دیں گے (اور نئی زندگی کے لیے اس کی دعوت پر لبیک کہیں گے) اور تمام آوازیں عظمت خدا کے سامنے خاضع ہوں گی اور سوائے آہستہ آواز کے تو کچھ نہ سنے گا۔
- ۱۰۹۔ اس دن (کسی شخص کی شفاعت فائدہ نہیں دے گی، سوائے اس شخص کے کہ جسے خدا نے رحمن نے اجازت دی ہے اور وہ اس کی گفتگو سے راضی ہے۔
- ۱۱۰۔ جو کچھ اُن (بحرین) نے آگے بھیجا ہے اور جو کچھ انہوں نے (دنیا میں) اپنے پیچھے چھوڑا ہے وہ اسے جانتا ہے، لیکن یہ لوگ اس (اللہ) کے علم کا احاطہ نہیں کر سکتے۔
- ۱۱۱۔ اور (اس دن) تمہارے چہرے خدا سے حق و حقیقت کے سامنے خاضع ہوں گے اور مالوس (اور زیاں کار) وہ لوگ ہوں گے کہ جنہوں نے ظلم کا ہتھ اپنے کندھوں پر اٹھا رکھا ہے۔
- ۱۱۲۔ (لیکن) وہ شخص کہ جو سوچا ہونے کی حالت میں نیک عمل انجام دے گا، نہ تو اسے کسی ظلم کا خوف ہوگا اور نہ ہی اپنے حق کے نقصان کا۔

تفسیر

قیامت کا ہولناک منظر:

چونکہ گزشتہ آیات میں اختتام دنیا اور آغاز قیامت کے بارے میں گفتگو تھی، زیر بحث آیت میں بھی یہی مسئلہ جاری ہے۔ پہلی آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں نے پیغمبر اسلام سے، دنیا کے اختتام کے موقع پر پہاڑوں کے بارے میں سوال کیا ہوگا۔ شاید اس بنا پر کہ انہیں اس بات کا یقین نہیں آتا تھا کہ اس قسم کے سوجدات کہ جن کی جڑیں زمین کی گہرائی میں گئی ہوتی ہیں اور آسمان سے باہیں کر رہے ہیں! اپنی جگہ سے ہل سکتے ہیں اور اگر بات ہو کہ انہیں جڑ سے ہی اٹھلا دیا جائے گا، تو وہ کونسا طوفان اور آندھری ایسی ہے کہ جو ایسا کر سکے گی۔

لہذا قرآن کتابت ہے: تمہارے پہاڑوں کے بارے میں سوال کرتے ہیں (ولیشلونک عن الجبال)۔

جواب میں اُن سے "کہہ دو کہ میرا پروردگار انہیں بکیر کر سگزیوں میں تبدیل کر دے گا اور ہر انہیں تباہ و برباد کر دے گا؟ (فقل ینسفھار بنی سفلاً)۔

پہاڑوں کے انہام کے بارے میں قرآن کی تمام آیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ میدان قیامت میں مختلف مراحل طے کریں گے۔ (۱) اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

پہلے تو وہ لرزہ برائنام ہوں گے:

لیوم ترجف الارض والجبال (مزلہ ۱۲)

پھر وہ چلنے لگ جائیں گے:

وتسیر الجبال سیراً (طور ۱۰)

اور تیسرے مرحلے میں وہ بکیر کر سگزیوں کی شکل اختیار کر لیں گے:

وكانت الجبال کثیراً مھیللاً (مزلہ ۱۲)

اور آخری مرحلے میں طوفان اور آندھیاں انہیں اپنی جگہ سے اٹھا کر فضا میں بکیر دیں گی کہ وہ دھنکی ہوئی زوئی کی طرح نظر آئیں گے:

وتكون الجبال كالعهن المنفوش (قارعہ ۵)

بعد والی آیت کہتی ہے کہ پہاڑوں کے ریزہ ریزہ ہونے اور ان کے ذرات کے بکیر جانے کے ساتھ "خدا صفحہ زمین کو ایک صاف اور ہموار بے آب و گیاہ چٹیل میدان کی طرح کر دے گا" (فیذرها قاعاً صافاً)۔

اس طرح سے کہ تم اس میں کسی طرح کا ٹیڑھا پن اور پستی و بلندی نہ دیکھو گے: (لا تری فیھا عوجاً ولا امْتاً)۔ "اس وقت خدا کی طرف سے دعوت کرنے والا، زندہ ہو کر عشر میں جمع ہونے اور حساب کتاب کی دعوت دے گا اور بے کم و کاست سب کے سب اس کی دعوت پر لبیک کہیں گے۔ اور اس کی پیروی کریں گے: (لیوم یسجدون للداخی لا عوج لہ)۔

کیا یہ دعوت کرنے اور نیکارنے والا "اسرافیل" ہوگا یا خدا کے بزرگ فرشتوں میں سے کوئی اور عظیم فرشتہ ہوگا؟ قرآن سے واضح نہیں ہوتا لیکن جو کوئی بھی ہو، اس کا حکم اس طرح سے نافذ ہوگا کہ کسی شخص میں اُس کی خلاف ورزی کرنے کی طاقت نہ ہوگی۔

"لا عوج لہ" (کسی قسم کا انحراف اور کجی نہیں رکھتا) ممکن ہے کہ اُس دعوت کرنے والے کی دعوت کا وصف ہو یا جن کو دعوت دی جائے گی ان کی توصیف ہو یا یہ دونوں کے لیے ہو۔ یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ جس طرح صاف زمین اس طرح صاف اور ہموار ہو جائیگی کہ اس میں معمولی سا ٹیڑھا پن بھی باقی نہ رہے گا، اسی طرح خدا کا فرمان اور اس کی صاف دعوت دینے والا بھی ویسا ہی صاف و مستقیم ہوگا اور اس کی پیروی بھی ایسی صاف ستھری ہوگی کہ اس میں کسی قسم کی کجی اور انحراف نظر نہیں آئے گا۔

اس موقع پر پروردگار رحمان کی عظمت کے سامنے تمام کی تمام آوازیں خاضع ہو جائیں گی اور آہستہ آہستہ سہی آوازوں کے ساتھ انہیں کوئی "نفس" کا مادہ لغت میں غنائی دالوں کو چھپائی میں ڈال کر ملائے اور پھٹکنے کے معنی میں ہے تاکہ پھٹکے دالوں سے علیحدہ ہو جائیں اور یہاں پہاڑوں کے بکیرنے، غراب ہونے اور اس کے بعد تباہ و برباد ہو جانے کی طرف اشارہ ہے۔

۱۔ "قاع" صاف و ہموار زمین کو کہتے ہیں۔ بعض نے اس کو ایک ایسی جگہ کہ جس میں پانی جمع ہو سے تفسیر کیا ہے۔ ۲۔ "صاف" صاف و ہموار زمین کے معنی میں۔ ان دونوں صفات کے مجموعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس دن پہاڑ اور گھاس وغیرہ سب کچھ زمین سے ختم ہو جائیں گے اور صاف اور سادہ زمین باقی رہ جائے گی۔

۳۔ "عوج" کجی اور گڑھے کے معنی میں ہے اور "امت" اونچی زمین اور ٹیلے کے معنی میں ہے۔ اس بنا پر آیت مجبوری طور پر یہی معنی لگائی کہ کسی قسم کی پستی و بلندی

چیز سنانی نہ دے گی۔ (و خشعت الاصوات للرحمن فلا تسمع الا همسا)۔

آوازوں کی یہ خاموشی یا تو صرف عشر میں عظمت الہی کے رعب کی وجہ سے ہوگی کہ جس کے سامنے سب کے سب حضور کریمؐ یا حساب و کتاب اور نتیجہ اعمال کے خوف سے اور یا دونوں وجوہ سے۔

چونکہ ممکن ہے کہ بعض لوگ اس اشتباہ میں گرفتار ہو جائیں کہ گناہوں میں غرق ہونے کے باوجود کچھ شفاعت کرنے والوں کی شفاعت کے ذریعہ پھر ممکن ہو جائے گا تو فوراً فرمایا گیا ہے، اُس دن کسی کی شفاعت فائدہ نہیں دے گی، سوائے اُن لوگوں (کی شفاعت) کے کہ جنہیں خدا نے رحمت شفاعت کی اجازت دے دیے گا اور اس سلسلے میں ان کی گفتگو سے راضی ہوگا (یومئذ لا تنفع الشفاعة الا لمن اذن له الرحمن ورضی له قولاً)۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہاں شفاعت بے حساب نہیں ہوگی بلکہ شفاعت کا پروگرام، شفاعت کرنے والوں کے بارے میں بھی اور جن کی شفاعت ہو سکے گی، ان کے بارے میں بھی، ایک دقیق پروگرام ہے اور جب تک لوگوں میں اس بات کی لیاقت اور استحقاق نہ ہوگا کہ ان کی شفاعت کی جائے، شفاعت بے معنی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ بعض لوگ شفاعت کے بارے میں غلط خیالات رکھتے ہیں اور اُسے بلا تشبیہ دنیا کی پارٹی بازیوں کی طرح سمجھتے ہیں شفاعت اسلام کی منطق کے لحاظ سے تربیت کا ایک اعلیٰ درجہ ہے اور ان لوگوں کے لیے کہ جو راہ حق میں جدوجہد اور کوشش کرتے ہیں ایک درس ہے۔ لیکن وہ کبھی کبھی اعمال کی کمی اور لغزشوں میں گرفتار ہو جاتے ہیں، ممکن ہے کہ یہ لغزشیں مالیوسی اور ناامیدی میں گرفتار کر دیں۔ اس مقام پر شفاعت ایک قوی محرک کے طور پر ان کے پاس آتی ہے اور کہتی ہے کہ مایوس نہ ہو اور راہ حق پر اسی طرح چلتے رہو اور اس راہ میں کسی کوشش سے دستبردار نہ ہو اور اگر تم سے کوئی لغزش ہو گئی ہے تو ایسے شفاعت کرنے والے موجود ہیں کہ جو خدا نے رحمت کی اجازت سے کہ جس کی عہد رحمت نے سب کو گھیر رکھا ہے۔ تمہاری شفاعت کریں گے۔

یہ شفاعت سستی اور کاہلی یا مستولیت و جواہی سے فرار، یا ارتکاب گناہ کے لیے سبز باغ نہیں ہے۔ بلکہ شفاعت راہ حق میں استقامت اور جہاد تک ممکن ہو سکے، گناہوں کو کم سے کم کرنے کی دعوت ہے۔

اگرچہ ہم شفاعت کی بحث جلد اول سورہ بقرہ کی آیہ ۸۷ کے ذیل میں اور جلد اول سورہ بقرہ آیہ ۲۵۵ کے ذیل میں تفصیل کے ساتھ کر چکے ہیں، البتہ کوئی حرج نہیں ہے کہ یہاں بھی ایک عمدہ داستان کا اضافہ کریں اور وہ یہ ہے کہ عالم ربانی مرحوم یا مری کی جو عملی تہران میں سے تھے، اس طرح نقل کرتے ہیں کہ ایک شاعر جن کا نام حاجب تھا، مسئلہ شفاعت میں عامیانا اشتباہات میں گرفتار تھا، اس نے اس ضمن کا ایک شعر کہا،

حاجب اگر معاملہ حشر با علیؑ است
من ضاکم کہ ہر چہ بجا ہی گناہ کن

اے حاجب! اگر حشر کا معاملہ علیؑ کے ہاتھ میں ہے، تو میں ضامن ہوں تم جتنے چاہو

۱۔ ”ہمس“ (بروزن لسن) جیسا کہ راجب نے مغزوات میں کہا ہے، آہستہ اور پنهان آواز کے معنی میں ہے بعض اس کو پاؤں کی آہستہ چاپ دنگے پاؤں سے چلنے کی آواز کے معنی میں تفسیر کرتے ہیں اور بعض لہجوں کی حرکت سے بغیر اس کے کہ ان کی آواز سُنی جائے۔ ان تمام میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔

گناہ کرو۔

وہ رات کے وقت عالم خواب میں امیر المؤمنین علیؑ علیہ السلام کو دیکھتا ہے کہ وہ جناب انتہائی غصہ اور غضب کی حالت میں ہیں، فرما رہے ہیں کہ (اے حاجب) تو نے شعر شیک نہیں کہا ہے۔ وہ عرض کرتا ہے کہ پھر کیا کہوں؟ تو آپؑ فرماتے ہیں کہ تو اپنے شعر کی اس طرح اصلاح کر:

حاجب اگر معاملہ حشر با علیؑ است

شرم از رخ علیؑ کن و کمتر گناہ کن

اے حاجب! اگر حشر کا معاملہ علیؑ کے ہاتھ میں ہے، تو علیؑ کے چہرے سے شرم کر اور گناہوں کو چھوڑ دے۔

اور چونکہ لوگوں کا قیامت کے میدان میں حساب اور جزا کے لیے حاضر ہونا، اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ خدا ان کے اعمال و کردار سے آگاہ ہے۔ لہذا بعد والی آیت میں اس طرح اضافہ کیا گیا ہے: خدا ان تمام باتوں کو جو انہوں نے آگے بھیجی ہیں اور جنہیں وہ دنیا میں اپنے پیچھے چھوڑ گئے ہیں، جانتا ہے اور ان کے تمام افعال و اقوال اور نیات سے جو وہ پہلے رکھتے تھے اور اس جزا و سزا سے کہ جو انہیں آئندہ پیش نظر آئے گا، خبر ہے لیکن وہ پروردگار کے بارے میں احاطہ علی نہیں رکھتے (یعلم ما بین ایدیمو وما خلفہو ولا یحیطون بہ علماً)۔

اس طرح سے خدا کا علمی احاطہ ان کے اعمال کے بارے میں بھی ہے اور ان کی جزا کے سلسلہ میں بھی اور یہ دونوں حقیقت میں کامل اور علامتہ نفاذات کے دو درکن ہیں کہ قاضی ان حادثات سے بھی کہ جو رونما ہوتے ہیں کامل طور پر باخبر ہو اور ان کے فیصلہ اور جزا سے بھی آگاہ ہو۔

”اور اس دن تمام لوگ خدائے حق و قیوم کے سامنے مکمل طور پر خاضع ہوں گے“ (وعنت الوجوه للحق القیوم)۔
”عنت“ ”عنوة“ کے مادہ سے حضور اور ذلت کے معنی میں ہے۔ لہذا قیومی کوعانی“ کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ قید کرنے والے کے ہاتھ میں خاضع اور ذلیل ہوتا ہے۔

اور اگر ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ یہاں پر حضور کی ”وجہ“ (چہرہ) کی طرف نسبت دی گئی ہے، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ تمام نفیاتی اہمالات کہ جن میں سے ایک حضور بھی ہے۔ سب سے پہلے اس کے آثار چہرہ پر ہی ظاہر ہوتے ہیں۔

بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ ”وجہ“ یہاں پر رؤسا اور املا اور صاحبان اقتدار کے معنی میں ہے کہ اُس دن وہ سب کے سب بارگاہ میں ذلیل و خاضع ہوں گے (لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے)۔

۲۔ بعض مفسرین نے یہ احتمال ذکر کیا ہے کہ پہلے چلے میں جمع کی ضمیر کی شفاعت کرنے والوں کی طرف لوٹتی ہیں اور بعض نے یہ بھی احتمال ذکر کیا ہے کہ ”بہ“ کی ضمیر مجرہ کے اعمال اور ان کے نتائج کی طرف لوٹتی ہے لیکن جو کچھ ہم نے اوپر کہا ہے وہ زیادہ صحیح نظر آتا ہے (غور کیجئے گا)

اس تمام پر خدا کی تمام صفات میں سے "حق" و "قدیم" کا انتخاب اس وجہ سے ہے کیونکہ یہ دونوں صفات قیامت کے سلسلہ کے ساتھ سب کی زندگی اور قیام کا دن ہے، مناسبت رکھتی ہے۔

آیت کے آخر میں مزید فرمایا گیا ہے: "خدا کی ثواب سے مایوس اور ناامید وہ لوگ ہیں کہ جنہوں نے ظلم و ستم کا جو چھاپنے کندھوں پر اٹھایا اور خدا کے فضل سے محروم ہو گئے۔" (وقد خاب من حمل ظلماً)

گویا ظلم و ستم ایسے عظیم اور بڑے گنہگاروں کے لئے ہے جو انسان کے کندھوں پر وزن ڈالتا ہے اور اس کو خدا کی دائمی نعمتوں کی طرف ٹھٹھنے سے روکتا ہے۔ ظلم و ستم ایسے عظیم اور بڑے گنہگاروں کے لئے ہے جو انسان کے کندھوں پر وزن ڈالتا ہے اور اس کو خدا کی دائمی نعمتوں کی طرف ٹھٹھنے سے روکتا ہے۔ ظلم و ستم ایسے عظیم اور بڑے گنہگاروں کے لئے ہے جو انسان کے کندھوں پر وزن ڈالتا ہے اور اس کو خدا کی دائمی نعمتوں کی طرف ٹھٹھنے سے روکتا ہے۔

چونکہ قرآن کی روش عام طور پر مسائل میں مطابقت کو بیان کرنا ہے لہذا اس دن ظالموں اور مجرموں کے انجام کا ذکر کرنے کے بعد، مومنین کی حالت کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: "باقی ہے وہ لوگ کہ جو اعمال صالحہ بجالائیں اور وہ مومن بھی ہوں، تو وہ نہ تو کسی ظلم و ستم سے ڈرتے ہیں اور نہ ہی اپنے حق کا نقصان ہو جانے سے (ومن يعمل من الصالحات وهو مؤمن فلا يخاف ظلماً ولا هضماً)۔"

"من الصالحات" کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر وہ تمام نیک اعمال کو انجام نہیں دے سکتے، تو کم از کم ان میں سے کچھ تو بجالائیں کیونکہ ایمان عمل صالح کے بغیر ایک ایسا درخت ہے کہ جس پر پھل نہ لگتے ہوں۔ جیسا کہ عمل صالح ایمان کے بغیر ایسا درخت ہے کہ جس کی جڑیں نہ ہوں، جو ممکن ہے کچھ دن کھڑا رہے، لیکن آخر کار خشک ہو جائے گا۔ اسی بنا پر عمل صالح کے ذکر کے بعد زیر نظر آیت میں "وہو مؤمن" شرط کا ذکر ہے۔

اصلی طور پر عمل صالح ایمان کے بغیر وجود میں آ ہی نہیں سکتا اور اگر کبھی بے ایمان لوگ کوئی نیک کام انجام دیں تو بلا شک و شبہ وہ وہ دکر اور استثنائی ہوں گے۔ دوسرے لفظوں میں اس غرض سے کہ عمل صالح مسلسل، پائیدار اور گہرا انجام پائے، اسے پاک اور صحیح عقیدے سے سیراب ہونا چاہیئے۔

چند نکات:

۱۔ "ظلم" اور "ہضم" میں فرق: زیر بحث آیات کے آخری جملہ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ صالح مومنین اس دن نہ تو ظلم سے ڈریں گے اور نہ ہی "ہضم" سے۔ بعض مفسرین نے یہ کہا ہے کہ "ظلم" تو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انہیں اس داؤ گاہ عدل میں ہرگز اس بات کا غور نہیں ہو گا کہ ان پر کوئی ظلم و ستم ہو گا اور کسی ایسے گناہ پر ان کا مواخذہ نہیں کیا جائے گا جسے انہوں نے انجام نہیں دیا۔

۲۔ "ہضم" لغت میں "نقص" اور کسی کے معنی میں ہے اور اگر بدن میں غذا کے جذب ہونے کو، ہضم کہتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ غذا ظاہر کا کم ہو جاتی ہے اور اس کی پخت باقی رہ جاتی ہے۔

۳۔ "ہضم" اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انہیں اپنے ثواب میں کسی کے بارے میں بھی کوئی گھبراہٹ نہیں ہو گی کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ یہی جزا پوری پوری ہے کہ وہ کماست انہیں دی جائے گی۔

بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی بیان کیا ہے کہ یہ لفظ تو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان کو اپنی تمام نیکیوں کے برابر ہو جانے کا غور نہیں ہو گا۔ اور دوسرا لفظ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انہیں اس میں تھوڑی سی کمی ہو جانے کے بارے میں کوئی گھبراہٹ نہیں ہو گی کیونکہ خدا کی حساب دقیق ہو گا۔

یہ احتمال بھی ہے کہ ان صالح مومنین سے کچھ لغزشیں بھی سرزد ہو گئی تھیں۔ انہیں اس بات کا یقین ہے کہ ان لغزشوں کو اس سے زیادہ کہ جتنی یہ ہیں، ان کے لیے نہیں کھایا جائے گا اور ان کے اعمال صالحہ کے ثواب میں بھی کسی چیز کی کمی نہیں کی جائے گی۔ مذکورہ بالا تفسیر کیونکہ ایک دوسرے کے متضاد نہیں لہذا ہو سکتا ہے کہ زیر بحث جملہ ان تمام معانی کی طرف اشارہ ہو۔

۲۔ قیامت کے مرحلے: زیر بحث آیات میں حوادث کے ایک سلسلہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جو در قیامت شروع ہونے سے پہلے اور اس کے بعد ظاہر ہوں گے:

- ۱۔ مردے نئی زندگی کی طرف پلٹیں گے (یوم ینفخ فی الصور)۔
- ۲۔ گنہگار مجتمع اور مشہور ہوں گے (نحشر المجرمین)۔
- ۳۔ زمین کے پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر ادھر ادھر بکھر جائیں گے اور سطح زمین بالکل صاف ہموار ہو جائے گی (ینسفہا رقی نسفاً)۔
- ۴۔ سب کے سب خدا کی طرف سے پکارتے والے کے فرمان پر کان دھرنے ہونے ہوں گے۔ اور تمام آوازیں خاموش اور چھپی ہو جائیں گی (یومئذ یتبعون الداعی)۔
- ۵۔ اس دن اذن خدا کے بغیر شفاعت مؤثر نہیں ہو گی (یومئذ لا تنفع الشفاعة)۔
- ۶۔ خدا اپنے بے انتہا علم کے ساتھ تمام کو حساب و کتاب کے لیے حاضر کرے گا (لیلومابین ایدیہو)۔
- ۷۔ سب کے سب اس کے حکم کے آگے سر تسلیم خم کریں گے (وعنت الوجوه للحي القيوم)۔
- ۸۔ ظالم و شکر مایوس ہو جائیں گے (وقد خاب من حمل ظلماً)۔
- ۹۔ اور مومن لطف پروردگار کے امیدوار ہوں گے (ومن يعمل من الصالحات وهو مؤمن)۔

۱۱۳۔ وَكَذَلِكَ أَنْزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا وَصَرَّفْنَا فِيهِ مِنَ الْوَعِيدِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ أَوْ يُحْدِثُ لَهُمْ ذِكْرًا ۝

۱۱۴۔ فَتَعَلَى اللَّهِ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْآنِ مِنْ قَبْلِ أَنْ

يُقْضَىٰ إِلَيْكَ وَحْيُهُ وَقُلْ رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا

ترجمہ

- ۱۱۳۔ اور اسی طرح سے ہم نے اس قرآن کو (فصح و بلیغ زبان) عربی میں اُتایا ہے اور اس میں ہم نے طرح طرح سے غور و کشاید وہ تقویٰ اختیار کر لیں یا یہ ان کے لیے (نصیحت اور) یاد دہانی کا سبب بنے۔
- ۱۱۴۔ پس بلند مرتبہ ہے وہ خدا کہ جو بادشاہ برحق ہے اور تم قرآن پڑھنے میں اس سے پہلے کہ اس کی وحی تجھ پر پوری ہو جائے نہ کیا کرو اور یہ کہا کرو کہ اے میرے پروردگار! میرے علم کو اور زیادہ کر دے۔

تفسیر

پروردگار! میرے علم کو اور زیادہ کر دے:

گزشتہ آیات میں قیامت اور وعدہ وعید سے مربوط تربیتی مسائل کے بارے میں جو کچھ آیا ہے تو درحقیقت ان آیات میں اس کی طرف مجموعی اعتبار سے اشارہ ہے۔

فہم یقولون "یامہم یقولون" (یہ کہتے ہیں: اے ہمارے پروردگار! ہم کو تعلیم عطا کر)۔ یہاں پر بھی قرآن کی تعلیم اور علم کی طرف اشارہ ہے۔

"کَذَٰلِكَ" کی تعبیر حقیقت میں ان مطالب کی طرف اشارہ ہے کہ جو اس آیت سے پہلے بیان ہوئے ہیں اور اس کی مثال یہی ہے جیسے کوئی انسان کسی دوسرے کے لیے بیدار کن اور عبرت انگیز مطالب بیان کرے اور اس کے بعد کہے کہ یوں پسند و نصیحت کرنا چاہیے۔ (اس بنا پر ہمیں دوسری تفسیروں کی ضرورت نہیں رہتی جو بعض مغربین نے اس مقام پر بیان کی ہیں۔ اور وہ آیت کے معنی کے ساتھ کی طاعت بھی نہیں رکھتیں۔)

لفظ "عربی" اگرچہ عربی زبان کے معنی میں ہے لیکن وہ لفظ سے یہاں قرآن کی فصاحت و بلاغت اور اس کے مغایم کے رسا ہونے کی طرف اشارہ ہے۔

پہلا یہ کہ اصولی طور پر عربی زبان — دنیا بھر کے زبان شناسوں کی تصدیق کے مطابق — ایک رساترین زبان ہے اور اس کا ادب قوی ترین ادب ہے۔

دوسرا یہ کہ کبھی "صرفنا" مختلف قسم کے بیانات کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ جو قرآن ایک حقیقت بیان کرنے میں اختیار کرتا ہے مثلاً وحی اور عجز کی سرگرمی گزشتہ امتوں کی گزشتہ کتب کے لباس میں کبھی حاضرین سے خطاب کی صورت میں کبھی میدان قیامت میں ان کے

حالات کی تصویر کشی کی صورت میں اور کبھی کسی دوسرے پیرائے میں بیان کرتا ہے۔

"لَعَلَّہُمْ یَتَّقُونَ" کا "یحدث لہم ذکراً" سے فرق ممکن ہے کہ اس لحاظ سے جو کہ پہلے جملے میں تو وہ یہ کہتا ہے کہ مقصد، تقویٰ کا کامل صورت میں پیدا ہوتا ہے اور دوسرے جملے کا مقصد یہ ہے کہ اگر مکمل طور پر تقویٰ پیدا نہیں ہوتی تو کم از کم بیداری و آگاہی تو ہونا چاہیے تاکہ اس وقت تک تو کچھ حدود میں اسے محدود کر دے اور آخر کے لیے مثبت حرکت کا سرچشمہ بن جائے۔ یہ احتمال بھی ہے کہ پہلا جملہ تو غیر پرہیزگاروں کے لیے پرہیزگاری اور تقویٰ اختیار کرنے کی طرف اشارہ ہو اور دوسرا جملہ پرہیزگاروں کے لیے نصیحت اور یاد دہانی کی طرف اشارہ ہو جیسا کہ سورہ انفال کی آیہ ۲ میں بیان ہوا ہے:

اذ اتیت علیہم آیاتنا زادتمہم ایماناً

جس وقت قرآن کی آیات مومنین کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو ان کے ایمان میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

در اصل زیر بحث آیت میں تعلیم و تربیت کے دو مؤثر اصولوں کی طرف اشارہ ہوا ہے، اول بیان کی صراحت اور عبارات کے رسا ہونے اور ان کے روشن و دلنشین ہونے کا مسئلہ ہے اور دوسرے مطالب کو طرح طرح کے لباسوں میں بیان کرنا ہے تاکہ ہر کار کا موجب نہ ہو اور دلوں میں اُتر جانے کا باعث ہو۔

بعد والی آیت میں مزید ارشاد ہوتا ہے: بلند مرتبہ ہے وہ خدا کہ جو بادشاہ برحق ہے: (فَعَلَى اللَّهِ الْمَلِكُ الْحَقُّ)۔ ممکن ہے لفظ "حق" کا ذکر لفظ "مک" کے بعد اس بنا پر ہو کہ لوگ عام طور پر لفظ "مک" (بادشاہ) سے برا منہم لیتے ہیں اور اس سے ان کے ذہن میں ظلم و ستم اور خود سری کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ لہذا ساتھ ہی فرمایا گیا ہے: خدا بادشاہ برحق ہے۔ بعض اوقات پیغمبر اکرم آیات قرآن حاصل کرنے کے اشتیاق اور اُسے گوئی تک پہنچانے کے لیے عطا کرنے کی خاطر نزول وحی کے وقت جلدی فرمایا کرتے تھے اور جبریلؑ کو پورے طور پر اس بات کی ملت نہ دیتے تھے کہ وہ اپنی بات کو تمام کر لیں۔ اس آیت کے آخر میں نصیحت کی جا رہی ہے: قرآن کے لیے جلدی نہ کیا کرو! اس سے پہلے کہ اس کی وحی پوری ہو: (وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْآنِ مِنْ قَبْلِ أَنْ يُقْضَىٰ إِلَيْكَ وَحْيُهُ)۔

"اور یہ کہا کرو کہ اے پروردگار! میرے علم میں زیادتی فرما (وَقُلْ رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا)۔

قرآن کی بعض دوسری آیات سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر میں نزول وحی کے وقت ایک خاص کیفیت پیدا ہو جایا کرتی تھی کہ جس بات کا سبب بنتی تھی کہ وہ حصول وحی میں جلدی کریں۔ مثلاً:

لَا تَحْرُكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ فَإِذَا قَرَأَهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ

اپنی زبان کو جلدی کی خاطر وحی حاصل کرتے وقت حرکت نہ دیا کرو۔ اُسے تیرے سینے میں جمع کرنا ہمارے ذمہ ہے تاکہ تو اُسے تلاوت کر سکے۔ پس جب ہم اسے پڑھ چکیں تو پھر تو اس کی

تلاوت کی پیروی کر لے

چند نکات :

۱۔ حصول وحی تک میں عجلت نہ کرو :

ان جملوں میں چند تربیتی سبق موجود ہیں۔ ان میں سے ایک حصول وحی کے وقت عجلت کرنے سے نہی ہے۔ اکثر یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ کچھ لوگ کسی بات کرنے والے کی بات سنتے وقت ابھی اس کا مطلب ختم ہونے نہیں پاتا کہ اسے دہرانے یا پورا کرنے میں لگ جاتے ہیں۔ اس کام کی بنیاد کبھی توبہ صبری ہوتی ہے اور کبھی غور و خوض نہ ہوتا۔ البتہ بعض اوقات مطلب حاصل کرنے اور ماموریت کی انجام دہی کے لیے اشتیاق اور لگاؤ بھی انسان کو اس کام کے لیے آواز دے دیتا ہے۔ اس صورت میں عجلت پر اصرار نہ دالاجزہ تو مقدس ہوتا ہے لیکن نفس عمل یعنی عجلت کرنا عام طور پر مشکلات پیدا کر دیتا ہے۔ اسی وجہ سے زیر بحث آیات میں اس کام سے منع کیا گیا ہے۔ اگرچہ وہ صحیح مقصد کے لیے ہی ہو۔ اصولی طور پر وہ کام جو سے محفوظ تھا لیکن چونکہ انہیں ہر چیز میں لوگوں کے لیے نمونہ عمل ہونا چاہیے تاکہ لوگ ابھی طرح سے سمجھ لیں کہ جہاں وحی کو حاصل کرنے میں عجلت کرنا مناسب نہیں ہے تو پھر باقی کاموں کا معاملہ تو بالکل واضح ہو جاتا ہے۔

البتہ عجلت کا سرعت کے ساتھ اشتباہ نہیں کرنا چاہیے۔ سرعت تو اس کو کہتے ہیں کہ پروگرام مکمل طور پر منظم ہو چکا ہے اور تمام مسائل کی جانچ پڑتال کر لی گئی ہے، اس کے بعد وقت ضائع کیے بغیر بلا تاخیر اس پروگرام پر عمل شروع کر دیا جائے۔ لیکن عجلت اس کو کہتے ہیں کہ ابھی پروگرام ابھی طرح بننا نہیں ہے اور اس کے لیے ابھی تکمیل اور غور و خوض کی ضرورت ہے اور کام شروع کر دیا جائے۔ اسی بنا پر "سرعت" ایک پسندیدہ عمل ہے اور "عجلت" اور جلد بازی کرنا ناپسندیدہ کام ہے۔

البتہ اس جملہ کی تفسیر میں بعض دوسرے احتمالات بھی بیان کیے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک احتمال یہ ہے کہ بعض اوقات وحی کے آنے میں دیر ہو جانے کی وجہ سے پیغمبر اکرم ﷺ بے تاب ہو جایا کرتے تھے۔ یہ آیت آپ کو یہ تعلیم دے رہی ہے کہ بے تاب نہ ہوں۔ ہم برعلی جو کچھ ضروری ہو آپ پر وحی کرینگے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ قرآن مجید کی آیات چونکہ مجموعی صورت میں ایک ہی ترتیب مشب قدر میں قلب پیغمبر پر نازل ہو گئی تھیں اور دوسری مرتبہ بتدریج ۲۳ سال کی مدت میں نازل ہوئیں۔ لہذا پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تدریجی طور پر نازل ہوتے وقت کبھی کبھی جبریل سے پہلے ہی بڑھ چکے ہوئے گئے تھے۔ قرآن حکم دیتا ہے کہ تم اس کام میں عجلت مت کرو اور نازل تدریجی کو اس کے موقع اور محل پر انجام پانے دو۔

۲۔ علم میں اضافے کے طلبگار رہو : اس سبب سے کہ وحی حاصل کرتے وقت جلد بازی سے ممانعت ممکن ہے یہ وہم پیدا کرے کہ یہاں زیادہ علم حاصل کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ لہذا ساتھ ہی فرمایا گیا ہے : یہ کما کر دو کہ اسے پروردگار ! میرے علم میں اضافہ فرما (قل رب زدنی علما)۔

لہ بروقیات ۱۵ ۱۴

اس جملے سے مذکورہ خیال کو رد کیا گیا ہے۔ یعنی عجلت اور جلد بازی درست نہیں ہے۔ لیکن علم میں اضافے کی کوشش کرنا ضروری بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ پہلے جملے میں نبی کریم کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ آیات کے تمام پہلوؤں کو دوسری آیات میں وضاحت بخشنے میں جلدی نہ کیا کرو اور دوسرے جملے میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ خدا سے قرآن کی آیات کے مختلف مضامین کے بارے میں زیادہ سے زیادہ آگاہ بہر حال جہاں رسول اللہ ﷺ اس علم سے سرشار اور آگاہی سے سمور روح کے بلا چود اس بات پر مامور ہوئے کہ آخری طرح خدا سے علم کی دعا کرتے رہیں تو دوسروں کی فتر داری کا کل طور پر واضح اور روشن ہو جاتی ہے۔ درحقیقت اسلام کی نظر میں علم کی کوئی حد یا سرحد نہیں ہوتی۔ اس امر میں زیادتی اور اضافہ کا مطالبہ مذہب سے لیکن علم میں ممدوح ہے۔ افراط جبری چیز ہے لیکن علم میں افراط کا کوئی معنی نہیں ہے۔ علم کی کوئی مکانی سرحد نہیں ہے۔ چین اور شریات تک بھی اس کی طلب میں دوڑنا چاہیے۔ علم کوئی زمانی سرحد بھی نہیں رکھتا۔ گہوارے لے کر قریب تک جاری ہے۔

اسلام معلم اور استاد کے لحاظ سے بھی کوئی سرحد نہیں بتاتا کیونکہ حکمت مومن کی گمشدہ چیز ہے۔ جس شخص کے پاس سے اُسے ملے۔ حاصل کر لے اور اگر کوئی سوئی کسی ناپاک منہ سے گرے تو اسے اٹھا لے۔

تلاش و کوشش کی نظر سے بھی اس کی کوئی سرحد نہیں ہے۔ سمندروں کی گہرائیوں میں جانے اور علم حاصل کرے۔ یہاں تک کہ اس کو حاصل کرے لے اپنی عزیز جان بھی دے دے۔

اس طرح سے مطلق اسلام میں لفظ "فارغ تحصیل" ایک بے معنی لفظ ہے۔ ایک سچے مسلمان کی تحصیل علم ختم نہیں ہوتی۔ وہ ہمیشہ ہی تلاشی اور طالب علم رہتا ہے۔ چاہے وہ بہترین استاد ہی کیوں نہ ہو جائے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ نے اپنے ایک صحابی سے فرمایا : ہم ہر شب جمعہ ایک خاص سرور اور خوشی حاصل کرتے ہیں۔

اُس نے عرض کیا :

خدا اس خوشی میں اور زیادتی کرے، یہ کوئی خوشی ہے۔

تو آپ نے فرمایا :

اذا كان ليلة الجمعة وافى رسول الله (ص) العرش ووافى الائمة (عليهم السلام) وواهيئنا مهمو فلا تدارولحننا بابدانتنا الا يعطو مستفاد ولو لا ذلك لافقدنا۔

جب شب جمعہ ہوتی ہے تو رسول اللہ (ص) کی روح پاک اور ان کے (علیہم السلام) کی ارواح اور ہم ان کے ساتھ عرش خدا کی طرف جاتے ہیں اور ہماری روضیں ہر طرف نہیں وگتیں گئے علم کے ساتھ اور اگر ایسا نہ ہو تو ہمارے علوم ختم ہو جائیں۔

یہ مضمون متعدد روایات میں مختلف عبارات کے ساتھ بیان ہوا ہے جو کہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ پیغمبر اکرم اور ان کے علم میں یہ تفسیر فراشتین جلد ۲، ۳۹۵۔

اشافہ ہوتا رہتا ہے اور جی دنیا تک یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

ایک اور روایت میں پیغمبر پر گوارا اسلام سے منقول ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا :
اِذَا اتَى عَلَيَّ يَوْمٌ لَا اَزْدَادُ فِيهِ عَلَمًا يَقْتَرِبُنِي إِلَى اللَّهِ فَلَا بَارَكَ اللَّهُ لِي
فِي طُلُوعِ شَمْسِهِ۔

جو دن مجھ پر ایسا آئے کہ اُس میں کسی علم کا مجھ میں اضافہ نہ ہو کہ جو مجھے اللہ کے قریب کرے،
اس دن کا طلوع آفتاب مجھ پر مبارک نہ ہو۔
ایک اور حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ بھی منقول ہے :

اعْلَمُوا النَّاسَ مِنْ جَمْعِ عِلْمِ النَّاسِ إِلَى عِلْمِهِ ، وَكَثْرَةِ النَّاسِ قِيَمَةً
أَكْثَرُهُمْ عِلْمًا وَقِلَّةِ النَّاسِ قِيَمَةً أَقَلُّهُمْ عِلْمًا۔

لوگوں میں سے سب سے زیادہ صاحب علم وہ ہے کہ جو لوگوں کے علم کا اپنے علم میں اضافہ کرے
تمام لوگوں میں سے زیادہ گراں قدر وہ شخص ہے جس کا علم زیادہ ہو اور سب سے کم قدر وہ شخص والا
وہ شخص ہے کہ جس کا علم سب سے کم اور حقوڑا ہو۔

یہ ہے علم کی قدر و قیمت اسلام کی نظر میں۔

۱۱۵- وَلَقَدْ عَهِدْنَا إِلَىٰ آدَمَ مِنْ قَبْلِ فَنَسَىٰ وَلَمْ يُجِدْ لَهُ عَزْمًا ۝
۱۱۶- وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ أَبَىٰ ۝
۱۱۷- فَقُلْنَا يَا آدَمُ إِنَّ هَٰذَا عَدُوٌّ لَكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجُكَمَا
مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْفَىٰ ۝

۱۱۸- إِنَّ لَكَ أَلَّا تَجُوعَ فِيهَا وَلَا تَعْرَىٰ ۝
۱۱۹- وَأَنَّكَ لَا تَظْمَأُ فِيهَا وَلَا تَصْحَىٰ ۝

ط تفسیر مجمع البیان و تورات التسلیم و صافی ، زیر بحث آیات کے ذیل میں ۔
عہ سینفہ : ۱۱۵ جلد ۲ ، ص ۲۱۹ (مادہ علم)

۱۲۰- فَوَسَّوَسَ إِلَيْهِ الشَّيْطَانُ قَالَ يَا دُمُ هَلْ أَدُلُّكَ عَلَى شَجَرَةٍ
الْخُلْدِ وَمَلِكٍ لَا يَبُلَىٰ ۝
۱۲۱- فَأَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوَاتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفْنَ
عَلَيْهِمَا مِنْ وُرْقِ الْجَنَّةِ وَعَصَىٰ آدَمُ رَبَّهُ فَغَوَىٰ ۝
۱۲۲- ثُمَّ اجْتَبَاهُ رَبُّهُ قَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدَىٰ ۝

ترجمہ

۱۱۵- ہم نے آدم سے پہلے پہل عہد لے لیا تھا لیکن وہ اُسے بھول گیا اور ہم نے اس میں عزم و استقامت نہ پائی۔
۱۱۶- جس وقت ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے انکار کیا (اور سجدہ نہ کیا)
۱۱۷- ہم نے کہا : اے آدم ! یہ تیرا اور تیری بیوی کا دشمن ہے۔ ایسا نہ ہو کہ یہ تمہیں جنت سے باہر نکال دے کیونکہ اس طرح
تو تم رحمت اور شفقت میں پڑ جاؤ گے۔

۱۱۸- (لیکن بہشت میں تم راحت د آدم سے ہو) اس میں تمہیں نہ تو بھوک لگے گی اور نہ ہی تم پر بہنہ ہو گے۔
۱۱۹- اور اس میں تمہیں پیاس لگے گی نہ سوج کی دھوپ تمہیں تکلیف پہنچائے گی۔
۱۲۰- لیکن شیطان نے اُسے دوسروں میں ڈال دیا اور کہا : اے آدم ! کیا تو یہ چاہتا ہے کہ میں تجھے عروج و اوج کے درخت اور لافانی
ملک کی طرف رہنمائی کروں !

۱۲۱- آخر کار دونوں نے اس میں سے کھالیا (اور ان کا بہشتی لباس اُتر گیا) اور ان کی شرٹ نکلیں ان پر ظاہر ہو گئیں اور وہ دونوں بہشت
کے درختوں کے پتوں کو اپنے اوپر پھینک گئے اور (آخر کار) آدم نے اپنے پروردگار کی نافرمانی کی اور (اس کے اعانت سے) محروم ہو گیا۔
۱۲۲- اس کے بعد اس کے پروردگار نے اُس کو برگزیدہ بنالیا اور اس کی توبہ قبول کر لی اور اُسے ہدایت کی۔

تفسیر

شیطان کی فریب کاری :

اس سورہ کا ایک اہم حصہ سوئی و بنی اسرائیل کی سرگزشت اور فرعون اور اس کے حواریوں کے ساتھ ان کے مقابلے کے ذکر پر مشتمل ہے

زیر بحث آیات آدم و حوا کی داستان اور ابلیس کی اُن سے دشمنی اور مقابلہ کرنے کے بارے میں ہیں۔

شاید یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حق و باطل کی جنگ آج اور کل اور ماضی و فرما میں منحصر نہیں ہے۔ یہ ابتداء سے آفرینہ جاری ہے اور اسی طرح سے جاری رہے گی۔

اگرچہ آدم و ابلیس کی سرگشتی بار بار قرآن مجید میں بیان ہوئی ہے لیکن ہر موقع پر کچھ نئے نکات بیان کیے گئے ہیں۔ یہاں پر پہلے خدا سے عہد و پیمان کی بات ہو رہی ہے۔ فرمایا گیا ہے: ہم نے آدم سے پہلے عہد و پیمان لے لیا تھا لیکن وہ اُسے بھول گیا اور اپنے ہم کاپا بند رہا (ولقد عہدنا لآدم من قبل فنی ولسعد لہ عزمًا)۔ اس بارے میں کہ اس عہد سے کونسا عہد مراد ہے، بعض نے تو یہ کہا ہے کہ یہ ممنوعہ درخت کے نزدیک نہ جانے کا خدا کا فرمان ہے۔ متعدد روایات بھی اس تفسیر کی تائید کرتی ہیں۔

جب کہ بعض دوسرے مفسرین نے دوسرے احتمالات بھی ذکر کیے ہیں۔ انہیں بھی اسی معنی کے شاخ و برگ شمار کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً خدا آدم کو اس خطرے کی خبر دینا کہ شیطان تمہارا سخت دشمن ہے، تم اس کی پیروی نہ کرنا۔ باقی رہا "نسیان" تو مسلمہ طور پر وہ مطلق فراموشی اور بھول جانے کے معنی میں نہیں ہے بلکہ یہ کہ مطلق فراموشی میں عتاب اور ملامت نہیں ہو سکتی بلکہ یہ یا تو ترک کرنے کے معنی میں ہے، جیسا کہ ہم روزمرہ کی گفتگو میں اُس شخص سے کہ جس نے اپنے عہد کی وفا نہ کی ہو، کہتے ہیں کہ ایسا مسلمہ ہو گیا کہ تو اپنے عہد کو بھول گیا ہے۔ یعنی تجھے یاد ہونا بھی فراموش کرنے والے کی طرح ہے یا یہ اُن فراموش کاریوں کے معنی میں ہے کہ جو توجہ کی کمی اور مبالغہ کے مطابق "ترک تحفظ" کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔

یہاں "عزم" سے مراد مصمم اور محکم ارادہ ہے کہ جو انسان کی شیطان کے قوی دوسروں کے مقابلے میں حفاظت کرتا ہے۔

بہر حال اس میں شک نہیں کہ آدم کسی گناہ کے مرتکب نہیں ہوئے بلکہ ان سے صرف "ترک ادبی" سرزد ہوا یا دوسرے لفظوں میں آدم کی جنت میں سکونت کا دور، تکلیف دیا و ذمہ داری یا مسئولیت کا دور نہیں تھا۔ بلکہ یہ دنیا میں زندگی بسر کرنے کے لیے تیار ہونے اور ذمہ داریوں کی جوابدہی کو قبول کرنے کا ایک تجرباتی دور تھا۔ خاص طور پر یہ بات کہ اس مقام پر خدا کی ممانعت اخلاقی پہلو کی حامل تھی کیونکہ اس سے فرمایا تھا کہ اگر ممنوعہ درخت سے کھاؤ گے تو حشا بہت سی زحمت و تکلیف میں گرفتار ہو جاؤ گے (ان سب باتوں کی تفصیلات اور اسی طرح یہ بات کہ شجرہ ممنوعہ سے کیا ملاو تھی اور اس قسم کے دیگر مباحث چوتھی جلد میں سورہ اعراف کی آیہ ۲۲ تا ۲۹ کے ذیل میں ہم تفصیل کے ساتھ بیان کیے ہیں) اس کے بعد اسی قصہ کے ایک دوسرے حصہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: اس وقت کو یاد کرو کہ جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو، ان سب نے تو سجدہ کیا مگر ابلیس نے نہ کیا، اُس نے انکار کر دیا (واذ قلنا للہم اسجدوا لآدم فہجوا الا ابلیس اہم)۔

اس سے آدم کا باحفظ مقام اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے۔ وہ آدم کو جو سجدہ ملا کہ تھا اور پروردگار کی اس عظیم مخلوق کے لیے لائق احترام ضمنی طور پر اُن سے ابلیس کی دشمنی پہلے ہی قدم پر ظاہر ہو جاتی ہے کہ اُس نے عظمت آدم کے سامنے ہرگز مرتعظیم نہ سمجھا کیا۔

اس میں شک نہیں کہ سجدہ، پرستش و عبادت کے معنی میں خدا کے ساتھ مخصوص ہے اور خدا کے سوا کوئی شخص اور کوئی چیز بھی معبود نہیں ہو سکتی ہے۔ اس بنا پر فرشتوں کا یہ سجدہ خدا کے لیے تھا، زیادہ سے زیادہ اس با عظمت وجود کی آفرینش کی خاطر سے کہ:

شائستہ تاشش اُن آفرینہ گاری است * کار و چہنیں دل آفرینہ نقشی ز ما و طمینی !

وہ خالق ہی لائق تعریف ہے کہ جس نے پانی اور مٹی سے ایسا دل آفرین نقش بنایا۔

یہاں سجدہ خضوع اور انکساری کے معنی میں ہے۔

بہر حال ہم نے اس موقع پر آدم کو خطرے سے آگاہ کر دیا تھا اور "ہم نے کہا اے آدم! اس طرز عمل سے یہ تصدیق ہو گئی کہ ابلیس اور تیری بیوی کا دشمن ہے۔ اس کا خیال رکھنا کہ کہیں وہ تمہیں جنت سے باہر نہ نکال دے۔ جس سے تو رنج و تکلیف میں مبتلا ہو جائیگا: قتلنا یا آدم ان ہذا عدو لک ولزوجک فلا یخرجنکما من الجنة فتشی)۔

یہ بات واضح ہے کہ یہاں جنت "دار آفرت کی بہشت با دو اداں کے معنی میں نہیں ہے کہ جو ایک نقطہ تکامل دار تھا ہے اور اس سے باہر نکلتا اور وہاں سے بازگشت ممکن نہیں ہے۔ یہ جنت جس کا یہاں ذکر ہے ایک باغ تھا کہ جس میں اس دنیا کے باغوں کی سب چیزیں موجود تھیں اور پروردگار کے لطف و کرم سے اس میں کوئی تکلیف اور زحمت نہیں تھی۔ لہذا خدا آدم کو اس خطرے سے خبردار کرتا ہے کہ اگر اس اس دنیا کی جگہ سے تم باہر نکل گئے تو رنج و مشکل میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ "فتشی" شقاوت کے مادہ سے ہے اور شقاوت کے معانی میں سے ایک درد رنج بھی ہے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا نے اپنا زور کس شخص پہلے دونوں یعنی آدم و حوا کی طرف کیوں کیا ہے اور فرمایا ہے کہ:

فلا یخرجنکما من الجنة

شیطان تم دونوں کو جنت سے نہ نکال دے۔

لیکن باہر آنے کا نتیجہ مفروضہ کی صورت میں آدم کے بارے میں بیان کیا ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے:

فتشی

اے آدم! تو درد رنج میں جا پڑے گا۔

تفسیر کا یہ اختلاف ممکن ہے کہ اس نکتے کی طرف اشارہ ہو کہ پہلے درجے میں درد رنج آدم ہی کے حصہ میں آئے تھے۔ یہاں تک کہ یہ انہی کی ذمہ داری تھی کہ اپنی بیوی کی شکلات بھی اپنے کندھے پر اٹھائیں اور مردوں کی ذمہ داری شروع دن سے اسی طرح سے چلی آ رہی ہے۔ یا یہ بات ہے کہ چونکہ شروع میں آدم سے ہی عہد و پیمان لیا گیا تھا، لہذا آخر میں بھی انہی سے خطاب کیا گیا ہے۔

اس کے بعد خدا، بہشت کے راحت و آرام اور اس سے باہر کے ماحول کے درد و رنج کی آدم کے لیے اس طرح تشریح کرتا ہے:

تویماں پر نہ تو بھوکا رہے گا۔ اور نہ ہی برہنہ ہوگا: (ان لك الاتموج فیہا ولا تعری)۔

"نہ تو اس میں پیاسا رہے گا اور نہ ہی مٹی کی تپتی ہوئی دھوپ تجھے تکلیف پہنچائے گی" (وانك لا تظمون فیہا ولا تعفی)۔ یہاں مفسرین کے لیے ایک سوال سامنے آیا ہے اور وہ یہ کہ پیاس کا حرارت آفتاب کے ساتھ اور بھوک کا برہنگی کے ساتھ کیوں ذکر کیا گیا ہے حالانکہ عام طور پر پیاس کا ذکر بھوک کے ساتھ کرتے ہیں۔

اس سوال کے جواب میں انہوں نے یہ کہا ہے کہ لباس اور سورج کی وجہ سے تعلق ناقابل انکار ہے۔ "تضحیٰ" "وضعی" مادہ سے سورج کا بادل وغیرہ کے سامنے کے بغیر چمکتا ہے۔

باقی رہا بھوک کا برہنگی کے ساتھ جمع ہونا، تو ممکن ہے، یہ اس وجہ سے ہو کہ بھوک بھی غذا سے اندرونی برہنگی کی ایک قسم ہے۔ یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ دونوں برہنگی اور گرہنگی (علیٰ اور بھوک) فقر و فاقہ کی دو خاص نشانیاں ہیں کہ جو عام طور پر ایک ہی ساتھ بیان کی جاتی ہیں: (بھوک کے نکلنے پر ہر حال ان دونوں آیات میں انسان کی چار اصلی اور ابتدائی ضروریات یعنی کھانا، پانی، لباس اور مکان (سورج سے بچاؤ کے لیے سامنے) کی ضرورت کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ ان ضروریات کا جنت میں حاصل ہونا، نعمت کی فراوانی کی وجہ سے تھا درحقیقت ان امور کا ذکر ان باتوں کی ایک وضاحت ہے کہ جن کا بیان "فتشقی" (تو زحمت اور مشقت میں پڑ جائے گا) کے جملے میں ہوا ہے۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود شیطان نے آدم کے خلاف عداوت اور دشمنی پر کمر باندھ لی۔ اسی وجہ سے وہ آرام سے نہ بیٹھا۔ اُس نے آدم کو وسوسہ ڈالنا شروع کر دیا اور کہا: اے آدم! کیا میں تجھے عمرِ جاودانی کے درخت کا پتہ نہ دوں کہ جو شخص اس کا پھل کھائے گا وہ ہمیشہ علی شجرۃ الخلد و ملک لایموتی۔ (فوسوس الیہ الشیطان قال یا آدم هل ادلتک

"وسوسہ" دراصل بہت ہی آہستہ اور دھیمی آواز کے معنی میں ہے۔ بعد ازاں ذہن میں بُرے مطالب اور بے بنیاد افکار پیدا ہونے کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ خواہ وہ (بُرے مطالب) انسان کے اندر سے خود بخود پیدا ہوں یا باہر سے کوئی ان کا عامل اور سبب بنے۔

حقیقت میں شیطان نے یہ اندازہ لگایا کہ آدم کا میلان کس چیز کی طرف ہے اور وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ زندگی جاوداں اور بے نوال قدرت و اقتدار تک پہنچنے کا خواہشمند ہے لہذا اُس نے انہیں پروردگار کی مخالفت کی طرف کیونچنے کے لیے اُنہی دونوں عوامل سے استفادہ کیا۔ دوسرے نظروں میں جس طرح سے خدا نے آدم سے یہ وعدہ کیا تھا کہ اگر تم شیطان کو اپنے سے دُور رکھو گے تو ہمیشہ کے لیے اپنے رب کی نعمتوں سے بہرہ مند رہو گے، شیطان نے بھی اپنے وسوسوں میں اسی نکتے کو ملحوظ رکھا۔

ان شیاطین اپنے منصوبوں کا ابتداء انہی راستوں سے کرتے ہیں کہ جن سے راہِ حق کے رہبر کرتے ہیں لیکن کچھ زیادہ وقت نہیں گزرتا کہ اُسے انحراف کی طرف کھینچ کر لے جاتے ہیں اور راہِ حق کی کشش کو ٹکرا ہوں تک پہنچنے کے لیے ذریعہ قرار دیتے ہیں۔ آخر کار جو نہیں ہونا چاہیے تھا، وہ ہو گیا۔ آدم و حوا دونوں نے ممنوعہ درخت سے کھالیا اور اس کے ساتھ ہی بہشتی لباس ان کے بدنوں سے گر پڑے اور ان کے اعضاء آشکار ہو گئے: (فاکلامنہا فبدت لہما نسواۃہما)۔

جب آدم و حوا نے یہ کیفیت دیکھی تو فوراً "جنت کے درختوں کے پتوں سے اپنے جسم کو ڈھانپنے لگے" (وظفقا یخسفان لہ "سواۃ" جمع ہے "سوسۃ" (بروزن "عسورۃ") کہ یہ اصل میں اس چیز کے معنی میں ہے کہ جو ناپسند ہو۔ لہذا کبھی مردہ جسم پر اور کبھی شرم گاہ کے معنی میں بولا جاتا ہے اور یہاں یہی آخری معنی مراد ہے۔

ہما من ورق الجنة۔

ان! آخر کار "آدم نے اپنے پروردگار کی حکم عدلی کی اور اس کی جزا اور انعام سے محروم ہو گیا" (وعطی آدم ربہ غفوی)۔ "غفوی" "غنی" کے مادہ سے لیا گیا ہے، جو ایسے جاہلانہ کام کے معنی میں ہے کہ جن کا سرچشمہ عقیدہ ہو اور چونکہ حضرت آدمؑ نے ان شیطان و وسوسے سے پیدا ہونے والے دوسرے کی بنا پر عدم آگاہی سے اُس شجرہ ممنوعہ سے کھالیا تھا۔ لہذا اُس کو "غفوی" سے تعبیر لیا گیا ہے۔

بعض مفسرین نے "غفوی" کو اس جمل و نادانی کے معنی میں لیا ہے کہ جو غفلت سے پیدا ہو، بعض نے محرومیت کے معنی میں اور بعض نے زندگی میں فساد پیدا ہونے کے معنی میں لیا ہے۔

بہر حال "غنی" "رشد" کا لفظ مقابل ہے۔ رشد یہ ہے کہ انسان کسی ایسے راستے سے جائے کہ اپنے مقصد تک پہنچ جائے لیکن "غنی" یہ ہے کہ اپنے مقصد تک پہنچنے سے رہ جائے اور محروم رہ جائے۔

لیکن چونکہ آدمؑ فاسق پاک اور مومن تھے اور رضائے خدا کی راہ میں قدم اٹھاتے تھے اور یہ غلطی جو شیطان و وسوسہ کی وجہ ہو گئی۔ ایک اشتہائی پہلو رکھتی تھی۔ لہذا خدا نے انہیں ہمیشہ کے لیے اپنی رحمت سے دُور نہیں کیا بلکہ "اس واقعہ کے بعد اس کے پروردگار نے اسے برگزیدہ بنالیا اور اس کی توبہ قبول کر لی اور اسے ہدایت کی" (شہر اجتباہ ربہ فتاب علیہ وھدی)۔

کیا آدم گناہ کے مرتکب ہوئے تھے؟

اگرچہ لفظ "عصیان" آج کے عرف میں گناہ کے معنی میں ہی بولا جاتا ہے لیکن لغت میں اطاعت و فرمان سے باہر ہو جانے کے معنی میں ہے (چاہے فرمانِ دینی ہو یا استعمالی) لہذا لفظ عصیان سے لازمی طور پر ترک واجب یا ارتکابِ حرام کا معنی مراد نہیں ہے۔ بلکہ ایک مستحب کا ترک یا محذورہ کا ارتکاب بھی ہو سکتا ہے۔

اس سے قطع نظر کرتے ہوئے "امر دینی" کبھی ارشادی پہلو بھی رکھتے ہیں، مثلاً ڈاکٹر کے اوامر و نواہی، جو بیمار کو حکم دیتا ہے کہ فلاں دوا کھاؤ اور فلاں غیر مناسب غذا سے پرہیز کرو۔ اس میں شک نہیں کہ اگر بیمار طبیب کے حکم کی مخالفت کرے گا تو صرف خود کو ہی نقصان پہنچائے گی کیونکہ اُس نے طبیب کے ارشاد اور ہدایت کی پرواہ نہیں کی۔

خدا نے بھی آدمؑ سے فرمایا تھا کہ ممنوعہ درخت کا پھل نہ کھانا کیونکہ اگر تم اُسے کھاؤ گے تو جنت سے باہر نکلنا پڑے گا اور زمین میں بے رحم رنج و تکلیف میں جا کر گرفتار ہو جاؤ گے۔ انہوں نے اس امر ارشادی کی مخالفت کی اور اس کا نتیجہ بھی دیکھ لیا۔

یہ بات اس چیز کی طرف توجہ کرتے ہوئے زیادہ واضح ہو جاتی ہے کہ آدمؑ کے جنت میں ٹھہرنے کا زمانہ تجرباتی تھا، تکلیف اور ذمہ داری کا زمانہ نہیں تھا۔

اس سے قطع نظر عصیان و گناہ کبھی مطلق پہلو رکھتے ہیں، یعنی سب کے لیے بغیر کسی استثناء کے گناہ ہوتے ہیں مثلاً جھوٹ بولنا، ظلم کرنا۔ "یخسفان" "خسف" کے مادہ سے یہاں لباس پہننے کے معنی میں ہے۔

حرام مال کھانا اور کبھی وہ نسبتی پہلو رکھتے ہیں یعنی یہ ایسا کام ہوتا ہے کہ اگر ایک انسان سے سرزد ہو جائے تو نہ صرف یہ کہ کوئی گناہ نہیں ہوتا کبھی اس کی نسبت سے وہ ایک مطلوب اور شائستہ عمل ہوتا ہے لیکن اگر وہی کام کسی دوسرے سے سرزد ہو جائے تو اس کے مرتبہ و مقام کا کرتے ہوئے وہ غیر مناسب ہوتا ہے۔

مثلاً ایک ہسپتال بنانے کے لیے لوگوں سے امداد کی اپیل کی جاتی ہے۔ ایک کارگر آدمی اپنی ایک دن کی مزدوری کہ جو کبھی چند روپے ہے زیادہ نہیں ہوتی سے جیتا ہے۔ یہ عمل اس کی نسبت سے ایثار اور اچھا عمل ہے، کامل طور پر مطلوب و پسندیدہ ہے لیکن اگر ایک دولت مند آدمی بھی اتنی ہی مقدار میں مدد کرے تو نہ صرف یہ کہ یہ عمل اُس کی طرف سے ناپسندیدہ ہے بلکہ ملامت و ذمہ کے لائق ہے حالانکہ اصلی طور پر ضرورت یہ کہ اس نے کوئی عوام کام نہیں کیا ہے بلکہ ظاہراً ایک کار خیر میں مدد بھی کی ہے۔

یہ وہی بات ہے کہ جیسے ہم یوں کہتے ہیں :

حسنات الابرار سیئات المقربین

نیک لوگوں کی اچھائیاں مقربین کے لیے گناہ ہیں۔

نیز یہ وہی چیز ہے کہ جو ترک اولیٰ کے عنوان سے مشہور ہوئی ہے اور ہم اسے گناہ نسبتی سے یاد کرتے ہیں کہ جو نہ تو گناہ ہے اور نہ ہی مقام عصمت کے خلاف ہے۔

اسلامی احادیث میں بھی کبھی کبھی مستحبات کی مخالفت پر معصیت کا اطلاق ہوا ہے۔ ایک حدیث میں امام باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ نے روزانہ کی نافلہ نمازوں کے بارے میں فرمایا :

”یہ سب مستحب ہیں واجب نہیں ہیں۔۔۔ اور جو شخص ان کو ترک کرے اُس نے معصیت کی کیونکہ مستحب ہے کہ جب انسان کسی نیک کام کو انجام دیتا ہے تو اس کام کو جاری رکھنا چاہیے۔“

اس موضوع اور حضرت آدم سے مربوط دوسرے مسائل اور ان کے جنت سے باہر نکلنے کے بارے میں چوتھی جلد سورہ اعراف کی آیہ ۱۹ سے بعد اور جلد اول سورہ لقوٰہ کی آیہ ۳۰ تا ۳۸ کے ذیل میں بحث کر چکے ہیں، یہاں تکرار کی ضرورت نہیں ہے۔

۱۲۳۔ قَالَ اهْبِطْ مِنْهَا جَمِيعًا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ فَاِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ

مِّنِّي هُدًى مِّنْ اَشْعٍ مُّدًى فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى ۝

۱۲۴۔ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ اَعْمٰى ۝

۱۲۵۔ قَالَ رَبِّ لَوْ خَشَرْتَنِيْ اَعْمٰى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا ۝

۱۱۲۔ قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اِيْتَانِ فَتَنٰيْهَا ۚ وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْصٰى ۝

۱۱۳۔ وَكَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ اَسْرَفَ وَلَمْ يُؤْمِنْ بِاٰيٰتِ رَبِّهِ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَاَلْبٰى ۝

ترجمہ

۱۱۲۔ (خدا نے) فرمایا : تم دونوں (اور اسی طرح شیطان) اس (باغ) سے نیچے اُترو۔ اس حالت میں کہ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو لیکن جس وقت میری ہدایت تمہارے پاس آئے تو جو شخص میری ہدایت کی پیروی کرے گا نہ تو وہ گمراہ ہوگا اور نہ ہی رنج و تکلیف میں مبتلا ہوگا۔

۱۱۳۔ اور جو شخص میری یاد سے روگردانی کرے گا، وہ تنگ زندگی گزارے گا اور قیامت کے دن ہم اُسے نابینا محسوس کریں گے۔

۱۱۴۔ وہ کہے گا : پروردگارا ! تو نے مجھے نابینا کیوں محسوس کیا؟ میں تو بینا تھا۔ (خدا) فرمائے گا : یہ اس بنا پر ہے کہ میری آیات تیرے پاس پہنچیں اور تو نے انہیں بھلا دیا۔ اسی طرح آج تجھے بھی بھلا دیا جائے گا۔

۱۱۵۔ اور جو شخص اسراف کرے گا اور اپنے پروردگار کی آیات پر ایمان نہیں لائے گا، ہم اُسے اسی قسم کی جزا دیں گے اور آخرت کا عذاب زیادہ شدید اور زیادہ پائیدار ہے۔

تفسیر

تنگ زندگی :

آدم کی توبہ اگرچہ قبول ہو گئی تھی مگر انہوں نے ایسا کام کیا تھا کہ اب پہلی جیسی حالت کی طرف لوٹنا ممکن نہیں تھا، لہذا خدا نے ”انہیں اور حوا کو حکم دیا کہ تم دونوں، اور اسی طرح شیطان بھی تمہارے ساتھ، جنت سے زمین پر اتر جاؤ (قال اهبطا منها جميعاً)۔“

”در آنحالیکہ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے“ (بعضکم لبعض عدو)۔

لیکن میں تمہیں خبردار کرتا ہوں کہ راہ سعادت اور نجات تمہارے سامنے کھلی ہوئی ہے۔ پس جس وقت میری ہدایت تمہارے پاس آئے تو تم میں سے جو کوئی اس ہدایت کی پیروی کرے گا وہ نہ تو گمراہ ہوگا اور نہ ہی بد نجات (فاما یا تینکم منه دى)۔

فمن اتبع هدای فلا یضل ولا یشتیٰ۔

اور اس غرض سے کہ جو لوگ حق تعالیٰ کے فرمان کو بھلا دیتے ہیں، ان کی پریشانی کا نتیجہ بھی واضح ہو جائے، مزید فرمایا گیا ہے اور جو شخص میری یاد سے رُکروانی کرے گا وہ تنگ اور سخت زندگی بسر کرے گا: (ومن اعرض عن ذکرہ فان لہ عیشۃ ضنکاً)۔

”اور قیامت کے دن ہم اُسے نابینا بنادیں گے“ (ونعشرک ۱ یوم القیامۃ اعیٰ)۔

وہاں وہ یہ عرض کرے گا کہ پروردگار! تو نے مجھے نابینا کیوں مشور کیا ہے جب کہ پہلے تو میں بینا تھا“ (قال رب لعلو حشرتینی اعیٰ وقد کنت بصیراً)۔

خدا کی طرف سے اُسے فرمایا یہ جواب دیا جائے گا: یہ اس بنا پر ہے کہ ہماری آیات تیرے پاس آئی تھیں، تو نے انہیں فراموش کر دیا اور انہیں ٹوٹا نظر نہ کیا۔ لہذا آج کے دن تو بھی فراموش کر دیا جائے گا۔ (قال كذلك اتل لئلا تفتیتہا وكذلك الیم غفلت)۔ اور تیری آنکھیں پر پردہ لگا کر کیوں نہیں اور اُس کے مقامِ قرب کو نہ دیکھ پائیں گی۔

اور آخر میں مجموعی نتیجہ نکالتے ہوئے آخری زیر بحث آیت میں فرمایا گیا ہے: اور جو لوگ اسراف کریں گے اور اپنے پروردگار کی آیات پر ایمان نہیں لائیں گے، ہم انہیں اسی قسم کی جزا دیں گے: (و كذلك نجزي من اسرف و لم یؤمن بآیات ربہ)۔

”اور آخرت کا عذاب اس سے بھی زیادہ شدید اور زیادہ پائیدار ہے۔“
(ولعذاب الآخرة اشد و ابقی)۔

چند اہم نکات:

۱۔ یادِ خدا سے غفلت اور اس کے نتائج: کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ انسان کے سامنے زندگی کے تمام دروازے بند ہو جاتے ہیں اور وہ جس کام میں ہاتھ ڈالتا ہے اُسے بند دروازوں کا سامنا ہوتا ہے اور کبھی اس کے باطل برکت وہ جہر بھی جاتا ہے ہر طرف اپنے لیے دروازوں کو کھلا ہوا پاتا ہے۔ ہر کام کے لیے حالات سازگار ہوتے ہیں اور کوئی بندش اور کسی قسم کی گروہ اس کے سامنے نہیں ہوتی یا اس حالت کو وسعتِ زندگی کہتے ہیں جب کہ پہلی حالت کو ”ضیق“ اور زندگی کی تنگی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ”معیشتِ تنگ“ کی تعبیر جو اوپر والی آیت میں آئی ہے، اُس سے بھی مراد ہے۔

کبھی معیشت کی تنگی اس بنا پر نہیں ہوتی کہ اس کی آمدنی کم ہے، بسا اوقات اس کی آمدنی میں ریل پیل ہوتی ہے لیکن نچلے ”حنک“ سختی اور تنگی کے معنی میں ہے، یہ لفظ ہمیشہ مفرد کی صورت میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کا شنیہ، جمع اور مؤنث نہیں ہے۔

روس اور لالچِ زندگی کو اس پر تنگ کر دیتے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ ایسا شخص اس بات پر مائل نہیں ہوتا کہ اس کے گھر کا دروازہ کھلا دے دوسرے اس کی زندگی سے فائدہ اٹھائیں، بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے لیے بھی اسے کھلا نہیں رکھنا چاہتا۔

علی علیہ السلام کے ارشاد کے مطابق:

”وہ اپنی زندگی تو فقیروں کی طرح سے بسر کرتا ہے لیکن اُس کا حساب سرمایہ داروں کا سا ہو گا۔“

واقعاً انسان ان تنگیوں اور سختیوں میں کیوں گرفتار ہو جاتا ہے۔ قرآن کتا ہے کہ اس کا اصلی عامل یادِ خدا سے رُکروانی ہے۔ یادِ خدا رُوح کے لیے آرام و سکون اور تقویٰ و شہامت کا باعث ہے اور اس کو بھلا دینا اضطراب، خوف اور پریشانی کا سبب ہے۔

جس وقت انسان خدا کو بھلا دینے کی وجہ سے اپنی ذمہ داریوں کو بھلا دے تو وہ شہوات، خواہشات، حرص اور طمع میں غرق ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے حشر میں تنگ زندگی ہی ہوگی۔ نہ اس میں کچھ قناعت ہوگی کہ جو اس کی رُوح کی تسکین کا موجب نہ اُس کی معنویت کی طرف توجہ ہوگی کہ جو اُسے روحانی غنا اور توکل کی عطا کر دے اور نہ ہی اس کا وہ اخلاق ہوگا کہ جو اُسے طغیانِ شہوات کا مقابلہ کرنے کے قابل بنائے۔

اسلام زندگی کی یہ تنگی زیادہ تر معنویات کی کمی اور روحانی استغناء کے نہ ہونے کی وجہ سے ہوتی ہے۔ مستقبل کے بارے میں مطمئن نہ ہونا، موجودہ امکانات و وسائل کے نابود ہو جانے کا خوف اور مادی دنیا کے ساتھ انتہائی وابستگی بھی اس کا سبب بنتی ہے اور وہ شخص کہ جو خدا پر ایمان رکھتا ہے اور اُس نے اس کی پاک ذات کے ساتھ دل لگایا ہے، وہ ان تمام پریشانیوں سے امان میں ہوتا ہے۔

البتہ یہاں تک تو بات ایک فرد سے متعلق تھی لیکن جب ہم ایسے معاشرے میں جائیں کہ جو یادِ خدا سے منہ پھیرے ہوئے ہو تو پھر سب اس سے بھی زیادہ دھشتِ ناک ہو جائے گا۔ وہ معاشرے کہ جو تعجب خیز اور حیرت انگیز صنعتی ترقی کے باوجود اور زندگی کے تمام وسائل فراہم ہونے کے باوجود شدید اضطراب اور پریشانی کی حالت میں زندگی بسر کرتے ہیں، وہ عجیب و غریب تنگی اور سختی میں گرفتار ہیں اور وہ اپنے آپ کو محسوس اور قیدی سمجھتے ہیں۔

سب ایک دوسرے سے ڈرتے ہیں۔ کوئی شخص کسی دوسرے پر اعتماد نہیں کرتا۔ تمام روابط اور تعلقات ذاتی منافات کے گھر پر گردش کرتے ہیں۔ جس کے خوفِ اسلامی کا بھاری بھونکا ہوا ہے زیادہ تر اقتصادی وسائل کو گلے لگتا ہے اور ان کی کس اس بھاری بھونک کے نیچے ختم ہو گئی ہیں۔ قیظانے جموں سے جبرے پڑے ہیں ان کے اپنے سرکاری علاؤ و شمار کے مطابق ہر گھریلو ہر شے کی نقل و حرکت پر حکومت کا انتظام ہوتا ہے۔ نشادِ خیر و نافرمانی نے انہیں اپنا غلام اور قیدی بنا رکھا ہے۔ ان کے گھروں کے ماحول میں نہ نورِ محبت ہے اور نہ ہی نشاطِ بخش پیار کا رشتہ۔

ہاں! یہ ہے ان کی سخت زندگی اور ”معیشتِ تنگ“

امریکہ (شیطانِ اعظم) کے ایک سابق صدر نے اپنی پہلی صدارتی تقریر میں اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہم اپنے گروہ گرد ایسی زندگیاں دیکھ رہے ہیں کہ جو اندر سے خالی ہیں۔ ہم خود کو خوش

رکھنے کی آرزو رکھتے ہیں، لیکن ہم ہرگز خوش نہیں ہوتے۔
انہی کے ایک اور مشہور آدمی نے کہ جس کا مقصود تھا معاشرے میں۔ سب کے لیے خوشی پیدا کی جائے، یہ کہا ہے کہ:

میں تو یہ دیکھ رہا ہوں کہ انسانیت ایک تاریک کپڑے میں دوڑ رہی ہے کہ جس کے آخر میں سوائے مطلق پریشانی کے اور کچھ نہیں ہے۔

یہ بات بھی خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ اسلامی روایات میں یہ بیان ہوا ہے کہ امام صادق علیہ السلام سے لوگوں نے پوچھا کہ آیا "من اعرض عن ذکرہ فان لم یعدشہ حنظلہ" سے کیا مراد ہے؟ تو آپ نے فرمایا:

اس سے مراد ولایت امیر المومنین علیہ السلام سے اعراض کرنا ہے۔
ہاں علی علیہ السلام وہ عظیم انسان تھے کہ جن کی نظر میں تمام دنیا درخت کے ایک پتے سے بھی کم قیمت ہے جو شخص ان کی زندگی کو اپنے لیے نمونہ عمل قرار دے اور اس طرح سے خدا کے ساتھ دل لگائے کہ سارا جہان اس کی نظر میں حقیر ہو جائے وہ کوئی بھی ہو اس کی زندگی کشادہ اور وسیع ہوگی۔ لیکن جو لوگ ان نمونوں کو بھلا دیں وہ بہر حال تنگی حیات میں گرفتار ہوں گے۔
بہت سی روایات میں زیر بحث آیت میں حق تعالیٰ کی یاد سے اعراض۔ ان لوگوں کے لیے کہ جو حج کرنے پر قادر ہیں۔ "ترک حج سے تفسیر ہوا ہے، اور یہ اس بنا پر ہے کہ حج کے بلا کر رکھ دینے والے ملازم، انسان کے خدا کے ساتھ نئے روابط اور تعلق پیدا کر دیتے ہیں اور یہی ارتباط اور تعلق اس کی زندگی کی راہوں کو کھولنے والا ہے۔ جب کہ اس کے برعکس مادیات سے زیادہ سے زیادہ ولایت تنگی حیات کا سرچشمہ ہے۔

۲۔ اندرونی اور بیرونی نایمانی: ان لوگوں کے لیے کہ جو خدا کی یاد سے روگردانی کرتے ہیں، زیر بحث آیات میں دوسرا میں معین کی گئی ہیں۔ ایک اس جہان کی تنگی حیات کہ جس کی طرف گزشتہ بحث میں اشارہ ہوا ہے اور دوسری دوسرے جہان میں نایمانی اور اندھا پن۔

ہم نے بار بار بیان کیا ہے کہ عالم آخرت عالم دنیا کی ایک پسلی ہوئی اور وسیع مجسم صورت ہے اور اس دنیا کے تمام حقائق وہاں پر ایک متناسب شکل و صورت میں اُبھرم ہو جاتے ہیں۔ وہ لوگ کہ جن کی روحانی آنکھیں (چشم بصیرت) اس عالم میں حقائق کو دیکھنے سے نایمان ہیں اس جہان میں ان کے جسم کی آنکھیں بھی نایمان ہو جائیں گی۔ لہذا جس وقت وہ یہ کہیں گے کہ ہم تو پہلے مینا تھے۔ اب نایمانیاں مشہور ہوتی ہیں تو انہیں یہ جواب ملے گا کہ یہ اس بنا پر ہے کہ تم نے خدا کی آیات کو بھلا دیا تھا (اور یہ حالت اس حالت کا عکس العمل ہے)۔
یہاں پر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ قرآن کی بعض آیات کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ قیامت میں تمام لوگ "مینا" ہوں گے اور ان سے یہ کہا جائے گا کہ اپنا نام عمل پڑھو۔

اقرا کتابک - - - (اسراء ۱۲)

۱۔ مملکت ہجرت، مدہ و مدہ

۲۔ نورالمتعلین، جلد ۲، مدہ

یا یہ کہ گنہگار جہنم کی آگ کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے:

ورای المجرمون النار۔۔۔ (کہنہ ۵۲)

یہ تعبیرات کچھ لوگوں کے نایمان ہونے کے ساتھ کس طرح مطابقت رکھتی ہیں۔
بعض بزرگ مفسرین نے تو یہ کہا ہے کہ اس جہان کی وضع و کیفیت اس جہان سے مختلف ہے۔ کتنے ہی ایسے افراد ہیں کہ جو بعض امور کو تو دیکھ سکتے ہیں اور بعض دوسرے امور کے لیے نایمان ہیں۔ مرحوم طبرسی نے بعض مفسرین سے نقل کیا ہے:

"انھو اعنی عن جہات الخیر لا یمتدی لشیئ منھا"

وہ ان چیزوں کے لیے کہ جو خیر و سعادت اور نعمت ہیں، نایمان ہوں گے اور ان چیزوں کے لیے کہ جو عذاب و شر اور حسرت و بد بختی کا سبب ہیں مینا ہوں گے۔

کیونکہ اس جہان کا نظام اس جہان کے نظام سے مختلف ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ وہ بعض منازل و موافقت میں تو نایمان ہوں گے اور بعض میں مینا ہو جائیں گے۔

ضمنی طور پر مجرمین کا دوسرے جہان میں فراموش کیا جانا یہ نہیں ہے کہ خدا انہیں بھول جائے گا بلکہ یہ بات واضح ہے کہ اس سے مراد ان کے ساتھ فراموشی والا معاملہ کرنا ہے۔ جیسا کہ ہماری روزمرہ کی زبان میں ہے کہ اگر کوئی شخص کسی دوسرے سے بے اعتنائی کرے تو وہ کہتا ہے کہ ہمیں کیوں بھلا دیا ہے؟

۳۔ گناہ میں اسراف: یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ زیر نظر آیات میں یہ دردناک سزائیں اور عذاب الیہ افراد کے لیے ذکر ہوئے ہیں کہ جو اسراف کرتے ہیں اور خدا کی آیات پر ایمان نہیں لاتے۔

یہاں "اسراف" کے ساتھ تعبیر ممکن ہے کہ اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ انہوں نے خدا کی دی ہوئی نعمتوں مثلاً آنکھ، کان اور عقل کو غلط راستوں پر ڈال دیا ہے اور اسراف اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ انسان نعمت کو فضول اور بیہودہ طور پر برباد کرے۔

اور یا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ گنہگاروں کے دگر وہ ہیں، ایک گروہ کے تو کچھ محدود گناہ ہیں اور ان کے دل میں خدا کا خوف بھی ہے یعنی انہوں نے اپنے پروردگار سے اپنا رابطہ بالکل منقطع نہیں کر لیا۔

اگر فرض کریں ایک شخص کوئی ظلم و ستم کرتا ہے مگر کسی یتیم و بے سہارا پر نہیں اور خود کو قصور وار بھی سمجھتا ہے اور بارگاہ خدا میں اپنے آپ کو رُوسیاہ جانتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس قسم کا آدمی بھی گنہگار ہے اور سزا کا مستحق ہے لیکن یہ ایسے شخص سے بہت مختلف ہے کہ جو بے حساب گناہ کرتا ہے، جو گناہ کے لیے کسی حد اور شرط کا قائل نہیں ہے اور بعض اوقات گناہ انجام دینے پر فخر کرتا ہے یا گناہ کو چھوٹا سمجھتا ہے کیونکہ پہلا گروہ ممکن ہے کہ آخر کار توبہ اور تلافی کے لیے تیار ہو جائے لیکن جو لوگ گناہ کرنے میں اسراف کرتے ہیں وہ اس بات پر آمادہ نہیں ہوتے۔

۴۔ "ہبوط" کیا ہے؟ "ہبوط" لغت میں قدر نیچے کی طرف آنے کے معنی میں ہے، مثلاً پتھر کا بلند سے

گزارا۔ جس وقت یہ لفظ انسان کے بارے میں استعمال ہو تو سزا کے طور پر تنزیل کی طرف راۓ درگاہ ہونے کے معنی دیتا ہے۔ اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ آدم زمین پر ہی زندگی بسر کرنے کے لیے پیدا ہوئے تھے اور وہ جنت میں اس جہاں کا سربراہ بن کر تعینات تھا لہذا آدم کا جھوٹا نزول یہاں نزول مقامی کے معنی میں ہے نہ کہ نزول مکانی کے معنی میں یعنی خدا نے ان کے مرتبہ و مقام کو ترک اولیٰ کی وجہ سے تنزیل کیا اور ان سب جتنی نعمتوں سے محروم کر دیا اور اس جہاں رنج و بلا میں گرفتار کر دیا۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ یہاں مخاطب کرنے کے لیے تشبیہ کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔ "اھبطوا" یعنی تم دونوں نیچے اتر جاؤ۔ ممکن ہے اس سے مراد آدم و حوا ہوں اور اگر بعض دوسری آیات میں "اھبطوا" جمع کی صورت میں ذکر ہوا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ شیطان بھی اس خطاب میں شریک تھا کیونکہ وہ بھی بہشت سے لاندہ گیا تھا۔ یہ احتمال بھی ہے کہ مخاطب آدم اور شیطان ہوں کیونکہ اس کے بعد کے جملے میں قرآن کہتا ہے: "بعضکم لبعض عدو" (تم میں سے بعض دوسرے بعض کے دشمن ہو گئے) بعض مفسرین نے یہ بھی کہہ ہے کہ "بعضکم لبعض عدو" سے مراد جو کہ جمع کی صورت میں خطاب ہے یہ ہے اور دوسری طرف سے شیطان اور اس کی ذریت کے درمیان عداوت پیدا ہو گئی یا ایک طرف سے آدم اور ان کی اولاد

لیکن ہر حال "اما یا ایہذا الکوہنی" (جس وقت میری ہدایت تمہارے پاس آئے) کے جملے میں حوا و اپنا حساب کتاب خدائی ہدایت سے پیدا کر لیا ہے۔ لہذا وہ اس خطاب میں شامل نہیں ہیں۔

۱۲۸۔ اَفَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ بَدَلًا قَبْلَهُمْ مِنَ الْقُرُونِ يَمْشُونَ فِي مَسْجِدِهِمْ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰى ۝
۱۲۹۔ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا وَّاجِلٌ مِّمَّا السُّنُسُ وَقَبْلَ غُرُوبِهَا ۚ وَمِنْ اٰنَايِ الْاَيْلِ فَسِيحٌ وَّاطْرَافُ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضٰى ۝

ترجمہ

۱۲۸۔ کیا ان کی ہدایت کے لیے یہ کافی نہیں ہے کہ ہم نے بہت سے گزشتہ لوگوں کو (کہ جنہوں نے سرکشی اور فساد کیا) ہلاک کر دیا اور یہ ان کے (دوران شدہ) مکانوں میں آتے جاتے ہیں۔ ان میں صاحبان عقل کے لیے واضح دلائل ہیں۔ اور اگر تیرے پر دروغار کی سخت و تعدیر اور مقررہ زمانے کا لحاظ نہ ہوتا تو عذاب الہی بہت جلد انہیں دامن گیر ہو جاتا۔

۱۲۹۔ اس بنا پر جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں اس پر صبر کرو اور طلوع آفتاب سے پہلے اور اس کے غروب ہونے سے پہلے اور اسی طرح اٹنا شب میں اور دن کے اطراف میں پر دروغار کی تسبیح اور حمد بجا لاؤ تاکہ تم خوش رہو۔

تفسیر

گزشتگان کی تاریخ سے عبرت حاصل کرو:

چونکہ شتہ آیات میں مجرمین کے بارے میں بہت بحث ہو چکی ہے۔ لہذا پہلی زیر بحث آیت میں بیداری کے ایک بہترین اور مؤثر ترین طریقے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور وہ ہے گزشتہ لوگوں کی تاریخ کا مطالعہ۔ ارشاد ہوتا ہے: کیا ان کی ہدایت کے لیے یہی بات کافی نہیں ہے کہ ہم نے بہت سی گزشتہ اقوام کو جو گزشتہ زمانوں میں زندگی بسر کرتی تھیں ہلاک کر دیا۔ (افلہو یهد لهم بادلًا قبلہم من القرون) وہی لوگ کہ جو خدا کے دردناک عذاب میں گرفتار ہوئے اور یہ ان کے دیران شدہ گھروں میں آتے جاتے ہیں۔ (یمشون فی مساجدہم)۔

یہ اپنی آمد و رفت کے راستے میں (مین کے سفر میں) قوم عاد کے گھروں سے (شام کے سفر میں) قوم ثمود کے مسکن سے اور (فلسطین کے سفر میں) قوم لوط کے زیر و زبر مکانوں سے گزرتے ہیں اور ان کے آثار دیکھتے ہیں لیکن درس عبرت نہیں لیتے۔ وہ دیرانیاں کہ جو اپنی زبان بے زبانی سے گزشتہ لوگوں کے دردناک قصے بیان کر رہی ہیں اور آج کے لوگوں کے لالچ والے لوگوں کو ان ہلاکت میں پڑنے والی تافان قوموں کی پیروی سے روکتی ہیں اور ان کو خبردار کر رہی ہیں۔ بیکار بیکار کر کہہ رہی ہیں اور ظلم و کفر و فساد کے انجام کو بیان کر رہی ہیں۔

ہاں! ان میں صاحبان عقل کے لیے واضح دلائل اور بے شمار نشانیاں موجود ہیں (ان فی ذلک لآیات لِّاُولٰٓئِی النُّهٰی)۔ جیسا کہ پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ "قرن" جمع ہے "قرن" کی جالیے لوگوں کے سنی میں ہے کہ جو ایک ہی زمانہ میں زندگی بسر کریں اور کبھی خود زمانہ کبھی قرن کہا جاتا ہے (مقارنۃ کے مادہ سے)۔

نہ "نہی" مادہ نہی سے بیان عقل کے سنی میں ہے کیونکہ عقل انسان کو برائیوں اور بدلوں سے منع کرتی ہے۔

گزشتہ لوگوں کی تاریخ سے عبرت حاصل کرنے کا موضوع ان مسائل میں سے ایک ہے جو قرآن اور اسلامی احادیث میں آیا ہے اور حق بات یہ ہے کہ یہ ایک بیدار کرنے والا معلم ہے۔ بہت سے ایسے لوگ ہیں کہ جو کسی بھی وعظ و نصیحت کی ہند و نصیحت حاصل نہیں کرتے لیکن گزشتہ لوگوں کے آثار و عبرت کے مناظر کا دیکھنا انہیں ہلا کر رکھ دیتا ہے اور اکثر پیغمبر اسلام سے ایک حدیث میں منقول ہے:

”اغفل الناس من لم يتعظ بتغییر الدنیا من حال الى حال“
لوگوں میں سے سب سے زیادہ غافل وہ شخص ہے کہ جو دنیا کے ایک حالت سے دوسری حالت میں بدلنے اور متغیر ہونے سے نصیحت حاصل نہیں کرتا اور رات اور دن کے بدلنے میں غور و فکر نہیں کرتا۔

بعد والی آیت درحقیقت ایک سوال کا جواب ہے کہ جو یہاں پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اُس پر گرام کو جو خدا نے گزشتہ زمانہ کے مجرمین کے لیے ترتیب دیا تھا، اس گروہ کے لیے کیوں ترتیب نہیں دیتا۔ قرآن کہتا ہے: اگر تیرے پروردگار کی سنت اور تقدیر اور مقرر زمانہ نہ ہوتا، تو عذاب الہی جلد ہی انہیں دامن گیر ہو جاتا: (ولو لا کلمۃ سبقت من ربک لکان لزاما واجل مسمیٰ)۔

سنت الہی کہ جسے قرآن میں متعدد مواقع پر کلمہ کہا گیا ہے، یہ انسانوں کی آزادی کے بارے میں حکم فطرت اور فرمانِ آفرینش کی طرف ایک اشارہ ہے۔ کیونکہ اگر ہر مجرم کو فوراً ہی اور بغیر کسی قسم کی مہلت دیے سزا دے دی جلتے، تو ایمان اور عمل صالح، توبہ یا اضطرابی اور اجباری پہلو اختیار کر لیں گے اور زیادہ تر خوف اور سزا کی وحشت سے فوری طور پر انجام پاجائیں گے۔ اس بنا پر وہ حصولِ کمال اور ارتقا کا ذریعہ نہ ہوگا۔ جو ان کا اصل مقصد ہے۔ نہ ہوں گے۔

علاوہ ازیں اگر تمام مجرموں کو فوراً سزا دیے جانے کا حکم ہو جلتے تو پھر کوئی بھی رُستے زمین پر زندہ نہ بچے گا:

ولو یدّ اخذ الله الناس بظلمهم ما ترک علیہا من داتقہ (غل ۱۱)

اس بنا پر ضروری ہے کہ کچھ مہلت ہو تاکہ گنہگار سوچ، بچار کر لیں اور اصلاح کی راہ اختیار کریں اور راہِ حق کے تمام راہبوں کو خود سازی کے لیے کچھ مہلت بھی دے دی جلتے۔

”اجل مسمیٰ“ کی تعبیر جیسا کہ قرآن کی کچھ آیات سے معلوم ہوتا ہے، انسان کی زندگی کے ختم ہونے کے حتیٰ اور یقینی وقت کی طرف اشارہ ہے۔

بہر حال بے ایمان سنگمروں اور جبارت کرنے والے مجرموں کو عذاب الہی کی تاخیر سے محروم نہیں ہونا چاہیے اور اس حقیقت

لہ سینۃ البحار (مادہ عبر) جلد ۲، ص ۱۴۶۔

لہ مزید وضاحت کے لیے تیسری جلد سورہ انعام کی آیہ ۲۰۱ کی تفسیر کی طرف رجوع کریں۔ ترکیب غمی کے لحاظ سے ”اجل مسمیٰ“ کلمہ، پر مہلت ہے۔

کہ بے پرواہی کے ساتھ نہیں دیکھنا چاہیے کیونکہ یہ لطفِ خدا، یہ سنت الہی اور قانونِ کمال و ارتقا ہے کہ جس نے میدانِ کو ان کے لیے کھلا رکھا ہوا ہے۔

اس کے بعد رُستے سخن پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے، اب جب کہ یہ بنا نہیں ہے کہ ان بدکاروں کو فوری طور پر سزا دی جائے، تو تم ان کی باتوں پر جودہ تمہیں کہتے ہیں ممبر سے کام لو: (فاصبر علی ما یقولون) پیغمبر اکرمؐ کو روزمانی طور پر تقویت پہنچانے اور ان کے دل کو تسلی دینے کے لیے انہیں خدا کے ساتھ راز و نیاز کی باتیں کرنے اور نماز و تسبیح کا حکم دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ”شورج نکلنے سے پہلے اور اس کے غروب ہونے سے پہلے اور اسی طرح رات کے درمیان اور دن کے اطراف میں اپنے پروردگار کی تسبیح اور حمد بجالاؤ تاکہ تم راضی اور خوشنود رہو اور تمہارا دل ان کی کدکھ پہنچانے والی باتوں سے پریشان نہ ہو۔“

(وسیلح بحمد ربک قبل طلوع الشمس وقبل غروبہا ومن اناء اللیل فسیح و اطراف النہار لعلک ترضی)۔

اس میں شک نہیں کہ مشرکین کی بدگوئیوں اور ناروا باتوں پر صبر کرتے ہوئے یہ حمد و تسبیح شرک و بت پرستی کے خلاف ایک مظاہر ہے۔

لیکن اس بارے میں کہ اس سے مراد مطلق حمد و تسبیح ہے یا یہ روزانہ کی مخصوص پنجگانہ نماز کی طرف اشارہ ہے بہترین کے درمیان اختلاف ہے۔ ایک گروہ کا نظریہ تو یہ ہے کہ ظاہر عبادت کو اس کے اسی وسیع معنی میں رہنے دیا جائے اور اس سے مطلق تسبیح و حمد کا استفادہ کرنا چاہیے جبکہ دوسرا گروہ اسے نماز پنجگانہ کی طرف اشارہ سمجھتا ہے، اس ترتیب سے کہ:

”قبل طلوع الشمس“ نماز صبح کی طرف اشارہ ہے۔

اور ”قبل غروبہا“ نماز عصر کی طرف اشارہ ہے (یا نماز ظہر و عصر کی طرف کہ جن کا وقت غروب تک باقی رہتا ہے)۔

”من اناء اللیل“ نماز مغرب و عشاء کی طرف اشارہ ہے (اور اسی طرح نماز شب کی طرف بھی)۔

لیکن ”اطراف النہار“ کی تعبیر نماز ظہر کی طرف اشارہ ہے کیونکہ ”اطراف“ ”طرف“ کی جمع ہے کہ جو جانب کے معنی میں ہے، اگر دن کو دو نصف حصوں میں تقسیم کریں، تو نماز ظہر دوسرے نصف کی ایک جانب یا طرف قرار پاتی ہے۔

بعض روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ”اطراف النہار“ سبھی نمازوں کی طرف اشارہ ہے کہ جنہیں انسان دن کے مختلف اوقات میں انجام دے سکتا ہے۔ کیونکہ ”اطراف النہار“ یہاں پر ”اناء اللیل“ کے مقابلہ میں ہے اور دن کے تمام اوقات کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے (خصوصاً اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ اطراف جمع کی شکل میں آیا ہے جب کہ دن میں دو سے زیادہ طرفیں نہیں ہوتیں، اس سے واضح ہوتا ہے کہ ”اطراف“ ایک وسیع معنی رکھتا ہے کہ جس میں دن کی مختلف ساعتیں شامل ہیں)۔

تیسرا احتمال بھی آیت کی تفسیر میں موجود ہے اور وہ یہ کہ یہ کچھ خاص اذکار کی طرف اشارہ ہے کہ جو اسلامی روایات میں ان مخصوص اوقات کے لیے وارد ہوئے ہیں مثلاً: اور پر والی آیت کی تفسیر میں، امام صادق علیہ السلام سے ایک حدیث منقول ہے کہ امام علیہ السلام نے فرمایا:

ہر مسلمان پر لازم ہے کہ طلوع آفتاب اور غروب آفتاب سے پہلے دس دس مرتبہ یہ ذکر پڑھے:

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ يُحْيِي وَيُمِيتُ

وہو حی لا یموت بیدہ الخیر وہو علی کل شیء قدير۔

لیکن ہر حال یہ تفسیریں ایک دوسرے کے متضاد نہیں ہیں، اور ممکن ہے کہ یہاں تسبیحات کی طرف بھی اشارہ ہو اور شب و روز کی واجب و مستحب نمازوں کی طرف بھی اشارہ ہو اور اس طرح سے وہ تضاد جو اس سلسلے میں روایات میں پایا جاتا ہے وہ باقی نہیں رہے گا کیونکہ بعض روایات میں مخصوص اذکار کے ساتھ اور بعض میں نماز کے ساتھ تفسیر کی گئی ہے۔

اس بحث کے ذکر بھی ضروری ہے کہ "لعلک ترضی" کا جملہ حقیقت میں پروردگار کی حمد و تسبیح نیز ان کی باتوں پر مسرت و شگیاں کا نتیجہ ہے کیونکہ یہ حمد و تسبیح اور شب و روز کی نمازیں انسان کے خدا کے ساتھ رشتہ اور تعلق کو اس طرح محکم کر دیتے ہیں کہ وہ اس کے علاوہ کسی چیز کی فکر اور خیال نہیں کرتا، سخت حادثات سے ہراساں نہیں ہوتا اور ایسی مضبوط پناہ گاہ کے ہوتے ہوئے شریک سے خوف نہیں کھاتا اور اس طرح سے آرام و سکون اور اطمینان اس کی روح پر چھا جاتے ہیں۔

اور "عل" "شاید" کی تفسیر ممکن ہے کہ اسی مطلب کی طرف اشارہ ہو کہ جو ہم پہلے بھی اس لفظ کی تفسیر میں بیان کر چکے ہیں اور وہ یہ ہے کہ "عل" عام طور پر ایسے حالات کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ جو نتیجہ حاصل کرنے کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ مثلاً، نماز اور ذکر خدا ایسی شرائط اور حالات ہیں اس قسم کے سکون و آرام کا سبب بنتا ہے کہ جو حضور قلب اور کامل آداب کے ساتھ انجام پانے چھٹا اگرچہ اس آیت میں مخاطب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں لیکن قرآن نشاندہی کرتے ہیں کہ یہ حکم عمومی پہلو رکھتا ہے۔

۱۳۱- وَلَا تَدْنِ عَيْنُكَ إِلَى مَا مَتَّعْنَاهُ أَزْوَاجًا مِنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا لِنَفِثْنَهُمْ فِيهِ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَابْقَى

۱۳۲- وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلَاةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا، لَا تَسْأَلْكَ رِزْقًا نَحْنُ نَرْزُقُكَ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوَى

۱۳۳- وَقَالُوا لَوْلَا يَأْتِينَا بِآيَةٍ مِنْ رَبِّهِ، أَوَلَمْ تَأْتِهِمْ بَيِّنَةٌ مَا فِي

الصَّحْفِ الْأُولَى

۱۳۴- وَلَوْ أَنَّا أَهْلَكْنَاهُمْ بُعْدَ ابْنِ مِنْ قَبْلِهِ لَقَالُوا رَبَّنَا لَوْلَا أَرْسَلْتَ إِلَيْنَا رَسُولًا فَنَتَّبِعَ آيَاتِكَ مِنْ قَبْلِ أَنْ نُنْزِلَ وَنَخْزِي

۱۳۵- قُلْ كُلُّ مُتَرَبِّصٍ فَتَرَبَّصُوا، فَسَتَعْلَمُونَ مَنْ أَصْحَابُ الصِّرَاطِ السَّوِيِّ وَمَنِ اهْتَدَى

ترجمہ

۱۳۱- وہ مادی نعمتیں جو ہم نے کفار کے مختلف گروہوں کو دے رکھی ہیں، تم ہرگز ان کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھنا۔ یہ دنیاوی زندگی کے شگوفے ہیں اور یہ اس لیے ہیں تاکہ ہم ان کے ذریعہ ان کی آزمائش کریں اور تیرے پروردگار کی روزی ہی بہتر اور زیادہ پائیدار ہے۔

۱۳۲- اور اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دو اور تم بھی اس کی انجام دہی پر پابند رہو۔ ہم تم سے روزی نہیں چاہتے بلکہ ہم ہی تمہیں روزی عطا کرتے ہیں اور اچھا انجام تو تقویٰ کے لیے ہے۔

۱۳۳- (اور انہوں نے یہ) کہا کہ پیغمبر ہمارے لیے اپنے پروردگار کا کوئی معجزہ یا نشانی لے کر کیوں نہیں آتا (تم ان سے یہ کہہ دو کہ) کیا گذشتہ قوموں کی واضح خبریں کہ جو گذشتہ آسمانی کتابوں میں تھیں، ان کے لیے نہیں آئیں۔

۱۳۴- اگر ہم انہیں اس (قرآن کے نزول) سے پہلے عذاب کے ذریعے ہلاک کر دیتے (تو وہ قیامت میں کہتے) پروردگار! تو نے ہمارے لیے کوئی پیغمبر نہیں بھیجا تاکہ ہم ذلیل و رسوا ہونے سے پہلے ہی تیری آیات کی پیروی کرتے

۱۳۵- تم کہہ دو (ہم اور تم) سب ہی انتظار میں ہیں (ہم تو تم پر کاسیانی اور فتح کے وعدہ کی انتظار میں ہیں اور تم ہم سے شکست کے انتظار میں ہو)۔ جب یہ بات ہے تو انتظار کرو لیکن تم جلدی ہی جان لو گے کہ صراطِ مستقیم پر کون ہے اور کون ہدایت یافتہ ہے۔

تفسیر

ان آیات میں پیغمبر اکرم کو کئی احکام دیئے گئے ہیں کہ جن سے حقیقت میں عام مسلمان مراد ہیں اور یہ اس بحث کی تکمیل ہے کہ جو مسرت و شگیاں کے سلسلہ میں گذشتہ آیات میں شروع ہوئی ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: وہ مادی نعمتیں جو ہم نے کفار و مخالفین کے مختلف گروہوں کو دے رکھی ہیں، تم ہرگز ان کی طرف آنکھ اٹھا کر

نہ دیکھنا۔ (ولا تمدن عينيك الى ما متعنا به ازواجنا منهم)۔

ہاں یہ ناپائیدار نعمتیں دنیاوی زندگی کے شگوفے ہیں (زهرة الحياة الدنيا)۔

ایسے شگوفے (اور پھل) کہ جو جلد ہی کھل جاتے ہیں اور (پھر) مڑ جھکا جاتے ہیں اور ٹکڑے ٹکڑے ہو کر زمین پر جاتے ہیں اور چند دنوں سے زیادہ پائیدار نہیں ہوتے۔

اس کے باوجود یہ سب اس لیے ہیں تاکہ ہم انہیں ان کے ذریعہ آزمائیں (لفتنہم و فیہ)۔

اور بہر حال جو کچھ تیرے پروردگار نے تجھے روزی دے رکھی ہے وہ زیادہ بہتر اور پائیدار ہے (و رزق ربك خیر من

خدائے تجھے انواع و اقسام کی نعمتیں عطا کی ہیں۔ ایمان و اسلام، قرآن و آیات الہی، حلال و پاکیزہ روزی، اور آخر میں آخرت

کی جاودال اور دائمی نعمتیں۔ یہ پائیدار اور جاودانی رزق ہے۔

بعد والی آیت میں پیغمبر اکرمؐ کی روح کو خوش کرنے اور ان کے دل کو تقویت پہنچانے کے لیے فرمایا گیا ہے: اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دو اور خود بھی اس کے انجام دینے کے لیے پابندی کرو (وأمر اهلك بالصلاة واصطبر عليها)۔

کیونکہ یہ نماز تیرے لیے اور تیرے خاندان کے لیے دل کی پاکیزگی اور صفائی اور روح کی تقویت اور یاد خدا کے دوام کا سبب ہے۔

اس میں شک نہیں کہ لفظ ”اهل“ کا ظاہر یہاں پیغمبر اکرمؐ کا بطور کلی خاندان ہے لیکن چونکہ یہ سورہ مکہ میں نازل ہوئی ہے، لہذا اُس وقت اہل کا مصداق ضحیرہ علیہ السلام ہی تھے اور ممکن ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کے کچھ اور نزدیکوں کے بارے میں بھی ہو، لیکن زمانے کے گزرنے کے ساتھ خاندان پیغمبرؐ کا دائرہ بھی وسیع ہو گیا۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے کہ اگر نماز کا حکم تجھے اور تیرے خاندان کو دیا گیا ہے تو اس کے فائدے اور برکات بھی صرف تمہارے ہی لیے ہوں گے ہم تجھ سے روزی نہیں چاہتے بلکہ ہم ہی تجھے روزی دیتے ہیں (لأنك لا تملك رزقا نحن نرزقك)۔

یہ نماز پروردگار کی عظمت میں کوئی اضافہ نہیں کرتی بلکہ تم انسانوں کے لیے سرمایہ تکامل و ارتقا اور تربیت کا اعلیٰ درجہ ہے۔

یاد دوسرے لفظوں میں خدا بلا دشا ہوں اور امرا کی طرح نہیں ہے کہ جو اپنی قوم اور رعایا سے باج و خراج لیا کرتے تھے اور اپنی اور اپنے مصاحبین کی زندگی کا نظام چلاتے تھے۔ خدا سب سے بے نیاز ہے اور سب اُسی کے نیازمند اور محتاج ہیں۔

در حقیقت یہ تعبیر اُسی چیز کے مشابہ ہے کہ جو سورہ فاریات کی آیہ ۵۶ تا ۵۸ میں بیان ہوئی ہے:

وما خلقت الجن والانس الا ليعبدون وما اريد منهم رزق وما

اريد ان يعطون ان الله هو الرزاق ذو القوة المتين۔

میں نے جن و انس کو نہیں پیدا کیا مگر اس لیے کہ وہ میری عبادت کریں، میں ان سے روزی کا طلب گار نہیں ہوں اور نہ ہی یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھانا کھلائیں۔ خدا ہی

سب کو روزی دینے والا ہے اور مستحکم قدرت کا مالک ہے۔

اور اس طرح سے عبادات کا نتیجہ اور فائدہ براہ راست عبادت کرنے والوں کو ہی پہنچ جاتا ہے اور آیت کے آخر میں مزید

ایک جگہ: عاقبت اور نیک انجام تو تقویٰ اور پرہیزگاری کے لیے ہی ہے (والعاقبة للمتقون)۔

جو چیز باقی رہنے والی ہے اور جس کا انجام مفید، تعمیری اور حیات بخش ہے، وہ تقویٰ اور پرہیزگاری ہی ہے۔ پرہیزگاری ہی

پرکار کا سیلاب ہوں گے اور غیر متقی لوگ خشک کھائیں گے۔

اس جملے کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ہے کہ اس کا مقصد عبادات میں روح تقویٰ اور اخلاص کے لیے تاکید کرنا ہو۔ کیونکہ عبادات

کی بنیاد یہی ہے۔ سورہ حج کی آیہ ۳۷ میں بیان ہوا ہے:

لن ينال الله لموها ولاد ما توها ولكن يناله التقوى منكم

قربانی کے جانوروں کے گوشت اور خون خدا کو نہیں پہنچتے بلکہ تمہارا تقویٰ اس تک پہنچتا ہے۔

تمہارے اعمال میں سے جو کچھ اُس کے مقام قرب میں جا پہنچتا ہے وہ ان کا چمڑا اور ظاہری وجود بھی نہیں ہے بلکہ وہ

اخلاص و روح اور سوچ کر جو اُس میں کار فرما ہے، وہی اس کے مقام قرب تک پہنچتا ہے۔

بعد والی آیت میں کفار کی ایک بہانہ جوئی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: انہوں نے کہا: پیغمبر! اپنے

پروردگار کے پاس سے ہماری من پسند کا کوئی معجزہ کیوں نہیں لاتا: (وقالوا لولا یا تسنا بآية من ربنا)۔

فورا ہی انہیں جواب دیا گیا ہے: کیا گزشتہ اقوام کی واضح خبریں کہ جو گزشتہ آسمانی کتابوں میں آئی تھیں، ان کے لیے نہیں آئیں

(کہ جو بے در پے سحرات پیش کرنے کے لیے تھانے اور عذر تراشیاں کرتے تھے اور معجزات دیکھنے کے بعد بھی اپنے کفر و انکار پر

باتی رہتے تھے اور خدا کا شدید عذاب انہیں آپکرتا تھا۔ کیا وہ یہ نہیں جانتے کہ اگر یہ بھی اُسی راہ پر چلیں گے تو ان کا انجام بھی وہی ہوگا)

(اولم تأتوا بسینة ما فی الصحف الاولی)۔

اس آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ہے کہ ”سینة“ سے مراد خود قرآن ہے کہ جو شتہ آسمانی کتابوں کے حقائق کو اعلیٰ ترین

معیار کے مطابق بیان کرنے والا ہے۔ زیر بحث آیت کہتی ہے: یہ معجزہ کیوں طلب کرتے ہیں اور بہانہ سازی کیوں کر رہے ہیں،

کیا یہی قرآن، ان عظیم امتیازات اور خصوصیات کے ساتھ کہ جو گزشتہ آسمانی کتابوں کے حقائق کو اپنے اندر سمونے ہوئے ہے،

ان کے لیے کافی نہیں ہے۔

اس آیت کی ایک اور تفسیر بھی بیان ہوئی ہے اور وہ یہ ہے کہ پیغمبر اسلامؐ نے باوجود اس کے کہ کسی سے درس نہیں پڑھا تھا

ایسی واضح، روشن اور آشکار کتاب لے کر آئے کہ آسمانی کتابوں کے متن میں جو کچھ تھا اُس کے ہم آہنگ ہے اور یہ بات خود اس

کے اعجاز کی ایک نشانی ہے۔ اس کے علاوہ رسول اللہؐ کی صفات اور ان کی کتاب، ان نشانوں کے ساتھ کہ جو پہلی آسمانی کتابوں میں

بیان ہوئی ہیں، کامل طور پر مطابقت رکھتی ہے اور یہ اس کی حقانیت کی دلیل ہے۔

بہر حال یہ بہانہ سازی کرنے والے، حق طلب لوگ نہیں ہیں بلکہ یہ ہمیشہ نئی سے نئی بہانہ تراشی میں لگے رہتے ہیں یہاں تک کہ

پہلی تفسیر ”جمع البسین“ میں اور دوسری تفسیر ”فضلال“ میں اور تیسری تفسیر ”رازی“ نے اپنی تفسیر کبیر میں بیان کی ہے۔ یہ تفسیر

اگرچہ مختلف ہیں، تاہم ان میں آپس میں کوئی تضاد نہیں ہے، خصوصاً دوسری اور تیسری تفسیر میں۔

”اگر ہم اس قرآن کے نزول اور پیغمبر اسلام کے آنے سے پہلے، انہیں سزا دے کر ہلاک کر دیتے، تو وہ یہ کہتے کہ پروردگار! اگر ہمارے لیے کوئی پیغمبر نہیں بھیجا، تاکہ ہم تیری آیات کی پیروی کرتے، اس سے پہلے کہ ہم ذلیل و رسوا ہو جائیں؟“ (ولوا اهلکنا هم بمذاب من قبلہ لقالوا رتنا لولا ارسلت الینا رسولا فنتبع آیاتک من قبل ان نزل وینزل لیکن اب جبکہ یہ عظیم پیغمبر ایسی با عظمت کتاب لے کر آئے کہ ان کے پاس آیا ہے تو ہر روز نئی سے نئی بات کہتے ہیں اور حق قرار کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی بہانہ تراشتے رہتے ہیں۔

انہیں خبردار کرو اور یہ کہہ دو کہ ہم اور تم سب کے سب انتظار کر رہے ہیں؟ (قل کل متولین)۔ ہم تو تمہارے پاسے میں عدائی وعدوں کے انتظار میں ہیں اور تم بھی اس انتظار میں ہو کہ مشکلات و مصائب تمہیں دامن گیر ہوں۔ اب جب کہ یہ بات ہے تو انتظار کرو“ (فتقرضوا)۔

”لیکن تم بہت جلد جان لو گے کہ راہ مستقیم اور دین حق پر کون لوگ ہیں اور حق کی منزل اور خدا کی جادواں نعمت کی طرف ہدایت پانے والے کون ہیں؟“ (فتعلمون من اصحاب الصراط السوی ومن اھتدی)۔

اور اس قاطع اور پر معنی جملے کے ساتھ قرآن برٹ دھرم اور بہانہ ساز منکرین سے اپنی گفتگو کو ختم کر دیتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ چونکہ یہ سورۃ مکہ میں نازل ہوئی تھی اور اُس زمانے میں پیغمبر اکرمؐ اور مسلمان دشمنوں کی طرف سے سخت دباؤ میں تھے، خدا اس سورہ کے آخر میں ان کی دھجی کرتا ہے، کہیں کہتا ہے کہ ان کا مال و دولت اس جلدی گزر جانے والی دنیا کا سرمایہ اور ان کی آزمائش اور امتحان کے لیے ہے، یہ تمہاری آنکھوں کو ابھنی طرف متوجہ نہ کرے۔

اور کبھی نماز اور صبر و استقامت کا حکم دیا گیا ہے تاکہ ان کی معنوی قوت کو دشمنوں کی کثرت کے مقابلے میں تقویت دے۔ اور آخر میں مسلمانوں کو بشارت دی گئی ہے کہ اگر یہ گروہ ایمان نہ لائیں گے تو ان کا انجام بہت تاریک ہو گا کہ جس کے انتقام میں انہیں رہنا چاہیے۔

پروردگار! ہمیں ہدایت یافتہ اور صراط مستقیم پر چلنے والوں میں سے قرار دے۔

خداوند! ہمیں وہ قدرت اور رعب عطا فرما کہ (جس سے) نہ تو ہم دشمنوں کی کثرت سے ڈریں اور نہ ہی سخت حوادث اور مشکلات سے ہراساں ہوں۔ ہٹ دھرمی اور بہانہ بازی کو ہم سے دُور رکھ اور ہمیں حق قبول کرنے کی توفیق مرحمت فرما۔

سورہ طہ کا اختتام

جمرات ۲۰، جمادی الثانی (روزِ ولادت

باسعادت بانوئے اسلام فاطمہ زہرا

سلام اللہ علیہا۔)

سال ۱۲۰۰ھ قمری

سورة انبیاء

مکہ میں نازل ہوئی



اس کی ۱۱۲ آیات ہیں



اس سورہ کے مضامین

- ۱۔ یہ سورہ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، انبیاء کی سورت ہے کیونکہ اس میں سولہ انبیاء کے نام آئے ہیں بعض کے خاص خاص حالات زندگی بیان کیے گئے ہیں اور بعض کا صرف ذکر ہے۔ اور وہ ہیں: موسیٰ، ہارون، ابراہیم، نوح، یعقوب، نوح، داؤد، سلیمان، ایوب، اسمعیل، ادریس، ذوالکفل، ذالنون (یونس) زکریا اور یحییٰ علیہم السلام۔ اس بنا پر اس سورہ کے اہم مباحث انبیاء کے پروگراموں کے بارے میں ہیں۔ علاوہ ازیں کچھ ایسے انبیاء بھی ہیں جن کے نام اس سورہ میں صراحت کے ساتھ نہیں لیے گئے لیکن ان کے بارے میں کچھ باتیں بیان ہوئی ہیں مثلاً پیغمبر اسلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام۔
- ۲۔ اس کے علاوہ کئی سورتوں کی خصوصیت ہے کہ وہ عقائد دینی خصوصاً مبادی و معاد کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں۔ اس سورہ میں بھی بات پوری طرح موجود ہے۔
- ۳۔ اس سورہ میں خالق کی وحدت اور یہ کہ اس کے سوا اور کوئی معبود اور پیدا کرنے والا نہیں ہے نیز عالم کی پیدائش، مقصد اور پروگرام کے مطابق ہونے اور اس جہان پر حاکم قوانین کی وحدت اور اسی طرح حیات و ہستی کے سرچشمہ کی وحدت نیز موجودات کی فنا اور موت کے پروگرام میں وحدت کے بارے میں بحث ہوئی ہے۔
- ۴۔ اس سورہ کے ایک حصہ میں حق کی باطل پر، توحید کی شرک پر، عدل و انصاف کے لشکر کی جنوز اہلیس پر کامیابی و کامرانی کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔
- ۵۔ یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ یہ سورہ غافل اور بے خبر لوگوں کو سختی کے ساتھ تنبیہ کرتے ہوئے حساب و کتاب سے شروع ہوتا ہے اور اس کے اختتام میں بھی اسی سلسلہ کی دوسری تنبیہیں ہیں۔
- وہ انبیاء جن کے نام اس سورہ میں آئے ہیں ان میں سے بعض کی زندگی کا بیان اور ان کے تفصیلی پروگرام دوسری سورتوں میں ذکر ہوئے ہیں لیکن اس سورہ میں زیادہ تر انبیاء کے حالات اس حصہ کا ذکر ہے کہ وہ جس وقت سخت قسم کی تنگی میں گرفتار ہوتے تھے تو وہ حق تعالیٰ کے واسطے لطف کی طرف کس طرح سے دست توسل پھیلاتے تھے اور کس طرح سے خدا ان کے لیے بند دروازے کھول دیتا تھا اور طوفان و گرداب سے انہیں نجات بخشتا تھا۔
- ابراہیم جب نرود کی آگ میں گرفتار ہوئے۔
- یونس جب مچھلی کے پیٹ میں چلے گئے۔
- زکریا نے جب اپنی عمر کے آفتاب کو غروب ہونے کے قریب دیکھا لیکن ان کا کوئی جانشین نہیں تھا کہ جو ان کے پروگرام کی تکمیل کرے۔
- اور اسی طرح باقی انبیاء جب وہ سخت مشکلات میں گھرے۔

سورۃ انبیاء کی فضیلت

پیغمبر اسلام سے اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت کے بارے میں منقول ہے :

من قرء سورة الانبياء احسبه الله حساباً يسيراً، وصافحه وسلم عليه كل نبي ذكر اسمه في القرآن۔

جو شخص سورۃ انبیاء کو پڑھے گا، خدا اس کے حساب کو آسان کر دے گا۔ (روز قیامت اس کے اعمال کا حساب لینے میں سخت گیری نہیں کرے گا) اور ہر وہ پیغمبر جس کا نام قرآن میں ذکر ہوا ہے وہ اس سے مصافحہ کرے گا اور اسے سلام کرے گا۔

اور امام صادق علیہ السلام سے یہ منقول ہے :

من قرء سورة الانبياء حبالها كان كمن رافق النبيين اجمعين في جنات النعيم، وكان معيياً في اعين الناس حياة الدنيا۔

جو شخص سورۃ انبیاء کو عشق و محبت کے ساتھ پڑھے گا وہ جنت کے پُر نعمت باغوں میں تمام انبیاء کا رفیق اور ہم نشین ہوگا اور دنیا کی زندگی میں بھی لوگوں کی نگاہ میں باوقار ہوگا۔

لفظ "حبالها" (اس سورہ سے عشق و محبت رکھتے ہوئے) درحقیقت ان روایات کے معنی کے سمجھنے کے لیے ایک کلید ہے کہ جو قرآن کی سورتوں کی فضیلتوں کے سلسلے میں ہم تک پہنچی ہیں یعنی صرف الفاظ کا پڑھ لینا ہی مقصد نہیں ہے۔ بلکہ اس کے معانی و مطالب سے محبت کرنا ہے اور یہ بات مسلم ہے کہ معنی و مفہوم سے محبت عمل کے بغیر کوئی معنی نہیں رکھتی، اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ میں فلاں سورہ کا عاشق ہوں اور اس کا عمل اس کے منافی ہے خلاف ہو تو وہ جھوٹ بولتا ہے۔

ہم نے بار بار کہا ہے کہ قرآن کتاب عقیدہ و عمل ہے اور اس کا پڑھنا مقدم اور تمہید ہے سمجھنے کے لیے اور سمجھنا مقدم ہے ایمان و عمل کے لیے۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

- ۱- اقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ مُّعْرِضُونَ ۝
- ۲- مَا يَأْتِيهِمْ مِنْ ذِكْرٍ مِنْ رَبِّهِمْ مُحَدَّثٍ إِلَّا اسْتَمَعُوهُ وَهُمْ يَلْعَبُونَ ۝
- ۳- لَا هِيَ قُلُوبُهُمْ وَأَسْرُوا الْعَبَايُ الَّذِينَ ظَلَمُوا هَلْ هَذَا إِلَّا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ أَفَتَأْتُونَ السَّحَرَاءَ وَانْتُمْ تُبْصِرُونَ ۝
- ۴- قُلْ رَبِّي يَعْلَمُ الْقَوْلَ فِي السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝
- ۵- بَلْ قَالُوا أَضْغَاثُ أَحْلَامٍ بَلْ افْتَرَاهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ فَلْيَأْتِنَا بِآيَةٍ كَمَا أُرْسِلَ الْأَوَّلُونَ ۝

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

- ۱- لوگوں کا حساب کتاب ان کے نزدیک آچکا ہے لیکن وہ غفلت میں منہ پھیرے ہوئے ہیں۔
- ۲- جو کوئی بھی نئی نصیحت ان کے پروردگار کی طرف سے ان کے پاس آئی ہے وہ اسے کھیل سمجھتے ہیں اور مذاق اڑانے کے انداز میں اسے سنتے ہیں۔
- ۳- (حالت یہ ہے کہ) ان کے دل کھیل اور بے خبری میں پڑے ہوئے ہیں اور یہ ظالم چپکے چپکے سرگوشیاں کرتے ہیں۔ (اور کہتے ہیں) کیا اس کے سوا کچھ اور بات ہے کہ یہ تم ہی جیسا ایک بشر ہے؟ کیا تم دیکھتے جھلکتے جادو کے پاس جاتے ہو؟
- ۴- (لیکن پیغمبر نے) کہا: میرا پروردگار آسمان اور زمین کی ہر بات جانتا ہے اور وہ (بڑا) سننے والا اور جاننے والا ہے۔
- ۵- انہوں نے کہا (جو کچھ محمدؐ لایا ہے یہ وحی نہیں ہے بلکہ یہ پریشان خواب و خیال ہیں بلکہ اُس نے دل سے جھوٹ محفل کے خدا کی طرف منسوب کر دیا ہے۔) بلکہ وہ ایک شاعر ہے۔ (اگر وہ سچا ہے) تو ہمارے لیے ایسا ہی ایک مجرم ملے

جیسے مجھے پہلے انبیاء کو دے کر بھیجا گیا تھا۔

تفسیر

طرح طرح کے بہانے:

یہ سورہ - جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا ہے - تمام لوگوں کے لیے ایک سخت تنبیہ کے ساتھ شروع ہوتی ہے ایک ہلاکت والی اور بیدار کن تنبیہ - فرمایا گیا ہے: لوگوں کا حساب ان کے قریب آپہنچا ہے، حالانکہ وہ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں اور منہ پھیرے ہوئے ہیں (اقترَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ مُّعْرِضُونَ)۔

ان کا عمل اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ اس غفلت اور بے خبری نے ان کے سارے وجود کو اپنی گرفت میں لیا ہوا ہے۔ وہ یہ بات کیسے ممکن ہو سکتی ہے کہ انسان حساب کے نزدیک ہونے پر ایمان رکھتا ہو - وہ بھی انتہائی دقیق حساب - اور پھر وہ تمام مسائل کو معمولی سمجھے اور ہر قسم کے گناہ میں آلودہ ہو۔

لفظ "اقترَبَ" میں "قرب" کی نسبت کہیں زیادہ تاکید پائی جاتی ہے اور اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ حساب بہت ہی نزدیک آگیا ہے۔

• "ناس" کی تعبیر اگرچہ ظاہری طور پر عام لوگوں کے لیے آئی ہے اور اس بات کی دلیل ہے کہ سب کے سب غفلت میں ہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ ہمیشہ جب بھی عمومی بات ہوگی تو اس میں اشتباہ بھی ہوگا۔ اور یہاں ایسے بیدار دل لوگوں کو کہ جو ہمیشہ حساب کی فکر میں رہتے ہیں اور اس کے لیے آمادہ و تیار ہوتے ہیں، اس حکم سے مستثنیٰ سمجھنا چاہیے۔

یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ حساب لوگوں کے نزدیک ہو رہا ہے، نہ کہ لوگ حساب کے۔ گویا حساب تیزی کے ساتھ لوگوں کی طرف دوڑ رہا ہے۔

ضمنی طور پر "غفلت" اور "اعراض" کے درمیان فرق، ممکن ہے اس لحاظ سے ہو کہ وہ حساب کے نزدیک ہونے سے غافل ہیں اور یہ غفلت اس بات کا سبب بنتی ہے، کہ وہ حق کی آیات سے زور گردانی کریں۔ درحقیقت "حساب سے غفلت" علت ہے اور "آیات حق سے اعراض" اس کا معلول ہے یا اس عظیم عدالت میں جواب دینے کے لیے آمادگی سے اور خود حساب سے اعراض رہا ہے یعنی چونکہ غافل ہیں لہذا اپنے آپ کو حساب کے لیے آمادہ نہیں کرتے اور زور گردانی کرتے ہیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حساب کا نزدیک ہونا اور قیامت کس معنی میں ہے؟

بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد ہے کہ باقی ماندہ دنیا گزشتہ کے مقابلہ میں کم ہے۔ تو اس بنا پر قیامت نزدیک ہوگی یعنی گزشتہ کی نسبت نزدیک خاص طور پر جبکہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ منقول ہو رہا ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

بعثت انا والساعة کھا تین

...سے لے کر ہوئی ہیں۔

بعض دوسروں نے کہا ہے کہ یہ تعبیر قیامت کے (حقیقی طور پر واقع) ہونے کی بنا پر ہے۔ جیسا کہ عربوں کی مشہور ضرب میں کہا جاتا ہے کہ :

کل ما هو ات قریب

جو چیز قطعی و یقینی طور پر آکر رہے گی، وہ قریب ہے۔

اس کے باوجود یہ دونوں تفسیریں آپس میں ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں۔ لہذا ممکن ہے دونوں نکات کی طرف اشارہ بعض مفسرین مثلاً قرطبی نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ یہاں "حساب" قیامت صغریٰ یعنی موت کی طرف اشارہ ہے کیونکہ موت کے وقت بھی کچھ نہ کچھ محاسب ہوتا ہے اور انسان کو اس کے اعمال کا کچھ بدلہ دیا جاتا ہے۔ لیکن زیر بحث آیت ظاہراً قیامت کبریٰ کی طرف راجع نظر آتی ہے۔

بعد والی آیت ان کے اعراض اور رد و گرائوں کی ایک نشانی کو اس صورت میں بیان کرتی ہے : اُن کے رب کی جو بھی کوئی نئی نصیحت اور یاد دہانی ان کے پاس آتی ہے، وہ اُسے کھیل اور مذاق کے ٹھوٹے میں سننے لگتے ہیں : (ما یأتیہم من ذکر من ربهم محذات الا استمعوه وھو یلعیون)۔

کبھی ایسا نہیں ہوا کہ وہ کسی سورہ یا آیت اور پھر دو گار کی طرف سے کسی بھی بیدار کرنے والی بات پر سنجیدگی سے سوچیں اور کچھ اس پر غور و فکر کریں اور کم از کم یہ احتمال ہی کر لیں کہ یہ بات ان کی زندگی اور مستقبل پر اثر کرنے والی ہوگی۔ وہ نہ تو خدا کی طرف سے آتی ہے بلکہ ان کے منکر کے ہیں اور نہ ہی پروردگار کی تنبیہوں کی۔

اصلی طور پر جاہل، منکر اور خود غرض لوگوں کی ایک بد بختی یہ ہے کہ وہ ہمیشہ خیر خواہی کرنے والوں کی ہند و ناصاج کا مذاق اڑاتے ہیں اور یہی بات اس کا سبب بن جاتی ہے کہ وہ ہرگز خواب غفلت سے بیدار نہ ہوں جبکہ ایک مرتبہ بھی وہ سنجیدگی کے ساتھ اس پر غور کرنا تو ہو سکتا ہے کہ ان کی زندگی کا راستہ اسی کے تبدیل ہو جائے۔

زیر غور آیت میں لفظ "ذکر" ہر بیدار کرنے والی بات کی طرف اشارہ ہے اور "محدث" (نیا اور جدید) کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آسمانی کتابیں یکے بعد دیگرے نازل ہوتی ہیں اور قرآنی سورتیں اور اس کی آیتیں ہر ایک تازہ بہ تازہ اور نئے نئے مضامین میں لیے ہوئے ہوتی ہیں جو مختلف اثرات غیر طریقوں سے فاعل کو بیدار کرتی ہیں لیکن ان لوگوں کے لیے کیا فائدہ کہ جو ان سب کا مذاق اڑاتے ہیں؟

گلوہ نئی چیزوں سے وحشت رکھتے ہیں۔ وہ انہی قدیم خرافات پر جو انہیں اپنے بڑوں سے ورثہ میں ملی ہیں، خوش ہیں گویا انہوں نے ہمیشہ کے لیے یہ عمدہ کرلی ہے کہ وہ ہر نئی حقیقت کی مخالفت کریں گے۔ جبکہ قانون ارتقاء کی بنیاد اس بات پر ہے کہ انسان کو ہر روز تازہ بہ تازہ اور نئے نئے مسائل کا سامنا ہو۔

جمع البیان آیات زیر بحث کے ذیل میں۔

تفسیر مشرقی، جلد ۶، ص ۲۳۔

پھر مزید تاکید کے طور پر فرمایا گیا ہے : وہ ایسی حالت میں ہیں کہ ان کے دل لہو و لعب اور بے خبری میں ڈوبے ہوئے ہیں : (ہیتہ قلوبہم)۔

کیونکہ وہ تمام حکم اور نہیہ مسائل کو ظاہری لحاظ سے شوقی اور لہو و لعب سمجھتے ہیں۔ (جیسا کہ لفظ "یلعبون" فعل مضارع اور مطلق صورت میں، اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے) اور باطنی لحاظ سے غفلت میں اپنے والے فضول مسائل کے ساتھ لہو و لعب اور فکری مشغولیت میں پھنسے ہوئے ہیں۔

اور یہ امر فطری اور طبعی ہے کہ ایسے افراد ہرگز راہ سعادت نہیں پاسکتے۔ اس کے بعد ان کے شیطانی منصوبوں کے ایک گوشہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے : یہ ظالم سازش پر مبنی اپنی سرگوشیاں پھیلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ تم ہی جیسا ایک عام بشر ہے : (واسروا النجوی الذین ظلمواھل هذا الا بشئ مثلكم)۔

جبکہ وہ ایک عام بشر سے زیادہ نہیں ہے، تو لازماً اس کے یہ نفاق عادت کام اور اس کی بات کی اثر پذیری جادو کے سوا کچھ نہیں تو کیا تم جادو کے پیچھے جاتے ہو، حالانکہ تم (یہ سب کچھ) دیکھ رہے ہو (افتاتون السحر وانتم تبصرون)۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہ سورہ مکہ میں نازل ہوئی ہے اور اس وقت دشنام اسلام بہت طاقتور تھے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ضرورت تھی کہ وہ اپنی باتوں کو چھپائیں، یہاں تک کہ اپنی سرگوشیوں کو بھی (اس بات پر ترجیح دے کہ قرآن یہ کہتا ہے کہ وہ اپنی سرگوشیوں کو مخفی رکھتے تھے)۔

ممکن ہے یہ اس بنا پر ہو کہ وہ ان مسائل میں جو کسی سازش اور منصوبہ بندی کا پہلو رکھتے تھے، مشورہ کرتے ہوں تاکہ عام لوگوں کے سامنے ایک ہی منصوبہ کے ماتحت پیغمبر اکرم کا مقابلہ کریں۔ علاوہ ازیں وہ قدرت و طاقت کے لحاظ سے تو مسلمانوں کے لیے لیکن منطوق اور لغوی کلام کی قدرت کے لحاظ سے پیغمبر اکرم اور مسلمانوں کو برتری حاصل تھی۔ اور یہی برتری اس بات کا سبب بنتی تھی کہ وہ پیغمبر اکرم کے مقابلہ کے لیے جلی باتیں گھڑتے، عمل بیٹھ کر خفیہ مشورے کرتے تھے۔

بہر حال وہ اپنی اس گفتگو میں دو چیزوں کا سہارا لیتے تھے۔ ایک رسول اللہ کا بشر ہونا اور دوسرے ان کی طرف جادو کی نسبت دینا۔ اور بعد کی آیات میں جو اور چیزیں انہوں نے غلط منسوب کیں ان کا ذکر بھی آئے گا۔ قرآن ان کا بھی جواب دیتا ہے۔

لیکن پہلے قرآن کلی صورت میں رسول اکرم کی زبان سے اس طرح جواب دیتا ہے : (میرا پروردگار ہر بات کو جانتا ہے چاہے وہ آسمان میں ہو یا زمین میں) (قال رب یعلم القول فی السماء والارض)۔ عربی ادب میں معمول ہے کہ اگر فاعل اسم ظاہر ہو تو فعل محذوف لایا جاتا ہے لیکن یہ کوئی قاعدہ کلیہ نہیں ہے۔ بعض اوقات خاص محل و اسباب کی بنا پر فعل کو مجع کی شکل میں اور فاعل کو اسم ظاہر لائے ہیں۔ "واسروا النجوی الذین ظلموا" کا جملہ بھی اسی نوعیت کا ہے۔

یہ تصور نہ کرنا کہ تمہاری معنی باتیں اور پوشیدہ سازشیں اُس پر معنی ہیں۔ کیونکہ ”وہ سنا بھی ہے اور جانتا بھی ہے“ (وہ سمیع العلیم)۔

وہ تمام چیزوں کو جانتا ہے اور تمام کاموں سے باخبر ہے۔ نہ صرف وہ باتوں کو سنتا ہے بلکہ وہ ان خیالات و تصورات کو جو ان کے ذہنوں میں گزرتے ہیں اور ان ارادوں کو بھی کہ جو ان کے سینوں میں چھپے ہوئے ہیں، جانتا ہے۔

غافلین کی ہماں بازیوں کی دو قسموں کا بیان کرنے کے بعد، ان ہماں بازیوں کی دوسری چار قسموں کا ذکر شروع کرتے ہوئے قرآن اس طرح کہتا ہے: انہوں نے کہا کہ پیغمبر جو کچھ وحی کے عنوان سے لایا ہے، یہ پریشان خواہوں اور پرانندہ خیالوں کے سوا کچھ بھی نہیں کہ جنہیں وہ حقیقت اور واقعیت سمجھ بیٹھا ہے: (بَلْ قَالُوا اضْغَاثٌ أَحْلَامٌ)۔

اور کبھی اپنی اس بات کو بدل کر کہتے ہیں کہ: ”وہ جھوٹا آدمی ہے اور اس نے خدا سے یہ باتیں جھوٹ منسوب کی ہیں (بَلْ افْتَلَاهُ) اور کبھی کہتے ہیں کہ: ”نہیں وہ تو ایک شاعر ہے“ اور یہ باتیں اس کے شاعرانہ تخیلات کا مجموعہ ہیں (بَلْ هُوَ شَاعِرٌ)۔ اور آخری مرحلہ میں کہتے ہیں کہ اگر ہم ان تمام باتوں کو چھوڑ دیں پھر بھی اگر وہ سچ کہتا ہے کہ وہ خدا کا بھیجا ہوا (رسول) ہے تو ہمارے لیے کوئی معجزہ لے کر آئے جیسا کہ گزشتہ انبیاء، معجزات کے ساتھ بھیجے گئے تھے“ (فَلْيَأْتِنَا بآيَةٍ كَمَا أُرْسِلَ الْآلُونَ) رسول اللہ کی طرف ان چیزوں کی نسبت، جو ایک دوسرے کی نفی میں اور ضد ہیں، کا مطالعہ اور تحقیق خود اس بات کی بہترین دلیل ہے کہ وہ لوگ حق طلب اور حقیقت کے متلاشی نہیں تھے بلکہ ان کا مقصد ہماں جونی اور حریف کو ہر قیمت اور ہر ضرورت میں میدان سے باہر نکالنا تھا۔

کبھی جادوگر کہتے، کبھی شاعر، کبھی مغتری اور کبھی (معاذ اللہ) خیالی دنیا میں بسنے والا ایک شخص جس کو چاہنے خراب پریشاں کو وحی کہنے لگتا ہے۔

اگر ہمارے پاس ان کی باتوں کو باطل کرنے کے لیے، ان کی ادھر ادھر کی ان منتشر باتوں کے علاوہ اور کوئی بھی دلیل نہ ہوتی، تو ان کے باطل ہونے کے لیے یہی کافی تھیں لیکن بعد کی آیات میں ہم دیکھیں گے کہ قرآن دوسرے طریقوں سے بھی انہیں قاطع جواب دیتا ہے۔

ایک نکتہ:

کیا قرآن حادث ہے؟ بعض مفسرین نے ان آیات کے ذیل میں لفظ ”محدث“ کی مناسبت سے کہ جو دوسری زیر بحث آیت میں ہے ”کلام اللہ“ کے حادث یا قدیم ہونے کے بارے میں بہت بحث کی ہے۔ یہ وہی مسئلہ ہے کہ

۱۔ ”اضغاث“: جمع ”ضفث“ (بروزن ”حرم“) خشک گڑبڑوں یا گھاس وغیرہ کے گٹھے کے معنی میں ہے۔

۲۔ ”احلام“: جمع ہے ”حلم“ کی (بروزن ”نہم“) خواب اور رویا کے معنی میں اور کچھ کڑی و غیرہ کے گٹھوں کو اکٹھا کرنے کے لیے بکری ہولی چیزوں کو ایک دوسرے کے اوپر رکھتے ہیں اس لیے اس تعبیر کا خواب پریشاں پر مطلق ہوا ہے۔

ابن عباس کے زمانہ میں سالہا سال تک بحث و تنقید کا موضوع بنارہا اور جس نے ایک طویل مدت تک بہت سے علماء کو لئے رکھا۔

لیکن ہم موجودہ زمانہ میں اچھی طرح سے جھلنے میں کہ یہ بحث زیادہ تر سیاسی پہلو رکھتی تھی۔ مگر ان چاہتے تھے کہ علمائے اسلام کو ان میں الجھائے رکھیں اور اصولی اور بنیادی مسائل کہ جو وضع حکومت اور لوگوں کے طرز زندگی اور اسلام کے اصلی حقائق سے تعلق رکھتے ہیں ان پر توجہ ہٹائے رکھیں۔

موجودہ زمانہ میں ہمارے لیے یہ بات پرے طور پر واضح ہے کہ اگر ”کلام اللہ“ سے مراد اس کا معنی و مفہوم ہے، تو وہ قطعی اور ہم قدیم ہے یعنی ہمیشہ وہ علم خدا تھا اور خدا کا علم ہمیشہ سے اس پر محیط ہے۔

اور اگر اس سے مراد یہ الفاظ اور یہ کلمات اور یہ وحی ہے کہ جو پیغمبر اکرم پر نازل ہوئی، تو وہ بلاشبک و شبہ حادث ہے۔ کون عاقل یہ کہتا ہے کہ الفاظ و کلمات ازل میں، یا پیغمبر پر وحی کا نزول دور بعثت کے آغاز سے نہیں ہوا؟ لہذا آپ ملاحظہ کریں گے کہ ہم بحث کو جس طرف سے بھی لیں مسئلہ روز روشن کی طرح واضح ہے۔

دوسرے الفاظ میں قرآن الفاظ بھی رکھتا ہے اور معانی بھی۔ اس کے الفاظ قطعاً و یقیناً ”حادث“ ہیں اور اس کے معانی قطعاً و یقیناً ”قدیم“ ہیں۔ لہذا کہینا تائی اور بحث و مباحثہ کی ضرورت نہیں ہے۔

اور پھر یہ بحث اسلامی معاشرے کی کونسی علمی، معاشرتی، سیاسی اور اخلاقی شکل کو حل کرتی ہے۔ حیرت ہے کہ بعض گزشتہ علمائے مکار اور سازشی حکام اور بادشاہوں کی فریب کاریوں سے دھوکا کیوں کھایا۔

لہذا ہم دیکھتے ہیں کہ بعض ائمہ اہل بیت نے اس مسئلے پر گفتگو کرتے ہوئے واضح اور عملی طور پر انہیں خبردار کیا ہے کہ وہ اس قسم کی بحثوں سے پرہیز کریں!

۶۔ مَا آمَنَتْ قَبْلَهُمْ مِنْ قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا أَفَهُمْ يُؤْمِنُونَ

۷۔ وَمَا أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ إِلَّا رِجَالًا نُوْحِي إِلَيْهِمْ فَسَلُّوا أَهْلَ الذِّكْرِ

۸۔ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ

۹۔ وَمَا جَعَلْنَاهُمْ جَسَداً أَلَا يَأْكُلُونَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوا

خَالِدِينَ

۱۰۔ نَتَرَصَّدُهُمُ الْوَعْدَ فَأَنْجَيْنَاهُمْ وَمَنْ نَشَاءُ وَ

اهْلَكْنَا الْمُسْرِفِينَ

۱۔ لَقَدْ اَنْزَلْنَا اِلَيْكُمْ كِتَابًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ۚ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ

ترجمہ

- ۶۔ تمام آبادیاں کہ جنہیں ہم نے اُن سے پہلے ہلاک کیا (انہوں نے بھی طرح طرح کے معجزات کا تقاضا کیا تھا اور ان کے مطالبات کے مطابق معجزات دکھا دیئے گئے تھے لیکن) وہ ہرگز ایمان نہ لائے۔ تو کیا یہ ایمان لے آئیں گے؟
- ۷۔ ہم نے تجھ سے پہلے (بھی) مرد ہی بھیجے کہ جن کی طرف ہم وحی کیا کرتے تھے۔ (وہ سب کے سب انسان ہی تھے اور نوح بشر میں سے تھے) اگر تم نہیں جانتے تو جاننے والوں سے پوچھ لو۔
- ۸۔ ہم نے انہیں ایسے جسم زد کیے تھے کہ وہ کھانا نہ کھاتے ہوں اور نہ ہی وہ عمر جاوداں رکھتے تھے۔
- ۹۔ اس کے بعد جو وعدہ ہم نے اُن سے کیا تھا اس کی ہم نے وفا کی انہیں اور جس جس کو ہم چاہتے تھے (ان کے دشمنوں کے چنگل سے) نجات دی اور زیادتی کرنے والے کو ہم نے ہلاک کر دیا۔
- ۱۰۔ ہم نے تم پر ایسی کتاب نازل کی ہے کہ جس میں تمہارے لیے نصیحت (اور بیداری) کا وسیلہ موجود ہے۔ کیا تم غور و فکر نہیں کرتے۔

تفسیر

تمام پیغمبر نوح بشر میں سے تھے:

گزشتہ آیات میں دشمنان اسلام کی طرف سے ایسے چھ اعتراضات کا ذکر تھا کہ جو ایک دوسرے کی ضد اور نفی میں۔ زیر بحث آیات انہیں کا جواب دے رہی ہیں۔ ان میں کبھی کی صورت میں اور کبھی کسی خاص مسئلے کے اعتبار سے جواب دیا گیا ہے۔ پہلی زیر بحث آیت ان کے من پسند معجزات طلب کرنے کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ اور کہتی ہے: تمام شہر آبادیاں کہ جنہیں ہم نے ان سے پہلے ہلاک کیا ہے۔ انہوں نے بھی اسی قسم کے معجزات کا تقاضا کیا تھا لیکن جب ان کے مطالبات پورے نہ کر دیئے گئے تو وہ پھر بھی ایمان نہ لائے۔ تو کیا یہ ایمان لے آئیں گے (ما امنت قریۃ اھلکناھا افسوٰی یؤمنون)۔ اس ضمن میں انہیں خبردار کیا گیا ہے کہ اگر اتراجی معجزات کے سلسلے میں تمہارے تقاضے کو پورا کر دیا جائے اور پھر بھی تم ایمان نہ لاؤ، تو تمہاری تباہی و نابودی جی دیشنی ہو جائے گی۔

۱۔ من پسند کے معجزات کو اصطلاح میں "اتراجی معجزات" کہتے ہیں۔ ان معجزات کا تقاضا درحقیقت ہمارے مادی زندگی کے طور پر تھا۔

آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی موجود ہے کہ قرآن اس آیت میں ان کے تمام ایسے اعتراضات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ جو ایک دوسرے کی ضد اور نفی میں اشارہ کرتے ہوتے یہ کہتا ہے کہ: سچے پیغمبروں کی دعوت کے سلسلے میں اس طرح کی محکوم کوئی نئی بات نہیں ہے۔ بہت دیر اور صدی افراد ہمیشہ ہی اسی قسم کے بہانوں کو وسیلہ بنایا کرتے تھے اور آخر کار ان کا انجام بھی سوائے کفر کے اور اس کے بعد ان کی ہلاکت اور دردناک عذاب الہی کے اور کچھ نہیں ہوتا تھا۔

بعد والی آیت ان کے سب سے پہلے اعتراض کا خصوصیت سے جواب دے رہی ہے، یہ اعتراض پیغمبر کے بشر ہونے کے سلسلے میں تھا۔ آیت کہتی ہے تو ہی نہیں کہ پیغمبر ہونے کے ساتھ ساتھ انسان بھی ہے بلکہ تمام کے تمام پیغمبر جو تجھ سے پہلے آئے ہیں وہ سب کے سب مرد ہی تو تھے کہ جن کی طرف ہم وحی کیا کرتے تھے (وما ارسلنا قبْلک الا رجا لا نوحی الیہو)۔ یہ ایک ایسی تاریخی حقیقت ہے کہ جسے سب لوگ جانتے ہیں اور اس سے آگاہ ہیں اور اگر تم نہیں جانتے، تو جو آگاہ ہیں اُن سے پوچھ لو (فاستلوا اهل الذکر ان کنتم لا تعلمون)۔

اہل ذکر کون ہیں؟

اس میں شک نہیں کہ "اہل ذکر" لغوی مفہوم کے لحاظ سے تمام آگاہ اور باخبر افراد کے لیے بولا جاتا ہے اور زیر نظر آیت "بابل کے عالم کی طرف رجوع کرنے" کے ایک کلی عقلی قانون کو بیان کر رہی ہے۔ اگرچہ موقع کے لحاظ سے آیت کا مصداق علم اہل کتاب ہی تھے، لیکن یہ بات قانون کی کلیت میں مانع نہیں ہے۔ اسی بنا پر علم اور فقہائے اسلام نے اس آیت سے "مجتہدین اسلام کی تقلید کرنے کے جواز" کے مسئلہ میں استدلال کیا ہے اور اگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اُن روایات میں کہ جو اہل بیت کی طرف سے ہم تک پہنچی ہیں اہل ذکر کی علی علیہ السلام یا تمام ائمہ اہل بیت سے تفسیر کی گئی ہے تو یہ مختصر ہونے کے سنی میں نہیں ہے بلکہ یہ اس قانون کلی کے واضح ترین مصداق کا بیان ہے۔ اس سلسلے میں مزید وضاحت کے لیے سورہ نحل کی آیہ ۶۳ کی تفسیر کا مطالعہ فرمائیں۔

بعد والی آیت انبیاء کے بشر ہونے کے سلسلے میں مزید وضاحت کرتے ہوئے کہتی ہے: ہم نے پیغمبروں کو ایسے جسم نہیں دیئے تھے کہ جو کھانا نہ کھاتے ہوں اور وہ ہرگز عمر جاوداں بھی نہیں رکھتے تھے (وما جعلناھم رجدا لا یاکلون الطعام وما کانوا خالداً)۔

"لا یاکلون الطعام" کا جملہ اس چیز کی طرف اشارہ ہے کہ جو قرآن میں دوسرے مقام پر اسی اعتراض کے سلسلے میں آئی ہے:

"وقالوا مالھذا الرسول یأکل الطعام ویمشی فی الاسواق"

انہوں نے کہا یہ پیغمبر کھانا کیوں کھاتا ہے اور بازاروں میں کیوں چلتا پھرتا ہے۔ (تفسیر...)
 ”ماکانوا خالداً“ کا جملہ بھی اسی معنی کی ایک تکمیل ہے۔ کیونکہ مشرکین یہ کہتے تھے کہ بشر کی بجائے اگرچہ فرشتہ بھیجا جائے
 تو اچھا تھا۔ ایسا فرشتہ جو جادوئی رکھتا ہوتا اور اسے موت نہ آتی۔ قرآن ان کے جواب میں کہتا ہے: ”مگر فرشتہ انبیاء میں سے کوئی بھی جادوئی نہیں رکھتا تھا کہ پیغمبر اسلام کے بارے میں یہ بات کی جائے۔“

بہر حال جیسا کہ ہم نے بار بار بیان کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ انسانوں کے رہبر کو انہیں کی نوع میں سے ہونا چاہیئے، ان ہی
 اغراض، احساسات، جذبات، احتیاجات اور علاقوں کے ساتھ تاکہ وہ ان کے درد اور تکالیف کو محسوس کرے۔ اور علاج کا بہترین طریقہ
 اپنی تعلیمات کے ذریعے پیش کرے تاکہ وہ تمام انسانوں کے لیے نمونہ اور ایک اسوہ بنے اور سب پر حجت تمام کرے۔

اس کے بعد سنت اور ہٹ و دم منکرین کو تنبیہ اور خبردار کرنے کے عنوان سے قرآن اس طرح کہتا ہے: ہم نے اپنے پیغمبروں
 سے وعدہ کیا تھا کہ ہم انہیں دشمنوں کے چنگل سے رہائی بخشنیں گے اور ان کے دشمنوں کے منصوبوں کو خاک میں ڈالیں گے۔ ہاں! ”آؤ
 ہم نے اپنے اس وعدہ کو پورا کیا اور ان کی صداقت کو آشکار کیا انہیں اور ان تمام لوگوں کو کہ جنہیں ہم چاہتے تھے نجات دی اور زیادتی کرنے
 والوں کو ہم نے ہلاک کر دیا۔ (ثو صد قناہو الوعد فاجیناھو ومن نشاء و اھلکنا المشرکین)۔
 ہاں! جس طرح افراؤ بشر میں سے رہبر ان بشر کو منتخب کرنا ہماری سنت تھی، یہ بھی ہماری سنت تھی کہ ہم
 مخالفین کی سازشوں کے مقابلہ میں ان کی حمایت کریں اور اگر پہلے دہپے پند و نصائح ان پر اثر انداز نہ ہوں تو ستمو زمین کو ان کے وجود
 کی گنگنی سے پاک کر دیں۔

یہ بات صاف ظاہر ہے کہ ”ومن نشاء“ (اور جسے ہم چاہیں) سے مراد ایسا چاہنا ہے کہ جو ایمان اور عمل صالح کے
 معیار پر پورا اترے اور یہ بھی واضح ہے کہ ”مشرکین“ سے یہاں ایسے لوگ مراد ہیں جنہوں نے اپنے باپے میں اور اس معاملہ
 کے بارے میں جس میں وہ زندگی بسر کرتے تھے، اسراف کیا ہے، آیات خداوندی کا انکار کر کے اور پیغمبروں کو جھٹلا کر۔
 اس لیے قرآن میں ایک دوسری جگہ پر بیان ہوا ہے کہ:

كذلك حقاً علينا نذی المؤمنین

اسی طرح سے ہم پر حق اور ضروری تھا کہ ہم مومنین کو نجات دیں۔ (یونس - ۱۰۳)
 آخری زیر بحث آیت میں ایک مختصر اور پرمعنی جملے میں مشرکین کے اکثر اعتراضات کا سننے سے جواب دیتے ہوئے
 فرمایا گیا ہے: ہم نے تم پر ایسی کتاب نازل کی ہے کہ جس میں تمہاری بیداری کا وسیلہ موجود ہے کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے:
 (ولقد انزلنا الیک حکماً تا فیه ذکرکم افلا تعقلون)۔

جو شخص اس کتاب کی آیات کا مطالعہ کرے جو معاشرے کے لیے تذکر اور دل کی بیداری اور فکر و نظر کے محرک اور پاکیزگی
 کا موجب ہیں، تو وہ اچھی طرح سے جان لے گا کہ یہ ایک واضح اور جادوئی معجزہ ہے۔ اس آشکار معجزے کے ہوتے ہوئے کہ جس
 میں مختلف جہات سے اہل علم کے آثار نمایاں ہیں۔ (انتہائی زیادہ قربت جاذبہ کی حجت سے، مضامین کی حجت سے، احکام و قوانین

جہت سے اور عقائد و معارف وغیرہ کی جہت سے) کیا پھر بھی کسی دوسرے معجزے کی انتظار میں ہو؟ اس سے بہتر اور کونسا معجزہ
 پیر اسلام کی دعوت کی حقیقت کو ثابت کر سکتا ہے؟

اس سے قطع نظر اس کتاب کی آیات پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ یہ جادو نہیں ہے، حقیقت و واقعیت ہے اور اس کی تعلیمات
 جاذب و پرمعنی ہیں۔ کیا پھر بھی یہی کہتے ہو کہ یہ جادو ہے؟
 کیا ان آیات کی طرف ”اضغاث اسلام“ کی نسبت دی جاسکتی ہے؟ بے معنی اور پریشان خواب کہاں اور یہ موزوں اور
 ایک دوسرے سے مربوط باتیں کہاں؟

کیا اسے جھوٹ اور افترا شمار کیا جاسکتا ہے؟ جب کہ سچائی کے آثار اس کے ہر مقام سے نمایاں ہیں۔
 اور کیا اسے لائے والا شاعر ہو سکتا ہے جبکہ شعر تحیل کے محور کے گرد چکر لگاتا ہے اور اس کتاب کی تمام آیات حقیقتوں پر مبنی ہیں
 مختصر یہ کہ اس کتاب میں غور و فکر کرنے اور اس کا مطالعہ کرنے سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ یہ نسبتیں کہ جو ایک دوسرے
 کی ضد اور تضاد ہیں ایسے پیوند ہیں کہ جو ہم رنگ نہیں ہیں اور ایسی باتیں ہیں کہ جو احمقانہ ہیں۔

یہ بات کہ زیر بحث آیت میں ”ذکرکم“ کس معنی میں ہے اس بارے میں مغربین کے بیانات مختلف ہیں۔
 بعض نے تو یہ کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ قرآن کی آیات تمہارے لیے نصیحت اور افکار و اذکار کی بیداری کا سبب ہیں
 جیسا کہ ایک اور جگہ قرآن کہتا ہے:

فذكر بالقول من يخاف وعيد

اس قرآن کے ذریعے ان لوگوں کو کہ جو خدائی عذاب اور سزا سے ڈرتے ہیں نصیحت کرو

اور یاد دہانی کراؤ۔ (ق - ۲۵)

بعض نے یہ کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ یہ قرآن تمہارے نام اور شہرت کو دنیا میں بلند کرے گا یعنی یہ تمہاری عزت و
 شرف کا باعث ہے، تم مومنین و مسلمین کی یا تم قوم عرب کی کیونکہ قرآن تمہاری زبان میں نازل ہوا ہے۔ اور اگر یہ تم سے لے لیا جائے
 تو تمہارا دنیا میں نام و نشان تک باقی نہ رہے۔

بعض مغربین نے یہ کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اس قرآن میں وہ تمام چیزیں موجود ہیں کہ جو تمہارے دین و دنیا کے لیے
 ضروری ہیں اور یا سکام اخلاق کے سلسلہ میں جن کے تم محتاج ہو، ان سب کے لیے یاد دہانی کرائی گئی ہے۔

اگرچہ یہ تفسیر ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں اور ممکن ہے کہ یہ سب کی سب ”ذکرکم“ کی تفسیر میں جمع ہوں تاہم
 پہلی تفسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ یہ قرآن بیداری کا سبب کس طرح ہے جبکہ بہت سے مشرکین نے اُسے سنا لیکن وہ بیدار نہیں ہوئے، تو
 ہم اس کے جواب میں کہیں گے کہ قرآن کا بیدار کرنے والا ہونا، جبری اور اضطراری پہلو نہیں رکھتا بلکہ اس کی شرط یہ ہے کہ انسان خود

چاہتا ہوا وہ اپنے دل کے دریچے اس کے سامنے کھول دے۔

۱۱۔ وَكَمْ قَصَصْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَأَنْشَأْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا آخَرِينَ ۝

۱۲۔ فَلَمَّا أَحْسَوْا بِأَسْنَاءِ إِذْ هُمْ مِنْهَا يَرْكُضُونَ ۝

۱۳۔ لَا تَرْكُضُوا وَارْجِعُوا إِلَى مَا أُتْرِفْتُمْ فِيهِ وَمَسْكَنِكُمْ فَلَعَلَّكُمْ تَسْأَلُونَ ۝

۱۴۔ قَالُوا لَیْوَلِّیْنَا إِنَّا كُنَّا ظَالِمِينَ ۝

۱۵۔ فَمَا زِلْتَ تِلْكَ دَعْوَاهُمْ حَتَّى جَعَلْنَاهُمْ حَصِيدًا خَمِیدَیْنِ ۝

ترجمہ

۱۱۔ ہم نے کتنی ہی ایسی بستیوں کو جو ظالم تھیں وہ ہم پر ہم کر دیا اور ان کے بعد ہم ایک دوسری قوم کو لے آئے۔

۱۲۔ انہوں نے جس وقت ہمارے عذاب کو محسوس کیا تو انہوں نے اپنا ہنگامہ فرار اختیار کیا۔

۱۳۔ فرار نہ کرو اور اپنی ناز و نعمت سے پر زندگی کی طرف لوٹ آؤ اور اپنے خوبصورت گھروں میں (آباد) تاکہ سائل آئیں اور تم سے سوال کریں۔ (اور تم ان کو محروم کر کے بیٹا دو)۔

۱۴۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے افسوس ہم پر کہ ہم ظالم و شکر تھے۔

۱۵۔ وہ اسی طرح سے اپنی ان باتوں کو دہرا رہے تھے، یہاں تک کہ ہم نے انہیں جڑ سے کاٹ کر خاموش کر دیا۔

تفسیر

ظالم عذاب کے جنگل میں کیسے گرفتار ہوئے؟

زیر بحث آیات میں ان باتوں کے بعد کہ جو ہٹ دھرم مشرکین اور کفار کے بارے میں گزریں، قرآن گزشتہ قوموں کے انجام کے ساتھ ان کے انجام کا موازنہ کر کے واضح کرتا ہے:

پہلے کتاب ہے: کتنی ظالم اور شکر آبادیاں ایسی تھیں کہ جنہیں ہم نے تروبالا کر دیا (وَكَمْ قَصَصْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً)۔

”اور ان کے بعد ایک دوسری قوم کو میدان آزمائش میں لے آئے“ (وَأَنْشَأْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا آخَرِينَ)۔

اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ ”قصو“ شدت کے ساتھ ٹوٹنے کے معنی میں ہے، یہاں تک کہ بعض اوقات ٹوٹنے کے معنی میں آتا ہے اور اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ ان قوموں کے ظالم ہونے کا ذکر ہے، اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ خدا ظالم و شکر قوموں کے بارے میں شدید ترین انتقام اور سزا و عذاب کا قائل ہے۔

ضمنی طور پر اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اگر تم گزشتہ لوگوں کی تاریخ کا مطالعہ کرو تو تم جان لو گے کہ پیغمبر اسلام کی تہذیبیں بے بنیاد اور مذاق نہیں ہیں بلکہ وہ ایک تلخ حقیقت ہیں کہ جس کے بارے میں تمہیں خوب غور و فکر کرنا چاہیئے۔

آب ان کے حالات کی تفصیل بیان کی گئی ہے جب کہ عذاب ان کی آبادیوں کو آلیتا تھا۔ خدائی عذاب کے مقابلہ میں ان کی بیجاگی واضح کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: جس وقت انہوں نے محسوس کیا کہ خدا کا عذاب انہیں دامن گیر ہو کے رہے گا تو انہوں نے فرار کی راہ اختیار کی: (فَلَمَّا أَحْسَوْا بِأَسْنَاءِ إِذْ هُمْ مِنْهَا يَرْكُضُونَ)۔

ٹھیک ایک شکست خوردہ لشکر کی مانند کہ جو دشمن کی برہنہ شمشیروں کی اپنی پشت پر دیکھ کر ادھر ادھر بھاگ کھڑا ہو۔

لیکن سرزنش کے عنوان سے انہیں کہا جائے گا: بھاگو نہیں! اور اپنی ناز و نعمت سے پر زندگی اور زر و جواہر سے بھرے ہوئے مکانات، محلوں، بنگلوں کی طرف پلٹ آؤ، شاید سائل آئیں اور تم سے سوال کریں: (لَا تَرْكُضُوا وَارْجِعُوا إِلَى مَا أُتْرِفْتُمْ فِيهِ وَمَسْكَنِكُمْ فَلَعَلَّكُمْ تَسْأَلُونَ)۔

یہ عبارت، ممکن ہے اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ ہمیشہ ان کی پر ناز و نعمت زندگی میں سائل اور خیرات مانگنے والے ان کے

نہ ”رکض“ کا معنی تیزی سے دوڑنا بھی ہے اور سواری کو دوڑنا بھی ہے اور کبھی زمین پر پاؤں مارنے کے معنی میں بھی آتا ہے

ارکض برجلک هذا مقتسل بارد و شراب

اے ایوب! تم اپنا پاؤں زمین پر مارو (تو ایک چشم بھٹ تلے گا) کہ جو تمہارے لیے بھی ہے اور اپنے کپڑے بھی (ص۔ ۴۴)

مگر دل کے درد ازل پر اُمید لے کر آتے تھے اور محروم ہو کر پلٹ جاتے تھے۔ انہیں کہا گیا ہے کہ "پلٹ جاؤ اور انہیں نصرت میں مناظر کو بھر دہراؤ۔"

یہ حقیقت میں ایک قسم کا استنزاف اور سرزنش ہے۔

بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ "لعلکوا تسئلون" ان کے جاہ و جلال کے دربار کی طرف اشارہ ہے کہ وہ خود ایک گوشہ میں بیٹھے رہتے اور مسلسل فرمان جاری کرتے، اور خدمت گار پے در پے ان کے پاس آتے، اور پوچھتے کہ حضور کا کیا حکم ہے؟

بانی رہا یہ کہ اس بات کا کہنے والا کون ہے؟ تو یہ بات آیت میں صراحت کے ساتھ بیان نہیں کی گئی۔

ممکن ہے کہ یہ ندا خدا کے فرشتوں یا انبیاء یا ان کے قاصدوں کی ہو یا خود انہی کے ضمیر اور وجدان کی آواز ہو۔

حقیقت میں یہ خدا کی ندا ہی تھی کہ جو انہیں سنائی دے رہی تھی کہ: بھاگو نہیں! پلٹ آؤ! کہ جو ان تنہوں میں سے کسی ایک ذریعہ سے ان تک پہنچ رہی تھی۔

یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ تمام مادی نعمتوں میں سے یہاں خصوصیت کے ساتھ "سکن" کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

شاید یہ اس بنا پر ہو کہ انسان کے آرام و سکون کا پہلا وسیلہ ایک مناسب جائے سکونت کا ہونا ہے۔ اور یہ بات ہے کہ انسان عام طور پر اپنی زندگی کی بیشتر آمدنی اپنے مکان پر صرف کرتا ہے اور اس کا زیادہ تر لگاؤ بھی اُسی سے ہوتا ہے۔

بہر حال وہ اُس وقت بیدار ہوں گے اور جس چیز کو وہ پہلے مذاق سمجھتے تھے اُسے سنجیدہ ترین صورت میں اپنے سامنے دیکھیں گے اور وہ بھی اُنھیں گے اور کہیں گے "وائے ہو ہم پر کہ ہم ظالم و ستمگر تھے" (قالوا یا ویلینا انا کنا ظالمین)۔

لیکن یہ انتظار ہی بیماری کہ جو عذاب کے حقیقی مناظر کے سامنے ہر شخص میں پیدا ہو جاتی ہے بے قدر و قیمت ہے اور اس سے ان کا انجام بدل نہیں سکتا لہذا قرآن آفری زیر بحث آیت میں اضافہ کرتا ہے:

اور وہ اس طرح اس بات کا کہ "وائے ہو ہم پر کہ ہم ظالم تھے" تکرار کر رہے تھے کہ ہم نے ان کی جڑ کو کاٹ کر رکھ دیا اور انہیں خاموش کر دیا (فما زالت تلك دعواهم حتى جعلناهم حصيداً خامدين)۔

کئی ہوئی کھیتیں (حصيد) کی طرح زمین پر گر گئے اور ان کا آباد اور جوش و خروش سے پُر شہر، دیوان قبرستان اور خاموشی میں بدل جائے گا" (خامدين)۔

۱۔ "خامد" اصل میں "خمود" کے ماد سے ("جنود" کے وزن پر) آگ بجھ جانے کے معنی میں ہے۔ بعد ازاں یہ لفظ ہر اُس چیز پر بلا جانے لگا کہ جس کا جوش و خروش ختم ہو جائے۔

- ۱۶۔ وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لِعِبَادٍ
لَّوْ أَرَدْنَا أَنْ نَتَّخِذَ لَهُمْ آلَاءَ تَتَّخِذُهُ مِنْ لَدُنَّا لَآهَ إِنْ كُنَّا فَعَلِينَ
۱۷۔ بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ
۱۸۔ وَلَكُمْ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُونَ

ترجمہ

- ۱۶۔ ہم نے آسمان و زمین اور جو کچھ اُن کے درمیان ہے کھیل کے طور پر پیدا نہیں کیا۔
۱۷۔ بے غرض محال اگر ہم چاہتے بھی کہ کوئی سرگرمی ڈھونڈیں، تو اپنے شایانِ شان کسی چیز کا انتخاب کرتے۔
۱۸۔ بلکہ ہم حق کو باطل پر دے مارتے ہیں تاکہ اُسے ہلاک کر دیں اور اس طرح باطل نابود ہو جاتا ہے لیکن تم پر داتے ہو اس توصیف پر کہ جو تم کرتے ہو۔

تفسیر

آسمان و زمین کی خلقت کھیل نہیں ہے:

چونکہ گزشتہ آیات میں یہ حقیقت بیان ہوئی تھی کہ ظالم بے ایمان اپنی خلقت کے بارے میں سوائے عیش و عشرت کے کسی مقصد کے قائل نہیں تھے اور حقیقتاً اس جہان کو بے مقصد خیال کرتے تھے۔ قرآن مجید زیر بحث آیات میں، اس طرزِ فکر کو باطل قرار دینے اور پوری کائنات خصوصاً انسانوں کی خلقت کے لیے گراں قدر مقصد ہونے کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے: ہم نے آسمان و زمین اور جو کچھ اُن کے درمیان ہے اُسے فضل اور بے ہودہ پیدا نہیں کیا ہے: (وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لَاعِبِينَ)۔

یہ پہلی ہوئی زمین: یہ وسیع آسمان اور ان میں موجود یہ قسم قسم کی موجودات، اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ کوئی اہم مقصد پیش نظر تھا۔

ہاں! مقصد تھا اور وہ یہ تھا کہ ایک طرف تو وہ اُس عظیم پیدا کرنے والے کے وجود کا ثبوت بنیں اور دوسری طرف سے "معاذ" کے لیے دلیل بنیں ورنہ یہ سب شور و غل چند دن کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا۔
کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی انسان کسی بیابان کے وسط میں تمام وسائل سے آراستہ و پیراستہ ایک محل بنائے، صرف اس غرض

کہ تمام عرب میں جو ایک گھنٹہ کے لیے وہاں سے گزرے گا، تو اس میں آرام کرے گا۔
مختصر یہ ہے کہ اگر ہم اس با عظمت جہان کو بے ایمان لوگوں کی آنکھ سے دیکھیں تو یہ فضول اور بے مقصد ہے، صرف
مبدأ و معاد پر ایمان ہی ہے کہ جو اسے بامقصد بناتا ہے۔

بعد کی آیت کہتی ہے کہ اب جبکہ یہ بات مسلم ہو گئی کہ عالم بے مقصد نہیں ہے۔ یہ بھی مسلم ہے کہ اس خلقت کا مقصد
خدا کا خلقت کے کام میں سرگرم اور مشغول رہنا نہیں ہے کیونکہ ایسی سرگرمی اور مشغولیت غیر معقول ہے۔ بغرض محال اگر ہم چاہتے
کہ اپنے لیے کوئی سرگرمی ڈھونڈیں، تو ایسی چیز کا انتخاب کرتے کہ جو ہمارے لیے مناسب ہوتی (لواردنان نتخذ
لھوا لا تغذناہ من لدنا ان کنا فاعلین)۔

حقیقت میں لفظ "لعب" بے مقصد کام کے معنی میں ہے اور "لھو" نامعقول مقاصد اور سرگرمیوں کی طرف اشارہ ہے۔
زیر بحث آیت دو حقائق کو بیان کرتی ہے۔ اول تو لفظ "لو" کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ جو لغت عرب میں اشتناع کہتے
اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ امر محال ہے کہ پروردگار کا مقصد اپنے آپ کو مشغول رکھنا ہو۔

اس کے بعد قرآن کہتا ہے: فرض کریں کہ اگر مقصد مشغول رہنا ہو، تو یہ سرگرمی اس کی ذات کے شایان شان ہونا چاہیے،
عالم بحرات اور اشیاء کی کمپیڑوں میں سے، نہ کہ اس عالم سے کہ جو مادہ میں محدود ہے۔

اس کے بعد قطعی اور دو لوگ الفاظ میں اُن احمقوں کے اوہام کو باطل کرنے کے لیے کہ جو دنیا کو بے مقصد یا صرف مشغول اور
سرگرم رہنے کا ذریعہ خیال کرتے ہیں، قرآن اس طرح کہتا ہے: یہ جہان ایک ایسا مجموعہ ہے کہ جو حقیقت و واقعیت ہے، یہ ایسا
نہیں ہے کہ جس کی بنیاد باطل پر ہو بلکہ ہم حق کو باطل کے سر پر دے چکے ہیں تاکہ اسے نابود اور ہلاک کر دے اور باطل کو
نابود ہو جائے: (بل نقذف بالحق علی الباطل فیدمغه فاذا هو زاهق)۔

اور آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: لیکن تم پر دلے ہو، اس توصیف پر، کہ جو تم عالم کے بے مقصد ہونے کے بارے میں
کرتے ہو (ولکو الولیل مصطفون)۔

یعنی ہم ہمیشہ بے ہودگی کی طرف مائل لوگوں کے خیالات و ادھام کے مقابلے میں عقلی دلائل، واضح استدلال اور اپنے
آشکار سچوت پیش کرتے ہیں تاکہ غور و فکر کرنے والوں اور صاحبان عقل کی نظروں میں، یہ خیالات و ادھام درہم برہم ہو جائیں۔
خدا کی معرفت کے دلائل روشن ہیں۔ معاد کے برپا ہونے کے دلائل آشکار ہیں۔ انبیاء کی حقانیت کے براہین واضح ہیں۔

کچھ سرسری نے زیر نظر آیات کو میسائیل کے عقائد کی نفی کی طرف اشارہ سمجھا ہے، یعنی لہو کو بیوی اور بیٹے کے معنی میں لیا ہے اور
انہوں نے کہا ہے کہ آیت ان کے جواب میں یہ کہہ رہی ہے کہ اگر ہم چاہتے کہ بیٹا اور بیوی کا انتخاب کرتے، تو نوع انسانی
میں سے انتخاب نہ کرتے۔

لیکن یہ تفسیر کی بہت سے مناسب نظر نہیں آتی۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ زیر بحث آیات کا ربط گزشتہ آیات سے منقطع ہو جائے گا اور
دوسرا یہ کہ لہو مصداقاً لعب کے بعد قرار پائے تو سرگرمی اور مشغولیت کے معنی میں ہوتا ہے، نہ کہ بیوی بیٹے کے معنی میں۔

در حقیقت ان لوگوں کے چلنے کے جو ہٹ دھرم اور ہماں باز نہیں ہیں۔ حق باطل سے کامل طور پر الگ اور نمایاں ہے۔
قابل توجہ بات یہ ہے کہ "نقذف" کے مادہ سے پھینکنے کے معنی میں ہے۔ خصوصاً دُور سے پھینکنا اور چونک
رہے پھینکنا، تیزی، سرعت اور زیادہ قوت رکھنا ہے، یہ تعبیر حق کی باطل پر کامیابی کی قدرت کو بیان کرتی ہے۔ لفظ "علیٰ"
بھی اسی معنی کی تائید کرتا ہے کیونکہ عام طور پر یہ لفظ "علو" اور بلندی کے مقام پر استعمال ہوتا ہے۔

"یدمغه" کا جملہ، راغب کے قول کے مطابق کھوپڑی کو توڑنے کے معنی میں ہے، جو کہ انسانی بدن کا حساس ترین تہل
شمار ہوتا ہے۔ یہ لشکر حق کے غالب ہونے کی ایک عمدہ تعبیر ہے۔ آنکھوں سے دکھائی دینے والا قطعی اور ظاہر بظاہر غلبہ۔

"اذا" کی تعبیر یہ نشاندہی کرتی ہے کہ ایسی جگہ بھی کہ جہاں یہ توقع ہی نہ ہو کہ حق کامیاب ہوگا، وہاں ہم ایسا انجام دیتے ہیں۔
"زاهق" کی تعبیر اُس چیز کے معنی میں ہے کہ جو کلی طور پر مضمحل ہو جائے نیز اس مقصد کے لیے یہ بھی ایک تائید ہے۔

اور یہ بات کہ "نقذف" اور "یدمغه" کے الفاظ فعل مضارع کی شکل میں کیوں آئے ہیں۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ
یہ اس عمل کے استمرار، تسلسل اور ہمیشگی کی دلیل ہے۔

ایک نکتہ:

مقصد خلقت: مادی بین خلقت کے بارے میں کسی حدف و مقصد کے قائل نہیں ہیں۔ کیونکہ وہ بے عقل دشعروا
بے حدف و مقصد طبیعت کو مبدأ خلقت سمجھتے ہیں۔ لہذا وہ پوری ہستی کے بے فائدہ اور فضول ہونے کے داعی ہیں۔ ان کے برعکس
فلاسفہ الہی اور ادیان آسمانی کے پیروکار سب کے سب آفرینش و خلقت کے لیے ایک اعلیٰ مقصد کا عقیدہ رکھتے ہیں کیونکہ عالم اور
قادر حکیم مبداء سے یہ امر محال ہے کہ وہ کوئی کام بغیر حدف و مقصد کے انجام دے۔

اب یہ سوال سنانے آتا ہے کہ یہ حدف و مقصد کیا ہے؟
بعض اوقات ہم خدا کا اپنے اُپر قیاس کرتے ہوئے اس توہم میں گرفتار ہو جاتے ہیں کہ شاید خدا میں کوئی کمی تھی کہ عالم ہستی کی
خلقت سے، کہ جس میں سے ایک انسان بھی ہے، اس کی تلافی کرنا چاہتا تھا۔

کیا وہ ہماری عبادت و پرستش کا محتاج ہے؟ کیا وہ یہ چاہتا تھا کہ پہچانا جائے، اس لیے اس نے مخلوق کو پیدا کیا ہے،
تاکہ وہ پہچانا جائے اور اس کی شناخت ہو؟!

لیکن جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہ ایک عظیم اشتباہ ہے کہ جو "خدا" کے "خلق" پر قیاس کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ جبکہ
صفات خدا کی شناخت اور معرفت کی بحث میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی غلط قسم کا قیاس ہے۔ لہذا اس بحث میں پہلی بنیاد یہ ہے
کہ ہم یہ جانیں کہ وہ کسی چیز میں ہم سے مشابہت نہیں رکھتا۔

ہم ہر نظر سے ایک محدود وجود ہیں اور اسی وجہ سے ہماری تمام کوششیں اپنی خامیوں اور نقائص کو دور کرنے کے لیے ہوتی ہیں۔
ہم تعلیم حاصل کرتے ہیں تاکہ پڑھے لکھے ہو جائیں اور ہماری علم کی کمی دور ہو جائے۔ کاہنہ ہمارے لیے جلتے ہیں تاکہ فقر و فاقہ اور ناداری کا

مقابلہ کر سکیں۔ فوج اور قوت مہیا کرتے ہیں تاکہ دشمن سے مقابلہ کرنے کے لیے اپنی قدرت و طاقت کی کمی کی تلافی کریں۔ یہ معنوی مسائل اور تہذیب نفس اور مقامات روحانی کی سیر بھی، غامضوں اور نقائص کو دور کرنے کی ہی کوششیں ہیں۔ لیکن کیا وہ ہستی جو ہر لحاظ سے غیر محدود ہے، جس کا علم و قدرت اور قوتیں بے انتہا ہیں، اور کسی لحاظ سے بھی جس میں کمی نہیں ہے کیا یہ بات اس کے لیے کتنا معقول ہے کہ وہ کوئی کام اپنی ہی کو دور کرنے کے لیے کرے؟ اس تجزیے سے یہ نتیجہ نکلا کہ ایک طرف تو آفرینش و خلقت بے حد و مقصد نہیں ہے اور دوسری طرف سے یہ حدود مقصد آفرینہ کار و خالق سے متعلق نہیں ہے۔

تو اب آسانی کے ساتھ یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ حتمی اور بلاشبہ یہ حریف و مقصد ایسی چیز ہے کہ جو خود ہمارے ہی متعلق رکھتی ہے۔ اس تمہید پر توجہ کرتے ہوئے یہ معلوم کیا جاسکتا ہے کہ غرض خلقت ہمارے ہی تکامل و ارتقاء اور بندگی کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے۔ دوسرے نظروں میں عالم ہستی ایک ایسی لڑ پڑی ہے کہ جو ہمارے علم کی تکمیل کے لیے بنائی گئی ہے۔ تربیت کے لحاظ سے ایک ایسی لڑ پڑی ہے کہ جو ہمارے نفوس کی تہذیب کے لیے ہے۔ معنوی و مادیات کو کسب کرنے کے لیے یہ ایک تجارت خانہ ہے۔ انسان کی طرح کی ضروریات کی پیدائش کے لیے ایک زرخیز زمین ہے۔ ہاں !

الدنيا مزرعة الآخرة - - - الدنيا دار صدق لمن صدقها و دار غنى لمن تزود منها و دار موعظة لمن انعط منها۔
دنیا آخرت کی کھیتی ہے، دنیا پھائی کا گھر ہے جو اس سے بچ بولے، تو گری کا گھر ہے جو اس سے زاوراہ اور توشہ آخرت حاصل کرے اور وعظ و نصیحت کا گھر ہے جو اس سے نصیحت حاصل کرے۔

یہ قافلہ عالم عدم سے چلا ہے اور سلسل لا متناہی منزل کی طرف بڑھا چلا جا رہا ہے۔ قرآن مجید مختصر اور بہت معنی خیز اشارات کے ذریعہ مختلف آیات میں، ایک طرف تو خلقت و آفرینش میں حریف و مقصد کے اصل وجود کی طرف اشارہ کرتا ہے اور دوسری طرف اس حریف و مقصد کو شخص بھی کر رہا ہے۔ پہلے حصے میں کہتا ہے:

ایحسب الانسان ان یترک سدى
کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ وہ مہل پیدا کیا گیا ہے، اور فضول چھوڑ دیا جائے گا۔ (نجات - ۳۶)
افحسبتم انما خلقکم عبثا و انکم الینسا لاترجعون

لہ نوح البلاغہ علامات قصار ۱۲۱

کیا تم نے یہ خیال کر لیا ہے کہ ہم نے تمہیں عبث اور فضول پیدا کیا ہے، اور تم ہماری طرف لوٹ کر نہ آؤ گے۔ (مؤمن - ۸۵)

وما خلقتنا السموات الارض وما بینہما باطلا ذالک ظن الذین کفروا
ہم نے آسمان و زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے۔ باطل اور فضول پیدا نہیں کیا ہے، یہ تو کافروں کا گمان ہے۔ (ص - ۲۷)

اور دوسرے حصے میں کہتی تو آیات قرآن میں آفرینش کا حریف و مقصد خدا کی عبودیت اور بندگی کو قرار دیتا ہے،
وما خلقت الجن والانس الا لعیبدون

میں نے جن و انس کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔ (اذاریات - ۵۶)

یہ بات واضح ہے کہ عبادت انسان کی مختلف جہات سے تربیت کا ایک مکتب ہے۔ عبادت کا وسیع معنی ہے، فرمان خدا کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا، اس لحاظ سے عبادت انسان کی روح کو گونا گوں مراحل میں تکامل و ارتقاء بخشتی ہے۔ اس کی تفصیل ہم عبادات سے مربوط مختلف آیات کے ذیل میں بیان کر چکے ہیں۔

اور کبھی کہتا ہے: خلقت کا حریف و مقصد آگاہی و بیداری اور ہمارے ایمان و اعتقاد کی تقویت ہے،

اللہ الذی خلق سبع سموات ومن الارض مثلهن یتنزل الامر بینہن
لتعلموا ان اللہ عنی کل شیء عاقدیر

خدا وہی تو ہے کہ جس نے سات آسمان اور انہی کے مانند زمینیں پیدا کی ہیں، اس کا حکم ان میں جاری و ساری ہے۔ یہ سب کچھ اس لیے تھا تاکہ تم جان لو کہ خدا ہر چیز پر قادر ہے۔ (طہ - ۱۲)
اور کبھی کہتا ہے کہ خلقت کا مقصد ہمارے حسن عمل کی آزمائش ہے:

الذی خلق الموت والحیوة لیلوکم ایکم احسن عملا

خدا وہی تو ہے کہ جس نے موت و حیات کو پیدا کیا ہے تاکہ تمہیں حسن عمل کے میدان میں آزمائے اور تمہاری تربیت کرے۔ (کہ - ۲)

مندرجہ بالا تینوں آیات میں سے ہر ایک انسانی وجود کی کسی ایک ہمت (آگاہی و ایمان، اخلاق اور عمل) کی طرف اشارہ کرتی ہے اور ہر ایک خلقت کے کمالی و ارتقائی مقصد کو بیان کرتی ہے کہ جس کی بازگشت خود انسان کی طرف ہے۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ چونکہ لفظ "تکامل" آیات قرآن میں ان مباحث میں بیان نہیں ہوا ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ ایک وارداتی فکر ہو۔ لیکن اس اعتراض کا جواب واضح ہے کہ یہ ہم خاص الفاظ کی قید میں پابند نہیں ہیں اور مندرجہ بالا آیات میں تکامل کے معادین اچھی طرح روشن ہیں۔ کیا علم و آگاہی اس کا واضح مصداق نہیں ہے اور اسی طرح عبودیت اور حسن عمل بھی۔

سورہ محمد کی آیت ۱۷ میں بیان ہوا ہے:

والذین امتدوا زادهم هدی۔

وہ لوگ کہ جہ راہ ہدایت پر آگئے، خدا ان کی ہدایت میں اضافہ کر دیتا ہے۔

کیا اضافہ کی تعبیر تکامل و ارتقاء کے علاوہ کوئی اور چیز ہے؟

ہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر حدف و مقصد تکامل و ارتقاء ہی تھا تو پھر خدا نے انسان کو ابتدا میں ہی مکمل بنا دیا تو کیا اس میں کمال پیدا کر دیا تاکہ تکامل کے مراحل کو طے کرنے کی ضرورت ہی باقی نہ رہتی؟

اس اعتراض کی بنیاد اس نکتے سے غفلت ہے کہ تکامل کی اصلی شاخ - تکامل اختیاری ہے۔ دوسرے لفظوں میں تکامل انسان راستہ اپنے پاؤں اور اپنے ارادہ و اختیار سے طے کرے۔ اگر اس کا ہاتھ پیر کو زبردستی آگے لے جایا جائے تو یہ نہ باعث فتنہ نہ ہی تکامل و ارتقاء۔ مثلاً اگر انسان ایک روپیہ اپنی خواہش اور ارادہ و اختیار کے ساتھ خرچ کرے تو اس نے اسی نسبت سے اپنی راہ طے کی ہے۔ جبکہ اگر اس کی دولت میں سے لاکھوں روپے جبراً چھین کر خرچ کر دیئے جائیں تو اس نے ایک قدم بھی اس میں آگے نہیں بڑھایا ہے۔ لہذا قرآن مجید کی مختلف آیات میں یہ حقیقت کھل کر بیان کی گئی ہے کہ اگر خدا چاہتا تو تمام لوگ جبری طور پر ایمان لے آتے، لیکن اس ایمان کا ان کے لیے کوئی فائدہ نہ ہوتا:

ولو شاء ربك لآمن من في الارض كلهم جميعا (نہض - ۱۹)

۱۹۔ وَلَهُ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَنْ عِنْدَهُ لَا يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِهِ وَلَا يَسْتَحْسِرُونَ ۝

۲۰۔ يُسَبِّحُونَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُونَ ۝

۲۱۔ أَمْ اتَّخَذُوا إِلَهًا مِنَ الْأَرْضِ هُوَ يُنْشِرُونَ ۝

۲۲۔ لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا فَسُبْحَانَ اللَّهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُونَ ۝

۲۳۔ لَا يُسْأَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُوَ يُسْأَلُ ۝

۲۴۔ أَمْ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِهِ إِلَهًا قُلْ مَا لَوْ أَنَّهُمْ عَلَّمُوا بَرِّهَانَكُمْ ۝

۲۵۔ هَذَا ذِكْرٌ مِنْ مَعِيَ وَذِكْرٌ مِنْ قَبْلِي بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا

يَعْلَمُونَ الْحَقَّ فَهُمْ مُعْرِضُونَ ۝
وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا نُوحِيَ إِلَيْهِ أَنَّهُ
لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُونِ ۝

ترجمہ

۱۔ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اُسی کا ہے اور جو اُس کے پاس ہیں وہ کبھی اس کی عبادت پر گھمنڈ نہیں کرتے اور نہ ہی ٹھکتے ہیں۔

۲۔ رات دن تسبیح میں لگے رہتے ہیں اور کوردی اور کابلی نہیں دکھاتے۔

۳۔ کیا انہوں نے ایسے زمینی خدا بنالیے ہیں کہ جو پیدا کر کے انہیں پھیلانے ہوں۔

۴۔ اگر آسمان و زمین میں خدا کے سوا اور کوئی خدا ہوتے، تو ان دونوں کا نظام بگڑ جاتا۔ (اور دنیا کا نظام درہم برہم ہو جاتا)۔ یہ لوگ جو توصیعات بیان کر رہے ہیں، عرش کا پروردگار اللہ ان تمام باتوں سے منزہ اور پاک ہے۔

۵۔ کوئی شخص اُس کے کام پر اعتراض نہیں کر سکتا جبکہ ان کے کاموں پر اعتراض ہو سکتا ہے۔

۶۔ کیا انہوں نے خدا کو چھوڑ کر اور معبود اختیار کر لیے ہیں۔ تم کہہ دو کہ اپنی دلیل لاؤ، یہ تو میری اور ان (پیغمبروں) کی بات ہے کہ جو مجھ سے پہلے تھے لیکن ان میں سے اکثر حق کو نہیں سمجھتے اسی وجہ سے وہ اس سے ڈر کر دان ہو جاتے ہیں۔

۷۔ ہم نے تجھ سے پہلے کوئی بھی پیغمبر ایسا نہیں بھیجا جس کی طرف ہم نے یہ وحی نہ کی ہو کہ میرے سوا اور کوئی معبود نہیں۔

۸۔ لہذا میری ہی عبادت کرو۔

تفسیر

شُرک خیال آرائی سے شروع ہوتا ہے،

گردشتہ آیات میں اس حقیقت کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی کہ عالم ہستی بغیر حدف و مقصد کے نہیں ہے، نہ مطلق اور مکمل تماشہ ہے اور نہ ہی لہو و لعب۔ بلکہ یہ انسانوں کے لیے ایک چٹا کلا حدف کمال رکھتا ہے۔

ممکن ہے یہ تو ہم پیدا ہو کر خدا کو ہمارے ایمان اور عبادت کی کیا ضرورت ہے لہذا زیر بحث آیات پہلے اسی بات کا جواب دیتی ہیں اور کہتی ہیں: تمام (ذوی العقول) جو آسمانوں اور زمین میں ہیں، اسی کی ملکیت ہیں: (ولہ من فی السماوات

والارض)۔

وہ تمام معبود کہ جنہیں تم خدا کے سوا پکارتے ہو وہ تو اتنی بھی قدرت نہیں رکھتے کہ ایک بھی خلق کر سکیں، چاہے وہ سب کے سب اس کے لیے لکھے ہی کیوں نہ ہو جائیں، اس حال میں وہ کیسے لائق عبادت ہو سکتے ہیں۔

”اللہ من الارض“ (زمین میں سے کچھ خدا) کی تعبیر بتوں اور ان معبودوں کی طرف اشارہ ہے کہ جنہیں لوگ پتھر اور لکڑی وغیرہ بناتے تھے اور انہیں آسمانوں پر حاکم خیال کرتے تھے۔

بعد والی آیت مشرکین کے بہت سے معبودوں اور خداؤں کی نفی کے لیے ایک نہایت روشن دلیل کو اس طرح سے بیان کرتی ہے: میں وہ زمین میں اللہ کے سوا اور بھی کوئی معبود اور خدا ہوتا، تو دونوں کا نظام بگڑ جاتا۔ اور نظام جہاں درہم برہم ہو جاتا (لو کان ہما اللہ الا اللہ لفسد تا)۔

”عرش کا پروردگار خدا اس توصیف سے کہ جو وہ کرتے ہیں منزہ اور پاک ہے“ (فسبحان اللہ رب العرش عما یسفون)۔

یہ ناروا نسبتیں اور یہ بنادنی خدا اور خیالی معبود اولیاء و خیالات سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے اور اس کی پاک ذات کی کبریائی کا کسی ان ناروا نسبتوں سے آلودہ نہیں ہو سکتا۔

دلیل تمنع :

وہ دلیل، جو مذکورہ بالا آیت میں توحید کے اثبات اور کئی معبودوں کی نفی کے بارے میں بیان کی گئی ہے، سادہ، آسان، روشن اور واضح ہونے کے باوجود اس سلسلے کی دقیق فلسفی دلیلوں میں سے ایک ہے کہ جسے علما ”برہان تمنع“ کے عنوان سے یاد کرتے ہیں۔ اس دلیل کا خلاصہ اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے :

ہم بلا شک و شبہ اس جہان میں ایک نظام واحد کو حکم فرما دیکھ رہے ہیں، ایسا نظام کہ جو تمام جہات سے ہم آہنگ ہے۔ اس کے قوانین ثابت اور آسان و زمین میں جاری ہیں۔ اس کے ہر گرام آپس میں منطبق اور اس کے اجزاء متناسب ہیں۔

قائمین کی یہ ہم آہنگی اور نظام آفرینش اس بات کی ترجمانی کرتے ہیں کہ ان سب کا سرچشمہ ایک ہی مبدأ ہے کیونکہ اگر متعدد مبادی ہوتے اور اس میں متعدد ارادے کار فرما ہوتے تو یہ ہم آہنگی ہرگز موجود نہ ہوتی اور وہی چیز کہ جسے قرآن ”فساد“ سے تعبیر کرتا ہے دنیا میں صاف طور پر نظر آتی۔

اگر ہم کچھ تحقیق اور مطالعہ کرنے والے ہوں تو کسی ایک کتاب کے مطالعہ سے اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ اسے ایک شخص نے لکھا ہے یا چند افراد نے۔

وہ کتاب جو ایک شخص کی تالیف ہو اس کی عبارات میں ایک خاص نظم اور ہم آہنگی، جملہ بندی، مختلف تعبیرات، کنایات و کنایات، عنوانات و شکات، مباحث کی طرز، خلاصہ یہ کہ اس کے تمام حصے بالکل ہم آہنگ ہوں گے۔ چونکہ وہ ایک عکس تخلیق

”اور وہ فرشتے کہ جو مقرران بارگاہ الہی ہیں، کبھی بھی اس کی عبادت پر متغیر نہیں کرتے اور نہ کبھی ٹھکتے ہیں“ (ومن عندہ یتکبرون عن عبادتہ ولا یتحسرون)۔

وہ ہمیشہ رات دن تسبیح میں لگے رہتے ہیں اور معمولی کمزوری اور کالی بھی وہ اپنے پاس نہیں آنے دیتے۔ (یسبحون والنہار لا یفترون)۔

ان حالات میں اُسے تمہاری اطاعت و عبادت کی کیا ضرورت ہے۔ یہ سب عظیم فرشتے شب و روز اس کی تسبیح میں مصروف ہیں۔ لہذا اگر اُس نے تمہیں ایمان حاصل، بندگی اور عبودیت کا حکم دیا تو اس کا فائدہ تمہارے ہی لیے ہے۔

یہ نکتہ بھی خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ ظاہری غلامی کے نظام میں غلام جتنا آقا سے نزدیک ہوگا، اتنا ہی اس کا حضور کم چلا جائے گا کیونکہ وہ اب آقا کا خاص ہو گیا ہے اور اسے اس کی زیادہ ضرورت ہے۔

لیکن ”خلق“ اور ”خالق“ کے نظام عبودیت میں معاملہ برعکس ہے۔ فرشتے اور اولیاء خدا جتنا خدا سے زیادہ نزدیک ہوتے ہیں ان کا مقام عبودیت بڑھتا جاتا ہے۔

جب گزشتہ آیات میں عالم ہستی کے فضول اور بے مقصد ہونے کی نفی ہو چکی اور یہ ثابت ہو گیا کہ یہ عالم ایک مقدس مقصد کے لیے پیدا کیا گیا ہے، تو اس کے بعد زیر بحث آیات میں اس جہان کے مدبر و مدیر اور وحدت معبود کا مسک شروع کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ کیا انہوں نے زمین پر کچھ خدا بنالیے ہیں، ایسے خدا کہ جو موجودات کو تخلیق و حیات عطا کریں۔ اور جہاں ہستی میں انہیں پھیلا سکیں، (ام اتخذوا اللہ من الارض هو ینشرون)۔

یہ جملہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ معبود ہی ہونا چاہیے کہ جو خالق ہو۔ خاص طور پر حیات کا خالق کیونکہ حیات خلقت کے روشن ترین چہرہ میں سے ہے۔ یہ حقیقت میں اسی چیز کے مشابہ ہے کہ جو سورہ حج کی آیہ ۳ میں بیان ہوئی ہے :

ان الذین تدعون من دون اللہ لن یخلقوا ذبابا ولو اجتمعوا لہ

”یستحسرون“ ”حشر“ کے مادہ سے اصل میں پوشیدہ چیز کو کھولنے اور جس میں وہ تھی اُسے الگ کر دینے کے معنی میں ہے۔ یہ لفظ بعد از ان غلگی، تکان اور ضعف کے معنی میں بولا جائے گا۔ گویا اس حالت میں انسان کی سب توہیں آشکار اور خراج ہو جائی ہیں اور ان سے کوئی چیز اس کے بدن میں چھپی ہوئی نہیں رہتی۔

المیزان، زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

”ینشرون“ ”مادہ“ ”نشر“ سے پیچیدہ چیزوں کو پھیلانے کے معنی میں ہے اور زمین و آسمان کی وسعت میں مخلوقات کو پیدا کرنے اور پھیلانے کے لیے بھی کتاہ کے طور پر بولا جاتا ہے۔ بعض مفسرین کا اس بات پر اصرار ہے کہ یہ لفظ ”معاذ“ اور مردوں کے دوبارہ زندہ ہو کر اٹھ کھڑا ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ حالانکہ بعد والی آیات کی طرف توجہ کرتے ہوئے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ گفتگو خدا کی پاک ذات کی توحید اور معبود حقیقی کے بارے میں ہے۔

مذکر معاذ اور موت کے بعد کی زندگی کے متعلق۔

اور ایک قلم کی تحریر ہے۔

لیکن اگر دو یا چند افراد۔ چاہے وہ سب عالم و دانشمند ہوں اور انھیں ایک ساتھ کام کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں اُس کے ایک حصہ کی تالیف اپنے ذمہ لے تو اس کی عبارات و الفاظ کی گہرائیوں میں اور بحثوں کی طرز میں فرق نمایاں ہوگا۔ اس کی وجہ بھی واضح ہے کیونکہ دو نفر چاہے کتنے ہی ہم فکر اور ہم سلیقہ ہوں، پھر بھی وہ دو نفر ہیں۔ اگر ان کی ہر چیز ایک دوسرے کی طرح ہو جائے۔ اس بنا پر قطعی اور یقینی طور پر ان میں فرق ہونا چاہیے تاکہ وہ دو نفر ہو سکیں اور یہ فرق آخر کار ان کی تحریروں میں مرتب کرے گا۔

اب یہ کتاب چاہے کتنی ہی بڑی اور مفصل ہو اور نوزع موضوعات کے بارے میں بحث کرتی ہو، یہ ناہم آہنگی محسوس ہو جائے گی۔

عالم آفرینش کی عظیم کتاب۔ کہ جس کی عظمت اس قدر ہے کہ ہم اپنے پورے وجود کے ساتھ اُس کی عبارات کے اندر گم ہو جائیں۔ اس پر بھی یہ قانون جاری ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ ہم اپنی ساری عمریں بھی اس تمام کتاب کا مطالعہ نہیں کر سکتے لیکن اتنی ہی مقدار کہ جس کے مطالعہ کی ہم دنیا کے تمام علماء کو توفیق ہوئی ہے، اس میں ایسی ہم آہنگی پائی جاتی ہے کہ جو اس کے سوانح کی وحدت کی بخوبی حکایت کرتی ہے ہم اس عجیب کتاب کی جتنی بھی درجہ گردانی کرتے ہیں، ہر جگہ ایک عالمی نظام، نظم و ضبط اور ناقابل توصیف ہم آہنگی اس کے طور اور صفحات میں نمایاں ہے۔

اگر اس جہان اور اس کے نظام کو چلانے میں کئی ارادے اور متعدد مبداء کا دخل ہوتا تو اس ہم آہنگی کا پیدا ہونا ممکن نہیں ہوتا۔ اتفاقاً سے متعلق علم رکھنے والے خدائی جہازوں کو کامل باریک بینی کے ساتھ فضا میں کیونکر بھیج دیتے ہیں اور چاند کا ڈھلوان اسی جگہ آتا رہیتے ہیں کہ جس کا سائنسی اعتبار سے یقین کیا گیا ہو اور پھر انہیں مقرر شدہ مقام پر زمین کی طرف نیچے لے آتے ہیں۔ کیا یہ حساب کتاب کی باریکی اس بنا پر نہیں ہے کہ پورے عالم ہستی پر جو نظام حاکم ہے۔ وہ دقیق، منظم اور ہم آہنگ ہے۔ اگر اس میں ذرہ برابر بھی ناہم آہنگی (زمنے کے لحاظ سے ایک سیکنڈ کا سواں حصہ بھی) ہوتی تو ان کے تمام اندازے درجہ بدرجہ ہو جائے۔ مختصر یہ کہ اگر دو یا چند افراد اسے عالم پر حاکم ہوتے تو ہر ایک کا الگ تقاضا ہوتا اور ہر ایک دوسرے کے اثر کو ختم کر دیتا۔ آخر کار سارے عالم کا نظام بگڑ کر رہ جاتا۔

ایک سوال اور اس کا جواب :

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ جس کا جواب گزشتہ توضیحات سے معلوم کیا جاسکتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جہان میں خدا تعالیٰ اس صورت میں مروجہ فساد ہے جبکہ وہ ایک دوسرے کے مقابلے کے لیے آئے ہوئے ہوں لیکن اگر ہم اس بات کو قبول کر لیں (خدا) حکیم اور آگاہ ہیں تو حقیقی طور پر ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے ہوئے عالم ہستی کا نظام چلا سکیں گے۔ اس سوال کا جواب زیادہ پیچیدہ نہیں ہے۔ ان کا حکیم و دانا ہونا ان کے تعدد کو ختم نہیں کرتا۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ وہ متعدد

اس کا منہم یہ ہے کہ وہ ہر لحاظ سے ایک نہیں ہیں کیونکہ اگر وہ تمام جہات ایک دوسرے کا ایک خدا ہو جائیں گے۔ اس بنا پر جہاں تعدد ہے۔ وہاں حتیٰ طور پر تفاوت اور اختلافات موجود ہوں گے کہ جو چاہئے اور نہ چاہئے اس صورت میں ارادہ و عمل پر اثر انداز ہوں گے اور جہاں ہستی کو حرج و مرج اور بگاڑ کی طرف کھینچ کر لے جائیں گے (غور کیجئے گا)۔ اس برہان متنازعہ و دوسری صورتوں میں بھی بیان کیا گیا ہے کہ جو ہماری بحث کی حدود سے باہر ہے اور جو کچھ ہم نے سطور بالا میں بیان کیا ہے بہتر ہے۔

ان استدلالات میں سے بعض میں کہا گیا ہے کہ اگر دو ارادے عالم خلقت میں حکم فرما ہوتے، تو اصل کوئی جہان وجود میں ہی نہ آتا۔ جبکہ اوپر والی آیت جہان کے فساد اور نظام میں خلل پڑنے سے متعلق گفتگو کر رہی ہے نہ کہ جہان کے موجود نہ ہونے کے بارے میں (غور کیجئے گا)۔

یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ اُس حدیث میں کہ جو ہشام بن حکم نے امام صادق علیہ السلام نے نقل کی اس طرح بیان ہوا ہے کہ امام نے ایک بے ایمان شخص کے جواب میں کہ جو خدا کے تعدد کے بارے میں بات کر رہا تھا فرمایا :

یہ دو خدا جو تو کہتا ہے یا تو دونوں قدیم و ازلی اور طاقتور ہیں، یا دونوں ضعیف و ناتواں ہیں یا ان میں سے ایک قوی ہے اور دوسرا ضعیف و کمزور ہے۔ اگر دونوں قوی ہوں تو پھر ان میں سے ہر ایک دوسرے کو ہٹا سکیں نہیں دیتا اور عالم کی تذبذب کیلئے ہی اپنے ہاتھ میں کیوں نہیں لے لیتا اور اگر تیرا گمان یہ ہے کہ ان میں سے ایک قوی ہے اور دوسرا ضعیف تو تو نے خدا کی توحید کو قبول کر لیا ہے کیونکہ دوسرا ضعیف کمزور ہے لہذا وہ خدا نہیں ہے۔

اور اگر تو یہ کہے کہ وہ دونوں متعادل دو حالت سے خالی نہیں ہے یا تو وہ تمام جہات سے متعلق ہیں یا مختلف ہیں لیکن جبکہ ہم نظام خلقت کو منظم دیکھ رہے ہیں۔ آسمان کے ستارے اپنے اپنے مخصوص راستوں پر چل رہے ہیں، رات اور دن ایک خاص نظم و ضبط کے ساتھ ایک دوسرے کے بعد آتے ہیں اور سورج اور چاند ہر ایک اپنا ایک خاص نظام رکھتا ہے۔ تدبیر جہان کی یہ ہم آہنگی اور اس کے اسرار کا نظم و ضبط اس بات کی دلیل ہے کہ مدبر عالم ایک ہے۔

اس سے قطع نظر، اگر تیرا پھر بھی یہی دعویٰ ہو کہ خدا دو ہیں تو لازمی طور پر ان کے درمیان کوئی فاصلہ (یا کسی قسم کا امتیاز) ہونا چاہیے تاکہ ان کے درمیان دوئی مانی جاسکے۔ تو یہاں یہ فاصلہ (امتیاز) خود ایک تیسرا موجود ازلی ہو جائے گا اور اس طرح خدا تین ہو جائیں گے اور اگر تم یہ کہو گے کہ وہ تین میں تو پھر ان کے درمیان دو فاصلے (امتیاز) ہونے چاہئیں۔ تو اس صورت میں تو پانچ قدیم و ازلی وجودوں کا قائل ہو جائے گا اور اس طرح سے یہ تعدد بڑھتی ہی چلی جائے گی، جس کی کوئی حد اور انتہا نہ ہوگی۔

اس حدیث کی ابتدا میں برہان تمانع کی طرف اشارہ ہے اور اس کے بعد ایک اور دلیل کی طرف اشارہ ہے کہ جسے "برہان خرجہ" یا "مابہ الاشتراك ومابہ الامتياز" کا فرق کہتے ہیں۔ ایک اور حدیث میں بیان ہوا ہے کہ حشام بن حکم نے امام صادق علیہ السلام سے پوچھا :
مال الدلیل علی ان اللہ واحد ؟ قال : اتصال التدبیر وتمام الصنع ، کما قال اللہ عزوجل : لو کان فیہما الہة الا اللہ لفسدتا
خدا کے ایک ہونے کی کیا دلیل ہے ؟ تو آپ نے فرمایا : تدبیر جہان میں نظم و ضبط اور ہم آہنگی اور خلقت کا ہر طرح سے کامل ہونا ، جیسا کہ خدا فرماتا ہے : لو کان فیہما الہة الا اللہ لفسدتا (اگر آسمان و زمین میں اللہ کے علاوہ اور بھی خدا ہوتے تو نظام جہان بگڑ جاتا)۔

جب اس استدلال سے کہ جو آیت میں بیان ہوا ہے ، عالم کے مدبر اور اسے چلانے والے کی توحید ثابت ہوگئی تو اس بعد والی آیت میں فرمایا گیا ہے : اُس نے اس طرح سے حکیمانہ طور پر جہان کو نظام بخشا ہے کہ کسی قسم کے اعتراض و گفتگو کی اس میں گنجائش ہی نہیں ہے۔ کوئی شخص اس کے کام پر تنقید نہیں کر سکتا اور نہ ہی کوئی (اعتراض کے طور پر) اس سے سوال کر سکتا ہے بلکہ دوسرے اس طرح نہیں ہیں۔ ان کے افعال و کردار میں بہت سے اعتراضات اور سوالوں کی گنجائش ہے۔ (لا یستل عما یفعل وہو یستلون)۔

اگرچہ اس آیت کی تفسیر میں مغربین نے بہت کچھ کہا ہے لیکن جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے وہ سب سے زیادہ صحیح دکھائی دیتا ہے اس کی وضاحت یہ ہے کہ ہم دوسرے کے سوال کرتے ہیں۔ سوال کی ایک قسم تو وہ ہے جسے توضیحی سوال کہتے ہیں کیونکہ انسانی کچھ مسائل سے بے خبر ہوتا ہے اور وہ یہ چاہتا ہے کہ ان کی حقیقت معلوم کرے۔ یہاں تک کہ اس بات کا علم اور ایمان ہوتے کے باوجود کہ جو کام انجام پایا ہے وہ ایک صحیح کام ہے۔ پھر بھی وہ اس کے اصلی هدف کو جاننا چاہتا ہے ، اس قسم کے سوالات خدا کے افعال کے بارے میں بھی جائز ہیں۔ بلکہ یہ وہی سوال ہے کہ جو علمی مسائل اور جہان خلقت میں تحقیق و جستجو کا سرچشمہ شمار ہوتا ہے اور اس قسم کے سوالات چاہے عالم سکون سے تعلق رکھتے ہوں یا تشریح سے ، پیغمبر اکرمؐ اور آئمہؑ کے اصحاب نے اکثر کیے ہیں۔

باقی رہی سوال کی دوسری قسم ، وہ اعتراضی سوال ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ انجام دیا گیا فعل نادرست اور غلط تھا۔ مثلاً ہم اُس شخص سے کہ جس نے اپنے عہد و پیمان کو بغیر کسی دلیل کے توڑ دیا ہو ، یہ کہتے ہیں کہ تو عہد شکن کیوں کرتا ہے ؟ اس سے ہمارا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ ہم اُس سے وضاحت طلب کر رہے ہیں بلکہ ہمارا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہم اس پر اعتراض کریں۔

مسئلہ طور پر خداوند حکیم کے افعال پر اس قسم کے اعتراضات کوئی معنی نہیں رکھتے اور اگر کبھی کسی سے سرزد ہو جائیں تو حتیٰ طور پر وہ نا اگاہی اور جہالت کی وجہ سے ہوتے ہیں لیکن دوسروں کے افعال میں اس قسم کے سوالات کی بہت گنجائش ہوتی ہے۔

یہ حدیث میں امام باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ اس آیت کے بارے میں جابر جعفی کے سوال کے جواب میں آپؑ فرمایا :

لانہ لا یفعل الا ما کان حکمة وصوابا
اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ کوئی کام انجام نہیں دیتا مگر یہ کہ اس میں حکمت ہوتی ہے اور وہ بالکل صحیح اور درست ہوتا ہے۔

معنی طور پر اس گفتگو سے یہ نتیجہ واضح طور پر نکالا جاسکتا ہے کہ اگر کوئی شخص دوسری قسم کا سوال کرتا ہے تو یہ اس بات کی دلیل بھی اُس نے خدا کو اچھی طرح سے پہچانا نہیں ہے اور اس کے حکیم ہونے کے بارے میں آگاہ نہیں ہے۔ بعد والی آیت فنی شرک کے سلسلے میں دوسری دلیلوں پر مشتمل ہے۔ گزشتہ دلیل سے مل کر یہ مجموعہ تین دلیلیں ہو جائیگی۔ پہلے فرمایا گیا ہے : کیا انہوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے لیے کچھ اور معبود منتخب کر لیے ہیں ؟ تم کہہ دو کہ تم اپنی دلیل پیش کرو :
ام اتخذوا من دونہ الہة قل ہاتوا برہانکم۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر گزشتہ دلیل سے کہ جس کی بنیاد یہ تھی کہ عالم ہستی کا نظام توحید کی دلیل ہے ، صرف نظر کر لو کہ کم از کم شرک اہل ان خلاق کی الوہیت ثابت کرنے کے لیے تو کوئی بھی دلیل موجود نہیں ہے۔ تو پھر عاقل انسان ایسی بات بغیر دلیل کے کیسے قبول کرتا ہے ؟

اس کے بعد آخری دلیل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ یہ صرف میں اور میرے ہمراہی ہی نہیں کہ جو توحید کی بات کرتے ہیں بلکہ تمام گزشتہ انبیاء اور سب ایمان لانے والے موعود ہی تھے (ہذا ذکروا من قبل)۔ یہ وہی دلیل ہے کہ جسے علماء عقائد نے خدا کی وحدانیت کے مسئلہ پر انبیاء کے اجماع و اتفاق کے عنوان کے ماتحت بیان کیا ہے۔

ممکن ہے کہ کبھی نبوت پرستوں کی کثرت۔ بعض لوگوں کے لیے توحید قبول کرنے میں مانع ہو ، خصوصاً ان حالات میں جیسے قبل ہجرت مکہ میں مسلمانوں کو درپیش تھے اور جن کی طرف سورہ انبیاء اشارہ کر رہی ہے۔ لہذا قرآن مزید کہتا ہے : لیکن اُن میں سے اکثر جن کو نہیں جانتے اس لیے انہوں نے اس سے منہ پھیر لیا ہے : (بل اکثرہم لا یعلمون الحق فہو معروضون)۔ بہت سے معاشروں میں نادان اکثریت کی مخالفت کرنا ہمیشہ بے خبر لوگوں کے لیے زنگوردانی کے مترادف قرار دی جاتی رہی ہے اور قرآن نے بہت سی سچی اور مدنی آیات میں اس اکثریت کے طرز عمل کو نیا د بنانے کی شدت کے ساتھ مذمت کی ہے اور اس کی نظر میں اس بات کی کوئی اہمیت نہیں ہے بلکہ وہ دلیل و منطق کو ہی حیار سمجھتا ہے۔

لیکن ہے کہ بعض بے خبر یہ کہنے لگیں کہ ہمارے سامنے عیسائی جیسے انبیاء بھی ہیں جنہوں نے متعدد خدائوں کی طرف دعوت دی ہے ، تو قرآن آخری زیر بحث آیت میں کہتا ہے : ہم نے تجھ سے پہلے کوئی پیغمبر ایسا نہیں بھیجا کہ جس کے پاس یہ وحی نہ آئی ہو کہ میرے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے ، لہذا میری ہی عبادت کرو : (وما ارسلنا من قبلك من رسول الا نوحي اليہ انه لا الہ الا انا فاعبدون)۔

اس طرح سے یہ ثابت ہو گیا کہ نہ عیسیٰ نے اور نہ ہی ان کے علاوہ کسی اور پیغمبر نے کبھی شرک کی دعوت دی تھی اور کی نسبتیں تھمت ہیں۔

تفسیر

فرشتے مکرم اور فرمانبردار بندے ہیں :

چونکہ گزشتہ بحث کی آخری آیت میں پیغمبروں اور ہر قسم کے شرک کی نفی (اور ضمناً عیسےٰ خدا کا بیٹا ہونے کی نفی) کے بارے میں گفتگو تھی، زیر بحث آیات سب کی سب فرشتوں کے خدا کی اولاد ہونے کی نفی کے بارے میں ہیں۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ بہت سے مشرکین عرب یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ فرشتے خدا کی اولاد ہیں اور اسی بنا پر کبھی ان کی پرستش کرتے تھے۔ قرآن مندرجہ بالا آیات میں مراحات کے ساتھ اس بے ہودہ اور بے بنیاد عقیدے کی مذمت کرتا ہے اور مختلف دلائل کے ساتھ اس کا بطلان ظاہر کرتا ہے۔

پہلے کہتا ہے : انہوں نے کہا کہ خدا نے رحمن کی اولاد ہے۔ (وقالوا اتخذ الرحمن ولداً)۔ اگر ان کی مراد حقیقی بیٹا ہو تو اس کے لیے جسم لازم ہے اور اگر یہ معنوی (سنہ بولا بیٹا) ہو کہ جو عربوں میں معمول تھا، تو وہ بھی ضعف و احتیاج کی دلیل ہے اور ان سب باتوں سے قطع نظر اصلی طور پر بیٹے کی احتیاج اور ضرورت اسے ہوتی ہے جو فنا ہونے والا ہو، تو اس کی نسل جانیسیا اور آثار کی بقا کے لیے اس کا بیٹا مدت و راز تک اس کی زندگی کو دوام بخشنے، یا (اسے بیٹے کی ضرورت اس لیے ہوتی ہے تاکہ اُسے) تنہائی کا احساس نہ ہو اور وہ اس کا سونپن تنہائی بنے یا اپنی طاقت میں اضافے کے لیے لیکن ایک انسان ایسی وجود جو جسم نہ رکھتا ہو اور ہر لحاظ سے بے نیاز ہو اس کے بارے میں بیٹا یا اولاد کوئی معنی نہیں رکھتی۔ لہذا ساتھ ہی فرمایا گیا ہے : وہ اس عیب و نقص سے پاک اور منزہ ہے (سبحانہ)۔ اس کے بعد فرشتوں کی صفات چھو شقوں میں بیان کی گئی ہیں۔ یہ مجموعی طور پر اس بات پر ایک روشن دلیل ہیں کہ وہ خدا کی اولاد نہیں ہیں :

۱۔ وہ ہنگام خدا ہیں (بل عباد)۔

۲۔ وہ مکرم و محترم بندے ہیں (مکرمون)۔

وہ بھاگ جانے والے غلاموں کی طرح نہیں ہیں کہ جو اپنے آقا کی سختی اور دباؤ تلے رہ کر خدمت کرتے ہیں بلکہ وہ ایسے بنیے ہیں کہ جو ہر لحاظ سے مکرم ہیں اور جو راہ عبودیت کو اچھی طرح سے جانتے ہیں اور اس پر فخر کرتے ہیں۔ خدا نے بھی عبودیت میں ان کے خلوص کی وجہ سے انہیں مکرم و محترم قرار دیا ہے۔ اور انہیں اپنی بہت سی نعمات عطا کی ہیں۔

۳۔ وہ اس قدر متوہب اور خدا کے فرمانبردار ہیں کہ کبھی بات کرنے میں اس پر سبقت نہیں کرتے (لایسبقونہ بالقول)۔

۴۔ اور عمل کے لحاظ سے بھی ”وہ صرف اسی کے فرمان پر عمل کرتے ہیں“ (وہو بامرہ یعملون)۔

۲۶۔ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمَنُ وَلَدًا سُبْحَنَهُ ۚ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُونَ ۚ لَا يَسْبِقُونَهُ بِالْقَوْلِ وَهُوَ بِأَمْرِهِ يَعْمَلُونَ ۚ

۲۷۔ لَعَلَّكُمْ مَابِئْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُونَ ۚ

۲۸۔ لِمَنِ ارْتَضَىٰ وَهُوَ مِنْ خَشْيَتِهِ مُشْفِقُونَ ۚ

۲۹۔ وَمَنْ يُقْلُ مِنْهُمْ إِنِّي إِلَهُ مِنْ دُونِهِ ۚ فَذَلِكَ نَجْزِيهِ جَهَنَّمَ ۚ كَذَلِكَ نَجْزِي الظَّالِمِينَ ۚ

ترجمہ

۲۶۔ انہوں نے کہا کہ خدا نے رحمن کی اولاد رکھتا ہے۔ اس کی ذات (اس عیب و نقص سے) منزہ ہے یہ (فرشتے) اس کے مکرم بندے ہیں۔ جو ہرگز بات کرنے میں اس پر سبقت نہیں کرتے اور اس کے فرمان کے مطابق عمل کرتے ہیں۔

۲۷۔ وہ ان کے آج کے اور آئندہ کے تمام اعمال کو بھی جانتا ہے اور ان کے گزشتہ اعمال سے بھی آگاہ ہے اور وہ سوائے اس شخص کے کہ جس سے خدا راضی ہے (اور اس کی شفاعت کی اجازت اُس نے دی ہے) کسی کی شفاعت نہیں کرتے اور وہ اس کے خوف سے ڈرتے رہتے ہیں۔

۲۸۔ اور جو کوئی اُن میں سے یہ کہے کہ میں خدا کے سوا معبود ہوں۔ تو ہم اس کو جہنم کی سزا دیں گے اور ہم ظالموں کو اسی طرح سے سزا دیتے ہیں۔

کیا یہ صفات، اولاد کی ہو سکتی ہیں یا بندوں کی؟

اس کے بعد ان کے بارے میں خدا کے احاطہ علمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے :
خدا ان کے آج اور آئندہ کے اعمال کو بھی جانتا ہے اور گزشتہ کو بھی۔ ان کی دنیا سے بھی آگاہ ہے اور ان کی آخرت سے
ان کے وجود سے پہلے بھی اور ان کے وجود کے بعد بھی: (يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ)۔

مسلمہ طور پر فرشتے اس امر سے آگاہ ہیں کہ خدا ان کے بارے میں یہ سب کچھ جانتا ہے اور یہی عرفان اس بات کا سبب
ہوتا ہے کہ وہ نہ تو اس سے پہلے کوئی بات کہتے ہیں اور نہ ہی اس کے فرمان سے سر تابی کرتے ہیں اور اس طرح سے یہ جملہ ہر کچھ
کے سابق آیت کے لیے تعلیل کا حکم رکھتا ہو۔

۵۔ اس میں شک نہیں کہ وہ جو کہ خدا کے محکم و معتمد بندے ہیں، حاجت مندوں کے لیے شفاعت کریں گے لیکن اس
بات پر توجہ رہے کہ ”وہ ہرگز کسی ایسے کی شفاعت نہیں کریں گے جس کے بارے میں نہ جان لیں کہ خدا اس سے راضی ہے اور
اس نے اس کی شفاعت کی اجازت دے دی ہے“: (وَلَا يَشْفَعُونَ إِلَّا لِمَنِ ارْتَضَى)۔

یقیناً خدا کا راضی ہونا اور اس کی شفاعت کی اجازت دے دینا بلا وجہ نہیں ہو سکتا۔ جتنا یہ اس سچے ایمان اور عمل صالح کی
وجہ سے ہے جس کے باعث انسان خدا کے ساتھ تعلق قائم رہتا ہے۔ بالفاظ دیگر ممکن ہے انسان گناہ سے آلودہ ہو جائے لیکن
اگر وہ اپنا رابطہ خدا اور اولیاء خدا سے بالکل منقطع نہ کر لے تو اس کے بارے میں شفاعت کی امید ہے۔

لیکن اگر فکر اور عقیدے کے لحاظ سے اس کا تعلق بالکل ٹوٹ جائے یا عملی طور پر اس قدر آلودہ ہو کہ شفاعت کی اہلیت کھو
بیٹھا ہو، تو اس موقع پر کوئی پیغمبر، مرسل یا مقرب فرشتہ اس کی شفاعت نہیں کرے گا۔

یہ وہی مطلب ہے کہ جسے ہم فلسفہ شفاعت کی بحث کے ضمن میں بیان کر چکے ہیں کہ شفاعت ایک انسان ساز مکتب ہے اور
گناہوں میں آلودہ لوگوں کو دایں صبح راستے پر لانے کا ایک وسیلہ ہے نیز شفاعت کا عقیدہ یا س دنا امید ہی سے بچاتا ہے کیونکہ
ناامیدی انحراف اور گناہ میں غرق ہونے کا ایک عامل ہے۔ اس قسم کی شفاعت پر ایمان رکھنا اس بات کا سبب بنتا ہے کہ گناہگار
لوگ اپنا رابطہ خدا، انبیاء اور آخرت سے منقطع نہ کریں، اپنے لسنے کے تمام راستوں کو دیران نہ کریں۔

ضمنی طور پر یہ جملہ ان لوگوں کا جواب ہے کہ جو یہ کہتے تھے کہ ہم فرشتوں کی اس لیے عبادت کرتے ہیں تاکہ وہ بارگاہ خداوندی
میں ہماری شفاعت کریں۔ قرآن کہتا ہے: وہ اپنی طرف سے کوئی کام نہیں کر سکتے لہذا جو کچھ چاہتے ہو وہ براہ راست خدا سے چاہو،
یہاں تک کہ شفاعت کرنے والوں کی شفاعت کی اجازت بھی۔

۶۔ بزرگ مفسرین نے اس جگہ کی تفسیر میں تین باتیں کی ہیں، ہم نے مذکورہ بالا عبارت میں ان تینوں کو جمع کر دیا ہے۔ چونکہ یہ ایک
دوسرے کے منافی نہیں ہیں

۷۔ ہم شفاعت کے بارے میں سورہ بقرہ کی آیہ ۴۸ اور ۲۵۴ کے ذیل میں تفصیل کے ساتھ بحث کر چکے ہیں، وہاں
رجوع فرمائیں۔

اسی معرفت اور آگاہی کے سبب ہے ”وہ صرف خدا سے ڈرتے ہیں اور صرف اسی کے خوف کو اپنے دل میں ماہ دیتے ہیں“
(وخشیتہ مشفقون)۔

وہ اس لیے نہیں ڈرتے کہ انہوں نے کوئی گناہ کیا ہے بلکہ وہ عبادت میں کوتاہی یا ترک ادنیٰ سے ڈرتے رہتے ہیں۔
یہ بات قابل توجہ ہے کہ ”خشیت“ اصل لغت کے لحاظ سے ہر قسم کے خوف کے لیے نہیں ہے۔ بلکہ وہ ایسا خوف ہوتا ہے کہ
علم و احترام کے ساتھ ہم آہنگ ہو۔

۸۔ مشفق: مادہ ”اشفاق“ سے، اس توجہ کے معنی میں ہے کہ جو خوف کی آمیزش رکھتی ہو (چونکہ اصل میں یہ ”شفق“ کے مادہ سے
لیا ہے کہ جو ایسی روشنی ہے کہ جو تاریکی کے ساتھ ملی ہوئی ہو)

اس بنا پر ان کا خدا سے خوف ایسا نہیں ہے جیسا کہ کسی انسان کو ایک وحشتناک حادثہ کا خوف ہوتا ہے اور اسی طرح ان کا
”اشفاق“ ایسے بھی نہیں جیسے کہ انسان کسی خطرناک چیز سے ڈرتا ہے بلکہ ان کا خوف و اشفاق احترام، عنایت، توجہ، معرفت اور احسان
مستویات کی آمیزش کے ساتھ ہوتا ہے۔

یہ بات واضح ہے کہ فرشتے ان عمدہ اور امتیازی صفات اور خاص مقام عبودیت کے باوجود ہرگز خدائی کا دعویٰ نہیں کرتے۔
لیکن اگر یہ فرض کر لیں کہ ان میں سے کوئی یہ کہنے لگے کہ خدا نہیں ہیں معبود ہوں، تو ہم اسے جہنم کی سزا دیں گے، ہاں! ظالموں کو ہم اسی
طرح سے سزا دیا کرتے ہیں: (وَمَنْ يَقْلُصْ مَنَافِقَ اللَّهِ مِنْ دُونِهِ فَذَلِكْ نَجْزِيهِ جَهَنَّمَ، كَذَلِكَ نَجْزِي
الظَّالِمِينَ)۔

در حقیقت الوہیت کا دعویٰ کرنا، اپنے آپ پر بھی اور معاشرے کے آپ پر بھی ظلم کرنے کا ایک واضح مصلوق ہے اور قانون کلی میں
”كَذَلِكَ نَجْزِي الظَّالِمِينَ“ درج ہے۔

۳۰

۳۱

۳۲

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا ۖ إِنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا

فَفَقَّتْهُمَا ۖ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ۖ أَفَلَا يُؤْمِنُونَ ۝

وَجَعَلْنَا فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيًا ۖ أَنْ تَمِيدَ بِهِمْ ۖ وَجَعَلْنَا فِيهَا

فِجَاجًا ۖ سُبُلًا لَّعَلَّهُمْ يَهْتَدُونَ ۝

وَجَعَلْنَا السَّمَاءَ سَقْفًا مَّحْفُوظًا ۖ وَهُوَ عَنْ آيَاتِهَا ۖ وَمَوْعِنٌ لِّبَنِي

۱۔ مفردات راغب: مادہ ”خشیت“ - ”شفق“ اور تفسیر المصالح آیات زیر بحث کے ذیل میں۔

مُعْرَضُونَ

۲۳۔ وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ

ترجمہ

- ۳۰۔ کیا کافروں نے یہ نہیں دیکھا کہ آسمان اور زمین ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے اور ہم نے انہیں ایک دوسرے سے جدا کیا اور ہم نے ہر زندہ چیز کو پانی سے پیدا کیا۔ کیا وہ ایمان نہیں لاتے؟
۳۱۔ اور ہم نے زمین میں پہاڑ گاڑ دیے تاکہ وہ آرام و سکون میں رہیں اور زمین ان کے ساتھ کسی طرف کو ڈھک نہ جائے اور ان میں دوسرے اور راستے قرار دیے تاکہ اپنی منزل مقصود کو جا پہنچیں۔
۳۲۔ اور آسمان کو محفوظ چھت قرار دیا لیکن وہ اس کی آیات سے گورگدان ہیں۔
۳۳۔ وہ وہی ہے جس نے رات و دن بنائے نیز سورج اور چاند کو پیدا کیا ہے کہ جن میں سے ہر ایک اپنے ہی مدار میں گردش کر رہا ہے۔

تفسیر

جہان ہستی میں خدا کی مزید نشانیاں :

گزشتہ آیات میں مشرکین کے بہودہ عقائد کا ذکر تھا اور ان میں توحید سے متعلق دلائل پیش کیے گئے تھے۔ اس کے بعد زبور میں عالم ہستی کے نظام میں خدا کی نشانیاں کا ایک سلسلہ اور اس کی منظم تدبیر کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ گزشتہ مباحث پر مزید تاکید ہے۔ پہلے فرمایا گیا ہے : کیا کفار نے یہ نہیں دیکھا کہ سارے آسمان اور زمین آپس میں ملے ہوئے تھے اور ہم نے انہیں کھول دیا :
(اولو الذین کفروا ان السماوات والارض کانتا رتقا ففتقناھما)۔

اور ہم نے ہر زندہ موجود کو پانی سے پیدا کیا ہے : (وجعلنا من الماء کل شئ حی)

کیا ان آیات اور نشانیاں کا مشاہدہ کرنے کے باوجود بھی وہ ایمان نہیں لاتے : (ا فلا یؤمنون)۔

اس بارے میں کہ "رتق" و "فتق" (پیوستگی اور جدائی) کہ جو یہاں آسمانوں اور زمین کے بارے میں کہی گئی ہے۔ اس سے کیا مراد ہے؟ مفسرین نے مختلف باتیں کی ہیں کہ جن میں تین تفسیری آیات کے منہم کے زیادہ نزدیک معلوم ہوتی ہیں اور جیسا کہ ہم بیان کریں گے مگر جسے ہم تین تفسیری آیات کے منہم میں جمع ہوں گے۔

۱۔ قرآنی تفسیر کے تحت میں اور بعض دوسرے مفسرین۔

۱۔ آسمان و زمین کی ایک دوسرے سے پیوستگی، ابتداء خلقت کی طرف اشارہ ہے۔
محققین کے نظریے کے مطابق یہ جہان مجموعی طور پر حرارت سے پیدا شدہ بھاپ کے ایک عظیم ملے ہوئے بخار کی صورت تھا کہ جس میں اندرونی تغیرات اور حرکت کی وجہ سے آہستہ آہستہ اور بتدریج اجزاء بکھرتے رہے اور نظام شمسی کے تمام سیارے اس کے اندر کڑی زمین وجود میں آئے اور ابھی بھی یہ جہان اسی طرح پھیلتا چلا جا رہا ہے۔

۲۔ پیوستگی سے مراد یہ ہے کہ جہان کا مادہ ایک ہی طرح کا تھا۔ اس طرح سے کہ سب کے سب آپس میں ملے ہوئے تھے اور ایک مادہ واحد کی صورت میں معلوم ہوتے تھے لیکن زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ مادے ایک دوسرے سے جُدا ہونے لگے اور ان میں نئی نئی ترکیبیں پیدا ہونے لگیں اور آسمان و زمین میں طرح طرح کی نباتات، حیوانات اور دوسری موجودات ظاہر ہوئیں۔
یہی موجودات کہ ان میں سے ہر ایک موجود ایک مخصوص نظام، آثار اور امتیازی خاص رکھتا ہے اور ان میں سے ہر ایک پر درودگار کی عظمت، علم اور لامتناہی قدرت کی نشانی ہے۔

۳۔ آسمان کی باہم پیوستگی سے مراد یہ ہے کہ ابتداء میں بارش نہیں ہوتی تھی اور زمین کی باہم پیوستگی سے مراد یہ ہے کہ اس زمانے میں کوئی نباتات نہ اُگتی تھیں لیکن خدا نے ان دونوں کو کھول دیا۔ آسمان سے بارش نازل کی اور زمین سے انواع و اقسام کی نباتات اُگائیں۔

متحد روایات — جو اہل بیت سے بیان ہوئی ہیں — آخری معنی کی طرف اشارہ کرتی ہیں اور ان میں سے بعض پہلی تفسیر کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ آخری تفسیر ایک ایسی چیز ہے کہ جو آنکھ سے دیکھی جاسکتی ہے کہ آسمان سے کس طرح بارش نازل ہوتی ہے اور زمینیں شکاف سے ہوتی ہیں اور نباتات اُگتی ہیں اور یہ "اولو الذین کفروا" (کیا وہ لوگ کہ جو کافر ہو گئے ہیں، انہوں نے نہیں دیکھا۔۔۔) کے جملہ کے ساتھ مکمل طور پر ہم آہنگ ہے اور یہ "وجعلنا من الماء کل شئ حی" (اور ہم نے پانی ہی سے ہر زندہ چیز کو بنایا ہے) کے جملہ کے ساتھ بھی پوری پوری ہم آہنگی رکھتی ہے۔

لیکن پہلی اور دوسری تفسیر بھی ان جملوں کے وسیع معنی کے خلاف نہیں ہے کیونکہ "زویت" بعض اوقات علم کے معنی میں بھی آتی ہے یہ ٹھیک ہے کہ یہ علم و آگاہی سب کے لیے نہیں ہے۔ یہ صرف کچھ ہی صاحب علم ہوتے ہیں کہ جو آسمان و زمین کے گزشتہ کے بارے میں اور ان کی پیوستگی اور پھر ان کی جدائی کے متعلق آگاہی حاصل کر سکتے ہیں لیکن ہم جانتے ہیں کہ قرآن پاک زمانہ یا ایک صدی کی کتاب نہیں ہے بلکہ یہ انسانوں کے لیے ہر دور میں رہبر و راہنما ہے۔

اسی بنا پر قرآن میں اس قسم کے عینی اور گہرے مطالب میں یہ ہرگز وہ اور ہر زمانے کے لیے قابل استفادہ ہے۔ اس لحاظ سے ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ اس میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ زیر بحث آیت تینوں تفاسیر کی حامل ہو کہ جن میں سے ہر ایک اپنی جگہ پر صحیح اور کامل اور ہم نے بار بار کہا ہے کہ کسی لفظ کا ایک سے زیادہ معنی میں استعمال، نہ صرف یہ کہ قابل اعتراض نہیں بلکہ کبھی کبھار فصاحت کی دلیل بن سکتا ہے۔

۱۔ المیزان، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔
۲۔ تفسیر صافی اور تفسیر نور افشکین میں زیر بحث آیت کے ذیل میں رجوع کریں۔

آخری زیر بحث آیت میں رات دن اور سورج و چاند کی خلقت کا بیان شروع کرتے ہوئے کہا گیا ہے: وہ رات دن اور سورج و چاند کو پیدا کیا ہے: (وهو الذي خلق الليل والنهار والشمس والقمر)۔ اور ان میں سے ہر ایک اپنے مدار میں گردش کر رہا ہے: (كل في فلك يسبحون)۔

چند اہم نکات:

۱۔ "كل في فلك يسبحون" کا مفہوم: اس کی تفسیر کے بارے میں مفسرین نے مختلف بیانات دیئے ہیں کہ جو علم افلاک کے ماہرین کی مسلمہ تحقیقات سے ہم آہنگ ہے یہ ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں سورج کی حرکت سے مراد یا تو حرکت ہے کہ جو وہ خود اپنے گرد کرتا ہے یا وہ حرکت ہے کہ جو وہ نظام شمسی کے ہمراہ رکھتا ہے۔

اس نکتے کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ لفظ "كل" ممکن ہے چاند اور سورج کی طرف اشارہ ہو اور اسی طرح ستاروں کی طرف اشارہ ہو کیونکہ کلمہ "لیل" (شب) سے یہی ظاہر ہوتا ہے۔

بعض بزرگ مفسرین نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ "شب" اور "روز" اور چاند اور سورج (چاندل) کی طرف اشارہ ہو رات تو زمین کا مغربی سایہ ہی ہے۔ نیز اس کا اپنا مدار بھی ہے۔ اگر کوئی شخص کرۂ زمین سے باہر دُور سے اس کی طرف دیکھے اس تاریک مغربی سائے کو زمین کے گرد دائماً اور ہمیشہ حرکت میں دیکھے گا اور اسی طرح سورج کی وہ روشنی کہ جو زمین پر پڑتی ہے اور اس سے دن کا نور ہوتا ہے، اس ستون کی مانند ہے کہ جو اس کرۂ کے گرد ہمیشہ نقل مکان کرتا رہتا ہے، لہذا رات اور دن بھی اپنے ایک گردش اور ایک مکان رکھتے ہیں۔

یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ سورج کی حرکت سے مراد ہمارے احساس میں اس کی حرکت ہے کیونکہ زمین پر کھڑے ہو کر دیکھنے کے لیے سورج اور چاند دونوں گردش میں ہیں۔

۲۔ آسمان محکم چھت ہے: ہم نے پہلے بھی بیان کیا ہے کہ "سماء" (آسمان) قرآن میں مختلف معانی کے لیے آیا ہے کبھی تو وہ زمین کی فضا یعنی ہوائ کے اس ضخیم قشر کے معنی میں آیا ہے کہ جس نے کرۂ ارض کو چار طرف سے گھیرا ہوا ہے جیسا کہ مذہب آیت میں ہے۔ اس مقام پر فرانس کے ماہرین کی زبان سے اس عظیم چھت کی مضبوطی اور استحکام کے بارے میں مزید وضاحت بیان میں کوئی حرج نہیں ہے۔

"فرانک آلن" جو فرانس کا استاد ہے، اس طرح لکھتا ہے:

وہ فضائی قشر (جو) کہ جو سطح زمین پر زندگی کی نگہانی کرنے والی گیسوں سے مل کر بنا ہوا ہے، اس قدر ضخیم ہے کہ جو ایک ذرہ کی طرح، زمین کو، ایسے بیس ملین آسانی پتھروں کے شرے کہ جو سمت کا بیخام ہوتے ہیں اور جو ۵۰ کلومیٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے اُس کے

یہ اقتباس الیسنان سے لیا گیا ہے۔

مکراتے ہیں، امان میں رکھ سکتا ہے۔

زمین کا فضائی قشر (جو) اُن دوسرے کاموں کے علاوہ سطح زمین پر درج حرارت کو بھی زندگی کے لیے درکار حدود تک محفوظ رکھتا ہے اس کے علاوہ پانی اور پانی کے بخارات کے بہت ہی ضروری ذخیرے کو سمندروں سے خشکی کی طرف منتقل کرتا ہے کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو حیات شرمسار، خشک ناقابل زیست زمین میں تبدیل ہو جاتے۔ اس طرح یوں کہنا چاہیے کہ سمندر اور جو زمین، زمین کے لیے سے پانی کھینچنے والی پیرنی کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ان شہابوں میں سے بعض کا وزن کہ جو زمین کی طرف آتے ہیں ایک گرام کے ہزاروں حصے کی مقدار کے برابر ہوتا ہے لیکن حد سرعت اور تیزی کی وجہ سے اس کی قوت و طاقت، ایسی ذات کی طاقت کے برابر ہوتی ہے کہ جن سے تباہ کن بم تیار ہوتے ہیں ان شہابوں کا حجم بعض اوقات ریت کے ایک ذرہ سے زیادہ نہیں ہوتا۔

ان شہابوں میں سے کئی ملین شہاب ہر روز زمین تک پہنچنے سے پہلے ہی جل جلتے ہیں یا بخارات میں تبدیل ہو جاتے ہیں لیکن ان اوقات بعض شہابوں کا حجم اور وزن اس قدر زیادہ ہوتا ہے کہ وہ گیسوں کے قشر سے گزر کر سطح زمین کے ساتھ چمکتے ہیں۔

منجملہ ان شہابوں کے جو مذکورہ گیسوں سے نکل کر زمین تک پہنچے ایک بہت بڑا مشہور شہاب "سیبری" ہے کہ جو ۱۹۰۸ء میں ۴۰ کلومیٹر زمین کو گھیر لیا تھا اور اس کے گرنے سے بہت سے نقصانات میں سے آنکرایا تھا۔ اس کا قطر اتنا بڑا تھا کہ اس نے تقریباً ۴۰ کلومیٹر زمین کو گھیر لیا تھا اور اس کے گرنے سے بہت سے نقصانات ہوئے تھے۔

ایک اور شہاب وہ ہے کہ جو امریکہ میں "اریزونا" کے مقام پر گرا تھا کہ جس کا قطر ایک کلومیٹر اور اس کی کٹائی میں میٹر تھی۔ اس کے گرنے سے زمین میں گہرا شکاف پڑ گیا تھا اور اُس کے پھٹنے سے اور بہت سے چھوٹے چھوٹے شہاب پیدا ہو گئے تھے کہ جو دُور دور جا کرے تھے۔

کرسی مورین لکھتا ہے: اگر وہ ہوا کہ جو زمین کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے،

اس کی نسبت کہ جتنی اب ہے کچھ بھی کم اور پتلی ہوتی تو اجرام سماوی اور شہاب ثاقب کہ جو روزانہ کئی ملین کی تعداد میں اس سے آنکراتے ہیں اور اسی فضا کے اندر باہری بابر منتشر اور نالود ہو جاتے ہیں، ہمیشہ سطح زمین پر پہنچ جاتے اور اس کے گوشہ و کنار سے آنکراتے رہتے۔ یہ اجرام فنی جیسے ہوائیں میل فی سیکنڈ کی رفتار سے چلتے ہیں اور جس چیز سے بھی جا ٹکرتے ہیں اُسے تباہ و برباد کر دیتے ہیں اور اس میں آگ بھڑکا دیتے ہیں۔

اگر ان اجرام سماوی کی حرکت اور تیزی اس سے کمتر ہوتی، جتنی کہ اب ہے، مثلاً وہ ایک گولی کی سرعت اور تیزی کے برابر ہوتی، تو وہ سب کے سب سطح زمین پر آگرتے اور ان کی تباہی کا نتیجہ واضح ہے، منجملہ ان کے اگر خود انسان ان اجرام سماوی کے چھوٹے سے چھوٹے ٹکڑے کی زد میں آجائے، تو اس کی حرارت کی شدت کے باعث کہ جو گولی کی سرعت حرکت کی نسبت فوسے گنا زیادہ ہے، ٹکڑے ٹکڑے اور ریزہ ریزہ ہو جائے۔

زمین کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہوا کی موٹائی اس قدر ہے کہ وہ سورج کی شعاعوں کو صرف اتنی ہی مقدار میں کہ جتنی نباتات کی نشوونما کے لیے ضروری ہے، زمین کی طرف آنے دیتی ہے اور تمام ضرر رساں جراثیم کو اسی فضا کے اندر نیست و نابود کر دیتی ہے اور سفید و مائیں پیدا کرتی ہے۔

۳۴۔ وَمَا جَعَلْنَا لِلْبَشَرِ مِنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ أَفَإِنْ مِتَّ فَهُمُ الْخُلْدُونَ

۳۵۔ كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ وَنَبْلُوكُم بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً وَإِلَيْنَا تُرْجَعُونَ

ترجمہ

۳۴۔ ہم نے تجھ سے پہلے کسی بھی انسان کو دائمی زندگی نہیں دی، (تو اس وقت وہ لوگ کہ جو تیری موت کا انتظار کر رہے ہیں) اگر تو مر جائے تو کیا وہ ہمیشہ جیتے ہی رہیں گے؟

۳۵۔ ہر انسان موت کا ذائقہ چکھے گا۔ اور ہم مصیبت و راحت کے ذریعے تمہاری آزمائش کریں گے اور آخر کار تم ہماری ہی طرف لوٹ کر آؤ گے۔

تفسیر

موت سب کے لیے ہے :

گذشتہ آیات کے ایک حصہ میں بیان ہوا ہے کہ مشرکین پیغمبر اکرمؐ کی نبوت کی تردید کے لیے ان کے انسان ہونے کو بہانہ بناتے تھے اور ان کا عقیدہ یہ تھا کہ پیغمبر کو حتی طور پر فرشتہ بنانا اور ہر قسم کے بشری عوارض سے خالی ہونا چاہیے۔ زیر بحث آیات ان کے کچھ اور اعتراضات کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ کبھی تو وہ یہ کہتے تھے کہ پیغمبر نے جو شاعرانہ سروصدا بلند کر رکھی ہے، ہمیشہ نہیں رہے گی اور اس کے مرنے سے سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ جیسا کہ سورہ طور کی آیہ ۳۰ میں بیان ہوا ہے :

لے کناب - راہ آئینہ نشانی - ص ۲۳۳ - ۲۵

۱۔ یقولون شاعر نثر تصب بہ ربیب المنون

اور کبھی یہ خیال کرتے تھے کہ کچھ اس شخص کا نظریہ یہ ہے کہ یہ خاتم انبیاء ہے۔ لہذا اسے ہرگز نہیں مرنے چاہیے تاکہ اپنے دین کو بچا دے۔ لہذا اس کی موت اس کے دعویٰ کے باطل ہونے کی دلیل ہوگی۔

قرآن مندرجہ بالا پہلی آیت میں مختصر سے جملے میں انہیں جواب دیتا ہے اور کہتا ہے : ہم نے تجھ سے پہلے کسی بشر کو جاوہل نہیں دی : (وَمَا جَعَلْنَا لِلْبَشَرِ مِنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ)۔

یہ فطرت کا ناقابل تغیر قانون ہے کہ کوئی بھی شخص حیات جاوداتی نہیں رکھتا۔ لہذا جو لوگ ابھی سے تیری موت کی خوشی منا رہے ہیں کیا اگر تجھے موت آتی ہے تو وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے : (افان مت فہم الخالدون)۔

شاید اس بات کی وضاحت کی ضرورت نہ ہو کہ شریعت و دین و آئین کی بقا اس کے لانے والے کی بقا کی محتاج نہیں ہے۔

ابراہیم و موسیٰ اور عیسیٰ اگرچہ حیات جاوید نہ رکھتے تھے لیکن ان عظیم پیغمبروں کی وفات کے (اور حضرت عیسیٰ کے آسمان کی طرف صعود کرنے کے) بعد بھی قرآن تک ان کا آئین و دین باقی رہا۔

لہذا دین و مذہب کی بقا اس بات کی محتاج نہیں کہ پیغمبر اس کی حفاظت کے لیے ہمیشہ موجود رہے کیونکہ اس کے جانشین اس کی تعلیمات اور ہدایات کو جاری اور برقرار رکھ سکتے ہیں۔

اور یہ بات کہ جو وہ خیال کرتے ہیں کہ پیغمبر کے چلے جانے کے بعد تمام چیزیں ختم ہو جاتی ہیں، درحقیقت ان کے بالکل اندھے پن کا ثبوت ہیں کیونکہ یہ بات ان مسائل کے بارے میں تو صحیح ہے کہ جو کسی شخص کے ساتھ قائم ہوں اسلام نہ تو شخصی اعتبار سے پیغمبر کے ساتھ قائم تھا اور نہ ہی آپ کے انصار و اصحاب کے ساتھ۔ یہ ایک ایسا زندہ اور رواں دواں دین و آئین ہے کہ جو اپنی اندرونی حرکت کی بنیاد پر آگے بڑھتا ہے۔ اور زمان و مکان کی سرحدوں کو عبور کرتے ہوئے اپنی حرکت اور سرکاری رکھتا ہے۔

اس کے بعد تمام نفوس کے بارے میں موت کے بلا استثنا عمومی قانون کو اس طرح بیان کرتا ہے : ہر انسان موت کا ذائقہ چکھے گا : (کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ)۔

یہ بات یاد دلانا ضروری ہے کہ لفظ "نفس" قرآن مجید میں مختلف معانی میں استعمال ہوا ہے "نفس" کا پہلا معنی "ذات" یا اپنا آپ ہے۔ یہ ایک وسیع معنی ہے، یہاں تک کہ خدا کی ذات پاک پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ جیسا کہ بیان ہوا ہے :

کُتِبَ عَلَى نَفْسِهِ الرَّحْمَةُ

خدا نے رحمت کو اپنے اویں لازم قرار دے لیا ہے۔ (انعام - ۱۲)

بعد میں یہ لفظ انسان کے لیے یعنی جسم و روح کے مجموعے کے لیے استعمال ہونے لگا۔ مثلاً :

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا

جو شخص کسی انسان کو بغیر اس کے کس نے کسی کو قتل کیا ہو یا زمین میں فساد کیا ہو قتل کر دے

تو یہ ایسے ہے جیسے اُس نے تمام انسانوں کو قتل کر دیا ہو۔ (مائدہ - ۳۲)

۲۸۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ اگر تم سچ کہتے ہو (تو بتاؤ) یہ قیامت کا وعدہ کب پورا ہوگا؟
 ۲۹۔ لیکن اگر کافراں نے مانے کو جانتے ہوئے کہ جب وہ آگ کے شعلوں کو اپنے چہروں اور اپنی پشتوں سے دُور نہیں کر سکیں
 شخص ان کی مدد بھی نہیں کرے گا (تو پھر اس قدر قیامت کے بارے میں جلدی نہ کرتے)۔
 ۳۰۔ ہاں ! یہ خدائی عذاب اچانک ان کے پاس آئے گا اور انہیں بہت کر دے گا۔ اس طرح سے کہ اسے
 کی ان میں طاقت نہ ہوگی اور انہیں ہمت بھی نہیں دی جائے گی۔

تفسیر

انسان جلد باز مخلوق ہے:

ان آیات میں مشرکین کی پیغمبر اسلام کے متعلق کچھ اور حکمت چینیوں اور اعتراضات کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان میں
 مسائل میں ان کی انحرافی طرز فکر کو بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: جس وقت کفار تجھے دیکھتے ہیں تو تیرا سر اڑانے کے
 انہیں اور کوئی کام ہی نہیں ہوتا: (واذا راک الذین کفرو ان یتخذونک الازھوا)۔
 وہ بے پروائی کے ساتھ تیری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: کیا یہ وہی ہے کہ جو تمہارے خداؤں اور بتوں کی بڑائی
 (اھذا الذی یذکر الھتکم)۔

حالانکہ وہ خود خدا کے رحمن کے ذکر کے منکر ہیں، (وھو بذکر الرحمن ھو کافرون)۔
 تعجب تو اس بات پر ہے کہ اگر کوئی شخص ان پتھر اور لکڑی کے بنے ہوئے بتوں کی بڑائی کرے — بڑائی ہی بیان نہ کرے
 بلکہ حقیقت کا انکار کرے اور یہ کہے کہ یہ بے روح و بے شعور اور ایک بے قدر و قیمت موجودات ہیں، تو وہ اس بات پر تعجب
 کرتے ہیں لیکن اگر کوئی شخص ایسے مہربان اور بخشنے والے خدا کا منکر ہو جائے کہ جس کی رحمت کے آثار و وسعت عالم پر محیط ہیں اور
 ہر چیز میں اس کی عظمت اور رحمت کی دلیل موجود ہے، تو یہ ان کے لیے کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔
 ہاں ! جس وقت انسان کو کسی چیز کی عادت ہو جاتی ہے اور اس کی خُوبِ اس میں رچ بس جاتی ہے اور اس میں پختہ ہو جاتا ہے
 تو وہ چیز اس کی نظروں کو اچھا لگنے لگتی ہے، چاہے وہ کتنی ہی بدترین کیوں نہ ہو اور جس وقت وہ کسی چیز سے عداوت و دشمنی اظہار کرتا ہے
 تو آہستہ آہستہ وہ چیز اس کی نظروں کو بُری لگنے لگتی ہے، چاہے وہ کتنی ہی زیبا اور محبوب کیوں نہ ہو۔

اس کے بعد ان بے ہمار انسانوں کے ایک اور قبیح اور بے سرو پا کام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: انسان جلد باز
 مخلوق ہے: (خلق الانسان من عجل)۔

۱۔ یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ وہ اپنے الفاظ میں یہ کہتے تھے، مگر یہ وہی شخص ہے کہ جو تمہارے خداؤں کے بارے میں باتیں کرتے ہیں۔ وہ اس بات
 تک کے لیے راضی نہ تھے کہ بُرائی کا نفاذ اپنی عبادت میں لے آئیں اور یہ کہیں کہ یہ تمہارے خداؤں کی بدگئی کرتا ہے یا انہیں بُرا کہتا ہے۔

وكان الانسان عجولا

(بنی اسرائیل - ۱۱)

درحقیقت "خلق الانسان من عجل" کی تعبیر ایک قسم کی تاکید ہے۔ یعنی انسان اس طرح کا جلد باز ہے کہ
 گویا جلد بازی اور "عجل" سے پیدا ہوا ہے اور اس کے وجود کے تار و پود اسی سے بنے ہیں اور سچ بچ بہت سے آدمی اسی
 بات کے عادی ہیں۔ وہ خیر اور بھلائی میں بھی جلد باز ہیں اور شر اور بُرائی میں بھی۔ یہاں تک کہ جب اُن سے یہ کہا جائے کہ اگر تم
 تکبر اور گناہ اختیار کیا تو عذاب الہی تمہارے دامن گیر ہو جائے گا تو وہ کہتے ہیں کہ یہ عذاب پھر جلدی کیوں نہیں آتا؟
 آیت کے آخر میں مزید فرمایا گیا ہے: جلدی نہ کرو، میں اپنی آیات تمہیں عنقریب دکھاؤں گا: (سأوریکھواياتی فلا
 تستعجلون)۔

ممکن ہے یہاں پر "آیات" کی تعبیر عذاب، بلا، مصائب اور سزاؤں کی آیات اور نشانیوں کی طرف اشارہ ہو کہ پیغمبر جس
 مخالفین کو ڈراتے تھے اور یہ کہ پیغمبر بار بار یہی کہتے تھے کہ وہ بلائیں اور مصیبتیں جس سے تم ہمیں ڈراتے تھے کہاں لگیں؟
 قرآن کہتا ہے کہ جلدی نہ کرو، زیادہ دیر نہیں گزرے گی کہ وہ تمہیں آلیں گی۔
 یہ بھی ممکن ہے کہ یہ اُن معجزات کی طرف اشارہ ہو کہ جو پیغمبر اسلام کی صداقت کی دلیل ہیں یعنی اگر تم تھوڑا سا صبر کرو، تو تمہیں
 کافی معجزات دکھائے جائیں گے۔

یہ دونوں تفسیریں ایک دوسرے کے متنافی نہیں ہیں، کیونکہ مشرکین و دونوں چیزوں میں جلد بازی کرتے تھے اور خدا نے بھی
 دونوں ہی انہیں دکھائیں۔ پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے اور بعد والی آیات کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔
 ان کے ایک اور عاجلانہ تقاضے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

وہ کہتے ہیں کہ اگر تم سچ کہتے ہو تو قیامت کا وعدہ کب پورا ہوگا: (ویقولون متى هذا الوعد ان کنتم صادقین)۔
 وہ انتہائی بے صبری کے ساتھ قیام قیامت کے منتظر تھے حالانکہ وہ اس بات سے غافل تھے کہ قیامت کے آنے ہی ان
 کی نیچا لگی اور بدبختی کا آغاز ہو جائے گا لیکن کیا کیا جا سکتا ہے، جلد باز انسان اپنی بدبختی و نابودی کے لیے بھی جلد بازی کرتا ہے۔
 ان کہنم صادقین (اگر تم سچے ہو) کی تعبیر جمع کی صورت میں ہے۔ حالانکہ مخاطب پیغمبر اسلام تھے۔ یہ اس بنا پر ہے کہ
 اس خطاب میں ان کے سچے پیروکاروں کو بھی شریک کیا گیا ہے اور وہ ضمنی طور پر یہ کہنا چاہتے تھے کہ قیامت کا آنا اس بات کی دلیل ہے
 کہ تم سب کے سب بھڑے ہو۔

بعد والی آیت ان کو جواب دیتے ہوئے کہتی ہے: اگر کافراں نے مانے کو جانتے ہوئے کہ جب وہ آگ کے شعلوں کو

اپنے چہروں اور پشتوں سے دُور نہیں کر سکیں گے، اور کوئی شخص ان کی امداد کے لیے بھی نہیں آئے گا، تو وہ ہرگز عذاب کے نہ کرتے اور یہ نہ کہتے کہ قیامت کب آئے گی۔ (لَوْ يَعْلَمُ الَّذِينَ كَفَرُوا حِينَ لَا يَكُونُونَ عَنْ وَجْهِهِمْ وَلَا عَنْ ظُهُورِهِمْ وَلَا هُمْ يَنْصُرُونَ)۔

زیر بحث آیت میں "چہروں" اور "پشتوں" کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ دوزخ کی آگ اس طرح نہیں ہوگی ان کے ایک ہی طرف رہے بلکہ ان کے سامنے کا حصہ بھی آگ میں ہوگا اور پشت والا حصہ بھی۔ گویا وہ آگ کے اندر غرق ہوں گے۔ "وَلَا هُمْ يَنْصُرُونَ" اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ بُت کہ جن کے بارے میں وہ یہ گمان کرتے تھے کہ وہ ان کے شفع و مددگار ہوں گے، اُن سے کچھ نہیں ہو سکے گا۔

اور یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ یہ خدائی سزا اور جلاؤالنے والی آگ اس طرح سے اچانک اُنہیں آئے گی کہ وہ بہت رہ جائیں گے: (بَل تَأْتِيهِمْ بَغْتَةً فَتَبْهَتُهُمْ)۔

"اور انہیں اس طرح سے غافل اور غمور و غلب کر دے گی کہ اُن میں اسے دُور کرنے کی بھی طاقت نہ ہوگی: (فَلَا يَسْتَطِيعُونَ رَدَّهَا)۔

یہاں تک کہ اگر وہ اب ہمت کی خواہش بھی کریں اور اُس کے برخلاف کر جس کے لیے وہ پہلے جلد بازی کیا کرتے تھے تاخیر کی درخواست کرنے لگیں تو بھی انہیں ہمت نہیں دی جائے گی: (وَلَا هُمْ يَنْظُرُونَ)۔

چند اہم نکات :

۱۔ جلد باز کو جلد بازی سے ممانعت : زیر بحث آیات پر توجہ کرتے ہوئے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اگر انسان فطری طور پر جلد باز ہے تو پھر اسے جلد بازی سے منع کرتے ہوئے کیوں کہا گیا ہے : "فَلَا تَسْتَعْجِلُونَ" (ترم جلدی نہ کرو)۔ کیا یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کی ضد نہیں ہیں۔

ہم جواب میں کہیں گے کہ انسان کے ارادہ کے اختیار اور آزادی اور اس کی اخلاقی صفات، خصوصیات اور جذبات و روایات کے قابلِ تغیر ہونے کی طرف توجہ دیں تو واضح ہوگا کہ اس میں کسی قسم کا کوئی تضاد نہیں ہے کیونکہ تربیت اور تزکیہ نفس کے ذریعہ اس حالت کو بدلا جاسکتا ہے۔

۲۔ "بَل تَأْتِيهِمْ بَغْتَةً فَتَبْهَتُهُمْ" کا مفہوم : اس کا معنی ہے عذاب الہی اچانک ان کی طرف آئے گا اور انہیں بہت کر دے گا۔ یہ جملہ ممکن ہے اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ قیامت کے عذاب کی ہر چیز دنیا کے عذاب سے مختلف ہے۔ مثلاً : جہنم کی آگ کے بارے میں یہ بیان کیا گیا ہے :

نَارُ اللَّهِ الْمَوْقُودَةُ الَّتِي تَطْلُعُ عَلَى الْفُتَّةِ

خدا کی روشنی کی ہوئی آگ تو (ایسی ہے کہ جو) انسان کے دل میں جا کے لگے گی (ہمزہ ۶۰)۔

یا یہ کہ جہنم کے اندر صحن کے بارے میں بیان ہوا ہے کہ :

وقودها الناس والحجارة

جہنم کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے۔ (بقرہ - ۲۴) اس قسم کی تعبیرات اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ جہنم کی آگ اچانک اور غفلت کی حالت میں آنے والی اور بہت رو دینے والی ہے۔

۴۱۔ وَلَقَدْ اسْتَهْزِئَ بِرُسُلٍ مِنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِينَ سَخِرُوا مِنْهُمْ مَا كَالْوَابِہِ يَسْتَهْزِئُونَ ۝

۴۲۔ قُلْ مَنْ يَكْلُوْكُمْ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ مِنَ الرَّحْمٰنِ ۚ بَلْ هُمْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّہِمْ مُّعْرِضُونَ ۝

۴۳۔ اَمْ لَهُمْ اَلَمَةٌ تَمْنَعُهُمْ مِنْ دُونِنَا ۚ لَا يَسْتَطِيعُونَ نَصْرَ اَنْفُسِہِمْ وَلَا هُمْ بِمُتَايَسِبُونَ ۝

۴۴۔ بَلْ مَتَّعْنَا هَؤُلَاءِ وَاَبَاءَهُمْ حَتَّى طَالَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ۚ اَفَلَا يَرَوْنَ اَنَّا نَأْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِہَا ۚ اَفْہُمْ الْغٰلِبُونَ ۝

۴۵۔ قُلْ اِنَّمَا اُنْذِرُكُمْ بِالْوَحْيِ ۚ وَلَا يَسْمَعُ الصُّوْرُ الدُّعَاءَ اِذَا الْغٰلِبُونَ ۝

ترجمہ

۴۱۔ اگر یہ تیرا مذاق اڑاتے ہیں تو پریشان نہ ہو تجھ سے پہلے پیغمبروں کا بھی مذاق اڑایا جاتا تھا لیکن آخر کار جس چیز کا تسخر اڑایا کرتے تھے، وہی عذاب تسخر اڑانے والوں کے واسطے گیر ہو گیا۔

۴۲۔ تم کہہ دو کہ رات کو اور دن کو خدا (کے عذاب) سے تمہیں کون بچا سکتا ہے؟ لیکن وہ اپنے پروردگار کی یاد

سے منہ پھیرے ہوئے ہیں۔

- ۴۳۔ کیا ان کے معبود ایسے ہیں کہ جو ہمارے مقابلہ میں ان کا دفاع کریں؟ (بنادنی خدا) تو اپنی مدد بھی نہیں کھتے (دوسروں کی مدد کیا کریں گے) اور نہ ہی ہماری طرف سے کسی طاقت کے ذریعہ ان کی مدد ہوگی۔
- ۴۴۔ ہم نے انہیں اور ان کے آباء و اجداد کو اپنی نعمتوں سے بہرہ مند کیا، یہاں تک کہ انہوں نے طولانی عمر پائی اور وہی ان کے غرور و طغیان کا سبب بن گئی، کیا وہ یہ نہیں دیکھتے کہ ہم پہلے درپہلے اور مسلسل زمین (اور اُس میں رہنے والوں) میں کمی کرتے جا رہے ہیں، کیا وہ غالب ہیں (یا ہم)؟
- ۴۵۔ تم کہہ دو کہ میں تو تمہیں صرف وحی کے ذریعے ڈراتا ہوں۔ لیکن وہ لوگ کہ جن کے کان بہرے ہیں، جس وقت انہیں ڈرایا جاتا ہے تو وہ باتوں کو سننے ہی نہیں ہیں۔

تفسیر

کان دھر کے سنو اگر تمہارے کان ..

گزشتہ آیات میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ سرکشین اور کفار پیغمبر اکرمؐ کا مذاق اڑاتے تھے۔ وہی کام کہ جو تمام جاہل اور مغرور لوگوں کی پُرانی عادت ہے کہ وہ حقیقی اور اہم واقعات کو بھی مذاق اور استہزاء کے طور پر لیتے ہیں۔ زیر بحث پہلی آیت میں پیغمبرؐ کو دلاسا اور تسلی دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے: یہ صرف تم ہی نہیں ہو کہ جس کا مذاق اڑایا جا رہا ہے بلکہ تمہارے پہلے جو پیغمبر آئے تھے انہوں نے ان کا بھی مذاق اڑایا تھا؛ (ولقد استهزئ بوسل من قبلک)۔ لیکن آخر کار وہ عذاب الہی کہ جس کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے تسخّر اُڑانے والوں کے دامن گیر ہو گیا: (فحاق بالذین سخر وامنہم ما کانوا بہ لیستہزون)۔

لہذا تم کسی قسم کے غم و اندوہ کو اپنے قریب بھی نہ پھکنے دو اور جاہلوں کے اس طرح کے کام سے تیری عظیم روح پر ہولنا اثر بھی نہیں ہونا چاہیے اور یہ تیرے آہنی عزم میں کسی قسم کا خلل نہ ڈالنے پائیں۔

بعد والی آیت میں فرمایا گیا ہے: نہ صرف قیامت میں عذاب الہی سے تمہیں کوئی نہیں بچا سکے گا۔ بلکہ اس دنیا میں بھی یہی حال ہے۔ تم کہہ دو کہ رات اور دن میں خدا تعالیٰ کے عذاب سے تمہیں کون بچا سکتا ہے: (قل من یفلکوک باللیل والنہار من الرحمن)۔

حقیقت میں اگر خدا نے آسمان (جو زمین) کو ایک معنوی پھت قرار نہ دیا ہوتا — جیسا کہ پہلی آیات میں بیان ہوا ہے — تو تمہارے لیے صرف یہی کافی تھا کہ رات دن تم آسمانی پتھروں کی زد میں ہوتے۔

خدا کے دشمن تم سے اس قدر محبت رکھتا ہے کہ اس نے تمہاری نگہبانی اور حفاظت کے لیے ایسے ایسے مامورین قرار دیے ہیں۔

اور وہ ایک لحظہ کے لیے تم سے جدا ہو جائیں تو مصائب و آلام کا سیلاب تم پر ٹوٹ پڑے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس آیت میں لفظ "اللہ" بھی بجائے "رحمن" استعمال ہوا ہے۔ یعنی تم یہ تو دیکھو کہ تم نے ان قدر گناہ کیے ہیں کہ تم نے اُس خدا کو بھی ناراض کر دیا ہے جو رحمت عامہ کا مرکز ہے۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: لیکن انہوں نے پروردگار کی یاد سے منہ موڑ لیا ہے، نہ اس کے انبیاء کے واعظ و نصائح طرف کان دھرتے ہیں اور نہ ہی خدا اور اس کی نعمتوں کی یاد ان کے دلوں کو ہلاتی ہے اور نہ ایک لمحہ کے لیے بھی اس بارے میں سوچتے ہیں، بلکہ انہوں نے اپنے پروردگار کی یاد سے منہ پھیر لیا ہے: (بل هو عن ذکر ربہم معرضون)۔ پھر سوال کیا گیا ہے کہ: یہ ظالم اور گنہگار کافر، خدائی عذاب کے مقابلے میں کس پر اعتماد کیے ہوئے ہیں؟ کیا وہ ایسے مار کھتے ہیں جو ہمارے مقابلہ میں ان کا دفاع کر سکیں: (ام لہم اللہ تمنعہم من ذنوبنا)۔

ان کے یہ جہلی خدا تو خود اپنی مدد بھی نہیں کر سکتے اور نہ اپنا دفاع کر سکتے ہیں: (لایستطیعون نصر انفسہم) اور نہ ہی ان کی ہماری طرف سے رحمت اور معنوی قوت کے ذریعے کوئی مدد کی جائے گی اور نہ ہی ان کا کسی طرح سے کوئی نفع دیا جائے گا: (ولاہو مننا یصحبون)۔

بعد والی آیت میں بے ایمان لوگوں کی سرکشی اور طغیان کی ایک اہم علت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بیان کیا گیا ہے: تم نے انہیں اور ان کے آباء و اجداد کو انواع و اقسام کی نعمتیں عطا کیں، یہاں تک کہ انہوں نے طولانی عمریں پائیں۔ (بل متعنا ولادہ و اباؤنا وحقی طال علیہم العمر)۔

لیکن بجائے اس کے کہ یہ طولانی عمر اور فراوان نعمت ان میں شکرگزاری کا احساس اُجارتی اور وہ حق تعالیٰ کے آستانِ عبودیت میں سر رکھتے، یہی ان کے غرور اور طغیان کا سبب بن گئی۔

لیکن کیا وہ یہ نہیں دیکھتے کہ یہ جہان اور اس کی نعمتیں پائیدار نہیں ہیں۔ کیا وہ یہ نہیں دیکھتے کہ ہم مسلسل زمین اور زمین کے بننے والوں میں کمی کر رہے ہیں: (افلا یرون انانا ناک الارض ننقصہا من اطرافہا)۔

اقوام و قبائل یکے بعد دیگرے آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں، چھوٹے اور بڑے افراد میں سے کوئی بھی عرصہ جلدی نہیں رکھتا اور سب کے سب اپنا سر نقاب فنا چھپا رہے ہیں۔ وہ قومیں جو ان سے زیادہ قوی، زیادہ طاقتور اور زیادہ سرکش تھیں سب نے تاریک فانی کے نیچے اپنا منہ چھپا لیا۔ یہاں تک کہ دانشمند بزرگ اور علماء کہ جو اقوام زمین تھے، انہوں نے بھی اس جہان سے آنکھیں بند کر لیں اور ان حالات میں کیا وہ غالب ہیں، یا ہم غالب ہیں: (افہو الغالبون)۔

اس بارے میں کہ "انانا ناک الارض ننقصہا من اطرافہا" (ہم زمین کی طرف آتے ہیں اور مسلسل اس کے اطراف کم کرتے رہتے ہیں) کے جملہ سے کیا مراد ہے، مفسرین نے مختلف باتیں کی ہیں۔

۱۔ "یصحبون" باب افعال سے ہے۔ اصل میں اس کا معنی ہے کسی چیز کو مدد اور حمایت کے طور پر کسی شخص کو دے دینا۔ یہاں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ بُت ذاتی طور پر دفاع کی قدرت رکھتے ہیں اور نہ ہی پروردگار کی طرف سے اس قسم کی قدرت ان کے اختیار میں دی گئی ہے اور ہم جانتے ہیں کہ عالم ہستی میں ہر ذراتی قوت یا کسی ذات کے اندر سے اُبھرتی ہے یا خدا کی طرف سے دی جاتی ہے۔

۱۔ بعض نے تو یہ کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ خدا مشرکین کی زمینوں اور بستیوں میں بتدریج کمی کر رہا ہے اور مسلمان شہروں میں اضافہ کر رہا ہے۔ لیکن اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہ سورہ مکہ میں نازل ہوئی اور اس زمانے مسلمانوں کو ایسی فتوحات حاصل نہیں ہو رہی تھیں، یہ تفسیر مناسب نظر نہیں آتی۔

۲۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد زمینوں کی تدریجی غزالی اور دریائی ہے۔

۳۔ بعض اسے زمین میں رہنے والوں کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں۔

۴۔ بعض نے یہاں خصوصیت سے دانشمندان اور علماء کا ذکر کیا ہے۔

لیکن ان سب سے زیادہ مناسب بات یہ ہے کہ زمین سے مراد اس دنیا کے مختلف علاقوں کے لوگ ہیں، وہ مختلف اطراف اور قومیں جو بتدریج دیا پر عدم کی طرف دوڑے پہلے جا رہے ہیں اور دنیا کی زندگی کو الوداع کہہ رہے ہیں۔ اور اس طرح سے دائمی طور پر بعض روایات میں کہ جو آئمہ اہل بیت سے نقل ہوئی ہیں، یہ آیت علماء اور دانشمندان کی موت سے تعبیر ہوتی ہے۔ امام علیہ السلام فرماتے ہیں:

نقصانها ذهاب عالمها

زمین کا نقصان اور کم ہونا علماء کے فقدان کے معنی میں ہے۔

الذی ہم جلستہ ہیں کہ یہ روایات عموماً واضح اور ظاہر مصداق بیان کرنے کے لیے ہیں نہ یہ کہ منہوم آیت کو مخصوص افراد میں اٹھا کر دیں۔

اس طرح سے آیت کا منشا دمنوم یہ ہے کہ بزرگوں، بڑی بڑی قوموں یہاں تک کہ علماء کی تدریجی موت کو، مغرور اور بے خبر کافروں کے لیے ایک درس عبرت کے طور پر بیان کرے اور اس بات کی نشاندہی کرے کہ غلے سے متاثرہ ہونے کی صورت میں ان کے لیے کامیابی ممکن نہیں۔

اس کے بعد یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ پیغمبر کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ لوگوں کو وحی کے ذریعے ڈرائے۔ اس لیے ڈنٹے ٹھنی پیغمبر کی طرف کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ان سے کہہ دو کہ میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا، میں تو صرف وحی کے ذریعے تمہیں ڈرتا ہوں (قل انما اناذرکم بالوحی)۔

اور اگر تمہارے سخت دل پر اس کا اثر نہیں ہوتا تو یہ بات باعث تعجب نہیں ہے اور نہ ہی دہی آسانی میں کسی نقص کی دلیل ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ "بہرے لوگوں کو جب ڈرایا جاتا ہے تو وہ سُنتے ہی نہیں" (ولا یسمع الصم الدعاء اذا ما یبذرون)۔

سُننے والے کان کی ضرورت ہے تاکہ وہ خدا کی بات سُننے لگے ایسے کان کی کہ جن پر گناہ، غفلت اور غرور کے پردے اس طرح پڑے ہوتے ہوں کہ وہ حق بات سُننے کی اہلیت بالکل کھو چکے ہیں۔

۲۶۔ وَلَئِنْ مَسَّتْهُمْ نَفْحَةٌ مِّنْ عَذَابِ رَبِّكَ لَيَقُولُنَّ يُوَيْلَنَا اِنَّا كُنَّا ظَالِمِينَ

۲۷۔ وَنَضَعُ الْمَوَازِينَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا

۲۸۔ وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَاهَا وَكَفَىٰ بِنَا حَاسِبِينَ

ترجمہ

۲۶۔ اگر تیرے پروردگار کا معمولی سا عذاب بھی انہیں چھو لے تو وہ بیخ اٹھیں اور کہنے لگیں کہ ہائے افسوس ہم تو سب ظالم تھے۔

۲۷۔ قیامت کے دن ہم عدل کے ترازو نصب کریں گے، لہذا کسی بھی شخص پر فراسی بھی زیادتی نہیں ہوگی، اور اگر کسی نے دلی برابر بھی کوئی نیکی یا برائی کی ہوگی تو ہم اس کو حاضر کر دیں گے اور اس کے لیے یہی کافی ہے کہ حساب کرنے والے ہم ہوں گے۔

تفسیر

قیامت میں عدل کے ترازو:

گذشتہ آیات میں بے ایمان لوگوں کے غرور اور بے خبری کی حالت بیان کی گئی تھی۔ زیر نظر آیات میں فرمایا گیا ہے: یہ مغرور اور بے خبر لوگ نعمت اور سکون کی حالت میں تو بہرگز خدا کے بندے نہیں بننے (لیکن) اگر تیرے پروردگار کے عذاب کا ایک ذرہ بھی ان کے دامن کو آگے۔ تو اس طرح سے وحشت زدہ ہو جائیں اور چیخنے لگیں کہ ہائے افسوس ہم تو سب سب ظالم تھے (ولئن مسَّتْهُمْ نَفْحَةٌ مِّنْ عَذَابِ رَبِّكَ لَيَقُولُنَّ يُوَيْلَنَا اِنَّا كُنَّا ظَالِمِينَ)۔

مفسرین اور ارباب لغت کے قول کے مطابق لفظ "نَفْحَةٌ" حقیر یا کم مقدار چیز یا ظلم ہوا کے معنی میں ہے، اگرچہ یہ لفظ زیادہ تر رحمت و نعمت کی ہواؤں کے لیے استعمال ہوتا ہے لیکن عذاب کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

تفسیر کشاف کے مطابق "لَئِنْ مَسَّتْهُمْ نَفْحَةٌ"۔۔۔ میں تمہیں تعبیر ایسی ہیں کہ جو سب ناجبزی اور کمی کی طرف اشارہ

کرتی ہیں۔ "مس" کی تعبیر اور "نفخہ" کی تعبیر مادہ لغت کے اعتبار سے نیز وزن اور صیغہ کے لحاظ سے۔

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن یہ کہنا چاہتا ہے کہ یہ دل کے اندھے، سالہا سال تک پیغمبر کی باتیں اور وحی کی منتقلی سنتے رہتے ہیں ان پر کچھ بھی اثر نہیں ہوتا مگر جس وقت عذاب کا تازیانہ چاہے وہ کتنا ہی خفیف اور مختصر ہو۔ ان کی پشت پر گئے گا تو پھر ان کے پاؤں پھول جائیں گے اور کہنے لگیں گے کہ "انا کنا ظالمین"۔ تو کیا عذاب کا تازیانہ کھا کر ہی انہیں بیدار ہونا چاہیے؟ اس کا کیا فائدہ؟ کیونکہ یہ اضطرابی بیداری بھی ان کے لیے فائدہ مند نہیں ہوگی، اس لیے کہ اگر طوفان عذاب رگ جائے تو وہ سکون حاصل کر لیں تو وہ پھر اسی راستے پر چلنے لگیں گے اور وہی طرز عمل اپنالیں گے۔

زیر بحث دوسری آیت قیامت میں دقیق حساب کتاب اور عادلانہ جزا و سزا کی طرف اشارہ کر رہی ہے، تاکہ بے ایمان اور شکر گریہ جان لیں کہ اگر بالفرض دنیا کا عذاب انہیں دامگیر نہ ہوا تو آخرت کی سزا تو حتمی ہے اور باریک بینی کے ساتھ ان کے تمام اعمال کا حساب کتاب لیا جائے گا۔

لہذا ارشاد ہوتا ہے: ہم قیامت کے دن عمل کے ترازو نصب کریں گے: (ونضع الموازين القسط ليوم القيامة) "قسط" کبھی تو عدم تبعیض اور ٹکڑے ٹکڑے زکرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور کبھی مطلق طور پر عدالت کے معنی میں اور یہاں دوسرا معنی مناسب ہے۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ "قسط" لفظ یہاں پر "موازن" کی صفت کے طور پر آیا ہے۔ یہ ناپ تول کے ترازو ایسے دقیق اور منظم ہیں کہ گویا عین عدالت ہیں۔

اسی بنا پر ساتھ ہی مزید ارشاد ہوتا ہے: کسی بھی شخص پر دواں معمولی سا بھی ظلم و ستم نہیں ہوگا: (فلا تظلم نفس شيئا)۔ نہ نیکی کرنے والوں کی جزا میں کوئی کمی ہوگی اور نہ ہی بدکاروں کی سزا میں کوئی زیادتی کی جائے گی۔ لیکن ظلم و ستم کی اس نفی کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ حساب کتاب میں باریک بینی نہیں ہوگی بلکہ "اگر رائی کے برابر بھی کسی کا کوئی نیک یا بد کام ہوگا، تو ہم اُسے حاضر کر دیں گے" (اور اُسے تول کر دکھائیں گے): (وان كان مثقال حبة من خردل اتينا بها)۔ "اور (عدل کے لیے) اتنی بات ہی کافی ہے کہ بندوں کے اعمال کا حساب کرنے والے ہم خود ہوں گے؟ (و کفی ببلندہ بین)۔ "خردل" کالے رنگ کے بہت چھوٹے چھوٹے دانوں والی ایک گھاس ہوتی ہے۔ یہ چھوٹے پن اور حقیر اور معمولی چیز ہونے میں ضرب المثل ہے۔

اس تعبیر کی ایک نظیر قرآن میں ایک اور جگہ "مثقال ذرة"۔ "ایک ذرہ کا وزن" (ایک بہت ہی چھوٹی سی چیز نئی یا مٹی اور لہ: اگرچہ "موازن" جمع ہے اور "قسط" مفرد لیکن اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ قسط مصدر ہے اور مصدر کی جمع نہیں ہوتی لہذا کوئی مشکل پیدا نہیں ہوتی۔

لہ: ہمارے دن اسے "دائی" کہتے ہیں۔ (مترجم)

یہ چھوٹا سا ذرہ کے عنوان سے آئی ہے۔ (ذلال۔ ۷)

یہ بات قابل توجہ ہے کہ قرآن مجید میں چھ موقعوں پر "مثقال ذرة" کی تعبیر اور دو موقعوں پر "مثقال حبة من خردل" آئی ہے۔

در حقیقت زیر نظر آیت میں قیامت کے دن کے دقیق حساب و کتاب کے سلسلے پر چھ مختلف تعبیروں کے ساتھ تاکید ہوئی ہے۔

۱. لفظ "موازن" وہ بھی جمع کی صورت میں

۲. پھر "قسط" کے وصف کا ذکر

۳. اس کے بعد ظلم کی نفی پر تاکید "فلا تظلم نفس"

۴. اس کے بعد کلمہ "شيئا" (کوئی بھی چیز) کا استعمال

۵. اور اس کے بعد دائی کے وزن کی مثال

۶. اور آخر میں "کفی بنا حاسبين" (یہی کافی ہے کہ حساب لینے والے ہم ہیں گے

کا جملہ)

یہ سب تاکیدیں اس بات کی دلیل ہیں کہ قیامت کے دن حساب کتاب حد سے زیادہ دقیق اور ہر قسم کے ظلم و ستم سے پاک ہوگا۔ اس بارے میں کرناپ تول کے ترازو سے مراد کیا ہے؟ بعض نے تو یہ خیال کیا ہے کہ دواں اس دنیا کے ترازو کی طرح کے ترازو میں ہوں گے اور اس بنا پر فرض کر لیا ہے کہ انسان کے اعمال دواں پر بوجھ اور وزن رکھتے ہوں گے تاکہ وہ ان ترازو دواں میں اکیلے کے قابل ہوں۔

لیکن یہ بات یہ ہے کہ یہاں پر "میزان" ناپ تول اور وزن کرنے کے وسیلہ اور ذریعہ کے معنی میں ہے اور ہم جانتے ہیں کہ ہر چیز کے وزن کرنے کا وسیلہ اور ذریعہ خود اس کی مناسبت سے ہوتا ہے۔ ہر ماسیٹر (گرمی کی مقدار معلوم کرنے کا آلہ) برقی میٹر (جوا کی رفتار معلوم کرنے کا آلہ) اور اسی طرح دوسرے موازن۔ ہر ایک اسی چیز کے مطابق ہوتا ہے، جسے اس وسیلہ اور ذریعہ سے ماپنا مطلوب ہوتا ہے۔

امادیت اسلامی میں آیا ہے کہ قیامت کے دن وزن کرنے کے ترازو انبیاء، آئمہ اور نیک پاک لوگ ہوں گے کہ جن کے نام اعمال میں کوئی تاریک نقطہ ہے ہی نہیں۔

ہم (زیارت میں) پڑھتے ہیں:

السلام علی میزان الاعمال

اعمال کے ترازو پر سلام ہے۔

(اس موضوع کی مزید تفصیل جلد ۳ کے صفحہ ۳۳ — پر دیکھیے)

یہ بھی ممکن ہے کہ "موازن" کا ذکر جمع کی صورت میں (کہ جو میزان کی جمع ہے) اسی بات کی طرف اشارہ ہو کیونکہ مردان حق

میں سے ہر ایک انسان کے اعمال کے لیے کسی نہ کسی ناپ تول کی میزان ہیں۔ علاوہ اس کے کہ وہ سب کے سب برے رکھتے ہیں لیکن پھر بھی ان میں سے ہر ایک کا ایک خاص امتیاز بھی ہے کہ جو اس خاص حصے کی ناپ تول کے لیے ترازو میں دوسرے نفلوں میں جو شخص جتنی مقدار میں ان سے شبہت رکھتا ہوگا اور صفات و اعمال کے لحاظ سے ان بزرگوں کے ہم آہنگ ہوگا، اسی قدر اس کا وزن بوجھل ہوگا۔ جس قدر وہ ان بزرگوں سے دور اور ان سے مختلف ہوگا، اتنا ہی ہلکا وزن رکھتا ہوگا۔

- ۴۸۔ وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى وَهَارُونَ الْفُرْقَانَ وَضِيَاءً وَقَذَرْنَا لِلْمُتَّقِينَ
 ۴۹۔ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُم بِالْغَيْبِ وَهُمْ مِنَ السَّاعَةِ
 مُشْفِقُونَ
 ۵۰۔ وَهَذَا ذِكْرٌ مُبْرَكٌ أَنْزَلْنَاهُ ۖ أَفَأَنْتُمْ لَهُ مُنْكَرُونَ

ترجمہ

۴۸۔ ہم نے موسیٰ و ہارون کو فرقان (حق کو باطل سے جدا کرنے کا وسیلہ) اور پرہیزگاروں کے لیے نصیحت کا ذریعہ عطا فرمایا۔

۴۹۔ وہی (پرہیزگار) کہ جو اپنے پروردگار سے غیب میں ڈرتے ہیں اور قیامت کا خوف رکھتے ہیں۔

۵۰۔ اور یہ قرآن ایک مبارک ذکر ہے، جسے ہم نے (تم پر) نازل کیا ہے۔ تو کیا تم اس کا انکار کرتے ہو؟

تفسیر

انبیاء کی کچھ داستان :

ان آیات میں اور ان کے بعد انبیاء کی زندگی کے کچھ حالات بیان ہوئے ہیں کہ جن میں بہت سے تربیتی نکات ہیں۔ ان حالات سے پیغمبر اسلام کی نبوت کے بارے میں گزشتہ بحثوں اور مخالفین کے ساتھ ان کے مقابلے اور مشکلات، زیادہ واضح ہو جاتے ہیں کیونکہ ان میں بہت سے مشترک پہلو موجود ہیں۔

پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے : ہم نے موسیٰ و ہارون کو "فرقان" یعنی حق کو باطل سے جدا کرنے کا ذریعہ، اور پرہیزگاروں

یہ نصیحت عطا کی : (وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى وَهَارُونَ الْفُرْقَانَ وَضِيَاءً وَقَذَرْنَا لِلْمُتَّقِينَ)

"فرقان" دراصل ایسی چیز کے معنی میں ہے کہ جو حق کو باطل سے جدا کر دے اور ان دونوں کی پہچان کا ذریعہ ہو۔ یہ کہنے کے مراد کیا ہے : تو علمائے اس کے لیے متعدد تفسیریں بیان کی ہیں۔ بعض نے تو اس سے مراد تورات لی ہے۔

بعض نے اسے بنی اسرائیل کے لیے دریا کا شق ہو جانا سمجھا ہے کہ جو حق کی عظمت اور موسیٰ کی حقانیت کی واضح نشانی تھی۔ جبکہ بعض نے ان تمام دلائل اور سارے معجزات کو جو موسیٰ و ہارون کو دینے گئے تھے، کی طرف اشارہ سمجھا ہے۔ لیکن یہ تمام تفاسیر ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں کیونکہ ممکن ہے کہ فرقان "تورات" کی طرف بھی اشارہ ہو، اور موسیٰ کے معجزات و دلائل کی طرف بھی اشارہ ہو۔

نیز تمام آیات میں "فرقان" کا کبھی تو خود "قرآن" پر اطلاق ہوا ہے۔ مثلاً :

تبارک الذی نزل الفرقان علی عبده لیكون للعالمین نذیرا
 بزرگ اور برکتوں والا ہے وہ خدا کہ جس نے اپنے بندہ پر فرقان کو نازل کیا تاکہ وہ سارے
 جہان والوں کو ڈرانے والا ہو۔ (مشتقان - ۱)

کبھی ان معجزات کا کیا بیان ہے، اس لفظ کا اطلاق ہوا ہے کہ جو پیغمبر اکرم کو حاصل ہوئیں۔ جیسا کہ جنگ بدر کے بارے میں یوم الفرقان فرمایا ہے۔ (انفال - ۴۱)

باقی را لفظ "ضیاء" تو وہ نور اور روشنی کے معنی میں ہے کہ جو کسی ذات کے اندر سے پیدا ہو اور سلیقہ طور پر قرآن، تورات اور انبیاء کے معجزات اسی طرح کے ہیں۔

"ذکر" ہر وہ چیز ہے کہ جو انسان کو غفلت اور بے خبری سے دور رکھے اور یہ بھی آسمانی کتابیں اور خدائی معجزات کے واضح آثار ہیں سے ہے۔

ان تینوں تعبیروں کو یکے بعد دیگرے بیان کرنا، گویا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسان مقصد تک پہنچنے کے لیے پہلے فرقان کا محتاج ہے۔ یعنی دور راہے یا چہ راہے پر کھڑا ہوا اصلی راستے کو معلوم کرے۔ جب وہ اپنے مقصد تک پہنچنے کا راستہ معلوم کرے تو پھر راستہ چلتے چلتے کبھی رکاوٹ بھی پیش آجاتی ہے۔ ایسی رکاوٹوں میں سب سے اہم غفلت ہے۔ لہذا کسی ایسے وسیلے اور ذریعے کا محتاج ہے کہ جو اسے مسلسل خبردار کرتا رہے، یاد دلاتا رہے اور ڈکڑتا رہے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ "فرقان" معرذ کی صورت میں آیا ہے اور "ضیاء" اور "ذکر" نکرہ کی صورت میں ہے اور ان کے اثر متعلق اور پرہیزگاروں کے ساتھ مخصوص قرار دیا گیا ہے۔ تعبیر کا یہ فرق ممکن ہے کہ اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ معجزات اور پیام آسمانی کو سب کے لیے راستہ واضح کرتے ہیں لیکن سب لوگ ایسے نہیں ہوتے کہ جو مصمم ارادہ کر لیں اور ضیاء و ذکر سے استفادہ کریں۔ بلکہ

ضیاء کے معنی اور ذریعے اس کے فرق کے بارے میں سورہ حیونس سے آیت ۵ کے ذیل میں ہم نے جگہ ۵ میں مزید وضاحت کی ہے۔

وہ صرف وہی لوگ ہوتے ہیں کہ جو مسئولیت اور ذمہ داری کا احساس کرتے ہیں اور تقویٰ شعار ہوتے ہیں۔

بعد والی آیت پر سیرگاردوں کا اس طرح تعارف کراتی ہے: وہ وہی لوگ ہیں کہ جو اپنے پروردگار سے غیب میں احوال ڈرتے ہیں: (الذین یخشون ربہم بالغیب)۔

اور قیامت کے دن کا خوف رکھتے ہیں: (وہم من الساعۃ مشفقون)۔

لفظ "غیب کی بیماں پر دو تفسیر کی گئی ہیں۔ پہلی تفسیر تو یہ ہے کہ یہ پروردگار کی ذات پاک کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی پاک کے کہ خدا نظر دل سے پوشیدہ اور پنهان ہے، وہ عقل کی دلیل کی بنا پر اس پر ایمان لاتے ہیں۔ اور اس کی پاک ذات کے سامنے اور ذمہ داری کا احساس کرتے ہیں۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ پر سیرگار لوگ صرف معاشرے کے سامنے ہی خدا کا خوف نہیں رکھتے، بلکہ اپنی خلوت گاہوں میں حاضر و ناظر سمجھتے ہیں۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ خدا سے خوف کے لیے لفظ "خشیت" استعمال ہوا ہے۔ اور قیامت کے بارے میں اس کی تعبیر آئی ہے۔ یہ دونوں الفاظ اگرچہ خوف کے معنی میں ہیں لیکن کتاب مفردات میں راعب کے قول کے مطابق "خشیت" اس میں بولا جاتا ہے کہ جب خوف احترام و تعظیم کے ساتھ ہو۔ اس خوف کی مانند کہ جو ایک بیٹا اپنے والد بزرگوار سے رکھتا ہے، اس پر سیرگاروں کا خدا سے خوف معرفت کے ساتھ ملا ہوا ہوتا ہے۔

لیکن "اشفاق" کا لفظ اس تعلق اور توجہ کے معنی میں ہے کہ جو خوف سے ملا ہوا ہو۔ مثلاً یہ تعبیر کبھی اولاد اور دوستوں کے بارے میں استعمال ہوتی ہے کہ انسان جن سے تعلق اور دوستی رکھتا ہے لیکن اس کے باوجود چونکہ وہ آفات و تکلیف میں گرفتار ہو سکتا ہے لہذا ان کے بارے میں ڈرتا رہتا ہے۔

حقیقت میں پر سیرگار لوگ قیامت کے دن سے بہت لگاؤ اور تعلق رکھتے ہیں کیونکہ وہ جزا اور خدا کی رحمت کا مرکز ہے۔ اس کے باوجود معاملہ حساب و کتاب کا بھی خوف رکھتے ہیں۔

البتہ بعض اوقات یہ دونوں الفاظ ایک ہی معنی میں بھی استعمال ہوتے ہیں۔

آخری زیر بحث آیت میں قرآن کا گزشتہ کتابوں سے ایک موازنہ کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: یہ ایک مبارک ذکر ہے جسے ہم نے تم پر نازل کیا ہے: (ولہذا ذکر مبارک انزلناہ)۔

کیا تم اس کا انکار کرتے ہو: (افانتولہ منکرون)۔

انکار کیوں کرتے ہو؟ یہ تو ذکر ہے اور تمہارے لیے بیداری و آگاہی اور یاد آوری کا باعث ہے۔ یہ تو مرکز برکت ہے اس میں دنیا و آخرت کی بھلائی ہے اور یہ تمام کامیابیوں اور خوش بختیوں کا سرچشمہ ہے۔

کیا ایسی کتاب سے بھی انکار کی گنجائش ہے؟ اس کی حقانیت کی دلیلیں خود اسی کے اندر پوشیدہ ہیں، اس کی نورانیت آشکار

اس کے راستے پر چلنے والے سعادت مند اور کامیاب ہیں۔

اس بات کو جاننے کے لیے کہ یہ قرآن کس حد تک آگاہی کا سبب اور برکت کا موجب ہے، یہی بات کافی ہے کہ ہم قرآن کے دل سے جزیرہ عرب میں رہنے والوں کی حالت کو دیکھیں۔ کہ وہ وحشت و ہلاکت، فقر و فاقہ، بد بختی اور پراگندگی میں زندگی بسر کرتے تھے اور ان کی نزول قرآن کے بعد کیا کیفیت ہو گئی۔ بعد میں وہ دوسروں کے لیے اسوہ اور نمونہ بن گئے۔ اسی طرح دوسری قوم کی کے درمیان قرآن کے ورود سے پہلے اور بعد کی وضع و کیفیت کو دیکھیں۔

۵۱۔ وَلَقَدْ آتَيْنَا إِبْرَاهِيمَ رُشْدَهُ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهِ عَالِمِينَ ۝

۵۲۔ اِذْ قَالَ لِأَبِيهِ وَقَوْمِهِ مَا هَذِهِ التَّمَاثِيلُ الَّتِي أَنتُم لَهَا عَافُونَ ۝

۵۳۔ قَالُوا وَجَدْنَا آبَاءَنَا لَهَا عِبَادِينَ ۝

۵۴۔ قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ أَنتُمْ وَآبَاؤُكُمْ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۝

۵۵۔ قَالُوا اجْتَنِبْنَا بِالْحَقِّ أَمْ أَنْتَ مِنَ اللَّاعِبِينَ ۝

۵۶۔ قَالَ بَلْ رَبُّكُمْ رَبُّ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ الَّذِي فَطَرَهُنَّ وَأَنَا عَلَىٰ

۵۷۔ ذَٰلِكُمْ مِنَ الشَّكِّينَ ۝

۵۸۔ وَتَاللَّهِ لَأَكِيدَنَّ أَصْنَامَكُمْ بَعْدَ أَنْ تُولُوا مُدْبِرِينَ ۝

۵۹۔ فَجَعَلَهُمْ جُذُا ۖ الْاَكْبَرُ اَلْهُوَ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ۝

ترجمہ

۵۱۔ ہم نے ابراہیم کو پہلے ہی رشد و ہدایت (کا ذریعہ) دے دیا تھا اور ہم اس (کی اہلیت) سے آگاہ تھے۔

۵۲۔ جس وقت اُس نے اپنے باپ (چچا آذر) اور اپنی قوم سے کہا کہ یہ بے روح مجسمے کہ جن کی تم ہمیشہ پرستش کرتے رہتے ہو، کیا ہیں؟

۵۳۔ (انہوں نے) کہا کہ ہم نے اپنے آباء و اجداد کو دیکھا ہے کہ وہ ان کی عبادت کرتے ہیں۔

۵۴۔ (ابراہیم نے) کہا کہ یقیناً تم بھی اور تمہارے آباء و اجداد بھی کھلی گمراہی میں پڑے رہے ہو۔

۵۵۔ (انہوں نے) کہا کہ کیا تو حق بات لے کر ہمارے پاس آیا ہے، یا مذاق کر رہا ہے؟

۵۶۔ (ابراہیم نے) کہا (میں تو کامل طور پر حق لے کر آیا ہوں کہ) تمہارا پروردگار تو وہی آسمانوں اور زمین کا پروردگار ہے جس نے ان کو پیدا کیا ہے اور میں بھی اس بات کا گواہ ہوں۔

۵۷۔ خدا کی قسم میں تمہارے جانے کے بعد تمہاری غیبت میں تمہارے بتوں کی نابودی کا منصوبہ بناؤں گا۔

۵۸۔ آخر کار (ایک مناسب موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے) ان کے بڑے بت کے سوا۔ ان سب کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تاکہ وہ اس کے پاس آئیں (اور وہ بڑا بت ان سے حقیقت بیان کرے)۔

تفسیر

ابراہیمؑ بتوں کی نابودی کا منصوبہ بناتے ہیں :

ہم بیان کر چکے ہیں کہ اس سورہ میں۔ سولہ پیغمبروں کے حالات اور واقعات بیان ہوئے ہیں اور اس سورہ کے نام سے بھی ظاہر ہے کہ یہ انبیاء کے بارے میں ہے۔ گزشتہ آیات میں موسیٰ و ہارون کی رسالت کی طرف کچھ اشارہ ہوا ہے۔ زیر بحث آیات میں حضرت ابراہیمؑ کی زندگی اور بت پرستی کے ساتھ ان کی معرکہ آرائی کا ایک اہم حصہ بیان ہو رہا ہے۔ پہلے فرمایا گیا ہے۔ ہم نے رشد و ہدایت کا وسیلہ پہلے سے ابراہیمؑ کو دے دیا تھا اور ہم اس کی اہلیت سے آگاہ تھے: (ولقد اتینا ابراہیم ہدایتاً و رشدہ من قبل و کتابہ عالمین)۔

”رشد“ اصل میں مقصد تک راہ پانے کے معنی میں ہے اور یہاں ممکن ہے حقیقت توحید کی طرف اشارہ ہو کہ ابراہیمؑ پہلی ہی میں اُس سے آگاہ ہو گئے تھے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس لفظ کے وسیع معنی کے لحاظ سے، ہر قسم کی خیر و صلاح کی طرف اشارہ ہو۔ ”کتابہ عالمین“ کا جملہ ان سب نعمات کو حاصل کرنے کے لیے ابراہیمؑ کی صلاحیتوں کی طرف اشارہ ہے کیونکہ درحقیقت خدا کوئی نعمت کسی کو بلا وجہ نہیں دیتا۔ یہ صلاحیتیں اور لیاقتیں ہی ہیں کہ جن کی بنا پر نعمات الہی حاصل ہوتی ہیں اگرچہ مقام نبوت بھی ایک مقام نعمت و عطا ہے۔

اس کے بعد حضرت ابراہیمؑ کے ایک اہم کام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ابراہیمؑ کا یہ رشد و ہدایت اس وقت ظاہر ہوا کہ جب اُس نے اپنے باپ (یہ ان کے چچا آذر کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ عرب بعض اوقات چچا کو بھی ”اب“ کہتے ہیں) اور اپنی قوم سے کہا کہ یہ سورتیاں کیا ہیں کہ جن کے تم گرویدہ ہو اور رات دن ان کا طواف کرتے ہو اور ان سے دستبردار نہیں ہوئے: (اذ قال لابیہ و قومہ ما ہذہ التماثل التی انتم لہا عاکفون)۔

حضرت ابراہیمؑ نے یہ الفاظ کہہ کر ان بتوں کی کہ جو ان کی نظروں میں انتہائی عظمت رکھتے تھے، شدت سے تحقیر و تذلیل کی۔

۵۹۔ ”ما ہذہ“ (یہ کیا ہیں؟) کہا۔ دوسرے: ”تماثل“ کی تعبیر استعمال کی کیونکہ ”تماثل“ ”تماثل“ کی جمع ہے اور یہ ہر وہ چیز ہے جو مجسمہ کے معنی میں ہے (بت پرستی کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ شروع شروع میں یہ تصاویر اور مجسمے انبیاء اور ملکا کی یادگار کے طور پر تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ ایسے مقدس سمجھے جانے لگے کہ معبود بن گئے)۔

”انتہو لہا عاکفون“ میں ”عکوف“ احترام کے ساتھ ملی ہوئی خدمت کے معنی میں ہے کہ جو اس بات کی شاندار گواہی دیتی ہے کہ انہوں نے بتوں کے ساتھ ایسی دل بستی پیدا کر لی تھی اور ان کے آستانے پر اس طرح سر جھکاتے تھے اور ان کے گرد چکر لگاتے تھے کہ گویا ہمیشہ کے لیے ان کے ملازم اور خدمت گار ہیں۔

ابراہیمؑ کی یہ گفتگو درحقیقت بت پرستی کے ابطال کے لیے ایک واضح اور روشن استدلال ہے کیونکہ بتوں میں ہم جو کچھ دیکھتے ہیں وہ یہی مجسمہ و تماثل ہی ہے۔ باقی تخیل ہے اور تو ہم ہے اور خیال۔ کونسا عقلمند انسان خود کو اس بات کی اجازت دے گا کہ وہ ایک چھوٹے سے پتھر اور لکڑی کے لیے اس قدر عظمت، احترام اور قدرت کا قائل ہو جائے۔ آخر وہ انسان کہ جو خود اشرف مخلوقات اپنی ہی بنائی ہوئی چیز کے سامنے اس طرح سے خضوع و خشوع کیوں کرے اور اپنی مشکلات کا حل اس سے کیوں طلب کرے؟

لیکن بت پرست درحقیقت اس منہ بولتی اور واضح منطق کا کوئی جواب نہیں رکھتے تھے۔ سوائے اس کے کہ اس کی طرف سے اپنے بڑوں کے سر تعظیم دیں۔ لہذا انہوں نے کہا: ہم نے اپنے آباؤ اجداد اور بڑوں کو دیکھا ہے کہ وہ ان کی پرستش کرتے ہیں اور ہم اپنے بڑوں کی سنت کو پورا کر رہے ہیں: (قالوا وجدنا آباؤنا علیہا عابدين)۔

چونکہ صرف بڑوں کی سنت اور روش کسی مشکل کو حل نہیں کرتی اور ہمارے پاس اس بات کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے کہ بزرگان گزشتہ آئندہ آنے والی نسلوں سے زیادہ عالم اور زیادہ عاقل تھے۔ بلکہ اکثر معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے کیونکہ زمانہ گزرنے کے ساتھ علم و دانش بڑھتی رہتی ہے۔ لہذا حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا انہیں جواب دیا: تم بھی اور تمہارے آباؤ اجداد بھی یقیناً واضح گمراہی میں تھے: (قال لقد کنتمو انتم و آباؤکم و کفری ضلال مبین)۔

یہ تعبیر کہ جس میں بہت سی تائیدیہ اور بڑی قاطعیت رکھتی ہیں، اس بات کا سبب بنی کہ بت پرست کچھ بڑوں میں آئیں اور تحقیق کی جانب مڑیں۔ ابراہیمؑ کی طرف رخ کر کے کہنے لگے: کیا سچ تو کوئی حق بات لے کر آیا ہے یا مذاق کر رہا ہے: (قالوا اجتہا بالحق ام انت من الملاحین)۔

کیونکہ وہ لوگ جنہیں بتوں کی پرستش کی عادت پڑ چکی تھی اور اسے ایک قطعی واقعیت سمجھتے تھے، یہ باور نہیں کرتے تھے کہ کوئی شخص سنجیدگی اور سچائی کے ساتھ بت پرستی کی مخالفت کرے گا۔ لہذا انہوں نے حضرت ابراہیمؑ سے تعجب کے ساتھ یہ سوال کیا۔ لیکن ابراہیمؑ نے صراحت کے ساتھ انہیں جواب دیا: میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ سنجیدہ، حکم اور عین واقعیت ہے کہ تمہارا

”ما“ اس قسم کے مرتضیٰ پر عموماً غیر عاقل کی طرف اشارہ ہوتا ہے اور اسم اشارہ قریب ہی ایسے مرتضیٰ پر۔ ایک قسم کی تحقیر کا ظاہر کرتا ہے۔ درجہ دوم کا اشارہ مناسب تھا۔

پروردگار آسمانوں اور زمین کا پروردگار ہے : (قَالَ بَلْ رِيكَو رَبِّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ) وہی خدا کہ جس نے انہیں پیدا کیا ہے اور خود بھی اس عقیدہ کے گواہوں میں سے ہوں (الَّذِي فَطَرَهُنَّ وَأَنَا عَلَى ذَٰلِكُمْ مِنَ الشَّاهِدِينَ)۔

حضرت ابراہیمؑ نے اپنی اس دو ٹوک گفتگو سے یہ واضح کیا کہ وہ ذات ہی پرستش کے لائق ہے کہ جو ان سب کی عزت کی اور تمام موجودات کی خالق ہے لیکن پھر اور کبھی کے ٹھوسے کہ جو خود ایک نابینا مخلوق ہیں، پرستش کے لائق نہیں ہیں۔ خاص طور پر "وَأَنَا عَلَى ذَٰلِكُمْ مِنَ الشَّاهِدِينَ" کے جملے نے یہ ثابت کیا کہ صرف میں ہی نہیں ہوں کہ جو اس حقیقت پر گواہ ہیں سب فہمیدہ، آگاہ اور صاحبان علم کہ جنہوں نے اندھی تقلید کے رشتوں کو توڑ دیا ہے۔ اس حقیقت پر گواہ ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کہ یہ بات سونی صد صحیح اور حکم ہے اور وہ اس عقیدہ پر ہر مقام تک قائم ہیں اور اس کے نتائج و لوازم کو جو کچھ بھی ہوں انہیں جان و دل سے قبول کرنے کے لیے تیار ہیں، مزید کہتے ہیں: مجھے خدا کی قسم، جس وقت تم یہاں پر موجود نہیں ہو گے اور یہاں سے کہیں باہر جاؤ گے تو میں تمہارے بتوں کو بھروسہ کرنے کا منصوبہ بناؤں گا۔ (وَتَاللَّهِ لَأَكِيدَنَّ أَصْنَامَكُمْ بَعْدَ أَنْ تُولُوا مَدِينًا)۔

"اکیدن" "حکید" کے مادہ سے لیا گیا ہے کہ جو پڑھنا، مضامین چارہ جی کے معنی میں ہے۔ ان کی مراد یہ تھی کہ انہیں صراحت کے ساتھ سمجھا دیں، کہ آخر کار میں اسی موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہیں نابود اور درہم برہم کر دوں گا۔ لیکن شاید ان کی نظر میں بتوں کی عظمت اور رعب اس قدر تھا کہ انہوں نے اس کو کوئی سنجیدہ بات نہ سمجھا اور کوئی رد عمل ظاہر نہ کیا۔ شاید انہوں نے یہ سوچا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص کی قوم و ملت کے مقدسات کے ساتھ ایسا کھیل کیسے جب کہ ان کی حکومت بھی سونی صد ان کی حامی ہے، وہ کس پرستے اور کس طاقت کے بل بوتے پر ایسا کرے گا؟

اس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ یہ جو بعض نے کہا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے یہ جملہ اپنے دل میں کہا تھا یا بعض نے کہا کہ اس کے علاوہ بعد کی چند آیات میں یہ بیان ہوا ہے کہ بت پرستوں کو ابراہیمؑ کی یہ بات یاد آگئی اور انہوں نے کہا کہ ہم نے سنا ہے کہ ایک جہان بتوں کے خلاف ایک سازش کی بات کرتا ہے۔

بہر حال حضرت ابراہیمؑ نے ایک دن جب کہ بت خانہ خالی چلا تھا اور بت پرستوں میں سے کوئی دہل موجود نہیں تھا، اپنے منصوبہ کو عملی شکل دے دی۔

اس کی وضاحت کچھ یوں ہے کہ بعض مفسرین کے قول کے مطابق بت پرست ہر سال ایک مخصوص دن بتوں کی عید مناتے تھے۔ طرح طرح کے کھانے پینے کی چیزیں، سب کے سب اکٹھے شہر سے باہر چلے جایا کرتے تھے اور شام دھلے واپس بت خانہ میں آتے تھے تاکہ وہ کھانے پینے کی چیزیں جو ان کے عقیدے کے مطابق منبرک ہو گئے تھے۔

حضرت ابراہیمؑ سے بھی انہوں نے تقاضا کیا کہ ان کے ساتھ چلیں لیکن انہوں نے بیماری کا عند کیا اور ان کے ساتھ نہ گئے۔ بہر حال وہ بغیر اس کے کہ اس کام کے خطرات سے ڈرتے یا جو طوفان اس کام کے بعد کھڑا ہوگا، اس کا کوئی خوف دل میں نہ تھا۔ روانہ دار میدان میں کود پڑے اور بڑی شجاعت سے ان ترلشے ہوئے خداؤں سے جنگ کرنے کے لیے چل پڑے کہ جن کے اتنے متعصب اور نادان عقیدت مند تھے۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے: ہولئے ان کے بڑے بت کے سب کو ٹھٹھکے ٹھٹھکے کر دیا: (فَجَعَلَهُمْ جَذًا الْأَكْبَرُ)۔

مقصود ان کا یہ تھا کہ شاید بت پرست لوٹ کر اس کے پاس آئیں اور وہ بھی ساری باتیں ان سے کہے (لَعَلَّهُمْ يَلْعَنُونَ)۔

چند اہم نکات

۱۔ بت پرستی کی مختلف شکلیں: یہ ٹھیک ہے کہ ہم بت پرستی کے لفظ سے زیادہ تر پتھر اور لکڑی کے بتوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں لیکن ایک لحاظ سے بت اور بت پرستی وسیع منہم کہتی ہے کہ جو غیر خدا کی طرف ہر قسم کی توجہ۔ خواہ وہ کسی بھی شکل و صورت میں ہو۔ پرمیٹ ہے اور مشہور و معروف حدیث کے مطابق کہ:

كُلُّ مَا شَفَلَتْ عَنْهُ لَٰهُ فَهُوَ صَنَمٌ

جو چیز بھی انسان کو اپنی طرف مشغول اور خدا سے دور کرے، وہ اس کا بت ہے۔

ایک حدیث میں اصبع بن نباتہ سے کہ جو علی علیہ السلام کے مشہور اصحاب میں سے ہیں، یہ بیان ہوا ہے کہ:

ان علیا مریقوم یلعبون الشطرنج فقال: ما هذه التماثیل

التي اشتولها عاکفون؟ لقد عصیت واللہ ورسولہ

امیر المومنین علیہ السلام کچھ لوگوں کے قریب سے گزرے۔ وہ شطرنج کھیل رہے تھے۔

آپ نے فرمایا: یہ مجھے (اور بت) کہ جن کے ساتھ تم مشغول ہو کیا ہیں؟ تم خدا کے بھی نافرمان ہو اور اس کے رسول کے بھی۔

۲۔ بت سے منسوب کیا ہے کہ "الیہ" کا مرجع خود حضرت ابراہیمؑ ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد بت پرست ہے لیکن پہلا معنی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے اور یہ جو کچھ مذکور بالا آیت میں بیان ہوا ہے کہ یہ ان کا بڑا تھا، لیکن یہ کہ یہ ظاہری بڑے ہونے کی طرف اشارہ ہوا ہے ہر وہ بت پرستوں کی نگاہ میں اس کے زیادہ احترام کی طرف یا دونوں کی طرف اشارہ ہو۔

۳۔ مجمع البیان، زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

۲۔ بُت پرستوں کی گفتگو اور ابراہیمؑ کا جواب : یہ بات قابل توجہ ہے کہ بُت پرستوں نے حضرت ابراہیمؑ کے جواب میں ازاں کی کثرت کا بھی ذکر کیا اور طویل زمانہ کا بھی۔ وہ کہنے لگے، ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو اسی دین پر پایا ہے۔ انہوں نے بھی دلوں جتنوں کا جواب دیا : تم بھی اور تمہارے آباؤ اجداد بھی ہمیشہ داغ گرہی میں رہے ہیں۔ یعنی عاقل انسان کہ جو استقلال نگری رکھتا ہو ہرگز ان ادھام کا پایہ نہیں ہوتا۔ نہ ہی کسی رسم اور سنت کے طرفداروں کی طرح۔ کو اس کی دوستی کی دلیل سمجھتا ہے اور نہ ہی اس کے ہمیشہ ہوتے رہنے کو اس کی حقانیت کی دلیل جانتا ہے۔

۵۹۔ قَالُوا مَنْ فَعَلَ هَذَا بِإِبْرَاهِيمَ إِنَّهُ لَمِنَ الظَّالِمِينَ ۝

۶۰۔ قَالُوا سَمِعْنَا فَتًى يَذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهُ إِبْرَاهِيمُ ۝

۶۱۔ قَالُوا فَاتَّبَعْنَاهُ عَلَىٰ أَعْيُنِنَا ۖ وَشَهِدُوا ۖ

۶۲۔ قَالُوا أَنْتَ فَعَلْتَ هَذَا بِإِبْرَاهِيمَ ۖ يَبْرَاهِيمُ ۝

۶۳۔ قَالَ بَلْ فَعَلَهُ كَبِيرُهُمْ هَذَا ۖ فَاسْأَلُوهُمْ ۖ إِنْ كَانُوا يَنْطِقُونَ ۝

۶۴۔ فَارْجِعُوا إِلَىٰ أَنفُسِكُمْ ۖ فَاقُولُوا إِنَّكُمْ أَنتُمُ الظَّالِمُونَ ۝

۶۵۔ ثُمَّ نَكْسُوْهُ عَلَىٰ رُءُوسِهِمْ ۖ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَّا هَؤُلَاءِ يَنْطِقُونَ ۝

۶۶۔ قَالَ أَفَتَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْئًا وَلَا يَضُرُّكُمْ ۝

۶۷۔ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝

ترجمہ

۵۹۔ انہوں نے کہا کہ جس نے بھی ہمارے معبودوں کے ساتھ ایسا سلوک کیا ہے۔ وہ قطعی طور ظالم و ستمگر ہے (اور اسے سزا ملنی چاہیے)

۶۰۔ (کچھ نے) کہا : ہم نے ایک جوان کو سنا ہے کہ جو بتوں کی (مخالفت) کی بات کرتا تھا، اس کا نام ابراہیمؑ ہے۔ (بعض نے) کہا : اُسے لوگوں کے سامنے پیش کر دو تاکہ وہ گواہی دیں۔

۶۱۔ (بعض نے) کہا : اُسے لوگوں کے سامنے پیش کر دو تاکہ وہ گواہی دیں۔

۶۲۔ (جب انہوں نے ابراہیمؑ کو حاضر کیا تو) اُس سے کہا : اے ابراہیمؑ کیا تُو نے ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ سلوک کیا ہے؟

۶۳۔ تو اُس نے کہا بلکہ یہ کام ان کے بڑے نے کیا ہوگا۔ انہی سے پوچھ لو اگر یہ بات کرتے ہیں۔

۶۴۔ وہ اپنے ضمیر کی طرف لوٹے (اور اپنے آپ سے) کہنے لگے کہ حق بات یہ ہے کہ تم خود ہی ظالم ہو۔

۶۵۔ اس کے بعد انہوں نے اپنا رخ موڑ لیا (اور اپنے ضمیر کی آواز کو بالکل بھلا دیا اور کہنے لگے) تو تو جانتا ہے کہ یہ بات نہیں کر سکتے۔

۶۶۔ (ابراہیمؑ نے) کہا : کیا تم خدا کو چھوڑ کر اُس کی پرستش کرتے ہو کہ جو نہ تو تمہیں کوئی فائدہ پہنچا سکتا ہے اور نہ نقصان (کہ جو تمہیں ان سے نفع کی کوئی اُمید ہو یا کسی نقصان کا خوف ہو)۔

۶۷۔ تُو جیسے تم پر بھی اور اس پر بھی جسے خدا کو چھوڑ کر پوجتے ہو کیا تم سوچتے نہیں ہو (اور کیا تمہارے پاس عقل نہیں ہے)۔

تفسیر

ابراہیمؑ کی دندان شکن دلیل :

آفریدہ عید کا دن ختم ہو گیا اور بُت پرست خوشی مناتے ہوئے شہر کی طرف چلے اور سب بُت خانے کی طرف گئے تاکہ بتوں سے اظہار عقیدت بھی کریں اور وہ کھانا بھی کھائیں کہ جو ان کے گمان کے مطابق بتوں کے پاس رکھے رہنے سے بابرکت ہو گیا تھا۔ جو بتی وہ بُت خانے کے اندر پہنچے تو ایک ایسا منظر دیکھا کہ ان کے ہوش اُڑ گئے۔ آباد بُت خانے کے بجائے بتوں کا ایک ٹھیر تھا ان کے ہاتھ پاؤں لٹھے ہوئے تھے اور وہ ایک دوسرے پر گرے ہوئے تھے۔ وہ تو چہینے چلانے لگے : یہ بلا اور مصیبت ہمارے خدائوں کے سر پر کون لایا ہے؟ (قَالُوا مَنْ فَعَلَ هَذَا بِإِبْرَاهِيمَ)۔

یقیناً جو کوئی بھی تھا، ظالموں میں سے تھا، (انہ لَمِنَ الظَّالِمِينَ)۔

اُس نے ہمارے خدائوں پر بھی ظلم کیا ہے، ہماری قوم اور معاشرے پر بھی اور خود اپنے آپ پر بھی کیونکہ اُس نے اپنے اس عمل سے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دیا ہے۔

لیکن وہ لوگ جو بتوں کے بارے میں ابراہیمؑ کی دھمکیوں سے آگاہ تھے اور ان جملی خدائوں کے بارے میں ان کی لعانت آمیز باتوں کو جانتے تھے، کہنے لگے : ہم نے سنا ہے ایک جوان بتوں کے بارے میں باتیں کرتا تھا اور انہیں برا بھلا کہتا تھا، اس کا نام ابراہیمؑ ہے (قَالُوا سَمِعْنَا فَتًى يَذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهُ إِبْرَاهِيمُ)۔

۱۔ بعض مفسرین منط "من" کو یہاں موصولہ سمجھتے ہیں لیکن بعد ال آیت کی طرف توجہ کرنے سے کہ جو سوال کا جواب ہے، اس طرح نظر آتا ہے کہ "من" یہاں استفہامیہ ہے۔

۲۔ جیسا کہ ہم نے پہلے ہی اشارہ کیا ہے۔ بُت پرست اس بات کے لیے بھی تیار نہیں تھے کہ وہ یہ کہیں کہ وہ جو ان بتوں کو بھلا کہتا تھا۔ بس تاکہ ان کو بتوں کے بارے میں اندازہ ہو۔

یہ ٹیکہ ہے کہ بعض روایات کے مطابق حضرت ابراہیمؑ اس وقت مکمل طور پر جوان تھے اور احتمالی یہ ہے کہ ان کی عمر ۱۶ سال سے زیادہ نہیں تھی اور یہ بھی درست ہے کہ جوافوی کی تمام خصوصیات، شجاعت، شہامت، صراحت اور قاطعیت ان کے وجود میں تھیں لیکن اس طرح سے بات کرنے سے بُت پرستوں کی مراد یقیناً تحقیر کے علاوہ کچھ نہیں تھی۔ بجائے اس کے کہ یہ کہتے کہ ابراہیمؑ یہ کام کیسا ہے کہتے ہیں کہ ایک جوان ہے کہ جسے ابراہیمؑ کہتے ہیں، وہ اس طرح کہتا تھا ... یعنی ایک ایسا شخص کہ جو بالکل گناہ اور ان کی نظر میں بے حیثیت ہے۔

اصولاً معمول یہ ہے کہ جب کسی جگہ کوئی جرم ہو جائے تو اس شخص کو تلاش کرنے کے لیے کہ جس سے وہ جرم سرزد ہوا ہو ان سے دشمنی رکھنے والوں کو تلاش کیا جاتا ہے اور اس ماحول میں ابراہیمؑ کے سوا مسلمان کوئی شخص بتوں کے ساتھ دست و گریبان نہیں ہو سکتا تھا کہ تمام افکار انہی کی طرف متوجہ ہو گئے اور بعض نے کہا: "اب جب کہ معاملہ اس طرح ہے تو جادو اور اس کو لوگوں کے سامنے پیش کرنا تاکہ وہ لوگ کہ جو پہلے ہی میں اور خبر رکھتے ہیں گواہی دیں: (قالوا فأتوا بہ علیٰ اعمین الناس لعلہم یشہدو)۔ بعض منسخرین نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ اس سے مراد حضرت ابراہیمؑ کی سزا کے منظر کا مشاہدہ ہے نہ کہ ان کے جرم ہونے کی شہادت۔ لیکن بعد کی آیات پر توجہ کرتے ہوئے کہ جو زیادہ تر باز پرس کا پہلو رکھتی ہیں، اس احتمال کی نفی ہو جاتی ہے۔ علاوہ ازیں حفظہ "عل" (شاید) کی تعبیر بھی دوسرے معنی کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتی، کیونکہ اگر لوگ سزا کا منظر دیکھنے کے لیے آئیں تو یقیناً لے دیکھیں گے اور اس کا مشاہدہ کریں گے۔ ایسے موقع پر شاید کی گنجائش نہیں ہے۔

منادی کرنے والوں نے شہر میں ہر طرف یہ منادی کی کہ جو شخص بھی ابراہیمؑ کی بتوں سے دشمنی اور ان کی بدگمانی کے بارے میں آگاہ ہے، حاضر ہو جائے۔ جلد ہی جو آگاہ تھے وہ لوگ بھی اور تمام دوسرے لوگ بھی جمع ہو گئے تاکہ دیکھیں کہ اس ملزم کا انجام کیا ہوتا ہے۔

ایک عجیب و غریب شور و غلغلہ لوگوں میں پڑا ہوا تھا، چونکہ ان کے عقیدے کے مطابق ایک ایسا جرم جو پہلے کبھی نہ ہوا تھا، ایک آشوب طلب جہان نے شہر میں برپا کر دیا تھا۔ اس کام نے اس علاقے کے لوگوں کی مذہبی بنیاد کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ آخر کار عدالت گئی اور باز پرس ہوئی۔ زعمائے قوم وہاں جمع ہوئے۔ بعض کہتے ہیں کہ خود فرد اس عمل کی نگرانی کر رہا تھا۔ پہلا سوال جو انہوں نے ابراہیمؑ سے کیا وہ یہ تھا: "انہوں نے کہا: اے ابراہیمؑ! کیا تو نے ہی ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ کام کیا ہے؟" (قالوا ءانت فعلت هذا بالہمتنا یا ابراہیم)۔

وہ اس بات تک کے لیے تیار نہیں تھے کہ یہ کہیں کہ تو نے ہمارے خداؤں کو توڑا ہے اور ان کے ٹکڑے کر دیئے ہیں بلکہ صرف یہ کہہ کر کیا تو نے ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ کام کیا ہے؟

ابراہیمؑ نے ایسا جواب دیا کہ وہ خود گھر گئے اور ایسے گھرے کر نکلا اُن کے بس میں نہ تھا۔ "ابراہیمؑ نے کہا: یہ کام اس بڑے بُت نے کیا ہے، ان سے پوچھو اگر یہ بات کرتے ہوں: (قال بل فعلہ کبیر ہو هذا فاسلوہو ان کانوا یظنون)۔

جہان کی تفتیش کے اصول یہ ہیں کہ جس کے پاس آثارِ جرم یا آثارِ جرم ملے وہ ملزم ہے (مشہور روایت کے مطابق حضرت ابراہیمؑ نے وہ مکمل بڑے بُت کی گردن میں ڈال دیا تھا)۔

اصلاً، تم میرے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو؟ تم اپنے بڑے خدا کو ملزم قرار کیوں نہیں دیتے؟ کیا یہ احتمال نہیں ہے کہ وہ چھوٹے لوگوں پر غضبناک ہو گیا ہو یا اس نے انہیں اپنا آیندہ کا رقیب فرض کرتے ہوئے ان سب کا حساب ایک ہی ساتھ پاک کر دیا ہو؟ چونکہ اس تعبیر کا ظاہر منسخرین کی نظر میں واقفیت سے مطابقت نہیں رکھتا تھا، اور چونکہ ابراہیمؑ پیغمبر ہیں اور معصوم ہیں اور وہ مرکزِ جہوت نہیں ہوتے، لہذا انہوں نے اس جملہ کی تفسیر میں عنفت مطالب بیان کیے ہیں، جو مطلب ہمیں سب سے بہتر معلوم ہوتا ہے یہ ہے کہ:

ابراہیمؑ نے قطعی طور پر اس عمل کو بڑے بُت کی طرف منسوب کیا، لیکن تمام قرائن اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ وہ اس بات سے کوئی پختہ اور متعلق قصد نہیں رکھتے تھے، بلکہ وہ اس سے یہ چاہتے تھے کہ بُت پرستوں کے سلسلہ عقائد کو، جو کفرِ فاقی اور بے بنیاد تھے، ان کے منہ پر دے ماریں اور اُن کا مذاق اڑائیں اور انہیں یہ سمجھائیں کہ یہ بے جان پتھر اور ٹکڑیاں اس قدر حقیر ہیں کہ ایک جملہ تک بھی منہ سے نہیں نکال سکتیں کہ اپنی عبادت کرنے والوں سے مدد طلب کر لیں، چہ جائیکہ وہ یہ چاہیں کہ ان کی مشکلات حل کر دیں۔

اس تعبیر کی ظہیر ہمارے روزمرہ کے عمارات میں بہت زیادہ ہے کہ مد مقابل کی بات کو باطل کرنے کے لیے، اسی کے منکرات کو، اس پر خیرا استقام کی صورت میں اس کے سامنے رکھتے ہیں تاکہ وہ مغلوب ہو جائے اور یہ بات کسی طرح بھی جھوٹ نہیں ہوتی، "جھوٹ وہ ہوتا ہے کہ جس کے ساتھ کوئی قرینہ نہ ہو۔"

اس روایت میں کہ جو کتاب کافی میں امام صادق علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے، یہ بیان ہوا ہے کہ:

انما قال بل فعلہ کبیر ہو ارادۃ الاصلاح، ودلالة على انفسو

لا یفعلون، شو قال واللہ ما فعلوہ وما کذب:

"ابراہیمؑ نے یہ بات اس لیے کہی کہ وہ ان کے افکار کی اصلاح کرنا چاہتے تھے اور

انہیں یہ سمجھانا چاہتے تھے کہ ایسے کام بتوں سے نہیں ہو سکتے۔"

اس کے بعد امام نے مزید فرمایا:

خدا کی قسم بتوں نے یہ کام نہیں کیا تھا اور ابراہیمؑ نے بھی جھوٹ نہیں بولا۔

منسخرین کی ایک جماعت نے یہ احتمال ذکر کیا ہے کہ ابراہیمؑ نے اس مطلب کو ایک جملہ شرطیہ کی صورت میں ادا کیا تھا اور انہوں نے کہا تھا کہ اگر یہ بت بات کریں تو یہ کام انہوں نے کیا ہے، اس تعبیر کے مضمون کی ایک حدیث بھی وارد ہوئی ہے۔

لیکن پہلی تفسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے، کیونکہ جملہ شرطیہ (ان کانوا یظنون) سوال کرنے کے لیے (فاسئلوہم)

ایک قیاس ہے، (بل فعلہ کبیر ہو) کے جملہ کے لیے نہیں ہے (مخبر کیجئے گا)

ایک اور نکتہ کہ جس کی طرف یہاں توجہ کرنا چاہیے یہ ہے کہ عبارت یہ ہے کہ اُن بتوں سے کہ جن کے ہاتھ پاؤں ٹوٹے ہوئے ہیں

یہ سوال ہرنا چاہیے کہ یہ مصیبت ان کے سر پر کس نے ڈالی ہے نہ کہ بڑے بُست سے (سوال) کیونکہ ”ہم“ کی ضمیر اور اسی ”ان کانوا یظنقون“ سب جمع کی صورت میں ہیں اور یہ پہلی تفسیر کے ساتھ موافق ہے۔

ابراہیم کی باتوں نے بُست پرستوں کو ہلا کر رکھ دیا، ان کے سونے ہوئے دہان کو بیدار کیا اور اُس طرفان کی مانند کہ جو آگ کی کے اُدبے پڑی ہوئی بہت سی راہ کو مٹا دیتا ہے اور اس کی چمک کو آشکار کر دیتا ہے، ان کی فطرت توحیدی کو تعصب، جہالت اور کے پردوں کے پیچھے سے آشکار و ظاہر کر دیا۔

زود گزرنے میں وہ موت کی سی ایک گہری نیند سے بیدار ہو گئے۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے: وہ اپنے دہان اور فطرت کی طرف پہلے اور خود اپنے آپ سے کھٹے گئے کہ حق بات یہ ہے کہ ظالم تو تم خود ہی ہو (فرجعوا الی انفسہم فقالوا انا نحنکون)۔

تم نے تو خود اپنے اُدبے پڑی ہوئی ظلم و ستم کیلئے اور اُس معاشرے کے اُدبے پڑی ہوئی جس کے ساتھ تمہارا تعلق ہے اور نعتوں کے جھنڈے والے پروردگار کی راحت مقدس میں بھی۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ گزشتہ آیات میں یہ بیان ہوا ہے کہ انہوں نے ابراہیم پر ظالم ہونے کا اتمام لگایا تھا لیکن اب انہیں یہاں معلوم ہو گیا کہ اصلی اور حقیقی ظالم تو وہ خود ہیں۔

اور واقعاً ابراہیم کا اصل مقصد بتوں کے توڑنے سے یہی تھا۔ مقصد توبت پرستی کی فکر اور بُت پرستی کی روح کو توڑنا تھا۔ وہ بتوں کے توڑنے کا تو کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ہٹ دھرم بُت پرست اُن سے زیادہ اور اُن سے بھی بڑے اور بنا لیتے اور ان کی جگہ پر رکھ دیتے۔ جیسا کہ نادان، جاہل اور تعصب اقوام کی تاریخ میں اس مسئلے کے بے شمار نمونے موجود ہیں۔

ابراہیمؑ اس حد تک کامیاب ہوئے کہ انہوں نے اپنی تبلیغ کے ایک بہت ہی حساس اور ظریف مرحلہ کا ایک نفسیاتی طوفان پیدا کر کے طے کر لیا اور وہ تھا سونے ہوئے دہانوں کو بیدار کرنا۔

لیکن افسوس! کہ جہالت و تعصب اور اندھی تقلید کا زنجیر اس سے کہیں زیادہ تھا کہ وہ توحید کے اس ہیرے کی وسیلہ بن چکا تھا۔

افسوس کہ یہ روحانی اور مقدس بیماری زیادہ دیر تک نہ رہ سکی اور ان کے آلودہ اور تاریک ضمیر میں، جہالت اور شیطانی قوتوں کی طرف سے اس نور توحید کے خلاف قیام عمل میں آگیا اور ہر چیز اپنی پہلی جگہ پر پلٹ آئی۔ قرآن کئی لطیف تعبیر پیش کر رہا ہے: اس کے بعد وہ اپنے سر کے بل اٹھ ہو گئے (ثنا نکسوا علی رؤسہم)۔

اور اس غرض سے کہ اپنے گنہگار اور بے زبان خداؤں کی طرف سے کوئی عذر پیش کریں، انہوں نے کہا: ”تو تو جانتا ہے کہ یہ باتیں نہیں کرتے“ (الہتد علمت ما ہوؤا)۔

لہٰذا علامہ ازیٰ ظاہر ہے کہ ”کبیر ہو“ کی ضمیر انی ضمیروں کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔

بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ (فرجعوا الی انفسہم) سے مراد یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے سے کھٹے گئے اور ایک دوسرے کو ملامت و سرزنش کرنے لگے لیکن جو کہ ہم نے سطور بالا میں بیان کیا ہے وہ زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

یہ تو ہمیشہ چپ رہتے ہیں اور خاموشی کے رعب کو نہیں توڑتے۔

اور اس تزلزلے ہوئے عذر کے ساتھ انہوں نے یہ چاہا کہ بتوں کی مکرہی، بدحالی اور ذلت کو چھپائیں۔ یہ وہ مقام تھا کہ جہاں ابراہیمؑ جیسے ہیرے کے سامنے منطقی استدلال کے لیے میدان کھل گیا تاکہ ان پر تاثر توڑ سکے کریں اور ان کے ذہنوں کو ایسی سرزنش اور ملامت کریں کہ جو خلق اور بیدار کرنے والی ہو۔ (ابراہیم نے) پکار کر کہا: کیا تم خدا کو بھڑو کر دوسرے معبودوں کی پرستش کرتے ہو کہ جو تمہیں کچھ فائدہ پہنچاتے ہیں اور نہ ضرر؟ (قال افتعبدون من دون اللہ مالا یففعکم شیئاً ولا یضرکم)۔

یہ خیالی خدا کہ جو نہ بات کہنے کی قدرت رکھتے ہیں نہ شعور اور ان رکھتے ہیں، خود اپنا دفاع کر سکتے ہیں، نہ بندوں کو اپنی حمایت کے لیے ہلاکتیں دیں، اصلاً ان سے کوئی کام ہو سکتا ہے اور کیسے درو کی دوا ہیں؟

ایک معبود کی پرستش یا تو اس بنا پر ہے کہ وہ عبدیت کے لائق ہے۔ تو یہ بات بتوں کے بارے میں کوئی مفہوم نہیں رکھتی یا کسی فائدہ کی امید کی وجہ سے ہوتی ہے اور یا ان سے کسی نقصان کے خوف سے، لیکن بتوں کے توڑنے کے میرے اقدام نے بتایا کہ یہ کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ تو کیا اس حال میں تمہارا یہ کام اہمنا نہیں ہے؟

پھر یہ معطر توحید بات کو اس سے بھی بالاتر لے گیا اور سرزنش کے تازیانے ان کی بے درد روح پر لگائے اور کہا: ”تف ہے تم پر بھی اور تمہارے ان خداؤں پر بھی کہ جنہیں تم نے خدا کو جھڑ کر اپنا رکھا ہے“ (اف لکم ولما تعبدون من دون اللہ)۔

”کیا تم کچھ سوچتے نہیں ہو اور تمہارے سر میں عقل نہیں ہے؟“ (افلا تعقلون)۔

لیکن انہیں بُرا جلا کھنے اور سرزنش کرنے میں نرمی اور ملامت کو بھی نہیں بھڑکا کہ کہیں اور زیادہ ہٹ دھرمی نہ کرنے لگیں۔ درحقیقت ابراہیمؑ نے بہت ہی پیچھے تلے انداز میں اپنا منصوبہ آگے بڑھایا۔ پہلی مرتبہ انہیں توحید کی طرف دعوت دیتے ہوئے انہیں پکار کر کہا: یہ بے رون مجھے کیا ہیں؟ کہ جن کی تم پرستش کرتے ہو؟ اگر تم یہ کہتے ہو کہ یہ تمہارے بڑوں کی سنت ہے تو تم بھی گمراہ ہو اور وہ بھی گمراہ تھے۔

دوسرے مرحلے میں ایک عملی اقدام کیا تاکہ یہ بات واضح کر دیں کہ یہ بُت اس قسم کی کوئی قدرت نہیں رکھتے کہ جو شخص ان کی طرف توجہ سے دیکھے تو اس کو نابود کر دیں۔ خصوصیت کے ساتھ پہلے سے خبردار کر کے بتوں کی طرف گئے اور انہیں باطل دھرم پر ہم کر دیا تاکہ یہ بات واضح کریں کہ وہ خیالات و تصورات جو انہوں نے باندھے ہوئے ہیں سب کے سب فضول اور بیہودہ ہیں۔

تیسرے مرحلے میں اس تاریخی حالت میں انہیں بُری طرح چسپا کے رکھ دیا۔ کسی ان کی فطرت کو ابھار کر کسی ان کی عقل کو جھنجھڑا، کسی ہندو نصیحت کی اور کسی سرزنش و ملامت۔

خلاصہ یہ کہ اس عظیم خدائی معلوم نے ہر راستہ اختیار کیا اور جو کہ اس کے بس میں تھا اسے بروئے کار لایا لیکن تاثیر کے لیے ظرف میں قابلیت کا ہونا بھی مسلمہ شرط ہے۔ افسوس یہ اس قوم میں موجود نہیں تھی۔

لہٰذا ہم ”ان“ کے معنی کے بارے میں ج ۶ سورہ بنی اسرائیل کی آیت ۲۳ کے ذیل میں تفصیل سے بحث کر چکے ہیں۔

لیکن بلاشبہ ابراہیم کی باتیں اور کام، ترجمہ کے بارے میں کم از کم استثنائی علامات کی صورت میں ان کے ذہن میں آتی ہیں اور یہ آئینہ کی وسیع بیداری اور آگاہی کے لیے ایک مقدور اور تفسیر ہیں۔
تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے کچھ افراد اگرچہ وہ تعداد میں بہت کم تھے، لیکن قدر و قیمت کے لحاظ سے یہ تھے۔ ان پر ایمان لے آئے تھے اور نسبتاً کچھ آدمی کا سامان دوسروں کے لیے بھی پہنچا ہو گیا تھا۔

۶۸۔ قَالُوا احْرِقُوْهُ وَاَصْرُوْا اِلَيْهِمْ اِنْ كُنْتُمْ فَعِلَيْنَ ۝

۶۹۔ قُلْنَا يَنْارُ كُونِي بَرْدًا وَسَلَامًا عَلٰى اِبْرٰهِيْمَ ۝

۷۰۔ وَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْخٰسِرِيْنَ ۝

ترجمہ

۶۸۔ انہوں نے کہا: اسے جلا دو اور اپنے خداؤں کی مدد کرو، اگر تم کچھ کر سکتے ہو۔

۶۹۔ (آخر کار اُسے آگ میں پھینک دیا لیکن ہم نے) کہا: اے آگ! ابراہیم پر سلامتی کے ساتھ ٹھنڈی رہ جا۔

۷۰۔ وہ چاہتے تھے کہ اس منصوبے سے ابراہیم کو نابود کر دیں لیکن ہم نے انہیں سب سے زیادہ خسارے میں ڈال دیا۔

تفسیر

آگ گلزار ہو گئی،

اگرچہ ابراہیم کے عملی و منطقی استدلال کے ذریعے سب کے سب بہت پرست مغلوب ہو گئے تھے اور انہوں نے اپنے دل میں اس شکست کا اعتراف بھی کر لیا تھا۔

لیکن تعصب اور شدت بہت دھرمی حق کو قبول کرنے میں رکاوٹ بن گئی۔ لہذا اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ انہوں نے ابراہیم کے بارے میں بہت ہی سخت اور خطرناک قسم کا اللہ کر لیا اور ابراہیم کو بڑی مصیبت میں قفل کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے پروگرام بنایا کہ انہیں جلا کر رکھ دیا جائے۔

عام طور پر طاقت اور منطق کے درمیان محسوس رابطہ ہوتا ہے، جس قدر انسان میں طاقت اور قدرت زیادہ ہوتی جاتی ہے، اتنی ہی اس کی منطق کمزور ہوتی جاتی ہے۔ سوائے مردانِ حق کے کہ وہ جتنا زیادہ قوی اور طاقتور ہوتے ہیں، اتنا ہی زیادہ متواضع اور منطقی

نہ کامل ابنِ اشیر، جلد اول، صفحہ ۱۰۰۔

جانتے ہیں۔

جو لوگ طاقت کی زبان سے بات کرتے ہیں۔ جب وہ منطق کے ذریعے کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکیں تو فوراً اپنی طاقت و قدرت کا ہمالے لیتے ہیں۔ ابراہیم کے بارے میں ٹھیک یہی طرز عمل اختیار کیا گیا۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

ان لوگوں نے (بیچ کر) کہا: اسے جلا دو اور اپنے خداؤں کی مدد کرو، اگر تم سے کوئی کام ہو سکتا ہے: قالوا احرقوه وانصروا المتكبرين (کنز العمال)۔

طاقتور صاحبانِ اقتدار بے خبر عوام کو مشتعل کرنے کے لیے عام طور پر ان کی نفسیاتی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں کیونکہ وہ نفسیات کو سمجھتے ہیں اور اپنے کام کرنا خوب جانتے ہیں۔

جیسا کہ انہوں نے اس قصہ میں کیا اور ایسے نعرے لگائے کہ جس سے، اصطلاح کے مطابق۔ ان کی غیرت کو ملکارا: یہ تمہارے خدا ہیں، تمہارے مقدسات نظر سے میں پڑ گئے ہیں، تمہارے بزرگوں کی سنت کو پاؤں تلے روند ڈالا گیا ہے، تمہاری غیرت و محبت کہاں چلی گئی؟ تم اس قدر ضعیف اور زہول حال کیوں ہو گئے ہو؟ اپنے خداؤں کی مدد کیوں نہیں کرتے؟ ابراہیم کو جلا دو اور اپنے خداؤں کی مدد کرو، اگر کچھ کام تم سے ہو سکتا ہے اور ہمارے خداؤں کی مدد کرو۔

دیکھو! سب لوگ اپنے مقدسات کا دفاع کرتے ہیں، تمہارا تو سب کچھ خطرے میں پڑ گیا ہے۔

خلاصہ یہ کہ انہوں نے اس قسم کی بہت سی فضول اور مہمل باتیں کیں اور لوگوں کو ابراہیم کے خلاف بھڑکایا اس طرح سے کہ کڑیوں کے چند گھنٹوں کی بجائے کہ جو کئی افراد کے جملانے کے لیے کافی ہوتے ہیں، کڑیوں کے ہزار گھنٹے ایک دوسرے پر رکھ کر کڑیوں کا ایک پہاڑ بنا دیا اور اس کے بعد آگ کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا تاکہ اس عمل کے ذریعہ سے اپنا انتقام بھی اچھی طرح سے لے سکیں اور جنوں کا وہ خیالی رعب و داب اور عظمت بھی جس کو ابراہیم کے طرز عمل سے سخت نقصان پہنچا تھا، کسی حد تک بحال ہو سکے۔ تاریخ دانوں نے اس مقام پر بہت سے مطالب تحریر کیے ہیں کہ جن میں سے کوئی بھی بعیدِ نظر نہیں آتا۔

مجموعہ ان کے کہتے ہیں کہ لوگ چالیس دن تک کڑیاں جمع کرنے میں لگے رہے اور ہر طرف سے بہت سی خشک کڑیاں لالا کر جمع کرتے رہے اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ وہ عورتیں تک بھی کہ جن کا کام گھر میں بیٹھ کر چر کاٹنا تھا، وہ اس کی آمدنی سے کڑیوں کا گھٹالے کر اس میں ڈال دیتی تھیں اور وہ لوگ کہ جو قریب المرگ ہوتے تھے، اپنے مال میں سے کچھ رقم سے کڑیاں خریدنے کی وصیت کرتے تھے اور حاجت مند اپنی حاجت کے لیے یہ منت مانتے تھے کہ اگر ان کی حاجت پوری ہو گئی، تو اتنی مقدار کڑیوں کا اعزاز کریں گے۔

یہی وجہ تھی کہ جب ان کڑیوں میں مختلف اطراف سے آگ لگائی گئی تو اس کے شعلے اتنے بلند ہو گئے تھے کہ پھر سے اس علاقے سے نہیں گزر سکتے تھے۔

یہ بات واضح ہے کہ اس قسم کی آگ کے تو قریب بھی نہیں جایا جاسکتا۔ چہ جائیکہ ابراہیم کو لے جا کر اُس میں پھینکیں مجبوراً معنیق سے کام لیا گیا۔ حضرت ابراہیم کو اس کے اندر بٹھا کر بڑی تیزی کے ساتھ آگ کے اس دریا میں پھینک دیا گیا۔

افسوس کے دل میں محبت بھی اسی نے ڈالی ہے۔ اس نے ارادہ کر لیا کہ یہ خالص بندہ مومن آگ کے اس دریا میں صحیح دھارم ہے

جیسا کہ قرآن اس مقام پر کہتا ہے: ہم نے آگ سے کہا: اے آگ! ابلا، ہم پر سلامتی کے ساتھ ٹھنڈی ہو جا:

ایسا نار کوئی بردا و سلاما علی ابراہیم۔۔۔ اس میں شک نہیں کہ یہاں خدا کا فرمانِ فرمانِ کو نبی تھا۔ وہی فرمان کہ جو وہ جہانِ ہستی میں آفتاب و مہتاب، زمین و آسمان اور آگ، نباتات اور پرندوں کو دیتا ہے۔

تو اگر مسلمانا کی تعبیر ساتھ نہ ہوتی تو آگ اس قدر سرد ہو جاتی کہ ابراہیمؑ کی جان سردی سے خطرے میں پڑ جاتی۔

یہاں تک کہ بعض نے تو کہا ہے کہ جس دن ابراہیم آگ میں رہے، ان کی زندگی کے دنوں میں سب سے بہترین راحت و آرام

دن تھا۔
 بہر حال اس بارے میں کہ آگ نے حضرت ابراہیمؑ کو کیوں نہ جلایا، مفسرین کے درمیان بہت اختلاف ہے لیکن اجمالی بات
 یہ ہے کہ بندشِ قید کی کوئی نظر رکھتے ہوئے کسی سبب سے بھی خدا کے حکم کے بغیر کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ ایک دن وہ ابراہیمؑ کے ہاتھ میں
 دھوا چھری سے کہتا ہے : نہ کاٹ اور دوسرے دن آگ سے کہتا ہے : نہ جلا اور ایک دن پانی کو جو سببِ حیات ہے حکم دیتا ہے
 کہ غرق اور غرق نہ ہو کر دے۔

کہ فرعون اور فرعونوں کو غرق کر دے۔
 آخری نیربھ آیت میں تیجہ پیش کرتے ہوئے مختصر اور سچے کلمے الفاظ میں فرمایا گیا ہے : انہوں نے یہ پختہ ارادہ کر لیا کہ ابلاہیم کو
 ایک خطرناک سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت نابود کر دیں لیکن ہم نے انہیں کو سب سے زیادہ گھمٹے میں رہنے والا قرار دے دیا :
 (وارادوا بہ کیدًا فجعلناہم الاٰخسرین)۔
 (اور ارادوا بہ کیدًا سے مراد وہاں جانے سے ضرورت حال بالکل بدل گئی۔ غرضی اور مست کا

(اور ادا وہ کیڈا فجعنا ہوا الانحرین)۔
یہ بات کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ابراہیم کے آگ میں صبح و سارا روز جلنے سے صورت حال بالکل بدل گئی۔ خوشی اور مسرت کا شور و غل ختم ہو گیا۔ تعجب سے منہ کھلے کے کھلے رو گئے۔ کچھ لوگ ایک دوسرے کے کان میں زوننا ہونے والی اس عجیب چیز کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ ابراہیم ادا اس کے خدا کی خلعت کا دیر زانوں پر جاری ہو گیا۔ فرد کا اقتدار شطرے میں پکڑا لیکن پھر بھی تعجب اور ہٹ دھرمی حق کو قبول کرنے میں پوری طرح حائل ہو گئی۔ اگرچہ کچھ بیدار دل اس واقعے سے بہرہ ور بھی ہونے اور ابراہیم کے خدا کے بارے میں ان کے ایمان میں زیادتی اور اضافہ ہوا، مگر یہ لوگ اقلیت میں تھے۔

۱۰ تفسیر مجمع السہیان زیر بحث آیہ کے ذیل میں۔

۱۰۰ تفسیر فخر رازی زیر بحث آیہ کے ذیل میں۔

ان روایات میں کہ جو شیعہ اور سنی کی طرف سے نقل ہوئی ہیں، یہ بیان ہوا ہے کہ :
 جس وقت حضرت ابراہیم کو خنقین کے ادب پر بٹایا گیا اور انہیں آگ میں پھینکا جانے لگا تو آسمان زمین اور فرشتوں
 اور بارگاہ خداوندی میں درخواست کی کہ توحید کے اس ہیرو اور حریت پسندوں کے لیڈر کو بچالے۔
 یہ بھی منقول ہے کہ اس وقت جبریلؑ حضرت ابراہیمؑ کے پاس آئے اور ان سے کہا :

الحاجة

کیا تمہاری کوئی حاجت ہے کہ میں تمہاری مدد کروں؟

ابراہیم علیہ السلام نے مختصر سا جواب دیا :

اما اليك فلا

تجھ سے حاجت ؟ نہیں ! نہیں ! (میں تو اسی ذات سے حاجت رکھتا ہوں کہ جو سب سے بڑے نیاز اور سب پر مہربان ہے)۔

تو اس موقع پر جبریل نے کہا :

فاسئل ربك

تو پھر تم اپنی حاجت خدا سے طلب کرو۔

انہوں نے جواب میں کہا :

حسبی من سؤالی علمہ بحالی

میرے سوال کرنے کی بجائے یہی کافی ہے کہ وہ میری حالت سے آگاہ ہے۔

ایک حدیث میں امام باقر علیہ السلام سے نقل ہوا ہے کہ اس موقع پر حضرت ابراہیم نے خدا سے اس طرح راز و نیاز میں بات کی کہ

يا احدى احد يا صمد يا صمد يا من لم يولد ولم يولد

ولم يكن له كفواً أحد توكلت على الله .

اے اکیلے! اے اکیلے! اے بے نیاز! اے بے نیاز! اے وہ کہ جس نے

کے کو نہیں جنا اور نہ جو جنا گیا اور کوئی جس کا ہم پہ نہیں ! میں اللہ پر ہی بھروسہ رکھتا ہوں۔

یہ دعا مختلف عبارات کے ساتھ دوسری کتابوں میں بھی آئی ہے۔

بہر حال لوگوں کے شور و غل مائدہ ہوا اور جوش و خروش کے اس عالم میں حضرت ابراہیمؑ آگ کے شعلوں کے اندر پھینک دیئے گئے۔

نے خوشی سے اس طرح نعرے لگائے گویا بتوں کو توڑنے والا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نابود اور خاکستر ہو گیا۔

لیکن وہ خدا کر جس کے فرمان کے سامنے تمام چیزیں سرخم کیے ہوئے ہیں۔ جلاسنے کی صلاحیت اُسی نے آگ میں رکھی۔

چند اہم نکات :

۱۔ سبب سازی و سبب سوزی : بعض اوقات انسان عالم اسباب میں اس قدر غرق ہو جاتا ہے کہ وہ یہ خیال گناتے کہ یہ آثار و خواص خود انہیں موجودات کے ذاتی ہیں اور اس عظیم مہلت سے کہ جس نے ان موجودات کو یہ مختلف آثار و صفات بخشے ہیں، غافل ہو جاتا ہے۔ اس مقام پر خدا بندوں کو بیدار کرنے کے لیے "سبب سازی" اور "سبب سوزی" کو بیان کر رہا ہے۔ وہ موجودات کہ جن سے کچھ بھی نہیں ہو سکتا، وہ عظیم آثار کا سرچشمہ بن جاتے ہیں۔ مکڑی کو مکہ و تنابہ کہ وہ چند روزہ تار غار سے دھالنے پر تن دے اور انہی چند تاروں کی وجہ سے پیچیدہ اسلام کے تعاقب میں نکلنے والے آپ کو نہ پاسکے جبکہ اگر وہ آپ کو پالے تو قہر کر دیتے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی چھوٹی سی چیز سے تاریخ عالم کا رخ موڑ کے رکھ دیا اور اس کے برعکس بعض اوقات ان اسباب کو کہ جو عالم میں ضرب المثل ہیں (آگ جلانے میں اور چھری کاٹنے میں) انہیں بیکار کر دیتا ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ ان کے پاس بھی ذاتی طور پر کچھ نہیں کیونکہ اگر رب جلیل ان کو منہ کر دے اور روک دے تو وہ اپنا کام نہیں کر سکتے، چاہے ابراہیم خلیلؑ حکم بھی دے۔

ان حقائق کی طرف توجہ — کہ جن کے بے شمار نمونے ہم نے اپنی زندگی میں دیکھے ہیں — روح توحید اور توکل کو سوس کی سنگی بنا اس قدر زندہ اور بیدار کر دیتے ہیں کہ اس کے جوتے ہوتے وہ کسی اور کے بارے میں سوچتا ہی نہیں اور اس کے غیر سے مدد طلب نہیں کرتا۔ مشکلات کی آگ کو خاموش کرنے کی صرف اسی سے دعا کرتا ہے اور دشمنوں کے سر کی ناوردی بھی اس کی بارگاہ سے طلب کرتا ہے۔ اس کے علاوہ کسی کی طرف نہیں دیکھتا، اور اس کے غیر سے کسی چیز کی تمنا نہیں کرتا۔

۲۔ ہمارے نوجوان : بعض تفسیروں میں آیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو جب آگ میں ڈالا گیا تو ان کی عمر سو سال سے زیادہ نہیں تھی اور بعض نے اس وقت ان کا سن ۲۶ سال کا ذکر کیا ہے۔

بہر حال وہ جوانی کی عمر میں تھے اور باوجود اس کے کہ ظاہری طور پر ان کا کوئی یار و مددگار نہیں تھا، اپنے زمانے کے اس عظیم طاغوت کے ساتھ پیچیدہ آزمائی کی کہ جو دوسرے طاغوتوں کا سر پرست تھا۔ آپ تنہا جہالت، غرافات اور شرک کے خلاف جنگ کرنے کے لیے نکل کھڑے ہوئے اور ماحول کے تمام خیالی مقدسات کا مذاق اڑایا اور لوگوں کے غمے اور انتقام سے ذرا بھی نہ گھبرائے کیونکہ ان کا دل عشق خدا سے معمور تھا اور ان کا اس پاک ذات پر ہی توکل اور ہمدرد تھا۔

ہاں! ایمان ایسی ہی چیز ہے کہ یہ جہاں پیدا ہو جاتا ہے وہاں جرات و شجاعت پیدا کر دیتا ہے اور جس میں یہ موجود ہو، اُسے شکست نہیں ہو سکتی۔

آج کی طغانی دنیا میں مسلمانوں کو عظیم شیطانی قوتوں کے مقابلہ کے لیے جس اہم ترین چیز کی ضرورت ہے وہ یہی ایمان کا عظیم سرمایہ ہے۔ ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے :

ان المؤمنین اشد من ذریر الحديد ، ان ذریر الحديد اذا دخل النار

۱۔ مجمع البیان ، زیر بحث آیہ کے ذیل میں ۔

۲۔ تفسیر تفسیر ، جلد ۶ صفحہ ۴۳۰ ۔

تغیر وان المؤمن لو قتل ثم نذر ثم قتل لم یغیر قلبه

مومن قتل کے محض سے ہی زیادہ حکم ہوتا ہے کہ اگر قتل کر دیا جائے تو اس میں قتل اور تبدیلی آجاتی ہے لیکن مومن کو اگر قتل بھی کر دیا جائے اور پھر دوبارہ زندہ کیا جائے اور پھر اسے قتل کر دیا جائے، پھر بھی اس کے دل میں تبدیلی نہیں آتی۔

۳۔ ابراہیمؑ اور فرود کے مابین معرکہ : تفسیروں میں آیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو جب آگ میں ڈالا گیا، فرود کو یقین ہو گیا تھا کہ ابراہیمؑ مشی ہر خاک میں تبدیلی ہو گئے ہیں لیکن جب اس نے غم سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ کو زندہ ہیں، تو اپنے اندر گدہ بیٹھے ہوئے لوگوں کے گنہگار بن گئے تو ابراہیمؑ زندہ دکھائی دے رہا ہے۔ شاید اچھے اچھے اچھے ہو رہا ہے۔ وہ ایک بلند مقام پر چڑھ گیا اور خوب غور سے دیکھا تو اسے معلوم ہوا کہ معاملہ تو اسی طرح ہے فرود نے بیکار کر دیا، اسے ابراہیمؑ! واقعتاً تیرا خدا عظیم ہے اور اس قدر قدرت رکھتا ہے کہ اُس نے تیرے اندر آگ کے درمیان ایک رکاوٹ پیدا کر دی۔ ... اب جبکہ یہ بات سچ تو نہیں چاہتا ہوں کہ اس کی اس قدرت اور عظمت کی وجہ سے اس کے لیے قربانی کروں۔ اور اس نے چار چار قربانیاں اس مقصد کے لیے تیار کیں لیکن ابراہیمؑ نے اُس سے کہا : تجھے کسی قسم کی قربانی اور کاغذ قبول نہیں کیا جائے گا مگر یہ کہ تو پہلے ایمان لے آئے۔

فرود نے جواب میں کہا : اس ضرورت میں تو میری حکومت ختم ہو جائے گی اور میں یہ بات گوارا نہیں کر سکتا۔ بہر حال یہی حادثات اس بات کا سبب بن گئے کہ آگ اور بیدار دل لوگ ابراہیمؑ کے خدا پر ایمان لے آئے یا ان کے ایمان میں اضافہ ہو گیا اور شاید یہی واقعہ اس بات کا سبب بنا کہ فرود ابراہیمؑ کے مقابلہ میں کسی سمت نہ عمل کا اظہار نہ کرے اور صرف ان کو سزا دینا باقی ہے جلا وطن کرنے پر قناعت کرے۔

۴۱۔ وَجِئْنَهُ وَلَوْ طَالِي الْأَرْضِ الَّتِي بَنَوْكُنَا فِيهَا لِلْعَالَمِينَ

۴۲۔ وَهَبْنَا لَهُ إِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ نَافِلَةً ، وَكُلًّا جَعَلْنَا صَالِحِينَ

۴۳۔ وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ إِبْرَاهِيمَ يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا وَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِمْ فِعْلَ الْغَيْرَاتِ

وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَكَانُوا الْبَائِعِينَ

ترجمہ

- ۱۔ اور ہم نے اسے اور لوط کو اس سرزمین (شام) کی طرف نجات دی کہ جسے ہم نے سب اہل جہان کے لیے پُر کر دیا۔
 ۲۔ اور ہم نے اُسے اسحاق اور (اس کے بعد) یعقوب بھی بخشا اور ہم نے اُن سب کو مردان صالح قرار دیا۔
 ۳۔ اور ہم نے انہیں ایسے امام (اور پیشوا) قرار دیا کہ جو ہمارے حکم سے (لوگوں کو) ہدایت کرتے تھے اور ہم نے انہیں نیک کام انجام دینے، نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کی وحی کی اور وہ صرف میری ہی عبادت کیا کرتے تھے۔

تفسیر

بُت پرستوں کی سرزمین سے ابراہیم کی ہجرت :

ابراہیمؑ کے اگ میں ڈالے جانے کے واقعہ اور اس خطرناک مرحلہ سے ان کی معجزانہ نجات نے نردود کے ارکان حکومت کو لرزہ بلاندا کر دیا۔ نردود تو باطل حواس باختہ ہو گیا کیونکہ اب وہ ابراہیمؑ کو ایک فتنہ کھڑا کرنے والا اور فحاش ڈالنے والا جو ان نہیں کر سکتا تھا کیونکہ ابراہیمؑ اب ایک خدائی رہبر اور بہادر ہیرو کی حیثیت سے پہچانا جاتا تھا۔ اُس نے دیکھا کہ ابراہیمؑ اس کے تمام تر طاقت و وسائل کے باوجود اس کے خلاف جنگ کی ہمت نہ کھتا ہے۔ اُس نے سوچا کہ اگر ابراہیمؑ ان حالات میں اس شرار اور اس ملک میں رہا تو اپنی باتوں قوی منطق اور بے نظیر شجاعت کے ساتھ، مسلح طور پر اس جابر، خود سر اور خود غرض حکومت کے لیے ایک خطرے کا مرکز بن سکتا ہے۔ لہذا اُس نے فیصلہ کیا کہ ابراہیمؑ کو ہر حالت میں اس سرزمین سے چلے جانا چاہیے۔

دوسری طرف ابراہیمؑ حقیقت میں اپنی رسالت کا کام اس سرزمین میں انجام دے چکے تھے۔ وہ حکومت کی بنیادوں پر یکے بعد دیگرے چکنا چور کرنے والی ضربیں لگا چکے تھے۔ اس سرزمین میں ایمان و آگاہی کا بیج بو چکے تھے۔ اب صرف ایک مدت کی ضرورت تھی کہ جس نے بیج آہستہ آہستہ بار آور جو اور بہت پرستی کی بساط اُلٹ جائے۔

اب ان کے لیے بھی مفید یہی تھا کہ یہاں سے کسی دوسری سرزمین کی طرف چلے جائیں اور اپنی رسالت کے کام کو وہاں بھی عملی شکل دیں لہذا انہوں نے یہ لہادہ کر لیا کہ لوط (جو آپؑ کے چچے تھے) اور اپنی بیوی سارہ اور احتمالا مومنین کے ایک چھوٹے سے گروہ کو ساتھ لے کر اس سرزمین سے شام کی طرف ہجرت کر جائیں۔

جیسا کہ قرآن زیر بحث آیات میں کہتا ہے : ہم نے ابراہیمؑ اور لوط کو ایسی سرزمین کی طرف نجات دی کہ جسے ہم نے مارے جہانوں کے لیے برکتوں والا بنایا تھا : (وَجِیْنَاهُ وَلُوطًا إِلَى الْاَرْضِ الَّتِی بَارَكْنَا فِیْهَا لِلْعَالَمِیْنَ)۔

اگرچہ قرآن میں اس سرزمین کا نام صراحت کے ساتھ بیان نہیں ہوا ہے لیکن سورہ بنی اسرائیل کی پہلی آیت (وَصَالِحِ الذِّیْ یُسَبِّحُ بِحَمْدِ رَبِّهِ وَیُحَدِّثُ صَبْرًا وَیُذْکِرُ اٰیَاتِ رَبِّهِ الْاُولٰٓئِکَ یُحِبُّ اِلٰهَہُمْ اِلٰهًا وَاحِدًا وَیُحَذِّرُ بَنِیَ اٰدَمَ اَنْ یَّکُوْنُوْا کَکَافِرِیْنَ) سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مراد وہی شام کی سرزمین ہے، جو ظاہری اعتبار سے بھی پُر برکت، زرخیز اور سرسبز و شاداب ہے اور معنوی لحاظ سے بھی کیونکہ وہ انبیاء کی

کا مرکز تھی۔

ابراہیمؑ نے یہ ہجرت خود اپنے آپ کی تھی یا نردود کی حکومت نے انہیں جلا وطن کیا یا یہ دونوں ہی صورتیں واقع ہوئیں اس بارے میں تفاسیر و روایات میں مختلف باتیں بیان کی گئی ہیں ان کا مجموعی منہم یہی ہے کہ ایک طرف تو نردود اور اس کے ارکان حکومت ابراہیمؑ کو اپنے لیے بہت برا خطہ سمجھتے تھے۔ لہذا انہوں نے انہیں اس سرزمین سے نکلنے پر مجبور کر دیا اور دوسری طرف ابراہیمؑ بھی اس سرزمین میں اپنی رسالت کے کام تقریباً مکمل کر چکے تھے اور اب کسی دوسرے علاقے میں جانے کے خواہاں تھے کہ دعوتِ توحید کو وہاں بھی پھیلائیں۔ خصوصاً بابل میں رہنے سے ممکن تھا کہ آپؑ کی جان چلی جاتی اور آپؑ کی عالمی دعوت نامکمل رہ جاتی۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ امام صادق علیہ السلام سے ایک روایت میں یہ بیان ہوا کہ جس وقت نردود نے یہ لہادہ کیا کہ ابراہیمؑ کو اس سرزمین سے جلا وطن کر دے تو اُس نے یہ حکم دیا کہ ابراہیمؑ کی بیویوں اور ان کا سارا مال ضبط کر لیا جائے اور وہ اکیلا ہی یہاں سے باہر جائے۔ حضرت ابراہیمؑ نے اُن سے کہا یہ میری عمر بھر کی کمائی ہے۔ اگر تم میرا مال لینا چاہتے ہو تو میری اُس عمر کو جو میں نے اس سرزمین میں گزارا مجھے واپس دے دو۔ لہذا طے یہ پایا کہ حکومت کے قاضیوں میں سے ایک اس بارے میں فیصلہ دے۔ قاضی نے حکم دیا کہ ابراہیمؑ کا مال لے لیا جائے اور جو عمر انہوں نے اس سرزمین میں خرچ کی ہے وہ انہیں واپس کر دی جائے۔

جس وقت نردود اس واقعے سے آگاہ ہوا تو اُس نے بہادر قاضی کے حقیقی منہم کو سمجھ لیا اور حکم دیا کہ ابراہیمؑ کا مال اور اس کی بیویوں اُسے واپس کر دی جائیں تاکہ وہ انہیں ساتھ لے جائے اور کہا : مجھے ڈر ہے کہ اگر وہ یہاں رہ گیا تو وہ تمہارے دین و آئین کو خراب کر دے گا اور تمہارے خدائن کو نقصان پہنچائے گا : (اِنَّہٗ اِنْ یَّقِیْ فِیْ بِلَادِکُمْ اَفْءَدَ دِیْنَکُمْ وَاضْرَبَ بِالْهَکْکُو)۔

بعد والی آیت میں ابراہیمؑ پر خدا کی ایک نہایت اہم نعت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور وہ ہے صالح اولاد اور ایک پھلنے پھولنے والی اچھی نسل فرمایا گیا ہے : ہم نے اُسے اسحاق (سایا) عطا کیا اور (اس کے بعد اسحاق کا بیٹا) یعقوب بھی عطا کیا : (وَوَهَبْنَا لَہٗ اِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ نَافِلًا)۔

اور ہم نے ان سب کو صالح، شائستہ اور مفید قرار دیا : (وَجَعَلْنٰہُمْ اَصْلٰحِیْنَ)۔ سالہا سال گزر گئے کہ ابراہیمؑ اس فرزند صالح کے انتظار اور خواہش میں ہی زندگی بسر کرتے رہے اور سورہ صافات کی آیہ ۱۰۰ ان کی اس اندرونی خواہش کو بیان کر رہی ہے :

رَبِّیْ هَبْ لِیْ مِنْ الصَّالِحِیْنَ

پروردگارا ! مجھے ایک صالح فرزند مرحمت فرما۔

آخر کار خدا نے ان کی دعا قبول کر لی۔ پہلے اسمعیلؑ اور پھر اسحاقؑ انہیں مرحمت فرمایا کہ جن میں سے ہر ایک، ایک بزرگ پیغمبر اور صاحبِ منزلت تھے۔

۱۔ السیدان زیر بحث آیات کے ذیل میں، بحوالہ روشنہ الکافی

۲۔ یہاں اسمعیلؑ کا ذکر کرنا جب کہ وہ ابراہیمؑ کے پہلے بیٹے تھے، شاید اس وجہ سے ہو کہ انہوں نے سارے جہاں پر خدائے تعالیٰ کے بطن سے پیدا ہونے والے تھے وہ بھی اس میں جب معمولاً وضع صل محسوس تھا۔ لہذا یہ ایک عجیب غیر معمولی مسئلہ معلوم ہوتا تھا جبکہ اسمعیلؑ کا اپنی والدہ ماجدہ سے پیدا ہونا ایسا عجیب نہ تھا۔

نافلہ کی تعبیر کے بظاہر ہر طور پر صرف یعقوب کی توصیف ہے، شاید اس بنا پر ہو کہ ابراہیم نے تو صرف ایک صالح فرزند کے لئے دعا کی تھی، خدائے ایک صالح پوسنے کا بھی اس پر اضافہ کر دیا کیونکہ "نافلہ"، دراصل نعمت کے یا اضافی کام کے معنی میں ہے۔ آخری زیر بحث آیت ان عظیم پیغمبروں کے مقام امامت و رہبری اور ان کی کچھ صفات اور اہم پروگراموں کی طرف اجتماعی طور پر اشارہ کر رہی ہے۔

اس آیت میں مجموعی طور پر ان کی کچھ صفات شمار کی گئی ہیں۔ ان میں صالح ہونے کی صفت کا اضافہ کر لیا جائے تو سات ہوجاتی ہیں کیونکہ گزشتہ آیت میں یہ صفت بیان ہوئی ہے۔ یہ احتمال بھی ہے کہ ان کچھ صفات کا مجموعہ جو اس آیت میں ذکر ہوا ہے، ان کے صالح ہونے کی تشریح ہو کر جس کا ذکر اس سے پہلی آیت میں آچکا ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: ہم نے انہیں امام اور لوگوں کا رہبر قرار دیا (وجعلناہم ائمة) یعنی مقام نبوت و رسالت کے بعد ہم نے انہیں مقام امامت بھی عطا کیا۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں کہ امامت انسانی ارتقا اور تکامل کا آخری مرحلہ ہے جو لوگوں کی مادی و مسموئی، ظاہری و باطنی، جسمانی و روحانی رہبری کے معنی میں ہے۔

نبوت و رسالت کا امامت کے ساتھ یہ فرق ہے کہ انبیاء و رسل مقام نبوت و رسالت میں صرف فرمان حق کو حاصل کرتے اور اس کی خبر دیتے اور لوگوں کو اس کی تبلیغ کرتے ہیں ایسا ابلاغ کہ جس میں بشارت و نذارت موجود ہو۔ لیکن مرحلہ امامت میں وہ ان خدائی پروگراموں کا اجرا کرتے ہیں، چاہے وہ حکومت عادل کی تشکیل کے ذریعے ہو یا اس کے بغیر اس لحاظ سے وہ تربیت کرنے والے احکام اور پروگرام جاری کرنے والے، انسانوں کی تربیت کرنے والے اور پاک و پاکیزہ انسانی ماحول کو وجود میں لانے والے ہوتے ہیں۔

درحقیقت مقام امامت تمام خدائی پروگراموں کو عملی صورت دینے کا مقام ہے۔

دوسرے لفظوں میں مقصود و مطلوب تک پہنچانا اور شرعی و دینی ہدایت کرنا ہے۔

امام اس لحاظ سے ٹھیک آفتاب کی مانند ہے کہ جو اپنی شاعلوں کے ذریعے زندہ موجودات کی پرورش کرتا ہے۔

ہدایت صرف راہنمائی اور راستہ دکھانے کے معنی میں نہیں ہے۔ کیونکہ یہ بات تو نبوت و رسالت میں بھی موجود ہوتی ہے۔ بلکہ دینی کرنے اور منزل مقصود تک پہنچانے کے معنی میں ہے (البتہ انہی لوگوں کے لیے کہ جو آمادگی اور اہلیت رکھتے ہیں)۔

تیسری چوتھی اور پانچویں نعمت اور ان کی خصوصیت یہ تھی کہ: ہم نے انہیں اچھے کام انجام دینے اور ناسی طرح نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کی وحی کی (واوحینا الیہم فعل الخیرات و اقام الصلوٰۃ و ایتاء الزکوٰۃ)۔

یہ دینی تشریعی وحی بھی ہو سکتی ہے یعنی ہم نے مختلف قسم کے کاربائے خیر اور ادائے نماز اور ادائیگی زکوٰۃ کو ان کے دینی پروگراموں میں داخل کر دیا اور یہ وحی ممکن بھی ہو سکتی ہے یعنی ہم نے ان امور کو انجام دینے کے لیے انہیں توفیق و توانائی اور مسموئی جبر عطا فرمایا۔

البتہ ان امور میں سے کوئی بھی چیز جبری اور اضطراری پہلو نہیں رکھتی۔ بلکہ یہ صرف اہلیتیں ہیں کہ جو خود ان کے اپنے ارادہ اور خواہش کے تحت اس سلسلہ میں مزید تشریح و تفصیل کے قابل ہیں۔

کے بغیر ہرگز کسی نتیجہ تک نہیں پہنچتیں۔

"فعل خیرات" کے بعد قیام صلوٰۃ اور ادائے زکوٰۃ کا ذکر، ان دونوں امور کی اہمیت کی وجہ سے ہے کہ جو پہلے تو عام حیثیت سے "واوحینا الیہم فعل الخیرات" کے جملے میں اور اس کے بعد بطور خاص بیان ہوا ہے۔

آخری حصے میں ان کے مقام "عبودیت" کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: وہ صرف ہماری عبادت کرتے تھے (وكانوا لنا عابدين)۔

ضمنی طور پر "كانوا" کی تعبیر کہ جو اس پروگرام میں پہلے سے مسلسل عمل کرتے رہنے پر دلالت کرتا ہے۔ شاید اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ وہ مقام نبوت و رسالت تک پہنچنے سے پہلے بھی صالح، موعود اور اہل لوگ تھے اور ان امور پر عمل کرتے رہنے کی بنا پر ہی خدائے انہیں نئے اعمال سے نوازا ہے۔

اس نکتے کی یاد دہانی بھی ضروری ہے کہ "یہدون بامرنا" کا جملہ درحقیقت باطل کے رہبروں اور پیشواؤں کے مقابل میں حقیقی آمر اور پیشواؤں کی شناخت کا ایک ذریعہ ہے۔ کیونکہ باطل کے پیشواؤں کے کام کی بنیاد قریشیاتی ہوا و ہوس پر ہے۔

ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے نقل ہے کہ آپ نے فرمایا: قرآن میں دو قسم کے املاں کا ذکر ہے، ایک جگہ فرمایا گیا ہے کہ: وجعلناہم ائمة یہدون بامرنا۔

یعنی خدا کے حکم سے، نہ کہ لوگوں کے حکم سے، وہ خدا کے حکم کو اپنے حکم پر مقدم سمجھتے ہیں اور اس کے حکم کو اپنے حکم سے برتر قرار دیتے ہیں۔

لیکن دوسری جگہ فرمایا گیا ہے:

وجعلناہم ائمة یدعون الی النار

ہم نے انہیں ایسا امام و پیشوا قرار دے دیا ہے کہ جو دوزخ کی طرف دعوت دیتے ہیں۔

اپنے حکم کو خدا کے حکم سے مقدم شمار کرتے ہیں اور اپنے حکم کو اس کے حکم سے پہلے قرار دیتے ہیں اور اپنی ہوا و ہوس کے مطابق اور کتاب اللہ کے خلاف عمل کرتے ہیں۔

اور یہ ہے عیار اور کسوٹی امام حق اور امام باطل میں تمیز کی۔

لفظ "ان" کو "عابدین" پر مقدم رکھنا محکمہ دلیل ہے اور ان بزرگوں کے خالص مقام توحید کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی وہ صرف خدا کی عبادت کرتے تھے۔

دوسری آیت جو کہ سورہ قصص کی آیہ ۲۱ ہے فرعون اور اس کے لشکر کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ یہ حدیث تفسیر صافی میں کتاب کافی سے نقل ہوئی ہے۔

۴۔ وَلَوْ طَا أَتَيْنَهُ حُكْمًا وَعِلْمًا وَنَجَّيْنَاهُ مِنَ الْقَرْيَةِ الَّتِي كَانَتْ تَعْمَلُ الْخَبِيثَ ۖ إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمَ فَاسِقِينَ ۝
۵۔ وَادْخُلْنَاهُ فِي رَحْمَتِنَا إِنَّهُ مِنَ الصَّالِحِينَ ۝

ترجمہ :

۴۔ اور لوٹ (کویا دکر) کہ جسے ہم نے حکم اور علم دیا اور اس شہر سے نجات بخشی کہ جہاں کے لوگ قبیح اور گندے کام کر
کیونکہ وہ بُرے اور فاسق لوگ تھے۔
۵۔ اور ہم نے اس کو اپنی رحمت میں داخل کر لیا، بیشک وہ صالحین میں سے تھا۔

تفسیر

بروں کے علاقوں سے لوٹ کی نجات :

حضرت لوطؑ چونکہ حضرت ابراہیمؑ کے قریبی رشتہ داروں اور ان پر سب سے پہلے ایمان لانے والوں میں سے تھے لہذا حضرت ابراہیمؑ کے واقعے کے بعد، ابلاغ رسالت کے سلسلہ میں ان کی جد و ہند اور گوشنوں کے ایک حصہ کی طرف اور ان کے لیے پروردگار کے انعامات احسانات کی طرف یوں اشارہ کیا گیا ہے : اور لوطؑ کو یاد کرو کہ جسے ہم نے حکم اور علم دیا (وَلَوْ طَا أَتَيْنَهُ حُكْمًا وَعِلْمًا)
لفظ "حکم" بعض مقامات پر تو فرمان نبوت و رسالت کے معنی میں آیا ہے اور کچھ دوسرے مقامات پر قصاصات اور فیصلہ کرنے کے معنی میں جب کہ بعض اوقات عقل و خرد کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ ان معانی میں سے یہاں پہلی معنی زیادہ مناسب نظر آتا ہے اگرچہ ان معانی کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے۔
"علم" سے مراد ہر قسم کا علم و دانش ہے کہ جس کا انسان کی سعادت اور انجام میں گہرا اثر ہوتا ہے۔

لوطؑ بزرگ انبیاء میں سے ہیں، جو ابراہیمؑ کے بھرتے اور انہوں نے ابراہیمؑ کے ساتھ سرزمین بابل سے فلسطین کی طرف ہجرت کی تھی اس کے بعد حضرت ابراہیمؑ سے جدا ہو کر "سodom" شہر میں آئے کیونکہ اس علاقے کے لوگ گناہ اور بدکاری میں مبتلا تھے۔ خصوصاً منی انحرافات اور لوگوں میں غرق تھے۔ انہوں نے اس خوف قوم کی ہدایت کے لیے بہت کوشش کی اور اس راستے میں خون جگر کھونٹ پیئے، لیکن ان دل کے اندھوں پر کچھ اثر نہ ہوا۔

۱۔ لفظ "لوٹ" کا یہاں منصوب ہونا اس بنا پر ہے کہ وہ فعل ماضی کا مفعول ہے، یہ فعل ممکن ہے کہ "اتینا" ہوا یا "اذکر" ہو۔
۲۔ لفظ "حکم" اور "علم" کی تفسیر اور ان دونوں کے درمیان فرق کے بارے میں ہم جلد ۴۴ صفحہ ۴۴۳ پر بھی بحث کر چکے ہیں۔

انجام کار۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں۔ خدا کے شدید عذاب نے انہیں اپنی لپیٹ میں لے لیا اور ان کی آبادیاں بالکل تباہ و بالا ہو گئیں جو انے لوطؑ کے گھر والوں کے، ان کی بیوی کے علاوہ سب کے سب نابود ہو گئے۔ جیسا کہ اس کی پوری تفصیل ہم سورہ صافات کی آیت ۷۷ میں بیان کر چکے ہیں۔

لہذا زیر بحث آیت کے آخر میں اس کرم فرمائی کی طرف کہ جو اس نے لوطؑ پر کی تھی اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے : ہم نے اُنہیں اس سے کر جہاں لوگ قبیح کام کرتے تھے ربانی بخش (وَنَجَّيْنَاهُ مِنَ الْقَرْيَةِ الَّتِي كَانَتْ تَعْمَلُ الْخَبِيثَ)۔

کیونکہ وہ بُرے لوگ تھے اور وہ فرمان حق کی اطاعت سے باہر نکل گئے تھے، (اِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمًا فَاسِقِينَ)۔
اہل شہر کی بجائے، قبیح اور بُرے اعمال کی "قریہ" (شہر اور آبادی) کی طرف نسبت دینا، اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ گناہ اور بدکاری میں اس قدر ڈوبے ہوئے تھے، کہ گویا ان کی آبادی کے درود و بارے گناہ اور قبیح و پلید اعمال برس رہے تھے۔

اور "خبائث" کی تعبیر جمع کی صورت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ "لواطت" کے انتہائی گندے عمل کے علاوہ اور بھی بُرے اور خبیث عمل کیا کرتے تھے کہ جن کی طرف ہم جلد ۳۲۹ کے صفحہ ۳۲۹ (آرڈر ترجمہ) میں اشارہ کر چکے ہیں۔

اور قومِ سوئے کے بعد فاسقین کی تعبیر ممکن ہے اس بات کی طرف اشارہ ہو، کہ وہ خدا کے قوانین کے لحاظ سے بھی فاسق لوگ تھے لہذا انسانی معیاروں کے لحاظ بھی۔ یہاں تک کہ دین و ایمان سے قطع نظر وہ پست، پلید، آلودہ اور خرف افراد تھے۔

اس کے بعد حضرت لوطؑ پر کیے گئے آخری انعام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے : ہم نے اُسے اپنی خاص رحمت میں داخل کیا (وَادْخُلْنَاهُ فِي رَحْمَتِنَا)۔

کیونکہ وہ صالح اور نیک بندوں میں سے تھا (اِنَّهُ مِنَ الصَّالِحِينَ)۔

خدا کی یہ خاص رحمت بلاوجہ کسی شخص پر نہیں ہوتی، یہ حضرت لوطؑ کی اہلیت تھی جس نے انہیں اس قسم کی رحمت کا مستحق بنا دیا۔
واقعاً اس سے زیادہ مشکل اور کونسا کام ہوگا اور کونسا اصلاحی پروگرام اس سے زیادہ طاقت فرسا ہوگا کہ انسان ایک طویل مدت تک ایسے شہر میں کہ جس میں اس قدر گناہ اور آلودگی ہو، ٹھہرا رہے اور مسلسل گناہ اور خوف لوگوں کو تبلیغ و ہدایت کرتا رہے اور معاملہ یہاں تک پہنچ جائے کہ وہ اس کے معاملہ تک کے ساتھ بھی مزاحمت کرنے لگیں۔ واقعاً یہ صبر و استقامت خدائی پیغمبروں اور ان کی راہ پر چلنے والوں کے سوا کسی کے بس کی بات نہیں۔ ہم یہاں سے کون ایسا شخص ہے کہ جو اس قسم کی جانکاہ و روحانی سختیوں کو برداشت کر سکتا ہو؟

۴۶۔ وَنُوحًا إِذْ نَادَىٰ مِنْ قَبْلُ فَاسْتَجَبْنَا لَهُ فَنَجَّيْنَاهُ وَأَهْلَهُ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيمِ ۝

وَلَصَرْنَهُ مِنَ الْقَوْمِ الَّذِينَ كَذَبُوا بَايَتَنَا إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمًا
سَوِيًّا فَأَغْرَقْنَاهُمْ أَجْمَعِينَ ۝

ترجمہ

۴۶ اور نوح (کو یاد کرو) جبکہ اس نے (ابراہیم دلو سے) پہلے اپنے پروردگار کو پکارا، تو ہم نے اس کی دعا کو قبول کر لیا اور اُسے اور اس کے خاندان کو عظیم غم سے نجات دی۔
۴۷ اور ہم نے اس کی، اس قوم کے مقابلہ میں کہ جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا تھا، مدد کی۔ کیونکہ وہ بُری قوم تھی لہذا ہم نے اُن سب کو غرق کر دیا۔

تفسیر

منتقِب اور ہٹ دھرم لوگوں سے نوح کی نجات :

ابراہیمؑ اور نوحؑ کی داستان کے ایک گوشہ کا ذکر کرنے کے بعد، ایک اور عظیم پیغمبر یعنی حضرت نوحؑ کی سرگزشت کے ایک حصہ کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے :
اور نوح کو یاد کرو جبکہ اس نے (ابراہیم دلو سے پہلے) اپنے پروردگار کو پکارا اور بے ایمان مغرور لوگوں کے چنگل سے نجات کے لیے درخواست کی (وَنُوحًا إِذْ نَادَىٰ مِنْ قَبْلِهِ)۔
حضرت نوحؑ کی یہ نماظاہری طور پر ان کی اس نفیر اور بددعا کی طرف اشارہ ہے جو قرآن مجید کی سورہ نوح میں بیان ہوئی ہے، جہاں پر ہے :

رَبِّ لَا تَذَرْنِي عَلَى الْأَرْضِ خَالِدًا ۖ إِنَّكَ أَنْتَ الْغَفُورُ الْكَافِرِينَ دِيَارًا إِنَّكَ أَنْتَ الْغَفُورُ الْكَافِرِينَ دِيَارًا إِنَّكَ أَنْتَ الْغَفُورُ الْكَافِرِينَ دِيَارًا

عبادت و لا یلدوا الا فاجرا کفارا
پروردگارا ! اس بے ایمان قوم کے کسی فرد کو باقی نہ رہنے دے کیونکہ اگر یہ باقی رہ گئے تو تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور ان کی آئندہ نسل بھی کافر و فاجر ہی ہوگی۔ (نوح ۲۶-۲۷)

خدا عارِ بہ اف مغلوب فانتصر

اس نے اپنے پروردگار سے دعا کی کہ میں ان کے مقابلہ میں مغلوب ہوں تو میری مدد فرما۔

نادی کی تعبیر کے جو عام طور پر پکارنے کے لیے آتی ہے، اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انہوں نے اس بزرگ پیغمبر کو اس قدر پریشان کیا تھا کہ وہ آخر کار بیچ اٹھا اور واقعاً اگر حضرت نوحؑ کے حالات کا کہ جن کا کچھ حصہ سورہ نوح میں بیان ہوا ہے اور کچھ حصہ سورہ ہود میں۔ اچھی طرح سے مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ وہ فریاد کرنے میں حق بجانب تھے۔
اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے : ہم نے اس کی دعا قبول کر لی اور اُسے اور اس کے گھر والوں کو اس عظیم غم سے نجات بخشی :
(فَاسْتَجَبْنَا لَهُ وَاهْلَهُ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيمِ)۔

درحقیقت لفظ "فَاسْتَجَبْنَا" تو ان کی دعا قبول ہونے کی طرف ایک اجمالی اشارہ ہے اور فَجِیئَہُ واهلہ من الکرب العظیم اس کی تشریح و تفصیل شمار ہوتا ہے۔

اس بارے میں کہ یہاں پر لفظ "اهل" سے کون مراد ہے، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے کیونکہ اگر اس سے مراد حضرت نوحؑ کے گھر والے ہی ہوں تو یہ صرف آپ کے بعض بیٹوں کے لیے ہی ہوگا کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ان کا ایک بیٹا، بُرے لوگوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کی وجہ سے اپنی خاندانِ نبوت کی اہلیت کھو بیٹھا تھا۔

ان کی بیوی بھی ان کے مسک اور طریقہ پر نہیں تھی اور اگر "اهل" سے مراد، ان کے خاص پیروکار اور ان کے صاحبِ ایمان ساتھی ہوں تو یہ "اهل" کے مشہور معنی کے برخلاف ہے۔

البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہاں پر "اهل" ایک وسیع معنی رکھتا ہے کہ جس میں آپ کے مومن عزیز و اقارب بھی شامل ہیں اور خاص صاحب و انصار بھی۔ کیونکہ ان کے نااہل بیٹے کے بارے میں تو یہ بیان ہوا ہے کہ :
انہ لیس من اہلک

وہ تیرے خاندان میں سے نہیں ہے، کیونکہ اس نے مکتب و مذہب تجھ سے جدا کر لیا ہے۔ (ہود ۶۲)
اس بنا پر وہ لوگ کہ جو حضرت نوحؑ کے ساتھ مکتب و مذہب کا رشتہ رکھتے تھے وہ حقیقت میں آپ کے خاندان سے شمار ہوتے تھے۔

اس نکتہ کا ذکر بھی ضروری ہے کہ لفظ "کرب" لغت میں "اندوہ شدید" کے معنی میں ہے اور دراصل یہ "کرب" سے لیا گیا ہے کہ جزمین اٹھنے بیٹھنے کے معنی میں ہے۔ اندوہ شدید کیونکہ انسان کے دل کرتا و بالا کر دیتا ہے اور اس کی "عظیم" کے ساتھ توصیف نوحؑ کے اندوہ کی شدت کی انتہا کو ظاہر کر رہی ہے۔

اس سے بڑھ کر اور کیا تم و اندوہ ہوگا کہ صریح آیات قرآنی کے مطابق کہ انہوں نے ۹۵ سال دینِ حق کی دعوت دی لیکن مفسرین کے درمیان مشہور قول کے مطابق اس ساری طویل مدت میں صرف اسی افراد آپ پر ایمان لائے۔

اور باقی لوگ کام، ٹھٹھہ کرنے، مذاق اڑانے، اذیت دینے، اور آزار پہنچانے کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

اگلی آیت میں مزید فرمایا گیا ہے : ہم نے اس کی، اس قوم کے مقابلہ میں مدد کی کہ جو ہماری آیات کی تکذیب کرتی تھی۔

تفسیر نمونہ جلد ۵، ص ۲۳۳ سے لے کر ۲۸۰ (اردو ترجمہ) بحم مجاہد فرماتے۔

اول نصرناہ من القوم الذین کذبوا بآیاتنا) ۱

”کیونکہ وہ بُری قوم تھی لہذا ہم نے ان سب کو غرق کر دیا“ : (القوم الذین کذبوا بآیاتنا)۔
یہ جملہ ایک بار پھر اس حقیقت پر ایک تاکید ہے کہ خدائی عذاب اور سزائیں ہرگز انتقامی پہلو نہیں رکھتیں بلکہ بنیاد یہ ہے کہ حیات اور نجات زندگی سے استفادہ کرنے کا حق انہی لوگوں کو حاصل ہے جو ارتقائی منزلتیں طے کرتے ہوئے، اللہ کے راستے پر چل رہے ہوں اور اگر ان سے کسی دن انحرافی راستے میں قدم پڑ بھی جائے، تو وہ اپنی غلطی پر غور کرتے ہوئے واپس لوٹ آئیں لیکن وہ گروہ کجرو فاسد جو چکا ہے اور آئندہ بھی ان کی اصلاح کی کوئی امید نہیں ہے، تو ان کا انجام سوائے موت اور نابودی کے اور کچھ نہیں ہوتا۔

ایک نکتہ

اس نکتے کا بیان بھی ضروری ہے کہ ابراہیمؑ اور لوطؑ کی سرگزشت میں بھی ان کی جابر دشمنوں اور مصائب سے نجات کا ذکر ہے، اور اسی طرح ”الیوبؑ“ اور ”یونسؑ“ کے قصے میں بھی لوح کی طرح ہی ان کی جابر دشمنوں اور مصیبتوں کے چنگل سے نجات کا ذکر آئے گا۔
گویا پروگرام یہ ہے کہ خدا اس سورۃ انبیاء میں پیغمبروں کی بے دریغ حمایت، اور ان کی مشکلات کے چنگل سے نجات کو بیان کرے تاکہ رسول اسلام کے لیے تسلی اور سونہیں کے لیے امید کا سبب ہو۔ خصوصاً اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہ سورہ مکی ہے اور مسلمان اس وقت شدید پریشانی اور رنج و تکلیف میں تھے، اس مسئلہ کی اہمیت اور بھی زیادہ واضح اور روشن ہو جاتی ہے۔

۷۸۔ وَدَاوُدَ وَسُلَيْمَانَ إِذْ يَحْكُمْنَ فِي الْحَرْثِ إِذْ نَفَسَتْ فِيهِ غَمُّ الْقَوْمِ وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ شَاهِدِينَ ۝

۷۹۔ فَفَهَّمْنَاهَا سُلَيْمَانَ ۚ وَكُلًّا آتَيْنَاهُمْ حُكْمًا وَعِلْمًا وَسَخَرْنَا مَعَ دَاوُدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ وَكُنَّا فَاعِلِينَ ۝

۸۰۔ وَعَلَّمْنَاهُ صَنْعَةَ لَبُوسٍ لَّكُمْ لَتُحَصِّنَكُمْ مِّنْ بِأْسِ كُوَ فَهَلْ أَسْتَشْكُرُونَ ۝

عام طور پر ”نفسر“ ”علی“ کے ذریعہ دوسرے مفعول کی طرف متعدي ہوتا ہے، مثلاً ”کما بآء“ ”اللہم انصرنا علیہم“ لیکن یہاں ”من“ استعمال ہوا ہے، شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس سے مراد ایسی مدد کرنا ہے کہ جو نجات کے ساتھ وابستہ ہو کیونکہ نجات کا مادہ ”من“ کے ساتھ متعدي ہو جاتا ہے۔

ترجمہ

۷۸۔ اور داؤد و سلیمان (کو یاد کرو) کہ جس وقت وہ ایک کھیت کے بارے میں — کہ جس کو ایک قوم کی بھیڑیں رات کو چر گئی تھیں (اور اسے خراب کر دیا تھا) — فیصلہ کر رہے تھے اور ہم ان کے فیصلے کے گواہ تھے۔

۷۹۔ ہم نے اس کا (صحیح فیصلہ) سلیمان کو سمجھا دیا تھا اور ہم نے اُن میں سے ہر ایک کو فیصلہ کی (لیاقت اور) آگاہی دی تھی اور ہم نے داؤد کے لیے پہاڑوں اور پرندوں کو سکھ کر دیا تھا کہ وہ اس کے ساتھ (خدا کی) تسبیح کرتے تھے اور ہم یہ کام کرنے پر قادر ہیں۔

۸۰۔ اور ہم نے اُسے زرہ بنانے کی تعلیم دی، تاکہ وہ تمہیں، تمہاری جنگوں میں محفوظ رکھے۔ کیا (تم خدا کی ان نعمتوں کا) شکر ادا کرتے ہو؟

تفسیر

داؤد اور سلیمان کا فیصلہ :

حضرت موسیٰؑ، حضرت ہارونؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت لوطؑ، اور حضرت نوحؑ سے متعلق واقعات کے بیان کے بعد زیر بحث آیات، داؤد و سلیمان کی زندگی کے ایک حصہ کی طرف اشارہ کر رہی ہیں۔ ابتدا میں ایک فیصلے کا ذکر ہے کہ جو حضرت داؤدؑ اور سلیمان نے کیا تھا — ایک اجمالی اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے :

اور داؤد و سلیمان کو یاد کرو کہ جس وقت وہ ایک کھیت کے بارے میں فیصلہ کر رہے تھے کہ جس کو ایک قوم کی بھیڑیں رات کے وقت چر گئی تھیں (و داؤد و سلیمان اذ یحکمٰن فی الحرث اذ نفست فیہ غم القوم)۔

اور ہم ان کے فیصلے کے شاہد تھے (و کُنَّا لِحُکْمِهِمْ شَٰہِدِیْنَ)۔

اگرچہ قرآن نے اس فیصلے کا واقعہ کا ملامت سربستہ طور پر بیان کیا ہے۔ اور ایک اجمالی اشارہ پر ہی اکتفا کیا ہے، اور صرف اس کے اخلاقی اور تربیتی نتیجہ پر کہ جس کی طرف ہم بعد میں اشارہ کریں گے قناعت کی ہے، لیکن اسلامی روایات اور مفسرین کے بیانات میں اس سلسلے میں بہت سی عجیب و غریب نظریات ہیں۔

کچھ مفسرین نے یہ بیان کیا ہے کہ وہ واقعہ اس طرح تھا : کہ بھیڑوں کا ایک رازدار رات کے وقت انگوروں کے ایک باغ میں داخل ہو گیا اور انگوروں کی سیلیوں اور انگوروں کے پھولوں کو کھا گیا اور انہیں خراب اور ضائع کر دیا۔ باغ کا مالک حضرت داؤد کے پاس شکایت لے کر پہنچا۔

۱۔ ”نفثت“ ”نفث“ (بروزن نفث) کے مادہ سے رات کو پگانہ ہونے کے سنی میں ہے، اور کچھ بھیڑوں کا رات کو پگانہ ہونا،

اور وہ بھی ایک کھیت میں، طبعی طور پر اس میں چرنے سے ملا ہوا ہوگا۔ لہذا بعض نے اُسے رات کو چرنا کہا ہے، اور ”نفث“ (بروزن نفث)

ان بھیڑوں کے سنی میں ہے کہ جو رات کو پگانہ اور منتشر ہو جائیں۔

حضرت داؤدؑ نے حکم دیا کہ اس اتنے بڑے نقصان کے بدلے میں تمام بیڑیں باغ کے مالک کو دے دی جائیں۔ یہ وقت بچتے باپ سے کہتے ہیں کہ: اے خدا کے عظیم پیغمبر! آپ اس حکم کو بدل دیں اور نقصان فیصلہ کریں! باپ نے کہا: آپ جواب میں کہتے ہیں کہ: بیڑیں تو باغ کے مالک کے سپرد کی جائیں تاکہ وہ ان کے دودھ اور اودن سے فائدہ اٹھائے اور بیڑوں کے مالک کے حوالے کیا جائے تاکہ وہ اس کی اصلاح اور درستی کی کوشش کرے۔ جس وقت باغ پہلی حالت میں لوٹ آئے اس کے مالک کے سپرد کر دیا جائے اور بیڑیں بھی اپنے مالک کے پاس لوٹ جائیں گی (اور نواسے بعد والی آیت کے مطابق سلیف فیصلہ کی تائید کی)۔

یہ مضمون ایک روایت میں امام باقرؑ اور امام صادقؑ سے نقل ہوا ہے۔
ممكن ہے یہ تصور ہو کہ یہ تفسیر لفظ "حرث" کے ساتھ جو کہ زراعت کے معنی میں ہے مناسبت نہیں رکھتی لیکن ظاہراً "حرث" ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے کہ جس میں زراعت بھی شامل ہے اور باغ بھی۔ جیسا کہ باغ والوں کی داستان (اصحاب الجنة) سورہ قلم آیہ ۱۱ سے معلوم ہوتا ہے۔

لیکن یہاں چند اہم سوال باقی رہ جاتے ہیں:

۱۔ ان دونوں فیصلوں کی بنیاد اور معیار کیا تھا؟

۲۔ حضرت داؤدؑ اور سلیمانؑ کے فیصلے ایک دوسرے سے مختلف کیوں تھے؟ کیا وہ اجتہاد کی بنیاد پر فیصلہ کیا کرتے تھے؟
۳۔ کیا یہ مسئلہ، ایک مشورے کی صورت میں تھا یا دونوں نے ایک دوسرے سے الگ، قطعی اور مستقل حیثیت سے فیصلہ دیا تھا؟
پہلے سوال کے جواب میں کہا جاسکتا ہے کہ معیار اور بنیاد خسارے اور نقصان کی تلافی کرنا تھا۔ حضرت داؤدؑ نے غور کیا اور دیکھا کہ انگوروں کے باغ میں جو نقصان ہوا ہے، وہ بیڑوں کی قیمت کے برابر ہے۔ لہذا انہوں نے حکم دے دیا کہ اس نقصان کی تلافی کرنے کے لیے بیڑیں باغ کے مالک کو دے دی جائیں کیونکہ قصور بیڑوں کے مالک کا تھا۔

اس بات کی طرف توجہ رہے کہ بعض اسلامی روایات میں یہ بیان ہوا ہے کہ رات کے وقت بیڑوں والے کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے ریلو کو دوسروں کے کھیتوں میں داخل ہونے سے روکے اور دن کے وقت حفاظت کی ذمہ داری کھیتوں کے مالک کی ہے۔

اور حضرت سلیمانؑ کے حکم کا مضابطہ یہ تھا کہ انہوں نے دیکھا کہ باغ کے مالک کا نقصان بیڑوں کے ایک سال کے منافع کے برابر ہے۔ اس بنا پر فیصلہ تو دونوں نے حق و انصاف کے مطابق کیا ہے لیکن اس میں فرق یہ ہے کہ حضرت سلیمانؑ کا فیصلہ زیادہ گہرائی پر مبنی تھا کیونکہ اس کے مطابق خسارہ یکشت پورا نہیں کیا گیا تھا بلکہ اس طرح خسارہ تدریجی طور پر پورا ہوتا اور یہ فیصلہ بیڑوں والے پر بھی گرا نہ تھا۔ علاوہ ازیں نقصان اہل تلافی کے درمیان ایک تناسب تھا، کیونکہ انگور کی جڑیں ختم نہیں ہوتی تھیں، صرف ان کا وقتی منافع ختم ہوا تھا، جمع البسیان، زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

جمع البسیان میں زیر بحث آیہ کے ذیل میں اس طرح بیان ہوا ہے کہ: "وَعَنِ النَّبِيِّ أَنَّهُ قَضَى بِحِفْظِ الْمَوَاشِيِّ عَلَى أَرْبَابِهَا لِيَلْاَوْقِضَ بِحِفْظِ الْحَرْثِ عَلَى أَرْبَابِهَا نَهَارًا"۔ یہی مضمون تفسیر صافی میں بھی کتاب کافی سے منقول ہے۔

اس بنا پر اصطلاحی معنی میں اجتہاد نظری یعنی اجتہاد ظنی کی۔ ان کے بارے میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن اس بات میں کوئی امر مانع نہیں ہے، کہ ایک مضابطہ عملی کو عملی شکل دینے میں دورا سے موجود ہوں اور دو بیڑوں میں سے ہر ایک میں سے کسی ایک راستے کو اختیار کر لے جبکہ حقیقت میں وہ دونوں کے دونوں صحیح ہوں اور اتفاق کی بات یہ ہے کہ ہماری اس بحث میں بھی مطلب اسی طرح کا ہے۔ جیسا کہ اس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے لیکن جیسا کہ قرآن اشارہ کرتا ہے، وہ راہ جو سلیمانؑ نے اختیار کی (وہ اجرائی لکھا) زیادہ مناسب تھی اور "وَكَلَّا اتَيْنَا حَكَمًا وَعِلْمًا" (ہم نے ان دونوں میں سے ہر ایک کو حکم و علم دیا تھا) کا جملہ جو اگلی آیت میں آئے گا دونوں فیصلوں کی درستی پر گواہ ہے۔

تیسرے سوال کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ بعید نہیں ہے کہ یہ بات مشاورت کے طور پر ہی ہو، ایسی مشاورت کہ جو احتمالاً سلیمانؑ کی آزمائش اور امر قضاوت میں ان کی لیاقت کو آزمانے کے لیے صورت پذیر ہوئی ہو، "حکما" (ان دونوں کا حکم) کی تعبیر بھی ان کے آخری حکم کے ایک ہونے پر گواہ ہے۔ اگرچہ ابتداء میں دو مختلف تجویزیں ہی تھیں (غور کیجئے گا)۔ ایک روایت میں امام باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپؑ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا:

لَوْ كُنَّا كَمَا كَانَتْ نَظَرَان

انہوں نے آخری فیصلہ نہیں دیا تھا وہ تو اس میں اپنی اپنی آراء پیش کر رہے تھے اور شرور کر رہے تھے۔

ایک اور روایت سے کہ جو اصول کافی میں امام صادق علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے، یہ معلوم ہوتا ہے، کہ یہ ماجرا داؤد کے وصی و جانشین کے تقرر کے لیے آزمائش کے طور پر تھا۔
بہر حال بعد والی آیت میں سلیمانؑ کے فیصلے کی اس صورت میں تائید کی گئی ہے: ہم نے یہ فیصلہ سلیمانؑ کو سمجھا دیا تھا اور ہماری تائید سے اس نے اس جھگڑے کے حل کی بہترین راہ معلوم کر لی (فَظَهَرْنَا هَاهُنَا سُلَيْمَانَ)۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ حضرت داؤدؑ کا فیصلہ غلط تھا۔ کیونکہ قرآن ساتھ ہی کہتا ہے: ہم نے ان دونوں میں سے ہر ایک کو آگاہی اور فیصلے کی اہلیت اور علم عطا کیا تھا (وَكَلَّا اتَيْنَا حَكَمًا وَعِلْمًا)۔
اس کے بعد ایک اور اعزاز کہ جو فضلانے حضرت داؤدؑ کو دیا تھا، اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ہم نے پہاڑوں کو داؤد کے لیے سحر کر دیا تھا کہ وہ اس کے ساتھ تسبیح کرتے تھے اور اسی طرح پرندوں کو بھی (وَمُخْرَجًا مَعَ دَاوُدَ الْجَبَالُ يُصَبِّحْنَ وَالطَّيْرِ)۔

لَا مِنْ لَاحِظِهِ الْفَقِيه

مزید وضاحت کے لیے تفسیر صافی میں زیر بحث آیہ کے ذیل رجوع کریں۔

یہ سب باتیں ہماری قدرت کے سامنے کوئی اہم چیز نہیں ہیں۔ ہم یہ کام انجام دینے پر قادر تھے (وکننا فاعلین)۔

ایک نکتہ :

اس بارے میں مفسرین میں اختلاف ہے کہ پہاڑ اور پرندوں کا داؤد کے ساتھ ہم صدا ہونا کس صورت میں تھا مختلف مفسرین کی بعض آراء ہم ذیل میں بیان کرتے ہیں :

۱۔ کبھی تو یہ احتمال ظاہر کیا جاتا ہے کہ حضرت داؤد کی آواز بڑی پرکشش تھی کہ جو پہاڑوں میں گونجا کرتی تھی اور پرندوں کو اپنی طرف کھینچتی تھی۔

۲۔ کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ یہ تسبیح ایک ایسے شعور کی حامل تھی کہ جو ذرات عالم کے باطن میں موجود ہے۔ کیونکہ اس نظریے کے مطابق عالم کے تمام موجودات عقل و شعور رکھتے ہیں۔ لہذا وہ جس وقت حضرت داؤد کی مناجات و تسبیح سنتے تھے تو ان کے ساتھ ہمدردی اور ان کی تسبیح کا غلغلہ بھی ان کی آواز کے ساتھ مل جاتا تھا۔

۳۔ بعض کے کہنا ہے کہ اس سے مراد وہی "تسبیح مکنونی" ہے کہ جو تمام موجودات عالم زبان حال سے کرتی ہیں کیونکہ ہر موجود کا ایک نظام ایک ایسا نظام کہ جو بہت ہی دقیق اور حساب شدہ ہے۔ یہ دقیق اور حساب شدہ نظام ایک ایسے خدا کے وجود پر دلالت کرتا ہے کہ جو پاک و منزہ بھی ہے اور صفات کمال کا مالک بھی۔ عالم ہستی کے اس حیرت انگیز نظام کی بنا پر ہر گوشہ میں تسبیح اور حمد جاری ہے۔ (تسبیح کا معنی نقص سے پاک شمار کرنا ہے اور حمد اس کی صفات کمال کی تعریف کرنا ہے)۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ تسبیح مکنونی نہ تو پہاڑوں اور پرندوں کے ساتھ مخصوص ہے اور نہ حضرت داؤد کے ساتھ بلکہ ہمیشہ اور ہر جگہ تمام موجودات اس تسبیح میں مصروف ہیں۔

اس کے جواب میں انہوں نے یہ کہنا ہے کہ ٹھیک ہے ! یہ عملی تسبیح تو ہے، لیکن سب اس کو سنتے تو نہیں ہیں، یہ تو حضرت داؤد کی عظیم روح ہستی کہ جو اس حالت میں عالم ہستی کے اندر اور باطن کی ہم نواز اور ان سے ہم آہنگ ہو جاتی تھی اور وہ اچھی طرح سے محسوس کرتے اور سنتے تھے کہ پہاڑ اور پرندے ان کے ساتھ ہمدرد ہیں اور تسبیح کر رہے ہیں۔

ان تفسیروں میں سے کسی کے لیے بھی ہمارے پاس کوئی قطعی اور دو ٹوک دلیل نہیں ہے۔ آیت کے ظاہر سے جو بات سمجھ میں آتی ہے یہ ہے کہ پہاڑ اور پرندے حضرت داؤد کے ساتھ ہمدرد ہو جاتے تھے اور خدا کی تسبیح کرتے تھے۔ البتہ ان تینوں تفسیروں کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے اور ان تینوں کو ایک ساتھ بھی لیا جاسکتا ہے۔

زیر بحث آخری آیت میں ایک اور نعمت کی طرف اشارہ ہے اس عظیم پیغمبر کو عطا کی گئی تھی اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے : ہم نے اُسے زور بنانے کی تعلیم دی تھی تاکہ تمہاری جنگوں میں تمہاری مخالفت کرے، کیا تم خدا کا اس کی نعمتوں پر شکر ادا کرتے ہو (وعلماہ صغۃ لبوس لکم لتحصنکم من بأسکم فقل انتو شاکرون)۔

۱۔ مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ جلد ۲ سورہ بنی اسرائیل کی آیہ ۴۴ کے ذیل میں درج کریں۔

"لبوس" عیاں کہ طبری مرحوم "مجمع البیان" میں کہتے ہیں ہر قسم کے دفاعی اور حملوں میں استعمال ہونے والے اسلحہ جیسے زره، تلوار، نیزہ وغیرہ کو کہتے ہیں ۱۔

لیکن قرآن کی آیت میں جو قرآن میں وہ اس کی نشاندہی کرتے ہیں کہ "لبوس" یہاں پر زره کے معنی میں ہے کہ جو جنگوں میں نجات کے کام آتی ہے۔

لیکن یہ بات کہ خدا نے حضرت داؤد کے لیے لہجے کو کس طرح سے نرم کیا تھا اور انہیں زره سازی کی صنعت کس طرح سکھائی، تو اس کی تفصیل ہم انشاء اللہ سورہ سبا کی آیہ ۱۰ اور ۱۱ کے ذیل میں بیان کریں گے۔

۸۱۔ وَلَسْلِمْنَا رَبِّجْ عَاصِفَةً تَجْرِي بِأَمْرِهِ إِلَى الْأَرْضِ الَّتِي بَرَكْنَا فِيهَا وَكُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عَالِمِينَ ۝

۸۲۔ وَمِنَ الشَّيَاطِينِ مَنْ يَغُوصُونَ لَهُ وَيَعْمَلُونَ عَمَلًا دُونَ ذَلِكَ وَكُنَّا لَهُمُ حَفِظِينَ ۝

ترجمہ

۸۱۔ اور ہم نے سلیمان کے لیے تیز ہوا کو سحر کر دیا تھا کہ جو اُس کے حکم سے اس سرزمین کی طرف کرے جسے ہم نے بابرکت بنا دیا تھا، چلتی تھی اور ہم ہر چیز سے آگاہ تھے۔

۸۲۔ اور شیطانوں کے ایک گروہ کو بھی ہم نے اُس کے لیے سحر کر دیا تھا کہ وہ اُس کے لیے (دریاؤں میں) غوطے لگاتے تھے اور اس کے علاوہ دوسرے کام بھی اس کے لیے سرانجام دیتے تھے اور ہم انہیں (بغاوت اور سرکشی کرنے سے) باز رکھتے تھے۔

تفسیر

ہوائیں سلیمان کے زیر فرمان :

ان آیات میں بعض ان نعمات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جو خدا نے اپنے ایک اور پیغمبر یعنی سلیمان کو عطا کی تھیں۔ اشارہ ہوتا ہے ہم نے تیز اور طوفان فیز ہواؤں کو سلیمان کے لیے سحر کر دیا تھا کہ جو اُس کے حکم سے اس سرزمین کی طرف چلتی تھیں۔ کہ جسے ہم نے مبارک ۱۔

۱۔ مجمع البیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

فرار دیا تھا : (ولسلیمان الريح عاصفة تجرى بامرہ الى الارض التي باركنا فيها)۔

اور یہ کوئی عجیب کام نہیں ہے، کیونکہ ہم ہر چیز سے آگاہ تھے اور ہیں (وکننا بكل شئ عالمین)۔ ہم عالم ہستی کے اسرار اور اس پر حاکم قوانین اور نظاموں سے بھی آگاہ ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ انہیں کس طرح سے زیر فرمان کیا جاسکتا ہے اور اس کام کے نتیجہ اور انجام سے بھی واقف ہیں۔ بہر حال ہر چیز ہمارے علم و قدرت کے سامنے قانع اور تابع فرمان ہے۔ "ولسلیمان" کا جملہ : "و مسخرنا مع داؤد الجبال" کے جملہ پر عطف ہے۔ یعنی ہماری قدرت ایسی ہے کہ کبھی تو پہاڑوں کو اپنے ایک بندے کے لیے مسخر کرتے ہیں تاکہ وہ اس کے براہ تبعیع کریں اور کبھی ہواؤں کو اپنے کسی ایک بندے زیر فرمان کر دیتے ہیں تاکہ وہ اسے ہر جگہ پہنچائیں۔

"عاصفہ" کا لفظ تیز ہوا یا طوفان کے معنی میں ہے جبکہ قرآن کی بعض دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ملائم اور آہستہ آہستہ چلنے والی ہوائیں بھی سلیمان کے حکم کے تابع تھیں، جیسا کہ سورہ "ص" کی آیہ ۳۶ میں ہے :
فخسرنا له الريح تجرى بامرہ رخاء حیث اصحاب
ہم نے ہوا کو اس کے تابع فرمان کر دیا تھا کہ وہ نرمی سے آہستہ آہستہ جہاں وہ چاہتا تھا اسی طرف کو چلتی تھی۔

البتہ یہاں لفظ "عاصفہ" (تیز و تند ہوا) کا استعمال ممکن ہے کہ حضرت سلیمان کی اہمیت کو زیادہ واضح کرنے کے لیے ہو یعنی نہ صرف نرم و ملائم ہوائیں ان کے تابع فرمان تھیں بلکہ سخت طوفان اور آنندھیاں بھی ان کی اطاعت گزار تھیں، کیونکہ دوسری بات زیادہ عجیب اور تعجب انگیز ہے۔

اور یہ ہوائیں صرف سرزمین مبارک (شام) کی راہ میں ہی جو سلیمان کا پایہ تخت تھا، ان کے لیے مسخر نہیں تھیں، بلکہ سورہ ص کی آیہ ۳۶ کے مطابق، وہ جس طرف بھی چاہتے تھے وہ اسی طرف چلتی تھیں لہذا مبارک سرزمین کے نام کی تصریح زیادہ تر اس بنا پر ہے، کہ وہ حضرت سلیمان کی حکومت کا دارالسلطنت اور پایہ تخت تھا۔

اب رہ گئی یہ بات کہ ہوا ان کے اختیار میں کس طرح سے تھی اور کتنی سرعت اور تیزی سے چلتی تھی ؟

سلیمان اور ان کے اصحاب کس چیز پر بیٹھ کر آیا جایا کرتے تھے ؟

چلیتے وقت کو نسا عامل انہیں گرنے یا ہوا کے دباؤ اور دوسری مشکلات سے محفوظ رکھتا تھا ؟

خلاصہ یہ کہ وہ کونسی پر اسرار قدرت اور طاقت تھی کہ جس نے اس زمانے میں ان کے لیے ایسے تیز رفتار سفر کو ممکن بنا دیا تھا۔ یہ ایسے مسائل ہیں کہ جن کی تفصیلات ہمیں معلوم نہیں، ہم تو بس اتنا جانتے ہیں کہ یہ ایک حمایت الہی اور بخشش خداوندی اور غیر بات اور ہر وہی کلاس میں بیٹھ کر اختیار میں دی گئی تھی اور ہم اس کی تفصیلات آگاہ نہیں ہیں اور کتنی ہی ایسے مسائل ہیں جو ہم کو معلوم ہیں مگر ان کی تفصیلات ہمیں نہیں ملتی ہیں۔

۱۲ "ولسلیمان الريح غدا وھا شھن ورواحھا شھن" سے اجمالی طور پر اتنا ہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ صبح کے وقت ایک ماہ صحر کے وقت ایک ماہ کی مسافت طے کیا کرتے تھے (اس زمانے کی رفتار کے لحاظ سے)۔

قرآن کے مقابلہ میں کہ جو ہمیں معلوم نہیں ہیں، ایک بہت بڑے سمندر کے مقابلے میں ایک تھوڑی سی سی یا ایک عظیم پہاڑ کے مقابلے میں کے ایک ڈبے کی مانند ہیں۔

خلاصہ یہ کہ ایک خدا پرست اور مودع انسان کی بصیرت کے لحاظ سے کوئی چیز خدا کی قدرت کے سامنے مشکل اور غیر ممکن نہیں ہے ہر چیز پر قادر اور ہر چیز کا عالم ہے۔

البتہ حضرت سلیمان کی زندگی کے دوسرے حیرت انگیز حثوں کی مانند ان کی زندگی کے اس حصے کے بارے میں بھی بہت سے بے یار و مشکوک افسانے لکھے گئے ہیں کہ جو ہمارے نزدیک قابل قبول نہیں ہیں۔ ہم صرف اسی پر اکتفا کرتے ہیں کہ جو قرآن نے یہاں بیان کیا ہے۔

اس کتبے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ دور حاضر کے مصنفین میں سے بعض کا نظریہ ہے کہ قرآن نے حضرت سلیمان اور ان کی بساط کے ہوا کے ذریعے چلنے کے بارے میں کوئی بات صریح طور پر بیان نہیں کی ہے بلکہ صرف ہوا کو سلیمان کے لیے مسخر کر دینے کی بات کی ہے اور ممکن ہے کہ یہ زراعت سے مربوط مسائل، نباتات میں زراعتی و تلیج، گندم وغیرہ کے فرسوں کو صاف کرنے اور کشتیوں کے چلانے کے لیے ہواؤں کی طاقت سے استفادہ کرنے کی طرف اشارہ ہو۔ خاص طور سے جبکہ حضرت سلیمان کی سرزمین (شام) ایک طرف سے تو وہ زرعی زمین تھی اور دوسری طرف سے اس کا ایک اہم حصہ بحیرہ روم کے ساحل سے ملتا تھا اور چار زراعتی کے لیے کام آسکتا تھا۔

لیکن یہ تفسیر، سورہ "سبا" اور سورہ "ص" کی آیات اور بعض روایات کے ساتھ، کہ جو اس سلسلے میں وارد ہوئی ہیں، چنداں مطابقت نہیں رکھتی۔

بعد والی آیت حضرت سلیمان کے لیے ایک اور خاص عنایت کو بیان کرتی ہے : ہم نے بعض شیاطین کو اس کے لیے مسخر کر دیا تھا کہ جو اس کے لیے سمندر میں غوطے لگاتے تھے (اور جواہرات اور قیمتی چیزیں بلکہ کال کر لاتے تھے) اور اس کے لیے ان کے علاوہ اور خدمت بھی انجام دیتے تھے : (ومن الشیاطین من یغوصون لہ ویعملون عملاً دون ذلک)۔

اور ہم انہیں اس کے فرمان سے سرکشی سے روک رکھتے تھے (وکنناھم حافظین)۔

اوپر والی آیت میں جو کچھ "شیاطین" کے حوالے سے بیان ہوا ہے، سورہ سبا کی آیات میں اسے "جن" کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے (سبا۔ ۱۲، ۱۳) سے ظاہر ہے کہ یہ دونوں تفسیریں ایک دوسرے کے کوئی منافی نہیں ہیں۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ "شیاطین" بھی جنوں کے ہی قبیلے سے ہوتے ہیں۔

بہال ہر گز یہاں بھی اشارہ نہیں ہے جن مخلوقات کی کسائی نہیں ہو سکتی اور جو خداوند پرست ہیں۔ یہ مخلوق ہم انسانوں کی نظروں سے پوشیدہ ہے اور اس پر ہمیں کچھ نہیں ہے اور ہم اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے ہیں۔

ط صلیح مومن لا کرش کا فر اور ہمارے پاس ایسے ہر جہات کی نفی پر کوئی دلیل نہیں ہے اور چونکہ خبر صادق (قرآن) نے ان کی خبر دی ہے لہذا ہم انہیں قبول کرتے ہیں۔ سورہ ص کی آیات اور اسی طرح زیر بحث آیت سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ جہات کا یہ گروہ کہ حضرت سلیمان

کے لیے مقرر تھا سمجھدار، فعال اور ہنرمند افراد پر مشتمل تھا۔

اور "یعملون عملاً دوت" ذلک (اور اس کے علاوہ ان کے لیے اور کام بھی انجام دیتے تھے) جس چیز کی اس کی تفصیل سورہ سبا آیت ۱۳ میں آئی ہے۔

یعملون له ما يشاء من محارِبٍ وقناثیل وجفان كالجواب و
قدور راسیات

سورہ سبا کی یہ آیت نشانہ ہی کرتی ہے کہ وہ اس کے لیے "محاربین" بہت اعلیٰ اور خوبصورت عبادت گاہیں اور ضروریات زندگی کی چیزیں بشمول ویگن، بڑی بڑی سینیاں اور اسی قسم کی دوسری چیزیں بنایا کرتے تھے۔
حضرت سلیمان کے متعلق بعض دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ شیاطین کا ایک سرکش گروہ بھی موجود تھا، کہ جنہیں حضرت علی نے قید کر رکھا تھا۔

والآخرین مقرنین فی الاصفاد

اور شاید: "وكنالهم حافظین" کا جملہ اس بات کی طرف بھی اشارہ ہو کہ ہم نے سلیمان کے اس خدمت گروہ کو سرکشی سے روک رکھا تھا۔

آپ اس سلسلے میں مزید تفصیل انشاء اللہ سورہ سبا اور سورہ ص کی تفسیر میں پڑھیں گے۔

ہم پھر یاد دلاتی کراتے ہیں کہ حضرت سلیمان کی زندگی اور ان کے لشکر کے بارے میں بہت سے جھوٹے یا مشکوک افسانے گردش کرتے ہیں کہ جنہیں ہرگز قرآن کے متن کے ساتھ ملحوظ نہیں کرنا چاہیے تاکہ وہ بہانہ سازوں کے لیے دستاویز نہ بن جائیں۔

۸۳- وَيُوبُ إِذْ نَادَى رَبَّهُ أَنْ مَتْنِي الضُّرُّ وَأَنْتَ أَرْحَمُ الرَّحِمِينَ
۸۴- فَاسْتَجَبْنَا لَهُ فَكَشَفْنَا مَا بِهِ مِنْ ضُرٍّ وَآتَيْنَاهُ أَهْلَهُ وَمِثْلَهُ مَعَهُ رَحْمَةً مِنْ عِنْدِنَا وَذَكَرَى لِلْعَبِيدِ

ترجمہ

۸۳- اور ایوب (کو یاد کرو) جب کہ اس نے اپنے پردہ و گار کو پکارا (اور عرض کی) بد حالی اور مشکلات نے میری طرف نہ کر لیا ہے اور تو ارحم الراحمین ہے۔

۸۴- ہم نے اس کی دعا قبول کی اور جن آلام میں مبتلا تھے انہیں ہم نے برطرف کر دیا (یعنی ان کی بیماری دور کی اور تندرست کر دیا) اور دوسروں کو زنجیروں میں جکڑ کے رکھا گیا تھا۔ (ص ۳۸)

اور اس کے گھر والے اسے پٹا دیتے اور ان ہی جیسے اسے مزید عطا کیے، اپنی رحمت خاص کے طور پر تاکہ یہ عبادت گزاروں کے لیے ایک سبق بن جائے۔

تفسیر

حضرت ایوبؑ کی مشکلات سے نجات:

بیانات خدا کے ایک اور عظیم پیغمبر اور ان کی سبق آموز سرگزشت کے بارے میں ہیں اور وہ "ایوب" ہیں۔ آپ وہ دوسری پیغمبر ہیں جن کی زندگی کے ایک گوشہ کی طرف سورہ انبیاء میں اشارہ ہوا ہے۔

حضرت ایوبؑ کی داستان دردناک بھی ہے اور باوقار بھی، ان کا صبر و ضبط خصوصاً ناگوار حادثات میں عجیب و غریب تھا، اس طرح کہ "صبر ایوب" ایک ضرب المثل بن گیا۔

لیکن زیر بحث آیات میں، خاص طور سے مشکلات سے ان کی نجات اور کامیابی کا ذکر ہے اور کھلی ہوئی نعمتیں دوبارہ حاصل ہونے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، تاکہ یہ ہر زمانے میں تمام مومنین کے لیے کہ جو مشکلات میں گھر جاتے ہیں ایک سبق بن جائے خصوصاً یہ کہ مومنین کے لیے ایک سبق تھا کہ جو ان آیات کے نزول کے وقت دشمن کے تنگ گھیرے میں تھے۔

فرمایا گیا ہے: ایوب کو یاد کرو کہ جس وقت اس نے اپنے پردہ و گار کو پکارا اور عرض کیا کہ دکھ، درد اور بیماری نے میری طرف رخ کر لیا ہے اور تو ارحم الراحمین ہے (والیوب اذ نادى ربه انى مضى الضر وان انت ارحم الراحمين)۔

• "ضر" (بوزن حصر) ہر قسم کی بیماری اور پریشانی کو کہتے ہیں کہ جو انسان کی روح اور جسم کو عارض ہو اور اسی طرح سے یہ لفظ کسی عضو کا نقص، مال کا تلف ہو جانا، عزیزوں کی موت، حیثیت و مقام کی پامالی اور اسی طرح کی دوسری باتوں کے لیے بولا جاتا ہے۔ جیسا کہ ہم بعد میں بتائیں گے کہ ایوبؑ ان میں سے بہت سی تکالیف اور پریشانیوں میں مبتلا ہوئے تھے۔

ایوبؑ نے بھی دوسرے تمام انبیاء کی طرح ان طاقت فرسا مشکلات کے دور ہونے کے لیے دعا کرتے وقت بارگاہ الہی میں انتہائی ادب کو ملحوظ رکھا۔ یہاں تک کہ زبان سے کوئی ایسی بات نہیں نکالی کہ جس سے شکایت کی بُرائی ہو۔ صرف اتنا کہا: میں کچھ مشکلات میں گرفتار ہو گیا ہوں اور تو ارحم الراحمین ہے، یہاں تک کہ یہ بھی نہیں کہا کہ میری مشکل کو دور کر دے کیونکہ جانتے ہیں کہ وہ بندگان و برتر ہے اور زندگی کے تقاضوں کو جانتا ہے۔

اگلی آیت کہتی ہے: ایوب کی اس دعا کے بعد ہم نے اس کی دعا کو قبول کر لیا اور اس کے رنج، دکھ اور پریشانی کو برطرف کر دیا: (فاستجبنا له فكشفنا ما به من ضرر)۔

اور اس کے خاندان والے اسے پٹا دیتے اور ان کے ساتھ ان ہی جیسے مزید بھی عطا کیے (واآتيناہ اہلہ ومثلہ معہ)۔ تاکہ یہ ہماری طرف سے ان کے لیے رحمت خاص ہو اور یہ خدا کی عبادت کرنے والوں کے لیے بھی ایک سبق ہو (رحمة من عندنا و ذکرى للعابدين)۔

تاکر مسلمان یہ جان لیں کہ مشکلات چاہے جتنی بھی ہوں اور مصیبتیں چاہے جس قدر ہوں، دشمن بھی پہلے ہی جتنے بھی پہلے ہوتے اور وہ (دشمن) پہلے ہی جتنی بھی طاقت و قدرت رکھتے ہوں، پھر بھی پروردگار کے قہر سے لطف و کرم سے یہ سب کچھ بظرف ہوں والی چیزیں ہیں، نہ صرف نقصانات کی تلافی ہو جاتی ہے، بلکہ بعض اوقات خدا با استقامت صبر کرنے والوں کی جزا کے عنوان سے، جو کہ ان کے ہاتھ سے گیا ہوا ہوتا ہے، اتنا ہی اور مزید اس پر اضافہ کر دیتا ہے اور یہ تمام مسلمانوں کے لیے ایک درس ہے۔ خصوصاً ان مسلمانوں کے لیے جو ان آیات کے نزول کے وقت دشمن کے سخت و باد اور بہت زیادہ مشکلات میں گھرے ہوئے تھے۔

چند نکات :

۱- حضرت ایوبؑ کی مختصر داستان { ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے : کسی شخص نے آپ سے پوچھا، کہ جو مصیبت ایوبؑ کو دامگیر ہوئی تھی وہ کس لیے تھی ؟

امام صادق علیہ السلام نے اس کے جواب میں جو کچھ فرمایا اس کا خلاصہ یہ ہے :

ایوبؑ پر مصیبت آئی اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے کوئی کفرانِ نعمت کیا تھا۔ بلکہ اس کے برعکس شکرِ نعمت کی وجہ سے تھی، کیونکہ ابلیس نے اُن پر حسد کیا اور بارگاہِ خدا میں عرض کی کہ اگر وہ تیری نعمتوں کا اتنا شکر ادا کرتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ تو نے اسے بڑی خوشحال زندگی دی ہے اگر تو اس سے دنیا کی مادی نعمات کو چھین لے تو پھر وہ ہرگز تیرا شکر ادا نہیں کرے گا تو مجھے اس کی دنیا پر مسلط کر دے تو بہتہ پیل جائے گا کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ درست ہے۔ خدا نے اس مقصد سے، کہ یہ قحطِ راہِ حق کے تمام راہیوں کے لیے ایک سند بن جائے، شیطان کو اس بات کی اجازت دے دی وہ اپنے کام میں مشغول ہو گیا اور ایوبؑ کے مال و اولاد کو یکے بعد دیگرے ختم کرتا چلا گیا، لیکن ان دردناک حادثات نے نہ صرف یہ کہ شکرِ ایوبؑ میں کوئی کمی نہ کی، بلکہ ان کا شکر اور بھی بڑھ گیا۔ شیطان نے خدا سے درخواست کی کہ اسے انکی زراعت اور بیڑوں پر مسلط کر دے۔ یہ اجازت بھی اسے دے دی گئی اور اُس نے ساری زراعت کو لگا دی اور ساری بیڑوں کو ہلاک کر دیا۔ پھر بھی ایوبؑ کی طرف سے حمد پروردگار اور شکر میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔

آخر شیطان نے خدا سے یہ درخواست کی کہ وہ ایوبؑ کے بدن پر مسلط ہو جائے اور ان کیلئے شدید بیماری کا سبب بنے اور ایسا بھی ہو گیا۔ اس طرح سے کہ وہ شہرتِ بیماری اور زخموں کی وجہ سے چلنے پھرنے اور حرکت کرنے سے بھی مجبور ہو گئے۔

البتہ ان کی عقل و شعور میں کسی قسم کا کوئی خلل پیدا نہ ہوا۔

خلاصہ یہ کہ تمام نعمتیں یکے بعد دیگرے ایوبؑ سے لی جا رہی تھیں لیکن ان کا شکر بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ کچھ راجب انہیں دیکھنے کے لیے آئے اور انہوں نے پوچھا : ہمیں بتاؤ کسی ایک ٹکڑے کو فنا پر لگانا کیلئے کبھی ایسی مصیبت میں مبتلا ہو گیا ہے ؟ اور اس طرح سے ہر کہ و سر کی شناسات کا آغاز ہو گیا اور یہ امر ایوبؑ پر گراں گزرا، ایوبؑ نے جواب دیا : مجھے اپنے پروردگار کی عزت کی قسم ہے کہ میں نے کسی غذا کا کوئی ایک لقمہ بھی اس وقت تک نہیں کھایا، جب تک کہ کوئی یتیم و ضعیف میرے دستِ نخل پر نہ بیٹھا ہو اور خدا کی کوئی اطاعت سامنے نہیں آئی، مگر یہ کہ میں نے اُس میں سے سخت ترین کو اختیار کیا۔ یہ وہ موقع تھا جب ایوبؑ تمام امتحانات سے صبر و شکر کے ساتھ عمدہ برآ ہو چکے تھے، تو زبانِ مناجات اور دُعا کے لیے کھولی اور خدا سے اپنی مشکلات کا حل انتہائی متوجہانہ طریقے سے چاہا۔ لہجہ ہر قسم کی شکایت سے خالی تھا۔ وہی دُعا جو مذکورہ بالا آیات میں ابھی گزری ہے۔

رب افی مسنی الضر وانت ارحم الراحمین

اس موقع پر خدا کی رحمت کے دروازے کھل گئے، مشکلات بڑی تیزی کے ساتھ بظرف ہو گئیں اور نعماتِ الہی نے اُن سے بھی کہیں زیادہ کہ جو پہلے ان کے پاس تھیں ان کی طرف رخ کیا۔

ہاں اُن ! جو مردانِ حق ہوتے ہیں، نعمتوں کے دگرگوں ہونے سے ان کے افکار اور طرزِ عمل نہیں بدلتے۔ وہ راحت و آرام میں ہوں یا مصیبت میں، یادِ ہول یا قیامِ صحت، ہر بار عطاقتِ قدرت کی حالت میں ہوں یا ضعف و کمزوری میں، خلاصہ یہ ہے کہ وہ ہر حال میں پروردگار کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور زندگی کے تحریکات اور انقلابات ان میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کرتے۔ ان کی روح ایک عظیم سمندر کی مانند ہے کہ جس کے آرام و سکون کو کبھی قسم کے طوفانِ عجم پرجم نہیں کر سکتے۔

اسی طرح وہ ہرگز تلخ حوادث کی کثرت سے مایوس نہیں ہوتے، وہ ڈٹ جاتے ہیں اور استقامت دکھاتے ہیں۔ یہاں تک کہ خدا کی رحمت کے دروازے کھل جائیں وہ جانتے ہیں کہ سخت حوادثِ خدائی آزمائشیں ہیں کہ جن کے ذریعے وہ کبھی بھی اپنے خاص بندہ کو آزماتا ہے تاکہ انہیں اور زیادہ چلا بخشنے۔

۲۔ "اتیناہ اہلہ ومثلہم معہم" کی تفسیر : مفسرین کے درمیان مشہور ہے کہ خدا نے ان کے بیٹوں کو پھر سے زندگی عطا کر دی تھی اور ان کے علاوہ اور بیٹے بھی انہیں دیئے تھے (بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ خدا نے اُن بیٹوں کو بھی جو اس واقعے میں سے تھے انھیں رحمتِ خدائی اور ان بیٹوں کو بھی زندہ کر دیا جو اس واقعے سے پہلے مر چکے تھے)۔

بعض نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ خدا نے حضرت ایوبؑ کو نئے بیٹے اور پوتے عنایت کیے کہ جنہوں نے مرجائے والوں کی خالی جگہ کو پُر کر دیا۔

بعض غیر مستبر روایات میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت الیوبؑ کے بدن میں شدید بیماری کے زیر اثر اس طرح بدبو پیدا ہو گئی تھی کہ لوگ ان کے قریب نہیں آ سکتے تھے لیکن اہل بیتؑ کی طرف سے بیان کی گئی روایات میں اس بات کی نفی کی گئی ہے اور دلیل عقلی بھی اس مسئلہ پر دلالت کرتی ہے کیونکہ اگر پیغمبر میں کوئی نفرت انگیز حالت یا صفت ہوگی، تو یہ بات اس کی رسالت کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہو سکتی پیغمبر کو تو ایسا ہونا چاہیے کہ تمام لوگ اس سے میل ملاپ رکھ سکیں اور کلمات حق کو اس سے سن سکیں۔ پیغمبر میں ہمیشہ قوت جذبہ و کشش ہوتی ہے۔

حضرت الیوبؑ کی داستان کی تفصیل انشاء اللہ سورہ صٰیٰ کی آیہ ۴۱ تا ۴۴ میں بیان ہوگی۔

۸۵۔ وَاسْمِعِيلَ وَاِدرِيسَ وَذَا الْكِفْلِ كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِيْنَ ۝
۸۶۔ وَاَدْخَلْنٰهُمْ فِى رَحْمَتِنَا اِنَّهُمْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝

ترجمہ

۸۵۔ اور اسمعیلؑ، ادریسؑ اور ذوالکفلؑ (کو یاد کرو) کہ وہ سب صابرین میں سے تھے۔
۸۶۔ اور ہم نے انہیں رحمت میں داخل کیا، کیونکہ وہ صالحین میں سے تھے۔

تفسیر

اسماعیلؑ ادریسؑ اور ذوالکفلؑ :

الیوبؑ کی سبق آموز سرگزشت اور طوفانِ حوادث کے مقابلہ میں ان کے مبرو ضبط کو بیان کرنے کے بعد، زیر بحث آیات میں خدا کے تین دوسرے پیغمبروں کے مقامِ مبرو و شکیبائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کتسا ہے : اسمعیلؑ ادریسؑ اور ذوالکفلؑ کو یاد کرو، وہ سب کے سب صابرین میں سے تھے۔ (واسمعیل و ادریس و ذوالکفل کل من الصابریں)۔ ان میں سے ہر ایک نے دشمنوں کے مقابلہ میں یا زندگی کی طاقت فرسا مشکلات کے سامنے مبرو استقامت دکھائی ہے اور انہوں نے ان حوادث کے سامنے ہرگز گھٹنے نہیں ٹیکے۔ اُن میں سے ہر ایک استقامت اور پامردی کا ایک نمونہ تھا۔ اس کے بعد اس مبرو استقامت پر ان کے لیے خدا کے عظیم انعام کا ذکر ہے : ہم نے انہیں اپنی رحمت میں داخل کر دیا کیونکہ وہ صالحین میں سے تھے۔ (و ادخلناہم فی رحمۃنا انہم من الصالحین)۔ یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ یہ نہیں کہا کہ ہم نے انہیں اپنی رحمت عطا کی بلکہ یہ ہے کہ ہم نے انہیں اپنی رحمت میں داخل کیا کیونکہ

وہ اپنے پورے جسم و جان کے ساتھ رحمتِ الہی میں غوطہ زن ہوئے، جیسے کہ وہ پہلے مشکلات کے دریا میں غرق تھے۔

ادریسؑ اور ذوالکفلؑ :

ادریسؑ خدا کے بزرگ پیغمبر تھے۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ بہت سے مفسرین کے مطابق وہ حضرت نوحؑ کے والد کے واداع تھے۔ ان کا نام تورات میں اخنوخ اور عربی میں " ادریس " ہے کہ جسے بعض " درس " کے مادہ سے ماخوذ سمجھتے ہیں کیونکہ وہ پہلے شخص تھے کہ جنہوں نے قلم کے ساتھ لکھنا شروع کیا۔ وہ مقامِ نبوت کے علاوہ علمِ نجوم اور علمِ ہیت پر بھی دسرس رکھتے تھے اور کتے ہیں کہ وہ پہلے شخص ہیں کہ جنہوں نے لباس سینے کا طریقہ انسانوں کو سکھایا تھا۔

باقی رہے ذوالکفلؑ، تو مشہور یہ ہے کہ وہ انبیاء میں سے تھے۔ اگرچہ بعض کا نظریہ، یہ ہے کہ وہ ایک صالح اور نیک انسان تھے۔ قرآن کی آیات کا ظاہری مفہوم بھی یہی ہے کہ وہ نبی تھے کیونکہ انہیں بزرگ انبیاء کے ساتھ شمار کیا گیا ہے اور زیادہ تر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ انبیاء بنی اسرائیل میں سے تھے۔

اس نام کے ساتھ ان کو موسوم کرنے کی علت کے بارے میں متعدد احتمالات پیش کیے گئے ہیں البتہ اس بات کی طرف توجہ رہے کہ " کفل " (بروزن فکر) حصہ کے معنی میں بھی ہے، اور کفالت کے معنی میں بھی آیا ہے۔ بعض تو یہ کہتے ہیں کہ انہوں نے بختِ عبادت کیں اور اعمالِ انجام دینے اس پر اللہ نے اپنی رحمت اور ثواب کا دافر حصہ، انہیں مرحمت فرمایا تھا لہذا وہ ذوالکفل کے نام سے موسوم ہوئے (یعنی دافر حصہ والے)

بعض نے کہا ہے کہ چونکہ انہوں نے یہ عہد کیا ہوا تھا کہ وہ راتیں عبادت میں گھر سے ہو کر گزاریں گے اور دن میں روزہ رکھا کریں گے اور فیصلہ کرتے وقت ہرگز غصے میں نہ آئیں گے اور انہوں نے آخر تک اپنے اس عہد کو پورا کیا لہذا ذوالکفل نام ہو گیا۔

بعض یہ نظریہ بھی رکھتے ہیں کہ ذوالکفل حضرت الیاسؑ کا لقب ہے، جیسا کہ اسرائیلؑ حضرت یعقوبؑ کا لقب ہے، مسیح حضرت عیسیٰؑ کا لقب ہے اور ذوالنون حضرت یونسؑ کا لقب ہے۔

۱۔ تفسیر کبیر غفرلہ زری بخت آیہ کے ذیل میں۔

۲۔ تفسیر فی ظلال، جلد ۵، ص ۵۵۵۔

۳۔ تفسیر فرازی زری بخت آیہ کے ذیل میں اور تاریخ کامل میں بھی لکھا ہے کہ ذوالکفل حضرت الیوبؑ کے ایک بیٹے تھے اور ان کا اصل نام " بشر " تھا اور وہ شام میں رہتے تھے۔ کامل ابن اثیر ج ۱ ص ۱۳۶۔

۸۷۔ وَذَٰلِ النُّونِ إِذْ ذَهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ أَنْ لَنْ نَقْدِرَ عَلَيْهِ فَنَادَىٰ فِي الظُّلُمَاتِ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِينَ ۝
۸۸۔ فَاسْتَجَبْنَا لَهُ وَخَرَجْنَاهُ مِنَ الْغَوِّ ۖ وَكَذَٰلِكَ نُخَيِّجُ الْمُؤْمِنِينَ ۝

ترجمہ

۸۷۔ اور ذوالنون (یونس کو بھی یاد کرو) کہ جب وہ غصے میں آکر (اپنی قوم کے درمیان سے) چلا گیا اور اس کا خیال تھا کہ ہم اس پر کوئی گرفت نہیں کریں گے۔ (لیکن جب وہ مگرچہ کے سنہ میں چلا گیا) تو وہ اس گھاؤپ اندھیرے میں پکارا : خداوند! تیرے سوا کوئی معبود نہیں ہے تو پاک و منزہ ہے، میں ہی قصور وار تھا۔
۸۸۔ ہم نے اس کی دعا کو قبول کر لیا اور اسے رنج سے نجات بخشی اور ہم مومنین کو اسی طرح سے نجات عطا کرتے ہیں۔

تفسیر

یونس کی دشتک زندان سے رہائی :

یہ دونوں آیات عظیم پیغمبر یونس کی سرگزشت کا ایک حصہ بیان کر رہی ہیں، پہلے فرمایا گیا ہے : ”ذوالنون“ کو یاد کرو جبکہ وہ اپنی بت پرست اور نافرمان قوم سے ناراض ہو کر چلے گئے (وَذَٰلِ النُّونِ إِذْ ذَهَبَ مُغَاضِبًا)۔
”نون“ لغت میں بہت بڑی پھلی یا مگرچہ یا ایک بہت بڑے دریائی جانور کے معنی میں ہے، اس بنا پر ”ذوالنون“ کا معنی ہے پھلی والا (یا مگرچہ والا) یہ حضرت یونس کو ”ذوالنون“ کہیں کہا گیا ہے اس سلسلے میں ایک واقعہ جس کی تفصیل ہم انشاء اللہ بیان کریں گے۔

بہر حال اس نے یہ گمان کر لیا تھا کہ ہم اس پر کوئی گرفت نہیں کریں گے! (فَظَنَّ أَنْ لَنْ نَقْدِرَ عَلَيْهِ)۔ ان کا یہ خیال تھا کہ انہوں نے اپنی نافرمان قوم میں اپنی رسالت کا کام پوری طرح انجام دے دیا ہے اور اس بارے میں انہوں نے کوئی ترک ادبی تک بھی نہیں کیا۔ اور اب جبکہ قوم کو اس کی حالت پر چھوڑ کر جا رہے ہیں تو اس میں کوئی مصلحت نہیں ہے۔ حالانکہ بہتر یہ تھا کہ ”قدّر“ ”قدر“ کے مادہ سے نعت گیری اور شکی دینے کے معنی میں ہے پھر انسان نعت گیری کرتے وقت ہر چیز کو ”قدر“ کے ساتھ محدود سمجھتا ہے مگر کھلا ہوا اللہ بے حساب۔

۸۷۔ کہ وہ ان لوگوں میں رہتے — اور صبر و استقامت کا مظاہرہ کرتے اور غم مگر چپتے۔ اس امید پر کہ شاید وہ بیدار ہو جائیں اور خدا کی طرف رجوع کریں۔
آخر کار اسی طرح ادلی کی وجہ سے انہیں سختی کا سہہ دیکھنا پڑا، ایک بہت بڑے مگرچہ نے انہیں نگل لیا : اور انہوں نے گھٹاؤ اندھیروں میں پکارا : خداوند! تیرے سوا کوئی معبود نہیں ہے : (فَنَادَىٰ فِي الظُّلُمَاتِ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ)۔
”خداوند! تو پاک اور منزہ ہے، میں ہی سرگاموں میں سے تھا : سُبْحَانَكَ إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِينَ)۔
میں نے خود اپنے آپ پر بھی ظلم کیا ہے اور اپنی قوم کے آپ پر بھی۔ مجھے چاہیے تھا کہ میں اس سے بھی زیادہ شرارت اور عتقین کو برا بھلا کہتا اور تمام مصیبتوں کو جھیلتا، شاید وہ راہ راست پر آجائے۔ بالآخر ہم نے اس کی دعا قبول کر لی اور غم سے اسے رہائی بخشی (فَاسْتَجَبْنَا لَهُ وَخَرَجْنَاهُ مِنَ الْغَوِّ)۔ اس طرح ہم مومنین کو نجات دیں گے (وَكَذَٰلِكَ نُخَيِّجُ الْمُؤْمِنِينَ)۔
یاں! ہاں! ہم مومنین میں سے جو بھی بارگاہ خداوندی میں اپنی کٹھنی اور تقصیر پر توبہ کرے گا اور اس کی ذات پاک سے مدد اور رحمت طلب کرے گا تو ہم اس کی دعا قبول کر کے اس کے غم و اندوہ برفٹ کر دیں گے۔

چند اہم نکات :

۱۔ یونس کی سرگزشت : انشاء اللہ تفصیل کے ساتھ تو حضرت یونس کی سرگزشت سورہ صافات میں آئے گی لیکن اس کا خلاصہ یہ ہے کہ :
وہ سالہا سال تک اپنی قوم کے درمیان (عراق کی سرزمین نمینا میں) دعوت و تبلیغ میں مشغول رہے۔ لیکن انہوں نے جتنی کوشش کی، ان کے ارشادات اور ہدایت کا ان کے دلوں پر کوئی اثر نہ ہوا۔ تو آپ نے اُن سے خفا ہو کر اُس جگہ کو چھوڑ دیا اور دُیا کی طرف چلے گئے۔ وہاں کشتی پر سوار ہو گئے۔ راستے میں دریا میں طوفان آگیا۔ اور سب اہل کشتی کے غرق ہونے میں کوئی کسر باقی نہیں رہ گئی تھی۔
کشتی کے علاج نے کہا، میرا خیال یہ ہے کہ تم میں سے کوئی بھاگا ہوا غلام موجود ہے کہ جسے دریا میں پھینک دینا چاہیے۔ (یا اُس نے یہ کہا کہ کشتی زیادہ بوجھل ہے لہذا ہم ایک شخص کو قعر کے ذریعے دریا میں پھینک دیں) بہر حال انہوں نے چند بار قعر ڈالا اور ہر دفعہ حضرت یونس کا نام نکلا۔ یونس سمجھ گئے کہ اس کام میں کوئی راز پوشیدہ ہے اور خود کو حادثہ کے سپرد کر دیا۔
جس وقت انہیں دریا میں پھینکا گیا تو ایک مگرچہ نے نگل لیا لیکن خدا نے انہیں معجزانہ طور پر زندہ رکھا۔
آخر کار وہ متوجہ ہوئے کہ ان سے ترک ادلی ہو گیا ہے۔ لہذا بارگاہ خدا کا رُخ کیا اور اپنی تقصیر اور کوتاہی کا اعتراف کیا۔ خدا نے بھی ان کی دعا کو قبول کر لیا اور اس تنگ و تاریک جگہ سے انہیں نجات دی۔
نکات : یہ خیال کیا جائے کہ یہ واقعہ سائنسی لحاظ سے ممکن نہیں ہے لیکن بلا شک و شبہ یہ ایک خلاف معمول واقعہ ہے نہ کہ

لہ تفسیر نورانی، جین السبیلان اور فرشتہ زینت آیہ کے ذیل میں۔

ایک محال عقلی۔ جیسا کہ مردوں کا زندہ ہونا کہ جو نہ صرف خلاف معمول ہے لیکن محال نہیں ہے۔ دوسرے لفظوں میں عام اور مروج طریقے سے اس کا انجام پانا ممکن نہیں ہے لیکن پروردگار کی بے پایاں اور لامحدود قدرت کی مدد سے کوئی مشکل نہیں رہتی۔ اس کی مزید تفصیل انشاء اللہ آپ سورہ صافات کی تفسیر میں پڑھیں گے۔

۲۔ یہاں ظلمات کے کیا معنی ہیں؟ ممکن ہے کہ یہ تعبیر دریا اور پانی کی گہرائیوں کی تاریکی اور اس بہت بڑی پھلی کے بیٹ کی تاریکی اور رات کی تاریکی، کی طرف اشارہ ہو اور ایک روایت کہ جو امام باقر علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے، وہ بھی اس کی تائید کرتی ہے۔ ۳۔ یونسؑ نے کونسا ترک اولیٰ کیا تھا؟ بلاشبہ و شبہ "مغاضبا" کی تعبیر یونسؑ کے بے ایمان قوم پر ناراض ہونے کی طرف اشارہ ہے اور اس قسم کا غصہ اور ناراضی۔ ایسے حالات میں، کہ ایک تنگسار و دوسرے پیغمبر سالساں تک گمراہ قوم کو ہدایت کرنے کیلئے مشقت اٹھاتا رہے لیکن وہ اس کی ہمدردانہ اور غیر خواہانہ دعوت کا ہرگز مثبت جواب نہ دیں۔ کامل طبعی اور فطری بات ہے۔ دوسری طرف چونکہ حضرت یونسؑ جلتے تھے کہ عتق ربیب عذاب الہی انہیں آئے گا۔ اس لیے اس شکر کو چھوڑ دینا کوئی گناہ نہیں تھا لیکن یونسؑ جیسے عظیم پیغمبر کے لیے بہتر یہ تھا کہ پھر بھی آخری لمحے تک۔ وہ لمحہ کہ جس کے بعد عذاب الہی نازل ہو جائے گا۔ انہیں پھولنے اسی بنا پر حضرت یونسؑ کا نسبتاً عاجلانہ فیصلہ ترک اولیٰ شمار ہوا اور خدا کی طرف سے اس پر مواخظ کیا گیا۔ یہ وہی چیز ہے کہ جس کی طرف ہم نے داستان آدمؑ میں بھی اشارہ کیا ہے کہ یہ مطلق گناہ نہیں ہے، بلکہ نسبتی گناہ ہے یا دوسرے لفظوں میں "حسنات الجوار میثاق المقربین" کے مصلحت ہے۔ مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ جلد ۲، صفحہ ۹۴ (اردو ترجمہ) کی طرف رجوع کریں۔

۴۔ کردار ساز سبق: "وَكَذَلِكَ نُنْجِي الْمُؤْمِنِينَ" کا پڑھنی جملہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ گرفت اور نجات کے سلسلہ میں جو کچھ حضرت یونسؑ پر گزری، یہ کوئی ایک خصوصی فیصلہ نہیں تھا۔ بلکہ سلسلہ مراتب کو ملحوظ رکھتے ہوئے سب کے لیے ایک عمومی پہلو رکھتا ہے۔

بہت سے غم انگیز حوادث اور سخت مشکلات، خود ہمارے گناہوں کی پیدا کردہ ہوتی ہیں۔ یہ خوابیدہ مردوں کو بیدار کرنے کیلئے ایک تازیانہ ہوتی ہیں یا فاضل انسانی کی دھات کو صاف کرنے کے لیے ایک کٹھالی کی مانند ہوتی ہیں۔ ایسے موقع پر انسان ان تین نکات کی طرف توجہ کرے تو نجات یقینی ہے کہ جن کی طرف "یونسؑ" نے توجہ کی تھی:

- ۱۔ حقیقت توحید کی طرف توجہ اور یہ کہ کوئی معبود اور پناہ گاہ اللہ کے سوا نہیں ہے۔
- ۲۔ خدا کو ہر نقص و ظلم سے پاک و منزہ سمجھنا اور اس کی ذات پاک کے بارے میں کسی طرح کی بدگمانی نہ کرنا۔
- ۳۔ اپنے گناہ کا اعتراف کرنا۔

اس بات کی گواہ وہ حدیث ہے کہ جو تفسیر در المنثور میں پیغمبر اسلامؐ سے نقل ہوئی ہے کہ آپؐ نے فرمایا: خدا کے ناموں میں سے ایک نام کہ جن کے ساتھ جو بھی خدا کو پکارے اس کی دعا قبول ہوگی، اور جس وقت اس کے ذریعے خدا سے کوئی چیز طلب کرے تو خدا اسے عطا کرے گا،

وہ "یونسؑ" کی دعا ہے۔

ایک شخص نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا وہ یونسؑ کے لیے مخصوص تھی یا مسلمان بھی اس میں شامل ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: یہ یونسؑ کے ساتھ بھی مربوط تھی اور تمام مومنین سے بھی مربوط ہے، جب کہ وہ خدا کو پکارتے ہیں: کیا تو نے قرآن میں خدا کی یہ گفتگو نہیں سنی:

"وَكَذَلِكَ نُنْجِي الْمُؤْمِنِينَ" یہ اس بات کی دلیل ہے کہ جو شخص اس طرح سے دعا کرے خدا نے اس کو قبول کرنے کی ضمانت دے دی ہے۔

یہ بات یاد دلانے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس سے مراد صرف الفاظ کا پڑھنا ہی نہیں ہے بلکہ اس کی حقیقت کا نفس انسانی میں نقش ہو جانا ہے۔ یعنی ان الفاظ کے پڑھنے کے ساتھ ساتھ اس کا تمام وجود اس کے منہم کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائے۔ اس نکتے کی یاد دہانی بھی ضروری ہے کہ خدا کی سزائیں اور عذاب و قسم کے ہوتے ہیں، ان میں سے ایک تو عذاب استیصال ہے۔ یعنی آخری عذاب کہ جو ناقابل اصلاح لوگوں کی تباہی اور نابودی کے لیے آئسہ ہے کہ جس میں کوئی دعا فائدہ مند نہیں ہوتی کیونکہ طوفانِ بے لاکے اتر جانے کے بعد پھر وہی طرز عمل شروع ہو جاتا ہے۔

دوسری قسم کی سزائیں اور عذاب تنبیہی ہوتے ہیں کہ جو تربیتی پہلو رکھتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر جو سزا کا اثر نمایاں ہونے لگتا ہے اور جس کو تنبیہ کے طور پر یہ سزا دی جا رہی ہے وہ بیدار اور متوجہ ہو جاتا ہے، تو بلافاصلہ عذاب اور سزا مل جاتی ہے۔

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ آفات و بلیات اور ناگوار حوادث کا ایک مقصد بیدار کرنا اور تربیت دینا ہے۔ حضرت یونسؑ کا واقعہ راہ حق کے تمام رہبروں کو مختلف حدود میں اس بات کی تنبیہ کر رہا ہے کہ وہ کبھی پیغام رسائی کی اپنی ذمہ داری کو ختم نہ سمجھیں اور اس راستے میں ہر سچی و گوشہ نشین کو کم شمار کریں کیونکہ ان کی مسئولیت اور ذمہ داری بڑی سنگین ہے۔

۸۹۔ وَزَكَّرْنَا إِذْ نَادَى رَبَّهُ رَبِّ لَا تَذَرْنِي فَرْدًا وَأَنْتَ خَيْرُ الْوَارِثِينَ ۝

۹۰۔ فَاسْتَجَبْنَا لَهُ وَوَهَبْنَا لَهُ يَحْيَىٰ وَأَصْلَحْنَاهُ زَوْجَهُ إِنَّهُمْ كَالْوَاسِعُونَ فِي الْخَيْرِ وَيَدْعُونَنَا رَغَبًا وَرَهَبًا وَكَانُوا لَنَا خَشِعِينَ ۝

ترجمہ

- ۸۹۔ اور زکریا (کو یاد کرو) کہ جب اس نے اپنے رب کو پکارا (اور عرض کیا)۔ اے میرے پروردگار! مجھے ایک لڑکے (اور مجھے ایک آبرومند بیٹا عطا فرما) اور بہترین وارث توڑ ہی ہے۔
- ۹۰۔ ہم نے اس کی دعا قبول کر لی اور اسے یحییٰ سابیٹا عطا کیا اور ہم نے اس کے لیے اس کی بیوی میں صلاحیت پیدا کر دی کیونکہ وہ لوگ نیکوں میں جلدی کرتے تھے اور (رحمت کے) شوق اور (عذاب کے) خوف کے ساتھ ہمیں پکارتے تھے اور (ادب اور مسئولیت کے احساس سے) ہمارے حضور کو گویا کرتے تھے۔

تفسیر

زکریا تنہا نہ رہے :

یہ دونوں آیتیں خدا کے دو اور بزرگ پیغمبروں حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ کی زندگی کا ایک گوشہ بیان کر رہی ہیں۔ پہلے فرمایا گیا ہے : زکریا کو یاد کرو جب اُس نے اپنے رب کو پکارا اور عرض کیا : پروردگار! مجھے ایک لڑکے چھوڑ اور توبہ داروں سے بہتر ہے : (و زکریا اذ نادى ربه رب لا تدفنى فرداً وانت خير الوارثين)۔ زکریا کی عمر کے سالہا سال گزر گئے وہ بہت بوڑھے ہو گئے لیکن ابھی تک ان کے کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی اور دوسری طرف ان کی بیوی یا نجھ تھی اور اب بچہ جننے کے قابل نہ تھی۔

انہیں ایک ایسے بیٹے کی تمنا تھی کہ جو ان کے خدائی پروردگاروں کو چلائے تاکہ ان کے تبلیغ کا کام ادھر سے نہ رہ جائیں اور ان کے بعد موقع کی تاخیر میں رہنے والے بنی اسرائیل کے عبادت خانہ اور اس کے اموال و دہایا پر قابض نہ ہو جائیں۔ کیونکہ انہیں تو وہ خدا میں صرف ہونا چاہیئے۔

ایسے وقت میں آپ نے غلوں دل کے ساتھ، بارگاہِ خداوندی کی طرف رجوع کیا اور ایک صالح بیٹے کے لیے دعا کی آپ نے انتائی ادب کے ساتھ خدا کو پکارا۔ آپ نے لفظ "بت سے دعا شروع کی۔ وہی رب کہ جس کا طہمت و کرم زندگی کے اولین لمحے سے انسان کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس کے بعد "لا تدفنى فرداً" کی تعبیر آئی ہے۔ یہ لفظ "وذر" (بروزی مرزا) کے مادہ سے، کسی چیز کو معمولی اور کم سمجھ کر بے اعتنائی کی وجہ سے چھوڑنے اور ترک کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ اس لفظ سے حضرت زکریا نے اس حقیقت کا اظہار کیا کہ اگر میں تنہا گیا تو فراموش ہو جاؤں گا۔ نہ صرف میں بلکہ میرے پروردگار بھی بھلا دیتے جائیں گے اور آخر میں "وانت خير الوارثين" کے جملہ سے اس حقیقت کو بیان کیا کہ میں جانتا ہوں کہ یہ دنیا دار بقاء نہیں ہے اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تو بہترین وارث ہے لیکن عالم اسباب کے لحاظ سے کسی سبب کی تلاش میں ہوں کہ جو میرے حدف اور مقصد کی طرف رہنمائی کرے۔

خدا نے حقیقت عش سے سرشار اور پر غلوں سے دعا قبول کر لی امدان کی خواہش پوری کر دی۔ جیسا کہ فرمایا گیا ہے : ہم نے اس کی دعا قبول

لی اور اسے یحییٰ سابیٹا عطا فرمایا : (خاستجبنا له ووهبنا له یحییٰ)۔

اور اس مقصود تک پہنچنے کے لیے، اس کی بانجھ بیوی کو درست کر دیا اور اس میں بچنے کی پیدائش کی صلاحیت پیدا کر دی : (واصلحنا له زوجہ)۔

اس کے بعد اس گھرانے کی تین عمدہ صفات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے : وہ لوگ نیک کاموں کی انجام دہی میں جلدی کرتے تھے (لانهصوكانوا یسارعون فی الخیرات)۔

وہ اطاعت سے عشق اور گناہوں سے وحشت کے ساتھ ہر حالت میں ہمیں پکارتے تھے (ویدعوننا رغبا ورهباً)۔ وہ ہمیشہ ہمارے سامنے (ادب و احترام اور احساسِ مسئولیت کے ساتھ) گویا کرتے تھے (وكانوا لنا خاشعین)۔

ان تینوں صفات کا ذکر ممکن ہے کہ اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ انہیں جس وقت کوئی نعمت ملتی ہے تو وہ کم ظرف اور ضعیف الایمان لوگوں کی طرح غفلتوں اور غرور میں گرفتار نہیں ہو جاتے تھے۔ وہ کسی حالت میں بھی ضرورت مندوں کو فراموش نہیں کرتے تھے اور اپنے کاموں کے کرنے میں جلدی کرتے تھے۔ وہ حالتِ نیاز میں بھی اور بے نیازی میں بھی فقیری میں بھی اور غنا میں بھی، بیماری میں بھی اور صحت میں بھی ہمیشہ خدا کی طرف متوجہ رہتے تھے۔ مختصر یہ ہے کہ وہ نعمتوں کے اپنی طرف رخ کرنے کی وجہ سے کبر و غرور میں گرفتار نہیں ہوتے تھے بلکہ ہمیشہ شامش و خورشید رہتے تھے۔

۹۱۔ وَالَّتِیْ أَحْصَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا وَجَعَلْنَاهَا وَابْنَهَا آيَةً ۝ لِلْعٰلَمِیْنَ ۝

ترجمہ

۹۱۔ اور یاد کرو اس خاتون کو کہ جس نے اپنی محنت کی حفاظت کی اور ہم نے اس کے اندر اپنی روح میں سے پھونکا اور اسے اور اس کے بیٹے کو ہم نے عالمین کے لیے ایک عظیم نشانی قرار دیا۔

لہ "رغباً" رغبت، میلان اور لگاؤ کے معنی میں ہے اور "رهباً" خوف، لغزت اور بیزاری کے معنی میں ہے اور یہ بات کبر و اعجاب کے لحاظ سے، ان کا عمل متقل کیلئے، تو مستعد احتمالات میں، لیکن یہ حال ہو، یا متوکل مطلق ہو، یا ظرفیت کا معنی رکھتا ہو۔ فی حال الرغبة و فی حال الہیبة اگرچہ تمیز ان پانچوں اسما کا مختلف ہے لیکن یہ فرق آیت کے مفہوم کے جزئیات میں ہے، اس کی اساس اور تعبیر میں نہیں ہے۔

تفسیر

مریم پاک دامن خاتون :

اس آیت میں حضرت مریمؑ اور ان کے بیٹے حضرت عیسیٰؑ کے مقام، عظمت اور احترام کی طرف اشارہ ہوا ہے۔
مریمؑ کا ذکر بزرگ انبیاء سے مربوط مباحث کے درمیان۔ یا تو ان کے بیٹے عیسیٰؑ کی وجہ سے ہے یا اس بنا پر کہ مریمؑ کی ولادت بھی کئی جہات سے یحییٰ کی ولادت کے مشابہ تھی کہ جس کی تفصیل ہم نے سورہ مریم کی آیات کے ذیل میں بیان کی ہے۔
اور یا اس بنا پر ہے کہ اس بات کو واضح کیا جائے کہ عظمت، عظیم مردوں ہی کے لیے نہیں ہے بلکہ ایسی عظیم عورتیں بھی ہو گزری ہیں جن کی تاریخ ان کی عظمت کی نشانی ہے، جو عالم کی عورتوں کے لیے ایک اسوہ اور نمونہ ہیں۔
ارشاد ہوتا ہے : یا ادرکد مریمؑ کو جس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی (والتی احصنت فرجھا)۔
پھر ہم نے اپنی زوج میں سے اس میں پھر نکا (فخننا فیھا من روحنا)۔
اور اُسے اور اُس کے بیٹے (عیسیٰ) کو ہم نے عالین کے لیے عظیم نشان قرار دیا (وجعلناھا وابنا ایۃ للعالمین)۔

چند اہم نکات :

۱۔ ایک ابہام کی وضاحت : فرج اصل میں نفث کے لحاظ سے فاصلہ اور شکاف کے معنی میں ہے۔ اور کٹانے کے طور پر عورت کی اندام نہانی کے لیے استعمال ہوتا ہے اور چونکہ فارسی میں اس کے کٹانی معنی کی طرف توجہ نہیں ہوتی۔ لہذا بعض اوقات یہ سوال سامنے آتا ہے کہ یہ لفظ کہ جو عورت کے اس عضو خاص کے لیے بولا ہے، قرآن میں کیسے آیا ہے؟ لیکن اس کے کٹانے ہونے کی طرف توجہ اس سوال کو حل کر دیتی ہے۔
زیادہ واضح اور روشن تعبیر میں اگر ہم کٹانی معنی کو ٹھیک طور سے تعبیر کرنا چاہیں تو "احصنت فرجھا" کے جملہ کا متبادل فارسی میں یہ ہے کہ "اپنے دامن کو پاک رکھا" تو کیا فارسی میں یہ تعبیر بڑی ہے؟
بلکہ بعض کے نظریہ کے مطابق عربی نفث میں ایسے الفاظ کہ جو عضو خاص کے لیے صراحتاً ہوں، یا جنسی اختلاط میں صراحت رکھتے ہوں، اصلاً موجود ہی نہیں ہیں۔ جو کچھ بھی ہے وہ کٹانے کا ہی پہلو رکھتا ہے۔ مثلاً قرآن کی مختلف آیات میں اختلاط کے بارے میں "لمس کرنا" داخل ہونا، "دھانپنا" (غشیان) یا بیوی کے پاس جانا کے لفظ استعمال ہوئے ہیں۔ کہ جو سب کٹانے کا پہلو رکھتے ہیں۔ لیکن بعض اوقات فارسی زبان میں ترجمہ کرنے والے ان کے کٹانی معنی کی طرف توجہ نہیں کرتے اور اس کٹانی معانی کے متبادل کی بجائے فارسی

۱۔ تفسیر نمونہ جلد ۱ سورہ مریم کی ابتدائی آیات کی تفسیر دیکھیے۔
۲۔ سورہ اعراف - ۱۸۹۔
۳۔ بعثہ - ۲۲۲۔

کے صریح الفاظ کہہ دیتے ہیں اور یہ بات سوال کا موجب بن جاتی ہے۔

بہر حال اس قسم کے الفاظ کی تفسیر میں کہ جو قرآن میں آئے ہیں، حتمی طور پر ان کے اصلی اور بنیادی معنی کی طرف توجہ کرنا چاہیے تاکہ اس کے کٹانے ہونے کا پہلو واضح ہو جائے اور ہر قسم کا ابہام ختم ہو جائے۔
اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ زیر بحث آیت کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ حضرت مریمؑ نے اپنی عصمت کی حفاظت کی، لیکن بعض مفسرین نے اس آیت کے معنی میں یہ احتمال ظاہر کیا ہے کہ انہوں نے کسی مرد سے (چاہے حلال ہو یا حرام) ہر قسم کے میل جول سے خود کو بچائے رکھا۔ جیسا کہ سورہ مریم کی آیہ ۲۰ میں ہے کہ :

وَلَوْ يَمْسُرُنَّ يَشْرُو لَوْ اَلْبَفِیَّا

نہ تو کبھی کسی بشر نے مجھے بھڑاسہ اور نہ ہی میں کوئی بدکار عورت ہوں۔

درحقیقت یہ حضرت عیسیٰؑ کی سبزانہ پیدائش اور ان کے معجزہ ہونے کے ذکر کی تہذیب ہے۔

۲۔ "روحنا" سے مراد : جیسا کہ ہم پہلے ہی بیان کر چکے ہیں، ایک باعظمت اور بلند حوصلہ روح کی طرف اشارہ ہے اور اصطلاح میں اس قسم کی اضافت "اضافت تشریفیہ" کہلاتی ہے، کہ ہم کسی چیز کی عظمت کو بیان کرنے کے لیے اس کی اضافت خدا کی طرف کر دیتے ہیں، مثلاً : "بیت اللہ" (خدا کا گھر) اور "شہر اللہ" (خدا کا مہینہ)۔

۳۔ ماں بیٹا ایک معجزہ : زیر نظر آیت کہتی ہے : "ہم نے مریمؑ اور اس کے بیٹے کو تمام جہان والوں کے لیے ایک آیت اور نشان قرار دیا۔ انہیں دو آیتیں یا دو معجزات نہیں کہا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا کی اس بزرگ آیت اور معجزہ میں "مریمؑ کا وجود ان کے بیٹے کے ساتھ اس طرح ملا ہوا تھا کہ وہ ایک دوسرے سے جدا شمار نہیں کیے جاسکتے تھے۔ بیٹے کا باپ کے بغیر پیدا ہونا آسانی کا اعجاز آمیز ہے، جتنا کہ کسی عورت کا شوہر کے بغیر حاملہ ہونا۔ علاوہ ازیں حضرت عیسیٰؑ کے معجزات، بچپن میں ہی اور بڑے ہو کر عیسیٰؑ کی والدہ کی عظمت کی یاد دلاتے ہیں۔

ان تمام امور میں سے ہر ایک، عام طبعی اسباب سے ہٹ کر اور خلاف معمول تھا۔ یہ سب امور اس حقیقت کی ترجمانی کرتے ہیں کہ سلسلہ اسباب کے ماوراء ایک ایسی قدرت بھی موجود ہے جو جب چاہے، ان کی روش کو بدل دے۔ بہر حال سچے اور ان کی والدہ مریمؑ کی کیفیت پوری انسانی تاریخ میں بے نظیر ہے نہ اس سے پہلے کبھی ایسا ہوا اور نہ اس کے بعد دیکھا گیا ہے اور شاید لفظ "آیت" کا معجزہ کی صورت میں کہ جو عظمت کی دلیل ہے، اسی معنی کی طرف اشارہ ہے۔

۹۲- اِنَّ هَذِهِ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۖ وَاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنَ
 ۹۳- وَتَقَطُّعُوا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ ۖ كُلُّ الِّیْنَا رَاجِعُوْنَ ۝
 ۹۴- فَمَنْ یَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا کُفْرَانَ لِسَعِیِّ
 وَاَنَا لَهُ کَاتِبُوْنَ ۝

ترجمہ

۹۲- یہ (عظیم پیغمبر) جن کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے اور ان کے پیروکار) سب ایک ہی امت ہیں (اور ایک ہی
 حریف اور مقصد کے پیرو ہیں) اور میں تمہارا پروردگار ہوں، پس میری ہی عبادت کرو۔
 ۹۳- (جیسے علم اور بے خبری پر دو کاروں کے ایک گروہ نے) آپس میں اپنے کام میں تفرقہ ڈال دیا ہے (لیکن آخر کار سب
 کے سب ہماری طرف لوٹ کر آئیں گے۔
 ۹۴- جو شخص بھی کچھ اعمال صالحہ بجالائے گا جب کہ وہ با ایمان بھی ہو، تو اس کی کوششوں کی ناکامی نہیں ہوگی اور ہم ان کے
 تمام اعمال لکھ رہے ہیں (تاکہ سب کو بڑی باریک بینی کے ساتھ ان کا بدلہ دیا جائے)

تفسیر

ایک اُمت

گزشتہ آیات میں خدا کے بعض پیغمبروں کے نام آئے ہیں اور اسی طرح مریم جیسی مثالی خاتون کا نام آیا ہے۔ ان کے حالات
 زندگی بیان ہوئے ہیں۔ زیر بحث آیات میں مجموعی طور پر نتیجہ نکالتے ہوئے فرمایا گیا ہے: یہ عظیم پیغمبر جن کی طرف اشارہ ہوا ہے
 سب کے سب ایک ہی امت تھے (اِنَّ هَذِهِ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً)۔
 اُن سب کا پروگرام بھی ایک تھا اور ان کا حریف و مقصد بھی ایک ہی تھا۔ اگرچہ زمانہ اور ماحول کے اختلاف کے لحاظ سے
 مختلف خصوصیات اور ان کا انداز کار کچھ مختلف تھا یعنی ان کی تکنیک مختلف تھی۔
 لیکن سب کے سب آخر الامر ایک ہی مسک اور راہ پر گامزن تھے۔ وہ سب کے سب توحید کی راہ میں شرک کے خلاف
 جدوجہد کرتے تھے اور دنیا کے لوگوں کو یگانگت، حق اور عدالت کی دعوت دیتے تھے۔
 پروردگار اہل اور حریف و متحد کی یہ یگانگت اور وحدت اس بنا پر تھی کہ وہ سب کے سب ایک ہی مبداء سے فیض حاصل کرتے تھے

مذہب واحد دیکھنا کا ارادہ تھا۔ لہذا ساتھ ہی فرمایا گیا ہے: میں تم سب کا پروردگار ہوں لہذا تم صرف میری ہی عبادت کرو:
 وَاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنَ)۔

درحقیقت انبیاء کی توحید عقیدتی و عملی کا سرچشمہ وحی ہے۔ اور یہ گفتگو علی علیہ السلام کی اُس بات سے مشابہ ہے کہ جو آپ نے
 اپنے بیٹے امام جعفر کو وصیت کرتے ہوئے فرمائی تھی:

واعلمو یا بنی انہ لوکان لربک شریک لانتک رسولہ ولعرفت
 افعالہ وصفاتہ۔

اے بیٹا! جان لے کہ اگر تیرے پروردگار کا کوئی اور بھی شریک ہوتا، تو اس کے
 رسول بھی تیری طرف آتے، تو اس کے ملک اور آثار قدرت کو بھی دیکھتا اور اس کے افعال و
 صفات کو بھی پہچانتا۔

امت جیسا کہ راغب کتاب مفردات میں لکھا ہے، ہر اس گروہ اور جمیعت کے معنی میں ہے کہ جس کی کوئی مشترک ہمت
 اس کے افراد کو آپس میں جوڑے رکھے۔ ایک دین، ایک زمانہ یا ایک معین مکان کا اشتراک چاہے یہ وحدت اختیاری ہو یا غیر اختیاری۔
 بعض مفسرین نے "امت واحدة" کو یہاں "دین واحد" کے معنی میں لیا ہے لیکن جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہ تفسیر امت
 کے لغوی معنی سے مطابقت نہیں رکھتی۔

بعض دوسرے لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ اس آیت میں "امت" سے مراد، تمام زمانوں اور قرون کے تمام انسان ہیں یعنی
 اے تمام انسانو! تم سب کے سب ایک ہی امت ہو، تمہارا پروردگار بھی ایک ہے اور تمہارا حقیقی مقصد بھی ایک ہے۔
 یہ تفسیر اگرچہ گزشتہ تفسیر کی نسبت زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے، لیکن اس آیت کے، پہلی آیتوں کے ساتھ تعلق کو برقرار
 رکھتے ہوئے، یہ صحیح نظر نہیں آتی۔ زیادہ مناسب یہ ہے کہ یہ جملہ اُن ہی انبیاء و مرسلین کی طرف اشارہ ہے کہ جن کے حالات کی
 تفصیل گزشتہ آیات میں بیان کی گئی ہے۔

اگلی آیت میں، لوگوں کی اکثریت کی توحید ہی بنیاد سے انحراف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: وہ اپنے معاملے
 میں اختلافات کا شکار ہو گئے: (وَقَطُّعُوا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ)۔

معاملہ اس حد کو پہنچ گیا کہ وہ ایک دوسرے کے مقابلے میں کھڑے ہو گئے اور ہر گروہ دوسرے گروہ کو لعن و نفرین کرنے لگاؤ
 اس سے بیزار ہو گیا۔ انہوں نے اسی پر قناعت نہ کی بلکہ ایک دوسرے کے مقابلے میں ہتھیار نکال لیے اور بہت زیادہ غور زنی کی اور
 یہ توحید اور حق کے دین واحد سے انحراف کا نتیجہ تھا۔

"فقطعوا" مادہ قطع سے ہے۔ یہ ایک باہم ملی ہوئی چیز کو علیحدہ علیحدہ ٹکڑوں میں کر دینے کے معنی میں ہے۔ یہ "باب فاعل"
 سے آیا ہے۔ کہ جو قبول کرنے کے معنی میں لڑا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے جملے کا مفہوم اس طرح ہوگا: وہ تفرقہ اور فتنے کے عوامل کے
 لہذا نبی البلاغہ، مکتوب ۳۱۔

سلسلے جھگ گئے اور انہوں نے ایک دوسرے سے علیحدگی اور بے گامی کو قبول کر کے اپنی فطری اور توحیدی وحدت کو ختم کر دیا اور
کے نتیجے میں ہر قسم کی شکست، ناکامی اور بد نتیجے میں گرفتار ہو گئے۔

آیت کے آخر میں مزید فرمایا گیا ہے: لیکن یہ سب کے سب آخر کار ہماری ہی طرف لوٹ کر آئیں گے (کل الیہنا راجعون)
یہ اختلاف جو عارضی ہے ختم ہو جائے گا اور پھر قیامت میں سب کے سب وحدت ہی کی طرف جائیں گے۔ قرآن کی مختلف
میں اس کے پرست تاکید کی گئی ہے کہ قیامت کی خصوصیات میں سے ایک اختلافات کا ختم ہو جانا اور وحدت کی طرف چل پڑنا ہے
سورہ مائدہ کی آیت ۴۸ میں ہے،

إِلَٰهُ اللَّهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ
تم سب کی بازگشت خدا ہی کی طرف ہے اور جن چیزوں میں تم اختلاف رکھتے تھے تمہیں
وہ ان سے آگاہ کرے گا۔

یہ مضمون قرآن مجید کی متعدد آیات میں نظر آتا ہے۔

اور اس طرح سے انسانوں کی خلقت "وحدت" سے ہی شروع ہوتی ہے اور وحدت کی طرف ہی لوٹ جائے گی۔

آخری زیر بحث آیت میں پروردگار کی پرستش کی راہ میں "آئینہ واحدہ" کے ساتھ ہم آہنگی کا نتیجہ بیان کیا گیا ہے: جو کوئی
بھی کچھ اعمال صالح انجام دے گا، جبکہ وہ ایمان بھی رکھتا ہو، تو اس کی جدوجہد اور کوشش کی ناقدری نہیں کی جائے گی:
(فَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا يَكْفُرْ لِسَعِيهِ)

اور مزید تاکید کے لیے اضافہ کیا گیا ہے: اور ہم اس کے اعمال صالح یقیناً نکھیں گے (وَأَنَّا لَهُ كَاتِبُونَ)

اس آیت میں قرآن کی دوسری بہت سی آیات کی طرح ایمان اور عمل صالح کا انسانوں کی نجات کے لیے دو اساسی اور بنیادی
ارکان کے طور پر ذکر ہوا ہے لیکن لفظ "من" کے اضافہ کے ساتھ کہ جو بعض کے لیے آتا ہے۔ یہ اس مطلب کو بیان کرتا ہے کہ تمام
اعمال کی انجام دہی بھی شرط نہیں ہے بلکہ اگر صاحبان ایمان کچھ بھی عمل صالح بجالائیں تو بھی وہ اہل نجات و سعادت ہیں۔

بہر حال یہ آیت قرآن کی بہت سی دوسری آیات کی طرح، اعمال صالح کی قبولیت کی شرط ایمان کو شمار کرتی ہے۔
"لَا يَكْفُرْ لِسَعِيهِ" کے جملہ کا ذکر، اس قسم کے افراد کی جزائے بیان کرنے کے لیے، ایک ایسی تعبیر ہے کہ جو انتہائی لطیف
محبت اور بزرگواری کے ساتھ ملی ہوئی ہے کیونکہ خدا اس مقام پر اپنے بندوں کی قدردانی کرتے ہوئے ان کی سعی و کوشش کا شکریہ ادا
کر رہا ہے۔ یہ تعبیر اس تعبیر کی مانند ہے جو سورہ بنی اسرائیل کی آیہ ۱۹ میں بیان ہوئی ہے:

وَمَنْ أَرَادَ الْآخِرَةَ وَسَعَىٰ لَهَا سَعْيًا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا يَكْفُرْ
سَعْيُهُمْ شُكْرًا

جو شخص آخرت کے گھر کی خواہش کرے گا، اور اس کے لیے سعی و کوشش کرے گا۔

جبکہ وہ ایمان بھی رکھتا ہو، تو اس کی کوشش کی قدردانی کی جائے گی۔

نہ آل عمران - ۵۵، النعام - ۱۶۴، نمل - ۹۲ اور ج ۶۹ وغیرہ۔

۹۵۔

۹۶۔

۹۷۔

ترجمہ

۹۵۔ وہ شر اور آبیادیاں کہ جنہیں ہم نے (گناہوں کی پاداش میں) ہلاک کر دیا، ان کے لیے ممکن نہیں ہے کہ وہ (اس دنیا میں)
پلٹ سکیں۔

۹۶۔ یہاں تک کہ جب یا جوج و ماجوج کھول دیئے جائیں گے اور وہ تیزی کے ساتھ ہر بلندی سے گزر جائیں گے۔

۹۷۔ اور (قیامت کے بارے میں) حق کا وعدہ (ایفا کے) قریب ہو جائے گا، تو اس وقت کافروں کی آنکھیں

دشت کی دج سے حرکت پھڑکیں گی، (وہ کہیں گے) واسے ہو ہم پر کہ ہم اس کے بارے میں غفلت میں تھے، ہم تو
ظالم تھے۔

تفسیر

کفار قیامت کے آستانے پر:

گوشہ آیات میں نیکو کار سونہیں کے بارے میں گفتگو تھی اور زیر بحث پہلی آیت میں ایسے افراد کی طرف اشارہ ہے کہ جو
ان کے نقطہ مقابل میں واقع ہیں وہ لوگ کہ جو آخری سانس تک گمراہی اور بڑائی پر باقی رہتے ہیں۔

فرمایا گیا ہے: ان بستیوں پر کہ جنہیں ہم نے ان کے گناہوں کے جرم میں نابود کر دیا ہے، حرام ہے کہ وہ دنیا کی طرف پلٹ
کر آئیں، وہ ہرگز واپس نہیں آئیں گے:

(وحرām علی قریۃ اهلکناھا انھو لا یرجعون)۔
درحقیقت وہ ایسے لوگ ہیں کہ جو عذاب الہی دیکھنے کے بعد یا ہلاکت کے بعد اور عالم برزخ میں جانے کے بعد غرور و غفلت کے پردوں کو اپنی نگاہوں کے سامنے سے ہٹا ہوا پائیں گے، تو آرزو کریں گے کہ اسے کاش! وہ ان تمام خطاؤں اور گناہوں کی تلافی کرنے کے لیے دوبارہ دنیا کی طرف لوٹ جاتے، لیکن قرآن صراحت کے ساتھ کہتا ہے کہ ان کی بازگشت باطل حرام یعنی ناسور ہے۔

یہ اسی بات کے مشابہہ کہ جو سورہ مؤمنون کی آیہ ۹۹ میں بیان ہوئی ہے:

حتیٰ اذا جاء احدھما الموت قال رب ارجعون لعلی اعمل صالحا فیما ترحمت کلا۔۔۔

ان کی یہ کیفیت اسی طرح باقی رہے گی، یہاں تک کہ ان کی موت (کا وقت) آن پہنچے گا تو وہ یہ کہیں گے: پروردگار! ہمیں دنیا کی طرف پلٹا دے تاکہ وہ نیک اعمال کر جو ہم نے ترک کر دیئے ہیں انجام دیں لیکن وہ سوائے منفی جواب کے اور کچھ نہیں سنیں گے۔

اس آیت کی تفسیر میں دوسرے بیانات بھی ذکر ہوئے ہیں کہ جن میں سے بعض کی طرف نیچے حاشیہ میں اشارہ ہوگا۔
بہر حال یہ بے خبر لوگ ہمیشہ غفلت اور غرور میں ہی رہیں گے اور ان کی یہ بدبختی اسی طرح باقی رہے گی یہاں تک کہ دنیا ختم ہو جائے گی۔

جیسا کہ قرآن فرماتا ہے:

”یہ بات اس وقت تک ہوتی رہے گی یہاں تک کہ یا جوج و ما جوج پر راہ کھل دی جائے گی اور وہ ساری زمین میں پھیل جائیں اور وہ ہر بلندی سے تیزی کے ساتھ گزر جائیں: (حتیٰ اذا ففتح یا جوج و ما جوج وھو من کل حدب ینسلون)۔
یا جوج و ما جوج کون لوگ تھے کہاں رہتے تھے اور آخر کار وہ کیا کریں گے اور ان کا کیا انجام ہوگا؟

لہٰذا اس تفسیر کے مطابق ”حرام“ خیر سے مبتلائے مذوت کی اور ”انھو لا یرجعون“ کا جملہ اس پر دلیل ہے اور تقریر میں اس طرح قاضی حرام علی اهل قریۃ اهلکناھا ان یرجعوا الی الدنیا انھو لا یرجعون
جن اہل قریۃ کو ہم نے ہلاک کیا ہے ان پر حرام ہے کہ وہ پلٹ آئیں، وہ نہیں پلٹیں گے۔

بعض نے ”حرام“ کو یہاں ”واجب“ کے معنی میں لیا ہے۔ انہوں نے کہلجہ کہ لغت عرب میں بعض اوقات یہ لفظ اس معنی میں استعمال ہوتا ہے اور وہ لفظ ”لا“ کو زائد سمجھتے ہیں۔ ان کے حساب سے آیت کا معنی اس طرح ہوگا:

آخرت میں ان کی بازگشت واجب اور ضروری ہے۔

بعض یہ کہتے ہیں کہ ”حرام“ حرام ہی کے معنی میں ہے، لیکن ”لا“ زائد ہے، یعنی ان کی بازگشت اس جہان کی طرف حرام ہے۔

بعض مشرکین نے آیت کو خدا اور اہل قریۃ کے مابین تفریق کے معنی میں لیا ہے (تفسیر مجمع البیان اور غراری زیر بحث آیہ کے ذیل میں)

بعض یہ کہتے ہیں کہ آیت تفسیری ہے اور یہاں بات کو بیان کرتی ہے کہ حرام ہے کہ وہ قیامت میں پلٹ کر نہ آئیں، یعنی وہ پلٹ کر نہیں آئیں گے۔ (تفسیر نجی الصادقین زیر بحث آیہ کے ذیل میں) لیکن جو کہ ہم نے متنبہ میں بیان کیا ہے وہ سب سے زیادہ مناسب نظر آتا ہے۔

اس بارے میں ہم نے سورہ کہف کی آیہ ۹۴ کے ذیل میں اور اس کے بعد بحث کی ہے اور اسی طرح اس ”سورہ کے بارے میں بھی کہ جو ”ذوالقرنین“ نے ان کے حملوں کو روکنے کے لیے پہاڑوں کے ایک تنگ درہ میں بنائی تھی، تفصیل سے بحث ہو چکی ہے۔
کیا ان دونوں گروہوں کے کھل جانے سے مراد، اس سدا کا ٹوٹ جانا، اور ان کا اس راستے سے دنیا کے دوسرے علاقوں میں نفوذ کرنے سے مراد کڑی زمین میں ہر جانب اور ہر طرف سے نفوذ ہے؟ زیر نظر آیت نے صریح طور پر اس بارے میں کوئی بات نہیں کی ہے۔ صرف زمین میں پھیل جانے کو عالم کے اعتدال کی ایک نشانی اور قیامت کے آنے کی ایک تہذیب کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے۔

اس کے ساتھ ہی یہ فرمایا گیا ہے: اس وقت خدا کا وعدہ حق نزدیک آ پہنچے گا: (واقرب الوعد الحق)۔

اور ایک گہرا ہٹ اس طرح کفار کے سارے وجود پر چھا جائے گی کہ ان کی آنکھیں حرکت نہیں کر پائیں گی، اور وہ یہ منظر حیرانی کے ساتھ دیکھیں گے: (فاذا ہی شاخصۃ ابصار الذین کفروا)۔

اس وقت ان کی آنکھوں کے سامنے سے غفلت اور غرور کے پردے ہٹ جائیں گے اور انہیں پکاریں گے: واسے جو ہم پر ہم تو اس منظر سے غفلت میں ہی تھے: (یا ویلنا قد کنا فی غفلۃ من لھذا)۔

اور چونکہ اپنے اس عذر سے اپنے گناہ نہیں چھپا سکیں گے اور خود کو بری بھی قرار نہ دے سکیں گے، لہٰذا صراحت کے ساتھ کہیں گے: نہیں بلکہ ہم ہی ظالم تھے: (بل کنا ظالمین)۔

اصولی طور پر خدا کے ان تمام پیغمبروں اور آسمانی کتابوں اور ان تمام ہلا دینے والے حوادث اور اسی طرح ایسے عبرت آموز سبقوں کے باوجود کہ جو زمانہ ان کے سامنے پیش کرتا ہے — یہ بات کیسے ممکن ہو سکتی ہے کہ وہ پھر بھی غفلت میں رہیں لہٰذا جو کچھ ان سے سرزد ہوا ہے، تفسیر ہے اور خود اپنے اوپر بھی اور دوسروں کے اوپر بھی ظلم ہے۔

چند الفاظ کے لغوی معنی:

”حدب“ (بروزن ”ادب“) ایسی بلندیوں کے معنی میں ہے کہ جو پہاڑوں کے درمیان ہوتی ہیں۔ کبھی انسان کی پشت کے اوجار کو بھی ”حدب“ کہتے ہیں۔

”ینسلون“ ”نسل“ کے مادہ سے (بروزن ”فضول“) تیزی سے نکلنے کے معنی میں ہے۔

یہ جو یا جوج و ما جوج کے بارے میں ہے کہ وہ ہر بلندی سے تیزی کے ساتھ گزر رہے ہیں اور نکلیں گے، یہ ان کے کڑی زمین میں بہت زیادہ نفوذ کرنے کی طرف اشارہ ہے۔

”شاخصۃ“ ”شخوص“ (بروزن ”خلوص“) دراصل گھر سے باہر نکلنے کے معنی میں ہے۔ یا ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرف نکل جانے کے معنی میں ہے اور چونکہ تعب اور حیرانی کے وقت انسان کی آنکھ گویا یہ چاہتی ہے کہ وہ باہر نکل آئے، لہٰذا ان حالت کو بھی ”شخوص“ کہا جاتا ہے۔ یہ وہ حالت ہے کہ جو قیامت میں گنہگاروں کو لاحق ہوگی۔ وہ ایسے حیران ہوں گے کہ گویا ان کی آنکھیں یہ چاہتی ہیں کہ وہ اپنے حلقہ سے باہر نکل آئیں۔

۹۸- اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ حَصْبُ جَهَنَّمَ
 ۹۹- اَنْتُمْ لَهَا وَرِدُونَ
 ۱۰۰- لَوْ كَانَ هَؤُلَاءِ الْاِلٰهَ مَا وَرَدُوْهَا وَكُلٌّ فِيْهَا خٰلِدُونَ
 ۱۰۱- اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰى اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُعَذَّوْنَ
 ۱۰۲- لَا يَسْمَعُونَ حٰثِثَهَا وَهُمْ فِيْ مَا اشْتَقَتْ اَنْفُسُهُمْ خٰلِدُونَ
 ۱۰۳- لَا يَحْزَنُهُمُ الْفِتْنُ الْاَكْبَرُ وَتَلَقَّوْا الْمَلٰٓئِكَةَ هٰذَا
 يَوْمُكُمْ الَّذِیْ كُنْتُمْ تُوعَدُونَ

ترجمہ

۹۸- تم بھی اور جن جن کی تم خدا کو چھوڑ کر پرستش کرتے ہو، جہنم کا ایندھن ہوں گے، اور تم سب کے سب اس میں جاؤ گے۔
 ۹۹- اگر یہ خدا ہوتے تو ہرگز اس میں نہ جلتے اور وہ سب کے سب ہمیشہ اسی میں رہیں گے۔
 ۱۰۰- وہاں پر وہ دردناک طریقے سے نالہ و فریاد کرتے ہوں گے اور وہاں انہیں کچھ سنا ہی نہ دے گا۔
 ۱۰۱- لیکن وہ لوگ کہ جن سے ہم نے پہلے سے اچھا وعدہ کیا ہوا ہے، انہیں اس سے دُور ہی رکھا جائے گا۔
 ۱۰۲- وہ جہنم کی آگ کی آواز (سبک بھی) نہیں سنیں گے اور وہ انہیں کہ جس میں ان کا دل پلپٹے گا، ہمیشہ ہمیشہ (غمزدن میں) رہیں گے۔
 ۱۰۳- انہیں وہ عظیم وحشت عذوبہ و مغموم نہیں کرے گی اور فرشتے ان کے استقبال کے لیے بڑھیں گے (اور یہ کہیں گے) یہی تودہ دن ہے کہ جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔

تفسیر

جہنم کا ایندھن

گزشتہ آیات میں ظالم مشرکین کے انجام کے بارے میں گفتگو تھی۔ ان آیات میں دُورے سخن ان کی طرف کرتے ہوئے ان کی اور ان کے معبودوں کے مستقبل کی اس طرح تصویر کشی کی گئی ہے: تم بھی اور جن جن کی تم خدا کو چھوڑ کر پرستش کرتے ہو (سبک جہنم کا ایندھن ہیں) انکو وما تعبدون من دون اللہ حصب جہنم۔
 "حصب" در اصل پھینکنے کے معنی میں ہے۔ خصوصاً ایندھن کے ٹکڑوں کو تنور میں پھینکنے کو۔ "حصب" کہا جاتا ہے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ "حطب" (بروزن سبب) کہ جو ایندھن کے معنی میں ہے، عربوں کی مختلف زبانوں میں مختلف تلفظ رکھتا ہے۔ بعض قبیلے اسے "حصب" اور بعض دوسرے اس کو "حضب" کہتے ہیں، اور چونکہ قرآن قبائل اور دلوں کو جوڑنے کیلئے آیا ہے لہذا بعض اوقات ان کے مختلف الفاظ کو بھی استعمال کرتا ہے تاکہ اس طریقے سے دل جمع ہوں۔ یہ لفظ "حصب" بھی ایسے الفاظ میں سے ہے کہ جو اہل یمن کے قبائل لفظ "حطب" کی جگہ تلفظ کرتے ہیں۔
 ہر حال زیر بحث آیت مشرکین سے کہتی ہے کہ جہنم میں آگ جلانے والا ایندھن جس سے اس کے شعلے پیدا ہوں گے، خود تم او تمہارے بناؤں خدا ایندھن کے لیے قدر و قیمت ٹکڑوں کی طرح یکے بعد دیگرے جہنم میں پھینکے جاؤ گے۔
 اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: تم اس میں جاؤ گے (انتو لھا واردون)۔
 یہ جملہ بات تو گزشتہ بات کی تاکید کے طور پر ہے یا ایک نئے نکتہ کی طرف اشارہ ہے، اور وہ یہ ہے کہ پہلے تو بتوں کو آگ میں ڈالیں گے، پھر تم ان پر وارد ہو گے، گویا تمہارے خدا اس آگ کے ساتھ کہ جو ان کے وجود سے نکلے گی، تہلدا استقبال کریں گے۔
 اگر یہ سوال ہو کہ بتوں کو جہنم میں ڈالنے کا کیا فلسفہ ہے، تو اس کے جواب میں یہ کہنا چاہیے کہ یہ بھی بُت پرستوں کے لیے ایک قسم کا عذاب اور سزا ہے کیونکہ وہ یہ دیکھیں گے کہ وہ اس آگ میں کہ جس کے شعلے ان کے بتوں سے نکل رہے ہیں، مل رہے ہیں۔
 علاوہ انہیں یہ بات ان کے نظریات کی تحقیر و تہذیب ہے، کہ وہ اس قسم کی بے قدر و قیمت چیزوں کی پٹلہ لیا کرتے تھے۔
 البتہ یہ اس صورت میں ہے جبکہ (ما یعبدون) ان معبودوں کے معنی میں ہو کہ جو بے جان پتھر اور لکڑی کے بنے ہوئے بت ہیں (بیساکر) تمہارے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بت "عام طور پر غمزدی، استغنا کے لیے" بنائے گئے تھے۔

اس کے بعد عیسیٰ تہیہ نکالتے ہوئے فرمایا گیا ہے : اگر یہ بُت خدا ہوتے تو ہرگز جہنم کی آگ میں نہ پہنچتے (لَوْ كَانَ هَذَا اِلَهًا مَا وَرَدَهَا)۔

لیکن یہ جان لو کہ نہ صرف یہ کہ وہ جہنم میں پہنچیں گے بلکہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس میں رہیں گے (وَكُلٌّ فِيهِ الْخَالِدُونَ) اور مرنے کی بات یہ ہے کہ یہ بت پرست ہمیشہ اپنے خداؤں کے ساتھ ہی رہیں گے۔ وہ خدا کہ جن کی وہ ہمیشہ پرستش کیا کرتے تھے اور انہیں مصیبتوں میں ڈھال سمجھتے تھے اور اپنی مشکلات کا حل ان سے پہنچتے تھے۔

ان "گمراہ عبادت کرنے والوں" کی "ان بے قدر و قیمت معبودوں" کے ساتھ دردناک کیفیت کے بارے میں مزید وضاحت کے لیے فرمایا گیا ہے : وہ دوزخ میں دردناک نالہ و فریاد کریں گے (اِهْوِزْ فَاِذَا زَفِيرٌ)۔

"زفیر" اصل میں ایسی چیخ و پکار کرنے کے معنی میں ہے جس کے ساتھ سانس کی آواز بھی آرہی ہو۔ بعض نے کہا کہ پھر کی نفرت اچیز آواز کو ابتدا میں "زفیر" اور آخر میں "شقیق" کہتے ہیں۔ بہر حال یہاں ایسے نالہ و فریاد کی طرف اشارہ ہے کہ جو غم و اندوہ کی وجہ سے نکلے گا۔

یہ احتمال بھی ہے کہ یہ غم اچیز نالہ و فریاد صرف ان عبادت کرنے والوں کے ساتھ ہی مربوط نہ ہو بلکہ شیاطین کے جو ان کے معبود تھے وہ بھی اس میں ان کے شریک ہوں۔

بعد کا جملہ ان کی ایک اور دردناک سزا کو بیان کرتا ہے اور وہ یہ ہے کہ : انہیں دوزخ میں کچھ سٹائی نہیں دے گا : (وَهُوَ فِيهَا لِاِيْسَمَعُونَ)۔

یہ جملہ ممکن ہے اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ وہ کوئی ایسی بات ہرگز نہیں سنیں گے کہ جو ان کے لیے راحت کا باعث بنے۔ بلکہ وہ دوزخوں کے جانکاہ نالے اور عذاب کے فرشتوں کی چوکیاں ہی سنیں گے۔

بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ انہیں آگ کے تابوتوں میں رکھا جائے گا، اس طرح سے کہ وہ کسی کی آواز کو باسکل نہیں سنیں گے۔ گویا وہ اکیلے ہی عذاب میں ہیں اور یہ بات خود زیادہ عذاب کا سبب ہے کیونکہ اگر انسان کے ساتھ اور افراد بھی زندان میں ہوں تو یہ بات اس کے دل کی تسلی کا باعث ہوگی کیونکہ :

البليّة اذا عمت طابيت

بلا ومصيبت جب عام ہو تو وہ جلی معلوم ہوتی ہے۔

اگلی آیت سچے مومنین اور صاحبانِ ایمان مردوں اور عورتوں کے حالات بیان کر رہی ہے تاکہ ایک دوسرے کے ساتھ موازنہ سے دونوں کی کیفیت زیادہ واضح ہو جائے۔

ارشاد ہوتا ہے کہ : وہ لوگ کہ جن سے ہم نے ان کے ایمان اور عمل صالح کی وجہ سے پہلے سے اچھا وعدہ کر رکھا ہے، وہ اس دشتناک اور ہولناک آگ سے دُور رہیں گے (ان الذين سبقناهم الى الجنة)۔

مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ جلد ۵ میں سورہ ہود کی آیہ ۱۰۶ کے ذیل میں رجوع کریں۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہم نے اس جہان میں مومنین سے جتنے وعدے کیے ہیں، ہم انہیں پورا کر دیں گے ان میں سے ایک ان کا جہنم کی آگ سے دُور رہنا ہے۔

اگرچہ اس جملے کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ یہ تمام سچے مومنین کے لیے ہوگا لیکن بعض نے یہ احتمال ذکر کیا ہے کہ یہ حضرت عیسیٰ اور مریمؑ جیسے معبودوں کی طرف اشارہ ہے کہ ایک گمراہ جن کی عبادت ان کی خواہش اور مرضی کے بغیر کرتا تھا۔ اور چونکہ سابقہ آیات یہ کہتی تھیں کہ تم بھی اور تمہارے معبود بھی دوزخ میں داخل ہوں گے تو اس تعبیر سے ممکن تھا کہ حضرت عیسیٰ جیسے افراد بھی شامل سمجھ لیے جاتے، لہذا قرآن نے جملہ فوراً ایک استثناء کے طور پر بیان کرتا ہے کہ ایسے لوگ ہرگز دوزخ میں نہیں جائیں گے۔

بعض مفسرین نے اس آیت کے بارے میں ایک شانِ نزول ذکر کیا ہے کہ جو اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ بعض لوگوں نے یہی سوال پیچ کر اسلام سے بھی کیا تھا لہذا یہ آیت ان کے جواب میں نازل ہوئی ہے۔

لیکن اس حالت میں بھی کوئی امر مانع نہیں ہے کہ زیر نظر آیت اُس سوال کا جواب بھی ہو اور سب سچے مومنین کے بارے میں ایک عمومی حکم بھی ہو۔

آخری زیر بحث آیات میں خدا کی چار عظیم نعمتوں کا ذکر ہے کہ جو ان لوگوں کو میسر ہوں گی :

پہلی یہ کہ وہ آگ کی آواز تک نہیں سنیں گے (لَا يَسْمَعُونَ حَيْثُ هُمْ)۔

"حیس" جیسا کہ ارباب لغت نے کہا ہے، عوس آواز کے معنی میں ہے اور خود حرکت یا خود حرکت سے جو آواز پیدا ہو اس کے معنی میں بھی ہے۔ دوزخ کی آگ کہ جو ہمیشہ آتش گیر یوں میں بڑھتی ہی جاتی ہے، ایک مخصوص آواز رکھتی ہے۔ یہ آواز وحشت سے

دشتناک ہے، ایک تو اس لحاظ سے کہ یہ آگ کی آواز ہے، اور دوسرے اس لحاظ سے کہ یہ آگ بھجنے کی آواز ہے۔

سچے مومنین چونکہ جہنم سے دُور رہیں گے، لہذا یہ دشتناک آوازیں ہرگز ان کے کانوں میں نہیں پڑیں گی۔

دوسری یہ، کہ وہ بیسی نعمت میں پائیں گے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس میں مستغرق رہیں گے (وَهُوَ فِيهَا اشْتَهَتْ

انفسهم خالداً)۔

یعنی وہاں پر اس جہان کی طرح کی محدودیت نہیں ہے۔ یہاں تو انسان بہت سی نعمتوں کی آرزو کرتا ہے لیکن ان تک نہیں پہنچ پاتا۔

وہاں پر وہ جو بھی مادی و معنوی نعمت چاہے گا، اس کی دسترس میں ہوگی۔ وہ بھی ایک دن یا دو دن نہیں بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔

تیسری یہ کہ عظیم دشت انہیں مفہوم نہیں کرے گی (لَا يَحْزَنُهُمُ الْفُتُوحُ الْاَكْبَرُ)۔

"فُتُوحُ الْاَكْبَرُ" (عظیم اور بڑی دشت) کہ بعض نے روزِ قیامت کی دشتوں کی طرف اشارہ سمجھا ہے کیونکہ وہ ہر دشت سے

بڑی ہے اور بعض نے صور کا پھونکا جانا اور اس جہان کے ختم ہونے کی زبردست کیفیت کی طرف اشارہ سمجھا ہے، جیسا کہ سورہ نمل کی آیہ

۸۷ میں ہے :

لیکن چونکہ قیامت کے دن کی دشت سلسلہ طور پر اس سے زیادہ اہم ہے، لہذا پہلی تفسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

آخر میں ان لوگوں کے لیے آخری نعمت کا ذکر ہے اور وہ یہ کہ : رحمت کے فرشتے ان کا استقبال کرنے کے لیے آگے بڑھیں گے،

انہیں مبارکباد دیں گے اور یہ بشارت دیں گے کہ یہ وہی دن ہے کہ جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا : (وَتَلَقُّهُمْ الْمُتَلَقُّونَ هَٰذَا

یوم الذی کنتم توعدون۔

نوح البلاغہ میں ہے کہ امیر المؤمنین علی علیہ السلام نے فرمایا :

فبادروا باعمالکم تکنونوا مع جیلان اللہ فی دارہ ، رافق بہم
رسلہ ، وازارہم ملائکتہ ، ولکم اسماعہم ان تسمعہم
نارجہم ابداً .

نیک اعمال کی طرف جلدی کرو ، تاکہ تم خدا کے گھر میں اس کے پڑوسی بنو۔ ایسے مقام پر کہ
جہاں پیغمبروں کو ان کا رفیق قرار دیا ہے اور فرشتوں کو ان کی زیارت کے لیے بھیجا جاتا ہے۔
خدا نے ان لوگوں کی اتنی عزت بڑھائی ہے کہ ان کے کان جہنم کی آگ کی آواز تک نہیں
سنیں گے ۔

۱۰۲۔ یَوْمَ نَطْوِي السَّمَاءَ كَطَيِّ السِّجْلِ لِلْكِتَابِ كَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ
نَعِيدُهُ وَعُدَّا عَلَيْنَا أَنَا كَافِعِلِينَ ۝

ترجمہ

۱۰۲۔ وہ دن کہ جب ہم آسمان کو اس طرح لپیٹ دیں گے جیسے خطوط کے کاغذوں کو آپس میں لپیٹا جاتا ہے۔ (پھر) جس
طرح سے ہم نے خلقت کی ابتدا کی تھی ، اسی طرح سے اُسے واپس لوٹائیں گے۔ یہ وہ وعدہ ہے کہ جو ہم نے کیا ہے اور
ہم یقینی طور پر اسے انجام دیں گے ۔

تفسیر

جب آسمانوں کو لپیٹ دیا جائے گا :

گزشتہ بحث کی آخری آیت میں تھا کہ سچے مومنین عظیم وحشت سے غلبین نہیں ہوں گے۔ یہاں پر اس بڑی وحشت کے
دن کا ایک اور رخ پیش کیا جا رہا ہے اور حقیقت اس وحشت کی عظمت کی عظمت کی تصویر کشی کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے :
نوح البلاغہ ، خطبہ ۱۸۳۔

یہ معاملہ اُس دن حقیقت کی صورت اختیار کر لے گا کہ جب ہم آسمانوں کو اس طرح سے لپیٹ دیں گے کہ جس طرح خطوط کو لپیٹا جاتا ہے
(یوم نطوی السماء کطی السجل للکتاب)۔

گزشتہ زمانے میں خطوط لکھنے کے لیے اور اسی طرح کتابیں لکھنے کے لیے ، طومار (لپٹے ہوئے کاغذ) کی طرح کے اوراق استعمال
ہوتے تھے۔ ان طوماروں کو لکھنے سے پہلے لپیٹ دیتے تھے اور لکھنے والا بتدریج آہستہ آہستہ اُسے ایک طرف سے کھینچتا رہتا تھا
اور جو مطالب اُسے لکھنا ہوتے تھے اس کے اوپر لکھا کرتا تھا اور لکھائی ختم ہونے کے بعد پھر انہیں لپیٹ کر ایک طرف رکھ دیا جاتا تھا۔
لہذا ان کے خطوط اور کتابیں بھی طومار کی شکل میں ہوتی تھیں اُس طومار کو "سجل" کا نام دیا جاتا تھا جس کو لکھنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔
اس آیت میں ، دنیا کے اعتقاد پر ، عالم ہستی کے لپیٹ دینے جلنے کی ، ایک لطیف تشبیہ ہے۔ اس وقت اوراق کے یہ طومار
کھلے ہوئے ہیں اور اس کے تمام نقوش اور خطوط پڑھے جا رہے ہیں اور ہر ایک اپنی اپنی جگہ پر قائم اور برقرار ہے لیکن جب قیامت
کا حکم ہو جائے گا تو یہ عظیم طومار اپنے تمام خطوط و نقوش کے ساتھ لپیٹ دیئے جائیں گے۔

البتہ دنیا کے لپیٹے جانے کا معنی اس کا مٹنا اور نابود ہونا نہیں ہے ، جیسا کہ بعض نے خیال کر رکھا ہے۔ بلکہ اس کا درہم برہم
ہو کر مل جانا اور اکٹھا ہو جانا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس جہان کی شکل و صورت تو تجرّج جلتے گی ، لیکن اس کا مادہ نابود اور ختم نہیں ہوگا۔
یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جو آیات معاد کی مختلف تعبیرات سے اچھی طرح واضح ہوتی ہے مثلاً انسان کا بوسیدہ ڈھریوں اور قبروں سے
اُٹھنا ۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے کہ : "جس طرح ہم نے اُسے ابتدا میں پیدا کیا ہے (اسی طرح) دوبارہ پٹائیں گے" یہ کام
ہماری عظیم قدرت کے سامنے کوئی مشکل نہیں ہے (کما بدأنا اول خلق نفییدہ)۔

درحقیقت یہ تعبیر اُس تعبیر کے مشابہ ہے کہ جو سورہ اعراف کی آیہ ۲۹ میں ہے :
کَمَا بَدَأْنَاكُمْ قَتُودًا
جس طرح سے اُس نے تمہیں ابتدا میں پیدا کیا اسی طرح لوٹائے گا۔
اسی طرح ،

وهو الذی یبدئ الخلق ثم یعیدہ وهو اھون علیہ
اور وہی ذات تو ہے جس نے خلقت کی ابتدا کی ، پھر اس کو لوٹائے گا اور یہ اس
کے لیے زیادہ آسان ہے (روم - ۲۷)۔

۱۔ "سجل" (بروزن سطل) بڑے اور پانی سے بھرے ہوئے ڈول کے معنی میں ہے ، اور "سجل" (سین اور جیم کی زیر اور لام
کی شد کے ساتھ) اُن پتروں کے ٹکڑوں کے معنی میں ہے کہ جن کے اوپر لکھا جاتا تھا ، اس کے بعد ان تمام اوراق کو جن پر مطالب
لکھے ہیں کٹا گیا ہے (مفردات راغب و قاموس)۔ اس بات پر بھی قویہ دلائل ملے ہیں کہ "کطی السجل للکتاب"
نے جملہ کی ترکیب میں کئی احتمال دیتے گئے ہیں ، لیکن سب سے زیادہ مناسب یہ ہے کہ "کطی" جو کہ مصدر ہے "سجل" کی طرف

یہ جو بعض مفسرین نے احتمال پیش کیا ہے کہ اس بازگشت سے مراد، فنا و نابودی کی طرف بازگشت یا آغازِ آفرینش
اپس میں پلٹ دینا ہے، بہت ہی بعید نظر آتا ہے۔
اور آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: یہ وہ وعدہ ہے کہ جو ہم نے کیا ہے اور یقیناً ہم اسے انجام دیں گے
(وَعْدًا عَلَيْنَا لَنُكَفِّرَنَّ عَنْكَ)۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مخلوق کی پہلی صورت میں بازگشت سے مراد یہ ہے کہ انسان دوبارہ ننگے پاؤں
غریاں جیسا کہ ابتدائے خلقت میں تھے۔ پلٹ کر آئیں گے لیکن بلا شک اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ آیت کا مضمون
معنی میں منحصر ہے، بلکہ یہ تو مخلوق کے پہلی صورت میں لوٹنے کی ایک شکل ہے۔

۱۰۵- وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرْثُهَا
عِبَادِي الصَّالِحُونَ
۱۰۶- إِنَّ فِي هَذَا لَبَلَاغٌ لِقَوْمٍ عَابِدِينَ

ترجمہ

۱۰۵- ہم نے ذکر (تورات) کے بعد زبور میں لکھ دیا ہے کہ میرے صالح بندے زمین (کی حکومت) کے وارث
ہوں گے۔
۱۰۶- اس میں عبادت گزاروں کے لیے ایک روشن ابلاغ ہے۔

۱۰۵- جیسا کہ پہلے ہی ہم نے اشارہ کیا ہے کہ خدا کی لامتناہی قدرت کے بارے میں "مشکل اور آسان" کوئی چیز نہیں ہے، بلکہ سب
ایک جیسا ہے۔ اس بنا پر جو تعبیر مذکورہ بالا آیت میں آئی ہے، حقیقت میں انسانوں کی نظر کے لحاظ سے ہے۔
ل "وعدہ" "وعدنا" کا مفعول ہے جو کہ متذکرہ ہے۔
یہ جملہ حقیقت میں چند قسم کی تاکید پر مبنی ہے، مثلاً "وعدنا"، "علینا" (ہم پر) انا کے ساتھ تاکید ہے۔
"کنا" میں فعل ماضی کا استعمال اور اس میں "فاعلین" کا لفظ۔

تفسیر

زمین کی حکومت صالحین کے لیے ہوگی۔

گزشتہ آیات میں صالح مومنین کے لیے اُفریدی جزا کے ایک حصے کی طرف اشارہ کرنے کے بعد، زیر بحث آیات میں
نہایت عمیق اور فصاحت سے ان کی ایک واضح و بنیادی جزا کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور وہ ہے زمین کی حکومت۔ ارشاد ہوتا ہے:
ہم نے "زبور" میں "ذکر" کے بعد یہ لکھ دیا ہے کہ آخر کار میرے صالح بندے زمین (کی حکومت) کے وارث ہوں گے
وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرْثُهَا عِبَادِي الصَّالِحُونَ۔

"ارض" سارے کرۂ زمین کو کہا جاتا ہے اور سارا جہان اس میں شامل ہے، مگر یہ کہ کوئی خاص تہذیب موجود ہو۔ اگرچہ بعض
نے یہ احتمال پیش کیا ہے کہ اس سے مراد قیامت میں ساری زمین کا وارث ہونا ہے لیکن لفظ "ارض" کا ظاہری معنی جب کہ
پر مطلق طور پر بولا جائے، اس جہان کی زمین ہی ہوتا ہے۔

لفظ "ارض" جیسا کہ ہم پہلے ہی اشارہ کر چکے ہیں، اس چیز کے معنی میں ہے کہ جو بغیر معاملہ اور خرید و فروخت کے
کسی کی طرف منتقل ہو اور کبھی قرآن مجید میں "ارض" ایک صالح قوم کے غیر صالح قوم پر تسلط اور کامیابی، اور ان کے تمام سرمائے و وسائل
کو اپنے قبضہ اور اختیار میں لینے کے لیے بولا گیا ہے جیسا کہ سورہ اعراف کی آیہ ۱۳ میں بنی اسرائیل کی فرعون پر کامیابی کے بارے میں
بیان ہوا ہے:

وَأَوْثَقْنَا الْقَوْمَ الَّذِينَ كَانُوا يُسْتَضَفُونَ مَشَارِقِ الْأَرْضِ وَمَغَارِبِهَا
ہم نے زمین کے مشرق و مغرب کو، اس مستضعف قوم کی میراث میں دے دیا۔
اگرچہ "زبور" اصل میں ہر قسم کی کتاب اور تحریر کے معنی میں ہے۔ قرآن مجید میں تین مواقع میں سے دو موقعوں پر یہ لفظ۔
حضرت داؤد کی طرف اشارہ ہے لیکن بعید نہیں کہ میرے موقع پر یعنی زیر بحث آیت میں بھی اسی معنی کی طرف اشارہ ہو۔
"زبور داؤد" یا "عہد قدیم" کی کتابوں کی تعبیر میں "مزاسیر داؤد" اللہ کے نبی حضرت داؤد کی نصیحتوں، دعاؤں اور مناجات کا
ایک مجموعہ ہے۔ بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ "زبور" سے مراد یہاں گزشتہ انبیاء کی تمام کتب ہیں۔
لیکن مذکورہ دلیل کے پیش نظر۔ یہی معلوم ہوتا ہے کہ "زبور" سے مراد "مزاسیر داؤد" ہی ہے۔ خاص طور پر جب کہ موجودہ مزاسیر
میں ایسی عبارتیں ملتی ہیں کہ جو زیر بحث آیت سے بالکل مطابقت رکھتی ہیں۔ انشاء اللہ ان کی طرف ہم بعد میں اشارہ کریں گے۔
"ذکر" دراصل یاد آوری یا اس چیز کے معنی میں ہے جو تذکرہ و یاد آوری کا باعث ہے۔ قرآن کی آیات میں اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔
کبھی حضرت موسیٰ کی آسمانی کتاب یعنی تورات پر بھی اس کا اطلاق ہوا ہے مثلاً سورہ انبیاء کی آیہ ۴۸:
وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَىٰ وَهَارُونَ الْفُرْقَانَ وَضِيَالَهُمْ ذِكْرًا لِلْمُتَّقِينَ
یہ احتمال تفسیر جمع السبلان اور تفسیر فرمازی نے چند گزشتہ مفسرین سے نقل کیا ہے۔

اس لیے بعد والی آیت میں مزید تاکید کے طور پر فرمایا گیا ہے: اس بات میں ان لوگوں کے لیے کہ جو خدا کی اخلاص کے ساتھ کرتے ہیں، ایک واضح اور روشن ابلاغ ہے (ان فی هذا لبلاغ القوم عابدين)۔

بعض مفسرین لفظ "هذا" کو ان تمام وعدوں اور وعیدوں کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں کہ جو اس سورہ میں ہیں یا سارے قرآن میں ہیں۔

لیکن آیہ کا ظاہر یہ ہے کہ "هذا" اسی وعدہ کی طرف اشارہ ہے کہ جو گزشتہ آیت میں خدا نے اپنے صالح بندوں سے اپنے زمین کی حکومت کے بارے میں کیا ہے۔

چند اہم نکات:

۱۔ قیام مہدی کے سلسلہ میں روایات: بعض روایات میں یہ آیت صراحت کے ساتھ حضرت امام مہدیؑ کے بارے میں انصار کے ساتھ تفسیر ہوئی ہے۔ جیسا کہ مجمع البیان میں امام محمد باقر علیہ السلام سے اسی آیت کے ذیل میں منقول ہے:

هو اصحاب المہدی في آخر الزمان

وہ صالح بندے کہ جن کا خدا نے اس آیت میں وارثان زمین کے عنوان سے ذکر کیا ہے وہ

آخری زمانے میں مہدی کے اصحاب و انصار ہیں۔

تفسیر قمی میں بھی اس آیت کے ذیل میں ہے:

ان الارض يرثها عبادي الصالحون، قال القاسم واصحابه

اس سے مراد کہ زمین کے وارث خدا کے صالح بندے ہوں گے، مہدی قائم اور ان کے اصحاب ہیں۔

بغیر کے یہ بات واضح ہے کہ یہ روایات اسی ایک عالی اور آشکار مصداق کا بیان ہیں۔ ہم نے بار بار بیان کیا ہے کہ یہ تفسیر گزشتہ آیت کے مفہوم کی عمومیت کو محدود نہیں کرتی۔

لہذا جس زمانے میں بھی اور جس جگہ بھی خدا کے صالح بندے اٹھ کھڑے ہوں گے تو وہ کامیاب ہوں گے اور آخر کار زمین ان کی حکومت کے وارث ہو جائیں گے۔

مندرجہ بالا روایات تو خصوصیت سے اس آیت کی تفسیر کے بارے میں ہیں۔ ان کے علاوہ بھی شیعہ مفسرین کتب میں متعدد اقوال نقل کیے ہیں بہت زیادہ روایات ہیں جو پیغمبر اسلام اور آئمہ اہل بیت سے منقول ہیں: اور سب کی سب اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اگر اس جہان کی حکومت صالحین کے ہاتھ آجائے گی اور خدا ان پیغمبر سے ایک شخص قیام کرے گا کہ جو زمین کو عدل و داد سے اس سے بھر دے گا جس طرح وہ ظلم و جور سے بھری ہوگی۔

ان میں سے ایک یہ مشہور حدیث ہے جو اکثر منابع اسلامی میں پیغمبر اکرمؐ سے نقل ہوئی ہے:

اور کبھی یہ لفظ قرآن کے لیے استعمال ہوا ہے۔ مثلاً سورہ مائیدہ کی آیہ ۲۷:

ان هو الا ذکر للعالمین

لہذا بعض نے یہ کہا ہے کہ زیر بحث آیت میں ذکر سے مراد قرآن ہے اور زبور سے مراد تمام گزشتہ کتب میں اور مسمیٰ کا لفظ، تقریباً فارسی کے لفظ "علاوہ بریں" کے ہم معنی ہے۔ اس طرح سے آیت کا معنی یہ ہوگا:

ہم نے قرآن کے علاوہ، تمام گزشتہ انبیاء کی کتابوں میں بھی لکھ دیا تھا کہ آخر کار تمام زمین خدا کے صالح بندوں کے اختیار میں قرار پا جائے گی۔

لیکن آیت میں جو تعبیرات استعمال ہوئی ہیں ان کی طرف توجہ کرتے ہوئے ظاہر یہ ہے کہ زبور سے مراد حضرت داؤدؑ کی کتاب ہی ہے اور "ذکر" تورات کے معنی میں ہے۔

اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ زبور تورات کے بعد تھی تو "من بعد" کی تفسیر بھی حتمی ہی ہوگی اور اس طرح آیت کا معنی یوں ہوگا:

ہم نے تورات کے بعد، زبور میں یہ لکھ دیا تھا کہ اس زمین کی میراث ہمارے صالح بندوں تک پہنچے گی۔

یہاں پر یہ سوال سلسلے آتا ہے کہ آسمانی کتابوں میں سے صرف انہی دو کتابوں کا نام کیوں لیا گیا ہے؟ لیکن جب یہ اس وجہ سے ہو کہ حضرت داؤدؑ ان بزرگ ترین پیغمبروں میں سے ایک تھے کہ جنہوں نے حق اور عدالت کی حکومت قائم کی اور بنی اسرائیل بھی وہ مستضعف قوم تھے کہ جنہوں نے مسکین کے خلاف قیام کیا اور ان کے اقتدار کو ختم کر کے ان کی حکومت اور سرزمین کے وارث ہو گئے۔

ایک اور سوال کہ جو یہاں باقی رہ جاتا ہے، یہ ہے کہ خدا کے صالح بندے (عباد الصالحون) کون ہیں؟

بندوں کی خدا کی طرف اضافت پر توجہ کرتے ہوئے، ان کے ایمان اور توحید کا مسلک واضح ہو جاتا ہے اور لفظ "صالحین" کی طرف توجہ کرنے سے جو کہ ایک وسیع معنی رکھتا ہے، تمام اہل بیتیں اور لیاقتیں ذہن میں آجاتی ہیں۔ عمل و تقویٰ کے لحاظ سے اہلیت علم و آگاہی کے لحاظ سے اہلیت، قدرت و وقت کے لحاظ سے اہلیت اور تدبیر و نظم و ضبط اور اجتماعی شعور کے لحاظ سے اہلیت جس وقت صاحب ایمان بندے اس قسم کی اہلیتیں پالیں، تو خدا بھی ملک اور مدد کرتا ہے تاکہ وہ مسکین کو شکست دے سکے ان کے آلودہ ہاتھوں کو زمین کی حکومت سے ہٹا سکے اور ان کی میراثوں کے وارث بن جائیں۔

اس بنا پر صرف "مستضعف" ہونا دشمنوں پر کامیابی اور رُوندے زمین کی حکومت کے لیے کافی نہیں ہوگا بلکہ ایک طرف ایمان ضروری ہے اور دوسری طرف اہلیت کا حصول۔ مستضعفین جہاں جب تک ان دو اصولوں کو زندہ نہیں کریں گے، رُوندے زمین کی حکومت تک نہیں پہنچ سکتے۔

اصطلاحی تفسیر کے مطابق "بند" کی لفظ بیان "بعد" رجبی ہے ذکر "بعد" زمانی۔

آورد میں "من بعد" کا متبادل "علاوہ ازیں" یا "اس کے علاوہ" ہے۔

ہوئی تصویروں کو دیکھتا ہے، لیکن کتا ہے کہ میں اس قسم کے کمرے اور تصویروں کو پہلی مرتبہ دیکھ رہا ہوں۔ شاید وہ یہ سوچتا ہے کہ کسی دوسرے کمرے سے اس کمرے میں اتر آیا ہے کیونکہ تمام چیزیں اس کے لیے نئی ہیں۔ شاید اس کے دماغ کے کپڑوں سیلوں میں سے چند دستیابی سیل کے جوگزشتہ کمال سے ملاتے ہیں، بیکار ہو گئے تھے لیکن اسی پر تعلیم کے غراب ہونے نے کیا مشتعل کر ڈھکیا۔

تو کیا انسانی معاشرہ "لائق" صرح و مرج، نظم و دستم، اور ناہنجاری کو انتخاب کر کے، اپنے آپ کو جہان آفرینش کے اس عظیم سمندر سے الگ کر سکتا ہے؟ کہ جس میں سب کے سب منظم پر وگرام کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں۔ کیا جہان کی وضع عمومی کا مشاہدہ ہمیں یہ سوچنے پر مجبور نہیں کرتا کہ بشریت بھی خواہ مخواہ عالم ہستی کے نظام کے سامنے تسلیم کرے اور منظم اور عادلانہ نظام کو قبول کرے، اپنی اصلی راہ کی طرف پلٹ آئے اور اس نظام کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائے؟ ہم ہر انسان کے بدن کی گونا گوں اور پیچیدہ مشین کی ساخت پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ دل و دماغ سے لے کر آنکھ، کان، زبان یہاں تک کہ بال کی ایک جڑ کو دیکھتے ہیں، یہ سب کے سب قوانین نظم اور ایک حساب کے تابع ہیں، تو اس حالت میں انسانی معاشرہ، ضوابط و قوانین اور صحیح عادلانہ نظام کی پیروی کے بغیر کس طرح برقرار رہ سکتا ہے؟ ہم بقائے بشریت کے خواہاں ہیں اور اس کے لیے سعی و کوشش کرتے ہیں۔ البتہ ابھی تک ہمارے معاشرے کی سطح آگاہی اس حد تک نہیں پہنچی ہے کہ ہم یہ جان لیں کہ موجودہ راہ درویش کو جاری رکھنے کا انجام ہماری فنا اور نابودی ہے۔ لیکن آہستہ آہستہ اور اک اور شعور فکری ہمیں حاصل ہو جائے گا۔

ہم اپنے مفادات کے خواہاں تو ہیں لیکن ابھی تک ہم یہ نہیں جانتے کہ موجودہ حالت کو برقرار رکھنا، ہمارے مفادات کو برباد کر رہا ہے۔ البتہ آہستہ آہستہ جب ہم بیکار ہوں گے اور اسلحہ سازی پر غور کریں گے تو ہم دیکھیں گے کہ عالمی معاشروں کی اسی فعالیت فکری اور جسمانی قوتیں اور عالمی سرمایے کا آدھا حصہ اس راستہ میں رائیگاں جا رہا ہے۔ نہ صرف رائیگاں جا رہا ہے بلکہ دوسرے آدمے کو نابود کرنے کے کام میں لایا جا رہا ہے۔

سطح آگاہی بلند ہوگی تو ہم واضح طور پر جان لیں گے کہ ہمیں عالم ہستی کے عمومی نظام کی طرف پلٹنا چاہیے اور اس کے ساتھ ہم آواز ہونا چاہیے۔

اور جس طرح سے کہ ہم واقعی طور پر اس کل کی ایک جز ہیں، عملی طور پر بھی ہمیں ایسا ہی ہونا چاہیے تاکہ ہم تمام مسائل میں اپنے مقاصد تک پہنچ سکیں۔

نتیجہ اس کا یہ نکلا کہ جہان انسانیت میں نظام آفرینش ہی آئندہ زمانے میں ایک صحیح اجتماعی نظام کو قبول کرنے کے لیے ایک روشی دلیل بنے گا اور یہ وہی چیز ہے کہ جو زیر بحث آیت اور "عالم کے مصلح عظیم" (مہدی ارواح فداہ) کے قیام سے مربوط احادیث سے معلوم ہوتی ہے۔

۱۔ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ یہ بحث سال ۱۲۰۲ھ کے باوشیان کی چند ہجری رات۔ جو ولادت باسلو حضرت موسیٰ المہدی (ارواح فداہ) کی رات ہے، کو کئی ہی ہے۔ کالیے وقت میں کہہ رہے ہیں کہ ہلکے مسلمان جہان خوشی منانے ہیں۔ ایک وجہ تو یہ ہے کہ مسلمانوں کی دوسری دنیا کی بانی کی جو نظریات اسلام کو مزید یکجہ پیروی میں لایا اور ہم خدا کا ان سادہ سادہ پرستکار ادا کرتے ہیں۔

- ۱۰۷۔ وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ ۝
- ۱۰۸۔ قُلْ إِنَّمَا يُوحِي إِلَيَّ أَنَّكُمْ آلُ الْكَوْكَبِ الْوَاحِدِ فَقُلْ أَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ۝
- ۱۰۹۔ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ أَذْنُكُمْ عَلَىٰ سَوَاءٍ ۖ وَإِنْ أَدْرِي أَقْرَبُ أَمْ بَعِيدُ مَا تُوعِدُونَ ۝
- ۱۱۰۔ إِنَّهُ يَعْلَمُ الْجُحْمَ مِنَ الْقَوْلِ وَيَعْلَمُ مَا تَكْتُمُونَ ۝
- ۱۱۱۔ وَإِنْ أَدْرِي لَعَلَّه فِتْنَةٌ لَّكُمْ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ ۝
- ۱۱۲۔ قُلْ رَبِّ احْكُم بِالْحَقِّ وَرَبُّنَا الرَّحْمَنُ الْمُسْتَعَانُ عَلَىٰ مَا تَصِفُونَ ۝

ترجمہ

- ۱۰۷۔ اور ہم نے تجھے عالمین کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔
- ۱۰۸۔ تم کہہ دو کہ مجھے تو صرف یہ وحی ہوئی ہے کہ تمہارا معبود خدا ہے (اس حالت میں حق کے سامنے) سر تسلیم خم کرو گے (اور بتوں کو چھوڑ دو گے)۔
- ۱۰۹۔ اگر (ان تمام باتوں کے باوجود) وہ ٹوگروانی کریں تو تم ان سے یہ کہہ دو کہ میں تم سب کو یکساں طور پر عذاب الہی سے خبردار کرتا ہوں اور میں یہ نہیں جانتا کہ (عذاب خدا کا) یہ وعدہ تمہارے نزدیک ہے یا دور۔
- ۱۱۰۔ یقیناً وہ آشکار باتوں کو بھی جانتا ہے اور جسے تم چھپاتے ہو اسے بھی جانتا ہے (اور کوئی چیز اس پر مخفی نہیں ہے)۔
- ۱۱۱۔ اور میں یہ نہیں جانتا کہ شاید یہ بات تمہارے لیے آفتابش ہو اور ایک (معیین) مدت کے لیے فائدہ اٹھانے کے لیے ہو۔
- ۱۱۲۔ اور (پیغمبر نے) کہا: پروردگار! توحق کے ساتھ فیصلہ کر دے (اور ان سرکشوں کو سزا دے) اور ہمارا پروردگار ہی وہ رحمن ہے کہ جس سے میں تمہاری ناروا تمہتوں پر مدد طلب کرتا ہوں۔

تفسیر

عالمین کے لیے پیغمبر رحمت :

گزشتہ آیات صالح، ہندول کو زوئے زمین کی حکومت کی بشارت دے رہی تھیں، اور اس قسم کی حکومت تمام جہانوں کے لیے باعث رحمت ہے، اس لیے پہلی زیر بحث آیت میں وجود پیغمبر کے رحمت عامہ ہونے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے : ہم نے تجھے نہیں بھیجا مگر عالمین کے لیے رحمت بنا کر (وما ارسلناک الا رحمة للعالمین)۔

دنیا کے سبھی لوگ خواہ وہ مومن ہوں یا کافر تیری رحمت کے منوں میں کیونکہ تو نے ایسے دین و آئین کی ترویج اپنے ذمہ لے کر جو سب کی نجات کا سبب ہے۔ اب اگر کچھ لوگوں نے اس سے فائدہ اٹھایا ہے اور کچھ نے نہیں اٹھایا، تو یہ بات خود انہیں سے تعلق رکھتی ہے اور اس کا تیری رحمت کے عمومی ہونے پر کوئی اثر نہیں ہے۔

یہ بالکل اس طرح ہے کہ ایک ساز و سامان سے آراستہ ہسپتال تمام بیمار لوگوں کے علاج کے لیے بنایا جائے جس میں ہر قسم کی دوائیاں اور ماہر طبیب اور ڈاکٹر موجود ہوں اور اس کے دروازے تمام لوگوں کے لیے بلا کسی امتیاز کے کھول دیئے جائیں تو کیا یہ اس معاشرے کے تمام لوگوں کے لیے وسیلہ رحمت نہیں ہے؟ اب اگر بعض ہسپتال دھرم بیمار اس فیض عام کو خود سے قبول کرنے سے انکار کر دیں تو اس مرکز شفا کے عمومی ہونے پر اثر انداز نہیں ہوں گے۔

دوسرے لفظوں میں پیغمبر اکرم کے وجود کا تمام جہانوں کے لیے رحمت ہونا تو فاعل کی فاعلیت کے متعینی ہونے کا پہلو رکھتا ہے لیکن مسلمہ طور پر فضیلت تجھی نتیجہ خیز ہوتی ہے جب قبول کرنے والے میں قبول کرنے کی قابلیت بھی ہو۔

"عالمین" کی تعبیر ایسا وسیع مفہوم رکھتی ہے کہ جس میں تمام ادوار کے تمام انسان شامل ہیں اسی لیے اس آیت کو پیغمبر اسلام کی خاتمیت کے لیے بھی اشارہ سمجھا گیا ہے کیونکہ آپ کا وجود آئندہ کے تمام انسانوں کے لیے عالم کے انتقام تک رحمت ہے اور رہبر و پیشوا و مقتدا ہے اور ایک لحاظ سے تو یہ رحمت فرشتوں کے لیے بھی ہے۔

اس سلسلے میں ایک عمدہ حدیث نقل ہوئی ہے کہ جو اس عمومیت کی تائید کرتی ہے، حدیث یہ ہے کہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی تو پیغمبر اکرم نے جبریلؑ سے پوچھا :

هل اجابك من هذه الرحمة شئ

کیا اس رحمت کا کچھ فائدہ تمہیں بھی پہنچا؟

تو جبریلؑ نے جواب میں عرض کیا :

أني كنت اخشى عاقبة الامر، فامنت بك، لما اثنى الله على بقوله

عند ذی العرش مکین

میں اپنے انجام سے ڈرتا تھا لیکن ایک آیت کی وجہ سے کہ جو آپ پر قرآن میں نازل ہوئی

میں اپنی حالت سے مطمئن ہو گیا ہوں، کیونکہ خدا نے میری اس جملہ کے ساتھ مدح کی ہے :

ذی قوۃ عند ذی العرش مکین (جبریلؑ خدا کے ہاں جو خالق عرش ہے

بلند مقام و مرتبہ پر ہے)

بہر حال موجودہ دنیا کہ جس کے درد و آزار سے فساد، تباہی اور ظلم و ستم کی بارش ہو رہی ہے، جنگوں کے شعلے ہر جگہ بھڑک رہے ہیں اور ظالم قوتوں کا چنگل مظلوم مستضعفین کے گلے دبا رہا ہے، اس دنیا میں کہ جس میں جہالت، اخلاقی تباہی، خیانت، ظلم و استبداد و طغیانی تفاوت نے ہزاروں قسم کی مشکلات اور مصیبتیں پیدا کر دی ہیں۔ ہاں! ہاں! ایسے جہان میں پیغمبر اکرم کے "رحمتہ للعالمین" ہونے کا معنوم ہر درد سے زیادہ آشکار اور واضح ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا رحمت ہوگی کہ آپ ایک ایسا پروگرام لے کر آئے ہیں کہ جس پر عمل سے یہ تمام نامردانیاں، بد بختیاں اور سیاہ کاریاں ختم ہو سکتی ہیں۔

ہاں! ہاں! وہ بھی اور ان کے احکام بھی، آپ کا پروگرام اور آپ کا اخلاق بھی سب کے سب رحمت ہیں۔ ایسی رحمت کہ جو سب کے لیے ہے اور اس رحمت کی بقا و دوام کا نتیجہ تمام کرۂ زمین پر صاحبان ایمان صالحین کی حکومت ہوگا۔

اور چونکہ رحمت کا اہم ترین مظہر اور اس کی محکم ترین بنیاد، مسئلہ توحید اور اس کے جلوے ہیں لہذا اگلی آیت میں فرمایا گیا :
تر یہ کہہ دو کہ محمدؐ پر تو یہی وحی ہوئی ہے کہ تمہارا معبود تو ایک ہی معبود ہے (قل انما یوحی الی انما اللہ یکو واحد)۔
تو کیا تم اس بات کے لیے تیار ہو کہ اس بنیادی اصل یعنی توحید کے سامنے سر تسلیم خم کر دو اور بتوں کو کچھو دو (فهل انتم مسلمون)۔
در حقیقت اس آیت میں تین بنیادی نکات پیش کیے گئے ہیں :

پہلا نکتہ یہ ہے کہ رحمت کی حقیقی بنیاد توحید ہے اور سچ بات یہ ہے کہ ہم جتنا بھی غور و فکر کریں گے اتنا ہی یہ قوی رابطہ واضح اور روشن تر ہوتا جائے گا۔ اعتقاد میں توحید، عمل میں توحید، صفوں میں توحید، قانون میں توحید، ظرفیکہ ہر چیز میں توحید۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ لفظ "انما" کے تقاضے کے مطابق کہ جو صریح دلالت کرتا ہے، اسلام کے پیغمبر کی تمام دعوت کا خلاصہ، اصل توحید ہے۔ گہرا مطالعہ بھی اسی بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ اصول دین میں بلکہ فروع و احکام تک میں بھی آخر کار توحید ہی کی طرف لوٹتے ہیں اور اسی بنا پر۔ جیسا کہ ہم نے پہلے بھی بیان کیا ہے۔ توحید صرف اصول دین کی ایک اصل ہی نہیں بلکہ یہ ایک مضبوط دھماگے کی مانند ہے کہ جو توحید کے قانون کو ایک دوسرے سے ملاتا ہے یا زیادہ صحیح الفاظ میں ایک روح ہے کہ جو دین کے بدن میں پھونکی گئی ہے۔

آخری نکتہ یہ ہے کہ تمام معاشروں اور قوموں کی اصل مشکل مشقت شعلوں میں شمرک سے آو گئی ہے۔ کیونکہ "فهل انتم مسلمون" (کیا اس اصل کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہو) کا جملہ یہ بتاتا ہے کہ اصل مشکل شمرک اور شمرک کے مظاہر سے باہر آنا اور بتوں کو توڑنے کے لیے آئینیں چڑھانا ہے۔ نہ صرف پتھر اور لکڑی کے بتوں کو، بلکہ ہر قسم کے بتوں کو، خصوصاً انسانی طاعنوں کو توڑنے کے لیے

بعد والی آیت کہتی ہے کہ اگر ان تمام باتوں کے باوجود ہماری دعوت اور پیغام کی طرف توجہ نہ کریں اور ڈر و گردانی کریں تو ان سے کہہ دیں تم سب کو یکساں طور پر عذاب الہی کے خطرے سے آگاہ کرتا ہوں (فان تولوا فقل اذنتکوا علی سواہ)۔
 "اذنت" مادہ "ایمان" سے خبردار کرنے کے معنی میں ہے جس کے ساتھ تہدید موجود ہو اور بعض اوقات یہ لفظ اعلان جنگ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ یہ سورت مکہ میں نازل ہوئی تھی اور وہاں نہ تو جہاد کے لیے زمین ہموار تھی اور نہ ہی حکم ہوا تھا، لہذا یہ بات بہت بعید نظر آتی ہے کہ یہ جملہ یہاں پر اعلان جنگ کے معنی میں ہو۔ بلکہ ظاہر یہ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ اس بات سے یہ چاہتے ہیں کہ ان سے اعلان نفرت و علیحدگی کریں۔

"علی سواہ" کی تعبیر یا تو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ میں خدا کی سزا اور عذاب کے خطرے سے تم سب کو یکساں طور پر خبردار کرتا ہوں تاکہ وہ یہ تصور نہ کر لیں کہ اہل مکہ یا قریش اور دوسروں میں کوئی فرق ہے اور خدا کی بارگاہ میں انہیں کوئی بڑائی یا برتری حاصل ہے اور یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ میں اپنی آواز تم سب کے کانوں تک بغیر کسی استثنائے کے پہنچا چکا ہوں۔
 پھر اسی تہدید کو اور زیادہ آشکار صورت میں بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: میں نہیں جانتا کہ عذاب کا وہ وعدہ کہ جو تم سے کیا گیا ہے، قریب ہے یا دور: (وان ادری اقرب ام بعید ماتوعدون)۔
 یہ خیال نہ کرنا کہ یہ وعدہ دور ہے، شاید نزدیک ہو اور بہت ہی نزدیک ہو۔

یہ عذاب اور سزا کہ جس کی یہاں انہیں تہدید کی گئی ہے، ممکن ہے کہ عذاب قیامت ہو یا دنیا کی سزا اور یا یہ دونوں ہی ہوں۔ پہلی صورت میں اس کا علم خدا کے ساتھ مخصوص ہے اور کوئی بھی شخص ٹھیک طور پر وقوع قیامت کی تاریخ سے آگاہ نہیں ہے حتیٰ کہ خدا کے پیغمبر بھی۔

اور دوسری اور تیسری صورت میں ممکن ہے کہ اس کی جزئیات اور زمانے کے بارے میں اشارہ ہو، کہ میں ان جزئیات سے آگاہ نہیں ہوں کیونکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا علم اس قسم کے حادثات کے بارے میں ہمیشہ فعلی پہلو نہیں رکھتا بلکہ یہ بعض اوقات ارادی پہلو رکھتا ہے یعنی جب تک ارادہ نہ کریں نہیں جانتے۔

یہ تصور بھی اپنے ذہنوں میں نہ پھکنے دو کہ اگر تمہاری سزا میں کچھ تاخیر ہو جائے تو یہ اس وجہ سے ہے کہ خدا تمہارے اعمال اور تمہاری باتوں سے آگاہ نہیں ہے۔ نہیں! ایسا نہیں ہے! وہ سب کچھ جانتا ہے۔ وہ تمہاری آشکار باتوں کو بھی جانتا ہے اور ان باتوں کو بھی کہ جنہیں تم پھپھاتے ہو: (انہ یعلو الجہر من القول ویعلو ما تحتکتمون)۔
 اصولی طور پر پنهان و آشکار، تمہارے لیے تو منہوم رکھتا ہے کیونکہ تمہارا علم محدود ہے۔ لیکن اس ذات کے لیے کہ جس کا علم بے پایاں اور لامتناہی ہے، غیب و شہود ایک ہے اور پوشیدہ اور اعلانیہ یکساں ہے۔

علاوہ ازیں اگر تم یہ دیکھ رہے ہو کہ خدا کی سزا فوری طور پر تمہارے واسطے نہیں ہو رہی تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ تمہارے لیے مزید وضاحت کے لیے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے معصوم جانشینوں کے بارے میں کتاب رہبران بزرگ دستوریتاً بزرگ قرآن کا مطالعہ کریں۔

ہم سے آگاہ نہیں۔ مجھے کیا معلوم؟ شاید یہ تمہاری آزمائش کے لیے ہو" (وان ادری لعلہ فتنة لکوا)۔
 "اور وہ چاہتا ہے کہ تمہیں اس دنیا کی لذتوں سے ایک مدت تک محروم کر دے اور اس کے بعد تم سے ہر چیز لے لے اور ہوائے (ومتاع الی حین) در حقیقت یہاں خدا کی سزاؤں کی تاخیر کے دو فلسفے بیان ہوئے ہیں۔

پہلا فلسفہ امتحان و آزمائش ہے۔ خدا ہرگز عذاب میں جلد بازی نہیں کرتا تاکہ مخلوق کی کافی حد تک آزمائش کر لے اور امتحان کر دے دوسرا فلسفہ یہ ہے کہ کچھ ایسے افراد ہیں کہ جن کی آزمائش تو مکمل ہو چکی ہے اور ان کی سزا کا فیصلہ قطعی ہو چکا ہے لیکن اس غرض سے کہ انہیں سخت سے سخت سزا ہو، اپنی نعمت کو ان پر وسیع کر دیتا ہے تاکہ وہ پوری طرح نعمت میں غرق ہو جائیں اور ٹھیک اسی حالت میں جب کہ وہ نعمتوں سے لطف اندوز ہو رہے ہوں عذاب کے تازیانے ان پر پڑنے لگیں تاکہ وہ اور بھی زیادہ دردناک اور تکلیف دہ محسوس ہوں اور محروم دیکھ لوگوں کی تکلیفوں کا اچھی طرح احساس کریں۔

آخری زیر بحث آیت کہ جو سورۃ انبیاء کی بھی آخری آیت ہے، اس سورت کی پہلی آیت کی طرح بے خبر لوگوں کی غفلت کے بارے میں گفتگو کر رہی ہے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قول نقل کیا گیا ہے:

اس سے ان لوگوں کے غرور اور غفلت کے بارے میں آپ کی ناراضگی اور پریشانی ظاہر ہو رہی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: پیغمبر نے ان کی تمام ڈر و گردانیوں اور اعراض کو دیکھنے کے بعد "عرض کیا: میرے پروردگار! اب حق کے ساتھ فیصلہ کر دے اور اس سرکش گرد کو اپنی عدالت کے قانون کے مطابق سزا دے" (قال رب احکو بالحق)۔
 دوسرے جملے میں روتے سخن مخالفین کی طرف کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

"ہم سب کا پروردگار خدا ہے اور ہم اس کی مقدس بارگاہ میں ان ناروا تمہتوں پر کہ جو تم اس کی طرف دیتے ہو، اسی سے مدد مانگتے ہیں" (وربنا الرحمن المستعان علی ما تصفون)۔

در حقیقت لفظ "ربنا" انہیں اس حقیقت کی طرف توجہ دلا رہا ہے کہ ہم سب کے سب مربوب مخلوق ہیں اور وہ ہم سب کا خالق و پروردگار ہے۔

لفظ "الرحمن" کہ جو پروردگار کی رحمت عامہ کی طرف اشارہ ہے، انہیں یہ بات سمجھا رہا ہے کہ تمہارے سارے وجود کو خدا کی رحمت نے گھیر رکھا ہے، تو ہر ایک لمحے کے لیے ان سب نعمتوں اور رحمتوں کے پیدا کرنے والے کے ہاتھ میں غور و فکر کیوں نہیں کرتے؟

اور "المستعان علی ما تصفون" کی تعبیر انہیں اس بات پر خبردار کر رہی ہے کہ یہ گمان نہ کر لینا کہ ہم تمہاری جمعیت کی کثرت کے مقابلہ میں تنہا ہیں اور یہ تصور بھی کر لینا کہ تمہاری یہ سب تمہتیں اور جھوٹ اور ناروا نسبتیں چلبے وہ خدا کی ذات پاک کی طرف ہوں یا ہماری طرف ان کا جواب ضرور دیا جائے گا۔ کیونکہ ہم سب کی پناہ گاہ وہی ہے اور وہ اس بات پر قادر ہے کہ اپنے مومن بندوں کا ہر قسم کے جھوٹ اور تمہتوں کے مقابلہ میں دفاع کرے۔

اس میں شک نہیں کہ خدا کا ہر حکم حق کے مطابق ہے لہذا "بالحق" یہاں توحید پر دلیل رکھتا ہے۔

ختم

پروردگارا! جس طرح تو نے اپنے پیغمبر گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے قلیل ساتھیوں کو ان کے کثیر دشمنوں کے مقابلے میں اکیلا نہیں چھوڑا، ہمیں بھی مشرق و مغرب کے ان دشمنوں کے مقابلے میں تنہا نہ رہنے دے کہ جنہوں نے ہماری تباہی کے لیے ایک کر لیا ہے۔

خداوند! تو نے اس پُر برکت سورت میں اپنی خاص رحمت کا ذکر کیا ہے کہ جو تو نے اپنے پیغمبر پر سخت اور بڑا نفع میں اور زندگی کے طوفانوں کے مقابلے میں کی۔

بار الہا! ہم بھی اس زمانے میں ایسے طوفانوں میں گرفتار ہیں اور اسی رحمت اور کائنات کے منتظر ہیں۔ آمین یا رب العالمین اسی پر۔

سُورۂ نَبِیَّہ اختتام پذیر ہوئی۔ جمعۃ المبارک

سُورۂ حج

مدینہ میں نازل ہوئی
اس کی ۷۸ آیات ہیں

تفسیر نمونہ جلد ۱۳
ترجمہ کا
اختتام کو پہنچا

بوقت ۱۰ بجے دن
بروز منگل
بتاریخ ۳۰ اکتوبر ۱۹۸۳
برسکان شیخ پرویز انور
مقام ناچنڈہ محلہ کرشل ۶۴
ڈیپنڈر روڈ انگلستان

والحمد لله اولاً و آخراً وله الشکر ابداً و سمرداً
والصلوة والسلام علی محمد وآلہ الطاہرین
سید صفدر حسین نجفی

سید غلام سرور نقوی مرحوم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سورہ حج کے مضامین اور مطالب

اس سورت کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس میں حج کے بارے میں کچھ آیات ہیں۔ یہ سورت ان سورتوں میں سے ہے جن کے مکی یا مدنی ہونے میں مفسرین اور موضحین قرآن میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض اس سورت کو ماسوائے چند آیات کے مکی سمجھتے ہیں جبکہ بعض دوسرے اس کے برعکس خیال رکھتے ہیں۔

اگر ہم مکی اور مدنی سورتوں کے مطالب و مضامین، دونوں جگہوں کے ماحول مسلمانوں کی ضروریات اور اسی لحاظ سے پیغمبر اکرم کی تعلیمات کو ذہن میں رکھ کر غور کریں تو فوراً واضح ہو جاتا ہے کہ اس سورت کی بعض آیات مدنی سورتوں میں پائی جانے والی آیات سے مشابہ ہیں۔ جیسے حج اور جہاد کے احکامات اور تفصیلات جن کا تعلق مسلمانوں کی مدنی زندگی اور ضروریات سے ہے اور بعض آیات مکی سورتوں میں پائی جانے والی آیات جیسی ہیں۔ مثلاً ابتدائے خلقت اور قیامت کی تفصیلات پر مشتمل ہیں۔

”تاریخ القرآن“ کا مؤلف فہرست ابن ندیم اور نظم الدار، و تاریخی کتب کے حوالے سے لکھتا ہے کہ سورہ حج ماسوائے چند آیات کے مدینہ میں نازل ہوئی اور وہ چند آیات بھی مکہ و مدینہ کے درمیان نازل ہوئیں۔ ترتیب نزولی میں اس سورت کا نمبر ایک سو چھ ہے یہ سورت سورہ نور کے بعد اور سورہ منافقین سے پہلے نازل ہوئی ہے۔

بہر حال مجموعی طور پر اس سورہ کا مدنی ہونا صحیح معلوم ہوتا ہے۔

مطالب اور مضامین کے اعتبار سے اس سورت کی مندرجہ ذیل تقسیم کی جاسکتی ہے۔

۱۔ قیامت کا بیان بہت سی آیات اس مضمون کی حامل ہیں، ان میں قیامت کا منطقی استدلال اور غافل لوگوں کو جوابدہی کی وعید موجود ہے۔ غرضیکہ ابتدائی آیات اس بارے میں ہیں۔

۲۔ شرک اور مشرکین کا بیان آیات کا دوسرا حصہ شرک اور مشرکین کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے سے متعلق ہے۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ کی آیات کے حوالے سے انسان کی توجہ خالق کی عظمت کی طرف دلائی گئی ہے۔

۳۔ عذاب الہی کا بیان آیات کا ایک حصہ گوشتہ اقوام پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے شدید عذاب اور ان کے عبرتناک انجام کے مطالبے کی غرض سے دیا ہے۔ ان اقوام میں سے خاص طور پر قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود، قوم ابراہیم، قوم لوط، قوم شعیب اور قوم موسیٰ کا انجام یاد دلایا گیا ہے۔

۴۔ حج کا بیان آیات کا چوتھا حصہ حج کے بارے میں ہے۔ اس حصے میں حج کا تاریخی پس منظر و حضرت ابراہیم سے لے کر طوابع اسلام

ہجج کی تاریخ، مسجد قربانی اور طواف کے احکامات واضح طور پر بیان کئے ہیں۔

۵۔ ظالموں کے خلاف قیام کا بیان آیات کا ایک اور حصہ جاہلوں اور ظالموں کے خلاف اٹھنے اور دشمنوں کی جارحیت سے پھٹنے کے بارے میں ہے۔

۶۔ فروع دین کا بیان آیات کا آخری حصہ زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق و منظر و نصیحت پر مشتمل ہے، اس میں نماز اور زکوٰۃ کی ترغیب دی گئی ہے، بھلائی کی تلقین، بُرائی پر تنبیہ اور توکل علی اللہ کی طرف رغبت دلائی گئی ہے۔

اس سورت کی تلاوت کے فضائل

اسلام کے گرامی قدر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک کچھ حدیث مروی ہے۔

من قرء سورة الحج اعطى من الاجر كحجه حجه او عمرة اعتمرها، البعد من حج واعتمر فیما معی و فیما بقی۔

جو بھی سورہ حج کی تلاوت کرے اللہ اسے ان تمام لوگوں کی تعداد کے برابر اجر و ثواب عطا کرے گا جو گزشتہ زمانے میں حج و عمرہ بجالائے اور جو آئندہ بجالائیں گے۔

اس میں شک نہیں کہ یہ کثیر ثواب اور عظیم درجہ صرف لغفلت کی تلاوت سے حاصل نہیں ہوگا۔ بلکہ فکر ساز تلاوت سے حاصل ہوگا۔ ایسی فکر جو عمل پر در ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ جو کوئی اس سورت میں مندرجہ مدار و معاد کے نظریات کو دلی کی گہرائیوں سے مانے، اخلاقیات، عبادات کو جان و دل سے اپنائے اور منکبر و ظالم طاقتوں کے خلاف جہاد سے متعلق آیات کو اپنی عملی زندگی کا جزو بنائے۔ اس کا روحانی رشتہ تمام گزشتہ و آئندہ مومنین کے ساتھ قائم ہو جاتا ہے۔ ایسا رشتہ کہ جس سے یہ ان کے اعمال میں شریک ہو جاتا ہے۔ اور وہ اس کے اعمال میں شریک ہو جاتے ہیں۔ جب کہ ان کے ثواب میں بھی کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ درحقیقت یہ ایک حلقہ اتصال بن جاتا ہے۔ جس میں ہر دور کے اہل ایمان شامل ہیں۔ اس تسلسل میں مذکور بالا حدیث کا مضمون ہرگز عجیب معلوم نہیں ہوتا۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

۱- يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ إِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيمٌ

۲- يَوْمَ تَرَوُنَّهَا تُذْهِلُ كُلُّ مَرْضِعَةٍ عَمَّا أَرْضَعَتْ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكَرَىٰ وَمَا هُمْ بِسُكَرَىٰ وَلَٰكِنَّ عَذَابَ اللَّهِ شَدِيدٌ

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱- اے لوگو! اپنے پروردگار کے عذاب سے ڈرو، اس میں کوئی شک نہیں کہ قیامت کا زلزلہ ایک بڑی چیز ہے۔

۲- جس دن یہ رونما ہوگا تم دیکھو گے کہ (وحشت و خوف کا یہ عالم ہوگا کہ) شیرخوار بچوں کی ماؤں کو بچوں کا ہوش نہیں رہے گا اور ہر حاملہ عورت کا حمل ساقط ہو جائے گا۔ اور تجھے یوں لگے گا گویا لوگ مدہوش ہو گئے ہیں۔ حالانکہ وہ مدہوش نہیں ہوں گے۔ بلکہ اللہ کے عذاب کی شدت ہی کچھ ایسی ہوگی

تفسیر

قیامت کا وحشت ناک زلزلہ

اس سورت کا آغاز ایسی دو آیتوں سے ہو رہا ہے، جن میں جھنجھوڑنے اور ہلارکھ دینے والے واقعات کا ذکر ہے ایک قیامت دوسرا "مقدمہ قیامت" یہ آیتیں انسان کو بے ساختہ اس فانی دنیا کے اس ہولناک مستقبل کی طرف متوجہ کرتی ہیں۔ جو اس کے انتظار میں ہے۔ وہ مستقبل کہ اگر آج اس کے بارے میں سوچا جائے اور عملی طور پر تیاری نہ کی گئی تو واقعی خوفناک ہوگا۔ اور اگر تیاری کر لی گئی تو پرکشش اور خوشگوار ہوگا۔

پہلی آیت میں بلا استثنا سب لوگوں سے کہا گیا ہے: اے لوگو! پروردگار کے عذاب سے ڈرو اور پرہیزگاری اختیار کرو، کیونکہ قیامت کا زلزلہ بہت شدید اور اہم واقعہ ہے۔ (یا ایہا الناس اتقوا ربکم ان زلزلۃ الساعۃ شیء عظیم)

"یا ایہا الناس" کا خطاب واضح کر رہا ہے کہ یہاں رنگ، نسل، زبان، مکان، زمان، بغیر فانی حدود اور قوم قبیلہ میں ترجیح اور فرق روا نہیں رکھا گیا۔ مومن، کافر، چھوٹا، بڑا، بوڑھا، جوان، مرد، عورت، ماضی، حال اور مستقبل، ہر شخص کو ہی اس خطاب سے مستثنیٰ نہیں ہے۔

"اتَّقُوا رَبَّكُمُ" یہ جملہ تمام تعمیری ہدایتوں اور کاموں پر محیط ہے کیونکہ رَبَّكُمُ کہہ کر توحید کو بیان کر دیا گیا ہے، اور پھر تقویٰ کا ذکر ہے، گویا اس میں عقائد اور اعمال دونوں کو جمع کر دیا گیا ہے۔

"ان زلزلۃ الساعۃ شیء عظیم" یہ جملہ اجمالاً اس امر واقعہ کا ذکر کر رہا ہے، جو دیگر قرآنی آیات میں باجما آیا ہے اس سے مراد قیامت ہے اور جب قیامت آئے گی تو عالم کائنات بُری طرح دگرگوں اور زبرد زبر ہو جائے گا۔ پہاڑ اپنی جگہ سے اکھڑ جائیں گے، دریا ایک دوسرے میں غلط ملط ہو جائیں گے۔ زمین و آسمان درہم برہم ہو جائیں گے اور ایک نیا عالم، نئی زندگی کے ساتھ شروع ہوگا، عالم قیامت میں لوگ شدید دہشت اور سراسیمگی کی حالت میں ہوں گے۔

اس کے بعد والی آیت میں اس کیفیت کے چند نمونے پیش کیے گئے ہیں۔

۱- "یَوْمَ تَرَوُنَّهَا تُذْهِلُ كُلُّ مَرْضِعَةٍ عَمَّا أَرْضَعَتْ"

"خوف اور ہولکلاہٹ کا یہ حال ہوگا کہ بائیں اپنے شیرخوار بچوں تک سے غافل ہو جائیں گی۔"

۲- "وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا"

"گمراہٹ کی وجہ سے ہر حاملہ عورت کا حمل ساقط ہو جائے گا۔"

۳- "وَتَرَى النَّاسَ سُكَرَىٰ وَمَا هُمْ بِسُكَرَىٰ"

"لوگ مدہوشی کی سی کیفیت میں دکھائی دیں گے۔ حالانکہ وہ مدہوش نہیں ہوں گے۔"

۴- "وَلَٰكِنَّ عَذَابَ اللَّهِ شَدِيدٌ"

کچھ مفسرین نے کہا ہے کہ یہ آیت نصیری حادث کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ یہ بہت ہٹ دھرم، متعصب، ہمارا اور دشمن میں سے تھا۔ اسے ضد تھی کہ لاخبر خدا کی بیسیاں ہیں یہ کہتا تھا کہ قرآن تو گذشتہ لوگوں کے افانوں کا مجموعہ ہے جسے صرف منسوب کر دیا گیا ہے۔ یہ حیات بعد از موت کا بھی منکر تھا۔

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ یہ ان تمام مشرکین کے بارے میں ہے۔ کہ جو توحید اور قدرت خدا کے مسئلے میں جھگڑتے تھے۔ اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ شان نزول کبھی بھی آیت کے مفہوم کو محدود نہیں کرتی، ان دونوں اقوال کا نتیجہ ایک ہی نکلا ہے کہ مفہوم میں وہ تمام لوگ شامل ہیں جو کلام حق تعالیٰ، تعصب، خرافات یا پیروی نفس کی بناء پر حق کے مقابلے میں نزاع و جدل کرنے لگے ہیں۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: ایسے لوگ کہ جو کبھی منطق و دانش کے تابع نہیں وہ سرکش و سرور شیطان کی پیروی کرتے ہیں۔ ویستبع کل شیطان مرید (

صرف ایک شیطان کی پیروی نہیں کرتے، بلکہ ہر شیطان کے پیچھے چلتے گتے ہیں، چاہے وہ انسانوں میں سے ہو یا جنوں میں سے، کیونکہ ان میں سے ہر شیطان کا اپنا منصوبہ، اپنا جال اور مکر و فریب کے لیے اپنا حیلہ ہوتا ہے۔

لفظ "مرید" دراصل "مرد" (بروزن مرد) کے مادہ سے ایسی بلند زمین کے معنی میں ہے کہ جس میں کوئی گھاس بھوس نہ ہو، اور تپڑ سے خالی درخت کو "امرد" کہتے ہیں۔ اسی بنا پر جس نوجوان کی دایرے کے بال نہ اُگے ہوں اسے بھی "امرد" کہتے ہیں۔ یہاں "مرید" سے مراد وہ شخص ہے جو ہر قسم کی خیر و سعادت اور صلاحیت سے عاری ہو۔ ایسا شخص بظنا سرکش، ظالم، عاصی اور نافرمان ہوگا۔

واقعہ ہے کہ جس شیطان کے پاس کچھ بھی نہیں۔ اس کی پیروی سے انسان کا انجام کیا ہوگا، لہذا بعد ازیں آیت میں فرمایا گیا ہے اس کے لیے یہ بات کہہ دی گئی ہے کہ جو شخص بھی اس کی اطاعت اختیار کرے گا اور اس کی سرپرستی کا طوق اپنی گردن میں ڈالے گا۔ اسے وہ یقیناً گمراہ کر دے گا اور جلاؤ اسنے والی آگ کی طرف اس کی رہنمائی کرے گا (کتب علیہ انہ من تلوٰہ فانہ یصلہ ویہدیہ الی عذاب السعیر)۔

چند اہم نکات

۱۔ مجادلۃ ہر دو حوالے سے لفظ "مجادلۃ" عرف عام میں بے بنیاد اور غیر منطقی بحث و تمحیص کو کہتے ہیں۔ لیکن اصل لغت کے لحاظ سے اس کا یہ مفہوم نہیں ہے، بلکہ لغت کے اعتبار سے ہر قسم کی بحث و گفتگو کے معنی میں ہے۔ یہ بحث حق بھی ہو سکتی ہے ناطق بھی۔ لہذا قرآن پیغمبر اکرم کو حکم دیتا ہے۔

۲۔ "سعی" (بروزن سعی) کے مادہ سے آگ بھڑک اُٹھنے کے معنی میں ہے۔ یہاں مراد مجاہد کی بھڑکتی ہوئی آگ بھڑک سے زیادہ جلاسنے والی ہے۔

۳۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُجَادِلُ فِي اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَتَبِعَ كُلَّ شَيْطَانٍ مَّرِيدٍ

۴۔ كُتِبَ عَلَيْهِ أَنَّهُ مَنْ تَوَلَّاهُ فَأَنَّهُ يُضِلُّهُ وَيَهْدِيهِ إِلَى عَذَابٍ سَعِيرٍ

ترجمہ
۳۔ کچھ لوگ ایسے ہیں کہ جو بغیر کسی علم و دانش کے خدا کے بارے میں مجادلہ کرنے لگتے ہیں اور ہر سرکش شیطان کی پیروی کرتے ہیں۔

۴۔ اس کے لیے لکھا جا چکا ہے کہ جو شخص بھی اس کی ولایت و سرپرستی میں جاتا ہے وہ اسے یقیناً گمراہ کر دیتا ہے اور جلاؤ اسنے والی آگ کی طرف اس کی رہنمائی کرتا ہے

تفسیر

شیطان کے پیروکار

گذشتہ آیات میں بتایا گیا تھا کہ جس وقت قیامت کا زلزلہ آئے گا وحشت و اضطراب کے مارے لوگوں کی عموماً کیا ہوگی زیر بحث آیات میں جاہل لوگوں کے ایک گروہ کی حالت بیان کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ کس طرح وہ اپنے واسے ایسے عظیم حادثے سے غافل ہیں۔

ارشاد دہوتا ہے، کچھ لوگ ایسے ہیں کہ جو کبھی علم و دانش کے بغیر خدا کے بارے میں جھگڑنے لگتے ہیں۔ ۱۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُجَادِلُ فِي اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ

یہ لوگ کبھی توحید، حق تعالیٰ کی یگانگی اور ہر قسم کے شرک کی نفی کے بارے میں جھگڑنے لگتے ہیں۔ اور کبھی یہ لوگ مردوں کی حیات اور مرد و شر و شر کے لیے قدرت خدا کے بارے میں جھگڑنے لگتے ہیں، جبکہ ان کے پاس اپنی باتوں کے لیے کوئی دلیل نہیں ہوتی۔

و جاد لہم بالآتی ہی احسن

اپنے مخالفین کے ساتھ اس طریقے سے مجادلہ کرو (نخل ۱۲۵)

۲۔ باطل مجادلہ شیطانی طریقہ ہے

بعض بزرگ مفسرین کا نظریہ ہے۔ "یجادل فی اللہ بغیر غلظ" مشرکین کی بے بنیاد بحث و محارک کی طرف اشارہ ہے اور فوہی شیع کل شیع

موسید" ان غلط کاموں کی طرف اشارہ ہے۔

بعض دوسرے مفسرین کا خیال ہے کہ پہلا جملہ ان کے فاسد اور خرافاتی عقائد کی نشاندہی کرتا ہے اور دوسرا غلط اصرار غلط اور اخراجی کاموں کی۔

لیکن؟۔ قبل کی اور بعد کی آیات چونکہ بنیادی اعتقادات اور اصول و عقاید کے بارے میں ہیں۔ لہذا بعد نہیں کہ دور جملے ایک ہی حقیقت کی طرف اشارہ ہوں۔ دوسرے لفظوں میں طرین ایک ہی موضوع کا نفی و اثبات ہے۔ پہلے جملے میں کہا گیا ہے کہ وہ کسی علم و دانش کے بغیر صرف تقلید، تعصب اور ہوا پرستی کی بنا پر خدا اور اس کی قدرت کے بارے میں جھگڑنے لگتے ہیں، اور دوسرے جملے میں کہا گیا ہے کہ جو شخص علم و دانش کی اتباع نہیں کرتا، فطری اسرے کہ وہ ہر سرکش شیطان کی پیروی کرتا ہے۔

۳۔ ہر شیطان کی پیروی۔ کیوں؟

یہ بات قابل توجہ ہے کہ قرآن یہ نہیں کہتا کہ ایسا شخص شیطان کی پیروی کرتا ہے، بلکہ کہتا ہے کہ ہر سرکش شیطان کی پیروی کرتا ہے؟

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ تمام شیطانوں کا پروگرام اور مقصد ایک ہی ہے۔ البتہ ہر ایک نے ایک خاص راستہ اور

جائزہ منتخب کر رکھا ہے، ان کے جال طرح طرح کے اور قسم قسم کے ہیں۔ یہاں تک کہ انسان انہیں پہچاننے میں کھو کر رہ جاتا ہے سوائے ان لوگوں کے جو ایمان اور توکل علی اللہ کی وجہ سے حمایت الہی کے زیر سایہ آجاتے ہیں۔ جیسا کہ قرآن میں ہے:

الْأَعْيَادُ لَكَ مِنْهُمْ الْمُخْلِصِينَ (حجرات ۴۰)

اس آیت کا ذکر بھی ضروری ہے کہ ظلم و سرکشی کا ہونا اور غیر و برکت سے تہی ہونا لفظ "شیطان" کے مفہوم میں پوشیدہ ہے لیکن یہاں خصوصیت کے ساتھ لفظ "موسید" (یعنی۔ ہر قسم کے غیر وسادت سے تہی) کا استعمال تاکید کے طور پر ہے تاکہ اس کی پیروی کرنے والوں کا انجام بالکل واضح ہو جائے۔

۴۔ "کتب علیہ" کا مفہوم

ہم جانتے ہیں کہ یہ تعبیر مقرر کرنے اور لازمی طور پر واقع ہونے کے معنی میں ہے۔ چاہے

اس میں یہ توہم نہیں ہونا چاہیے کہ اس جملے میں جبر کا مفہوم پیدا ہوتا ہے اور یہ کہ شیطان مجبور ہیں کہ اپنے پیروکاروں کو گمراہ کریں اور دارالبوار کی طرف بھیجیں، بلکہ یہ اس طرز عمل کا نتیجہ ہے، جو انھوں نے برضا و رغبت اختیار کیا ہے۔ مثلاً سردار شیطان

ابلیس نے قرآن الہی کی مخالفت اور سرکشی اپنے ارادہ و اختیار سے کی، بلکہ اس نے تو خدا کی ذات پاک پر اعتراض بھی کیا، لہذا ایسے افراد سوائے اس کے کچھ نہیں ہیں کہ خود بھی گمراہ ہیں اور دوسرے کو گمراہ کرنے والے بھی ہیں۔ انسانوں اور جنوں میں سے موجود دوسرے

شیطانوں کی بھی یہی کیفیت ہے۔

یہ بالکل ایسی بات ہے کہ ہم کہیں کہ جو شخص منشیات کا عادی ہو جاتا ہے۔ بد بختی اور سیاہ انجام اس کی پیشانی پر لکھ دیا جاتا ہے ظاہر ہے یہ بات جبر کی دلیل تو نہیں ہے۔

لے معنی نے کہا ہے کہ علیہ کی ضمیر شیطان کی طرف دیتی ہے۔ جبکہ بعض نے کہا کہ یہ شیطان کے پیروکاروں کے بارے میں ہے کہ جن کا ذکر (ومن الناس من یجادل) میں کیا گیا ہے۔ لیکن ظاہری مفہوم یہ ہے کہ یہ اس ضمیر کا تعلق شیطان سے ہے خصوصاً جبکہ اس کے نزدیک کی ضمیر من تلوہ۔ کی ضمیر بھی شیطان کی طرف وٹدی ہے۔

۵۔ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَغَيْرِ مُّخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ وَتُقَرَّرِ الْاَرْحَامُ مَا نَشَاءُ اِلَىٰ اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْا اَشَدَّكُمْ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفَّىٰ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلَى الْاَرْضِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا وَتَرَى الْاَرْضَ هَامِدَةً فَاِذَا اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَاَنْبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍ بَهِيجٌ ۝۴

۶۔ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّهُ يُحْيِ الْمَوْتٰى وَاَنَّهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۵

۷۔ وَاِنَّ السَّاعَةَ اَتِيَةٌ لَا رَيْبَ فِيْهَا وَاِنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ ۝۶

ترجمہ

۵۔ اے لوگو! تمہیں قیامت کے آنے میں کوئی شک ہے (تو اس نکتے پر ذرا غور کر لو کہ ہم نے تمہیں مٹی سے، پھر نطفہ سے، پھر جے ہوئے خون سے، پھر مضغہ (گوشت کے ٹوٹھڑے) سے جو کبھی تو کسی شکل و صورت کا حامل ہوتا ہے اور کبھی نہیں پیدا کیا ہے تاکہ تم جان لو، کہ ہم ہر چیز پر قادر ہیں) پھر جنین کی صورت میں ایک مدت مقررہ تک رحم مادر میں رکھا

اور کبھی کسی کو ساقط کر دیا) اسکے بعد بچے کی صورت میں تمہیں پیدا کیا تاکہ بچپن اور بلوغت و کمال تک پہنچ سکو۔ اس دوران میں کئی ایک مرحلے جاتے ہیں اور دوسرے اس قدر عمر پاتے ہیں کہ بڑھاپے کے انتہائی بُرے مرحلے تک جا پہنچتے ہیں اور اپنی تمام تر معلومات اور تجربہ کھو بیٹھتے ہیں اور (دوسری طرف) تو دیکھے گا کہ زمین خشک اور مرده ہوتی ہے، ہم اس پر بارش برساتے ہیں تو اس میں زندگی پیدا ہو جاتی ہے اور نوع بہ نوع ہری بھری لہلہاتی کھیتیاں اگاتی ہے۔

۶۔ یہ اس لیے کہ تمہیں پتہ چل جائے کہ اللہ برحق ہے، مردوں کو زندہ کرتا ہے اور ہر چیز پر قادر ہے۔

۷۔ اور یہ کہ قیامت بہر حال آئے گی جس میں کسی قسم کا کوئی شک نہیں اور قبروں میں جتنے لوگ ہوں گے اللہ ان کو زندہ کرے گا

تفسیر

نباتات اور انسان کی پیدائش میں قیامت کے دلائل

گذشتہ آیات میں مہداء و معاد کے بارے میں منافقین کے شکوک و شبہات سے متعلق گفتگو کی جا رہی تھی۔ زیر بحث آیتوں میں جہانی معاد کو ثابت کرنے کے لیے دو بڑی مضبوط عقلی دلیلیں دی گئی ہیں۔ ایک دلیل جنین (اور شکم باز کے دور سے متعلق ہے۔ دوسری زمین کی حالت میں تبدیلی یعنی مٹی سے ہریالی اور پھر نباتات میں نمو و بالیدگی سے متعلق ہے) دراصل قرآن مجید کا منشا یہ ہے کہ قیامت کے وہ مناظر جن کا مشاہدہ عام طور پر انسان اس دنیا میں کرتا رہتا ہے۔ مگر اکثر و بیشتر ان کی طرف متوجہ نہیں ہوتا کھول کر پیش کرے تاکہ انسان خوب سمجھے کہ موت کے بعد نہ صرف یہ کہ زندگی ناممکن نہیں ہے بلکہ وہ زندگی اس قدر فطری ہے کہ اس کی کئی مثالیں ہر روز اس کے سامنے آتی رہتی ہیں۔

سب سے پہلے تمام انسانوں سے یوں خطاب کیا گیا ہے: اے لوگو! اگر تمہیں روز قیامت زندہ ہونے کے بارے میں شکوک و شبہات ہیں تو اس دنیوی زندگی پر ہی نظر ڈال لو کہ ہم نے تمہیں مٹی سے نطفہ بنایا۔ نطفہ سے جے ہوئے خون میں بدلا

بعد والی دو آیات میں پروردگار عالم مذکورہ بالا دو دلیلوں سے مجموعی نتیجہ اخذ کرتے ہوئے، پانچ نکات میں ان کا مقصد بیان کرتا ہے۔

۱۔ انسان اور نباتات کی زندگی کے مختلف مراحل کو اس لیے بیان کیا گیا تاکہ تم سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ ہے (ذالک بان اللہ هو الحق) چونکہ وہ خود حق ہے۔ لہذا اس کا پیدا کردہ نظام بھی برحق ہے اور قطعاً بے مقصد نہیں ہو سکتا، یہی نکتہ قرآن مجید میں ایک اور جگہ یوں بیان ہوا ہے۔

”وما خلقت السموات والارض وما بينهما باطلا ذالک ظن الذين كفروا“

ہم نے آسمان، زمین اور ان کے درمیان جو کچھ بھی ہے، اسے بے کار پیدا نہیں کیا یہ تو کفار کا وہم و گمان ہے۔ (ص ۲۷)

چونکہ یہ کائنات بے مقصد نہیں، دوسری طرف زندگی کا اصلی مقصد اس کائنات تک محدود نہیں۔ لہذا لازمی طور پر معاد اور قیامت کا وجود ہے۔

۲۔ اس عالم حیات و ممات پر حکمران نظام ہم پر یہ حقیقت آشکار کرتا ہے کہ: وہی ہے جو مردوں کو زندہ کرتا ہے۔ (واتہ یحیی الموتی) وہی ہے جو مٹی کے بدن کو زندگی کے لباس سے آراستہ کرتا ہے اور حقیر نطفہ کو انسان کامل کا شرف بخشتا ہے۔ مردہ زمینوں میں جان ڈالتا ہے۔ اس دنیا میں اس ذات کی طرف سے مسلسل حیات آفریں پروگرام مشاہدہ کرنے کے بعد بھی کیا قیامت کے بارے میں کبھی قسم کا شک و شبہ کیا جاسکتا ہے بلکہ

۳۔ پروردگار عالمین ہر چیز پر قادر ہے، کوئی کام بھی اس کے لیے ناممکن نہیں ہے (واتہ علی کل شیء قدیر)۔ کیا وہ ذات جو بے ہان مٹی کو نطفہ میں تبدیل کرتی ہے۔ پھر اس حقیر نطفہ کو مرحلہ وار نمودیتے ہوئے ہر روز ایک نئی زندگی دیتی ہے، خشک بجز اور جامہ زمین کو اس طرح ہر گز زندگی دیتی ہے کہ تھوڑی سی مدت میں سرسبز و شاداب کھیتیاں ہر

(پچھلے صفحہ کا مشیہ)

تفسیر فی ظلال کے مطابق موت و حیات کی درمیانی حالت کو ہامدہ کہا جاتا ہے: ”اھتوت“ تھوڑے کے اودہ سے شدت کے سہنی میں استعمال ہوتا ہے ”ربت“ ”ربو“ ”بروزن“ ”علو“ زیادتی انراش اور نمو کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے ربا (یعنی نمو) یہیں سے لیا گیا ہے۔

”بھیج“ غریب و تنگ اور پرکشش کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔

۴۔ (واتہ یحیی الموتی) یعنی مفسر نے اس جملے کو قیامت کے دن انسان کی زندگی کی طرف اشارہ سمجھا ہے۔ (واتہ اللہ یحیی من فی القبور) اس جملے کا معنی بھی کم و بیش یہی ہے۔ البتہ فرق یہ ہے کہ پہلا جملہ اصل حیات کی طرف اشارہ ہے اور دوسرا مردوں کے زندہ ہونے کی کیفیت کی طرف لیکن ایک اور تفسیر کے مطابق (واتہ یحیی الموتی) کا جملہ اس دنیا میں خدائی مسلسل حیات آفرینی کی طرف اشارہ ہے اور ہم نے بھی اسی تفسیر کو بنیاد بنایا ہے تاکہ قیامت کے بارے میں دلیل قائم کی جاسکے۔

بے ہونے خون سے چائے ہوئے گوشت میں دھلا جین میں سے بعض کئی شکل و صورت کے حامل ہوتے ہیں اور بعض نہیں۔ (یا ایہا الناس اختلف ریب من البعث فیا انما خلقتکم من تراب ثم من نطفة ثم من علقۃ ثم من مضغۃ مخلقة و غیر مخلقة)۔ یہ سب اس لیے ہے کہ تم پر کھل کر واضح ہو جائے کہ ہم ہر کام کرنے کی طاقت رکھتے ہیں: (النسب لکم) اور پھر ان جنین میں سے جن کو ہم چاہتے ہیں کہ وہ اپنی خلقت کی مدت مکمل کریں۔ ان کو ماؤں کے رحم میں ایک خاص مدت تک رکھتے ہیں۔ جب کہ وہ مردوں کو درمیانی مدت ہی میں ساقط کر دیتے ہیں (ونفرفی الارحام ما انشاء الی اجل مستحی) پھر ایک انقلابی دور کا آغاز ہوتا ہے اور ہم تمہیں بچے کی صورت میں پیدا کر دیتے ہیں لا ثم نخرجکم طفلاً ثم نریدکم من بعد انکم صغار اور انحصاری دور شکم مادر میں پورا ہوتا ہے۔ اس کے بعد تم ایک ایسے ماحول میں قوم رکھتے ہو جو پہلے کی نسبت کہیں زیادہ وسائل، مواقع اور روشنی رکھتا ہے یہاں تمہاری قیادت مکمل ہوگی دو دہائیوں میں ہو جاتی بلکہ سرعت کے ساتھ اس کو ہماری رکھتے ہو۔ ”مقصود یہ ہے کہ تم جہانی اور عقلی اعتبار سے کمال تک پہنچو۔ ثم لتبلغوا اشدد کھ ۱۲ منزل پر تمہاری نادانی، دانائی، کمزوری طاقت اور مقامی خود اختیاری میں بدل جاتی ہے۔ لیکن یہ کمال منزل آخر نہیں۔ بلکہ مزید مراحل بھی ہوتے ہیں۔ البتہ ان افراد انتقال کر جاتے ہیں اور بعض مذکورہ کمال کے بعد تنزل کی طرف بڑھنے لگتے ہیں۔ حتیٰ کہ دنیوی زندگی کے بدترین دور یعنی امتحانی بڑھاپے میں پہنچ جاتے ہیں۔ (ومنکم من یتوفی ومنکم من یرد الی ارضہم) اس مرحلے میں آدمی کی معلومات اور تجربات میں سے کچھ بھی اس کے دماغ میں نہیں رہتا، نیاں اور بھول چوک کے پردے اس کی عقل پر پڑ جاتے ہیں اور واقعی اس کی ایک بچے کی سی کیفیت ہو جاتی ہے (لکیلا یعلم من بعد علمہ شیئاً)

یہ کمزوری، ضعف اور بڑھاپہ اس بات کی دلیل ہے کہ آدمی ایک نئے انتقالی مرحلے کے نزدیک پہنچ چکا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے بچہ بالکل پکا جاتا ہے تو رشتہ سے اس کا رشتہ ٹوٹنے کا وقت یقینی ہوتا ہے۔

یہ عجیب و غریب تغیر و تبدل پروردگار عالمین کے بے پناہ اختیارات کا منہ بولتا ثبوت ہے اور اس حقیقت کو اجاگر کرتا ہے کہ مردوں کو زندہ کرنے کے سمیت اللہ تعالیٰ کے لیے ہر کام آسان کا ہے

دوسری دلیل رویدگی اور نباتات کی پیداوار سے متعلق بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ انسان سے یوں مخاطب ہے ”وہم فرائض میں زمین کو تو بجز اور ٹھیل دیکھتا ہے مگر جو بھی ہم اس پر حیات بخش بارش برساتے ہیں، بارش آ جاتی ہے، زمین میں حرکت، نمو اور بالیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ ہر طرف طرح طرح کے پودے اور گھاس لہلہاتے لگتے ہیں۔ (وتسری الارض ہامدۃ فاذا انزلنا علیہا السماء اھتزت و ربت و انتبت من کل زوج بھیج)۔

۵۔ مضغہ، ”مضغ“ سے مشتق ہے، جس کے معنی چبانے کے ہیں۔ یہ لفظ گوشت کی اس تھوڑی سی مقدار کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ جس کو انسان ایک ہی لقمہ میں چبا جائے۔

۶۔ ”ہامدہ“ بھی بھٹی آگ کو ”ہامدہ“ کہا جاتا ہے اور یہ لفظ زمین کے اس حصے کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے جس پر گھاس پھوس زرد، خشک اور مردہ ہو گئی ہو۔ (مفردات راعب)

(باقی آئندہ صفحہ پر)

طرف اہلبائی نظر آئیں، اس بات پر قادر نہیں ہو سکتی کہ موت کے بعد انسان کو پھر سے زندہ کرے؟
۴۔ یہ بھی سمجھ لو کہ اس جہان کے خانے اور دوسرے جہان کی ابتداء کے لیے ایک وقت مقرر ہے۔ جس میں کسی قسم کا نہیں کیا جاسکتا (وان الشاعۃ اثیۃ لای یفیدھا)
۵۔ یہ زندگی دنیا کا تمام کاروبار و اصل کسی نتیجے اور انجام کا مقدمہ ہے اور اس نتیجے کے دن اللہ سبحانہ ان سب کو پورے ہوں گے زندہ کرے گا۔ (وان اللہ یبعث من فی القبور)۔

مذکورہ بالا پانچ نتائج کہ جن میں سے بعض تمہید ہیں، بعض اہل مضمون بعض امکانی کیفیت لیے ہوئے۔ جبکہ بعض واقعہ دوسرے کی تکمیل کرتے ہوئے ایک نقطہ پر جاملتے ہیں۔ وہ یہ کہ قیامت یعنی مردوں کا شتر نشتر صرف یہ کہ امکان پذیر ہے بلکہ ہوگا۔ وہ لوگ جو حیات بعد موت میں شک کرتے ہیں وہ شب و روز اس دنیا میں نالت، حیوانات اور انسان کی زندگی اور موت کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرتے رہتے ہیں۔ اس کے بعد کوئی وجہ نہیں کہ وہ خدائی قدرت پر شک کریں۔ کیا انسان ابتداء میں مٹی سے نہیں بنا تو پھر تعجب کی کیا بات ہے کہ ایک دفعہ مرنے اور مٹی میں دفن ہونے کے بعد پھر اٹھایا جائے۔ کیا ہر سال ہماری آنکھوں کے سامنے مٹی سے تروتازہ کیتیاں نہیں نکلتیں تو پھر کون سے تعجب کی بات ہے کہ اگر کئی سالوں بعد مردہ انسان جاندار ہو کر مٹی سے اٹھ کھڑا ہو اگر دوسری زندگی کے بارے میں ان کو شک ہے تو ان کو خوب سمجھ لینا چاہیے کہ جو نظام آفرینش اس دنیا میں جاری و ساری ہے وہ اس بات کا غماز ہے کہ زندگی دنیا کا کوئی مقصد ہے، اگر نہیں تو یہ تمام کاروبار و دنیا بے ہودہ اور مبہم ہو کر رہ جاتا ہے کیونکہ یہ چند روزہ زندگی جو سیکیڑوں مشکلات، پریشانیوں اور تکالیف سے جملہ تعلق کسی قسم کی قدر و قیمت اور حیثیت نہیں رکھتی کہ اس حیرت انگیز کائنات کا وجود و نصب العین اور مقصد اصل قرار پائے۔ اس بنا پر ماننا پڑے گا کہ اس عالم کے بعد کوئی دوسرا جہان ضرور وجود رکھتا ہے۔ جو اس دنیا کے مقابلے میں کہیں وسیع و عریض دائمی اور ابدی ہے اور اس زندگی کی اصل منزل بننے کے لائق ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ انسانی زندگی سات مراحل پر مشتمل ہے
مذکورہ بالا آیتوں میں حقیقت قیامت کی تشریح کے ذیل میں ہر مکمل انسانی کے سات مراحل گوارائے گئے ہیں:

پہلا مرحلہ جب انسان محض مٹی ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے مٹی سے مراد وہ مٹی ہو، جس سے حضرت آدم بنا کے گئے تھے۔ یا لہان بھی ہے کہ اس مٹی سے قطع نظر ہر انسان مٹی سے بنا ہے۔ کیونکہ نطفے کے اجزاء انسانی خوراک سے بنتے ہیں اور خوراک مٹی کے اجزاء سے مرکب ہوتی ہے۔

البتہ اس میں شک نہیں کہ انسانی جسم کا ایک اہم حصہ پانی آکسیجن اور کاربن پر مشتمل ہوتا ہے کہ جو مٹی سے نہیں لیا گیا۔ لیکن بدن کے تمام بنیادی اعضاء جو نکل مٹی سے بنتے ہیں۔ لہذا یہ تعبیر سونی صریح ہے کہ انسان مٹی سے ہے۔

دوسرا مرحلہ نطفے کا ہے۔ بے حس بے جان پاؤں میں زندگی جانے والی مٹی نطفے میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ وہ نطفہ جس میں نہایت چھوٹے چھوٹے ذی روح اجزاء ہوتے ہیں جو صرف غریبہ ہی سے دیکھے جاسکتے ہیں۔ مرد کے نطفے کے اجزاء کو "اسپرم" اور عورت کے

کو "اول" کہتے ہیں۔ یہ جاندار اجزاء اس قدر چھوٹے ہوتے ہیں کہ ایک مرد کے نطفے میں شاید کئی لاکھ اسپرم موجود ہوں۔ زیادہ توجہ طلب بات یہ ہے کہ پیدائش کے بعد انسان آہستہ آہستہ اور تدریجاً نشو و نما پاتا ہے اور یہ نشو و نما زیادہ حرکت کے سبب سے ہوتی ہے۔ جبکہ رحم مادر میں نشو و نما تیز تبدیلیوں اور حرکت کے ساتھ کیفیت کے اعتبار سے ہوتی ہے۔

رحم مادر میں جنین کی کیفیت حیرت انگیز طریقے سے مسلسل بدلتی رہتی ہے۔ اس کی مثال ایسے ہے۔ جیسے ایک معمولی سی پن چند عرصے میں ایک ہوائی جہاز کی شکل اختیار کر جائے۔ موجودہ زمانے میں جنین پر بڑی تحقیق کی جا چکی ہے۔ ماہرین کو موقع ملا ہے کہ جنین کے مختلف مراحل کا مطالعہ کریں اور خدا کی عجیب و غریب قدرت سے لوگوں کو آگاہ کریں۔

تیسرا مرحلہ علقہ کا ہے۔ یہ نطفے کی تبدیل شدہ صورت ہے جب نطفہ شبوت کے دانے کی طرح ایک جے ہوئے خون کے محوے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اسے سائنسی اصطلاح میں "مورولا" کہا جاتا ہے۔ کچھ مدت کے بعد جنین کے چاروں طرف ایک غلاف سا پیدا ہو جاتا ہے۔ دراصل یہ جنین کے اطراف کی تقسیم کی ابتداء کا مرحلہ ہے اور اس کیفیت کو "لاستولا" کہتے ہیں۔ جو تھوڑے عرصے میں ہی ٹھکانا چلائے ہوئے گوشت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ بغیر اس کے کہ اعضاء کی کوئی شکل و صورت واضح ہو اچانک جنین کی پتلی سی کھال میں تبدیل واقع ہوتی ہے، اعضاء بدن ظاہر ہونا شروع ہوتے ہیں اور ہر عضو اپنے مخصوص کام کے لحاظ سے متشکل ہو جاتا ہے۔ بعض جنین جو اس تبدیلی سے خاصا صریح ہوئے اپنی سابقہ حالت ہی میں باقی رہ جائیں یا ناقص رہ جائیں وہ ساقط ہو کر فاج ہو جاتے ہیں ("تخلقة وغیر تخلقة") ہو سکتا ہے۔ یہ اشارہ مکمل خلقت و غیر مکمل خلقت کی طرف ایک اشارہ ہو۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ مذکورہ بالا چار مراحل کے ذکر کے بعد قرآن مجید "نسبین لکھ" کا جملہ ارشاد فرمایا ہے۔ گویا تصور ہی مدت میں یہ عجیب و غریب تبدیلیاں جو ایک معمولی سے قطرے کو مکمل انسان میں موعال دیتی ہیں۔ اس حقیقت کی واضح دلیل ہیں کہ خدا ہر چیز پر قادر ہے اس کے بعد جنین کے پانچویں، چھٹے اور ساتویں مراحل کا ذکر ہے جو ولادت کے بعد سے تعلق ہیں یعنی بچپن، جوانی اور بڑھاپا۔

یاد رہے کہ بچے کا ایک زندہ موجود کی صورت میں پیدا ہونا مذاہب خود ایک زبردست تغیر و تحریک ہے جو جنین ہی کے پہلے چار مراحل میں شمار ہوتا ہے، اسی طرح بچپن، بلوغ اور بڑھاپا بھی جنین ہی کے ارتقائی مراحل ہیں۔ مذکورہ بالا آیت مجیدہ میں "قیامت کو بعثت" یعنی اٹھانا یا زندہ کرنا سے تعبیر کرنا بھی جنین کے ارتقائی مراحل کی آخری کڑی ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ اس نکتے کی طرف بھی خاص توجہ کرنی چاہیے کہ جس زمانے میں قرآن مجید نازل ہوا اور اس مقدس کتاب نے جنین کے مراحل ایسی علمی دسائی گفتگو کی اس وقت نہ کوئی "جنین کھانا تھا اور نہ کوئی ایسا علم معرض وجود میں آیا تھا جو اس کی تفصیلات بیان کرے

سے قابل توجہ یہ بات ہے کہ "شعۃ غدر جبکہ طفلا" کے جملے میں لفظ "طفلا" مفرد استعمال کیا گیا ہے۔ حالانکہ ظاہراً اطفالاً چاہیے تھا۔ اس کی شاید وجہ یہ ہو کہ "طفل" معصومی معنی رکھتا ہے اور اس میں مفرد جمع یکساں ہوتے ہیں۔ یا یہ کہ مقصد جنین کے بارے میں ہے بچے بچوں کے بارے میں جو اس موقع پر چپے ہوئے ہوتے ہیں اور بعد میں انہیں خبر کرنا ہوتا ہے۔

لہذا اپنی جگہ پر یہ خود ایک مہجر سے کم نہیں اور اس حقیقت کا بین ثبوت بھی ہے کہ اس کتاب کا سرچشمہ وحی الہی ہے۔

۲۔ معاد جسمانی

قرآن مجید نے جہاں بھی انسان کی بازگشت کا ذکر کیا ہے۔ بے شک وہاں انسان کی روح اور جسم دونوں ہی مراد ہیں۔ جنہوں نے معاد کو صرف روحانی ہونے تک محدود سمجھا اور صرف ارواح کی بقا کے قائل ہیں۔ انھوں نے قرآنی آیتوں کا بغور مطالعہ نہیں کیا۔ حالانکہ بہت سی آیتیں مذکورہ بالا آیتوں کی طرح بڑی وضاحتوں کے ساتھ معاد جسمانی کو بیان کرتی ہیں۔ جنہیں کے ارتقائی مراحل اور مردہ زمینوں کی شادابی معاد روحانی سے کسی طرح بھی کوئی شبہت نہیں رکھتی۔ خصوصاً زیر بحث آیتوں کا آخری جز جو اس کا رد بارہستی کے انجام کو بیان کرتے ہوئے بڑی صراحت سے واضح کرتا ہے (وَأَنَّ اللَّهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُورِ) یعنی جو بھی قبروں میں ہوگا۔ اللہ سبحانہ اس کو اٹھائے گا، کیونکہ قبر تو جسم کی جگہ ہے۔ نہ کہ روح کا مسکن، اصولی طور پر مشرکین کی ساری حیرت اور تعجب بھی معاد جسمانی پر تھا۔ یعنی ان کے پتے یہ بات نہیں پڑتی تھی کہ مٹی میں غلط طوطا ہو جائے والا آدمی دوبارہ کیسے اٹھ کھڑا ہوگا۔ روح کی بقا کا مسئلہ نہ صرف یہ کہ کوئی تعجب انگیز بات نہیں بلکہ ان کو منظور بھی تھا (مورد فرمائیے)

۳۔ ارذل العمر

”ارذل“ ”رذل“ کے مادہ سے مشتق ہے۔ یعنی گھٹیا اور ناپسندیدہ چیز، ارذل العمر یعنی انسان کی عمر کا ناپسندیدہ زمانہ، جبکہ وہ بڑھاپے کی وجہ سے اپنے کمالات کو اس حد تک کھو بیٹھا ہے کہ بقول قرآن مجید، اپنی معلومات اور تجربات تک کو بھول جاتا ہے اور بالکل ایک ناخواندہ اور نامہ سچے کی مانند ہو جاتا ہے۔ بچوں کی طرح معمولی معمولی باتوں پر پریشان ہو جاتا ہے۔ پل میں خوش اور پل میں غم ہو جاتا ہے۔ صبر و تحمل کا دامن بالکل چھوڑ دیتا ہے۔ مختصر یہ کہ بچوں کی سی حرکتیں کرنے لگتا ہے۔ البتہ فرق یہ ہے کہ بچے سے اس بات کی توقع نہیں کی جاتی جو ایک بڑے آدمی سے کی جاتی ہے اور بچوں کے بارے میں امید کی جاتی ہے کہ وہ بڑے آدمی کی طرح عقل و تدبیر کے ساتھ ساتھ یہ حالات بدل جائیں گے۔ جبکہ بزرگ اس امید کے قائل نہیں ہوتے اور یہ کہ بچے کی یہ حالت کسی کمال کے زوال سے نہیں ہوتی جبکہ بزرگ اپنا تمام مال و متاع کمال کو کر اس حالت کو پہنچا ہے۔ ان جہات کے پیش نظر بزرگوں کی حالت بچوں کی نسبت زیادہ ناگوار اور افسوسناک ہے۔ بعض روایات ہیں ”ارذل العمر“ سے سو سال سے زیادہ عمر مراد لی گئی ہے۔

یہ عمومی صورت حال کی طرف اشارہ ہے، لیکن ہو سکتا ہے کوئی شخص سو سال سے پہلے ہی ایسی حالت کو پہنچ جائے اور کوئی سو سال کے بعد بھی نہ پہنچے، ہر لحاظ سے پاک و چنیدہ ہے، خصوصاً عظیم اور اجل علماء و فاضل جو عمر بھر تعلیم و ترویج علوم میں مصروف رہتے ہیں۔ ان میں بہت کم دیکھا گیا ہے کہ ان کی یہ کیفیت ہو۔ بہر حال عمر کے اس حصے میں خلا سے بچنا ناگفتی چاہیے۔

ضمنی طور پر عرض ہے کہ ان حقائق سے آگاہی ہمیں غرور اور تکبر سے نکالنے کے لیے کافی ہے کہ ہم پہلے کیا تھے۔ اب کیا ہیں اور آئندہ کیسے ہونے والے ہیں۔

- ۸۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُجَادِلُ فِي اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَلَا هُدًى وَلَا كِتَابٍ مُنِيرٍ
 ۹۔ ثَلَاثِي عَظْفِهِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ذَلِكُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَنَذِيقُهُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ عَذَابُ الْحَرِيقِ
 ۱۰۔ ذَلِكُمْ بِمَا قَدَّمَتْ يَدُكَ وَأَنَّ اللَّهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَالَمِينَ

ترجمہ

۸۔ اور کچھ لوگ بغیر کسی علم و دانش کے اور بغیر کسی ہدایت اور واضح کتاب کے خدا کے بارے میں جھگڑنے لگتے ہیں۔

۹۔ وہ تکبر اور (احکامات خدا سے) بے اعتنائی کر کے چاہتے ہیں، کہ لوگوں کو خدا کے راستے سے گمراہ کر دیں۔ دنیا میں ان کے لیے ذلت و رسوائی ہے اور قیامت میں ہم ان کو بھسم کر دینے والے عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔

۱۰۔ (اور ان میں سے ہر کسی سے کہیں گے) یہ سب کچھ خود تیرا ہی کیا دھرا ہے اور اللہ تو اپنے بندوں پر کبھی زیادتی نہیں کرتا۔

تفسیر

کج بگنی کرنے والوں کے بارے میں

ان آیتوں میں بھی ان لوگوں کی کج بگنی کا تذکرہ ہے جو مبداء و معاد سے متعلق بے سرو پا باتیں کرتے ہیں۔

پہلے بیان کیا جا رہا ہے، کہ لوگوں میں ایک گروہ ایسا ہے جو کسی قسم کے علم، ہدایت اور کتاب کے بغیر ہی خدا کے فضل سے نجات پانے لگا ہے (ومن الناس من يجادل في الله بغير علم ولا هدى ولا كتاب من قبله)۔ (ومن الناس من يجادل في الله بغير علم) کا جملہ پہلے کی چند آیتوں میں گزر چکا ہے۔ یہاں وہی تعبیر ہے جو وہاں تھی۔ جملے کا بخوار ظاہر کرتا ہے کہ وہاں اس جملے سے اور لوگ مراد تھے اور یہاں کوئی اور تفسیر المیزان اور کبیر میں مذکور بالا دو قول گروہوں میں یہ فرق بیان کیا گیا ہے، کہ پہلے کی آیتوں میں اس جملے سے گمراہ اور بے خبر عوام الناس ہیں جبکہ اس آیت میں خواص اور سربراہان (المفضل عن سبيل الله) کا جملہ ہے۔ کتاب کے اس گروہ کا کام دوسروں کو راہ راست سے ہٹکانا ہے یہی مذکورہ بالا فرق کا واضح قرینہ ہے۔ جیسے گذشتہ آیتوں میں (يتبع كل شئ مريده) کا جملہ جو شیطانوں کی پیروی کے بارے میں تھا، اس معنی کو زیادہ واضح کرتا ہے۔

اس بارے میں کہ ”علم“ ”ہدی“ اور کتاب منیر“ میں کیا فرق ہے، مفسرین کے درمیان اس میں بھی اختلاف ہے۔ ہماری نظر میں زیادہ صحیح یہ ہے کہ ”علم“ سے عقل استدلال کی طرف اشارہ ہے۔ ”ہدی“ سے اللہ سبحانہ کی طرف انبیاء، ائمہ اور صلحاء کی رہنمائی کی طرف اور ”کتاب منیر“ سے آسمانی کتابوں کی طرف اشارہ ہے۔ زیادہ آسان الفاظ میں یہ کیا ہو سکتا ہے کہ اس جملے میں کتاب، سنت اور دلیل عقلی تینوں مشہور دلائل اور ”اجماع“ (اس معنی میں کہ علماء کے مطابق دلیل اس سے مراد سنت ہی ہے) ساری اور شرعیہ اربعہ بیان کر دی گئی ہیں۔

بعض مفسرین کے مطابق ”ہدی“ سے مراد وہ معنوی رہنمائی ہے، جو انسان کو ذاتی اصلاح پر بہرہ گاری اور تہذیب نفس کے ذریعے حاصل ہوتی ہے (البتہ یہ مفہوم ہمارے مذکورہ بالا مفہوم کے ہم آہنگ ہے) دراصل علمی بحث و تحقیق اس صورت میں مفید و نتیجہ خیز ثابت ہو سکتی ہے۔ جب یہ کتاب، سنت اور دلائل عقلی پر مبنی ہو۔ اس کے بعد ان گمراہی کے رہبروں کی روگردانی کی ایک وجہ ایک مختصر مگر معنی خیز جملے میں بیان کی جا رہی ہے۔ وہ بحر اہل خدا کی باتوں اور واضح عقلی دلائل سے بے اعتنائی کرتے ہوئے چلتے ہیں کہ لوگوں کو راہ خدا سے ہٹالیں۔ (دشانی عطفہ لیصل عن سبيل الله)۔

”دشانی“ ”دشانی“ کے مادہ سے پلٹنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور عطف پہلو کے معنی میں۔ پہلو لپیٹنا کسی چیز پر پہلو جہی اور بے اعتنائی کا ایک لطیف کنایہ ہے۔

”لیصل“ کے مادہ سے ملتا ہوتا ہے۔ ایک تو یہ کہ یہ ان لوگوں کی پہلو جہی اور روگردانی کا مقصد ہو، یعنی وہ دوسروں کو گمراہ کرنے کی خاطر خدا کی آیتوں اور ہدایت سے بے اعتنائی کرتے ہیں اور انہیں کچھ نہیں سمجھتے، دوسرا یہ کہ ان کی پہلو جہی کا نتیجہ ہو۔ یعنی ان کی بے اعتنائی کا نتیجہ ہے کہ لوگوں کو راہ حق سے پھیر دیتے ہیں۔

اس کے بعد دنیا و آخرت میں ان کا انجام بیان کیا گیا ہے، کہ اس دنیا میں وقت رسوائی اور بے نصیبی ان کا مقدر ہے اور آخرت میں ہم انہیں جلا دینے والے عذاب کا مزہ چکھائیں گے (لله في الدنيا خزي ونديق يوم القيامة عذاب الحريق)۔

اور ان میں سے ہر ایک سے کہا جائے گا: یہ تیرا ہی کیا دھرا ہے، یہ وہ ہے جو تو نے اپنے ہاتھوں سے آگے بھیجا ہے (بما قدمت يدك) اور اللہ ہرگز اپنے بندوں پر ظلم نہیں کیا کرتا (وان الله ليس بظلام للعبيد)۔ بلا وجہ سزا دیتا ہے اور نہ ہی سزا میں بلا وجہ اضافہ کرتا ہے۔ اس کا کام تو صرف عدل و انصاف کرنا ہے۔ ملے۔ یہ آیت مجیدہ ان آیتوں میں سے ہے جو جبر کے قائل فرقے کے نظریات کی نفی کرتی ہے اور افعالِ خدا میں عدالت کو قرآنی و مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ کی دوسری جلد سورہ آل عمران آیت نمبر ۷۵ کے ذیل میں ملاحظہ فرمائیں،

ملے ظلام مبالغہ کا صیغہ ہے اور اس کا معنی ہے ”بہت زیادہ ظلم کرنے والا“ خدا نے تعالیٰ جو مطلقاً ظلم نہیں کرتا، اس لیے یہ لفظ کیوں استعمال کیا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ بلا وجہ سزا دینا یا سزا میں اضافہ کرنا خدا کے نزدیک ایسا ہی ہے۔ جیسے ہمیشہ کے لیے بہت زیادہ ظلم کیا جاتا۔

۱۱- وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُعْبُدُ اللَّهَ عَلَى حَرْفٍ فَإِنْ أَصَابَ خَيْرٌ اِظْمَأَنَّ بِهِ وَإِنْ أَصَابَتْهُ فِتْنَةٌ انْقَلَبَ عَلَى وَجْهِهِ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةَ ذَلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِينُ ۝

۱۲- يَدْعُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنْفَعُهُ ذَلِكَ هُوَ الضَّلَالُ الْبَعِيدُ ۝

۱۳- يَدْعُوا لِمَنْ ضَرُّهُ أَقْرَبُ مِنْ نَفْعِهِ لَيْسَ الْمَوْلَىٰ وَلَيْسَ الْعَشِيرُ ۝

۱۴- إِنَّ اللَّهَ يَدْخُلُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ إِنَّ اللَّهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيدُ ۝

ترجمہ

۱۱- بعض لوگ صرف زبانی کلامی اللہ کی پرستش کرتے ہیں (ان کا دلی ایمان بہت ہی کمزور ہے) یہی وجہ ہے کہ جب دنیوی منفعت حاصل کرتے ہیں تو مطمئن ہو جاتے ہیں۔ مگر جو نہی آزمائشی مصیبت آتی ہے۔ روگردانی کرتے ہوئے کفر کا رخ کرتے ہیں۔ اس طرح دنیا و آخرت کھو بیٹھتے ہیں

اور یہی کھلا ہوا گناہ ہے۔

وہ خدا کو چھوڑ کر اس کو پکارتے ہیں، جو کسی قسم کا نفع یا نقصان پہنچانے کی اہلیت نہیں رکھتا اور یہی گہری گمراہی ہے۔

وہ اس کو پکارتے ہیں جس کی طرف سے نفع کی نسبت نقصان کا کہیں زیادہ اندیشہ ہے۔ کیا ہی بُرا سرپرست اور کیسا بُرا ساتھی ہے۔

۱- جو ایمان لائے اور انہوں نے اعمال صالح کیے اللہ ان کو ایسے باغات میں لے جائے گا، جن کے درختوں تلے نہریں بہتی ہیں اور (بے شک) اللہ جس کام کا ارادہ کرتا ہے۔ اسے انجام دیتا ہے۔

تفسیر

کفر کے گڑھے کے کنارے کھڑے لوگ

گزشتہ آیتوں میں دو گروہوں کا تذکرہ ہو رہا تھا ایک گمراہ کرنے والے لیڈروں کا، دوسرا گمراہ ہونے والے پیروکاروں کا لیکن زیر بحث آیتوں میں ایک تیسرے گروہ کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ یہ لوگ کمزور ایمان والے ہیں۔

قرآن مجید اس گروہ کی تعریف یوں کر رہا ہے۔ بعض لوگ صرف زبان سے اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔ جبکہ ان کا دلی ایمان بالکل سطحی اور کمزور درجے کا ہے۔

(وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُعْبُدُ اللَّهَ عَلَى حَرْفٍ)۔ اعلیٰ حرف سے ہو سکتا ہے یہ مراد ہو کہ ان کا ایمان زبانی کلامی ہے اور دل میں صرف ایمان کی ایک سمولی سی جھلک پائی جاتی ہے۔ یا اس طرف اشارہ ہو سکتا ہے کہ وہ دائرہ ایمان کے مرکز پر نہیں بلکہ ایک طرف کنارے پر کھڑے ہیں۔ کیونکہ ”حرف“ کا ایک معنی کسی پہاڑی یا گھاٹی کا کنارہ بھی ہوتا ہے۔ یہ عام مشاہدہ ہے کہ جو کوئی کسی کنارے پر کھڑا ہو، مضبوط نہیں ہوگا۔ بلکہ سمولی سی حرکت سے لٹک جاتے گا۔ اور راستے سے ہٹ کر گر جائے گا۔ یہی حال کمزور ایمان والوں کا ہے کہ کسی سمولی سی چیز کے لیے ایمان برباد کر دیتے ہیں۔

ان کے ایمانی تزلزل کی تشریح قرآن مجید یوں بیان کرتا ہے کہ اگر دنیاوی منفعت میسر آجائے تو مطمئن اور پرسکون ہو جاتے ہیں اور اسے اسلام کی حقانیت کی دلیل سمجھتے ہیں۔ لیکن اگر کسی نقصان، کسی نعمت کے چھن جانے یا پریشانی کے ذریعے آزمائش آوے

استحسان میں مبتلا ہو جائیں تو شدید بے قراری اور اضطراب کا شکار ہو کر گرفتار اختیار کر لیتے ہیں۔

(افسان اصحابہ خیرین اطعمان بہ وان اصابتہ فتنۃ القلب علی وجهہ) گویا انہوں نے دین دایان کو مادی مفادات کے حصول کا ذریعہ سمجھ کر قبول کیا تھا کہ اگر ان کا مقصد پورا ہوتا تو دینی برحق در نہ باطل دے بنا۔

ابن عباس اور دوسرے متقدمین مفسرین نے اس آیت مجیدہ کی شان نزول اس طرح بیان فرمائی ہے کہ بعض اوقات بدولت کا گروہ بارگاہ رسالت میں حاضر ہوتا اور اس کی دلی مرادیں برآتیں۔ یعنی ان کے مویشی اچھے بچے دیتے ان کے اولاد زرمینہ ہوتی اور ان کی مال دروست میں اضافہ ہوتا تو وہ غرض ہو کر اسلام اور غیر اسلام کے حلقہ بگوش عقیدت ہو جاتے، لیکن اگر اس کے برعکس الہی ہاں روکیاں پیدا ہوتیں، کوئی فرد بیمار پڑ جاتا یا مال مویشی میں کوئی نقصان ہو جاتا تو شیطان دوسرے ان کے دلوں میں گھر کر لیتے اور کہتے کہ ان تمام مصیبتوں کا ذمہ دار یہ دین ہے، جیسے تم نے قبول کیا ہے۔ نتیجہً وہ اس دین سے پھر جاتے رہے۔

توجہ طلب محنت یہ ہے کہ قرآن مجید ان کے مادی مفادات کو "خیر" سے تعبیر کرتا ہے اور ان مفادات کے حاصل نہ ہونے کو فتنہ (آزمائش کا ذریعہ) سے "شر" سے نہیں، گویا کہ قرآن مجید یہ تصریح فرما رہا ہے کہ دنیاوی ناخوشگوار حادثات شر اور برائی نہیں ہیں۔ بلکہ آزمائش و امتحان کا ذریعہ ہیں۔

آیت مجیدہ کے آخر میں یہ فرمایا جا رہا ہے "اس طرح سے وہ دنیا و آخرت دونوں سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں" (اخسر النشیا والآخرۃ) یہی تو واضح گھانا اور نقصان ہے کہ دنیا و آخرت دونوں ہی برباد ہو جائیں۔ (ذالک هو الخسران المبین) حقیقت یہ ہے کہ مذکور بالا اقسام کے لوگ دین کو مادی مفادات کی عینک سے دیکھتے ہیں اور مادی مفادات کے حصول کو دین کی حقانیت کی دلیل خیال کرتے ہیں۔ ایسے لوگ، جو آج کل بھی باافراد موجود ہیں اور ہر زمانے میں رہے ہیں۔ دراصل ایمان کو شرک اور ربت پرستی سے آلودہ کر لیتے ہیں۔ البتہ ان کا ربت بیوی، مال مویشی یا دیگر مفادات ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کا ایمان مڑوکی جالے سے بھی زیادہ نازک ہوتا ہے۔

بعض مفسرین نے اس آیت مجیدہ سے منافقین مراد لیے ہیں۔ ہماری نظر میں اس آیت مجیدہ کے ذیل میں وہ منافقین جن کے دل میں ایمان بالکل نہ ہو، شمار نہیں کیے جاسکتے در نہ یہ مفہوم آیت مجیدہ کے ظاہری معنی کے خلاف ہو جائے گا۔ کیونکہ "یجب اللہ" اطعمان بہ" اور "انقلب علی وجهہ" کے الفاظ اس بات کی دلیل ہیں کہ جن لوگوں کا ذکر اس آیت میں ہو رہا ہے۔ ان کے دل میں کمزور ایمان ہے۔ چنانچہ اگر کمزور ایمان داسے منافقین مراد لیے جائیں تو کوئی ہرج نہیں ہے اس کے بعد اس گروہ کے آلودہ ایمان خصوصاً توحید و ایمان باللہ سے روگردانی کے بعد کی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے کہہ رہے ہیں "وہ خدا کو چھوڑ کر اس کو بچا رہے ہیں جو انھیں نہ نقص پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان۔"

۳ "انقلب علی وجهہ" اگر اس جملے میں "انقلب" سے باز گشت مراد لیں تو اس جملے کا یہ معنی ہو سکتا ہے کہ ایمان کی بالکل نفاک

۴ تفسیر خازمی ج ۲۳ ص ۱۱۱ اور تفسیر قرطبی ج ۶ ص ۲۴۰۹۔

(یدعوا من دون اللہ ما لا یضرہ وہا لا ینفعہ) اگر وہ واقعی مفادات مادی کے خواہاں اور نقصان سے پریشان ہیں اور ان کی نگاہ میں کسی دین کی حقانیت کا یہ معیار ہے تو پھر بتوں کی پرستش کی طرف کیوں مائل ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ ربت مذکورہ کو کچھ دے سکتے ہیں۔ اور کسی کا کچھ بگاڑ سکتے ہیں۔ کسی بھی صلاحیت سے عاری ربت انسان کی زندگی کو کسی طور پر متاثر نہیں کر سکتے۔

۵ ذالک هو الضلال البعید) ان کی گمراہی کا فاصلہ "راہ راست" سے اس قدر زیادہ ہو گیا ہے کہ دوبارہ ہدایت کی میریت کم ہو گئی ہے۔

اس کے بعد اس کی بدتر کیفیت بیان کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے "وہ اس کو پکارتے ہیں، جس سے فائدے کی نسبت نقصان کی امید زیادہ ہے (یدعوا لمن ضلہ اقرب من نفعہ) کیونکہ یہ مصنوعی معبود دنیا میں ان لوگوں کی فکری بیخ کو ربت ہست کر کے خرافات کی طرف لے جاتے ہیں اور آخرت میں جلائے دال آگ کا تحفہ دیتے ہیں۔ بلکہ سورۃ انبیاء کی آیت نسبتہ کے مصداق۔

"اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ حَصْبٌ جَہَنَّمُ اَتْتُمَّ لَهَا وَاَرَدْتُمْ دُونَ" بے شک تم اللہ کو چھوڑ کر ان کی عبادت کرتے ہو جو درخ کا ایندھن ہیں اور تم ہی اس میں جالنے والے ہو۔ آیت مجیدہ کے آخر میں ارشاد ہوتا ہے "کیا یہی بڑے سرپرست اور مونس ہیں" (لَیْسَ الْمَوْلىٰ وَلَیْسَ الْعَشیءُ)۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ گزشتہ آیت میں یہ کہا گیا ہے کہ ربت مذکورہ کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں اور نہ نفع۔ مگر بعد کی آیت میں یہ بیان ہوا ہے کہ ان کا نقصان نفع سے زیادہ قریب ہے تو کیا یہ دونوں آیتیں متضاد ہیں؟ اس کا جواب ہم روز مڑوکی گفتگو میں دے دیتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہم کسی چیز کو ہر قسم کے خواص سے عاری جانتے ہیں اور پھر اس کی اسی جہت کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے اس کو ضرر و نقصان کا منبع کہہ دیتے ہیں مثلاً ہم کہتے ہیں کہ نلال شخص سے راہ درم نہڑھاؤ کیونکہ وہ نہ دنیا میں تمھارے کام آسکتا ہے نہ آخرت میں اور پھر اس کی مذموم صفات کو اور بڑھا کر ظاہر کرنے کے لیے یوں کہتے ہیں۔ بلکہ وہ تمھاری بد بختی اور ذلت کا سبب ہے۔ مزید برآں یہ جو ان کی طرف کسی کو نقصان نہ پہنچانے کی نسبت دی گئی ہے اس سے ملوث ہے، کہ وہ اپنے مخالفین کو کچھ بگاڑنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ لیکن جس نقصان کا ذکر ہے وہ ایک فطری اور لازمی نقصان ہے۔ جو ان کی پوجا کرنے والوں کو ہوتا ہے۔

افضل تفضل کا معنی جیسا کہ "اقرب" اس کے بارے میں پہلے بھی عرض کیا گیا ہے کہ ضروری نہیں کہ جن دو چیزوں کے درمیان ہونے اور مقابلہ کیا جا رہا ہے۔ ان دونوں میں وہ چیز ہو۔ بلکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ زیادہ کمزور طرفہ زیر بحث صفت سے بالکل ہی عاری ہوتی ہے۔ مثلاً اگر ہم یہ کہیں کہ ترک گناہ پر چھوڑی دیر صبر تحمل کرنا دوزخ کی آگ سے بہتر ہے تو اس سے ہماری مراد ہرگز یہ نہیں ہوتی کہ دوزخ کی آگ میں کوئی اچھائی پائی جاتی ہے۔ جس کے مقابلے میں صبر کرنا زیادہ اچھا ہے۔ بلکہ یہاں یہ معنی ہے کہ دوزخ کی آگ ہر طرح کی اچھائی سے عاری ہے۔

اس آیت مجیدہ کی مندرجہ بالا تفسیر جناب شیخ طوسی نے "تبیان" اور جناب طبری نے "معجم البیان" میں بیان فرمائی ہے۔ البتہ بعض مفسرین مثلاً جناب فخر الدین نے اس آیت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ زیر بحث دونوں آیتوں میں الگ الگ مکتبے لیے گئے ہیں۔ پہلی آیت میں پتھر، گولی اور دیگر جادات کے بے جان اور بے حس تبول کا ذکر ہے اور دوسری آیت میں انسان طاغوتی تبول کا ذکر ہے ازل الذکر مکتبہ کی قسم کہ نقصان یا فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔ جب کہ موصوف الذکر "امر ضال" ہونے کے ناتے سے تو پہنچا سکتے ہیں۔ مگر فائدہ نہیں اور اگر بالفرض کوئی حیوانی موٹی خون ان میں ہو بھی تو نقصان کے مقابل میں اس کی کوئی حیثیت نہیں انہوں نے اپنے خیال کے ثبوت کے طور پر (لبس المولیٰ ولبس العسیر) کا جملہ پیش کیا ہے۔ لہذا کوئی نقصان باقی نہیں رہتا بلکہ

قرآن مجید کا اسلوب بیان یہ ہے کہ اچھے اور بُرے کا موازنہ پیش کیا جاتا ہے تاکہ نتیجہ نکالنے میں کوئی دشواری نہ ہو۔ لہذا زیر بحث آخری آیت میں ارشاد ہوا ہے۔ "وہ لوگ جو ایمان لائے، جنہوں نے نیک کام کیے۔ اللہ ان کو ایسے باغات سے نوازتا ہے، جن کے تے نہریں بہتی ہیں۔ (ان اللہ یدخل الذین امنوا و عملوا الصالحات جنات تجری من تحتھا الانهار) ان کا طرز عمل نہایت واضح، ان کے نظریات و افکار اور عملی خطوط متعین ہیں۔ ان کا سر پرست خود اللہ ہے اور ان کے مہدم و مونس انبیاء و شہداء صالحین اور فرشتے ہیں۔ بے شک اللہ جس چیز کا ارادہ کرتا ہے انجام دیتا ہے۔ (ان اللہ یفعل ما یرید) اتنی اعلیٰ اور بڑھیا ہزار اور بلکہ دنیا اس کے لیے اتنا ہی آسان ہے۔ جتنا صندی اور ہٹ دھرم مشرکین اور ان کے گمراہ سربراہوں کو عبرتناک سزا میں دیتا۔

مندرجہ بالا موازنے میں وہ لوگ جو صرف زبانی کلامی ایمان لاتے ہیں۔ دراصل دین کے ایک کنارے پر کھڑے ہیں اور مومنوں کے دہم اور دوسے روگرداں ہو جاتے ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ ان کا کوئی نیک عمل بھی نہیں۔ لیکن صالحین اور مومنین دائرہ اسلام کے مرکز میں واقع ہیں اور گولی سے گولی آزمائش بھی ان کو مسترزل نہیں کر سکتی۔ ان کے ایمانی درخت کی مضبوط جڑیں ہیں اور ان کے اعمال صالح اس کے بیٹے پھول کی طرح شاخوں پر عیاں ہیں۔ زیر بحث آیتوں کے مفہوم کا ایک رخ یہ ہے اور دوسرا یہ کہ گمراہ گردہ کے مہمکے قسم کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے، بلکہ ہلکے مہر رساں ہیں۔ جبکہ مومنین کا سر پرست صاحب قدرت ہے اور ان کے لیے طرح طرح کا دور قسم قسم کی نعمتیں مہیا کرتا ہے۔

۱۰ البتہ "المیزان" کے ناظم مؤلف نے "ید عوائس" سے نقل مراد لیا ہے۔ جو آیت کے ظاہری معنی سے عجیب ہے

۱۵- مَنْ كَانَ يَظُنُّ أَنْ لَنْ يَنْصُرَهُ اللَّهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ إِلَى السَّمَاءِ ثُمَّ لِيَقْطَعْ فَلْيَنْظُرْ هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدَهُ مَا يَغِيظُ ۝

۱۶- وَكَذَلِكَ أَنْزَلْنَاهُ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ وَأَنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يُرِيدُ ۝

۱۷- إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالصَّابِقِينَ وَالنَّصَارَى وَالْمَجُوسَ وَالَّذِينَ أَشْرَكُوا إِنَّ اللَّهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ إِنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ۝

ترجمہ

۱۵۔ جس شخص کو یہ گمان ہے کہ اللہ دنیا و آخرت میں اپنے پیغمبر کی مدد نہیں کرے گا (وہ اسی وجہ سے تیج و تاب کھا رہا ہے، پس جو کر سکتا ہے کرے) وہ اپنے گھر کی چھت سے رسی باندھ کر اس سے لٹک جائے اور خودکشی کرے (اور موت کے گڑھے تک جا پہنچے) اور دیکھ لے کہ آیا یہ کام اس کے غیظ و غضب کو ٹھنڈا کر سکتا ہے؟

۱۶۔ اسی طرح ہم نے قرآن کو واضح آیتوں کی صورت میں اتارا ہے اور اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے۔

۱۷۔ صاحبانِ ایمان اور یہودیوں، صابئین، عیسائیوں، مجوسیوں اور مشرکوں کے درمیان

اللہ روز قیامت فیصلہ چکا دے گا، حق کو باطل سے جدا کر کے دکھائے گا، اللہ ہر چیز پر گواہ ہے (اور ہر چیز سے آگاہ ہے)

شان نزول

مندرجہ بالا آیات میں سے پہلی آیت کی شان نزول بعض مفسرین نے یوں بیان کی ہے: "نبی اسد" اور نبی غطفان کہ جن کے ساتھ رسول اللہ کا ایک معاہدہ تھا۔ ان کے کچھ لوگ آپ کے پاس آئے اور کہا کہ میں ڈر ہے کہ کہیں خدا، محمد کی مدد بندہ کر دے۔ اس صورت میں ہم اپنے حلیف یہودیوں سے کٹ جائیں گے۔ اور ان سے کھانے پینے کی اشیاء نہیں لے سکیں گے۔ چنانچہ یہ آیت نازل ہوئی اور ان کو تنبیہ کی گئی اور ان کی شدید مذمت کی گئی۔

بعض دوسرے مفسرین نے شان نزول کے ضمن میں یہ کہا ہے کہ مسلمانوں کا گروہ جو کفار پر شریعت غضب کی بنا پر کسی اقدام کے لیے جے قرار دے رہے تھے۔ یہ کہتا تھا کہ پیغمبر اکرم کی مدد کے سلسلے میں اللہ کا وعدہ کیوں پورا نہیں ہو رہا؟ چنانچہ یہ آیت نازل ہوئی اور ان کی جلد بازی پر ان کی سرزنش کی گئی۔

تفسیر

قیامت — تمام اختلافات کے خاتمے کا دن

گذشتہ آیتوں میں کمزور ایمان والے لوگوں کے بارے میں بات ہو رہی تھی۔ زیر بحث آیتوں میں بھی ایک اور رخ ہے انہی کے بارے میں فرمایا جا رہا ہے۔ جو شخص اس دہم میں مبتلا ہے کہ اللہ دنیا و آخرت میں اپنے پیغمبر کی مدد نہیں کرے گا اور غیظ و غضب میں بیچ و تاب کھا رہا ہے۔ اس سے جو بن پڑے کر گزرے چاہے اپنے گھر کی چھت سے رسہ باندھ کر اس سے لٹک جائے۔ اپنی زندگی کا خاتمہ کرے اور موت کی وادی میں جا پہنچے اور دیکھ لے، کیا اس طرح اس کا کچھ ٹھنڈا ہوتا ہے۔ من کان بظن ان لن ينصره الله في الدنيا والاخرة فليمدد يسمي الى السماء فليقطع فلينظر هل يذنب كيد مـ يفيظ ۱۱ اس تفسیر کو عظیم مفسرین نے ایک قابل توجہ احتمال کے طور پر پیش کیا ہے۔

اس تفسیر کے مطابق "لن ينصره الله" کی ضمیر پیغمبر اکرم کی طرف بٹھتی ہے۔ اور "سماء" سے مراد گھر کی چھت ہے؟

۱۔ ابو الفتوح رازی اور فخر الدین رازی کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں۔

۲۔ تفسیر مجمع البیان، تبسیلک، فخر الدین رازی، ابو الفتوح، صافی، قرطبی اور المیزان ملاحظہ فرمائیں۔

۱۔ "سما" کا لفظ ہر اس چیز کے لیے استعمال ہوتا ہے جو اوپر کی طرف ہو "ليقطع" دم کھنکھانے، سانس بند ہونے اور موت کی حالت تک پہنچ جانے کے معنی میں ہے۔ اس کے علاوہ کئی اور احتمالات بھی ہیں۔ لیکن ان سب کا ذکر ضروری نہیں۔ صرف دو قابل ملاحظہ ہیں۔

۱۔ (سماء) سے مراد آسمان ہے۔ وہ لوگ جن کا یہ خیال ہے کہ اللہ اپنے پیغمبر کی مدد نہیں کرے گا۔ وہ آسمان کی طرف جائیں۔ یعنی آسمان پر چڑھ جائیں۔ اس میں ایک سی لکھائیں اور اس کا پھندا بنا کر زمین و آسمان کے درمیان پھانسی پائیں تاکہ ان کا دم گھٹ جائے دیا لٹک کر خودی کو کاٹ لیں تاکہ وہ صراط زمین پر آریں، پھر دیکھیں ان کو کچھ سکون میسر آتا ہے؟

۲۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ مذکورہ ضمیر پیغمبر اکرم کی بجائے خود ان اشخاص کی طرف بٹھتی ہے۔ یعنی ان کی طرف جو اس بدگمانی کا شکار ہیں اس طرح زیر بحث آیت کا معنی یہ ہو گا کہ "وہ افراد جن کا یہ خیال ہے کہ خدا ان کی مدد نہیں کرتا اور ان کے ایمان کی وجہ سے ان کی رنج بند ہو جاتی ہے۔ جو کچھ ان سے ہو سکتا ہے کر لیں۔ آسمان کی طرف پھلے آئیں اور اپنے آپ کو ایک رسی سے لٹکائیں پھر اسی رسی کو کاٹ کر گریں تو کیا یوں ان کا غصہ ٹھنڈا ہو گا؟" قابل توجہ بات یہ ہے کہ تمام مفسرین نے کم حوصلہ، زور رنج اور کمزور ایمان والے اشخاص کے بارے میں نفسیاتی لحاظ سے روشنی ڈالی ہے کہ جس وقت ان کی حالت اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ ان کو آگے راہ نہ ملے تو وہ گھبرا کر ہزنی حرکتیں کرنے لگتے ہیں۔ کبھی دیواروں پر کھٹکے برساتے ہیں، تو کبھی یہ چاہتے ہیں کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائیں، آخر کار اپنے قہر و غضب کو ختم کرنے کے لیے خود کشی پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ جبکہ ان میں سے کوئی بھی حرکت ان کی مشکل حل نہیں ہو سکتی۔ اس کے برعکس اگر وہ صبر و تحمل سے کام لیں۔ اللہ پر عبور رکھیں، خود اعتمادی پیدا کریں اور مسائل کا مقابلہ استقامت سے کریں تو مسائل کا حل یقیناً ممکن ہے اس کے بعد کی آیت گزشتہ تمام آیتوں کا مفہوم سمیٹتے ہوئے بیان کرتی ہے، اس طرح ہم نے قرآن کو مکمل نشانوں کی صورت میں نازل کیا ہے (و كذلك انزلناه آيات بينات) ، اور اوستا قیامت کے وجود کے ضمن میں دلائل دیتے ہوئے۔ انسان کا جتنی درد نانات کی نوا، بالیدگی اور مروت زمین کی سرسبز و شادابی کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ بتوں کی نااہلی کے دلائل ہیں اور آخر میں ان لوگوں کے بارے میں بیان ہے، جو دین کو مادی مفادات کے حصول کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اس کے بعد آیت آخر میں بیان کرتی ہے کہ اس سب کچھ کے باوجود صرف واضح اور مکمل نشانیاں ہی کافی نہیں ہیں۔ بلکہ قبول حق کے لیے ذہنی آمادگی کی بھی ضرورت ہے۔

"اور اللہ جیسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے (وان الله يهدي من يريد)

ہم نے اکثر کہا ہے کہ اللہ کا ارادہ اور خواہش بغیر کسی وجہ کے نہیں ہوا کرتی۔ وہ عظیم و عہد ہے اور اس کے تمام اقدامات کسی خاص قانون کے تحت ہوتے ہیں۔ جو شخص اس کی راہ میں جہاد کے لیے اٹھ کھڑا ہو اور دل سے ہدایت کا خواہاں ہو تو وہ اس کی واضح راہنمائی کرتا ہے۔

زیر بحث آخری آیت چوتھ مختلف مذاہب کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ جن میں ایک مسلمان اور مومن ہیں، صاحبان ایمان اور یہودیوں

۱۔ "ان الله يهدي من يريد" اس جملے کے بارے میں مشہور یہی ہے کہ اس میں مبتداء محذوف ہے اور دراصل یہ جملہ یوں ہے۔

"الامران الله يهدي من يريد" (الف پر زور اور زیر و نون) کے معنی میں جو اور درمیان میں کوئی لفظ محذوف نہ ہو۔

صائبوں، عیسائیوں، مجوسیوں اور مشرکوں کے درمیان، قیامت کے دن، اللہ فیصلہ فرمائے گا اور حق کو باطل سے الگ کر کے دکھائے گا۔
(إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالصَّابِئِينَ وَالْمَجُوسَ وَالَّذِينَ أَضْرَكُوا إِنَّ اللَّهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ)۔

قیامت کے جتنے نام آئے ہیں ان میں "یوم الفصل" یعنی حق کو باطل سے الگ کرنے کا دن "یوم البروز" ہے جو نئے حقائق سے آشکار ہو جانے کا دن اور اختلافات مکمل طور پر ختم ہو جانے کا دن بھی ہیں۔ ضرور بالضرور اس دن اللہ تمام اختلافات کو مٹا دے گا۔ کیونکہ وہ ہر چیز کا جاننے والا ہے (إِنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ)۔

چند اہم نکات

۱- آیتوں کا ایک دوسرے سے تعلق اس آیت مجیدہ کا تعلق پچھلی آیت سے اس طرح ہے کہ پچھلی آیت میں ہدایت چاہنے والوں کی ہدایت، کا ذکر تھا، چونکہ ہر دل ہدایت پسند نہیں ہوا کرتا اور تعصب بہت دھرمی اور اندھی تقلید ہدایت حاصل کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹیں ہیں۔ لہذا فرمایا گیا ہے کہ یہ دھرمی بندیاں اور اختلافات قیامت تک باقی رہیں گے صرف اس دن تمام پیچھے ہوئے حقائق واضح ہوں گے اور اختلافات ختم ہو جائیں گے۔ علاوہ بریں پہلی آیتوں میں تین قسم کے لوگوں کے بارے میں بات ہو رہی تھی۔ ایک وہ جو بلا کی دلیل و ثبوت کے خدا اور قیامت پر بحث کرتے ہیں۔ دوسرے وہ جو دوسروں کو گمراہ کرتے ہیں اور تیسرے کمزور ایمان والے جو ہوا کے رخ پر اڑنے والے ہیں۔ کبھی ادھر کبھی ادھر ہو جاتے ہیں اس آیت میں صاحبان ایمان کے مقابلے میں آنے والے گردہوں میں سے بعض نمونے کے طور پر بیان کئے گئے ہیں اس سے قطع نظر گذشتہ آیتوں میں قیامت کے اغراض و مقاصد کے بارے میں گفت گو تھی۔ جبکہ یہ آیت کہتی ہے کہ قیامت کا ایک مقصد اختلافات کو مکمل ختم کر کے یکجا نعت کو معرض وجود میں لانا ہے۔

۲- مجوسی کون ہیں؟ سارے قرآن مجید میں صرف اس آیت میں لفظ "مجوس" آیا ہے۔ اس لحاظ سے کہ مجوسیوں کو مشرکین کے مقابلے میں آسمانی ادیان کے پیروؤں کی صف میں شامل کیا گیا ہے۔ قرن قیاس ہے کہ مجوسی بھی کسی نبی کی امت اور کسی دین کے پیرو تھے۔ البتہ آج کل زرتشت کی تاریخیں جو یوں لگتی دکھائی دیتی ہیں اور وہ یوں نے زرتشت کو حضرت عیسیٰ کے گیارہ یا چار سات صدیاں پہلے لکھا ہے (السلام القرآن ص ۷۵) اس حیران کن اختلاف سے صاف ظاہر ہے کہ زرتشت کی تاریخیں کس قدر ہمیشہ سے کہ زرتشت "اوستا" نامی کتاب رکھتا تھا۔ جو ایران پر سکندر اعظم کے قبضے کے وقت نابود ہوئی اور ساسانی بادشاہوں کے زمانے میں دوبارہ ملکی گئی۔ زرتشتیوں کے نظریات کے بارے میں بھی خاص معلومات نہیں ملتی البتہ ان کا دو مبداء (غیر دشر یا نور و ظلمت) کا عقیدہ مشہور ہے، بھلائی اور نور کے خدا کو "ہوزا مزدا" اور برائی اور ظلمت کے خدا کو "اھرمن" کہتے ہیں۔ ہوا، پانی، زمینی اور آگ چار عناصر کا احرام کرتے ہیں۔ آگ سے خاص لگاؤ رکھتے ہیں۔ جہاں بھی ہوں، چھوٹا موٹا آتشداں ضرور بناتے ہیں۔ اس لیے ان کو آتش پرست

بھی کہتے ہیں

بعض لفظ "مجوس" کو جو اس مذہب کے علماء اور پیشواؤں کے لیے بولا جاتا ہے "من شے شتق سمیتے ہیں اور لفظ "مژد" جو آج کل ان کے علماء کے لیے مستعمل ہے۔ دراصل "مژد" سے ہی ہے۔ اسلامی روایات میں انہیں کسی نبی کی امت قرار دیا گیا ہے۔ بعض یہ لوگ جہلک کر شرک آمیز نظریات اپنا بیٹھے ایک روایت ہے کہ مژد کے بعض مشرکین نے رسول اللہ سے عرض کیا کہ جزیہ لیکر انہیں بت پرستی کی اجازت دے دیں۔ آپ نے فرمایا میں اہل کتاب کے علاوہ کسی سے جزیہ نہیں لیتا، انہوں نے اعتراض کیا کہ آپ تو "مجر" کے ہاسی مجوسیوں سے جزیہ لیتے ہیں۔ تب آپ نے فرمایا

"إِنَّ الْمَجُوسَ كَانَ لِهِمْ نَبِيٌّ فَقَتَلُوهُ وَكَتَابَ احِرْقُوهُ"

مجوسی ایک نبی کی امت تھے جسے انہوں نے قتل کر دیا اور ایک کتاب رکھتے تھے جسے انہوں نے جلا ڈالا۔

"اصبح بن نباتہ" سے ایک اور روایت ہے کہ حضرت امیر نے ایک دفعہ برسر منبر فرمایا۔

"سلونی قبل ان تفقدونی"

"اپنے درمیان مجھے نہ پانے سے پہلے پہلے مجھ سے جو چاہو چھو لو"

مشہور زمانہ متافضی اشتیاق میں تیس کھڑا ہوا اور چھوٹا۔

یا امیر المؤمنین! مجوسیوں سے جزیہ کی طرح لیا جاسکتا ہے، جبکہ نہ وہ کسی نبی کی امت ہیں، نہ کسی کتاب کے پیرو؟ آپ نے فرمایا

قد انزل الله اليهم كتابا وبعث اليهم نبيا۔

"اللہ نے ان پر ایک کتاب نازل کی تھی اور ایک نبی ان کی طرف بھیجا تھا، اے

امام جہاد، علی بن حسین علیہما السلام نے پیغمبر اکرم سے روایت کی ہے کہ آپ کے فرمایا

"سنوا بهم سنة اهل الكتاب، یعنی المجوس۔"

"مجوسیوں سے اہل کتاب کا سا برتاؤ کیا کرو۔"

یاد رہے کہ مجوسی کی جمع "مجوس" ہے۔

۳- صابئین کون ہیں؟ مذکورہ بالا آیت سے اجمال طور پر معلوم ہوتا ہے کہ صابئین بھی کسی آسمانی دین کے پیرو تھے خصوصاً جب کہ ان کا ذکر یہود و نصاریٰ کے درمیان کیا گیا ہے۔ بعض مفسرین انہیں حضرت یحییٰ بن کریمؑ جنہیں عیسائی یحییٰ قنیدصندہ کہتے ہیں کے پیرو سمجھتے ہیں۔ دوسرے مفسرین کے مطابق صابئین وہ لوگ ہیں جنہوں نے یہودیوں اور عیسائیوں کے نظریات کو منسوخ کر کے ایک نیا مذہب بنا لیا ہے۔ لہذا یہ لوگ دونوں کے درمیان واسطہ سمجھے جاتے ہیں۔

"صابئین بہتے پانی نے خاص عقیدت رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی زیادہ تر آبادیاں بڑے بڑے دریاؤں کے کنارے

واقع ہیں۔ بعض مفسرین نے ان پرستارہ پرست ہونے کا الزام بھی لگایا ہے۔ اگرچہ مذکورہ بالا آیت مجیدہ اس پر دلالت نہیں کرتی۔ کیونکہ ان کا ذکر مشرکین کی صف میں نہیں کیا گیا (مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ کی پہلی جلد سورہ لقہر کی آیت نمبر ۲۲ کی تشریح سے رجوع کیجیے۔)

۴۔ توحید سے انحراف کرنے والے گروہوں کی ترتیب
مذکورہ بالا آیت میں تحریر شدہ پانچ مذاہب کا ذکر کیا گیا ہے ان کی ترتیب غالباً توحید سے درجہ انحراف کے مطابق ہے۔ مسلمانوں کے بعد سب سے پہلے یہودیوں کا ذکر کیا گیا ہے، کیونکہ توحید سے ان کا انحراف کچھ کم دیکھے کا ہے۔ اس کے بعد صابین کا ذکر ہے جو عقاید کے اعتبار سے یہودیوں اور نصاریٰ کے درمیان ہیں اس لیے دوسرے نمبر پر ہیں تیسرے نمبر پر تثلیث کے قائل نصاریٰ کا ذکر ہے، ان کے بعد سارے عالم کو غیر دشر کے دھتوں میں تقسیم کرنے والے اور ہر شے کے لیے دو مبارکے قائل مجوسی ہیں۔ آخر میں بت پرست اور مشرکین جو توحید کے بالکل عکس ہیں کا ذکر کیا گیا ہے۔

۱۸۔ اَلْمُتَرَانِ اللّٰهُ يَسْجُدْ لَهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُومُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَابُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ وَكَثِيْرٌ حَقٌّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ وَمَنْ يُهِنِ اللّٰهُ فَعَمَالُهُ مِنْ مُّكْرِمٍ ۚ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ۝

ترجمہ

۱۸۔ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ آسمان و زمین میں رہنے والے سب ہی اللہ کیلئے سجدہ کرتے ہیں، اسی طرح سورج، چاند، ستارے، پہاڑ، درخت، چلنے والے جاندار اور بہت سے انسان اسی کے لیے سر بسجود ہیں، جب کہ بہت سے لوگ انکار کرتے ہیں اور ان کے لیے عذاب کا فرمان حتمی ہے اور جس کو اللہ رسوا کرے اسے کون باعزت بنا سکتا ہے۔ بے شک اللہ جس کام کو چاہتا ہے اور (صحیح سمجھتا ہے) انجام دیتا ہے۔

تفسیر

عالم کی تمام موجودات اس کی بارگاہ میں سر بسجود ہیں

گورنمنٹ آف ایشیا، بمبارہ و معاد کے بارے میں تھیں۔ زیر بحث آیت اسی مضمون کی تکمیل کرتے ہوئے مسئلہ توحید اور خدا شناسی کو پیش کر رہی ہے۔ پیغمبر اکرم کو مخاطب کر کے کہا جا رہا ہے:- کیا تو نہیں دیکھا کہ آسمانوں پر رہنے والے اور وہ جو زمین پر ہیں۔ سب اللہ کی بارگاہ میں سر بسجود ہیں۔ اور سورج چاند ستارے پہاڑ، درخت اور چلنے پھرنے والے

بالتور ہی (السموات من في السموات ومن في الارض والشمس والقمر والنجوم والجلال والشجر والذواب)۔

اور بہت سے لوگ بھی سجدہ کرتے ہیں۔ جبکہ دوسرے بہت سے انکار کرتے ہیں اور ستویں عذاب مٹھرتے ہیں۔ ۳۔
کثیر من الناس وکثیر حق علیہ العذاب اس کے بعد کہا جا رہا ہے۔

تیر لوگ خدا کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتے اور جو خدا کے حضور بے وقت ہو، اس کی کوئی توفیق نہیں کرتا اور وہ سعادۃ و ثواب سے بہرور نہیں ہوتا (ومن یمن الله فعالمه من مکبرہ)۔ تب تک خدا جس کام کو قرین مسلت سمجھتا ہے انجام دیتا ہے۔ صاحبان ایمان کو عزت و احترام اور منکرین کو ذلیل و خوار کرتا ہے (ان الله یفعل ما یشاء)

چند نکات

۱۔ یہ سب چیزیں سجدہ کس طرح کرتی ہیں؟ قرآن مجید کی مختلف آیتوں میں تمام موجودات کے سجدہ کرنے، تسبیح و تہلیل کرنے، مذکورہ بالا چار عبادتیں صرف انسان ہی سے مخصوص نہیں، بلکہ جمادات تک اس میں شریک ہیں۔ اگرچہ سورہ صافات جلد ۵، سورہ اسرار جلد ۱۶ میں علی الترتیب آیت نمبر ۵ اور ۴۴ کی تشریح کرتے ہوئے ہم نے اسی موضوع پر کسی حدیث کی ہے لیکن یہاں بھی اس مسئلہ کی اہمیت کے پیش نظر کچھ اشارے کرنا چاہتے ہیں۔ زیر بحث آیت میں جس جگہ کے ذکر ہے اس کی دو قسمیں ہیں یعنی عالم موجودات کی تمام چیزیں یا سجدہ بخوبی کرتی ہیں یا سجدہ کثرتی نظریں اور عالم اسباب کے قوانین کے تحت ہر ایک شے کا بغیر کسی شروع و ختم کے ساتھ تسبیح و تہلیل رہتے ہوئے اپنے کام میں سجدہ بخوبی ہے۔ کائنات کا ایک ذرہ بھی اس سے نفی نہیں، حتیٰ کہ بڑے بڑے نافرمانوں، فرود اور زلزلوں کے دماغوں کے نیچے اور ان کے جموں کے تمام ذرات بھی یہ سجدہ کرتے رہے ہیں۔

محققین کے ایک گروہ کا کہنا ہے کہ کائنات کے تمام ذرات ایک قسم کا ادراک و شعور رکھتے ہیں اور اسی وجہ سے زبان حال سے اللہ کی حمد و تسبیح بجالاتے ہیں۔ اور یہی ان کا سجدہ اور نماز ہے (اسی مفہوم کو ہم نے سورہ اسرار کی آیت ۴۴ کی تشریح کے ذیل میں بیان کیا ہے) اور اگر ذرات کا شعور تسلیم نہ کیا جائے تو ذرات کا عالم ہستی کے خاص نظام کے تحت محو کارہنا کی طور قابل انکار نہیں ہے۔ البتہ سجدہ تشریفی، ذوالعقول کی طرف سے معرفت و شعور کے ساتھ بارگاہ رب العزت میں سجدہ ریز ہونے کو کہتے ہیں۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان بھی اسی کائنات میں سے ہے اور جب مذکورہ بالا آیت میں تمام کائنات کے سجدہ کا ذکر ہوا تو انسان بھی اس میں آگیا، پھر انسان کا ذکر الگ سے کیوں کیا گیا؟

متواری کی توجہ کرنے سے جواب بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ وہ اس طرح کہ آیت میں لفظ "سجدہ" تشریفی و بخوبی، دونوں قسم کے سجدوں کو دامن میں لینے ہوئے ہے۔ چنانچہ سورج، چاند ستارے، پہاڑ درخت اور جانوروں کے لیے تکوینی، لیکن انسان کے لیے تشریفی مراد لیا گیا ہے، جسے بہت سے لوگ بجا لاتے ہیں۔ جب کہ معین لوگ لوگوں کی بھی کرتے ہیں۔ اور کثرت

حق علیہ العذاب کا مصداق بنتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ ایک لفظ کا جامع اور وسیع مفہوم میں استعمال، اس کے کئی ایک تالیق کے ہوتے ہوئے بھی کسی خلل کا سبب نہیں ہوتا۔ یہ اصول تو انھوں نے بھی مانا ہے جو کسی مشرک لفظ کا متعدد معانی میں استعمال کرتے ہیں۔ پھر جہانگیر بھی صحیح سمجھتے ہوں۔ (مغور کیجیے گا)

۲۔ کیا فرشتوں کا سجدہ "تشریفی" ہے؟ فرشتے بھی شامل ہیں لیکن ان کا سجدہ کونسا ہے "تکوینی" یا "تشریفی"؟ اگر فرشتوں کی عقل و شعور اور صاحب ارادہ ہونے کو مد نظر رکھا جائے تو ان کا سجدہ "تشریفی" نظر آتا ہے یعنی ارادہ اور اختیار کے ساتھ یا خضوع و خشوع بطور عبادت انجام پاتا ہے۔ سورہ تحریم آیت ۶ میں ارشاد ہوتا ہے۔

لا یعصون الله ما امرهم و یفعلون ما یؤمرون
اللہ کے کسی حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور حکم دیا جاتا ہے، بجالاتے ہیں۔

۳۔ چند سوالات اور ان کے جوابات "من فی الارض" کے جملے کو ذہن میں رکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ اس میں انسان بھی شامل ہیں۔ لیکن اس کے بعد "کثیر من الناس" کیوں آیا ہے۔ اس کے جواب میں کہا جاسکتا ہے کہ "کثیر من الناس" کا جملہ "من فی الارض" کے جملے کی وضاحت کے لیے آیا ہے۔ یعنی زمین پر رہنے والے دو گروہ ہیں۔ ایک اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جھکنے والا مومن گروہ، دوسرا باغی کافروں کا گروہ۔ مومن مفسرین نے ایک اور خیال کا اظہار کیا ہے۔ وہ یہ کہ "من فی الارض" کا جملہ عمومی یثبیت رکھتا ہے "سجدہ بخوبی" کی طرف اشارہ کرتا ہے جس میں تمام انسان حتیٰ کہ کافروں کے وجود کا ایک ایک جز بھی شامل ہے۔ جب کہ "کثیر من الناس" کا قبلہ صرف "سجدہ تشریفی" کی طرف اشارہ ہے، جس کے لحاظ سے ان کا مکمل مختلف ہے۔

ایک احتمال اور یہی ہے کہ "من فی الارض" دراصل زمین پر رہنے والے فرشتوں کے لیے آیا ہے، جس طرح "من فی السموات" آسمان پر رہنے والے فرشتوں کے لیے ہے اور "کثیر من الناس" زمین پر رہنے والے انسانوں کے لیے آیا ہے۔

(ii) زیر بحث آیت میں آسمان و زمین پر رہنے والوں کا ذکر ہے۔ خود آسمان و زمین کا کیوں نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ "سجود" کے ذکر سے خود آسمان کا ذکر دیا گیا ہے اور "جبال" جو زمین کا ایک اہم حصہ ہیں، کے ذکر سے زمین کا ذکر کر دیا گیا ہے۔

(iii) آخری سوال یہ ہے کہ آیت کے شروع میں "السموات" (کیا تو دیکھتا نہیں) کیوں فرمایا گیا ہے۔ حالانکہ موجودات عالم کا تکوینی سجدہ آجھ سے دیکھا نہیں جاسکتا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ عربی زبان میں "رأیت" "علم" کے معنی میں بھی آتا ہے۔ اس کے علاوہ کبھی کبھی بہت ہی واضح نتائج کو مشاہدے کے ذیل میں ذکر کیا جاتا ہے۔ مثلاً: کیا آپ دیکھتے نہیں کہ فلاں شخص زیادہ حامد اور بخیل ہے یا فلاں شخص عالم اور عادل ہے۔ حالانکہ حمہ و بخیل علم اور عدل ایسی صفات نہیں ہیں کہ جو دیکھی جاسکیں دراصل یہاں ان الفاظ سے مراد علم و عین کا ادراک ہے۔

۱۹۔ هٰذِهِ خَصْمَانِ اخْتَصَمُوا فِي رَبِّهِمْ فَالَّذِينَ كَفَرُوا قُطِعَتْ لَهُمْ شِيَابٌ مِّنْ نَّارٍ يَصُبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوسِهِمُ الْحَمِيمُ

۲۰۔ يُصْهَرُ بِهِ مَا فِي بُطُونِهِمْ وَالْجُلُودُ

۲۱۔ وَلَهُمْ مَقَامِعٌ مِّنْ حَدِيدٍ

۲۲۔ كُلَّمَا أَرَادُوا أَن يَخْرُجُوا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ أُعِيدُوا فِيهَا وَذُوقُوا عَذَابَ الْحَرِيقِ

۲۳۔ إِنَّ اللَّهَ يَدْخِلُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ يُجَلِّوْنَ فِيهَا مِنْ أَسَاوِرٍ مِّنْ ذَهَبٍ وَلُؤْلُؤًا وَلِبَاسُهُمْ فِيهَا حَرِيرٌ

۲۴۔ وَهَدُّوا إِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ وَهَدُّوا إِلَى صِرَاطِ الْحَمِيدِ

ترجمہ

۱۹۔ یہ دو مخالف گروہ ہیں۔ جنہوں نے اپنے پروردگار کے بارے میں آپس میں جھگڑا کیا۔ پس جو منکر رہے۔ ان کے لیے آگ کے کپڑے تیار کیے جائیں گے اور ان کے سروں پر کھولتا ہوا مانع اندلیا جائے گا۔

۲۰۔ جو ان کے جسموں کے اندر اور باہر کے حصوں کو پگھلا کے رکھ دے گا۔

ان کے لیے آہنی گرز ہیں۔

جب وہ دوزخ کی عقوبتوں سے نکلنا چاہیں گے۔ انہیں اس میں پھر لوٹا دیا جائے گا کہ حلاسنے والے عذاب کا مزہ چکھو

ایمان لانے اور اعمال صالح کرنے والوں کو اللہ فردوس بریں کے باغات میں بھیج دے گا۔ جہاں درختوں کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، انہیں سونے کے لنگنوں اور موتیوں سے آراستہ کیا جائے گا، اور وہاں انہیں ریشمی پوشاک عطا کی جائے گی۔

اور انہیں پاکیزہ باتوں کی ہدایت دی جائے گی اور ان کی راہنمائی اللہ کے اس راستے کی طرف کی جائے گی جو قابل ستائش ہے۔

شان نزول

شیعہ اور سنی مفسرین میں سے بعض نے مذکورہ بالا آیات میں سے پہلی آیت کی شان نزول یوں نقل کی ہے۔

جنگ بدر میں مسلمانوں کی طرف سے جناب امیر حضرت حمزہ اور حضرت عبیدہ بن حارث بن عبد المطلب

میدان کارزار میں نکلے اور ولید بن عقبہ، عقبہ بن ربیعہ اور شیبہ بن ربیعہ کو قتل کیا۔ تو یہ آیت نازل ہوئی اور مجاہدین کا یہ واقعہ بیان کیا۔ ابوذر غفاری قسم کھا کر کہتے تھے کہ یہ آیت ان پونہ دو دن کی شان میں نازل ہوئی ہے

لیکن متعدد اس بات کی تصریح کی گئی ہے کہ کسی آیت کا کسی ذات کے ساتھ مخصوص ہونا اس کے عمومی مفہوم پر اثر انداز نہیں ہوتا۔

میرزا نے مع البیان، فخر الدین رازی نے تفسیر کبیر، آلوسی نے روح المعانی، سیوطی نے اسباب انزال اور قرطبی نے تفسیر میں بیان کیا ہے۔

۲۴۔ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمَسْجِدِ
الْحَرَامِ الَّذِيْ جَعَلْنَاهُ لِلنَّاسِ سَوَآءًا ۙ بِالْعَٰكِفِ
فِيْهِ وَالْبَادِ ۙ وَمَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِالْحَادِ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ
مِنْ عَذَابِ الْيَوْمِ ۝

ترجمہ

۲۵۔ وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور مومنین کو اللہ کی راہ اور اس مسجد حرام سے روکتے
ہیں، جس کو ہم نے مقامی لوگوں اور دوسروں کے لیے یکساں قرار دیا ہے۔
(درناک عذاب کے مستحق ہیں) اور وہ جو اس سرزمین پر حق سے روگرداں ہو جائے
اور ظلم کرے، اسے ہم اذیت ناک عذاب کا مزہ چکھائیں گے

تفسیر

خدا کے گھر سے روکنے والے

گذشتہ آیتوں میں مطلق طور پر کفار کے بارے میں بات ہو رہی تھی۔
جبکہ اس آیت میں ان میں سے ایک خاص گروہ کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ جو منافقین اور سنگین گناہوں کے مرتکب ہوتے تھے
علیٰ الخصوص مسجد حرام اور حج کے عظیم الشان اجتماعات کے سلسلے میں رکاوٹیں ڈالتے تھے۔ لہذا ارشاد ہوتا ہے، جو لوگ کافر ہو
گئے اور وہ راہ حق سے دوسروں کو روکتے ہیں (اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ) اس طرح
وہ مومنین کو توحید کے مرکز مسجد حرام سے روکتے ہیں۔

وہ مرکز جسے ہم نے ہر ایک کے لیے یکساں قرار دیا ہے، چاہے وہیں کا باسی ہو یا کسی اور جگہ سے آیا ہو۔ (والمسجد
الحرام الَّذِيْ جَعَلْنَاهُ لِلنَّاسِ سَوَآءًا) العاکف فیہ والباد (پہنا پنچہ جو بھی اس جگہ حق سے روگرداں
ہوگا اور ظلم و ستم سے اپنے ہاتھ آلودہ کرے گا، ہم اسے اذیت ناک عذاب کا مزہ چکھائیں گے) (ومن یرد فیہ بالحد

شناسی کی راہ، قرب پروردگار عالم کی راہ اور عشق و عرفاں کی راہ۔ بے شک اللہ مومنین کو ان مفاہیم کی طرف ہدایت کرے گا
کے آخری درجہ تک لے جاتا ہے۔

ایک مشہور مفسر علی بن ابیہیم نے اپنی تفسیر میں ایک حدیث نقل کی ہے کہ "طیب من القول" سے مراد توحید اور احادیث
اور تراویح سے مراد ولایت اور اللہ کے مقرر کردہ رہبروں کی قیادت کو قبول کرنا ہے، ہماری نظریں یہ حدیث زیر بحث اس
بہترین مصداق ہے۔

مذکورہ بالا آیتوں کی شان نزول اور مختلف تفاسیر و تفسیرات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ تکلیف وہ اور اذیت ناک شدید عذاب
کفار کے اس گروہ کے لیے ہے جو اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہیں۔ اور دوسروں کو گمراہ کرتے ہیں، کفار کے ان سرغنوں اور سر
میں سے کچھ ان لوگوں کی طرح ہیں جو میدان بدر میں جناب امیر، حضرت حمزہؓ اور حضرت عبیدہ بن حارث کے مقابلے میں نکلے

(پچھلے صفحہ کا ماحشیہ) یہاں حمید صراط کی صفت بیان ہے۔ اس صفت میں منیٰ یہ ہوگا کہ قابل تعریف راستے کی طرف راہنما کی جلتے
گی۔ لیکن ہماری نظریں پہلا مطلب زیادہ مہم ہے

بظلم من ذقہ من عذاب الیم۔

حقیقت یہ ہے کہ کفار کا یہ گروہ انکار حق کے علاوہ تین بڑے گناہوں کا مرتکب ہوا ہے۔

i راہ خدا ایمان اور اللہ کی اطاعت میں رکاوٹ ڈالنا۔

ii زائریں کو اور عبادت کرنے والوں کو حرم خدا تک نہ پہنچنے دینا اور حرم خدا پر اپنا حق فائق قرار دینا۔

iii اس مقدس سرزمین پر ظلم و احماد اور گناہ کا بازار گرم کرنا۔ چنانچہ دردناک عذاب کے مستحق اس گروہ کو اللہ عزوجل فرمادے گا۔

چند اہم نکات

- 1۔ دو مختلف صیغے اس آیت میں مذکورہ گروہ کے بارے میں کفر کا ذکر ماضی کے صیغے کے ساتھ ہے۔ جبکہ "راہ حق میں گناہ" کا صیغہ کا ذکر مضارع کے صیغے کے ساتھ ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ان کا کفر قدیمی ہے۔ مگر لوگوں کی راہ حق سے ہٹانے کی ان کی کوششیں مسلسل اور دائمی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں کفر کا تعلق چونکہ عقائد کے ساتھ ہے اور یہ ایک ثابت شے ہے۔ لہذا فعل ماضی کے ساتھ آیا ہے جبکہ "صد عن سبیل اللہ" عملی کیفیت ہے۔ لہذا فعل مضارع کے ساتھ آیا ہے۔
- 2۔ (صد عن سبیل اللہ) کیا ہے؟ اس سے مراد ایمان اور اعمال صالح کی راہ میں کسی بھی قسم کی رکاوٹ ڈالنا ہے۔ چاہے صرف نشر و اشاعت اور پراپیگنڈے کی حد تک ہو یا عملی اقدامات کی صورت میں ہو۔ اس میں سب شامل ہیں

- 3۔ اس منہج فیض میں تمام لوگ برابر کے شریک ہیں "سواء العاکف فیہ والباد" اس جیسے کے مفہوم کے آثار مختلف ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اس مرکز توحید میں استحقاق عبادت سب کو یکساں طور پر حاصل ہے اور مناسک حج یا دیگر عبادات کی بجائے آدمی کے لحاظ سے کسی کے خاندان کے نزدیک کسی کے معاملے میں مداخلت کا کوئی حق نہیں ہے۔ البتہ بعض نے اس مفہوم کی حدود عبادات سے بڑھا کر تمام حقوق تک بیان کی ہیں۔ یعنی مکہ اور اس کے گرد و نواح میں رہن سہن کا بھی سب کو یکساں طور پر حق ہے۔ اسی بنا پر بعض فقہاء کا فتویٰ ہے کہ مکہ میں گھروں کی خرید و فروخت اور گریہ داری حرام ہے۔ اور انہوں نے استدلال کے طور پر اسی آیت کو پیش کیا ہے
- بعض روایات میں بھی حرم خدا کے زائریں کو مکہ کے مکانات میں قیام سے روکنے سے منع کیا گیا۔ البتہ بعض میں ممانعت حرمت کے اعتبار سے ہے اور بعض میں کراہت کے لحاظ سے۔
- 4۔ نبی اہل فطر کے غلو میں غلبہ ظلم میں جناب امیر علیہ السلام اپنے دور کے محض کے گورنر جناب قثم بن عباس کو خط تحریر فرمایا ہے وہ یوں ہے۔

و مراہل مکہ ان لا یأخذوا من ساکن اجراء فان الله سبحانه یقول "سواء العاکف فیہ والباد" فالعاکف المقیم بہ، والبادی

الذی یحج الیہ من غیر اہلہ

"اہل مکہ کو حکم دو کہ جو لوگ شہر میں سکونت اختیار کریں، ان سے کوئی کرایہ نہ لیا جائے، کیونکہ اللہ فرماتا ہے کہ مقامی اور مسافر حقوق رکھتے ہیں۔" اور "عاکف" سے مراد مقامی لوگ ہیں اور "بادی" مختلف علاقوں سے حج کے لیے آنے والے کو کہتے ہیں۔

امام صادقؑ سے بھی اسی طرح کی ایک روایت ہے۔

کانک مکہ لیست علی شیء منہا باب وکان اول من علق علی بابہ المصراعین، معاویۃ بن ابی سفیان ولیس یبغی لاحد ان یمنع الحاج شیئا من الدور و منازلہا۔

صدر اسلام میں مکہ میں گھروں کے دروازے نہیں ہوتے تھے۔ پہلا شخص جس نے اپنے گھر کا دروازہ لگایا۔ معاویہ تھا اور مناسب نہیں کہ کوئی شخص عاجیوں کو مکہ کے گھروں میں داخل ہونے سے روکے۔

اس طرح کی بعض اور روایتوں سے یہ مفہوم ملتا ہے کہ خاندان خدا کے زائریں کا یہ حق ہے کہ مناسک حج کے اختتام تک گھروں کے معنوں سے استفادہ کریں۔

البتہ یہ حکم بعد والی بحث سے متعلق ہے کہ آیا یہ عہدہ میں "مسجد الحرام" سے مراد، صرف مدو مسجد ہے یا مکہ کا تمام شہر۔ اگر صرف مسجد حرام مراد ہو تو پھر یہ حکم مکہ کے مکانات پر نافذ نہیں ہوگا۔ اور اگر مکہ کے سارے شہر کو آیت کے مفہوم میں شامل سمجھیں تو مکانات کی ضرورت فرخت یا کراہی لینے دینے کا سوال پیدا ہوگا۔ لیکن ہماری نظروں میں چونکہ نفسی منابع اور تفسیر کے لحاظ سے یہ مطلب پوری طرح ثابت نہیں لہذا تمام شہر کے مکانات پر حرمت کا حکم لگانا مشکل ہے۔ تاہم اس میں شک نہیں کہ اہل مکہ کو چاہیے کہ بیت اللہ کے زائریں کو زیادہ سے زیادہ سہولتیں مہیا کریں اور گھروں کے معاملے میں اپنی مولویت نہ بتائیں۔ بیچ السلاطین کے خط اور دیگر روایات کا بھی غاہر اس مفہوم کی طرف اشارہ ہے اور شیخ دمشقی فقہاء کے نزدیک حرمت والا قول زیادہ معتبر نہیں ہے۔ مزید وضاحت کے لیے جواہر الاسلام ج ۲۰ صفحہ ۴۰ سے رجوع کریں۔

البتہ یہ مفہوم بھی مسلم ہے کہ کسی شخص کو یہ حق نہیں کہ بیت اللہ کے متولی یا منتظم ہونے کا باند بنا کر زائریں کے لیے کوئی چھوٹی سی بھی رکاوٹ پیدا کرے یا اسلام کے اس مرکز کو اپنے پراپیگنڈے کے لیے استعمال کرے۔

بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ مسجد حرام سے مراد مدو مسجد ہی ہیں، جبکہ بعض نے اس آیت میں مسجد حرام سے کیا مراد ہے؟ نے اس سے مراد مکہ کا پورا شہر لیا ہے اور ثبوت کے طور پر سورۃ بنی اسرائیل کی پہلی آیت جو غیر کریم کی معراج کے بارے میں نازل ہوئی ہے کو پیش کیا ہے۔

تفسیر کنز العرفان ج ۱ صفحہ ۲۲ کے مطابق آیت معراج میں یہ تصریح موجود ہے کہ معراج کی ابتداء مسجد حرام سے ہوئی۔ جب کہ تاریخ یہ کہتی ہے کہ جناب خدیجہ الکبریٰ کے گھر یا شیب ابی طالب یا جناب اہم ہانی کے گھر سے ہوئی اس بنا پر مسجد حرام سے شہر مکہ مراد ہے۔ لیکن ہماری نظروں میں چونکہ آیت میں "مسجد حرام" کا لفظ صریحاً موجود ہے۔ لہذا آیت کی موجودگی میں تاریخ کو معتبر نہیں سمجھا جاسکتا اور

پاس کوئی دلیل نہیں کہ جس کی بنا پر غاہرا آیت کا مضمون بدلا جائے اس لیے یہ ماننا پڑے گا کہ معراج کی ابتداء خود مسجد حرام ہی سے ہوئی ہے مذکورہ بالا چند روایات سے یہ احتمال ہوتا ہے کہ زیر بحث حکم محکم کے تمام مکانات ہنا مذہبے قواس کی وجہ سے کفار ہر ایہ حکم ہے اور کسی ہی مستحب حکم کے دائرے کو مختلف مناسبتوں کی بنا پر وصت دینے میں کوئی مضائقہ نہیں (ملاحظہ کیجئے گا)

۵۔ ظلم کے ساتھ "احاد" کا کیا مفہوم ہے
نفت میں "احاد" صراحتاً سے ادھر ادھر ہو جانے کو کہتے ہیں۔ اسی کو "نہ کوئڈ" کہا جاتا ہے کہ وہ قہر کو دینے کی جگہ سے ایک طرف کو بہت کر کے اس مقدس سرزمین پر نافرمانی کے مرتکب ہوتے ہیں البتہ بعض مفسرین نے یہاں ظلم کو صرف شرک سے تعبیر کیا ہے، بعض نے شرک کے ساتھ حرام کو حلال کرنے کو بھی شامل کر لیا ہے، جبکہ بعض نے ہر فعل حرام کو ظلم میں شامل کیا ہے، حتیٰ کہ بدکلامی گالی گلوچ اور ماتحتوں کی برائی کرنے تک کو بھی ظلم کے وسیع مفہوم کے ذیل میں سمجھا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس مقدس و محترم مقام پر چھوٹے سے چھوٹے گناہ کی سزا اور عذاب بھی بہت سخت ہے۔
امام صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ ایک صحابی نے اس آیت کی تفسیر کے بارے میں آپ سے استفسار کیا تو آپ نے فرمایا۔

كُلُّ ظَلَمٍ يَظْلِمُ الرَّجُلَ نَفْسَهُ بِمَكَّةَ مِنْ سُرْقَةٍ أَوْ ظَلَمَ أَحَدًا شَيْءًا مِنَ الظُّلْمِ فَافِي إِتْلَاهِ الْحَادِّ وَلِذَلِكَ كَانَ يَنْهَى أَنْ يَسْكُنَ الْحَرَمَ بِهَرَمٍ جَوْ مَكَّةَ كَوْنِي شَخْصٍ اسْتَعَانَ بِهِ عَلَى كَرِّهِ، بِمَا هُوَ جَوْرِي هُوَ يَأْكُلُ مِنْ زَيْدٍ أَوْ يَأْكُلُ مِنْهُ، فِيهِ أَنْ سَبَّ كَوْنِي أَحَادٍ سَمَّجَاتُ هُوْنَ

اسی وجہ سے امام لوگوں کو مکہ میں زیادہ دیر تک قیام سے منع فرمایا کرتے تھے۔
"کیونکہ اس جگہ پر گناہ کی سزا زیادہ اور سخت ہے۔"

کئی اور روایات بھی اسی مفہوم پر دلالت کرتی ہیں اور یہی مفہوم مطلق طور پر غاہرا آیت کے بھی ہم آہنگ ہے۔ اسی بنا پر بعض فقہاء نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ اگر کوئی شخص حرم خدائیں ایسا گناہ کر بیٹھے، جس کی حد میں ہے، اس پر نہ کہ علاوہ تعزیر بھی جاری کی جائے اور اس فتویٰ کی دلیل انھوں نے اس آیت مجیدہ کے اس جملے کو قرار دیا ہے "مَنْ ذَقَّ مِنْ عَذَابِ الْمَيْمِ" ۱۰
اس گفت گو کے مطابق جن مفسرین نے ظلم سے مراد صرف ذخیرہ نموداری یا عذر حرم میں بغیر احرام باندھے داخلے کی ممانعت لیا ہے، ان کی مراد آیت مجیدہ کا واضح مہداتی بیان کو ناسہ در ضایت کے وسیع تر مفہوم کو محدود کرنے کی کوئی دلیل نظر نہیں آتی۔

۲۶۔ وَإِذْ بَوَّأْنَا لِإِبْرَاهِيمَ مَكَانَ الْبَيْتِ أَنْ لَا تُشْرِكْ بِي شَيْئًا وَطَرَّ رَبِّي لِلطَّاغُوتِ
وَالْقَائِمِينَ وَالزُّكَّعَ السُّجُودِ
۲۷۔ وَأَذِنَ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَى كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ

۲۸۔ لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ فِي أَيَّامٍ مَعْلُومَاتٍ عَلَى مَا رَزَقَهُمْ مِنْ بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطِيعُوا الْبَاسِ الْفَقِيرَ

ترجمہ

۲۶۔ یاد کیجئے جب ہم نے ابراہیمؑ کے لیے خانہ کعبہ کی جگہ تجویز کی (تاکہ وہ اس پر عمارت بنائیں، ہم نے اس سے کہا) کسی چیز کو بھی میرا شریک نہ بنانا، اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور قیام، رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے لیے

ایتھا الناس كتب علیکم الحج الى البیت الصتیق فاجیبوا ربکم
لو اذنا کعبہ کاج تم پر فرض کر دیا گیا ہے، اپنے پروردگار کا بلا دا قبول کر دو۔

چنانچہ اللہ نے ان کی آواز سب کے کانوں تک پہنچا دی۔ حتیٰ کہ صلیب پر ادرار دم مار میں موجود افراد نے بھی سنا لیا
جواب میں (البیک اللہم لبیک) بھی کہہ دیا اس دن سے لے کر قیامت تک جتنے لوگ مراسم حج میں شریک ہوئے
ہیں یا ہوں گے۔ وہی میں جنہوں نے اس دن حضرت ابراہیم کی آواز کا جواب دیا تھا۔

آئیہ حمیدہ میں سواری سے حج پر جانے والوں سے قبل پیدل جانے والوں کا ذکر ہے۔ یہ اس لیے کہ اول الذکر کا مقبرہ اللہ تعالیٰ کے
بال زیادہ ہے کیوں کہ وہ زیادہ تکلیف اٹھاتے ہیں، چنانچہ پیغمبر اکرم سے روایت ہے کہ پیدل حج پر جانے والے کے لیے ہر قدم پر سات
سو نیکیوں کا ثواب لکھا جاتا ہے، جبکہ سوار کے لیے صرف ستر نیکیوں کا ثواب
یہ بھی ممکن ہے کہ غنائ خدا کی زیارت کی اہمیت کے پیش نظر یہ کہا گیا ہو کہ جو وسیعہ بھی ممبر ہوج کے لیے نکل پڑنا چاہیے۔ اور ہمیشہ

سواری کے انتظام میں نہیں رہنا چاہیے۔
”ضامن“ (یعنی کمزور جانور) یہ لفظ اس لیے استعمال کیا گیا ہے کہ قاری یہ جان لے کہ سفر حج اس قدر کٹھن ہے کہ چلایا نہ صرف اطفال
اور بے آب و گیاہ بیابانوں سے گزرتے ہوئے جانور کو درد پڑ جاتا ہے، لہذا ان دشوار گزار راستوں کو طے کرنے کے لیے ذہنی طور پر
تیار رہنا چاہیے۔ اس لفظ سے ایک اور اشارہ بھی ملتا ہے۔ وہ یہ کہ ایسے جانور مقعب کیے جائیں جن کے جسم شفقت کی رابرتی سے کمزور
پڑ گئے ہوں۔ البتہ اعضاء اور پٹھے مضبوط ہوں، کیونکہ موٹے تازے جانور ایسے سفر میں کام نہیں آتے اور یہ اشارہ بھی ہے کہ ناز و نعمت
سے بچنے والے جانور کو کیا سفر ایسے انسانوں کا بھی کام نہیں۔

”من کفل فح عقیق“ کا معنی یہ ہے کہ نہ صرف لوگ محنت کے گرد و فواح اور قرب ہوا سے حج کے لیے آئیں گے
بلکہ دور دراز سے بھی آئیں گے، اس جملے میں لفظ ”کل“ احاطہ کے معنی میں نہیں بلکہ کثرت کے معنی میں ہے۔
مشہور مفسر ابوالفتح رازی اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے ”الواقعا بشر بن محمد نامی ایک شخص سے ایک عجیب واقعہ نقل کرتا
ہے، بقول اس کے:

ایک دفعہ میں نے خاند کعبہ کا طواف کرتے ہوئے ایک ضعیف آدمی کو دیکھا، جس کے چہرے پر بے سفر کی تھکن اور بے آرامی کا
پڑھی جاسکتی تھی اور عمار کے سہارے بڑے کرب کے ساتھ طواف کر رہا تھا۔ میں اس کے پاس گیا اور پوچھا بڑے سیال کہاں سے
تشریف لاتے ہیں؟ کہنے لگا ”اتنی دور سے آیا ہوں کہ سفر میں پانچ سال بیت گئے اور رنج و تعب سفر سے مضمحل اور بوڑھا ہو گیا ہوں“
میں نے اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا، بے شک آپ نے حق تعالیٰ کی سچی محبت اور پر غلوں اعانت میں بڑی محنت

لے تفسیر نور الثقلین ج ۳ صفحہ ۳ کے مطابق تفسیر علی بن ابراہیم کا خلاصہ، آدھی نے روح المعانی میں ادرارازی نے تفسیر کبیر میں بھی
اس معنوں کو کم و بیش تحریر کیا ہے۔

لے تفسیر روح المعانی، مجمع البیان اور تفسیر کبیر از فخر الدین رازی۔

گوارا کی! یہ سن کر وہ فرط مسرت سے مسکرایا۔ اور اس نے یہ اشارہ پڑے۔

زمر من هویت وان شطت بک الدار وحال من دونہ حب واستار
لا یعنک بعد من زیارتہ ان المحب لمن یہواہ زوار!
اپنے محبوب سے ملنے ضرور جائو! اگرچہ تیرے گھر سے کتنا ہی دور کیوں نہ ہو اور راستے میں کیسی ہی رکاوٹیں، اور
مزا جتنی تیرا راستہ کیوں نہ روکیں۔ خالصے کی طوالت اس سے ملنے میں ہرگز حائل نہ ہونے دیجو، کیونکہ عاشق کو
بہر حال محبوب کی زیارت کے لیے جانا ہی چاہیے۔

بے شک خاند خدایا انتہائی کشتش اور جاہزیت ہے، جس کے سبب سے ایمان سے سرشار دل دور و نزدیک سے اس کی طرف
کھینچے پلے آتے ہیں۔ ہر نسل ہر قبیلے کے لوگ چھوٹے ہوں یا بڑے ”لبیک“ کہتے ہوئے دیوانہ وار اس کی طرف آتے ہیں تاکہ اللہ کی ذات
پاک کے جلوے اس مقدس سرزمین پر دل کی آنکھوں سے دیکھیں اور اس کی ہمہ گیر رحمت کو روح کی گہرائیوں میں محسوس کریں۔ لے

بعد وال آیت میں ایک مختصر محکمہ معنی نیز جملے میں حج کے فلسفے کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے، لوگ
اس سرزمین مقدس پر آئیں تاکہ اپنے مفاد کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں (لشہد و منافع لہم) مفسرین قرآن نے لفظ ”منافع“
کے ذیل میں بہت کچھ ذکر کیا ہے، البتہ بالکل واضح ہے۔ کہ اس لفظ کو غیر مشروط و لامحدود و محدود پر استعمال کیا گیا ہے، یعنی مادی، معنوی،
الغرضی، اجتماعی، سیاسی، اقتصادی، اخلاقی اور تعلیمی مفاد سب ہی اس میں شامل ہیں۔

بے شک مسلمانوں کو دنیا کے ہر ایک علاقے سے اور ہر قسم کے لوگوں کو یہاں آنا چاہیے اور اپنے مفاد کا ناظر اور شاہد بننا چاہیے۔
یعنی اپنے اپنے وطن میں جو کچھ سنتے رہے ہیں، یہاں آکر اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں۔ تفسیر نور الثقلین، ج ۳، صفحہ ۳ پر کافی کے حوالے
سے امام صادق علیہ السلام سے ایک روایت نقل کی گئی ہے کہ ریح بن خثیم نے امام سے اس لفظ کی تفسیر کے بارے میں پوچھا تو آپ نے
ارشاد فرمایا۔

”یہ لفظ دنیا و آخرت کے جملہ ”منافع“ اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔“

انشار اللہ آیت کے نکات کے ذیل میں ہم اس پر تفصیل سے روشنی ڈالیں گے۔

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے: حجاج آئیں اور قربانی کریں، روزی کے سلسلے میں دینے والے جانور دل کو مخصوص ایام میں
اللہ کا نام لے کر ذبح کریں۔ (و یذکر ولا سمع اللہ فی ایامہ معلومات علی مارز قہم من بھیمة الانعام۔)

لے فاضل و اخذ شران موعوم کہتے ہیں۔

اگر گزشتہ زمانے کے ذرائع آمد و رفت اور راستوں کو ذہن میں رکھ کر اس وقت کے اندلس، مراکش یا
چین و ہندوستان آنے والوں کا تصور کریں خوشی کے یا سمدردی راستوں سے نکل آتے تھے، خصوصاً راستوں کا رہنوں سے
غیر محض ہونا پیش نظر ہے تو واقعی یہ بڑا عظیم کام نظر آتا ہے کہ کئی دفعہ ان عاشقان خدا کا زادہا لوٹ لیا جاتا اور ان کو بے سرو سامانی کے عالم میں

یعنی ہر شخص مناسک حج کے دونوں میں عبادت کرے اس پر کوئی گناہ نہیں۔

یہ سورہ بقرہ کی آیت ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایام التشریق تین دن سے زیادہ نہیں ہیں۔ کیونکہ لوگوں کے قرینے سے یہ قیاس ہے کہ اگر حاجی ذرا جلدی سے کام لیتے ہوئے ایک دن کم کرے تو دونوں دن جاسکتے ہیں۔ البتہ اگر ہم اس سختے پر غور کریں کہ زیر بحث آیت میں ہم معلومات کے بعد قربانی کا تذکرہ کیا گیا ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ قربانی عام طور پر دسویں تاریخ کو کی جاتی ہے، تو اس سے یہ بات قرین ملتی ہو جاتی ہے کہ "ایام معلومات" سے مراد ماہ ذوالحجہ کے پہلے دس دن ہیں جو قربانی کے دن یعنی دسویں تاریخ کو ختم ہو جاتے ہیں، لہذا جو تفسیر ایام معلومات اور ایام محدودات کو الگ الگ کرتی ہے۔ وہ صحیح معلوم ہوتی ہے، لیکن دونوں آیتوں میں ہر مشترک مطلب بیان کیا گیا ہے۔ اس سے ذہن میں یہ آتا ہے کہ دونوں کا ایک ہی مفہوم ہے یعنی مخصوص دنوں میں ذکر خدا کرنا اور اسی کی طرف متوجہ رہنا جو دسویں سے شروع ہو کر تیرہویں تک جاری رہتا ہے۔ البتہ اللہ کے نام کے تذکرے کا ایک مرحلہ قربانی بھی ہے۔ لہ

متحد روایات کے مطابق اس ذکر سے مراد وہ تکبیریں ہیں جو عید قربان کے دن نماز ظہر کے بعد سے برابر پندرہ نمازوں تک پڑھنا مستحب ہیں، یعنی تیرہویں ذوالحجہ کی نماز فجر تک۔ بحار الانوار ج ۹۹، ص ۲۰۰ پر ایام نبوی کا ختم کے حوالے سے ذکر ہے کہ یہ ہیں:

اللہ اکبر لا الہ الا اللہ واللہ اکبر واللہ اکبر ولله الحمد اللہ اکبر
علی ما ہدانا واللہ اکبر علی ما رزقنا من یمیمة الانعام۔

اسی کتاب میں ص ۲۰۰ پر درج بعض دوسری روایات کے ذریعے تصریح ہوئی ہے کہ پندرہ نمازوں کے بعد پڑھنا اس شخص کے لیے ہے جو میدان نبی میں ہو باقی حضرات کے لیے دس نمازوں تک پڑھنا کافی ہے، یعنی بارہویں ذوالحجہ کی نماز فجر تک، یہ سختی بھی قابل توجہ ہے بحیثیت والی روایات اس حقیقت کی دوسرا گواہ ہیں کہ زیر بحث آیت میں جن "ذکر" کا تذکرہ ہوا ہے وہ قربانی کرتے ہوئے ذکر سے مخصوص نہیں، بلکہ مجموعی ذکر مراد ہے۔ اگرچہ اس میں وقت ذبح ذکر بھی شامل ہے۔ (قابل غور)

۲۔ حج کا فلسفہ اور اس کے مضمرات
حج کے عظیم الشان مراسم دوسری عبادت کی طرح فیوض و برکات کا سرچشمہ ہیں اور انفرادی اور اسلامی معاشرے کے بہت سے اجتماعی پہلوؤں کی عکاسی کرتے ہیں۔ اگر مناسک حج صحیح طریقے سے ادا کیے جائیں۔ ہر ایک رکن ٹھیک اسلامی تقاضے کے مطابق ادا ہو تو ہر سال مسلمانوں کا یہ بہتر ہال شان اجتماع اسلامی مساعروں میں نئے انقلاب کی داغ بیل ڈال سکتا ہے، حج کے عظیم الشان مناسک کے چار پہلو ہیں۔ جن میں ہر ایک دوسرے سے زیادہ بنیادی گہرا اور مفید دکھائی دیتا ہے۔

۱۔ حج کا اخلاقی پہلو
حج کا اہم ترین فلسفہ اخلاقی ہے، یعنی حج انسان میں زبردست اخلاقی انقلاب پیدا کرتا ہے۔ احرام کی پابندی انسان کو مکمل طور پر رادوی تعیش، ظاہری امتیازات مختلف لباس اور رنگ و روپ و زیب و زینت سے محروم کر دیتا ہے۔

۲۔ "وید کر وید اللہ" کی تفسیر کے ذیل میں جو اختلاف متاد ایک قربانی کے وقت تمام خداوندی امور مطلقاً خدا کا ذکر کرنا ختم جاتا ہے اور یوں ہلالوں دوسرے کا صدق بن جاتا ہے اور دوسرا ایک وسیع عمومی مضمون بن جاتا ہے۔

مناسک حج میں وہ امور یا اعمال مرکزی حیثیت رکھتے ہیں، جن سے اللہ سے تعلق پیدا ہوا اور اس طرح اس عبادت کی عظمت کی عکاسی کرتے ہیں۔ چنانچہ اس آیت میں قربانی کرتے ہوئے صرف اللہ کا نام لینے کا ذکر کیا گیا ہے۔ جو شرائط ذبح میں سے ہے یا اس لیے ہے، تاکہ قربانی کرنے والے کی پوری توجہ اللہ اور اس کے قبول کرنے پر ہے اور قربانی کے گوشت یا دیگر ذبیحی مفاد اس کے ذیل میں رہیں۔ دراصل جانور دن کی قربانی، انسانوں کے ذہن میں راہ خلائق قربان ہونے کے لیے آمادگی کا ایک ذریعہ ہے، جس طرح واقعات حضرت ابراہیم و اسماعیل میں آیا ہے کہ انھوں نے یہ عمل بجا لاکر گویا یہ اعلان فرمایا کہ ہم اللہ کی راہ میں ہر قربانی دے سکتے ہیں، حتیٰ کہ جان تک بھی قربان کر سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ قرآن مجید نے بہت پرستوں کے مشرکانہ طریقہ کار کی نفی بھی کر دی جو قربانی کرتے وقت بتوں کے نام پکارتے تھے اور اس طرح توحید مناسک کو شرک سے آلودہ کر لیتے تھے، چنانچہ آیت کے آخر میں ارشاد ہوتا ہے: قربانی کے گوشت میں سے خود بھی کھاؤ اور غریبوں کو بھی کھلاؤ۔ (فکلوا منها واطعموا البائس الفقیر)۔

اس آیت کی تفسیر یوں بھی کی جاسکتی ہے "ایام معلومات" میں اللہ کا نام لینے سے مراد اللہ کی بے حد حساب نعمتوں کی وجہ سے علی الخصوص جانور و انسان کی خوراک بھی ہیں، کی وجہ سے مخصوص ایام میں، اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تقدیس کی جائے۔ لہ

چند اہم نکات

۱۔ ایام معلومات
زیر بحث آیت میں نظم ہو رہا ہے "ایام معلومات" میں یعنی مخصوص دنوں میں، اللہ کو یاد کرو۔ سورہ بقرہ آیت ۱۱۰ میں بھی یہ نظم یوں آیا ہے:

"واذکروا للہ فی ایام معدودات"

اللہ کو معدود دنوں میں یاد کرو

آیا "ایام معلومات" اور "ایام معدودات" ایک ہی یا جدا جدا، اس مسئلے میں اختلاف پایا جاتا ہے، روایات بھی مختلف وارد ہوتی ہیں۔

بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ "ایام معلومات" سے مراد ماہ ذوالحجہ کے پہلے دس دن ہیں اور ایام معدودات سے گیارہ بارہ اور تیرہ ماہ ذوالحجہ ایام التشریق" مراد ہیں یعنی نورانی اور دنوں کی روشنی بخشنے والے دن۔

بعض مفسرین چند روایات کی بنیاد پر دونوں ہی سے "ایام التشریق" مراد لیتے ہیں۔ "ایام التشریق" کے مصداق میں بھی اختلاف ہے کبھی اس سے ماہ ذوالحجہ کی گیارہ بارہ اور تیرہ تاریخ مراد لی جاتی ہے اور کبھی دسویں کے دن یعنی عید قربان کے دن کو بھی شامل کر لیا جاتا ہے۔

فمن تعجل فی یومین فلا اشع علیہ۔

۲۔ اقل الذکر تفسیر کے مطابق، قربانی کرتے وقت اللہ کا نام لینا "علی" یعنی استعلا ہے اور ان مخصوص دنوں میں تسبیح و تقدیس کا معنی کیا جائے وہاں "علی" بمعنی "برائے" ہے "اس فرق کی وضاحت ہم آگے کریں گے۔

یہی وجہ ہے کہ نبی امیر اور نبی عباس جیسے دیکھنے والوں کے زمانے میں عوام کے بعض طبقات کے میل جول پر لڑی نظر رکھی جاتی تھی تاکہ
مکانہ کی تحریکوں کو کچلا جاسکے، اس وقت ان کے ملاپ سیاسی روابط اور صلاح مشورے کا واحد ذریعہ ج تھا۔ بیچ اہل لغت کلمات حضار
مبشر میں جناب امیر نے ج کو

الحج تقویۃ للدين

"مناسک حج، دین مقدس اسلام کی تقویت و استحکام کا سبب ہیں۔" قرار دیا ہے۔

ایک غیر مسلم سیاست دان نے یونہی نہیں کہا،

"انوس کہ مسلمانوں نے حج کے فلسفے کو نہ سمجھا، لیکن ان کے دشمن سمجھ گئے۔"

روایات میں حج کو ضعیف اور کمزور مسلمانوں کا جہاد قرار دیا گیا ہے۔ ایسا جہاد کہ ساری دنیا کے ضعیف، کمزور اور عورتیں ایک جگہ جمع
ہو کر امت مسلمہ کی عظمت و عظمت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ خانہ خدا کے چاروں طرف نازکی صفیں باندھ کر ایک آواز ہو کر جب نعرۂ تحیر بلند
کرتے ہیں تو دشمنوں کے دل دہل جاتے ہیں۔

۱۱۔ حج کا ثقافتی پہلو
حج کے دنوں کو مختلف علاقوں کے لیے ثقافتی افکار و افعال کے تبادلے کا بہترین موقع قرار دیا جاسکتا
ہے، خصوصاً اس لحاظ سے کہ حج کا عظیم الشان اجتماع دنیا بھر کے مسلمانوں کے مختلف طبقات کا حقیقی اجتماع ہے
ہے، کیونکہ خانہ خدا کی زیارت کے لیے آنے والے افراد کے انتخاب میں کوئی انسان ساختہ طریقہ کار فرما نہیں ہے۔ بلکہ صرف حکم خدا کے
تحت مختلف علاقوں، خانہ دلوں، زبانوں اور ملکوں کے لوگ ایک جگہ پر جمع ہو جاتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اسلامی روایات میں ہے کہ حج رسول اللہ کے فرمودات اور آثار کے دنیائے اسلام میں نشر و اشاعت کا بہترین
ذریعہ ہے۔ رسائل الشیعہ ۸ صفحہ پر ایک روایت ہے کہ امام صادق کے خاص صحابی جو بہت صاحب علم بھی تھے ابن ابی شامہ بن
حاکم ہے، نے ایک دن امام سے حج کے فلسفے کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے فرمایا۔

ان الله خلق الخلق.... وامرهم بما يحكون من امر الطاعة في الدين و
مصلحتهم من امر دنياهم فجعل في الاجتماع من الشرق والغرب وليتعارفوا
وليتنزع كل قوم من التجارات من بلد الى بلد.... ولتعرف آثار رسول الله
رض، وتعرف اخباره ويذكروا لایسی۔

اللہ نے بندوں کو پیدا کیا.... آپ نے ان کے دینی اور دنیوی مفاد میں احکام جاری فرمائے۔ مہملہ ان احکام کے شرق
وغرب کے لوگوں میں شریعت ایک اجتماع دینا کہ حج کا بھی حکم دیا تاکہ لوگ ایک دوسرے سے شناسا ہوں، تجارتی،
ساز و سامان ایک شہر سے دوسرے شہر میں منتقل کیا جاسکے۔ نیز اس طرح آپ کی تعلیمات کی بھی اشاعت ہو، لوگ ان
تعلیمات کو اپنے دلوں میں جگہ دیں اور انھیں کبھی فراموش نہ کریں۔

یہی وجہ ہے کہ جابر بن عبد اللہ اور عمرو بن عبد اللہ کے عہد حکومت میں جبکہ احکامات قرآن و سنت کی نشر و اشاعت کی اجازت نہیں ہو سکتی تھی۔
مسلمان عوام حج کے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آمد ظاہر، اور بزرگ علماء کی باگاہ میں حاضر ہو کر اپنے مسائل کا حل حاصل کیا

کرتی ہے۔ مختلف مادی لذات سے پرہیز انسان کو ضبط نفس، اصلاح اور شخصیت سازی کی طرہ مل کر رہا ہے۔ مادی دنیا سے نکال کر فضا
صدق و صفائی سیر کر رہا ہے اور وہ لوگ جو عام حالات میں مڑ مڑا کر امتیازات، مراتب اور فخر و ناز کے سنگین بوجھ تلے دبے ہوئے ہوتے ہیں
اچانک اپنے آپ کو ہلکا پڑھ سکوں اور اسودہ خاطر محسوس کرنے لگتے ہیں۔

اس کے بعد حج کے دیگر مناسک انسان کے روحانی تعلقات بڑھاتے ہیں، انسان کا اللہ کے ساتھ تعلق لمحہ بہ لمحہ مستحکم ہوتا
ہیں اور اسے اس کے نزدیک تر لگتے جاتے ہیں۔ انسان کو آلودہ اور تاریک ماضی کی آغوش گہرائیوں سے نکال کر چکا چوند مستقبل کی
چوٹیوں پر لاکھڑا کرتے ہیں۔

قابل توجہ یہ ہے کہ مناسک حج علی الخصوص قدم قدم پر بت شکن ابراہیم، اسماعیل اور حضرت ہاجرہ کے نظریات، کردار اور راہ خدا
قریبوں کو حجاج کے اذہان پر نقش کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح منکر خطر مومن اور خانہ کعبہ، مسجد حرام اور طواف مشرف و خصوصاً رسول اکرم اور صدیق
کے مسلمانوں کی یاد دلاتے ہیں۔ جس سے اخلاقی انقلاب حجاج کے اذہان پر زیادہ گہرا ہو جاتا ہے۔ علاوہ ان کے ہر حاجی سرزمین منکحہ صبر
الحرام میں گویا حضرت رسول اکرم، حضرت امیر المؤمنین اور دیگر صحابہ کرام کی زیارت سے مشرف ہوتا ہے، ان کی رجز خوانی اور قتال کرتے ہوئے
توارد کی جھکاؤں کو مستحضر ہے۔ بے شک تمام مناسک حج اس طرح سے آپس میں مسلسل اور منظم ہیں کہ مائل ذہن کے دلوں کو مکمل طور پر
محافظ سے اس طرح متغیر کرتے ہیں۔ کہ الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ واقعی حاجی کی کتاب زندگی میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوتا
ہے۔ بحار الانوار کی جلد نمبر ۱۰ صفحہ نمبر ۱ پر جو روایت درج ہے، اس قدر قرین حقیقت ہے۔

يخرج من ذنوبه كهيئتہ يوم ولدته امه !

حاجی حج کے بعد اپنے گناہوں سے پورے بری ہو جاتا ہے، گویا وہ نومولود محسوس ہوتا ہے۔

واقعی حج انسان کے لیے تولد ثانی ہے، ایسی پیدائش جو ایک نئی زندگی سے لپٹے ہوئے ہو۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ مذکورہ بالا
فیوض و برکات اور وہ جو بعد میں ذکر ہوں گے، ان افراد کے لیے نہیں ہیں جو مناسک حج کے ظواہر تک محدود رہتے ہیں اور اس کے
گوہر نایاب کو گنوا جھٹکتے ہیں اور نہ ہی ان لوگوں کے لیے جو حج کو سیاحت اور تفریح یا مادی وسائل کے حصول کا ذریعہ سمجھتے ہیں، ان کے
چھتے دہی کچھ آتا ہے جو کچھ وہ پالتے ہیں۔

۱۱۔ حج کا سیاسی پہلو
ایک عظیم فقیہ کے بقول یا جو اس کے کہ مناسک حج خالص اور عین ترین عبادت کا مجموعہ ہیں مگر
اس کے ساتھ ساتھ اسلام کے سیاسی مقاصد کے حصول اور پیش رفت کا موثر ذریعہ بھی ہیں۔

کی طرف توجہ کے لحاظ سے عبادت اور مخلوق خدا کے حقوق کے تحفظ کے لحاظ سے سیاست مناسک حج میں یہ دونوں پہلو آپس میں
طرح سے مربوط و منسلک ہیں، گویا ایک کپڑے کا تانا بانا ہوں، حج مسلمانوں کی منتشر صفوں کو تنظیم کرنے کا مسلمانوں میں نسلی امتیاز
عصبیت اور قومی تفاخر کے خاتمے کا بہترین عامل ہونے کے ساتھ ساتھ دشمنوں سے مقابلے کا بھی بہترین ذریعہ ہے۔ حج، انہماک
خیال پر سفر استبدادی نظام اور گھٹن خوف اور دباؤ کے خاتمے کا بھی بڑا موثر ذریعہ ہے، مسلمان ممالک کے صحیح حالات ایک
دوسرے تک پہنچنے کا ذریعہ بھی ہے۔ غرضیکہ حج استحصال طاقتوں کی چیرہ دستیوں سے آزادی اور استعماری زنجیروں کو توڑنے کا بہترین
عامل ہے۔

کرتے تھے۔

نیز حج کے اجتماع کو مسلمانوں کے عظیم ثقافتی سیمینار میں بھی تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ عالم اسلام کے تمام علماء جو مکہ میں موجود ہوں دوسرے کے سامنے اپنے خیالات تجربات اور تجاویز پیش کر سکتے ہیں۔

مسلمانوں کی بڑی بڑی پیمائشیں یہ کہ مسلمانوں کی جغرافیائی سرحدیں ان کو ثقافتی طور پر محدود کر دیتی ہیں اور ہر ملک کے مسلمان صرف اپنے ہی ملک میں سوچ بچار کرتے نظر آتے ہیں۔ ایسے میں دوسری اسلامی معاشرہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر تقریباً ناپید ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں حج بے شک اس پیمائش کی ناکامی رات میں خوش نصیبی کا مہر و درخشاں ہے، مذکورہ بالا روایت کے اگلے حصے میں امام صادقؑ نے کیا عمدہ بات فرمائی ہے

ولو كان كل قوم امتايت كلهم على بلادهم وما فيها ملوكوا، وخربت البلاد، ومقطعت الجلب والارباح وعميت الاخبار۔

اگر ہر قوم اپنے ہی ملک اور شہر کی بات کرے اور صرف اپنے مسائل پر سوچ بچار کرے تو سب کے سب برباد ہو جائیں گے۔ ان کے ملک تباہ و برباد ہوں گے، ان کے مفادات تباہ ہوں گے اور حقائق پس پردہ چلے جائیں گے۔

۱۷۔ حج کا اقتصادی پہلو

حقیقت، لوگوں کے خیال کے بالکل برعکس ہے، یعنی یہ کہ حج کے اجتماع کو اسلامی ممالک کی اقتصادی بنیادوں کو مضبوط بنانے کے لیے استعمال کرنا نہ صرف حج کی روح کے منافی نہیں ہے۔ بلکہ روایات کی روشنی میں فلسفہ حج کا ایک پہلو یہ بھی ہے۔

اگر تمام مسلمان اس کثیر اجتماع میں اسلامی ممالک کی مشترکہ تجارتی منڈی کی بنیاد رکھیں، ایک دوسرے کی ضرورت کو پورا کریں۔ منافع و دشمنوں کی جیب میں جائے اور دنیا اقتصادیات کو دشمنوں کا فیصلی بنائیں تو یہ دنیا پرستی نہیں ہے۔ بلکہ مین خدا پرستی ہے اور اس کی راہ میں جہاد ہے۔ چنانچہ مندرجہ بالا روایت میں امام صادقؑ فلسفہ حج کے ضمن میں ہشامؓ سے کھول کر بیان فرما رہے ہیں کہ حج کے مقاصد میں سے ایک مقصد مسلمانوں کی باہمی تجارت کو فروغ دینا اور اقتصادی روابط کو آسان بنانا ہے۔

سورۃ بقرہ کی آیت ۱۹۸۔

ليس عليكم جناح ان تتنقوا فضلا من ربحكم

کی تفسیر کے ذیل میں امام صادقؑ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں تتنقوا فضلا سے مراد کسب معاش ہے، فرمایا

فاذا احل الرجل من احرامه وقضى فليست ترابيع في الموسم۔

جب حاجی احرام اتار دے، مٹا سکے حج کا وقت ختم ہو جائے تو خرید و فروخت کو رے سلہ

(یہ کام نہ صرف یہ کہ گناہ نہیں ہے، بلکہ ثواب کا بھی مال ہے)۔

امام علی بن موسیٰ رضاؑ سے بھی اس طرح کی ایک روایت مروی ہے، جس کے آخر میں آپ فرماتے ہیں۔

ليشهدوا منافع لهم

تاکہ اپنا نفع حاصل کریں۔

لفظ "منافع" بہت بلیغ اشارہ کر رہا ہے اور مادی و معنوی مفادات پر محیط ہے۔

مختصر یہ کہ اگر یہ عبادت صحیح اور مکمل طور پر بحال لائی جائے اور اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جائے، عائد خدا کے زائرین مقدس سرزمین میں قیام کے دوران حج کے فرائض حاصل کرنے کے لیے ذہنی طور پر آمادہ ہوں اور پوری طرح سرگرم بھی رہیں، اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے سیاسی، ثقافتی اور اقتصادی مسائل پر باہمی صلاح مشورے کریں تو مٹا سکے حج پر سب سے مکمل پیش کرنے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں اور شاید اسی نکتے کو امام صادقؑ نے اسی طرح فرمایا ہے۔

لا يزال الذين قاضوا ما قامت الحجة

یعنی جب تک کعبہ رہے گا دین رہے گا۔

جناب امیر المومنینؑ فرماتے ہیں۔

اللہ فی بیت ربکم لاتخلوہ ما بقیتہ فانتہ ان تزلزلتمنا ظروا۔

خدا اپنے رب کے گھر کے بارے میں اس کے احکامات کی تعمیل کر دے اور اسے ہرگز خالی نہ چھوڑے اور نہ اللہ کی طرف سے بالکل مہلت نہ دی جائے گی۔

۱۸۔ اس زمانے میں قربانی کے گوشت سے متعلق ذمہ داریاں

زیر بحث آیت سے پوری طرح واضح ہو رہا ہے، کہ قربانی کے معنوی اور روحانی پہلوؤں اور حصول تقرب کا گواہ الہی کے علاوہ اور مٹا صدیقی ہیں، وہ یہ کہ اس گوشت کا مناسب مصرف کیا جائے، قربانی دینے والا خود بھی کھائے، مساکین و غریبوں کو تقسیم کرے، یا بیخوشاں، اسراف و فساد غریبی کی ہی اسلام میں بڑی واضح ممانعت ہے۔ یہ کوئی پوشیدہ بات نہیں ہے بلکہ قرآن و سنت اور فہم عام سے یہ بات ثابت ہے۔

مندرجہ بالا بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مسلمانوں کو اس بات کی قطعاً اجازت نہیں ہے کہ قربانی کے کثیر گوشت کو "مٹی" میں اُدھر پھینک کر فساد کو مقرر بنائیں یا "مٹی" میں دفن کر دیں، مٹا ملک حج میں قربانی کا واجب ہو نہ صرف ان دو کاموں کے لیے ناقابل فہم ہے۔ اگر خود وہ افراد وہاں موجود نہیں ہیں تو ضروری ہے کہ دنیا کے دوسرے حصوں میں جہاں بھی ضرورت مند ہوں اس گوشت کو ان تک پہنچایا جائے۔ (قابل غور ہے)

مگر انہیں آج مسلمان قربانی دینے کے حکم کی تعمیل تو کرتے ہیں مگر گوشت کی تقسیم کو بھلائے ہوئے ہیں۔ ہر سال لاکھوں جانوروں کا گوشت جو ضرورت مندوں کی کثیر تعداد کی ایک طویل مدت تک ضرورت پوری کر سکتا ہے، اس مقدس سرزمین پر بیت ناپسندیدہ اور

ملک بحار لاوارج فیہ

ملک و ممالک الشیعہ حج نبشر ملک

ملک الحج البلاغہ، جناب امیر کے خطوط، وصیت فیہ

لہ تفسیر عباسی بمطابق المیزان ج نمبر ۲ ص ۱۰۰

مکروہ حالت میں تلف ہو جاتا ہے، مسلمانوں کے بہت سے علماء دانش مندوں اور مفکرین نے سعودی حکومت سے بار بار گفتگو کی ہے۔ یہاں تک کہ رضا کارانہ طور پر گوشت کے حمل و نقل کے اخراجات برداشت کرنے کی پیشکش بھی ہیں۔ مگر ایک طرف وہ اپنی عمار کا موجود اور بے حسی اور دوسری طرف سعودی حکومت کے کارپروائزوں کی لاپرواہی اور بے حس اس کا ذخیرہ کی راہ میں سنگ گراں بنی ہوئی ہے۔

اسراف و فضول خرچی کی حرمت اور کفران نعمت جو ایک مسئلہ مسئلہ ہے سے قطع نظر حد قربان کے دن مٹی میں قسریات کیفیت و ماحول اس قدر مختصر و غیر مطلوب ہوتا ہے کہ کمزور ایمان کے مسلمان اس رکن کے وجوب کے بارے میں ہی شک لگتے ہیں۔ مزید برآں دشمنوں کو مخالفت کے لیے ایک موثر حربہ ہاتھ لگتا ہے۔ وہ اس کیفیت کو وہاں کے علماء اور متقلین کی فکری سمجھنے کی بجائے اسلام میں میں بدینہ نکالنے بیٹھ جاتے ہیں۔ لہذا دنیا کے تمام تر مسلمان ممالک کے عوام پر لازم ہے کہ اسلام کے تحفظ اور مناسک حج کی صحیح تصویر کو نمایاں کرنے کے لیے سعودی حکومت پر دباؤ ڈالیں کہ ذلت آمیز ماحول کو ختم کر کے احکامات اسلام کا نفاذ کریں۔ البتہ بعض روایات جن کے مطابق قربانی کا گوشت مٹی یا حرم مکتہ سے باہر لے جانا منوع ہے، ان کا اس زمانے اور حالات سے ہے۔ جب اس گوشت کے ضرورت مند اس علاقے میں موجود ہوتے تھے اور گوشت کی مقدار اپنی کے لیے کافی تھی، چنانچہ معتبر ذرائع سے حاصل ہونے والی یہ روایت اس مسئلے پر یوں روشنی ڈالتی ہے۔ امام صادق کے ایک صحابی نے قربانی کے گوشت کو مٹی سے باہر لے جانے کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے فرمایا:

كُنَّا نَقُولُ لَا يَجُزُّ مِنْهَا بَشِيءٌ لِحَاجَةِ النَّاسِ إِلَيْهِ، فَمَا الْيَوْمَ فَقَدْ كَثُرَ النَّاسُ فَلَا بَأْسَ بِأَخْرَاجِهِ

کبھی ہم کہا کرتے تھے کہ اس میں سے کچھ بھی باہر نہ لے جائیں، کیونکہ لوگ ضرورت مند تھے۔ اب جبکہ حجاج کی تعداد زیادہ ہو گئی ہے۔ قربانی کے گوشت کی مقدار بھی بڑھ گئی ہے۔ لہذا اسے باہر لے جانے میں کوئی حرج نہیں۔

ثُمَّ لِيَقْضُوا تَفَثَهُمْ وَلِيُوفُوا بَذَوْرِهِمْ وَلِيُطَوِّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ ۝

ذَلِكَ وَمَنْ يُعْظَمْ حُرْمَتِ اللَّهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَهُ عِنْدَ رَبِّهِ وَأُحِلَّتْ لَكُمْ الْاَنْعَامُ إِلَّا مَا يَتْلَىٰ عَلَيْكُمْ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّورِ

ترجمہ

۳۹۔ اس کے بعد اپنی میل کچیل کو دور کریں۔ منتیں اتاریں اور قابل احترام خانہ کعبہ کا طواف کریں۔

۳۰۔ حج کے مناسک یہی ہیں اور جو اللہ کے قوانین کا احترام کرے اللہ کے ہاں اس کی بہتر جزا ہے اور تمہارے لیے چوپائے حلال کئے گئے ہیں۔ سوائے ان کے جو تمہیں بتا دیئے گئے ہیں۔ گندگی (یعنی بتوں) سے اجتناب کرو اور باطل و بے ہودہ باتوں سے بچو۔

تفسیر

مناسک حج کا ایک اور اہم حصہ

مناسک حج کے متعلق مندرجہ بالا بحث کے بعد زیر نظر آیت میں انہی کے ایک اور حصے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا جا رہا ہے۔ اس کے بعد اپنی گندگی اور نااتوا جزاء کو اپنے آپ سے دور کریں (ثُمَّ لِيَقْضُوا تَشْتَهُ) اور اپنی تدبیر پوری کریں۔ (وَلِيُقْنِطُوا لَذَوْرِهِمْ) اور مرد و زمانہ کی دست برد سے محفوظ گھر کا طواف کریں۔ (وَلِيَطُوفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ)۔

اکثر اہل زبان اور مشور مفسرین کے بقول "تشتہ" کا مطلب میل کچیل کثافت اور غیر ضروری اعضاء بدن جیسے ناخن، اور غیر ضروری بال ہیں۔ بعض کے مطابق اصل میں ناخن کے نیچے میل کچیل اور اس قسم کی چیزوں کے لیے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔

کئی دوسرے ماہرین لسانیات کے مطابق یہ لفظ سرے سے عربی زبان میں موجود ہی نہیں ہے۔ لیکن مفردات راغب کے مطابق ایک صحرائی عرب نے اپنے اس ساتھی سے جو میل کچیل اور گندگی سے اٹا ہوا تھا، کہا "ما اتفشتك وادرنك" تو کس قدر گندا اور غلیظ ہے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عربی زبان میں یہ لفظ موجود ہے۔

روایات میں بھی بار بار اس جملے کا مفہوم ناخن کا ثنا، بدن صاف کرنا اور احرام اتارنا بیان کیا گیا ہے۔ بالفاظ دیگر یہ جملہ "تقصیر" کے عمل کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ جو مناسک حج میں سے ہے۔ اس طرح بعض روایات میں "سر منڈوانے کے لیے بھی یہ جملہ استعمال کیا گیا ہے اور وہ بھی "تقصیر" کا حصہ ہے۔

کنز العمال میں اس آیت کی تفسیر میں ابن عباس سے ایک قول نقل کیا گیا ہے کہ اس جملے سے مراد آ مناسک حج کو انجام دینا ہے۔ لیکن اس قول کی کوئی دلیل ہماری نظر میں نہیں ہے۔

ایک لائق توجہ روایت ہے کہ امام صادقؑ نے "ثُمَّ لِيَقْضُوا تَشْتَهُ" کی تفسیر اپنے زمانے کے اہل علم سے ملاقات کرنے سے کی ہے اور جب راوی نے وضاحت چاہی اور عرض کیا کہ لوگ تو اس سے مراد ناخن کا ثنا اور غلاظت کو دور کرنا لیتے ہیں۔ تو آپ نے فرمایا۔ "قرآن مجید ظاہر و باطن رکھتا ہے"۔ یعنی امام سے ملاقات کا تعلق

آیت کے باطنی معنی میں سے ہے۔

جو کہتا ہے اس حدیث میں یہ نکتہ پنہاں ہو کہ خانہ خدا کا نذر مناسک حج ادا کرنے کے بعد جس طرح گندگی اور غلاظت کو اپنے بدن سے دور کرتا ہے۔ اسی طرح اپنے زمانے کے امام سے ملاقات کے بعد روحانی غلاظتوں سے پاک ہو جاتا ہے علی الخصوص جن ادوار میں ظالم اور جابر بادشاہ عام حالات میں مسلمانوں کو ائمہ اہل ہمارے ملاقات کی اجازت نہیں دیتے تھے مناسک حج اس سعادت کا بہترین موقع ہوا کرتا تھا۔

اسی مضمون کی ایک اور حدیث حضرت امام باقرؑ سے مروی ہے۔ آپ نے فرمایا

تصامم الحج لقاء الامام

حج کی تکمیل اپنے امام سے ملاقات پر ہوتی ہے۔

حقیقت بھی یہی ہے کہ مناسک حج اور ملاقات امامؑ دونوں ہی ذریعہ تطہیر ہیں۔ ایک ظاہری غلاظت و کثافت کی تطہیر کا اور دوسرا باطنی جمالت و اخلاقی اخطاؤں کی تطہیر کا۔

وہ کیا منقش آثار نے کامسکہ تو اس سے مراد ہے کہ صدر اسلام میں بعض مسلمان منت مان لیتے تھے کہ اگر انہیں حج کرنے کی سعادت نصیب ہوئی تو مناسک حج کے علاوہ امور خیر صدقات اور قربانی بجالائیں گے۔ بسا اوقات اپنی مراد پانے کے بعد منت اتارنا بھول جاتے تھے۔ اس لیے قرآن مجید میں منت اتارنے کی تاکید آئی ہے۔

خانہ کعبہ کو "بیت العتیق" کہا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عتیق "لفظ عتیق" سے مشتق ہے اور اس کا معنی قید و بند سے آزاد ہونا ہے۔ احتمال یہ ہے کہ چونکہ خانہ کعبہ "انسان کی قید و بند سے آزاد رہے اور کسی زمانے میں بھی اندر کے علاوہ کسی کی ملکیت نہیں رہا۔ حتیٰ کہ برابر جیسے جابر و اور سرکشوں کے تسلط اور غلبے سے بھی آزاد رہا۔ اس لیے اسے بیت العتیق" کہا گیا ہے۔

عتیق کا ایک اور معنی بیش بہا اور قابل قدر بھی ہے۔ یہ معنی بھی خانہ کعبہ کے لیے بالکل درست ہے۔ "عتیق" کا ایک اور مطلب "قدیم بھی ہے۔ جیسے مفردات راغب میں ہے۔

العتیق المتقدم الزمان والمكان والزمنة

عتیق، وہ چیز ہے جو زمان و مکان اور رتبے کے لحاظ سے اولیٰ ہو۔

اولیت کا معنی بھی خانہ کعبہ پر بھی منطبق ہوتا ہے۔ کیونکہ سورہ اہل عمران آیت ۹۶ میں ہے۔

لے تفسیر تراشعین ج ۳ ص ۲۹

لے وسائل الشیعہ ج ۱۰ ص ۲۵۵ الباب المزیل باب تبصر حدیث نبویؐ۔

لے بعض مفسرین نے "نذر" سے خود مناسک حج مراد لیا ہے۔ لیکن مزاج قرآن کے مطابق لفظ "نذر" "منت" ہی کے لیے آیا ہے۔ اس لیے اس کا مناسک حج کا معنی ظاہر آیت کے خلاف ہے۔

لے کنز العمال، تفسیر مجمع البیان اور دوسری تفاسیر نیز قاموس اللغة اور مفردات راغب۔

لے کنز العمال ج ۱ ص ۱۰

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى لِلْعَالَمِينَ
دنیا میں سب سے پہلا مبارک اور ہدایت کن گناہ توحید وہ گھر ہے جو مکہ میں ہے۔

بہر حال کوئی حرج نہیں، اگر یہ لفظ اپنے تمام معانی کے ساتھ خانہ کعبہ کی تمام خصوصیات کی وجہ سے اس کے لیے استعمال کیا جائے۔ اگرچہ مفسرین میں سے ہر ایک نے ان میں سے بعض معانی کی طرف اشارہ کیا ہے یا مختلف روایات میں سے ہر ایک روایت میں کسی ایک معنی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

آیت کے آخری حصے میں "طواف" کا ذکر کیا گیا ہے۔ مفسرین کے درمیان اختلاف ہے کہ اس سے مراد کون سا طواف ہے (چونکہ میں قربانی کے بعد حجاج کرام دو طواف بجالاتے ہیں، پہلے کو "طواف زیارت" اور دوسرے کو طواف نسا کہا جاتا ہے) بعض فقہاء اور مفسرین کا خیال ہے کہ چونکہ آیت میں لفظ طواف بلا قید اور غیر مشروط ہے۔ لہذا اس کا مفہوم عام ہے۔ یعنی اس لفظ سے سبھی طواف مراد لینے جاسکتے ہیں۔ طواف زیارت، طواف نسا، حتیٰ کہ طواف عمرہ بھی اس میں شامل ہے۔ یہ بعض دوسرے مفسرین کا خیال ہے کہ اس سے مراد صرف طواف زیارت ہے جو کہ احرام کھولنے کے بعد واجب ہوتا ہے۔ اس ضمن میں جو روایات آمد اہل بیت سے ہم تک پہنچی ہیں۔ ان کے مطابق اس سے مراد "طواف نسا" ہے۔ چنانچہ امام صادق فرماتے ہیں۔

ولیسوفوا نذوہہم ویطوفونوا بالبیت العتیق میں طواف سے مراد طواف نسا ہے۔
امام رضاؑ کے بھی یہی معنی مروی ہیں۔

یہ وہی طواف ہے جسے اہل سنت "طواف دواح" کہتے ہیں۔

بہر حال مندرجہ بالا احادیث کے پیش نظر آخری تفسیر زیادہ قوی دکھائی دیتی ہے۔ علی الخصوص اس کا امکان ہے کہ شفع "لیقتضوا تقشہم" کے جملے سے بدن کو غلافت سے پاک کرنے کے بعد پاکیزگی کی تکمیل کے لیے مہتر کرنا بھی مراد ہو۔ یہ بھی مسلمہ امر ہے کہ حج کے سلسلے میں مہتر صرف اس وقت ہوا جاسکتا ہے۔ جب حاجی طواف دوسی زیارت سے فارغ ہو چکا ہو لہذا اس صورت میں "طواف نسا" کے سوا اور کوئی طواف حاجی کے ذمے نہیں ہوتا۔ دغور کیجیے گا۔

گذشتہ آیتوں کی بتوں کو سمیٹتے ہوئے بعد والی آیت میں کہا جا رہا ہے۔ مناسک حج کی تفصیلات یہی ہیں۔

(ذٰلِکَ) ۱۷

اس کے بعد مذکورہ فرائض اور ذمہ داریوں کی تاکید مزید کے طور پر بیان کیا جا رہا ہے۔ "جو شخص اللہ کے لاکھ عمل کا احرام

لے کنز العرفان ج ۱ ص ۲۴۱

۱۷ تفسیر مجمع البیان میں یہ مفسرین کا نام لیے بغیر درج کیا گیا ہے۔

۱۸ رسائل اشعریہ ۹ ص ۲۱۱ ابواب الطواف باب ہفتم

۱۹ اس لفظ کے تحت ایک پورا غلط محذوف ہے وہ یہ ہے۔ کذا اللہ امر الحج والمناسک۔

رے اور اس کو اہم جانے اس کے لیے اللہ کے اہل بہتر جزا ہو رہے (ومن یعظم حرمان اللہ فہو خیر لہ) ہند رہا ہے۔

واضح سی بات کہ "حرمان" سے مراد مناسک حج ہیں۔ ہو سکتا ہے، خصوصی طور پر خانہ کعبہ اور عمومی طور پر حرم مکہ کا احترام و تحکیم بھی اس میں شامل ہو۔ لہذا خاص طور پر تمام اداہم لوہی کو اس میں شامل کر لینا ظاہر آیت کے خلاف ہے "حرمان" جمع ہے "حرمت" کی اور لفظ "حرمت" اس چیز کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، جس کا احترام ملحوظ خاطر رہنا چاہیے اور اس کی بے حرمتی نہیں ہونی چاہیے۔

اس کے بعد احکام احرام کی مناسبت سے چوپاؤں کے حلال ہونے کا ذکر کیا گیا ہے۔ چوپاؤں سے دھڑ بھری، گامے بھینس اور اونٹ وغیرہ) تھارے لیے حلال ہیں۔ سوائے اُن کے جو بعد ازاں بتائے جائیں گے۔ اور ان کی مانعت کا حکم دیا جائے گا۔ (واحتلت لکم الانعام الا ما تیل علیکم)۔ اس آیت کا آخری حصہ (الا ما تیل علیکم) حالت احرام میں شکار کی حرمت کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ سورہ مائدہ آیت ۹۵ میں فرمایا گیا ہے۔

یا ایہا الذین امنوا لا تقتلوا الصيد وانتم حرم

اے مساجد ایمان! مالیت احرام میں شکار نہ کرو۔

سورہ مائدہ، سورہ حج کے بعد نازل ہوئی ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ یہ حرمت، زیر بحث آیت کے اُس جملے کی طرف اشارہ ہو جو بتوں کے لیے کی جانے والی قربانیوں کی حرمت کے بارے میں آیا ہے۔ کیونکہ یہ مسلم ہے کہ جانور کا حلال ہونا، صرف اس صورت میں ہے کہ ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لیا جائے نہ کہ بتوں یا کسی اور کا۔

آیت کے آخر میں، مناسک حج کے ذیل میں اور زمانہ جاہلیت کے طور طریقوں کے خلاف دو مزید حکم دیے جا رہے ہیں بتوں کی غلافت و گندگی سے اجتناب کرو (فاجتنبوا الرجس من الاوثان)۔

اوثان جمع وثن (دروازن کفن) ہے، اس سے مراد وہ چہرے ہیں، جو مجود کے طور پر رکھے جاتے تھے یہاں لفظ "اوثان" "رجس" کی وضاحت کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ جو اس سے پہلے ہے یعنی آیت کا جملہ کچھ یوں ہے۔ گندگی اور غلافت سے اجتناب کرو۔ بعد میں کہا جاتا ہے گویا کہ پلیسنگ دی بُت ہیں۔ توجہ طلب نکتہ یہ ہے کہ اسلام سے پہلے بت پرست، قربانی کرنے کے بعد، قربانی کا خون بتوں کے سر دل اور چہروں پر مل دیتے تھے۔ اس طرح بڑی کریمہ المنظر کیفیت پیدا ہو جاتی تھی، ممکن ہے، زیر بحث آیت میں اسی طرف اشارہ ہو۔

"اور بے ہودہ گفتگو سے اجتناب کرو" (واجتنبوا قول الزور)۔

نکتہ

”قول الزور“ کیا ہے؟

بعض مفسرین کے مطابق ”قول الزور“ سے مراد قبل از اسلام حج کے دوران مشرکین کا تلبیہ ہے انہوں نے توحید کے آئینہ دار تلبیہ کو مسج کر کے رکھ دیا تھا۔ چنانچہ تلبیہ مشرکانہ روشوں میں سب سے زیادہ تکلیف دہ تھا۔ وہ اس طرح تلبیہ کہتے تھے۔

لَبَيْكَ لَا شَرِيكَ لَكَ إِلَّا شَرِيكَاهُ وَلَكَ تَعْلُكُهُ وَمَا مَلَكَ

”ہم نے تیسری دعوت کو قبول کیا اور ہم تیری بارگاہ میں حاضر ہوئے۔ اے وہ خدا جس کا سوائے اس مخصوص شریک کے کوئی شریک نہیں تو بھی اس کا سب اور اس کی ہر شے کا مالک بھی تو ہی ہے۔“

یہ جملہ بات شک شبہ خرافات سے زیادہ کچھ بھی نہیں ہے اور قول الزور کا صحیح معنی یہ ہے جس کا مطلب، جھوٹ، باطل اور نامناسب کلام ہوتا ہے۔

اس صورت میں اگر کہا جائے کہ یہ آیت مشرکین مکہ کے حج کے طور طریقے سے متعلق ہے تو یہ آیت کے کلی مفہوم سے مانع نہیں ہے اور ہر قسم اور ہر طرح کے بت سے پرہیز اور ہر لغو اور بے ہودہ بات سے اجتناب کا حکم اس میں شامل رہتا ہے۔ بعض روایات میں ”اذنان“ سے شطرنج جو جوئے کی ایک قسم ہے، اسرا دیا گیا ہے اور قول الزور سے عذاب اور جہنمی گواہی مراد ہے۔ دراصل یہ سب ایک کل کے مختلف اجزاء ہیں۔ اور زیر بحث آیت ان سب پر محیط ہے۔ نہ یہ کہ کسی ایک معنی میں منحصر ہے۔

اسلام کے قابل احترام پیغمبر سے ایک روایت مروی ہے کہ ایک دفعہ آپ نے موعظہ کے دوران فرمایا۔

”ایہا الناس عدلت شہادۃ الزور بالشِّرک باللہ“

اے لوگو! جھوٹی گواہی دینا اللہ کے ساتھ کسی کو شریک قرار دینے کے مترادف ہے

پھر آپ نے یہی آیت ”فاجتنبوا الرجس من الاوثان واجتنبوا قول الزور کی تلاوت فرمائی۔

یہ حدیث بھی زیر بحث آیت کی وسعت پر دلالت کرتی ہے۔

۳۱۔ حُنَفَاءَ لِلَّهِ غَيْرِ مُشْرِكِينَ بِهِ وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَكَأَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَاءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ أَوْ تَهْوِي بِهِ الرِّيحُ فِي مَكَانٍ سَحِيقٍ ۝

۳۲۔ ذَلِكَ وَمَنْ يُعْظَمْ شَعَائِرَ اللَّهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوبِ ۝

۳۳۔ لَكُمْ فِيهَا مَنَافِعُ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ مَحِلُّهَا إِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيقِ ۝

ترجمہ

۳۱۔ (مناسک حج بجالاؤ) اس طرح کہ صرف اللہ ہی کے لیے خالص رہو۔

کسی کو اس کا شریک قرار نہ دو اور جو اللہ سے شرک کرے گا، گویا کہ آسمان سے گرتے ہوئے پرندے اُسے (فضا میں) اُچک لیتے ہیں یا آندھی کے جھکڑ اُسے دور واز اڑا لے جاتے ہیں

۳۲ (مناسک حج اسی طرح ہیں) اور جو شعائر اللہ کا احترام کرے تو یہ عمل تقویٰ کے جھکڑ اُسے دور واز اڑا لے جاتے ہیں

۳۳۔ ایک خاص وقت (ان کے ذبح ہونے کے دن) تک قربانی کے جانوروں

میں تمہارے لیے فائدے ہیں۔ پھر محترم اور قدیمی خانہ کعبہ ان کی جگہ ہے
(عمرہ مفردہ کی صورت میں قربانی کی جگہ خود مکہ ہے، جب کہ حج کی صورت میں
منیٰ ہے جو مکہ کے نواح میں واقع ہے۔)

تفسیر

شعائر اللہ کی تعظیم علامت تقوا ہے

گذشتہ آیت کے آخر میں توحید اور جملہ بتوں اور ہر قسم کی بت پرستی سے اجتناب کی تاکید پر بحث ہو رہی تھی۔ یہ
آیت بھی اسی بحث کے ذیل میں بیان کر رہی ہے۔ مناسک حج اور تکبیر غاصتا لہذا اور کسی طرح بھی اس میں شرک
کا گزرنہ ہو (حنفاء باللہ غیر مشرکین بہ) لہ

”حنفاء“ ”حنیف“ کی جمع ہے۔ جس سے مراد وہ شخص ہے، جو گمراہی اور افراط و تفریط سے ہٹ کر راہ راست
اور میانہ روی کی طرف میلان رکھتا ہو۔ بالفاظ دیگر غلط راستے سے ہٹ کر صراطِ مستقیم پر قدم رکھے۔ کیونکہ ”حنف“ (دردن
”صدف“) جھکاؤ اور میلان کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اہر قمر کی گمراہی سے منہ موڑ کر دوسری جانب جھکنے ہی کا نتیجہ
صراطِ مستقیم پر گامزن ہونا ہے۔

اس طرح سے یہ آیت اخلاص اور ارادہ قربت خدا کو حج اور دیگر عبادات میں اصل محرک کے طور پر پیش کر رہی ہے۔ حقیقت
بھی یہی ہے کہ عبادت کی روح اخلاص ہے اور اخلاص یہ ہے کہ کسی قسم کا شرک اور غیر قدسی عنصر اس میں کارفرمانہ ہو۔ امام باقر
علیہ السلام سے ایک حدیث مروی ہے کہ آپ سے ”حنیف“ کی تشریح کے لیے سوال کیا گیا تو آپ نے جواب میں فرمایا
ہی الفطرۃ التي فطر اللہ علیہا لا تبدل لخلق اللہ قال۔

فطرہم اللہ علی العرفۃ

حنیف اس فطرت کا نام ہے، جس پر اللہ نے لوگوں کو پیدا کیا، اللہ کی پیدا کردہ فطرت میں کبھی تغیر و تبدل
نہیں ہوا کرتا۔ اس کے بعد فرمایا اللہ تعالیٰ نے توحید کو انسانی سرشت میں قرار دیا ہے۔
زیر بحث آیت کی جو تفسیر مندرجہ بالا روایت میں آئی ہے وہ غلوں کی حقیقی بنیاد کی طرف اشارہ ہے۔ فطرتِ توحید

لہ ”حنفاء“ اور غیر مشرکین دونوں حال ہیں اور گذشتہ آیت کے اخلاص ”فاجتنبوا“ اور اجتناب سے متعلق ہیں۔
لہ تفسیر مانی بوالہ توحید صدوق۔

قصد قربت اور تحریک کا منبع ہے۔

اس کے بعد مشرکین، ان کے زوال، بدعتی اور بتا ہی کی حقیقت کی تصویر کشی کی گئی ہے؛
جو شخص اللہ کے ساتھ کسی کو شریک قرار دے، اس کی مثال آسمان سے اس گرنے والے کی سی ہے جس پر مردار خوار پرندے چھپتے ہیں اس کے
جسم کا ایک ایک جزو کسی نہ کسی مردار خوار پرندے کی چوکی میں ہوتا ہے، اور یا اگر ان کی گرفت سے بچ نکلے تو آندھیاں اس کے جسم کے اعضاء
چاروں طرف پھیر دیتی ہیں (ومن یشربک باللہ فکان شرا من السماء فتخطفه

الطیر او تھوی بہ السیح فی مکان سحیق) لہ

دراصل اس آیت میں آسمان کو توحید کے لیے کینائے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے اور شرک کو آسمان سے گرنے
سے تشبیہ دی گئی ہے۔ یہ فطری حقیقت ہے کہ آسمان پر سورج اور چاند روشنی پھیلاتے ہیں۔ اور ستارے چمکتے ہیں
نوشا بحال وہ جو اس آسمان پر اگر کسی طرح نمایاں نہیں ہو سکتا تو کم از کم ستاروں کی طرح تو چمکتا ہے۔ مگر انسان جب
اس رشت سے گرتا ہے تو وہ دنیا جہنم میں سے ایک اس کا مقدر بن جاتا ہے یا یہ کہ زمین پر پہنچنے سے پہلے ہی مردار خوار پرند
بڑے پرندوں کا ترنوالہ بن جاتا ہے، یعنی اطمینان بخش مرکز سے ہٹ جانے کے بعد خواہشات نفسانی کے اضطراب و
گرداب میں پھنس جاتا ہے اور ہر خواہش نفسانی گویا اس کی زندگی کے ایک ایک گوشے کو ایک لیت ہے اور اسے نتر کر
دیتی ہے اور اگر اس مرحلے سے صحیح سلامت نکل جائے تو تیز و تند آندھیاں اور جھکڑا سہ آیتے ہیں۔ زمین پر ادھر ادھر
اُسے اس طرح پٹختے ہیں کہ اُس کا جسم ٹوٹے ٹوٹے ہو کر فضا میں منتشر ہو جاتا ہے۔ یہ آندھیاں اور جھکڑا دراصل شیطان
کی طرف اشارہ ہے جو تاک لگائے بیٹھا ہے۔ یہ بات مسلم ہے کہ جو شخص بندگی سے پستی کی طرف جاتا ہے، وہ قوتِ فیصلہ
اور قوتِ ارادی سے محروم ہو جاتا ہے اور لمحہ بہ لمحہ بڑھتی ہوئی تیزی کی وجہ سے وہ غیبتی و عدم کی طرف بڑھتا جاتا ہے، حتیٰ کہ بالکل
معدوم و محو ہو جاتا ہے۔

واقعی جو شخص آسمانِ توحید کے مرکز کو کھودے، وہ اپنی تقدیر کی لگام تھامنے کی صلاحیت سے عاری ہو جاتا ہے۔
اور اس سلسلے میں جتنا آگے بڑھتا ہے اس کے تنزل اور زوال میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ تمام انسانی جوہر سے ہاتھ جو
بیٹھا ہے۔

واقعی شرک کے لیے اس سے زیادہ واضح اور منہ بولتی مثال نہیں دی جاسکتی۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ موجودہ دور میں ثابت کیا جا چکا ہے کہ جہاں کششِ ثقل نہ ہو وہاں انسان کا کوئی وزن نہیں ہوتا
اسی لیے خلا باز ایسی فضا میں بے وزنی کی مشق کرتے ہیں، جہاں کششِ ثقل ختم کر دی جاتی ہے۔ وہاں انسان پر جو اضطراب

لہ تختطفہ ”خطف“ ”دردن“ ”عطف“ کے مادہ سے ہے۔ اس کا معنی چھٹ کر پڑنا ہے۔

”سحیق“ ”دردن“ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے ”سحوق“ ”کھجور کے اس درخت کو کہتے ہیں جو بہت اونچا اور اس
کی شاخیں دُور دُور تک پھیلی ہوں۔

بے قراری کی سی کیفیت پیدا ہوتی ہے، بے درزی ہونے کی وجہ سے ہوتی ہے۔ بے شک جو شخص فراز ایمان سے نشیب شرک کی طرف لڑھکتا ہے۔ دراصل اپنے مستقر اور مکن کو کھودینے کی وجہ سے اپنے اندر ایک بے درزی کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتا ہے، جس کے بعد شدید اضطراب اس پر طاری ہو جاتا ہے۔

بعد والی آیت میں مناسک حج اور شعائر اللہ کی تعظیم کی بحث کر سیتے ہوئے کہا جا رہا ہے: بات یوں ہی ہے جیسے بیان کر دیا گیا ہے (ذالک)۔

جو شخص شعائر اللہ کی تعظیم کرے، انہیں برتر جانے اور دین مقدس اسلام کی نشانیوں اور اس کی اطاعت کی علامتوں کا احترام کرے، خود اس کے متقی ہونے کا ثبوت ہے (ومن یعظم شعائر اللہ فانہا من تقوی القلوب)۔

”شعائر“ تشعیر کا جمع ہے جس کا معنی علامت اور نشانی ہے۔ لہذا شعائر اللہ کا مطلب اللہ کی نشانیں ہوا۔ جس میں دین مبین کا مجموعی پروگرام اس کے پیہ پیہ و مانی و اصول و ارکان ہیں کہ جو پہلی ہی نظر میں نمایاں نظر آنے لگیں اسی میں سے ”مناسک حج“ بھی ہیں، جو انسان کو خدا تعالیٰ کی یاد دلا سکتے ہیں۔ اگرچہ مناسک حج بلاشبہ ان شعائر میں سے ایک ہیں، جن کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے۔ عمل مخصوص قربانی کا مسئلہ جو اس سورۃ کی آیت ۲۷ میں پوری وضاحت کے ساتھ انہی شعائر سے ایک جزو کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

لیکن واضح رہے کہ اس میں تمام اسلامی شعائر کا مفہوم پوری شد و مد سے موجود ہے اور کسی طور بھی انہیں صرف مناسک حج یا قربانی کے ساتھ مخصوص کرنے کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے، کیونکہ قربانی کے بارے میں شعائر اللہ کا ذکر لفظ ”من“ کے ساتھ کیا گیا ہے جو اس حقیقت کا واضح ثبوت ہے کہ قربانی ان تمام شعائر میں سے ایک ہے، جن کو شعائر اللہ کہا جاتا ہے اور یہاں لفظ ”من کو“ من تبعیضی“ کہتے ہیں۔ اس طرح سورۃ بقرہ کی آیت نمبر ۱۷۷ میں صفا و مردہ کے بارے میں ہے۔

”ارت الصفا والمروة من شعائر اللہ“

بے شک صفا اور مردہ شعائر اللہ میں سے ہیں۔

مختصر یہ کہ وہ تمام ارکان مقامات اور اشیاء جن کا تعلق دین کے کسی نہ کسی پروگرام سے ہے اور انسان کو اللہ کی یاد دلاتی ہیں اور دین کی عظمت و جہت کا مظہر ہیں وہ سب کی سب شعائر اللہ ہیں اور ان کی تعظیم و تحکیم بابت خود تقویٰ و پرہیزگاری کی علامت ہے۔

ایک اور قابل توجہ بات یہ ہے کہ ان کی تعظیم و تحکیم سے مراد یوں نہیں کہ جیسے بعض ظاہرین مفسرین نے قربانی کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کی بڑائی کا مفہوم اس کا جسمانی طور پر بڑا ہونا ہے۔ بلکہ تعظیم کی حقیقت یہ ہے کہ شعائر اللہ کی حقیقت، مقام اور کیفیت کے بارے میں اپنے افکار و افہام کو اونچا کریں اور اسی مناسبت سے ان کا شایان شان احترام کریں۔ اس عمل کا دل میں پائے جانے والے تقویٰ و پرہیزگاری سے گہرا تعلق ہے اور درحقیقت، تعظیم“ قصہ

ارادہ، کا جزو ہے۔ یوں تو منافق بھی ظاہری اعمال سے تعظیم کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ مگر ان کے اعمال کا حشریمہ دلی تقویٰ و پرہیزگاری نہیں ہوتا۔ اس لیے ان کی قطعی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ حقیقی تعظیم ان افراد ہی کی طرف سے ہے جو صاحبان تقویٰ ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ پرہیزگاری اور احکامات خداوندی کے سلسلے میں جواب دہی کا احساس باطنی امور ہیں اور ان کا مرکز انسان کا دل اور روح ہیں، جہاں سے ہر سارے جسم کی طرف سرایت کرتے ہیں۔ اس بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ شعائر اللہ کی تعظیم و احترام تقویٰ کی ایک علامت ہے۔

تفسیر قرطبی ج ۱، ص ۴۴۸ میں رسول اکرم سے ایک حدیث نقل کی گئی ہے کہ آپ نے اپنے سینہ الجبر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا

”التقویٰ ہهنا“

”تقویٰ کی حقیقت یہاں ہے“

بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں کا ایک گروہ اس طرح کے عقیدے کا حامل ہے کہ قربانی کے ارادے سے لے جانے والے اونٹ یا دو سکر جانور کو اپنے دھن سے میقات اور دہاں سے نکلنے تو اٹھتے سفر میں ذاتی استعمال میں نہیں لانا چاہیے۔ یعنی نہ اس پر سواری کوئی چاہیے۔ نہ اس کا دودھ ذاتی طور پر استعمال کرنا چاہیے۔ وہ مجموعی طور پر اپنے لیے اس کا استعمال ممنوع سمجھتے ہیں۔ قرآن مجید اس فضول اور لاعینی ذہنیت کی نفی کرتا ہے اور یوں کہتا ہے ”ایک مقررہ وقت تک (یعنی ان کے ذبح ہونے تک) قربانی کے جانوروں سے تم فائدے حاصل کر سکتے ہو (لکم فیہا منافع الی اجل مستق)“

ایک اور روایت میں ہے کہ پیغمبر اکرم نے بچتے ہوئے ایک شخص کو دیکھا جو بڑی مشکل سے قدم اٹھا رہا تھا۔ جبکہ ایک اونٹ اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ آپ نے اس سے فرمایا

”ارکبھا“

”اس اونٹ پر سوار ہو جا“

اس نے عرض کیا۔

لہ عربی زبان کی گرامر کے قواعد کی رو سے شرطیہ جملوں میں ”شروط“ اور ”جزاء“ کے درمیان کوئی تعلق ضرور ہونا چاہیے اور دونوں کا موضوع بھی ایک ہونا ضروری ہے۔ مذکورہ آیت میں ”جزاء“ مفہوم ہے اور دراصل بول ہے۔

ومن یعظم شعائر اللہ فان تعظیمہا من تقوی القلوب۔

ایک احترام یہ بھی ہے کہ سب سے بڑا اور پر محترم ہو۔ چونکہ فائدہ من تقوی ملت ہے۔

اور اپنے معلول کی جانشین ہے اور پورا جملہ بول ہے۔

ومن یعظم شعائر اللہ فہو خیر لہ فان تعظیمہا من تقوی القلوب۔

”یا رسول اللہ! انتہا ہدیٰ“

”یا رسول اللہ! یہ قربانی کا اؤٹٹ ہے“

آپ نے قدرے غصے سے فرمایا۔

ارکبھا ویلک

افسوس ہے تیرے حال پر میں کہہ رہا ہوں سوار ہو جا۔

اسی طرح کی متعدد روایات اہل بیت کے ذریعے سے ہم تک پہنچی ہیں۔ ان روایات میں سے ایک ابو بصیرؓ ماقول سے نقل کرتے ہیں کہ زیر بحث آیت کی تفسیر کے ذیل میں آپؐ نے فرمایا۔

ان احتاج الی ظہرہا رکبھا، من غیر ان یعنف علیہا وان کان لہا لبن حلہا حلا بآ لا ینہکھا۔

اگر حاجی کو قربانی کے جانور کو بطور سواری استعمال کرنے کی ضرورت پڑے تو سوار ہو جائے مگر اس پر تشدد نہ کرے۔ اگر قربانی کا جانور دودھ دینے والا ہو تو بے شک دودھ دہ لے۔ مگر اس پر زیادتی نہ کرے۔

مذکورہ بالا روایات دو انتہائی نظریات کے درمیان ”معتدل“ طریقے کی طرف رہنمائی کر رہی ہیں۔ ایک طرف اس طرح کے لوگ تھے کہ قربانی کے جانوروں کا سرے سے کسی قسم کا احترام ہی ملحوظ نہ رکھتے تھے اور کبھی تو وقت و مقام قربانی سے پہلے ہی ذبح کر کے کھا لیتے تھے۔ جس کی طرف سورہ مائدہ آیت ۲ میں یوں اشارہ کیا گیا ہے۔

لا تَحْتَلُوا شَعَائِرَ اللَّهِ وَلَا الشُّهُرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقُلُودَ

شعائر اللہ ماہِ حرمت اور قربانی کو من مانے طریقے سے اپنے استعمال میں نہ لاؤ۔

دوسری طرف بعض لوگ اس طرح کرتے کہ جس جانور کو قربانی کے لیے چنتے نہ اس کے دودھ سے فائدہ اٹھاتے اور نہ ہی اس پر سواری کرتے۔ اگرچہ کچھ آتے جوتے ان کو طویل راستوں میں اس کی سخت ضرورت بھی ہوتی، مذکورہ آیت نے ان کے استعمال کو جائز قرار دیا ہے۔

مندرجہ بالا تفسیر پر صرف یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ زیر بحث آیت سے پہلے کی آیت میں قربانی کے جانور کا کوئی ذکر ہی نہیں آپؐ نے ضمیر ان کی طرف کیے لوٹا دی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت سے پہلی آیت میں شعائر اللہ کا ذکر تو واضح ہے اور مسئلہ طور پر قربانی، شعائر اللہ میں سے، جیسا کہ پہلے ذکر ہوا اور بعد میں بھی کیا جائے گا۔ لہذا شعائر اللہ کے ضمن میں ضمیر قربانی کے جانور کی طرف لوٹائی گئی ہے۔

۱۔ تفسیر کبیر فیضان القرآن ج ۲ ص ۳۳۳

۲۔ تفسیر نور الثقلین ج ۲ ص ۴۹

۳۔ مذکورہ بالا اس آیت کی واضح تفسیر ہے۔ اس کے علاوہ بعض مفسرین نے دو ادراخیات کا بھی اظہار کیا ہے (فقیر الگ صفحہ پر)

بہر حال آیت کے آخری حصے میں قربانی کے آخری مقام کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا جا رہا ہے۔

اس کا مقام وہ قدیم اور محترم گھر خانہ کعبہ ہے (شم حلہا الی البیت العتیق)۔

اس طرح جب تک قربانی کا جانور قربان گاہ تک نہ پہنچ جائے۔ اس سے ذاتی کام لیا جاسکتا ہے اور قربان

گاہ تک پہنچنے کے بعد اس کی قربانی کے فرض کو ادا کرنا چاہیے۔ فقہانہ اسلامی اسناد کی بنیاد پر کہا ہے کہ اگر قربانی

حج سے متعلق ہے۔ تو اس کی قربان گاہ میدان منی ہے، اگر عمرہ مضرہ سے متعلق ہے تو مکہ المکرمہ ہے۔ البتہ زیر بحث آیت

مناسک پر گفتگو کر رہی ہے لہذا ”بیت العتیق“ (خانہ کعبہ) کو وسیع تر معنی میں مکہ مکرمہ اور اس کے گرد و قریب

(میدان منی، کے معنی میں بھی سمجھنا چاہیے۔ (قابل غور ہے)

(ا) ”قیہا“ کی ضمیر تمام مناسک کی طرف چلتی ہے۔ اس بنا پر آیت کا مفہوم یوں ہوگا۔ (ایک مقررہ وقت تک ایام حج یا دنیا کے ختم ہونے تک) مناسک حج میں متاثر نہ ہوا ہے۔

حج کا آخری ترکہ جس کو بجالانے کے بعد حاجی احرام کھول کر مکہ ”ہو جاتا ہے، خانہ کعبہ کے قریب طواف زیارت یا طواف نسا کا بجالانا ہے۔ اس بنا پر زیر بحث آیت (لہذا شہدوا منافع لہا) کے مشابہ ہے، جس کی تفسیر گزر چکی ہے۔

(ب) ”قیہا“ کی ضمیر تمام شعائر اللہ اور اسلام کے نمایاں ارکان اعمال کی طرف چلتی ہے۔ اس صورت میں اس کا مفہوم یوں ہوگا:

شعائر اللہ اور تمام اسلامی احکام میں رہتی دنیا تک تمھارے لیے بہت فائدہ ہے۔ اس کے بعد معنوی اور مادی فوائد کے خالق کے

ذمہ ہے۔

لیکن جس تفسیر کو ہم نے ذکر کیا ہے۔ ان دونوں کے مقابلے میں زیادہ صحیح اور روایات سے زیادہ ہم آہنگ ہے۔

ہیں اور انہیں جو روزی دی گئی ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

تفسیر

بردار لوگوں کے لئے بشارت

گذشتہ آیتوں کے حوالے سے منجملہ قربانی کے مضمون سے شاید یہ سوال پیدا ہو کہ اسلامی شریعت میں یہ کیسی عبادت ہے کہ خداوند قدوس کی خوشنودی اور رضا کے حصول کے لیے جانوروں کی قربانی دی جائے۔ آیا خدا کو قربانی کی ضرورت ہے؟ آیا یہ حکم دوسرے ادیان میں بھی آیا ہے یا صرف یہ مشرکین کا طریقہ کار تھا؟ انہیں سوالات کی وضاحت کے ذیل میں قرآن مجید زیر بحث پہلی آیت میں فرما رہا ہے۔ قربانی اور خدا کے لیے جانور ذبح کرنے کا حکم صرف تمہیں ہی نہیں دیا گیا بلکہ "ہم نے ہر امت کے لیے ایک قربان گاہ قرار دی ہے تاکہ وہ روزی کے طور پر دیئے جانے والے جانوروں کو قربان کرتے ہوئے ان پر اللہ کا نام لیں" (وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُمْ مِنْ بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ)۔

راغب اپنی "مفردات" میں کہتے ہیں کہ

"نَسَكَ" کے معنی عبادت کے ہیں "منسك" معنی "عابد" ہے۔ لہذا مناسك حج یعنی وہ مقامات یا اوقات گاہیں جہاں یہ عبادت بجالائی جاتی ہے یا پھر خود انہی اعمال کے معنی میں ہے۔

لیکن مجمع البیان، میں جناب طبری اور مروج البیان، میں جناب ابو الفتوح رازی کے بقول "منسك" بروزن منصب ہے اور ایک احتمال کے مطابق عبادات میں سے علی الخصوص "قربانی" کے معنی میں ہے۔ لہ

اس بنا پر اگرچہ "منسك" ایک عام مفہوم رکھتا ہے، جن میں منجملہ عبادات کے "مناسك حج" بھی شامل ہیں۔ اھلیر بحث آیت (لِيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُمْ مِنْ بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ) کے معنی میں ہے۔

بہر حال، ہمیشہ سے قربانی کے متعلق سوالات اٹھاتے جاتے رہے ہیں۔ لیکن زیادہ تر سوالات کی وجہ فضول ادا بے ہودہ رسمیں ہیں، جو اس عبادت کے ساتھ تھی کر دی گئی ہیں۔ مثلاً ایک خاص رسم کے تحت مشرکین کا بتوں کے لیے

۳۲- وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُمْ مِنْ بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ فَإِنَّ اللَّهَ وَاحِدٌ فَلَا أَسْلُمُوا وَلِبَشَرِ الْمُخْبِتِينَ ۝
۳۵- الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَالصَّالِحِينَ عَلَىٰ مَا آصَابَهُمْ وَالْمُقِيمِينَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ ۝

ترجمہ

۳۲- ہر ایک امت کے لیے ہم نے ایک قربان گاہ مقرر کی ہے تاکہ وہ روزی کے طور پر دیئے جانے والے چوپایوں پر (ان کی قربانی کرتے ہوئے) خدا کا نام لیں اور تمہارا خدا معبودِ بیکتا ہے۔ اس کے حضور سر تسلیم خم کرو اور منکسر و بردبار لوگوں کو خوشخبری سنا دو۔

۳۵- یہ وہ لوگ ہیں کہ جب اللہ کا نام لیا جائے تو ان کے دل خوف الہی سے معمور ہو جاتے ہیں۔ اور انہیں جو مصیبتیں پہنچتی ہیں ان پر صابر اور مضبوط رہتے ہیں اور یہ لوگ مناز قائم کرنے والے

قربانی کرنا، مگر اس کے برعکس اللہ کے نام پر اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے قربانی کرنا جو دراصل کسی کارہ خدا میں جان نثاری اور اپنی قربانی دینے کی آمادگی کے جذبے کا مظہر ہے اور جانور کی قربانی کے بعد اس کے گوشت سے غبار کثیف اور محتاجوں کی خوراک کے لیے استفادہ کرنا وغیرہ صریحاً منطقی اور قابل فہم ہے۔ لہذا آیت کے آخر میں مذکور ہے۔ **تَصَارُفُهَا** مجبور کیا دیکھنا ہے (اور اس کا پروگرام بھی ایک ہی ہے) **(فَاِذَا لَكُمْ اِلٰهُ وَاَحَدٌ)**۔

جب حقیقت یہی ہے تو اس کے حضور تسلیم غم کرو۔ **(فَقُلْهُ اسْلَمُوا)** اور احکامات خدا کے سامنے ہنک جانے والوں کو خوشخبری سنا دو۔ **(وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِينَ)** ۱۰۰
بعد والی آیت میں "مخبتین" (انحاری کرنے والوں اور بردبار لوگوں) کی صفات کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے جن میں سے دو جیسے روحانی ہیں اور دو مادی۔

① پہلے فرمایا جا رہا ہے "وہ لوگ ایسے ہیں کہ جو نبی اللہ کا نام ان کے سامنے لیا جائے۔ تو ان کے دل خوف الہی سے معمور ہو جاتے ہیں ۱ **الَّذِينَ اِذَا ذَكَرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ**، یہ خوف صرف اللہ کے غلط و غضب کی وجہ سے نہیں اور نہ ہی اس کی رحمت بے پایاں میں کسی قسم کے شک و شبہ کی وجہ سے ہے بلکہ یہ خوف ان ذمہ داریوں اور فرائض کی وجہ سے ہے جو ان کے کندھوں پر ہیں اور انہیں یہ ڈر ہے کہ کہیں ان ذمہ داریوں کی انجام دہی میں کوئی کوتاہی نہ ہو جائے نہ بددعاؤں کی خوف اللہ کی بے انتہا عظمت و جلالت کی وجہ سے جس کا ان کو ادراک ہے کیونکہ انسان سمیت جلالت سے خائف ہوتا ہے۔
② زندگی میں پیش آنے والے مصائب و آلام پر نہایت صبر و تحمل کا مظاہرہ کرتے ہیں **(وَالصّٰبِرِیْنَ عَلٰی مَا اَصَابَهُمْ)**۔

حالات کیسے ہی سنگین کیوں نہ ہوں اور ان مشکل حالات کی وجہ سے ان کو کتنی ہی تکلیف کیوں نہ پہنچے یہ لوگ گھبرا کر گھٹنے نہیں ٹیک دیتے اور نہ ہی ان کے اطمینان اور سکون میں فرق پڑتا ہے اور نہ وہ اپنے موقف سے دست بردار ہوتے ہیں اور نہ رحمت خدا سے مایوس ہوتے ہیں اور نہ ہی کبھی کسی لفظ کے ذریعے کفران نعمت کرتے ہوئے سنائی دیتے ہیں۔ غرضیکہ ہر حال میں یہ استقامت و پامردی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سوئے منزل رواں دواں رہتے ہیں اور کامیابی سے ہم کنار ہوتے ہیں۔

③ اور ④ نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انہیں دے رکھا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں (والمقیمی

۱۰۰ "مخبتین" "اخبات" کے مادہ سے ہے "خبت" (بردزن "ثبت") سے لیا گیا ہے۔ جو ہمارا وسیع و عریض زمین کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ جس پر انسان آرام سے چل پھر سکتا ہے۔ بعد ازاں یہ مادہ اطمینان اور انحاری کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ کیونکہ اس زمین پر چلنے والے اطمینان اور اس کے پاؤں تلے زمین منکسر و متواضع ہوتی ہے۔

۱۰۰ خلافتی کے علل و اسباب کے بارے میں تفسیر نمونہ جلد ۴ میں سورہ انفال کی آیت ۲ کی تفسیر کے ذیل میں ہم شرح و ربط کے ساتھ بحث کر چکے ہیں۔

الصَّلٰوةِ وَمِیْتَازِ قَنَاصِهِمْ یَنْفَعُونَ)۔

یعنی ایک طرف اللہ کے ساتھ ان کا گہرا ربط ہے اور دوسری طرف ان کی جڑیں خلق خدا میں دوسرے پھیلی ہوئی ہیں۔ مندرجہ بالا تفصیل سے یہ بات اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ "اخبات" مجبور و انکساری اور تسلیم کہ جو زمین کی خاص صفات میں سے ہیں۔ صرف باطنی پہلو نہیں رکھتیں، بلکہ اس کے آثار ظاہر و آشکار ہونے چاہئیں۔

۳۶۔ وَالْبُدْنَ جَعَلْنَاهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَائِرِ اللَّهِ لَكُمْ فِيهَا خَيْرٌ ۖ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهَا صَوَافٍ ۚ فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوبُهَا فَكُلُوا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ ۚ كَذٰلِكَ سَخَّرْنَاهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝
 ۳۷۔ لَنْ يَّبَالِ اللَّهَ لِحُومِهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلَكِنْ يَّبَالِهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ۚ كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدٰكُمْ ۚ وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ ۝
 ۳۸۔ اِنَّ اللَّهَ يُدْفِعُ عَنِ الْذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ اِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُوْرٍ ۝

ترجمہ

۳۶۔ اور موٹے تازے اونٹوں کو ہم نے تمہارے شعائر اللہ میں سے قرار دیا ہے۔ ان میں تمہارے لیے خیر و برکت ہے جب وہ قربانی کے لیے قطار میں کھڑے کیے جائیں، اور ان کی صف بندی کر کے (قربانی کرتے وقت) اللہ کا نام

لو اور جب ان کے دست و بازو (کٹ کر) گر پڑیں تو خود بھی ان کا گوشت کھاؤ اور قناعت پسند غریبوں اور محتاجوں کو بھی کھلاؤ۔ اس طرح سے ہم نے انہیں تمہارا تابع کر دیا ہے تاکہ تم شکر بجا لاؤ۔
 ۳۷۔ اللہ کے پاس ہرگز ان کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا، اس کے پاس تو صرف تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔ اس طرح اللہ نے انہیں تمہارے تابع کر دیا ہے تاکہ جیسے اُس نے تمہیں ہدایت کی ہے۔ اس طرح اُس کی کبریائی بیان کرو اور نیکو کاروں کو بشارت دے دو۔
 ۳۸۔ یقیناً اللہ اہل ایمان کا دفاع کرتا ہے اور اللہ کسی ناشکرے اور بددیانت کو پسند نہیں کرتا۔

تفسیر

قربانی کیوں کی جاتی ہے؟

زیر بحث آیتوں میں ایک دفعہ پھر مناسک حج شعائر اللہ اور قربانی کے مسائل پر گفتگو ہو رہی ہے۔ پہلی آیت میں ارشاد ہوا ہے۔ موٹے تازے اونٹوں کو ہم نے تمہارے لیے شعائر اللہ میں سے قرار دیا ہے۔ (وَالْبُدْنَ جَعَلْنَاهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَائِرِ اللَّهِ)۔ ایک طرف اونٹن تم سے متعلق ہیں۔ اور دوسری طرف وہ اللہ کی نشانیوں میں سے قرار دیئے گئے ہیں۔ کیونکہ حج کی قربانی۔ اس بالکل عبادت کا ایک نمایاں حصہ ہے۔ جس کے فلسفے کے بارے میں ہم تفصیلات کر چکے ہیں۔

”بُدن“ بردن ”قدس“ ہے اور یہ ”بدن“ (بردن) جملہ کی جمع ہے۔ اس کا معنی موٹا تازہ اور زیادہ گوشت والا اونٹ ہے، چونکہ اس طرح کے جانور قربانی کرنے اور فقراء و مساکین اور ضرورت مندوں کو کھلانے کے لیے زیادہ موزوں ہوتے ہیں۔ لہذا خصوصی طور پر ایسے جانوروں کا ذکر کیا گیا ہے۔ حالانکہ احکام

قربانی کے مطابق قربانی کے جانور کا مٹانا نہ ہونا ضروری شرائط میں سے نہیں۔ بس اتنا دیکھا جاتا ہے کہ کمزور اور لافسہ نہ ہو۔

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے، اس قسم کے جانوروں میں تمہارے لیے خیر و برکت ہے (لَا تَكُنْ فِيهَا خَيْرٌ)۔

یعنی ایک طرف تم ان کے گوشت سے بھی خود استفادہ کرتے ہو اور دل کو بھی دیتے ہو اور دوسری طرف ایثار قربانی اور عبادت، بالکل روحانی نتائج سے بہرہ مند ہوتے ہو اور اس کی بارگاہ میں رسائی پاتے ہو۔

اس کے بعد قربانی کرنے کی کیفیت کے بارے میں ایک مختصر سا جملہ ارشاد فرمایا گیا ہے۔ جب تم قطار میں کھڑے جانوروں کی قربانی کرنے لگو تو اللہ کا نام لو (فَاذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهَا صَوَافٍ)۔

بے شک اونٹ کو بخر کرتے وقت یاد دوسرے چوپایوں کو ذبح کرتے وقت جس طرح سے بھی اللہ کا نام لے لیا جائے صحیح ہے اور آیت بھی ظاہری طور پر یہی کہہ رہی ہے، لیکن بعض روایات میں ابن عباس سے اس موقع کے لیے ایک خاص ذکر نقل کیا گیا جو دراصل ایک اکمل ذات کی تعریف ہے۔ وہ ذکر یہ ہے (اللَّهُ أَكْبَرُ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَاللَّهُ أَكْبَرُ اللَّهُ أَكْبَرُ مِنْكَ وَلَكَ)۔

امام صادق سے بہت رسا اور عمدہ جملے نقل ہوئے ہیں۔ آپ نے فرمایا جب تم قربانی کرنے لگو اسے قبل روٹاؤ یا کھڑکرو اور ذبح یا بخر کرتے وقت یہ پڑھو: وجہت وجہی لِلَّذِي فَطَرَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ حَنِيفًا مُسْلِمًا وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ إِنَّكَ صَلَوَتِي وَنَسْكَ وَحَيَاؤِي وَمَا قِيَّ اللَّهُ رَبِّ الْعَالَمِينَ لَا شَرِيكَ لَكَ، وَبِذَلِكَ أَمَرْتُ وَأَنَا مِنَ الْمُسْلِمِينَ - اللَّهُ أَكْبَرُ مِنْكَ وَلَكَ جِسْمُ اللَّهِ وَبِاللَّهِ وَاللَّهُ أَكْبَرُ، اللَّهُمَّ تَقَبَّلْ مِنْ خَشْيَتِهِ۔

لفظ "صواف" "صافہ" کی جمع ہے اور اس کا معنی قطار میں کھڑے ہونے کے ہیں۔ روایات میں ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ قربانی کرتے وقت اونٹ کے اگلے دونوں پاؤں ٹخنے سے لے کر گھٹنے تک باندھ دیئے جائیں۔ مگر وہ کھڑا رہے۔ تاکہ بخر کرتے ہوئے وہ نہ ہلے اور نہ ہلگے۔ طبعی طور پر جب خون کی کافی مقدار خارج ہو جاتی ہے تو اگلے پاؤں منصف کی وجہ سے کمزور پڑ جاتے ہیں اور اونٹ زمین پر لیٹ جاتا ہے۔ لہذا آیت میں اسی کیفیت کا بیان آیا ہے کہ جس وقت اس کا پیلو ساکن ہو جائے۔ (اس کی جان نکل جائے) تو اس کا گوشت خود بھی کھاؤ، قناعت پیش اور غریبوں اور مقررہ صفتوں کو بھی کھلاؤ (فَاذْأَوْجِبَتْ جُنُوبُهَا)۔

۱۔ اسی آیت کی تفسیر کے ذیل میں تفسیر مجمع البیہین اور روح المعانی تحریر سے اختلاف کے ساتھ

۲۔ مسائل الشیعہ ج ۲ ص ۳۱۱ باب الذبح باب ۴۔

فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطِعُوا الْقَانِعَ وَالْمَعْتَرِ)۔

"قانع" اور "معتز" میں فرق ہے۔ "قانع" اس شخص کو کہتے ہیں جسے جو کچھ بھی دیا جائے اسی پر قناعت کرتے ہوئے راضی ہو جائے اور کسی قسم کا اعتراض نہ کرے اور نہ اظہارِ ناراضگی کرے جبکہ "معتز" ایک تو سوال کرتا ہے۔ دوسرا بے ادقات جو کچھ ملے اسے ناکافی جانتے ہوئے تقاضائے مزید کرتا ہے۔

اور بزرگ ہوتا ہے۔ "قانع" "قناعت" کے مادہ سے اور "معتز" "عز" (بزدل "تشنہ" اور بزدل "حر") مادہ سے اور اصل میں ایک بیماری جسے "جرب" کہتے ہیں کہٹھن میں ہے (یہ فارش کی طرح کی ایک جلدی بیماری ہے) اس کے علاوہ اس سال کو جو سوال کرنے کے بعد اس پر اصرار کرتا ہے اور کبھی تو کچھ نہ سنے پر اظہارِ ناراضگی و غصہ بھی کرتا ہے "معتز" کہا جاتا ہے۔ "قانع" کو "معتز" پر ترجیح اس لیے دی گئی ہے کہ عوام جتنے میں سے سفید پوش، عقیف النفس اور خود دار افراد توجہ کے زیادہ مستحق ہیں۔

ایک اور تباہی توجہ بحث یہ ہے "کَلُوا مِنْهَا" اس میں سے کھاؤ کہہ کر آیت نے ظاہراً پہلی چیز پر اصرار کر دیا ہے کہ اپنی قربانی کا گوشت خود بھی ضرور کھاؤ۔ شاید یہ حکم ان کے اور غریبوں اور محتاجوں میں مساوات کے لیے ہے۔

آیت کا اختتام ان الفاظ پر کیا جا رہا ہے۔ اس طرح سے ہم نے ان جانوروں کو تمہارے تابع کر دیا ہے تاکہ تم شکر گزار بنو بن جاؤ۔ (كَذَلِكَ سَخَّرْنَا مَا لَكُمْ لَكُمْ خَشْيَةً وَجْهِي)۔ صحیح عجیب ہی تو ہے کہ عظیم الجثہ اور قوی ہیکل جانور اپنی تمام قوت جسمانی کے باوجود ایک کمزور جسم والے انسان کے آگے گویا بے بس کھڑا جاتا ہے۔ تاکہ وہ اس کے پاؤں جکڑے اور غصہ کرے (غصہ کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ گردن اور اگلی دو ٹانگوں کے ٹاپ پر جو گرہما سا ہوتا ہے، اس میں پھری گھونپ دی جاتی ہے۔ اور جانور تھوڑی ہی دیر میں جان دے دیتا ہے)۔

کبھی یہ ہوتا ہے کہ ان جانوروں کے مطیع ہونے کی اہمیت کو ظاہر کرنے کے لیے اللہ ان پر سے مطیع و فرمانبردار رہنے کا حکم اٹھالیتا ہے۔ بس اچانک وہی جانور جو ایک بچے کے پیچھے بھی نہایت فرمانبردار بن کر عام طور پر چلا کرتا ہے۔ غضب ناک اور خطرناک آفت کا روپ دھار لیتا ہے، اور کسی طاقت ور افراد کو کبھی اس پر قابو نہیں پاسکتے۔ بعد والی آیت دراصل ان سوالات کا واضح جواب ہے کہ آخر اللہ کو قربانی کی کیا ضرورت پیش آگئی؟ قربانی کا فلسفہ کیا ہے، کیا قربانی اس کے لیے کسی طرح سے نائدہ رسال ہے؟ جواباً فرمایا جا رہا ہے قربان شدہ جانوروں گوشت اور خون ہرگز خدا تک نہیں پہنچتا (لَنْ يَنَالِ اللَّهُ لَحُومَهَا وَلَكِنَّ دِمَاءَهَا)۔ اصولی طور پر خدا کو گوشت کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ تو جسم نہیں ہے اور نہ ہی ضرورت مند ہے وہ اکمل اور لامتناہی ذات ہے۔ بلکہ وہ چیز جو اللہ تک پہنچتی ہے وہ تمہارے اعمال نیک اور تمہارا تقویٰ ہے (وَلَكِنْ يَنَالُهُ التَّقْوَىٰ مِنْكُمْ)۔

بالفاظ دیگر قربانی سے مقصد یہ ہے کہ تم مدارج تقویٰ طے کر کے ایک انسان کا دل بن جاؤ اور دل بدن اللہ کے قریب ہوتے جاؤ، کیونکہ عبادت انسان کے لیے تربیتی کلاسیں ہیں۔ قربانی انسان کو باطنی، خود گذشت اور راہ خدا میں شہادت کا درس دیتی ہے۔ مزید برآں محتاجوں اور ضرورت مندوں کی مدد کا سلیقہ سکھاتی ہے۔

یہ عجیب و غریب شہادہ جانوروں کا خون تک نہیں پہنچتا، کس مفہوم میں ہے، حالانکہ خون سے ظاہر کوئی فائدہ نہیں اُٹایا جاسکتا؟ بات دراصل یہ ہے کہ اس جملے سے نہایت جاہلیت کی بے ہودہ اور فسودہ رسوم کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اس وقت ایک رسم یہ تھی کہ قربانی کا خون تینوں کے سروں پر پڑھتے تھے۔ اور کبھی تو کبھی کے درود اور پرمی چھڑک دیتے تھے۔ بعض بے غیر مسلمان بھی چاہتے تھے کہ ان رسومات پھل کیا جائے۔ لہذا اس آیت سے ان کو منع کر دیا گیا ہے۔

بڑے انوس سے کہنا پڑتا ہے کہ بعض علاقوں میں ابھی تک یہ بے ہودہ رسومات باقی ہیں۔ چنانچہ جب کبھی مکان کی تعمیر کے سلسلے میں قربانی کرتے ہیں تو جانوروں کا خون بنیادوں، دیواروں یا چھتوں پر چھڑک دیتے ہیں یہاں تک کہ بعض مساجد کی تعمیر کے دوران بھی یہ قبیح عمل دہرایا جاتا ہے۔ جو مسجد کی بنیاد کا سبب بن جائے روشن فکر مسلمانوں کو اس کے خلاف ہم چلائی جا رہی ہے۔

اس کے بعد ایک مرتبہ پھر جانوروں کے مطیع کیے جانے کی نعمت کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ اس طرح سے اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے جو پالوں کو مطیع بنادیا ہے تاکہ تم اپنی ہدایت کیے جانے پر اللہ کی بڑائی بیان کرو۔ "وَكَذَلِكُمْ سَخَّرْنَا لَكُمُ الْبَهْمَ وَالْطَّيْرَ عَلَىٰ مَا حَدَّكُم"۔

مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت و رفعت سے شناسائی پیدا کرو جس نے تمہارے لیے فطری اور تافنی دونوں طریقوں سے ہدایت کی ہے۔ ایک طرف طریقہ ریح اور سلیقہ اطاعت و بندگی تمہیں سکھایا اور دوسری طرف قوی ہیکل اور طاقتور جانوروں کو تمہارا مطیع و فرمانبردار بنایا تاکہ اللہ کی اطاعت کرنے پر قربانی کرنے، ضرورت مندوں کی ضرورت کو پورا کرنے اور معیشت کا معیار بھی بلند کرنے میں ان سے استفادہ کرو۔ چنانچہ آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے۔ "نِيْلَكُمْ لَهُمْ كَوْنُ شَيْءٍ نَّاسٍ"۔ (وَلِبَشَرِ الْمَاضِيْنَ)۔

وہ لوگ جو ان نعمتوں کو اللہ کی اطاعت میں صرف کرتے ہیں اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کو بطریق احسن انجام دیتے ہیں اور علی الخصوص اپنا مال و متاع راہِ خدا میں خرچ کرتے ہیں۔ یہ نیک لوگ نہ صرف دوسروں سے نیکی کرتے ہیں۔ بلکہ اس طرح اپنی بھی بہترین خدمت انجام دیتے ہیں۔

مشرکین کی بعض بیہودہ حرکات کہ جن کا اس سے پہلے آیتوں میں ذکر کیا گیا ہے کے متعلق یہ احتمال ہو سکتا تھا کہ مشرکین مہٹ دھرمی اور تعصب کی وجہ سے انتقامی کارروائی کرتے ہوئے مسلمانوں سے بددعا کریں۔ چنانچہ یہ لوگ

عالمین کو مومنین کو دلاسا دیتا ہے اور اپنی مدد کے وعدے سے ان کو حوصلہ بندھاتے ہوئے فرماتا ہے۔ اللہ صاحبان ایمان کا دفاع کرتا ہے۔ (اِنَّ اللّٰهَ يَدْفَعُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ)۔

اگرچہ جزیرہ نمائے عرب کے مشرکین یہودی، نصاریٰ اور سیکڑوں چھوٹے چھوٹے قبیلے اور خاندان باہم متحد ہو کر اپنے زعم باطل میں مومنین کو دبا کر نہایت نابود کر دینا چاہتے تھے۔ مگر اللہ نے قیامت تک کے لیے بقائے اسلام اور سلامتی مومنین کا وعدہ فرمایا۔ مشرکین کے خلاف مومنین کے دفاع کا وعدہ در پیغمبر اکرم سے ہی مخصوص نہیں تھا۔ بلکہ یہ تمام امور و احوال پر یکساں جاری و ساری ہے۔ البتہ شرط یہ ہے کہ ہم "اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا" کا مصداق بنیں، پھر دعائی و دفاع لازمی امر ہے اور کبھی اس کی خلاف ورزی نہیں ہو سکتی۔ بے شک اللہ مومنین کی حمایت اور دفاع کرتا ہے۔

آیت کے آخری حصے میں مشرکین اور اس کے ہم ذہنیت لوگوں کا اللہ کے ہاں مقام اس طرح بتایا گیا ہے: اللہ کسی بددیانت ناشکر سے کو پسند نہیں کرتا (اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِيْنَ)۔

وہی کہ جو اللہ کا شریک بناتے ہیں یہاں تک کہ "لبیبت" کہتے ہوئے واضح طور پر بتوں کا نام پکارتے ہیں، اور یوں اپنی بددیانتی پر ہر تصدیق صبر کر لیتے ہیں۔ اس طرح قربانی کرتے ہوئے اللہ کا نام چھوڑ کر بتوں کا نام لیتے ہوئے کفران نعمت کے مرتکب ہوتے ہیں۔ انہیں حالات کیسے ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ ان بددیانت اور کفران نعمت کرنے والے کو پسند نہ کرے۔

۳۹- اَذِّنْ لِلَّذِينَ يُقْتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظَالِمُونَ
وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ ۝

۴۰- الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ
إِلَّا أَنْ يَقُولُوا رَبَّنَا اللَّهُ ۚ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ
بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَفُتَّتْ صَوَامِعُ وَيَعُوقُ
صَلَوَاتُكَ وَمَسْجِدُكَ ذُكِرَ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ
كَثِيرًا وَلَئِنْ نَصَرْتَ اللَّهَ مِنْ نِيَصْرَتِهِ
إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ ۝

۴۱- الَّذِينَ إِنْ مَكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا
الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَآمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ
وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۚ وَاللَّهُ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ ۝

ترجمہ

۳۹- ان لوگوں کو جہاد کی اجازت دے دی گئی ہے، جن پر جنگ ٹھوس
گئی ہے، کیونکہ ظلم و ستم کا نشانہ بنے ہیں اور اللہ سبحانہ و تعالیٰ
ان کی مدد و نصرت پر قادر ہے۔

۴۰- وہ لوگ ناحق اپنے گروں سے نکال باہر کیے گئے ہیں، ان کا قصور سوا

اس کے اور کیا تھا کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا پروردگار صرف اللہ ہے اور اگر اللہ
بعض کے ذریعے بعض کو مغلوب نہ کرے تو دیر گربے، عبادت خانے
اور مساجد کہ جن میں اللہ کا نام کثرت سے لیا جاتا ہے۔ ویران کر دیئے
جاتے اور اللہ ان لوگوں کی جو اس کی مدد کرتے ہیں (اور اس کے دین کی
حمایت کرتے ہیں) مدد کرتا ہے۔ اللہ طاقت ور اور ناقابل شکست ہے۔
۴۱- (خدا کے بار و مددگار) وہ لوگ ایسے ہیں کہ جنہیں جب زمین پر صاحب اقتدار
بنایا گیا تو انہوں نے نماز قائم کی، زکوٰۃ ادا کی، نیکی کا حکم دیا اور بدی سے روکا
اور ہر چیز کا انجام اختتام اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

تفسیر

جہاد کا پہلا حکم

بعض روایات سے چہ چلتا ہے کہ جب مسلمان محاذ میں تھے تو اکثر مشرکین مکہ کے ظلم و ستم کا نشانہ بنتے تھے۔ بڑی
تکلیف اور اذیتیں اٹھاتے تھے اور جب کہیں مار پیٹ کے بعد رنجیدہ خاطر ہو کر بارگاہِ رسول میں آتے اور ظالم کے خلاف
شکایت کرتے (اور جہاد کی اجازت مانگتے) تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے۔ صبر کرو، ابھی مجھے جہاد کا حکم نہیں دیا گیا
یہاں تک کہ مسلمانوں نے مکہ سے مدینے کی طرف ہجرت کی تو ذکرہ بالا آیت منبر پر جو جہاد کی اجازت لیے ہوئے ہے
نازل ہوئی۔

چنانچہ جہاد کے بارے میں نازل ہونے والی پہلی آیت ہے۔

اگرچہ اس کے حکم جہاد کے لیے پہلی آیت ہونے کے بارے میں مفسرین میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض اسے
پہلی آیت گردانتے ہیں اور بعض سورہ بقرہ کی آیت۔

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ ... (بقرہ ۱۹۰)

کو پہلی آیت قرار دیتے ہیں۔ جب کہ بعض مفسرین سورۃ توبہ کی آیت

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ ... (توبہ ۱۱۱)

کو اس سلسلے کی پہلی آیت سمجھتے ہیں۔

لیکن "اذن جہاد" کے موضوع کی مناسبت سے اس آیت کا لب و لہجہ زیادہ قرین حقیقت معلوم ہوتا ہے کیونکہ لفظ "اذن" کا قرین صراحت کے ساتھ اجازت دے رہا ہے۔ جبکہ یہ قرینہ مذکور بالا باقی دو آیتوں میں نہیں ہے، بالفاظ دیگر اس آیت کی تعبیر اس خاص موضوع کے بارے میں ہے۔

بہر حال اگر گذشتہ آخری آیت جس میں یوں کے دفاع اور حمایت کا مدہ کیا گیا ہے، کو ذہن میں رکھا جائے تو زیر بحث آیت کا اس سے تعلق خاصہ واضح معلوم ہوتا ہے۔ زیر نظر پہلی آیت میں فرمایا جا رہا ہے: اللہ نے ان لوگوں کو جن پر جنگ عطا کی گئی۔ جہاد کی اجازت دی ہے۔ کیونکہ ان پر ظلم کیا گیا ہے (اذن یلکذین یقاتلون بانہم ظلّموا)۔

اس کے بعد قادر و طاقتور خدا کی طرف سے کامیابی کے وعدے کے ساتھ اذن جہاد کی تکمیل کرتے ہوئے فرمایا جا رہا ہے: اللہ ان کی مدد و نصرت پر قادر ہے (وان اللہ علیٰ نصرہم لقدیر)۔

ہو سکتا ہے اس جملے سے: خدا کی طاقت و قوت کے ساتھ نصرت الہی کی ضمانت دے رہا ہے، اس طرف اشارہ ہو کہ خلائی مدد اس وقت میر ہوگی جب صدہم و دفاع کیلئے تیار ہو جائے تاکہ یہ لگن نہ ہو جائے گھر بیٹھے اللہ مدد کر دے گا یہ الفاظ دیگر عالم اسباب میں سے جو بھی میر ہے اسے کام میں لایا جائے اور تعارضی قوت ختم ہو جائے تو یوں ہونے کی بجائے اللہ تعالیٰ کی نصرت کے منظر ہو یہی وہی تھا جسے پیغمبر اکرم نے تمام فرائض میں علیٰ طور اپنا اہک یا بیٹے اس کے بعد ان مظلوموں کی حالت ناز کی مزید وضاحت کی گئی ہے، جن کو جہاد کی اجازت دی گئی ہے اور جہاد سے تعلق اسلامی نقطہ نظر کو واضح کرتے ہوئے فرمایا جا رہا ہے: وہی لوگ جو ناحق اپنے گھر یا چھوڑ کر نکل جانے پر مجبور کر دیئے گئے ہیں۔ (الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِنْ ديارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ)۔

ان کا قصور سوائے اس کے اور کچھ نہیں تھا کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا پروردگار صرف اللہ ہے (الان یقولوا دیننا اللہ)۔

کھلی بات ہے کہ خدا تعالیٰ کی توحید و یکائنت کا اقرار گناہ نہیں، بلکہ مایہ ناز ہے۔ یہ کوئی ایسا عمل نہیں جس کی بنیاد پر شرکین کو یہ حق مل جائے کہ وہ انہیں ان کے گھروں اور ملاقوں سے نکال باہر کریں اور مکے سے مدینے کی طرف ہجرت پر مجبور کر دیں۔ آیت نے اس مفہوم کے بیان میں جو تعبیر استعمال کی ہے وہ ایسے مواقع پر مد معقول کو محکوم و مغلوب کرنے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ بعض اوقات ہم خدمت و نعمت پر ناگھڑی کرنے والے شخص کے لیے یوں کہتے ہیں (ہمارا گناہ صرف یہ تھا کہ ہم نے تیری خدمت کی) مخاطب کی بے خبری کے اظہار کے لیے یہ لطف کنایہ ہے جس نے خدمت

کے بدلے ایسا رویہ اختیار کیا جو کسی جرم کے جواب میں رد رکھا جاتا ہے۔

اس کے بعد حکم جہاد کے غلطی اور مصلحت کی وضاحت کرتے ہوئے اس طرح ارشاد ہوتا ہے: اگر اللہ مؤمنین کا دفاع نہ کرے اور جہاد کی اجازت دے کر بعض کو بعض کے ذریعے مغلوب نہ کرے تو دیر، گرے یہود نصاریٰ کے عبارت خانے اور سنا کہ جن میں کثرت سے اللہ کا ذکر ہوتا ہے، ویران ہو جائیں (ولولا دفع اللہ الناس بعضهم ببعض لفسدت صوامع وبيع وصلوات ومساجد یذکر فیہا اسم اللہ کثیرا)۔

بے شک اگر ماحجان ایمان ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں، غالموں، جابرین اور بے ایمان دنیا پرستوں کی تباہ کن کارستانیوں کے مقابلے میں خاموش تماشا بنے رہیں اور انہیں حمل کھیلنے کی کھلی چھٹی دیتے رہیں۔ تو یقیناً وہ مباد اور عبادت گاہوں کا نام نشان تک نہ چھوڑیں۔ کیونکہ مباد و عبادت گاہیں، بیداری کی درس گاہیں ہیں، محراب عبادت میدان جنگ ہے اور مسجد سرکشوں کے خلاف مورچہ ہے۔ واصل ہر قسم کی خدا پرستی کی دعوت ان کے خلاف اعلان جنگ کے مترادف ہے، کیونکہ وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ خدا کی طرح خود ان کی پرستش کی جائے، چنانچہ اگر انہیں موقع ملے تو خدا پرستی کے تمام مراکز کو مسمار کر دیں۔ جہاد کا حکم دینے اور جنگ جہاد کی اجازت دینے کا یہ ایک مقصد بیان کیا گیا ہے۔

"صوامع" "بیع" "صلوات" اور مساجد میں فرق سے تعلق مفسرین میں اختلاف ہے، لیکن جو بات زیادہ صحیح نظر آتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ "صوامع" "صومعہ" کی جمع ہے، یہ اس جگہ کو کہتے ہیں جو عام طور پر شہروں کے باہر لوگوں کے شور و غل سے دور تارک الدنیا زادوں اور عبادت گاہوں کے لیے بنائی جاتی ہے۔ فارسی میں اسے "دیر" کہتے ہیں۔ یاد رہے کہ "صومعہ" اس عبارت کو کہتے ہیں، جس کا اوپر کا حصہ ایک دوسرے سے ملتی ہوتا ہے، ظاہراً اس سے پورے گلدستوں کی طرف اشارہ ہے جو راہب لوگ اپنے دیروں کو سنانے کے لیے بناتے ہیں۔

"بیع" "بیعتہ" کی جمع ہے، اس سے مراد عیسائیوں کی عبادت گاہ یعنی گرجا ہے "صلوات" "صلوۃ" کی جمع ہے۔ یہ لفظ یہودیوں کی عبادت گاہوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ بعض اسے "صلوتا" کا عرب سمجھتے ہیں۔ جو عبرانی زبانی میں نماز خانہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ "مسجد" "مسجد کی جمع ہے۔ جو مسلمانوں کی عبادت گاہ ہے۔ اس بنا پر اگرچہ ملحوظ اور "بیع" دونوں ہی عیسائی عبادت گاہوں سے متعلق ہیں۔ مگر ان میں ایک اجتماعی عبادت گاہ ہے اور دوسری تارکین دنیا کی انفرادی "بیعتہ" کو عیسائیوں اور یہودیوں دونوں کی عبادت گاہوں کے لیے لفظ مشترک سمجھا جاتا ہے۔

حتیٰ طور پر یہ بھی ذکر ہو جائے کہ جملہ "یذکر اسم اللہ فیہا کثیرا" (کثرت سے ذکر کیا جاتا ہے) مساجد کی تعریف میں آیا ہے، کیونکہ جملہ مذاہب کے تقابلی جائزے کے مطابق مسلمان ہر روز پانچ مرتبہ سال بھر عبادت کرتے رہتے ہیں اور یوں مسلمانوں کے عبادتی مراکز سب سے زیادہ بار و بار رہتے ہیں، جبکہ بہت سے دوسرے مذاہب کے

لے مسلم ہوتا ہے کہ اس آیت میں استثناء، استثنا و استثناء ہے۔ البتہ کنائی معنی میں امداد مائی موضوع کی نسبت سے۔ (قابل غور ہے)

عبادت سرگزشتہ میں ایک بار سال ہجری میں چند مخصوص ایام میں استعمال میں آتے ہیں۔

آخر میں ایک بار پھر خدائی مدد کے وعدے کا اعادہ کیا جا رہا ہے، یقیناً اللہ ان لوگوں کی مدد کرتا ہے جو اس کی مدد کرتے ہیں اس کے دین اور عبادت گاہوں کا دفاع کرتے ہیں۔ (ولینصون اللہ من فیصلہ) اس میں شک و شبہ نہیں کہ خدا کا وعدہ پورا ہو کر رہتا ہے۔ کیونکہ وہ قادر اور ناقابل شکست ہے (ان اللہ لقوی عزمین)۔

یہ اس لیے فرمایا کہ توحید کے متوالے اور پاسدار کہیں یہ تصور نہ کر بیٹھیں کہ وہ انہی حق و باطل اور طاقتور دشمنوں کے زرخیز میں اکیلے اور بے سہارا ہیں۔ اسی وعدے کے پر تو قریب اکثر مسلمان مجاہدوں نے باوجود اس کے کہ تعداد اور آلات حرب و ضرب کے لحاظ سے کفار کے مقابلہ میں کہیں کم تھے، زبردست اور شاندار کامیابیاں حاصل کی ہیں ان کامیابیوں کی وجہ نہیں نصرت الہی کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے۔ زیر بحث آخری آیت اللہ کے بار بار ان دنا صریح کی تفصیل بیان کر رہی ہے، جن سے گذشتہ آیت میں مدد کا وعدہ کیا گیا تھا۔

ان کی یوں تعریف کی گئی ہے: وہ ایسے لوگ ہیں کہ جب زمین پر ہم ان کو صاحب اقتدار بناتے ہیں، وہ فائز قائم کرتے ہیں، بڑکاتا دے کرتے ہیں، بیکاروں کو دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں (الذین ان محکناہم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ و اتوا الزکوٰۃ و امروا بالمعروف و نہوا عن المنکر)۔

وہ کامیابی کے بعد سرکشوں، جنگجوؤں اور غلاموں کی طرح کبھی داد و پیش نہیں دیتے، نہ لہو و لعب میں زندگی منانے کرتے ہیں اور زلفہ انتہا سے بڑھتے ہوئے ہیں۔ بلکہ وہ کامیابیوں، کامیابیوں اور اس توفیق خاص کو اپنی اور معاشرے کی اصلاح و تعمیر و ترقی کا ذریعہ قرار دیتے ہیں وہ حکومت حاصل ہونے کے بعد خدا کے خلاف ایک اور طاقتور طاقت بن کر نہیں ابھرتے بلکہ خداوند عزوجل اور اس کی مخلوق کے ساتھ ان کے روابط اور گہرے ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ وہ فائز قائم کرتے ہیں۔ جو اللہ سے گہرے روابط کی علامت ہے، بڑکاتا دیتے ہیں۔ جو حقوق بشر و خدمت خلق کی نشانی ہے، بھلائی کی ترغیب دے کر اور برائی کی حوصلہ شکنی کر کے صاف سطر اسطرہ تشکیل دیتے ہیں، یہی پار صفت ان کے تعادلات کے لیے کافی ہیں۔ انہی کے زیر سایہ باقی جمادات اعمال صالح اور اچھے معاشرے کی خصوصیات پیدا ہوتی ہیں اور فلاحی کام پرمندان جڑ پکڑتے ہیں۔

یاد رہے محکمات "تکلیف" کے مادہ سے ہے۔ جس کا مطلب وسائل و ذرائع کی فراہمی ہے۔ قطع نظر اس سے کہ وہ آلات ہوں یا کافی علم و آگاہی یا جسمانی و فکری توانائی "معروف" آپھے اور پسندیدہ امور کے معنی میں ہے اور "منکر" قبیح و ناپسندیدہ اور باطل کے معنی میں کیونکہ اول الذکر ہر عقل سلیم رکھنے والے شخص کے لیے جانا چھپاتا ہے اور موعظ الذکر ابھی و بے گناہ بالفاء و دیگر اول الذکر فطرت انسانی سے ہم آہنگ ہے۔ جبکہ موعظ الذکر خلاف فطرت آیت کے آخر میں ارشاد ہو

لے امر بالمعروف و نہی من المنکر کی اہمیت اور ان سے متعلق فقیر مسائل اور اس مسئلے میں اٹھنے والے فیلہ سوالات کے جوابات تفصیل کے ساتھ سورہ آل عمران آیہ ۱۱۰ کی تفسیر کے ذیل ۲۵ میں بیان کیے جا چکے ہیں۔

رہا ہے، اتمام کاموں کا انجام و اختتام اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ (وللہ عاقبۃ الامور)۔

جس طرح ہر کام، ہر کامیابی اور تسلط کی ابتداء و منتہا اللہ کی طرف سے ہے۔ اسی طرح اس کے اختتام و انجام و نتیجہ کی بازگشت بھی اسی کی طرف سے ہے۔ کیونکہ۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

چند اہم نکات

۱۔ حکم جہاد کا فلسفہ جس میں مسلمانوں کو جہاد کی اجازت دی گئی ہے اور ان آیتوں کا مضمون اور مقصد اس حکم کے فلسفے اور مصلحت پر روشنی ڈالتا ہے، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ چند نکات اگرچہ اعادہ کے طور پر یہی کیوں نہ ہوں بیان کیے جائیں، ان آیات میں جہاد کے فلسفے کے دو اہم اجزاء کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، (۱) ظالم اور جابر کے خلاف مظلوم کا جہاد؛ بلا شک و شبہ یہ مظلوم کا پیدا شدہ فطری اور عقلی حق ہے کہ ظلم کے سنگ گراں کے نیچے پسنے کی بجائے ظالم کے خلاف اٹھ کھڑا ہو، پیچ و پکار کرے، ہتھیار اٹھائے، اس کو اس کے اہلی مقام تک پہنچائے اور اپنے حقوق کی جانب اٹھنے والے اس کے ہاتھوں کو قطع کر دے۔

(۲) طاغوتی طاقتوں کے خلاف جہاد؛ طاغوتی طاقتیں دلوں سے نام خدا کو نکالنے اور خدا کے ذکر و عبادت کے مراکز کو دیران اور برباد کر دینا چاہتی ہیں۔ کیونکہ یہی عبادت گاہیں شعور و بیداری کے مراکز ہیں۔ لازم ہے کہ ان طاقتوں کے خلاف اٹھ کھڑا جانا جائے تاکہ وہ نام خدا کو محو نہ کر سکیں اور لوگوں کی سوچ پر پھر سے بٹا کر ان کو اپنا در خیر غلام نہ بنائیں۔

یہ بحث بھی قابل توجہ ہے کہ معابد و مساجد کو برباد کرنے کا صرف یہی طریقہ نہیں ہے کہ ان کی عمارت کو تباہ کر دیا جائے۔ بلکہ بالواسطہ ذرائع بھی استعمال کیے جاسکتے ہیں اور منہی سرگرمیوں اور غلط پراپیگنڈے کے ذریعے سے بھی حوام کو مساجد و معابد سے بدلتا کیا جاسکتا ہے تاکہ وہ خود ہی مساجد و معابد کا رخ نہ کریں اور بارونق مساجد و انواروں میں بدل جائیں۔

بعض لوگ یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ اسلام نے دلیل و منطق کی بجائے مسلح جنگ کے ذریعے اپنے مقاصد حاصل کرنے کا طریقہ کیوں اختیار کیا ہے؟ اس کا جواب ہم گذشتہ مضمون میں دے چکے ہیں۔ کیا وہ ظالم درندے جو صرف "لا الہ الا اللہ" کہنے کے جرم میں لوگوں کو بے گھر اور در بدر کر دیتے ہیں، ان کے سیاہ و سفید کے مالک بن جاتے ہیں ان پر ہر طرح کا ظلم روا رکھنے کے لیے کسی قانون کی پاسداری نہیں کرتے، کیا ایسے بے منطق وحشیوں کا مقابلہ طاقت کی زبان کے علاوہ کسی اور طرح سے ممکن ہے؟ اس کی بہترین مثال یہ ہے کہ لوگ کہتے ہیں کہ آپ اسرائیل کے ساتھ میز پر بیٹھ کر مذاکرات سے مسائل کا حل کیوں نہیں کرتے؟ جو ابا عرض ہے، وہی اسرائیل جو غاصب و جابر ہے، جس نے تمام بین الاقوامی قوانین، عالمی اداروں کی تمام قراردادیں اور تنظیمیں اور ہر قوم مذہب اور ملیت کے مسئلہ انسانی حقوق کو پا مال کر دیا ہے، آیا وہ مذاکرات میں دلیل و منطق کی زبان سمجھنے کی اہلیت رکھتا ہے؟ وہ اسرائیل جس نے ہزاروں بچوں اور بوڑھوں

عورتوں، مردوں اور بچوں پر بربادی کر کے، ان کو آگ کی بھیجی میں جھونک دیا، کیا اس پر بذکرات کا کچھ اثر ہو سکتا ہے کہ اگر وہ جو عوام انسان کی بیداری اور شعور کے مراکز، مساجد اور دیگر عبادت گاہوں، جن کو وہ اپنے غیر قانونی مفاد کے میں سدھ رہے تھے۔ کو جیسے تیسے تباہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں، کیا اس قابل ہیں کہ ان کے ساتھ مصالحانہ رویہ کیا جائے؟

بہر حال نظریاتی مسائل سے قطع نظر اگر آج دنیا کے مختلف معاشروں کی حقیقی کیفیت پر غور کریں اور ان پر مبنی قریب عیدیں گزرنے والے واقعات پر نظر رکھیں تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ بعض حالات میں طاقت اور آلات حرب کا سارا اپنا ناکہ بر ہو جاتا ہے، اس لیے نہیں کہ دلیل و منطق میں کسی قسم کا جھول ہے، بلکہ ظالموں اور جاہلوں کو دلیل اور منطق کی طرف مائل کرنے کے لیے، یقیناً جہاں کام دلیل و برہان سے تباہ ہو وہاں منطق مقدم ہے۔

۲۔ اللہ نے کن لوگوں سے مدد کا وعدہ فرمایا ہے؟
یہ نظریہ غلط ہے کہ مذکورہ بالا آیت یا دوسری آیتوں میں اللہ نے مومنین کے دفاع، مدد اور کامیابی کا جو وعدہ فرمایا ہے وہ قوانین اور ضابطہ آفرینش و فطرت کے خلاف ہے۔ یہ وعدہ صرف ان لوگوں سے کیا گیا ہے، جو مقدمہ برصورت و عدالت اور تمام تر وسائل کے ساتھ میدان میں آئیں۔ آیت میں بھی یہ فرمایا گیا ہے۔
”لَوْ لَا دَفَعَ اللَّهُ النَّاسَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا“

خدا جاہر و ظالم طاقتوں کو رسوائے استثنائی اور معجزاتی حالات کے غیبی طاقتوں مثلاً صاعقہ اور زلزلہ سے ختم نہیں کرتا بلکہ، خالص اور پختے مومنین کے ذریعے دور کرتا ہے۔

ان پختے مومنین کی مدد اور حمایت کی جاتی ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ کہیں اللہ کے وعدے صرف یہ مسلمانوں کی سمتی، کامل اور عدم احساس ذمہ داری کا موجب بن جائیں، بلکہ حرکت، فعالیت اور حصول مقصد کے لیے تشویق و ترغیب کا سبب بھی بنیں، البتہ اس صورت میں حتیٰ کامیابی کی ضمانت دی گئی ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ مومنین کا یہ طبقہ کامیابی سے پہلے ہی اللہ سے متک نہیں ہوتا، بلکہ کامیابی کے بعد بھی اس آیت ”الَّذِينَ اِنْ مَكَّنَا هُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلَاةَ وَكَامُوا مِمَّا بَيْنَ يَدَيْهِمْ“ اور دشمن پر کامیابی کو حق، انصاف اور شرافت کی تریکا کا ذریعہ بناتا ہے۔

بعض روایات میں عمومی طور پر حضرات آل محمد اور امام مہدیؑ کے انصار کو مندرجہ بالا آیت کا مصداق قرار دیا گیا ہے۔ شافعی امام باقرؑ نے اسی آیت کی تفسیر کے ذیل میں فرمایا۔

یہ آیت اول سے آخر آل محمد اور حضرت مہدی کے انصار اور جاہل ثاروں کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔
يَمْلِكُهُمُ اللَّهُ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا، وَيُظْهِرُ الْتَّيْنِ، وَيُمِيتُ اللَّهُ بِهِ وَبِاصْحَابِهِ الْبِدْعَ وَالْبَاطِلَ مَكَمَا اَمَاتَ الشَّقَاةَ الْحَقَّ، حَتَّى لَا يَبْقَى اَيُّ الظُّلْمِ، وَيَأْمُرُونَ بِالْعُرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔

زمین کے مشرق و مغرب کو ان کی حکمرانی میں دے دے گا۔ اپنے دین کو غالب قرار دے گا، امام مہدی اور آپ کے اصحاب کے لیے بدعت اور باطل کو اسی طرح مٹا دیں گے کہ جس طرح غاصبوں نے حق کو کیا تھا اور دور دور تک کہیں علم کا نام و نشان تک نہ لے گا۔ (کیونکہ) وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی کریں گے۔

اس سلسلے میں اور احادیث بھی روایت کی گئی ہیں۔ لیکن یاد رہے کہ ایسی روایات ہمیشہ آیت کے عملی اور ظاہری معانی کا ذکر کرتی ہیں۔ آیت کے عام مفہم پر ہرگز اثر انداز نہیں ہوتیں۔ اس بنا پر اس آیت کا وسیع تر مفہم تمام صاحبان ایمان و مجاہدوں اور مومنین کو دامن میں لیے ہوئے ہے۔

۳۔ ”مومنین“ معنیتیں اور اللہ کے انصار
مندرجہ بالا آیت اور ان سے پہلے کی آیات کہتی ہیں کہ مومنین کو خوشخبری سنا دو اور بعد ازاں ان کا تعارف مساجد ایمان اور کفران نعمت نہ کرنے والوں کی حیثیت سے کرواتی ہیں اور کبھی حقیقتیں (عجز و انحدار کرنے والے) کے طور پر ان کا ذکر کیا ہے اور انہیں ذکر خدا کے موقع پر خوف خدا سے لرزاں اور مصائب شائد کے مواقع پر صبر و تحمل کے پیکر بننے والے، ناز و قائم کرنے والے اور اپنے خدا داد وسائل نعمات میں ہنگام خدا کو شریک کرنے والے، کہہ کر پیش کیا گیا ہے۔ آخر میں اللہ کے انصار کا یوں تعارف کرایا جاتا ہے کہ وہ غالب آنے کے بعد گھنٹہ، غرور اور تکبر کی بجائے تواضع و عاجزی کی روش اختیار کرتے ہوئے ناز و قائم کرتے ہیں۔ زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرتے ہیں۔ اگر ان آیتوں کا مجموعی طور پر جائزہ لیا جائے تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مندرجہ بالا خصوصیات کے حامل پختے اور خالص مومنین وہ ہیں، جو ایک طرف نظریات، اعتقادات اور احساس کی ذمہ داری کے اعتبار سے بہت مضبوط اور دوسری طرف میدان عمل میں خالق و مخلوق دونوں کے تمام حقوق پوری طرح ادا کرتے ہیں، بدعتوں اور برائیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں اور ہر قسم کی مشکلات و مصائب کا مقابلہ بڑی پامردی اور استقامت سے کرتے ہیں۔

۲۵۔ کتنے ہی شہر اور بستیاں ان کے (رہنے والوں کے) ظلم و ستم کی وجہ سے ہم نے تباہ و برباد کر دیں۔ اس طرح سے کہ ان کی چھتیں ان پر گرا دیں (پہلے چھتیں گرائی گئیں، پھر دیواریں چھتوں پر آ گئیں) کتنے ہی لبالب کنوئیں لاوارث ہو گئے اور کتنے پختہ فلک بوس محل بھی۔

تفسیر

لاوارث کنوئیں اور فلک بوس محل

گذشتہ آیتوں میں مومنین کے لیے اسلام دشمن طاقتوں کی طرف سے پیدا کردہ اچھیدہ، گھمبیر اور طاقت فرسا مسائل کا ذکر تھا۔ یہ بھی بیان کیا گیا تھا کہ توحید پرستی کے جرم میں طاقتوں نے مومنین کو کس طرح اور کیسی کسی اذیتیں اور تکالیف پہنچائیں۔ انہیں آوارہ وطن اور بددعا اور ان مظالم سے نکلنے کے لیے مومنین کو جہاد کی اجازت دی گئی۔ زیر بحث آیت ایک طرف پیغمبر اسلام اور مومنین کی دل جوئی کرتی ہے اور دوسری طرف کفار کے منحوس اور برے انجام کی وضاحت کرتی ہے۔

پہلی آیت میں فرمایا جا رہا ہے: اگر تمہیں جھٹلایا گیا ہے تو پریشان نہ ہو۔ کیونکہ ان سے پہلے نوح کی قوم، عاد اور ثمود بھی اپنے نبیوں کو جھٹلا چکی ہیں۔ (وَانْ يُكَذِّبُوكَ فَقَدْ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَ قَوْمُ ثَمُودَ) اور اسی طرح، ابراہیم و لوط کی قوموں نے بھی ان کو جھٹلایا (وَقَوْمُ اِبْرٰهٖمَ وَ قَوْمُ لُوطٍ) اور مدین کے باسی بھی شعیب کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور فرعون اور اس کے پیروں کا رول نے موسیٰ کو جھٹلایا۔ (وَاصْحٰبُ مَدْيَنَ وَكَذَّبَ مُوسٰی) یعنی جس طرح ماضی میں شدید منافقین کی رکاوٹیں اور تکذیبیں ان کو جھٹلایا۔ میں نے دعوت توحید حق و عدالت کی راہ میں کمزوری کا باعث بنیں گیں، اسی طرح بلا تکلف شبہ تیزی پاک اور با استقامت رُوح پریمی اخراج کر سکیں گی۔ لیکن اندھے دلوں والے یہ کفار کہیں نہ سمجھیں کہ وہ اپنی ناپاک تخریب کاری اور سیاہ کاریاں ہمیشہ جاری رکھ سکیں گے۔ "ماضی میں پہلے تو ان کو مہلت دی گئی تاکہ ان کی آزمائش مکمل ہو جائے ان پر سخت تمام ہو جائے اور وہ پر تعیش زندگی میں مگن رہیں۔ پھر قانون مکافات کے تحت ان کو دھریا (فاہلیت للکافرین شتہ اخذتہم) دیکھا اکتی حقارت سے میں نے ان کی بد اعمالیوں کو بیکسر مسترد کر دیا اور کتنی وضاحت سے ان کی بد اعمالیوں کی قہامت و طاقت کو طشت از باہم کی (فکیف

۲۲۔ وَاِنْ يُكَذِّبُوكَ فَقَدْ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَ عَادٌ وَ ثَمُودٌ ۝

۲۳۔ وَ قَوْمُ اِبْرٰهٖمَ وَ قَوْمُ لُوطٍ ۝

۲۴۔ وَ اصْحٰبُ مَدْيَنَ وَ كَذَّبَ مُوسٰی فَاَمْلٰیْتُ لِلْكَافِرِیْنَ شَتًّا اَخَذْتَهُمْ فَكَيْفَ كَانَ نَكِیْرٌ ۝

۲۵۔ فَكَآئِنٌ مِّنْ قَرْبَةٍ اَهْلَكْنٰهَا وَ هِيَ ظَالِمَةٌ فَمِنْهَا خَاوِیَّةٌ عَلٰی عُرُوشِهَا وَ بَیْرٌ مُّعْتَلَةٌ وَ قَصْرِ مَّشِیْدٍ ۝

ترجمہ

۲۲۔ اور اگر وہ تمہیں جھٹلاتے ہیں تو (یہ کوئی نئی بات نہیں) ان سے پہلے نوح کی قوم، عاد اور ثمود نے بھی (اپنے نبیوں کو) جھٹلایا ہے۔

۲۳۔ اور ابراہیم کی قوم اور لوط کی قوم نے بھی۔

۲۴۔ اور مدین کے عوام (شعیب کی قوم) نے اور (فرعون کے پیروں نے) موسیٰ کو جھٹلایا۔ میں نے انہیں مہلت دی، مگر پھر میں نے ان کو پکڑ لیا، تو نے دیکھا کس طرح میں نے ان کے عمل کو مسترد کر دیا (اور ان کو کیا جواب دیا)

کان نکیں۔ ۱۰

ان کو دی گئی نعمتیں بھین لیں اور اذیت، زحمت اور بد نصیبی ان کا مقدر بنادی۔ زندگی سے کرموت دے دی۔ زیرِ عرش آخری آیت کے پچھلے جملے میں اللہ کی سزا سے اجمالی کی تفصیل بیان کر دی گئی ہے۔ ارشاد ہوا ہے: کتنی ہی بستیاں اور آبادی ایسی ہیں جن (کے باسیوں) کو ہم نے ہلاک کر ڈالا۔ کیونکہ وہ ظالم اور ستم گر تھے۔ (فککائن من قریب اہلکناھا وہی ظالمۃ)۔ ان کی جھٹیں نیچے آگئیں۔ (فہی خاویۃ علی عروشہا) یعنی خدیہ مذہب اس قدر سخت تھا کہ صحیح و سالم مکانات کی یکدم جھٹیں بیٹھ گئیں اور ان پر دیواریں آ رہیں۔ اور کتنے پراز آب کنویں لا وارث ہو گئے پانی زمین میں جذب ہو گیا اور وہ بے کار ہو گئے۔ نہ کوئی ان سے پانی نکالنے والا رہا اور نہ کوئی پیاس بجھانے والا بچا۔ (وبئر معطلۃ)

کتنی پختہ سرنگوں پر شکوہ عمارتیں زمین بوس ہو گئیں اور ان میں رہنے والے ملک عدم کے رہی ہو گئے (وقصر مشید)۔ ۱۱

اس طرح سے ان کے پر تعیش عمارت و مسکن لا وارث ہو گئے۔ اور ان کی زمین کی سرسبزی و شا وادی کے ضامن ذرائع آب و ہوا بھی ختم ہو کر رہ گئے۔

ایک نکتہ

اہل بیت اطہار کے ذریعے سے جو روایات ہم تک پہنچی ہیں ان میں ایک توجہ طلب نکتہ بیان کیا گیا ہے، کہ "بئر معطلۃ" سے مراد وہ علماء اور دانش ور ہیں جو معاشرے میں تنہا رہ گئے ہوں اور جن کے علوم و دانش سے کوئی کسب فیض نہ کرتا ہو۔ امام موسیٰ کاظم سے (وبئر معطلۃ وقصر مشید) سے متعلق روایت ہے کہ آپ نے فرمایا:

"البئر المعطلۃ الامام الصامت، والقصر المشید الامام الناطق"
"وہ کنواں جس سے استفادہ کرنے والا کوئی نہ ہو، اس امام درہر کی طرح ہے جو خاموش اور عالم سکوت میں ہو۔ بجز "قصر مشید" سے مراد وہ امام درہر ہے جو منصب رہبری پر عملًا فائز ہو۔"

۱۰ "نکیر" کا لغوی معنی اٹھا کرنا ہے اور یہاں سنا دینے اور مذہب و عقاب کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔
۱۱ "مشید" "مشید" اور وزن "بید" کے مادہ سے ہے۔ اس کے دو معنی ہیں۔ (۱) بلند و بالا (۲) سینٹ اور پختہ
پہلے معنی کے مطابق، سرنگ اور ملک بوس عمارت مراد ہے اور دوسرے معنی کے مطابق، پختہ ہونے اور موسیٰ تغیر و تبدل سے محفوظ مراد ہے جو ہم
اس زمانے میں اکثر اہل عام لوگوں کے مکانات کچے اور مٹی کے بنے ہوتے تھے جو فطری عوامل کے سامنے کمزور ہوتے تھے۔ مگر وہ دیروں اور مریدوں
ماکوں کے عمارت بننے یا اس قسم کے پختہ مواد سے بنائے جاتے تھے۔

اس طرح کی ایک روایت امام صادق سے بھی نقل کی گئی ہے۔ ۱۲

یہ روایات دراصل تشبیہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ (جبکہ حضرت مہدیؑ اور آپ کی عالمگیر عادل حکومت کو روایات میں "معد معین" (یعنی آپ جاری) کہا گیا ہے مطلب یہ ہے کہ جب رہبر اور امام مسند حکومت پر فائز ہو تو وہ ایک عالیشان سرنگ اور مضبوط محل کی مانند ہے۔ جو قریب و بعید سے ہر کسی کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے اور سب کے لیے ایک مرکز و پناہ گاہ کا کام دیتا ہے۔ مگر جب اسے مسند اقتدار سے ہٹا کر ناقابل اور ناقابل افراد کو اس کی جگہ پر بٹھا دیا جائے تو وہ اس متروک کنویں کی طرح ہو جائے گا جس سے نہ کوئی پیاس بجھائے اور نہ زمین اس سے سیراب ہو۔
"بئر معطلۃ" اور "قصر مشید" کے محاورے کو ایک عرب شاعر نے بھی بڑے دلکش انداز میں نظم کیا ہے۔ ۱۳

بئر معطلۃ وقصر مشرف مش لال محمد مستطرف
فالقصر مجدھم الذی لایرتقی والبر علمھم الذی لاینزف
متروک کنواں اور طہر علی آل محمد کے حالات کے لیے بڑی عمدہ مثال ہے "قصر" ان کی رفعت
بلندی اور وقار کی مثال ہے کہ جہاں تک کسی کی رسائی نہیں اور کنواں، ان کے علم کا مظہر ہے، جو کبھی
ختم نہیں ہوتا۔ ۱۴

۲۶۔ اَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْاَرْضِ فَتَكُونْ لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَا اَوْ اِذَا نُيَسْمَعُونَ بِهَا فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلَكِنْ تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ ۝

۲۷۔ وَلَيْسْتَ عَجَلُونَكَ بِالْعَذَابِ وَلَنْ يُخْلِفَ اللَّهُ وَعْدَهُ وَلَنْ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَأَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ ۝

۲۸۔ وَكَأَيِّنْ مِنْ قَرْيَةٍ اَمَلْنَا لَهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ ثُمَّ اخَذْتُهَا وَالِىَ الْمَصِيرُ ۝

ترجمہ

۲۶۔ کیا وہ زمین پر چلتے پھرتے نہیں کہ ان کے دل ادراک حقیقت کر سکتے اور کان صدائے حق سننے والے ہوتے۔ کیونکہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں، بلکہ سینے کے اندر دل اندھے ہو جاتے ہیں۔

۲۷۔ اور وہ تجھ سے عذاب میں تعجل کا تقاضا کرتے ہیں۔ حالانکہ اللہ کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتا اور تیسے رب کے ہاں ایک دن نھارے حساب کے ہزار سال کے برابر ہے۔

۲۸۔ کتنی بستیوں اور آبادیاں ایسی ہیں، جن کو میں نے مہلت دی۔ جب کہ وہ ظالم تھے۔ (لیکن انھوں نے اپنی اصلاح کے لیے اس مہلت سے فائدہ نہیں اٹھایا) پس میں نے ان کو دھریا اور سب کی بازگشت میری ہی طرف ہے۔

تفسیر

سیر و سیاحت اور دلوں کی بیداری

گذشتہ آیتوں میں ان بد اعمال اور دسیاہ ظالموں کے بارے میں گفتگو کی جا رہی تھی، جن کو اللہ نے کیغیر کردار تک پہنچایا اور ان کے شہروں کو برباد کر دیا۔ زیر بحث پہلی آیت میں اسی مضمون کی تاکید مزید کے طور پر ارشاد ہوتا ہے۔ آیا وہ زمین میں سیر و سیاحت نہیں کرتے ان کے دل حقیقت شناس ہو جائیں یا ان کے کان صدائے حق سن لیں۔ (اَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْاَرْضِ فَتَكُونْ لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَا اَوْ اِذَا نُيَسْمَعُونَ بِهَا)

بے شک ظالموں کے مہلات اور دنیا پرستوں کے ٹھکانے اور مساکن جن کا اقتدار کبھی بہت بلند تھا اس خاموشی کے باوجود ہزار ہزار باتیں کہہ رہے ہیں اور ہر بات میں ہزار ہزار سختے پوشیدہ ہیں۔ یہ دیوان اور اجڑی ہوئی بستیاں، گویا ان اقوام کی سوانح خود اور درختار، شرمناک طرز زندگی اور عبرت ناک انجام پر مسند بولتی کہاتیں ہیں۔

یہ کھنڈرات اور ان سے نظر آنے والے آثار انسان کے دل و دماغ پر ایسے اثرات مرتب کرتے ہیں کہ بعض اوقات ان میں سے کسی ایک جگہ کا مشاہدہ کثیر مطالعے سے زیادہ اثر انگیز ہوتا ہے اور تاریخ کے اٹھارے جاننے کے تناظر میں، جو انسانی زندگی کی بنیاد ہے، ان کھنڈرات کا مشاہدہ انسان کے مستقبل کو مجسم شکل میں اس کے سامنے لا کھڑا کرتا ہے۔ واقعی سابقہ اقوام کا مطالعہ اور ان کے آثار کا مشاہدہ کان کو شہنوا اور آنکھ کو بیسنا کر دیتا ہے۔

اسی لیے قرآن مجید کی متعدد آیات میں سیاحت کی ترغیب دی گئی ہے۔ لیکن الہی اور اخلاقی سیاحت میں کی غرض و غایت عبرت حاصل کرنا اور جنت کی سیاحت کی آنکھوں سے گویا اس کا دل جھانک رہا ہو جو ملائک کے ایوانوں اور فرشتوں کے حلوں کو نگاہ عبرت سے دیکھ رہا ہو کہ یہی وجہ کے ساتھ ساتھ ملائک کی وادیلوں میں پہنچے اور کبھی ملائک میں اپنے آنسوؤں سے ایک نیا دجلہ بہا دے۔

خالم بادشاہوں کے حملات کے کھنڈروں میں ٹوٹے ہوئے برہمنوں سے نصیحت حاصل کرے اور دل کے کانوں سے وہاں کی خاک کے ہر ذرے سے سنانی دیتا ہوا یہ لغز دل نشیں منے سے
گامی دوسرے برہمن
اشکی دوسرے بھٹان

یعنی دو تین قدم چلو اور دو تین آنسو بہا دے۔

اس کے بعد قرآن مجید اس حقیقت کو کہ اکثر لوگ ظاہر صیح و سالم آنکھیں افکان رکھتے ہیں۔ مگر دل کے اندر سے اور ہرے بھتے ہیں۔ زیادہ واضح کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے۔ کیونکہ ظاہری آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں۔ بلکہ سینوں کے اندر دل اندھے ہو جاتے ہیں (فَاَنظُرْهَا لَا تُعْصِي الْاَبْصَارَ وَلَكِنْ تَعْصِي الْقُلُوبَ وَالْغَمَىٰ فِي الصُّدُورِ)۔

حقیقت یہ ہے کہ ظاہری آنکھوں سے محروم جو عرف عام میں اندھے کہلاتے ہیں۔ بعض اوقات بہت روشن دل اور باہر ہوتے ہیں حقیقی اندھے تو وہ لوگ ہیں کہ جن کے دل کی آنکھ اندھی ہو گئی ہو اور وہ صیح اور اک نہ کر سکتے ہوں۔ اسی لیے حضرت رسول اکرمؐ نے فرمایا۔

شَرُّ الْعَمَىٰ عَمَى الْقَلْبِ

بدترین اندھا پن دل کا اندھا پن ہے

ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

اعْمَى الْعَمَىٰ عَمَى الْقَلْبِ

”سب سے شدید اندھا پن دل کا اندھا پن ہے۔“

غوالی اللہ تعالیٰ میں ایک اور روایت درج ہے۔

حضرت پیغمبر اکرمؐ فرماتے ہیں۔

اِذَا ارَادَ اللّٰهُ بِعِبْدٍ خَيْرًا فَافْتَحْ عَيْنَ قَلْبِهِ فَيَشَاهِدُ بِهَا مَا كَانَ

”اگر اللہ تعالیٰ کسی عیبدار کے ساتھ نیکوئی کے آثار کے متعلق سیاحت کے آداب کے بارے میں سورۃ آل عمران آیت ۱۵۹ کی تفسیر کے تحت ہم اس تفسیر کی جگہ پر ہمیں یہ ملاحظہ کرنا چاہیے۔

تفسیر نوافلین ج ۲ ص ۳۷

غَائِبًا عَنْهُ۔

جب اللہ کسی بندے کی بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے تو اس کے دل کی آنکھیں روشن کر دیتا ہے تاکہ وہ

اس ذریعے سے پوشیدہ حقائق کا مشاہدہ کر سکے۔

یہاں یہ سوال ابھرتا ہے کہ ادراک حقائق کی نسبت سینے کے اندر دل سے کیوں دی گئی ہے۔ حالانکہ دل کا کام صرف خون کو گردش دینا ہے۔ اس کا جواب ہم سورۃ بقرہ کی تفسیر کے ذیل میں پہلی جلد میں دے چکے ہیں البتہ یہاں خلاصہ پیش خدمت ہے

دل کو عقل کے معنی میں بھی لیا گیا ہے اور سینہ انسان کی ذات اور سرشت کے معنی میں ہے۔ اس کے علاوہ جذبات اور میلانات کا مظہر بھی دل ہی ہے۔

جب کبھی جذباتی ادراک کی کوئی برقی روح شدید تحریک کا سبب ہوا کرتی ہے۔ انسانی روح میں ظاہر ہوتی ہے تو سب سے پہلے اس سے متاثر ہونے والا عضو بدن ہی دل ہی ہے۔ دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے۔ خون بڑی تیزی سے بدن کے ہر عضو میں پہنچتا ہے اور جسم کو ایک تازہ نشا اور نئی توانائی حاصل ہوتی ہے۔ اس وجہ سے روح کے ظواہر کی نسبت ”دل کی طرف دی جاتی ہے۔“ (قابل غور ہے)

زیر بحث آیت میں توجہ طلب نکتہ یہ ہے کہ انسان کے مجموعی ادراکات کی نسبت دل (نقل) اور کانوں کی طرف دی گئی ہے گویا اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے کہ ادراک حقیقت کے صرف دواستے ہیں۔

۱۔ اندرونی

۲۔ بیرونی

یعنی یا تو انسان اپنے اندر سے جو شش و دلوں کے کراس کا تجربہ کرے اور اس طرح حقائق تک پہنچے یا بیرونی عوامل، مثلاً انبیاء، اوصیاء، اولیاء اور نامعین و تائیدین کی حقیقت آفریں باتوں سے حق کو پالے یا دلوں سے حقیقتوں سے حق تک پہنچے۔

دوسری نظر آیت میں ہے ایمان، جاہل، بے خبر اور دل کے اندر دل کا ایک ہیچہ دکھایا گیا ہے کہ وہ جلد عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ اگر تم سچے ہو تو پھر خدا کا عذاب کیوں نہیں آتا۔ (وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالْعَذَابِ)۔

”ان سے کہہ دیجئے کہ جلدی ذکریں اللہ بھی مدد غلطی نہیں کرتا۔ (وَلَنْ يَخْلُفَ اللّٰهُ وَعْدَهُ) کیونکہ جلدی اور عجلت تو اسے ہوا کرتی ہے۔ جسے یہ ڈر ہو کہ کہیں موقع ہمارے نکل نہ جائے اور اس کے وسائل و اختیارات ختم نہ ہو جائیں۔ بلکہ اللہ جوازل سے ابد

تفسیر نوافلین ج ۲ ص ۳۷

تفسیر المیزان زیر بحث آیت کی تفسیر کے ذیل میں ج ۲ ص ۳۷

تک ہر چیز پر قدرت کاملہ رکھتا ہے کسی کام میں جلدی کیوں کرے گا۔ وہ ہمیشہ اپنے وعدوں کو بروقت پورا کرتا ہے، اس کے نزدیک ایک لمحہ، دن یا ایک سال سب برابر ہیں۔ کیونکہ تیرے پروردگار کے ہاں ایک دن تھارے حساب سے ہزار سال کے برابر ہے۔

(وان یوما عند ربک کا الف سنة مما تعدون)

چنانچہ وہ سنجیدگی کے ساتھ عذاب کا مطالبہ کریں یا بطور تھنیک استغناء الیسا کہیں کہ کیوں عذاب خدا ہم پر نازل نہیں ہوتا۔

انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ کی طرف سے آنے والا عذاب ان کی گھات میں ہے جلدی یا بدیر ضرور ان کو آئے گا۔ یہ مہلت جو انہیں دی گئی ہے اس کا مقصد ان کو بیداری شعور اور تجدید نظر کا موقع فراہم کرنا ہے۔

اور جب عذاب نازل ہو گیا تو معافی اور توبہ کے تمام دروازے ان پر بند کر دیئے جائیں۔ شعور اور نجات کا کوئی راستہ باقی نہیں رہے گا۔

”ان یوما عند... مما تعدون“ کے جملے کی مندرجہ بالا تفسیر کے علاوہ اور مغایر بھی مفسرین نے پیش کیے ہیں، مجاہد ان کے ایک یہ ہے کہ کسی کام کو یا یہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے تھیں ہزار سال کا عرصہ بھی لگ سکتا ہے مگر اللہ کو نہ کسی تیاری کی ضرورت ہے نہ وقت کی احتیاج، بلکہ وہ کسی کام (عذاب) کو ایک دن (بلکہ اس سے کم) میں بھی انجام دے سکتا ہے۔

ایک اور مفہوم یہ ذکر کیا گیا ہے کہ آخرت کا ایک دن دنیا کے ہزار سال کے برابر ہے (اسی لحاظ سے وہاں کی جزا اور سزا کی طوالت بھی زیادہ ہے) اس سلسلے کی ایک روایت نقل کی گئی ہے

ان الفقراء یبدخلون الجنة قبل الاغنیاء نصف یوم ای خمسة

مائتة عامر

”غریب لوگ امیر کبیر لوگوں کے مقابل میں آدھا دن یعنی پانچ سو سال قبل جنت میں داخل ہوں گے“۔
آخری آیت میں گذشتہ آیتوں میں بیان شدہ بنیادی نقطہ عادتہ بیان کیا جا رہا ہے اور اسی طرح ہٹ و حرم کفار کو توبہ کی جا رہی ہے۔

”ایسی کتنی بستیاں اور آبادیاں ہیں، جنہیں ہم نے مہلت دی، حالانکہ وہ ظالم تھے (مہلت اس لیے دی گئی تاکہ وہ خواب غفلت سے جاگ اٹھیں۔ مگر جب ایسا نہ ہوا تو پھر ہم نے انہیں دھیل دی تاکہ پر تعیش زندگی میں مگن ہو جائیں، پھر چونکہ ان کی سزا یعنی شدید عذاب نے انہیں آلیا (وکان من قریة املیت لها وحی ظالمة شقا خذتها) تو وہ بھی تیری

۱۰ تفسیر مجمع البیان زیر بحث آیت کی تفسیر کے ذیل میں۔

طرح عذاب میں تاخیر و شکایت کرتے تھے اور مذاق اڑایا کرتے تھے اور اس تاخیر عذاب کو پیہروں کے جھوٹا ہونے کی دلیل بنا لیا کرتے تھے۔ لیکن آخر کار عذاب میں مبتلا ہوئے اور آہ و بکا کرنے لگے مگر اس آہ و بکا کی شہنائی نہ ہو سکی۔ بے شک یہ سب میری طرف ہی لوٹیں گے۔ تمام راہیں اللہ ہی پر جا کر ختم ہوتی ہیں۔ اور تمام ذخائر و وسائل اور یہ تمام دولت و ثروت یہاں باقی رہ جائے گی اور وہی ان سب کا مالک ہے۔ (والی المصیبر)۔

۴۹۔ قَدْ يَأْتِيهَا النَّاسُ إِنَّمَا أَنَا لَكُمْ بَازٍ مُبِينٌ ۝

۵۰۔ فَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ ۝

۵۱۔ وَالَّذِينَ سَعَوْا فِي آيَاتِنَا مُعْجِزِينَ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ ۝

ترجمہ

۴۹۔ کہہ دیجئے! اے لوگو! میں تمہارے لیے ایک واضح ڈرانے والا ہوں۔

۵۰۔ وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے بھلائی کے کام کیے ان کے لیے معافی اور اچھا رزق ہے۔

۵۱۔ اور وہ لوگ جنہوں نے ہماری نشانیوں کے بارے میں (مٹانے کی) کوشش کی، اور یہ سمجھے کہ وہ ہم پر غلبہ حاصل کر لیں گے۔ وہ اہل جہنم ہیں۔

تفسیر

رزق کریم

گذشتہ آیتوں میں کفار کی طرف سے عذاب میں تعین کے مطالبے کا ذکر تھا اور یہ مسئلہ صرف ذات پروردگار عالم اور اس کی حکمت افریقہ مشیت سے متعلق ہے۔ یہاں تک کہ انبیاء کو بھی اس میں کسی قسم کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ چنانچہ زیر بحث پہلی آیت میں ارشاد ہوتا ہے، کہہ دیجئے۔ اے لوگو! میں تمہارے لیے صرف ایک حکم کھلا ڈال رہا ہوں۔

ہوں۔ (قل یا ایہا الناس اتعبدوا اللہ من دیر قبین ۲) البتہ سرکش اور نافرمانی کی منہا کے طور پر جلد یا بدیر کوئی عذاب تم پر نازل ہو۔ تو اس کا تعلق مجھ سے نہیں ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ پیغمبر اکرم ﷺ ڈرا دیا ہے اور خوشخبری دینے والے بھی مگر اس آیت مبارکہ میں خوشخبری کا ذکر نہ کرنے اور صرف ڈرانے کی بات کرنے کی وجہ مخصوص نظریے کے مخاطب ہیں۔ چونکہ وہ بے ایمان اور بٹ دھرم قسم کے افراد تھے۔ جو خدائی عذاب و عقاب کا بھی مذاق اڑا کرتے تھے۔ البتہ بعد والی دو آیتوں میں بشارت اور ڈراوا، دونوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ چونکہ اللہ کی رحمت و اسرار کے عذاب پر سبقت رکھتی ہے۔ لہذا پہلے بشارت کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہ لوگ جو ایمان لے آئے اور انہوں نے بھلے کام کیے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے معافی اور اعلیٰ رزق و روزی ان کے لیے مخصوص ہے (فالذین آمنوا وعملوا الصالحات لهم مغفرة ورزق كريم) یعنی پہلے اللہ کی معافی بخشش اور عسود و رزق جاری نہر میں غوطہ زن ہو کر کثافت و غلاظت کے بوجھ سے سبکدوش ہوتے ہیں۔ پاک باطن بن جاتے ہیں، پھر اس کے لطف و کرم کی طرح طرح کی نعمتوں سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔

اس لحاظ سے کہ ”کریم“ سے مراد ہر قابل قدر اور اعلیٰ چیز ہوا کرتی ہے ”رزق کریم“ ایک وسیع مفہوم پر دلالت کرتا ہے جو تمام مادی اور معنوی گرانقدر نعمتوں پر محیط ہے۔

بے شک اللہ اپنے اس کریم مہمان خانے میں طرح طرح کی کریم نعمتوں کے ساتھ اپنے مومن، صالح اور کریم بندوں پر فیض و برکات کی بارش کرے گا۔

راغب اپنی مشہور کتاب ”مفردات“ میں مکتوبات سے کلفظ ”کریم“ عام طور پر بہت نیک، بھلے، اچھے اور قابل قدر امور کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، کم درجے کی نیکی اور اچھائی کے لیے نہیں۔ بعض مفسرین نے ”رزق کریم“ سے غیر منقطع، مسلسل بے نقص، روزی کے معنی مراد لیے ہیں اور بعض نے مناسب اور حیرت انگیز حال کا مفہوم لیا ہے۔ اصل میں یہ سب معانی ہم مندرجہ مذکور مفہوم میں شامل ہیں۔

اس کے بعد دوبارہ فرمایا گیا ہے: لیکن وہ لوگ جو اللہ کی نشانیوں کو مٹانے اور تحریفی کاروائیوں میں سرگرم ہیں اور اپنے رعب باطل میں اللہ کے ارادوں پر غلبہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ دوزخی ہیں (والذین سعوا فی آياتنا معاجزین اولئک اصحاب الجحیم) ۱۔

۱۔ ”سَعَوْا“ سعی کے مادہ سے دوڑنے کے معنی میں ہے اور یہاں آیات الہی کو مٹانے کے لیے کوشش کرنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ”معاجزین“ ”عجز“ کے مادہ سے ہے۔ یہاں ان لوگوں کے ارادوں کو ٹھاکر کرنے کے لیے استعمال ہوا ہے جو اللہ تعالیٰ کے بے پناہ قوت و سطوت پر غلبہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ بعض مفسرین نے معاجزین کو پیغمبر اور مومن کے ساتھ منسوب سمجھا ہے۔ ان کے خیال میں کسی شخص کے بارے میں یہ احتمال نہیں ہو سکتا کہ وہ خدا کو عاجز کرنا چاہتا ہو۔ حالانکہ یہی تعبیر و قرآنی آیات میں اللہ تعالیٰ کے بارے میں آئی ہے (سورہ جن۔ ۱۲ اور سورہ صافات۔ ۱۲) اور مراد یہ ہے کہ کسی کا عمل اس کے جبر سے غافل ہو۔

”جَحِيْمٌ“ جَحَم (بروزن شَرَم) کے مادہ سے ہے۔ اس کا معنی آگ کا شدت سے بھڑکنا اور غیظ و غضب کی شدت ہے۔ لہذا جَحِيْم وہ جگہ ہوئی، جہاں آگ، غیظ اور غضب شدت سے بھڑکتے ہیں۔ یعنی دوزخ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

۵۲۔ وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ إِلَّا إِذَا تَمَنَّى أَلْقَى الشَّيْطَانُ فِي أُمْنِيَّتِهِ فَيَنْسَخُ اللَّهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ ثُمَّ يُحْكُمُ اللَّهُ أَيْتَهُ ۖ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ۝

۵۲۔ لِيَجْعَلَ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ فِتْنَةً لِلَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ وَالْقَاسِيَةِ قُلُوبُهُمْ وَإِنَّ الظَّالِمِينَ لَفِي شِقَاقٍ بَعِيدٍ ۝
۵۲۔ وَلِيَعْلَمَ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ فَيُؤْمِنُوا بِهِ فَتُخْبِتَ لَهُ قُلُوبُهُمْ وَإِنَّ اللَّهَ لَهَادِ الَّذِينَ آمَنُوا إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ۝

ترجمہ

۵۲۔ اور ہم نے تجھ سے پہلے جو بھی رسول اور نبی بھیجا جب بھی وہ کوئی آرزو کرتا (اور اپنے الہی اہداف کی تکمیل کے لیے کوئی منصوبہ بناتا) تو شیطان ضرور اس میں دوسو سے پیدا کر دیتا، پھر خدا انہیں مٹا دیتا اور اپنی نشانیوں کو استحکام بخشتا اور اللہ علیم و حکیم ہے۔

۵۳۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ اللہ شیطانی دوسو لوگوں کو ان لوگوں کے لیے آزمائش قرار دے، جن کے دلوں میں بیماری ہے اور جو سنگ دل ہیں اور ظالم حق سے دور شدید بغض و عناد میں بھرے ہوئے ہیں۔

۵۴۔ اور علاوہ برائیں مقصد یہ تھا کہ وہ لوگ جنہیں اللہ نے علم دیا ہے جان لیں، کہ تیرے پروردگار کی طرف سے یہ حق ہے۔ چنانچہ ایمان لے آئیں، دل سے اس کے سامنے تسلیم خم کر دیں اور اللہ صاحبان ایمان کو راہ راست کی طرف ہدایت کرتا ہے۔

تفسیر

انبیاء کے خلاف شیطانی وسوسے

گذشتہ آیتوں میں کفار اور مشرکین کی طرف سے دین خدا کی تضحیک اور استہزاء اور اسے مٹانے کی سرگرمیوں کا ذکر تھا۔ زیر بحث آیتوں میں لوگوں کو آگاہ کیا جا رہا ہے کہ دین و شمن و سہیہ کا یہاں کوئی نئی بات نہیں، بلکہ ہمیشہ سے طاغوتی اور شیطانی شکوک و شبہات انبیاء کے مقابلے میں پھیلانے جاتے رہے ہیں۔ چنانچہ پہلی آیت میں ارشاد ہوتا ہے: "تجوہ سے پہلے ہم نے جب کبھی بھی کوئی رسول بھیجا اور اُس نے خدائی مقام کی توسیع و ترقی کا جو منصوبہ بھی بنایا۔ ضرور شیطان نے اس میں شکوک و شبہات پھیلانے کیے۔" (وما ارسلنا من قبلك من رسول ولا نبی الا اذا تمشی فی السیطان فی امنیہ) لیکن اللہ شیطان کے ان دوسو لوگوں کے ہجوم میں اپنے پیغمبر کو کبھی تنہا نہیں چھوڑتا۔ بلکہ "اللہ شیطان کے شکوک و شبہات کو زائل کر دیتا اور اپنی نشانوں کو استحکام بخشتا ہے۔ فی نسخ اللہ ما یلقى الشیطان شقہ یحکمہ اللہ" ایسا کہ اللہ کے لیے آسان ہے، کیونکہ وہ علیم و حکیم ہے، تمام منفی ریشہ و انہول سے پوری طرح باخبر ہے۔ اور ان کو ناکام بنانے کے طریقوں سے ابھی طرح واقف ہے (واللہ علیہ حکیم بالبتہ دین و شمن طاغوتوں کی سیلہ کاریاں اور طاغوتی کارستانیاں ہمیشہ مومنین، باخبر افراد اور کفار سب کے لیے آسمان کا سبب بنتی ہیں، چنانچہ بعد الی آیت میں ارشاد ہوتا ہے: "یہ تمام امور بیمار دل اور سنگدل افراد کی آزمائش کا ذریعہ ہیں۔ (لیجعل ماسی لقی الشیطان فتنہ لیسوین فی قلوبہم مرض والفساقۃ قلوبہم و ظالم و نا انصاف لوگ حق سے

بہت دور ہیں اور ان کے دل بغض و عناد سے بھرے پڑے ہیں (وارت الظالمین لفی شقاق بعیذ) علاوہ برائیں ان کا ایک اور مقصد یہ تھا کہ آگاہ اور باخبر لوگ حق و باطل میں تمیز کریں، خدائی ضابطوں اور شیطانی شکوک میں امتیاز کریں اور دونوں کا موازنہ کر کے سمجھ جائیں کہ خدائی قانون ہی دین ہی ہے اور تیرے رب کی طرف سے ہے، چنانچہ اس پر ایمان لے آئیں اور ان کے دل پوری طرح اللہ کی بارگاہ میں جھک جائیں (ولیجعل الذین اوتوا العلم انہ الحق من ربک فیتؤمنوا بہ فتخبت لہ قلوبہم)۔ بے شک اللہ ان آگاہ اور حق طلب مومنین کو ان خطرناک راہوں میں اکیلا نہیں چھوڑتا، بلکہ اللہ صاحبان ایمان کو راہ راست کی ہدایت کرتا ہے (وان اللہ لہاد الذین امنوا الی صراط مستقیم)۔

چند اہم نکات

۱۔ شیطانی شکوک و شبہات کیا ہیں؟ مندرجہ بالا تفسیر کے علاوہ ان آیتوں کے بارے میں اور خیالات کا بھی اظہار کیا گیا ہے اگرچہ مذکورہ بالا تفسیر بعض محقق مفسرین کے نظریات سے ہم آہنگ ہے۔ بعض مفسرین کے نزدیک "تمنی" اور "امنیہ" کے معنی تلاوت یا قرأت کے ہیں اور بعض عرب شعراء نے بھی ان الفاظ کو اسی معنی میں استعمال کیا ہے۔ اس بنا پر زیر بحث پہلی آیت کا ترجمہ یہ ہوگا کہ ماضی میں حبیب انبیاء اللہ کے احکامات لوگوں کو سناتے تھے تو شیطانیین (خصوصاً شیاطین نا انسان) ان کی گفتگو میں شکوک و شبہات پیدا کر دیتے اور عوام کو گمراہ کرنے کے لیے اور پیغمبروں کی ہدایت کو غیر موثر بنانے کے لیے، ان کی تقریر کے دوران ہی باطل نظریات کا پرچار کرنے لگتے۔ لیکن اللہ اپنی قدرت کا طرے ان باطل افکار کے اثرات کو زائل کر دیتا اور اپنے احکامات کو پیشگی بخفا، یہ معنی ہے۔

"شقہ یحکمہ اللہ آیاتہ"

کے جملے سے مطابقت رکھتا ہے اور بعد میں آنے والے غرضی کے فنانے سے ملتا جلتا ہے اگرچہ بعض پہلوؤں کے اعتبار سے) لیکن زیادہ غور طلب بات یہ ہے کہ "تمنی" اور "امنیہ" تلاوت کے معنی میں شاذ ذی استعمال ہوئے ہیں۔ حتیٰ کہ خود قرآن حکیم میں کہیں بھی اس معنی میں استعمال نہیں ہوئے۔ "تمنی" کا اصل مادہ "منی" (بروزن منشی) ہے اور یہ دراصل تقدیر اور فرض کے معنی میں ہے۔ انسان اور جو ان کے لفظ کو اسی لیے "منی" کہا جاتا ہے کہ اس سے شے کی شکل و صورت معین ہوتی ہے۔ "منیہ" موت کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ اس لیے کہ موت انسان کے لیے مقدمہ ہوتی ہے۔ آرزوؤں کو بھی تمنی اسی لیے کہا جاتا ہے کہ انسان اپنے ذہن میں ان کی تصویر بنالیتا ہے اور انھیں اپنا مقدمہ سمجھنے لگتا ہے۔ مختصر یہ کہ اس لفظ کی بنیاد ہر جگہ تقدیر، فرض اور تصویر ہی ہے۔ یوں تو تلاوت اور قرأت کو بھی اس معنی سے مرتبط کیا جاسکتا ہے کہ تلاوت الفاظ کی تقدیر و تصویر ہی تو ہے۔ مگر یہ ربط بہت دور کا ہے اور عربی زبان میں ایسے ربط کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ البتہ انبیاء مرسلین کے منصوبوں اور پروگراموں والا معنی جو ہم نے پیش کیا ہے وہ اس لفظ کے بنیادی اور اصلی معنی

کے بہت قریب ہے۔

اسی ذیل میں ایک تیسرا احتمال یہ بھی پیش کیا ہے کہ اس سے مراد وہ شیطانی دوسے ہیں جو بہت ہی کم وقفے کے لیے انبیاء سے پاک اور فرشتوں کی نگاہ سے ڈالے جاتے تھے مگر مقام عصمت کی وجہ سے اللہ کی عظمیٰ قوت اور مدد کے ذریعے ان دوسروں کی بہت جلد ناکل کر دیا جاتا تھا اور ان کو بدستور راہ راست پر قائم رکھا جاتا تھا۔ یہ مفہوم بھی بعد کی آیتوں سے مطابقت نہیں رکھتا کیونکہ بعد والی آیت میں یہ کہا گیا ہے کہ یہ شیطانی شکوک اور دوسرے صاحبانِ علم، مومنین اور کافروں کے لیے آزمائش کا ذریعہ تھے چنانچہ اس مفہوم کا تعلق انبیاء کی قلبی اور فکری کیفیت سے ہرگز نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ بہت جلد شیطانی دوسروں کو سمجھ لیتے تھے اور ان سے دور رہتے تھے۔

بہر حال اس تفصیل سے واضح ہو جاتا ہے کہ سب سے پہلی تفسیر سب سے زیادہ مناسب ہے جس میں انبیاء کی کارکردگی اور مصروفی کے تحت مقابل شیطانی سازشوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، جن کے ذریعے وہ انبیاء کے غلامی اور فکری منصوبوں کو ہمیشہ سبوتاژ کرنے کے درپے رہتے تھے مگر اللہ ان کو ناکام بنادیا کرتا تھا۔

۲۔ "غرائبق" کا من گھڑت فسانہ بعض کتب اہل سنت میں اس موقع پر ابن عباس سے ایک عجیب روایت نقل کی گئی ہے۔ وہ یہ کہ رسول اللہ ﷺ سورۃ النجم کی تلاوت میں مصروف تھے جب

آپ اس آیت مجیدہ

أَفَرَأَيْتُمُ اللَّاتَ وَالْعُزَّىٰ ۖ وَمَنْوَةَ الْغَابِیَةِ ۚ

جس میں مشرکین کے بتوں کے نام لیے گئے ہیں، پر پہنچے تو شیطان نے آپ کی زبان پر یہ جملے جاری کر دیئے "ثَلَاثُ الْغَرَائِبِقِ الْعَلٰی ۖ وَانْ شَفَاعَتُهُنَّ لَتَرْجَبِ ۖ"

یہ دلکش بلند پایہ پرندے ہیں جن سے شفاعت کی امید باقی ہے۔ ۱۔
یہ سننا تھا کہ مشرکین محض بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے "آج پہلا موقع ہے کہ محمد نے ہمارے خداؤں کے ناموں کو اچھائی کے ساتھ لیا ہے"

اس وقت پیغمبر اکرم نے سجدہ کیا اور مشرکین نے بھی سجدہ کیا، جبرائیل نازل ہوئے اور اطلاع دی کہ مومن الذکر و الذکر میں آپ کے پاس نہیں لایا تھا بلکہ دوسرے شیطانی تھے اور اس وقت (وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ نَبِیٍّ ...)
والی آیت نازل ہوئی اور اس طرح رسول اللہ ﷺ اور مومنین کو تسبیح کی گئی۔ ۲۔

بعض اسلام دشمنوں نے پیغمبر اکرم کے متین کو نقصان پہنچانے کے لیے اس روایت کو اپنے لیے بڑی عمدہ

۱۔ "غرائبق" "غرنوق" (بروزن "مزدور" کی جمع ہے۔ یہ سفید یا سیاہ رنگ کا ایک آبی پرندہ ہے۔ اس کے علاوہ یہ لفظ اور معنی میں بھی آیا ہے۔ (قاموس اللغة)

۲۔ تفسیر المیزان زیر بحث آیت کی تفسیر سے ذیل میں یہ حدیث اہل سنت کے حقاہ حدیث سے نقل کی گئی ہے۔ ان میں ابن جریر شامل ہیں۔

دستاورز بنایا ہے۔ انہوں نے اس معاملہ کو بڑی شد و مد سے نقل کیا ہے اور اس پر بہت ماحیے چڑھائے ہیں۔ جب ایسے بہت سے قرآن موجود ہیں، جن سے بات ظاہر ہوتی ہے کہ یہ ایک من گھڑت حدیث ہے۔

(i) مثلاً بقول محققین اس حدیث کے راوی ضعیف اور غیر ثقہ ہیں اور ابن عباس سے اس کا روایت ہونا ثابت نہیں ہے۔
بقول محمد ابن اسحاق یہ قصہ زندیقوں اور محدول کے بہت سے گھڑے ہوئے قصوں میں سے ایک ہے۔ اس نے یہ بات اپنی ایک کتاب میں لکھی ہے۔ ۱۔

(ii) سورۃ النجم کی ابتدائی آیتوں میں صریحاً ان خرافات کی نفی کی گئی ہے۔ اس سورۃ کی تیسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے "وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی ۚ اِنَّ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی"

"رسول اللہ ہوائے نفس سے کلام نہیں کرتے وہ جو کچھ بھی کہتے ہیں وحی ہوا کرتی ہے"

اس آیت کی موجودگی میں مذکورہ فسانہ کیا حیثیت رکھتا ہے۔

(iii) سورۃ النجم کے نزول کے دوران اور اس کے بعد حضرت پیغمبر اکرم اور مسلمانوں کے سجدہ کرنے کے بارے میں مختلف کتابوں میں متعدد روایات نقل کی گئی ہیں۔ مگر کسی میں غرائبق والا فسانہ موجود نہیں ہے، جو اس اسکا بیان ثبوت ہے کہ یہ فسانہ بعد میں بڑھایا گیا ہے۔ ۲۔

(iv) ان بتوں کے نام والی آیت کے بعد آنے والی آیتیں سب کی سب بتوں کی شدید مذمت کر رہی ہیں اور ان کی ہستی و مصالحت کو واضح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ تعالےٰ من گھڑت ادہام و تصورات ہیں، جن کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

اِنَّ هِيَ اِلَّا اَسْمَاءٌ سَمَّیْتُمُوْهَا اَنْتُمْ وَاٰبَاؤُكُمْ مَّا اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ سُلْطٰنٍ اِلَّا یَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاَسَاسَ تَهْوٰی اِلَیْهِ النَّفْسُ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِنْ رَبِّهِمْ الْهُدٰی۔

مذمت کے ان شدید الفاظ کے بعد کس طرح تصور کیا جاسکتا ہے کہ پہلے کی کسی آیت میں بتوں کی تعریف و توصیف کی گئی ہو۔ مزید برآں قرآن مجید کے بارے میں صریحاً کہا گیا ہے کہ یہ ہر قسم کی تعریف و تغیر سے منزہ ہے۔ سورۃ النجم آیت ۱۸ اس طرح ہے۔

اِنَّا خَلَقْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَکَ اِلٰھَافُظُّوْنَ۔

(v) پیغمبر اکرم نے زندگی جہتوں کے خلاف مسلسل دہم جہاد فرمایا اور کبھی لمحہ بھر کے لیے بھی ان سے سمجھوتہ نہیں فرمایا۔ ابتدائی سن مبارک سے لے کر آخری دن تک بتوں اور بت پرستی کی طرف معمولی سا جھکاؤ اور میلان بھی نہیں دکھایا۔

۱۔ تفسیر کبیر فخر الدین رازی ج ۳ ص ۵۔

۲۔ تفسیر کبیر فخر الدین رازی ج ۳ ص ۵۔

ہاں تک کہ سخت ترین حالات میں بھی آپ کے رویے میں ذرا سی پچک بھی پیدا نہ ہوئی تو پھر کس طرح ممکن کہ یہ الفاظ آپ کی زبان مبارک پر آئے ہوں۔

(۷۱) وہ لوگ جو مسلمان نہیں اور آپ کو منصوص من اللہ نہیں مانتے۔ وہ بھی آپ کو ایک مذہب مفکر اور دانشور منور سمجھتے ہیں اور اعتراف کرتے ہیں کہ آپ نے اپنی حکمانہ تدبیروں سے شاندار کامیابیاں حاصل کریں تو اس کردار کی حامل شخصیت جو زندگی بھر لا الہ الا اللہ کا نعرہ بلند کرے کس قسم کی مصالحت اور سمجھوتے کے بغیر شرک و بدعت پرستی کے خلاف جہاد مسلسل جاری رکھے۔ کیا ممکن ہے کہ یکایک اپنے مقصد کو چھوڑ کر تنوں کی تعریف کرنے لگ جائے؟

مسند رجبہ بالا مفصل بحث یہ واضح کر رہی ہے کہ ”غدرانیق“ کا قصہ عیار دشمنوں اور بے خبر مخالفوں کا خود ساختہ ہے۔ جنہوں نے قرآن مجید اور پیغمبر اکرم کی حیثیت کو داغدار کرنے کے لیے بے بنیاد اور گمراہ کن روایات گھڑی ہیں بشیوعہ دشمنی سے بالاتر جو کہ اسلام کے تمام متقیین نے اس روایت کی پوری شد و مد کے ساتھ نفی کی ہے۔ لہ

البتہ بعض مفسرین نے اس قصے کی توجیہ کی ہے۔ لیکن توجیہ کی وقعت تو تب ہے جب اصل حدیث صحیح ثابت ہو جاتی بہر حال انہوں نے توجیہ یوں کی ہے کہ پیغمبر اکرم قرآن مجید کی تلاوت ٹھہر کر کیا کرتے تھے اور آیات کے درمیان چند لمحوں کا وقفہ کیا کرتے تھے تاکہ آیات سامعین کے ذہن نشین ہو جائیں۔ سورۃ نجم کی تلاوت کے دوران میں بھی جب آپ نے (اَفَرَأَيْتُمُ اللَّاتَ وَالْعُزَّىٰ الْاٰخِرٰی) والی آیت تلاوت کرنے کے بعد وقفہ فرمایا تو غیظان صفت ہٹ دھرم مشرکین نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے (ثَلَاثُ الْغَدْرَانِیْقِ لَلتَرْجِی) کا جملہ اسی غیظان کے ساتھ کہہ دیا تاکہ پیغمبر اکرم کا تنہا ٹھہرے اور لوگوں میں شکوک پیدا ہوں۔ لہ

مگر بعد والی آیتوں نے مسئلے کو واضح کرتے ہوئے اس کا دندان شکن جواب دے دیا اور بت پرستی کی شدید مذمت کی۔ اس سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ یہ جو بعض افراد نے ”غدرانیق“ والی داستان متعصب مشرک بت پرستوں کی ہٹ دھرمی کے باوجود ان کو اسلام کی طرف مائل کرنے کے لیے پیغمبر اکرم کے جھکاؤ اور سیلان کے طور پر بیان کی ہے۔ ایسا کرنے میں وہ فاش غلطی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ کیونکہ ان کا یہ کہنا خود اس حقیقت کا واضح ثبوت ہے کہ انھیں جاہل بت پرستوں کے ساتھ پیغمبر اکرم کے دلوں کو روکنے کا ارادہ نہیں ہے اور ان تاریخی حقائق سے یا تو بے خبر ہیں یا تجاہل عارفانہ کا مظاہرہ کر رہے ہیں کہ جن کے مطابق مشرک، پیغمبر اسلام کو منہ مانگے دام دینے کے لیے تیار تھے۔ بشرطیکہ آپ اپنے موقف سے دستبردار ہو جائیں۔ مگر آپ نے ان کی ہر پیش کش کو ٹھکرا دیا اور اپنے موقف سے سر مو ادرہ نہ ہونے۔

لہ تفسیر مجمع البیان تفسیر فرالدین رازی، تفسیر قرطبی، تفسیر فی ظلال، تفسیر معانی، تفسیر المیزان اور دوسری تفاسیر (اسی آیت کے ذیل میں)

لہ تفسیر قرطبی ج ۲، ص ۴۷۷۔ تفسیر مجمع البیان میں مرحوم طبری نے بھی ایک طرح اس کا ذکر کیا ہے۔

۳۔ ”رسول“ اور نبی“ میں فرق اس مسئلے میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔ ہماری نظر میں زیادہ صحیح یہ ہے کہ رسول ان انبیاء کو کہتے ہیں جو اپنے دین کی تبلیغ و ترویج اور لوگوں کو اس کی دعوت دینے پر مامور تھے، جیسا کہ ان کی سوانح حیات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس سلسلے میں انتہک کوشش کرتے تھے۔ معمولی سی فروگزاشت بھی نہیں کرتے تھے اور ہر طرح کی سختی اور تکلیف خندہ پیشانی سے برداشت کرتے تھے۔ البتہ نبی جیسا کہ خود اس لفظ سے ہی ظاہر ہے کہ اس شخصیت کو کہا جاتا ہے جو وحی الہی کی ببردے۔ اگرچہ وہ وسیع سطح پر تبلیغ پر مامور نہیں ہوتا۔ دراصل وہ ایک ڈاکٹر کی مانند ہوتا ہے، جس کو تلاش کر کے اس سے لوگ اپنی بیماری کا علاج کراتے ہیں مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ مختلف پیغمبروں کے ماحول و حالات میں خاصا فرق تھا اور ہر ایک کے فرائض و ذمہ داریاں جدا جدا تھیں۔ لہ

لہ سورہ بقرہ آیت نمبر ۱۲۲ کی تفسیر کے ذیل میں اسی سلسلے میں بحث ہو چکی ہے۔

۵۵۔ وَلَا يَزَالُ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي مِرْيَةٍ مِّنْهُ
حَتَّىٰ تَأْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً أَوْ يَأْتِيَهُمْ
عَذَابٌ يَوْمٍ عَقِيمٍ ۝

۵۶۔ الْمَلِكُ يَوْمَئِذٍ لِّلَّهِ يُحْكُمْ بَيْنَهُمُ فَالَّذِينَ
آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فِي جَنَّاتِ النَّعِيمِ ۝
۵۷۔ وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ
لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِينٌ ۝

۵۸۔ وَالَّذِينَ هَاجَرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ ثُمَّ
قُتِلُوا أَوْ مَاتُوا لَيَرْزُقْنَهُمُ اللَّهُ رِزْقًا حَسَنًا
وَأِنَّ اللَّهَ لَهُوَ خَيْرُ الرَّازِقِينَ ۝
۵۹۔ لِيَدْخُلْنَهُمْ مُّدْخَلًا يَرْضَوْنَهُ وَإِنَّ اللَّهَ
لَعَلِيمٌ حَلِيمٌ ۝

ترجمہ

۵۵۔ کفار ہمیشہ قرآن کے بارے میں شک میں مبتلا رہیں گے، یہاں تک
کہ اچانک قیامت آجائے یا یوم عقیم (وہ دن جب وہ کسی تلافی
کے قابل نہ ہوں گے) کا عذاب ان کو آئے۔

۵۶۔ اس دن صرف اللہ کی حکمرانی ہوگی۔ وہ ان کا فیصلہ کرے گا۔

اور جو لوگ ایمان لائے ہیں اور انہوں نے اچھے عمل کیے ہیں۔
وہ بہشت کے نعمتوں سے معمور باغوں میں ہوں گے۔

۵۷۔ اور جو لوگ کافر ہو گئے ہیں اور انہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا
ہے ان کے لیے ذلت آمیز عذاب ہے۔

۵۸۔ اور جن لوگوں نے راہ خدا میں ہجرت کی پھر قتل ہوئے یا فوت ہو گئے
اللہ انہیں بڑا عمدہ رزق دے گا اور اللہ ہی بہترین روزی دینے
والا ہے۔

۵۹۔ اللہ انہیں ایسے مقام پر لے جائے گا کہ وہ خوش ہو جائیں گے اور
اللہ صاحب علم و علم ہے۔

تفسیر

رزق حسن

گذشتہ آیتیں، اللہ کی نشانیوں کو محو کرنے کے لیے مخالفین کی سرگرمیوں کے بارے میں تھیں۔ زیر بحث
آیتوں میں انہی متعصب اور منہدی لوگوں کی ان مذموم کوششوں کے جاری رہنے کا ذکر ہے۔

پہلی آیت میں ارشاد ہوتا ہے "کفار ہمیشہ قرآن مجید اور تیرے تو حیدی دین کے بارے میں درود قیامت تک
شکوک میں مبتلا رہیں گے۔ حتیٰ کہ قیامت اچانک آجائے گی۔ یا یوم عقیم کہ جس دن وہ کسی قسم کی تلافی کرنے کی صلاحیت
نہ رکھتے ہوں گے کا عذاب ان کو آئے گا۔ (وَلَا يَزَالُ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي مِرْيَةٍ مِّنْهُ
حَتَّىٰ تَأْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً أَوْ يَأْتِيَهُمْ عَذَابٌ يَوْمٍ عَقِيمٍ)۔

واضح ہے کہ کافریں سے مراد تمام کفار نہیں ہیں۔ کیونکہ ان میں سے بہت سے تبلیغ کے دوران پیغمبر اکرم
پر ایمان لے آئے تھے اور کافران کی صفوں میں شامل ہو گئے تھے۔ یہاں کافریں سے مراد ان کے منہدی اور متعصب
سرور احمد ہٹ دھرم کہنے پر در لوگ جو آخر تک ایمان نہ لائے اور تخریبی کاروائیوں میں مصروف رہے۔

لفظ "مہریتہ" جس کا معنی رشک، تردد اور تذبذب ہے، یہ ظاہر کرتا ہے کہ کفار قرآن اور اسلام کو یقین نہ دے سکے۔ غلط فہمی سمجھتے تھے اگرچہ زبان سے ایسا ہی کہتے تھے، وہ اسلام کے خلاف یقین کی منزل سے گر کر کم از کم شک کی سطح پر آ گئے تھے مگر تعصب اور کینہ انہیں حقیقت کو پا نے کے لیے مزید مطالعے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ لفظ "ساعت" کے متعلق اگرچہ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس کا مطلب "موت" اور "لحابت مرگ" ہے مگر بعد کی آیتیں بتاتی ہیں کہ اس سے مراد قیامت کا آنا ہے۔ علی الخصوص "بغضۃ" یعنی اچانک اور ناگہانی کے قرینے سے "یوم عقیقہ" کے عذاب سے مراد قیامت کی سزا ہے۔ اس کو "باخجہ" اس لیے کہا گیا ہے کہ اس کے بعد ان کو کوئی ایسا دن میسر نہ آئے گا کہ اپنے گناہوں کا کفارہ دے سکیں اور اپنی حالت و کیفیت میں کسی قسم کی تبدیلی کر سکیں۔ اس کے بعد قیامت کے دن اللہ کی ہر جہت حاکمیت اعلیٰ کا ذکر کیا گیا ہے، اس دن صرف اللہ ہی کی حکمرانی ہوگی۔ (اللعلل یومئذ للذین) یہ بات صرف قیامت کے دن سے ہی مخصوص نہیں ہے، کیونکہ اللہ تو ہمیشہ ہر جہت اور اطلاق ماکم ہے۔ آج بھی ہے اور کل بھی رہے گا۔ البتہ دنیا میں چونکہ دوسرے حکام اور فرمانروا بھی ہوتے ہیں۔ اگرچہ ان کی حکومت محدود اور کمزور ہوتی ہے اور اس کی صورت صرف ظاہری ہوتی ہے

البتہ یہی بات ہو سکتی ہے، اس امر کا باعث بنے کہ کہا جائے کہ اللہ کے علاوہ اور بھی حاکم و مالک موجود ہیں۔ لیکن روز قیامت جبکہ دنیاوی تمام ممالک اور بادشاہوں کی بساط لپیٹ دی جائے گی، تب یہ حقیقت ہر زمانے سے زیادہ واضح ہوگی کہ حاکم و مالک صرف اللہ ہی ہے۔

بالفاظ دیگر حاکمیت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک حقیقی حاکمیت جو خالق کو مخلوق پر حاصل ہے۔ دوسری اعتباری اور قراردی گئی حاکمیت جو لوگوں کے درمیان ایک نظام قائم رکھنے کے لیے ہوتی ہے۔ دنیا میں یہ دونوں قسم کی حاکمیتیں موجود ہیں مگر آخرت میں اعتباری اور قراردی گئی حکومتیں سب کی سب ختم کر دی جائیں گی۔ اور صرف خلاق عالم کی حاکمیت باقی رہ جائے گی۔ بہر حال حقیقی مالک وہی ہے، چنانچہ حقیقی حاکم و فرمانروا بھی وہی ہوگا، لہذا وہ کا فرد مومن تمام انسانوں کا فیصلہ کرے گا اس کا نتیجہ وہی ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں اس کے بعد کیا گیا ہے، یعنی جو ایمان لائے اور نیک اعمال انجام دیے۔ بہشت میں ہر طرح کی نعمتوں والے باغوں میں رہیں گے۔ ایسے باغات جہاں ہر درخت اور ہر خیر و برکت موجود ہوگی جس کا وہ تصور کریں گے (فالتذین امشوا و عملوا الصالحات فی حبیث نعیم)۔ البتہ جو منکر بنے اور جنہوں نے ہماری نشانیوں کو چیلایا وہ ذلت آمیز عذاب میں مبتلا رہیں گے (والتذین کفروا و کذبوا بآیاتنا فانوا و لیسک لہم عذاب مہین)۔ واقعی کیا منہ لبتی اور زندہ تصویر پیش کی گئی ہے یہ عذاب ان لوگوں کو سزا اور پست کرے گا جو منکر بنے اور منکر بنے۔ جو اپنے آپ کو باقی مخلوق خدا سے برتر سمجھتے تھے۔ خود کو بڑے اور رسول کو پست اور چھوٹا سمجھتے تھے۔

قرآن مجید کی مختلف آیات میں عذاب کی مختلف اقسام بیان کی گئی ہیں "اللیعۃ عظیمہ" اور "مہین" ان میں سے ہر قسم، گناہ کی اس قسم کے ساتھ مطابقت و مناسبت رکھتی ہے جو مغرور اور تکبر لوگ کرتے رہے ہوں گے۔

توجہ طلب نکتہ یہ ہے کہ مومنین اور کفار دونوں کے ساتھ دو چیزوں کی نسبت دی گئی ہے۔ مومنین کے لیے ایمان، اور عمل صالح، اور کفار کے لیے کفر اور تکذیب، دراصل یہ ہر گز وہ کی اندرنی اعتقاد اور ظاہری آثار کی عکاسی ہے۔ کیونکہ انسان کے اعمال و کردار کا سرچشمہ اس کے نظریات ہیں۔

گذشتہ چند آیتوں میں اللہ اور اس کے دین کے لیے اپنے گھر بار چھوڑنے والے مہاجرین کا ذکر تھا۔ زبردست آیت میں ان کو ایک ممتاز طبقے کے طور پر پیش کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے۔ جنہوں نے راہ خدا میں ہجرت کی اور اس کے بعد جام شہادت نوش کیا یا دیے ہی چل بسے۔ اللہ ان کو عمدہ روزی اور مخصوص نعمتوں سے نوازے گا۔ کیونکہ وہ بہترین روزی دہنے والا ہے (والتذین ہاجدوا فی سبیل اللہ شکرًا قتلوا أو ماتوا السیرۃ قتلہم اللہ رزقا حسنًا وإن اللہ لہو خیر الترازقین)۔

بعض مفسرین نے "رزق حسن" سے مراد وہ نعمتیں لیں ہیں، جن پر اگر انسان کی نظر پڑے تو دیکھتا ہی رہ جاتا ہے اور اس میں ایسا کھو جاتا ہے کہ دوسری چیز کا ہوش ہی نہیں رہتا اور ایسی روزی صرف اللہ ہی دے سکتا ہے۔ بعض علماء نے اس آیت کی شان نزول یہ بیان کی ہے۔

جب مسلمانوں نے مدینے کی طرف ہجرت کی، وہاں کچھ مسلمان تو طبعی موت سے دنیا سے اٹھ گئے اور بعض نے جام شہادت نوش کیا۔ اس موقع پر مسلمانوں کا ایک گروپ یہ تاثر دینے لگا کہ تمام درجات اور فضیلتیں صرف ان ہی سے مخصوص ہیں جو شہید ہوئے ہیں اور دیے فوت ہونے والوں کے لیے کچھ نہیں ہے۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی اور دونوں کو نعمتوں کا مستحق بتایا۔

یہی وجہ ہے کہ بعض مفسرین نے یہ لکھا ہے کہ اصل اہمیت راہ خدا میں جان دینا ہے۔ چاہے میدان کارزار میں جام شہادت نوش کرتے ہوئے دے یا اطاعتِ خدا میں فوت ہو جائے۔ اللہ کی فرمانبرداری کرتے ہوئے مرنے والا بھی شہداء کے ثواب کا حامل ہوتا ہے۔

ان المحقون فی سبیل اللہ والمیت فی سبیل اللہ شہید۔ ۱۰

آخری آیت میں عمدہ روزی کا ایک نونہ پیش کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: اللہ انہیں ایسے مقام پر لے جائے گا کہ وہ خوش ہو جائیں گے۔ (الیدخلہم مدخلًا یرضونہ)۔ یعنی اگر اس دنیا میں وہ اپنے گھر بار سے بڑی پریشانی اور دکھ کے عالم میں نکلنے پر مجبور کر دیے گئے، تو اللہ ان کو دوسرے جہان میں ایسی رہائش گاہ اور مسکن دے گا۔ جو ہر لحاظ سے ان کے لیے لذت انگیز اور نشاط دہ

انبساط بخش ہوگا۔ اور یوں ان کی جاں نثاری اور قربانی کی تلافی بہ طریق احسن کرے گا۔ آخر میں ارشاد ہوتا ہے کہ اللہ ان کے اعمال و کردار سے پوری طرح باخبر ہے۔ نیز علیم و بردبار ہے اور سزا و جزا میں بلا بازی سے کام نہیں لیتا۔ تاکہ اس امتحان گاہ میں مومنین کی تربیت بھی ہو۔ اور مکمل امتحان بھی۔ (وَإِنَّ اللَّهَ لَعَلِيمٌ)۔

۶۰۔ ذَٰلِكَ وَمَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوقِبَ بِهِ
ثُمَّ بَغَىٰ عَلَيْهِ لَيَنْصُرَنَّهُ اللَّهُ إِنَّ اللَّهَ
لَعَفُوٌّ غَفُورٌ

۶۱۔ ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ يُوَلِّجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ
وَيُوَلِّجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ وَأَنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ
بَصِيرٌ

۶۲۔ ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ هُوَ الْحَقُّ وَأَنَّ مَا
يَكْدُ عُونُ مَنْ دُونِهِ هُوَ الْبَاطِلُ وَأَنَّ
اللَّهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيرُ

ترجمہ

۶۰۔ بات یہی ہے اور جو شخص اپنے اوپر کی گئی زیادتی کے برابر سزا
دے اور پھر اس پر زیادتی کی جائے تو اللہ ضرور اس کی مدد کرے گا۔
اور اللہ معاف کرنے والا اور بخشنے والا ہے۔

۶۱۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ اللہ رات کو دن میں اور دن کو رات میں بدلتا ہے۔
اور اللہ سننے اور دیکھنے والا ہے۔

۶۲۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ اللہ ہی برحق ہے اور اس کے علاوہ وہ
جسے بھی پکارتے ہیں باطل ہے اور اللہ بلند مقام اور بڑا ہے۔

شان نزول

بعض روایات کے مطابق محرم کا مہینہ ختم ہوا تھا اور صرف ایک دو راتیں باقی تھیں کہ مشرکین نے باہم صلاح مشورہ کیا کہ محمد کے اصحاب اور ساتھی اس مہینے میں جنگ نہیں کرتے۔ کیونکہ وہ اسے حرام سمجھتے ہیں۔ لہذا آواں پر صلہ کے احصائے ختم کر دیں۔ چنانچہ انھوں نے ملکہ کو دیا۔ مسلمانوں نے پہلے اپیل کی کہ اس مقدس مہینے میں جنگ نہ کی جائے۔ مگر جب کفار کے کانوں پر جوں تک درگی تو مسلمانوں نے ڈٹ کر دفاع کیا اور اللہ نے ان کو فتح دی۔ اس کے بعد زیر بحث پہلی آیت نازل ہوئی۔

کامران کون ہے؟

گذشتہ آیتوں میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں اور اللہ کی طرف سے قیامت میں انھیں عظیم جزا کا ذکر تھا۔ اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے کہ اللہ کی طرف سے عظیم جزا اور کامیابی صرف آخرت کے لیے ہیں۔ زیر بحث پہلی آیت میں اسی دنیا میں اس کی طرف سے انعام اور مسلمانوں کی کامیابی کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے۔ بات یہی ہے اور ہر شخص اپنے اوپر کی ہوئی نیادتی کے برابر بدلے اور پھر اس پر مزید زیادتی کی جائے تو اللہ اس کی مدد کرے گا۔ ذلک ومن عاقب بمثل ما عوقب بہ شمر بغی علیہ لی نصرنہ اللہ) یہ اس حق کی طرف اشارہ ہے کہ ظلم و ستم کے مقابلے میں ہر ایک شخص دفاع کا فطری حق رکھتا ہے اور ہر شخص اقتدار کا مجاز ہے۔ مگر مشل کی جیسے یہ تاکید کر دی گئی ہے کہ حد سے تجاوز نہیں کرنا چاہیے۔ "شمر بغی علیہ" اس طرف اشارہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنا دفاع کرتے ہوئے دشمنوں کے زرعے میں آجائے تو اس کی مدد خود اللہ کرے گا۔ یعنی یہ واضح کیا جا رہا ہے کہ جو شخص سرے سے ظلم کے مقابلے میں خاموش بیٹھا ہے بھگتہ مشق ظلم بار ہے اپنے دفاع کے لیے کوئی موثر اقدام نہ اٹھائے تو ہرگز اللہ کی مدد مستحق قرار نہیں پائے گا۔ چنانچہ اللہ نے اپنی مدد کا وعدہ صرف ان لوگوں سے مخصوص کر رکھا ہے جو اپنی تمام توانائیوں کو ظالموں اور جاہلوں کے مقابلے میں بروئے کار لائیں اور اپنا بھرپور دفاع کریں۔

جرم پر نادم ہونے والے اور سر تسلیم خم کر لینے والے سائے تلے پڑ سکیں۔ آیت کے آخر میں ارشاد ہوتا ہے۔ اللہ بہت معاف کرنے والا اور بخشنے والا ہے (ان اللہ لعفو غفور)۔

یہ آیت قصاص کی دوسری آیتوں کے مشابہ ہے جو ایک طرف مقتول کے وارث کو بدلہ لینے کی اجازت دیتی ہے تو دوسری طرف معاف کر دینے کو بہتر شمار کرتی ہے (البتہ انہیں جو معافی کے لائق ہوں)

لے مجمع البیان، اردو منظور زیر بحث آیت کی تفسیر کے ذیل میں۔

جو کہ نصرت و مدد کا وعدہ صرف اس صورت میں موثر اور حوصلہ افزا ہوگا جب مدد کرنے والا کوئی قادر و توانا ہو۔ چنانچہ بعد والی آیت میں وسیع عالم ہستی میں پروردگار عالم کی طاقت و ایثار کا ایک بڑھ چش کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ اللہ رات کو دن میں اور دن کو رات میں بدست ہے ہمیشہ ان میں کمی بیشی کرتا رہتا ہے۔ اسی طرح لاکھوں سالوں سے یہ باقاعدہ نظام چل رہا ہے، (ذلک بان اللہ یولج الیل فی الظہار ویولج الظہار فی الیل)۔ "یولج" اور "ایلج" "ولج" کے مادہ سے ہے۔ "جو" دخول کے معنی میں ہے۔ یہ اس حیثیت کی تعبیر ہے کہ سال کے مختلف حصوں میں رات دن میں تبدیلی کی بیشی کا نظام باقاعدہ تغیر و تبدل کے ساتھ قائم رہتا ہے اور ایک میں کمی اور دوسرے میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ اس سے طلوع و غروب آفتاب کی طرف اشارہ ہو۔ زمین کی مدور شکل اور ہوا کے غلاف کی وجہ سے کبھی طلوع و غروب کی اپانک یا فوری تبدیلی واقع نہیں ہوتی، بلکہ ہوا کے غلاف کے اوپر کے حصے پر سورج کی پہلی شعائیں پڑنے سے طلوع فجر و قح پڑ پڑ ہوتی ہے۔ پھر تدریجاً نیچے کے حصے روشن ہوتے ہیں اور زمین کی سطح منور ہوتی ہے۔ گویا تدریجاً دن رات میں داخل ہوتا ہے اور افواج نور تاریکی کے لشکر پر غالب آجاتی ہیں۔ اس کے برعکس غروب آفتاب کے موقع پر سورج کی شعائیں پہلے سطح زمین سے اوپر فضا میں اٹھتی ہیں جس سے معمولی تاریکی ہوجاتی ہے اور تدریجاً ہوا کے غلاف کے اوپر کی سطح تک چلی جاتی ہے، حتیٰ کہ سورج کی آخری کرنیں ہوا کے غلاف کے آخری کناروں سے بھی ہٹ جاتی ہیں اور یوں اندھیرا ہر گھنٹہ کو اپنے گھیرے میں لے لیتا ہے۔ اگر یوں نہ ہوتا تو طلوع و غروب اپانک اور فوری تبدیلی سے دونوں ہوتے رات دن میں اور رات میں اپانک بدل جاتا اور جہاں اور رات دن ہوتا سے انسان کے لیے نقصان دہ ہوتا۔ اجتماعی طور پر بھی یہ ناگہانی تبدیلی کی مشکلات کا سبب بنتی۔ بہر حال اگر یہ کہا جائے کہ زیر بحث آیت مذکورہ بالا دونوں امور کی طرف اشارہ کرتی ہے تو بھی کوئی حرج نہیں۔ آیت کے آخر میں ارشاد ہوتا ہے۔ "اللہ شہید والا اور دیکھنے والا ہے (وان اللہ سمیع بصیر)۔"

مومنین کی امداد کے تقاضے مستحق ہے۔ ان کی کیفیت اور کارکردگی سے باغیر ہے اور ضرورت پڑنے پر اس کا فضل و کرم ان کے شامل حال ہو جاتا ہے۔ اسی طرح وہ دشمن کی کارستانیوں اور ناپاک عزائم سے بھی مطلع ہے۔ زیر بحث آخری آیت واصل پہلی آیت کے دعوے کی دلیل ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ اللہ حق ہے اور اس کو چھوڑ کر وہ جسے بھی پکارتے ہیں باطل ہے اور اللہ طے مقام اور بڑا ہے (ذلک پاکرت اللہ هو الحق وان ما یدعون من دونه هو الباطل وان اللہ هو العلیٰ العلیٰ)۔ اگر آپ یہ دیکھتے ہیں کہ حق کی افواج کامران ہوتی ہیں۔ باطل قوتیں پیچھے ہٹتی ہیں اور منہ کی کھاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم کفار کا ساتھ نہیں دیتا، بلکہ مومنین کی مدد کرتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ کفار باطل ہیں اور مومنین حق۔ وہ نظام عالم ہستی کے برخلاف ہیں۔ چنانچہ ان کا انجام فنا اور بربادی ہے اور مومنین کائنات کے قوانین سے ہم آہنگ ہیں۔ اصول یہ ہے کہ اللہ سبحانہ حق ہے اور اس کا غیر باطل چنانچہ وہ تمام لوگ، بلکہ ہر وہ موجود جو اللہ سے مربوط ہوگا۔ وہ برحق ہے۔ اسی طرح جو اس سے منفق ہیں وہ انہی درجہ الفاظ، حاکم اللہ۔

سے درجہ باطل پر ہیں۔ لہ

”علی“ علو کے مادہ سے بلند ہے اور رفعت کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ نیز اس ذات کو ”علی“ کہتے ہیں جو ماضی و سلطوت ہو اور اس کے ارادے کے سامنے کھڑا ہونے کی کسی میں ہمت نہ ہو۔
”کبیر“ بھی پروردگار عالم کی عظمت علم و قدرت کی طرف اشارہ ہے۔ ان صفات کا حامل مالک اپنے بندوں کی مدد پر طرح قادر ہے اور دشمنوں کو نصیب و نابود کر سکتا ہے۔ لہذا اس کے بندوں کو اس کے دھرم پر مطمئن رہنا چاہیے۔

۶۳۔ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً
فَتُصْبِحُ الْاَرْضُ مُخْضَرَّةً اِنَّ اللّٰهَ لَطِيفٌ
خَبِيرٌ

۶۴۔ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ
وَ اِنَّ اللّٰهَ لَهٗوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ

۶۵۔ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی
الْاَرْضِ وَاَلْفُلَکَ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ
بَاْمْرِہٖ وَاِمْسَکِ السَّمَاءِ اَنْ تَقَعَ عَلٰی
الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِہٖ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ
لَرَّءُوفٌ رَّحِیْمٌ

۶۶۔ وَہُوَ الَّذِیْ اَحْیَاکُمْ ثُمَّ یُمِیْتُکُمْ ثُمَّ
یُحْیِیْکُمْ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَکَفُوْرٌ

ترجمہ

۶۳۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے آسمان سے بارش
برسائی اور زمین (اس کی وجہ سے) سرسبز و شاداب ہو گئی
اور اللہ لطیف و خبیر ہے۔

لہ تفسیر ”المیزان“ میں ہے کہ حق کا اطلاق اللہ پر اور باطل اس کے غیر پر یا اس وجہ سے ہے کہ وہ ”حق“ جو کسی طرح
سے بھی باطل کے ساتھ مخلوق نہیں اللہ ہی ہے یا اس وجہ سے ہے کہ وہ ”حق“ جو اپنی ذات میں ”قائم“ اور خود مختار ہے، وہ اللہ
ہی ہے اور دوسرے اس کے ساتھ رابطے کی وجہ سے برحق کہلاتے ہیں۔

۶۴۔ آسمانوں اور زمین کا سب کچھ اسی کا ہے اور اللہ بے نیاز ہے۔ اور ہر ستائش کے لائق ہے۔

۶۵۔ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ زمین میں جو کچھ ہے۔ اللہ نے تمہارے لیے مسخر کیا ہے اور اسی کے حکم سے سمندروں میں کشتیاں اور بحری جہاز چلتے ہیں۔ وہ آسمان (اجرام فلکی اور آسمانی پتھروں) کو روکے ہوئے ہے تاکہ اس کی اجازت کے بغیر زمین پر نہ گر پڑے۔ اور اللہ بندوں پر بڑا مہربان اور رحیم ہے۔

۶۶۔ وہ وہی ہے، جس نے تمہیں زندگی دی پھر موت دے گا۔ پھر زندہ کرے گا۔ مگر یہ انسان کفرانِ نعمت کرنے والا اور ناشکرا ہے۔

تفسیر

کائنات میں اللہ کی نشانیاں

گذشتہ آیتوں میں اللہ کی لاتناہی طاقت اور اس کی حقانیت مطلقہ کا ذکر تھا۔ زیر بحث آیتوں میں اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے اس کی طاقت اور اختیار کی مختلف علامتوں کا ذکر کیا جا رہا ہے، ارشاد ہوتا ہے، کیا تو نے ملاحظہ نہیں کیا کہ اللہ نے آسمان سے پانی برسایا۔ اور اس سے خشک اور مردہ زمین کو سرسبز و شاداب کیا۔ (الحمد لله رب العالمین) انزل من السماء ماء فتصبح الارض مخضرة۔ یعنی وہ زمین جس سے زندگی کے آثار معدوم ہو گئے تھے، پھل سہا، اور کریمہہ المنظر ہو گئی تھی۔ وہ بارش کے حیات بخش قطرہوں سے زرخیز ہو گئی۔ یہی زندگی و حیات اور بہانے کی بے شک اتنی آسانی سے زندگی کو جو دیں لاسنے والا اللہ لطیف و خیر ہے۔ (الافتاء) اللہ لطیف و خیر ہے۔

”لطیف“ ”لطف“ کے مادہ سے نہایت عمدہ اور باریک کام کو کہتے ہیں۔ اللہ کی خاص رحمتوں کو بھی ”لطف“ اس کی عمدگی اور باریکی کی وجہ سے کہا جاتا ہے۔

”خبیر“ اسے کہتے ہیں جو گہرے اور باریک مسائل سے آگاہ ہو۔

اللہ کا ”لطیف“ ہونا اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ منوں مٹی میں وجہ ہوئے ننھے ننھے نباتاتی بچوں کی نشو و نما کرے تاہن کشتِ ثقل کے برعکس ان کو گہری تلمیحات مٹی سے نہایت باریک بینی اور لطف سے اور مٹی کی سطح کی طفت پر بھیجے۔ اور سورج کی گرم اور روشن شعاعوں، ہوا کے جھونکوں کے سامنے پھیلائے اور یوں آخر کار ایک بار بار سرسبز پودے، یا تنومند درخت بنا دیے۔

اگر اللہ بارش نہ برساتا اور بیج کے ارد گرد کی مٹی نرم اور ملائم نہ ہو جاتی تو وہ ہرگز نشو و نما نہ پاتا، مگر اس نے بارش کے ذریعہ سخت زمین کو نرم و لطیف بنایا تاکہ کمزور اور نازک بیج کی پرورش کی تمام ضروریات مہیا ہو سکیں اور وہ مٹی کی تہوں میں بیج کی ضروریات سے لے کر تنگونی کی ضرورت میں زمین سے نکلے تک ہر مرحلے سے مکمل باخبر ہے۔ اللہ کے ”لطیف“ ہونے کا یہ تقاضا ہے کہ بارش برساتے۔ مگر ”خبیر“ ہونے کا تقاضا ہے کہ ایک اندازے کے مطابق ایسا کرے۔ یعنی اگر بارش زیادہ برے تو سیلاب کا مطلب بن جائے اور اگر کم برے تو خشک سالی کا وبال یہ ہے اس کے لطیف فیہ ہونے کا مفہوم سورہ مؤمنون آیت ۶۵ میں ہے۔

”وانزلنا من السماء ماء بقدر فاسکاف الارض“

ہم نے آسمان سے ایک اندازے کے مطابق پانی نازل کیا پھر اسے (حسب مصلحت) زمین میں پھیر دیا۔

اسی کا بھی یہی مفہوم ہے۔ لہ

اپنی بے پایاں طاقت اور اختیار کی دوسری علامت بیان کرتے ہوئے اللہ ارشاد فرماتا ہے:

آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ اسی کا ہے (لہ ما فی السموات وما فی الارض) سب کا خالق و مالک وہی ہے۔ اسی وجہ سے سب پر مکمل اختیار رکھتا ہے۔ اس کا کائنات میں وہی اکیلا، بے نیاز و توکل ہے۔ اور ہر طرح کی تعریف و ستائش کا مستحق ہی ٹھہرتا ہے۔ (وان الله هو الغنی الحمید)۔

”غنی“ اور ”حمید“ کی دو صفات بہت مربوط طریقے سے استعمال کی گئی ہیں۔ کیونکہ۔

(۱) بہت سے لوگ متمول اور مالدار ہیں، مگر کج فہم، استعصاف ذہن کے مالک، دولت کو اپنے تک محدود رکھنے والے اور متکبر اور اپنی عیش و عشرت میں مست ہیں۔ چنانچہ کسی کا غنی ہونا گویا مذکورہ بالا اوصاف سے متعطف ہونا بھی ہے مگر اللہ غنی ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے بندوں کے لیے صاحبِ لطف و عنایت، فیاض، فیضِ رسال اور غنی و جواد بھی ہے، جو اسے عمدہ ستائش کا مستحق ٹھہرتا ہے۔

(ب) امیر لوگوں کی دولت و ثروت ظاہری ہے۔ اگر وہ ساتھ ساتھ غنی بھی ہوں تو بھی وہ اپنا مال و دولت تو کسی کو نہیں دیتے۔ اس لیے اسی تفسیر کی جگہ میں سورہ انعام آیت ۵۱ میں اللہ کے لطیف ہونے کے بارے میں بڑی قابلِ توجہ بحث کی گئی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

کہ جو کہ یہ درحقیقت تمام ثروت اور مال اللہ کا دیا ہوا ہے اور جو کچھ اسلی اور ذاتی طور پر صاحب ثروت و دولت صرف اللہ ہی کی ذات ہے۔ لہذا حمد و ثناء کا مستحق بھی دراصل وہی ہے۔

(ج) امیر اور دولت مند لوگ اگر کوئی کام کرتے ہیں تو اس کی منفعت عام طور پر اپنی کو حاصل ہوتی ہے۔ یہ صرف اللہ ہی ہے کہ جو بے حساب دیتا ہے اور کسی قسم کا نفع خود اسے حاصل نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کا جو دوسرا اس کے بندوں کے لیے ہے۔ اسی سبب وہی سب سے زیادہ تعریف اور حمد و ثناء کے لائق ہے۔

اس کے بعد اپنی لامتناہی طاقت سے کائنات کو انسان کے لیے مقرر کرنے کے بارے میں ایک نمونہ پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے۔ کیا تو نے ملاحظہ نہیں کیا اللہ نے زمین کی ہر ایک چیز تمہارے زیر تسلط قرار دی ہے اور تمام قدرتی وسائل طرح کی نعمتیں اور چیزیں، سب کی سب تمہارے اختیار میں دے دی گئی ہیں۔ تاکہ جس طرح چاہو ان سے فائدہ اٹھاؤ۔ (الکھتران اللہ سخر لکم ما فی الارض) اس طرح اللہ کے حکم سے سمندر میں چلنے والے اور پانی کا سینہ چکر کر سونے منزل بڑھنے والے جہاز بھی زیر تسلط قرار دیئے گئے ہیں۔ (والفلك السی تجری فی البحر یا مریض) علاوہ ازیں اللہ آسمان کو اس کی جگہ پر رکھ کر دے ہوئے ہے اور اس کی بلا اجازت زمین پر نہیں گر سکتا۔

(ویمسک السماء ان تقع علی الارض الا بذکرہ) ایک طرف قوت دافعہ و جاذبہ مدار

اپنے مدار پر رہنے اور ایک دوسرے سے نہ ٹھونکنے کا پابند کر رکھا ہے۔ دوسری طرف زمین کے گرد ہوا کا اس طرح غلاف پیٹ رکھا ہے تاکہ فضا میں منتشر ہونے والی چیزیں زمین سے ٹکرائیں اور اہل زمین کے لیے تکلیف اور پریشانی کا سبب نہ بنیں۔

جسے شک اپنے بندوں پر پیاس کی رحمت، ٹھنڈی اور گرم ہونے کی زمین کو ہر قسم کے خطرات سے غالی امن کا گوارہ بنادیا تاکہ وہ انسان کے لیے پرسکون اور آسائشوں کا مرکز بنی رہے۔ نہ پتھر اس سے ٹکرائیں اور نہ کوئی آسمانی گزہ۔ چنانچہ آیت کے آخر میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔ بے شک اللہ بندوں پر بڑا مہربان اور مہم ہے۔ (لا یسئ اللہ بالشیء

زیر بحث آخری آیت میں اللہ کے بے پایاں اختیار کے حوالے سے زمین پر اہم ترین مسئلے یعنی موت و حیات کے بارے میں فرمایا گیا ہے۔ وہ وہی ہے جس نے تمہیں زندگی دی (تم بے جان مٹی تھے، تم میں حیات کی روح چھوٹی) (وہو الذی احیاکم) پھر زمانہ حیات کے بعد تمہیں موت دیتا ہے۔ (اور جس مٹی سے تم اٹھے تھے واپس اسی میں چلے جاؤ گے) (شعۃ یحییٰ کفۃ) پھر روز قیامت ایک نئی زندگی ملے گی (مردہ مٹی سے نکلو گے اور حساب اور جزاء و سزا کے لیے آؤ گے) (شعۃ یحییٰ کفۃ) زمین و آسمان میں اللہ نے یہ تمام نعمتیں انسان کے لیے مخصوص کی ہیں، لیکن اس کے باوجود انسان بہت ناشکر ہے۔ واضح اور کھل نشانیاں کے باوجود اللہ کے وجود کا انکاری ہے۔ (لا یسئ اللہ بالشیء لکفور)

چند اہم نکات

۱۔ پروردگار عالم کی خاص صفات
مندرجہ بالا آیتوں اور اس سے پہلے کی دو آیتوں میں ایک خاص ترتیب کے ساتھ اللہ کی چودہ مختلف صفات کا ذکر کیا گیا ہے۔ ہر ایک کے آخر میں دو صفات کا ذکر ہے۔

(۱) علیم و حلیم (۱۱) عفو و غفور (۱۲) سمیع و بصیر (۱۳) علی و مجیر (۱۴) لطیف و خبیر (۱۵) غنی و جمید (۱۶) رؤف و رحیم (۱۷)

ان میں ایک صفت دوسری کی تکمیل کرتی ہے۔ عفو، غفران کے ساتھ، سمیع بصیر ہونے کے ساتھ ساتھ رخصت بلندی بڑائی کے ساتھ، لطیف ہونا مکمل اطلاع اور آگاہی کے ساتھ ساتھ بے نیازی قابل ستائش ہونے کے ساتھ اور رؤف ہونا رحیم ہونے کے ساتھ۔ یہ سب صفات ایک دوسری سے ہم آہنگ اور مربوط ہیں۔ علاوہ ازیں ہر صفت اس مہم سے متعلق ہے جس کا اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے۔ جیسا کہ ہم بیان کر آئے ہیں۔ لہذا اعادہ کرنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔

۲۔ ان آیتوں کا ایک استدلالی پہلو
جس طرح مندرجہ بالا آیتیں اللہ کی قدرت کی نشان دہی کرتی ہیں اور اسے باایمان بندوں کے لیے اللہ کی مدد و دلالت کرتی ہیں۔ اسی طرح اللہ کی ذات اقدس کی ستائش پر بھی وال ہیں۔ نیز توحید، معاد اور قیامت کا بھی ثبوت ہیں۔ بارش کے اثر سے مردہ زمینوں کا سرسبز ہونا داب ہو جانا، اسی طرح انسان کی پہلی حیات و موت کا تذکرہ اس کی قدرت کا بین ثبوت ہے کہ وہ انسان کو دوبارہ زندہ کر سکتا ہے، قرآن مجید کی آیتیں انہی امور کے ذریعے مسئلہ معاد و قیامت پر استدلال کرتی ہیں۔ ضمنی طور پر یہ بھی بیان ہو جائے کہ انسان لکھنور میں لفظ کفور کے مقابلے کا معنی ہے اور انسان کی برہمنی ہوتی ہے و حرمی اور کفر و منکرات پر دلالت کرتا ہے، یعنی انسان اس قدر ناشکر اور کھنڈان نعمت کرنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ان تمام آیات عظمت کا مشاہدہ کرنے کے باوجود راہ انکار اختیار کرتا ہے۔ یا یہ اس قسم کے افراد کے ناشکر ہونے کی طرف اشارہ ہے، جو ستر یا اس کی نعمتوں سے سرشار ہونے کے باوجود خدا کا شکر ادا کرتے ہیں اور خدا اس کی معرفت حاصل کرتے ہیں۔

۳۔ کائنات کا انسان کیلئے مقرر ہونا
ہم نے پہلے ہی اشارہ کیا ہے کہ کائنات کے انسان کے لیے مقرر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ یہ کائنات انسان کی خدمت گزار ہے۔ اور اس کے مفاد کے لیے ہے (سورہ نمل کی آیت فبسترنا بسترک لکھیر کے ذیل میں اسی تفسیر کی جلد نمبر ۱ اور جلد نمبر ۲ میں سورہ زمر آیت ۶۱ کی تفسیر کے ذیل میں اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے)۔

دنیا کی بے شمار نشانیاں اور نعمتوں میں سے سمندر میں چلنے والے جہاز کا خاص طور سے اس لیے ذکر کیا گیا ہے کہ ماضی

میں اور موجود زمانے میں انسانوں کے روابط اور میل جول اور ایک جگہ سے دوسری جگہ نقل و حرکت کا بہترین ذریعہ یہی بحری جہاز رکھتا ہے۔ ان کے علاوہ حمل و نقل کا کوئی اور ذریعہ زیادہ پرواج نہیں پاسکا۔ یہ بات یقین ہے کہ اگر ایک دن سمندر میں چلنے والے تمام کے تمام جہاز روک دیئے جائیں تو انسانی زندگی معطل ہو کر رہ جائے۔ کیونکہ انسانی ضرورت کی تمام اجناس کی نقل و حرکت ہری راستے سے نہیں ہو سکتی اور نہ ہی ہری راستے اتنے مفید سمجھے جاتے ہیں۔ خصوصاً آج ہمارے دور میں جبکہ صنعت و حرفت کی شرح گتیل ہے۔ اور تیل کی نقل و حرکت کے لیے اہم ترین ذریعہ یہی بحری جہاز ہیں۔ اس طرح بحری جہازوں کی اہمیت کتنے گنا بڑھ جاتی ہے۔ جتنا تیل ایک بڑے تیل بردار جہاز کے ذریعے لے جایا سکتا ہے۔ اتنا تیل دس ہزار ٹرک بھی نہیں لے جاسکتے اور پائپ لائنوں کے ذریعے بھی ایک محدود علاقوں میں ہی نقل کی جاسکتی ہے۔

۴۰۔ لِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوهُ
فَلَا يَنَازِعُكَ فِي الْأَمْرِ وَاذْعُ إِلَىٰ رَبِّكَ
إِنَّكَ لَعَلَىٰ هُدًى مُّسْتَقِيمٍ
۴۱۔ وَإِنْ جِدَّ لُوكَ فَقُلِ اللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُونَ
۴۲۔ اللَّهُ يُحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ فِيمَا
كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ
۴۳۔ أَلَمْ تَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَاءِ
وَالْأَرْضِ إِنَّ ذَلِكَ فِي كِتَابٍ إِنَّ ذَلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ

ترجمہ

۴۰۔ ہر امت کے لیے ہم نے ایک عبادت مقرر کی ہے تاکہ وہ (اللہ کے حضور عبادت کریں۔ پس انہیں تیرے ساتھ اس سلسلے میں ہر گز جھگڑنا نہیں چاہیئے۔ تو اپنے پالنے کی طرف دعوت دے۔ کیونکہ تو یقیناً ہدایت مستقیم پر ہے) سیدھا اور صحیح راستہ یہی ہے، جس پر تو گامزن ہے)

۴۱۔ پھر بھی وہ تیرے ساتھ جھگڑنے لگیں، تو کہہ دے کہ جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اس سے خوب واقف ہے۔

۴۲۔ روز قیامت اللہ تمہارے اختلافات کا فیصلہ کر دے گا۔

۷۔ کیا تجھے معلوم نہیں کہ زمین و آسمان کا سب کچھ اللہ کے علم میں ہے۔ یہ سب کچھ اللہ کے لامتناہی علم کی کتاب میں لکھا ہوا ہے اور خدا کے لیے یہ آسان سی بات ہے۔

تفسیر

ہر اُمت کے لیے ایک عبادت مقرر ہے

ہماری گذشتہ بحثیں مشرکین کے بارے میں تھیں۔ مشرکین بحثہ علی الخصوص اور دوسرے اسلام مخالف عناصر علی العموم پیغمبر اکرمؐ کے ساتھ جھگڑتے رہتے تھے اور پرانے احکامات کی تیغ اور نئی شریعت کے نفاذ کو اسلام کی کمزوری خیال کرتے تھے۔ حالانکہ یہ تبدیلیاں کسی کمزوری کی دلیل نہ تھیں، بلکہ ارتقاء و تکاملِ ادیان کے پروگرام کا ایک حصہ تھیں، چنانچہ زیر بحث پہلی آیت میں ارشاد ہوتا ہے: ہم نے ہر ایک امت کے لیے ایک عبادت مخصوص کر دی ہے۔ تاکہ وہ اسی طرح اپنے رب کی عبادت کرے۔ (لِکُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا هُمْ نَاسِكُوهُ) ۱۷

”مناسک“ ”منسک“ کی جمع ہے۔ اور حیکما کہ پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ ”منسک“ کا مطلب ”عبادت“ ہے۔ ہو سکتا ہے، یہاں پر یہ لفظ، مختلف دینی ضابطوں کے لیے استعمال کیا گیا ہو۔ اس بناء پر ایت کا مضمون یہ ہوگا۔ کہ سابقہ امتیں اپنے لیے ایک مخصوص شریعت رکھتی تھیں، جو مخصوص حالات مختلف زمان و مکان اور دیگر جماعت کے لحاظ سے ان کے لیے مکمل ”ضابطہ حیات“ تھیں۔ مگر ان مخصوص حالات کے بدل جانے کی صورت میں ضروری تھا کہ وہ ضابطہ بھی بدلا جائے اور نئے احکام اس کی جگہ لے لیں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: اس وجہ سے ان کو آپ کے خلاف نہیں اٹھ کھڑا ہونا چاہیے۔ (فلا ینازعنک فی الامر)۔ آپ اپنے پالنے والے کی طرف رُو دیجیے، کیونکہ سیدہ صالستہ یہی ہے، جس پر آپ کا منزن ہیں۔

(و اذع الى مرئيك انك لعلى هدى مستقيم) یعنی ان کے بے سرو پا اعتراضات اور غوغا میں آپ کو ذرہ بھر بھی متاثر نہ کریں، کیونکہ آپ تو اللہ کی طرف بلاہے ہیں اور آپ راہ راست پر ہیں۔ ”ہدیٰ“

لے لیے معسرین کے نزدیک یہ آیت مشرکین کے اس سوال کا جواب ہے کہ تم ذبح کر کے گوشت کھا لیتے ہو جبکہ مردہ کا نہیں کھاتے ہو۔ یعنی اپنے دل سے ہونے کو کھاتے ہو جو خدا کے ان سے مجھے کو نہیں؟ مگر یہ بات بہت عجیب و غریب سمجھ ہو رہی ہے۔ کیونکہ زبردست آیت ہی ہر طرح کے تعظیم کی گنجائش ہے نہ کہ صرف سٹل ذبح کی۔ مزید برآں، مردہ گوشت کا ناکافی شریعت میں بھی جائز نہیں تھا۔ اس کے باوجود اس حوالہ کے کہ کسما ہے کہ ہر ایک انسان کو ذبح کے بارے میں الگ طریقہ تھا۔

کی صفت "مستقیم" بیان کی گئی ہے۔ دیے اس لیے ہے کہ تاکید و تشدید کا اظہار ہو یا یہ بیان مقصود ہو کہ کسی منزل کی طرف کئی راستے راہنما کی کر سکتے ہیں۔ نزدیک، دور، فیصلح اور سیدھا، لیکن اللہ کی طرف سے جو راستہ مقرر ہوگا وہ نزدیک ترین اور سیدھا ہوگا۔ لیکن اس کے باوجود مخالفت جاری رکھیں اور آپ کی ہدایت سے اثر قبول نہ کریں تو ان سے کہہ پڑیں کہ اللہ ان کی حکمت سے زیادہ مطلع ہے۔

(و ان جادلوك فقل الله اعلم بما تعملون) ۱۰ اللہ تمہارے اخلاف کا فیصلہ فرمائے گا۔ (فرمائے قیامت، جو اللہ کی طرف بازگشت کا دن ہے اور اتحاد و یکائیت کا دن ہے اور تمام اختلافات مٹ جانے کا دن ہے۔ تم سب پر حقائق واضح کر دے گا۔) (اللہ یحکم بینکم یوم القیامۃ فیما کانتم فیہ تختلقون) ۱۱

چونکہ قیامت کے دن ہندوؤں کے جملہ اخلاقات کو ختم کرنا اور ان کا ٹھیک ٹھیک فیصلہ کرنا اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ جو ذات یہ مرحلے طے کرے۔ وہ لازمی طور پر بے پناہ علم کی حامل ہو۔ لہذا ارشاد ہوتا ہے: کیا آپ کو علم نہیں، کہ زمین و آسمان میں ہر چیز اللہ واقف ہے؟ (الم تعلم ان اللہ یعلم ما فی السماء والارض)۔ بے شک یہ سب علوم و اسباب ایک کتاب میں موجود ہیں۔ (ان ذالک فی کتاب)

اللہ علیم وحکیم کے لامتناہی علم کی ڈائری اور کتاب عالم ہست و بود اور کائنات اشرار و موثر کی کتاب ہے، جس میں سے کچھ نا پید نہیں ہوتا، بلکہ ہمیشہ اس میں تغیر و تبدل اور اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ انسان کے گلے سے بھٹی ہوئی کمزور آواز بھی جو ہزاروں سال پہلے اس کائنات میں وجود میں آئی تھی، فنا نہیں ہوگی، بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اسی فضائیں موجود رہے گی۔ یہ بہت جامع اور مفصل کتاب ہے۔ جس میں ہر ایک چیز لکھی ہوئی ہے۔ بالفاظ دیگر یہ سب کچھ لوح محفوظ یعنی "علم الہی کی تختی" میں درج ہے اور تمام موجودات اپنی تمام تر تفصیل کے ساتھ اس کے نزدیک حاضر ہیں اس لیے آیت کے آخری جملے میں ارشاد ہوتا ہے: اللہ کے لیے سب کچھ بہت آسان ہے، کیونکہ تمام موجودات اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ اس کے سامنے ہیں۔ (ان ذلک علی اللہ یسیر)۔

۱۰ ممکن ہے اس آیت کے مخاطب رسول اسلام اور مخالفین اسلام دونوں ہوں، اس بنا پر (اللہ یحکم بینکم.....) کا حبل قرآن پیڑ کڑھ کر ہوگا۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ آیت کے مخاطب مسلمان اور کفار ہوں، اس صورت میں یہ آیت اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کے لیے ایک متعلیٰ بیان ہوگی۔

۷۰- وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَمْ يَنْزِلْ بِهِ سُلْطَانًا وَمَا لَيْسَ لَهُمْ بِهِ عِلْمٌ وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ نَصِيرٍ

۷۱- وَإِذَا تَنَادَىٰ عَلَيْهِمْ إِيَّتَنَا يَعْبُدُونَ فَقَالُوا كُفِّرُوا كُفْرًا وَكَفَرُوا بِالْمُنْكَرِ كَادُونَ يَسْطُونَ بِالَّذِينَ يَتْلُونَ عَلَيْهِمْ آيَاتِنَا قُلْ أَفَأَنْتُمْ تُبَشِّرُونَ ذَلِكَمُ الْكَافِرِينَ وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِبَشِيرٍ مِصْرٍ

۷۲- يَا أَيُّهَا النَّاسُ صُربَ مَثَلٍ فَاسْتَمِعُوا لَهُ إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ لَنْ يَخْلُقُوا ذُبَابًا وَلَوْ اجْتَمَعُوا لَهُ وَإِنْ يَسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا لَا يَسْتَنْقِذُوهُ مِنْهُ ضَعُفَ الظَّالِمُ وَالْمُطْلُوبُ

۷۳- مَا قَدَرُوا اللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ

ترجمہ

۷۰- اور اللہ کو چھوڑ کر وہ ایسی چیزوں کی عبادت کرتے ہیں، جن کی عبادت

کے لیے اللہ نے کوئی دلیل نازل نہیں فرمائی اور نہ ہی ان کو، اپنے خود ساختہ معبودوں کے بارے میں کوئی معلومات ہیں اور گناہگاروں کے لیے کوئی مددگار اور رہبر نہیں۔

۷۱- اور جب ان کے سامنے ہماری واضح آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو تو کفار کے چہروں پر انکار کے تیور ملاحظہ کرتا ہے (ایسا معلوم ہوتا ہے) کہ وہ جلد ہی ان پر مکوں سے حملہ شروع کر دیں جو ان کے سامنے ہماری آیتیں پڑھتے ہیں۔ ان سے کہہ دے کہ کیا تمہیں اس سے بھی بدتر چیز کی خبر دوں، یعنی بھسم کر دینے والی (جہنم کی) آگ جس کا اللہ نے کافروں سے وعدہ کر رکھا ہے اور وہ بہت بُرا ٹھکانا ہے۔

۷۲- اے لوگو! ایک مثال غور سے سُنو! اللہ کو چھوڑ کر تم جنہیں پکارتے ہو وہ سب مل کر بھی ایک مکھی پیدا نہیں کر سکتے، بلکہ مکھی اگر کچھ لے لے تو واپس نہیں لے سکتے، طالب و مطلوب (عابد و معبود) دونوں ہی بڑے کمزور ہیں۔

۷۳- جس طرح پہچاننے کا حق تھا انہوں نے اللہ کو ہرگز نہیں پہچانا، بیشک اللہ طاقت ور اور ناقابل شکست ہے۔

تفسیر

مکھی سے بھی کمزور معبود

گذشتہ آیتوں میں شرک اور توحید سے متعلق گفتگو کے لحاظ سے زیر بحث آیت میں دوبارہ شریکین اور ان کی غلط کاریوں کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ چونکہ شرک اور بت پرستی کے بطلان کا واضح ثبوت یہ ہے کہ عقلی اور نقلی کوئی دلیل اس قبیح عمل کا جواز مینا نہیں کرتی۔ لہذا پہلی آیت میں فرمایا جا رہا ہے: اللہ کو چھوڑ کر جن کی وہ پرستش کرتے ہیں۔ اس کے بارے میں اللہ نے کوئی دلیل نازل نہیں فرمائی (و یبیدون من دون اللہ مالاً لعلہ یبذل بہ سلطاناً)۔ دراصل یہ آیت بت پرستوں کے اس عقیدے کو باطل کر رہی ہے، جس کے تحت وہ کہا کرتے تھے کہ بت اللہ کی بارگاہ میں ہمارے شیع ہیں اور ہم اس کی اجازت سے ہی ان کی عبادت کرتے ہیں۔ اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے وہ ایسوں کی عبادت کرتے ہیں۔ جن کے بارے میں انہیں کچھ معلومات نہیں ہیں۔ (و ما لیس لہم بہ علم)۔ یعنی اپنے اس فعل سے متعلق وہ نہ تنزل من اللہ کوئی دلیل رکھتے ہیں اور نہ ہی انہم عامہ سے کوئی حراز پیش کر سکتے ہیں۔

واضح سی بات ہے کہ جس شخص کے پاس اپنے عقیدے اور اعمال کے بارے میں کوئی ٹھوس ثبوت نہ ہو۔ وہ بڑی حماقت کا مرتکب ہوا ہے۔ اس نے اپنے آپ پر بھی زیادتی کی اور دوسروں پر بھی اور جب وہ گرفتار غلاب و عقاب الہی ہوگا تو کوئی بھی اس کی حمایت و دفاع کی جرات نہیں کر سکے گا۔ اس حقیقت کو آیت کا آخری حصہ واضح کر رہا ہے: مستغمرل کا کوئی یار و مددگار نہیں (و ما للظالمین نصیر)۔

یعنی مفسرین نے اس آیت میں "نصیر" کا مطلب دلیل و برہان لیا ہے۔ کیونکہ دلیل و منطق ہی حقیقی مددگار ہیں۔

یہ احتمال بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ "نصیر" سے مراد رہبر و راہنما ہے اور اب تک کی بحث کا نتیجہ بھی یہی ہے۔ اور معلوم یہ ہے کہ ان باطل عقیدہ رکھنے والوں کے پاس نہ خدا کی طرف سے کوئی دلیل ہے اور نہ ہی عقل و منطق کی برہان کہ جن تک وہ خود پہنچے ہوں اور نہ کوئی ایسا رہبر و رہنما انہیں دیکھ رہے جو زندگی کے پُر پیچ راستوں میں ان کی راہبری کر سکے وہ بڑے ظالم ہیں کہ حق کے طبع نہ ہوئے۔ مندرجہ بالا تین مختلف مقام پر ایک دوسرے سے منافی نہیں ہیں۔ اگرچہ پہلا مفہوم زیادہ واضح دکھائی دیتا ہے۔ اس کے بعد اللہ کے احکامات سننے کے بعد بت پرستوں کے شدید معنی رومی، منہ، تعصب اور نہایت دھرمی

۱۔ تفسیر المیزان اور کبیر زیر بحث آیت کی تفسیر کے ذیل میں۔

کی طرف مختصر اشارہ کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:

"جب ہمارے واضح احکامات (جن کی عقل و منطق صحت بڑی واضح ہے) جن سے فائدہ اٹھانا عقل سلیم رکھنے والے ہر فرد کے لیے آسان ہے، ان کے سامنے بیان کیے جاتے ہیں، تو کفار کے چہرہ پر انکار و تنفر کے آثار ملاحظہ کرتا ہے (و اذا اتلى علیہم آیاتنا تعرف فی وجوہ الذین کفروا المنکر)۔ یہ حقیقت یہ ہے کہ جب یہ صاف سترے اور منطقی احکامات بیان کیے جاتے ہیں۔ تو انہیں اپنے جاہلانہ اور باطل عقائد متضاد نظر آتے ہیں، چونکہ وہ سچائی اور صداقت کو قبول نہیں کرتے، اس لیے غیر امتیازی طور پر نفرت و ناپسندیدگی کے آثار ان کے چہروں سے عیاں ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک ہی بس نہیں بلکہ، تعصب، ہٹ دھرمی اور ضد کی شدت کی وجہ سے ہو سکتا ہے وہ جلد ہی احکامات کو غور سے سننے والوں سے باعتماد پائی اور دھمکیاں پرائیں (یکادون یسطون بالذین یستلون علیہم آیاتنا)۔

"یسطون" "سطوت" کے مادہ سے ہے اور آستینیں چڑھا کر ہاتھ اٹھا کر یہ مقابل پر حملہ آور ہونے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ بقول راجب کے جب گھوڑا پچھلے پاؤں پر کھڑا ہو کر اگلے پاؤں اٹھاتا ہے، اسے "سطوت" کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ مندرجہ بالا مفہوم بھی استعمال ہوتا ہے۔ اگر کسی معاملے میں انسان عقل و منطق سے غور کرے تو اپنے مخالف کی دلیل سے نہ چہرے کے تاثرات میں تغیر و تبدل کی ضرورت ہے اور نہ ہی ممکنہ لہرانے کی بلکہ دلیل کا جواب دلیل سے دیا جاتا ہے۔ کفار کا غلط رد عمل ہی اس امر کا بین ثبوت ہے کہ وہ کسی دلیل و منطق کو سننے پر تیار نہیں۔ بلکہ جالت ہٹ دھرمی اور طاقت و تشدد کے قائل ہیں۔

توجہ طلب نکتہ یہ ہے کہ "یکادون یسطون" فعل مضارع ہے اور کفار کی مذکورہ بالا کیفیت کے استمرار پر دلالت کرتا ہے۔ یعنی اگر وہ مارپیٹ کا موقع پاتے تو ضرور مارتے اور اگر موقع نہ پاتے تو مار پیٹ کے لیے تیار ضرور رہتے۔ ہماری زبان میں وہ اکثر رانت پیٹتے ہی رہتے ہوں گے کہ وہ مار پیٹ پر قادر نہیں ہیں۔ ایسے احمقوں کے مقابلے میں رسول اکرم کو یہ حکم دیا جاتا ہے کہ ان سے کہہ دے کہ اس سے بھی بدتر چیز کی تم کو خبر دوں! جہنم کی بھم کر دینے والی آگ اس سے کہیں تکلیف دہ ہے دقل افا نیکم بشر من ذلکھ النار)۔ یعنی اگر اللہ کی واضح اور کھلی ہوئی آیتیں تمہیں بڑی معلوم ہوتی ہیں۔ شاید اس لیے کہ تمہارے معنی اور اہل بچہ نظریات کے برعکس

۱۔ "منکر" مصدر می ہے۔ "انکار اور ناپسندیدہ افعال کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ ایک قلبی کیفیت سے یہاں اس کے آثار مراد ہیں۔ جو چہرے پر نمایاں ہوتے ہیں۔

۲۔ اس جملے میں "النار" بتدرج مصنف کی خبر ہے۔ اس کی تقدیر یہ ہے ہی النار (وہ آگ ہے) بعض مفسرین کے خیال میں خود "النار" بتدرج ہے اور جملہ (وعدہ اللہ)۔ اس کی خبر لیکن پہلی بات زیادہ صحیح ہے۔ نیز اسی جملے میں "وعدہ" کے دو محمول ہیں۔ پہلا الذین کفروا اور دوسرا ہا کا مقدم ہونا شاید مخصوص ہونے کو واضح کرنے کے لیے ہے۔

ہیں تو کہیں زیادہ بُری چیز کی تم کو خبر دے دوں اور وہ یہ کہ اللہ کی طرف سے تیار کیا ہوا اذیت ناک عذاب اور سزا ہے جو مہدی اور ہٹ دھرم لوگوں کا آخری ٹھکانا ہے۔ "مہم کر دینے والی وہی آگ، جس کا اللہ نے کفار سے وعدہ کر رکھا ہے" (وعدھا اللہ الذین کفروا)۔ اور یہ آگ بہت ہی بُرا ٹھکانا ہے (وہبش المصیر)

حقیقت یہ ہے کہ ان بدعنوان اور تند مزاج مخالفین کہ جن کے دلوں میں ہمیشہ تعصب اور ہٹ دھرمی کے شعلے بھڑکتے رہتے ہیں، کا بدلہ جہنم کی آگ کے سوا اور کچھ ہے ہی نہیں۔ کیونکہ ہمیشہ اللہ کی طرف سے دی جانے والی سزا گناہ کے تناسب سے ہوا کرتی ہے۔

اس کے بعد بتوں اور خود ساختہ معبودوں کی کیفیت، کمزوری اور ناتوانی کا دلچسپ اور حسب حال خاکہ بیان کیا گیا ہے اور مشرکین کے نظریات کو بڑے واضح انداز میں باطل ثابت کیا گیا ہے

عوام الناس سے خطاب کیا جا رہا ہے۔ اے لوگو! بیان کی جانے والی ایک مثال تو جیسے سنو۔ (اس پر غور و غوض کرو۔)

(یا ایہا الناس ضرب مثل فاستمعوا للہ) اللہ کو چھوڑ کر جن کو بطور خدا پکارتے ہو وہ تو کبھی بھی پیدا نہیں کر سکتے۔ چاہے وہ سب کے سب بل کر اس کے لیے اجتماعی کوشش کریں۔ (ان الذین تدعون من دون اللہ لمن یخلقوا ذبابا ولو اجتمعوا لہ) تمام بت اور مگر معبود سب اللہ کے برابر نظر اور اپنی نوع انسان کے تمام کے تمام صنعت کار اور معبود اگر مل کر بھی کوشش کریں تو ایک کھٹی نمک پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ ایسے میں وہ کسی بنا پر ان نا اہل چیزوں کو اس پر درگزر عالم کا ہم ملے قرار دے سکتے ہیں۔ جو زمین و آسمان پر نہارا ذی روح موجودات، دریاؤں، ریگستانوں، جنگلوں، زیر زمین اور زیر آب مخلوقوں کا بنانے والا اور پیدا کرنے والا ہے وہ اللہ جو زندگی کو مختلف شکلوں اور طرح طرح کی صورتوں میں پیش کرنے والا ہے، جس کی قدرت کا ملے کے حیرت انگیز اور عجیب و غریب مظاہر انسان کو اس کی تحسین و افرین اور حمد و ستائش کرنے پر بے اختیار مجبور کرتے ہیں۔ یہ کمزور و نا اہل معبود کہاں اور وہ قادر حکیم مطلق کہاں۔ تاکمیر مزید کے طور پر اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ نہ صرف یہ کہ بناؤنی معبود کھٹی نمک پیدا نہیں کر سکتے، بلکہ خالق و معبود حقیقی کی پیلے کی ہوئی ایک کھٹی کا مقابلہ بھی نہیں کر سکتے۔ ایک کھٹی ان سے کچھ جھین لے تو یہ واپس تک لینے کی طاقت نہیں رکھتے۔ (و ان یسلبہم الذباب شئیئا لا یتنقذوہ منه)۔

ایسا کمزور اور بے بس موجود جو ایک کھٹی کے مقابلے میں شکست کھا جائے، کیا یہ صلاحیت رکھتا ہے کہ ہم اسے اپنی تقدیر کا مالک اور مطلق مشکلات سمجھ سکیں؟ بلاشبکہ شبہ ایسے معبودان کی عبادت کرنے والے اور خود یہ معبود دونوں ہی ضعیف و بے بس ہیں۔ (ضعف الطالب والمطلوب)۔

روایات میں ہے کہ بت پرست قریش ان بتوں پر جو انہوں نے خاک کعبہ کے گرد و نواح میں جمع کر رکھے تھے، شہد بٹک عبیر اور زعفران چھڑکتے اور طواف کرتے ہوئے۔

لبیک اللہم لبیک، لبیک لا شریک للہ، لا شریک ہو لک تملک و ما

ملکت، کا غلبہ کرتے۔ یہ خرافات تو حید پرستوں کی لیبیک کی واضح تحریف اور ان کے شرک کی واضح دلیل تھی جو ان پست و حقیر چیزوں کو خالق کون و مکان کا شریک سمجھتے تھے، لیکن ان بتوں پر لکھیاں بھیننا تھیں اور شہد و زعفران اور مشک و عبیر اڑا لے جانے والے اور بت کیوں کو روک نہ سکتے تھے۔ قرآن مجید اس منظر کو بتوں کی بے بسی اور مشرکین کی کمزور منطق کے بیان کے لیے بطور ایک مثال ذکر کرتا ہے۔ گویا کہ چیلنج کر رہا ہے کہ اچھی طرح سوچ سمجھ لو کہ وہ چیزیں جن کو تم اپنے معبود اور مشکل کشا سمجھتے ہو کس طرح ہماری پیدا کردہ ایک کھٹی کے سامنے بے بس ہیں اور اس حقیر مخلوق کے مقابلے میں بھی اپنا دفاع نہیں کر رہے۔ یکس قدر پست و حقیر معبود ہیں۔ "طالب" مطلوب سے وہی مراد ہے جو ہم اوپر بیان کر آئے ہیں "نبی" طالب بتوں کو پوجنے والے اور "مطلوب" خود بت، دونوں ہی کمزور و بے بس ہیں۔

بعض مفسرین نے "طالب" سے کھٹی مراد لی ہے اور "مطلوب" سے بت کی کھٹی جیسی حقیر شے ان پر مبنی ہیں۔

بعض دیگر مفسرین نے "طالب" سے بت مراد لی ہے اور "مطلوب" سے کھٹی، کیونکہ بالفرض بت کھٹی جیسی حقیر شے بھی پیدا کرنا چاہیں تو بھی نہ کر سکیں گے، لیکن پہلا مفہوم زیادہ صحیح نظر آتا ہے۔

مذکورہ بالا مثال دینے کے بعد قرآن مجید نتیجہ یہ کہہ رہا ہے: جس طرح اللہ کو پہچاننے کا حق تھا انہوں نے نہیں پہچانا (ما قدر و اللہ حق قدرہ) اللہ کی معرفت کے بارے میں وہ اس قدر پیچھے ہیں کہ اس با عظمت و ملامت خدا کو اتنا پست کر دیا کہ اتنی بے وقعت چیزوں کو اس کا شریک گردانا۔ اللہ کی اگر صورتی سی بھی معرفت رکھتے تو اس بے حیثیت جوڑ پر شہ منہ ہوتے۔ آیت کے آخر میں اللہ تعالیٰ اپنی طاقت و سلطنت کا اظہار کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے: اور اللہ طاقت ور اور صاحب سلطنت ہے (ان اللہ لفتویٰ عزیز)۔ اور ہرگز ان بھولے اور بے بس خداؤں کی طرح نہیں ہے جو ایک حقیر سامان پر پیدا کرنے کی صلاحیت بھی نہیں رکھتے اور نہ کھٹی سے مقابلے کی تاب رکھتے ہیں۔ بلکہ وہ تو ہر چیز پر قادر ہے اور اس پر اسے عالم میں ایک وجود بھی ایسا نہیں جو اس کے سامنے ظہر کے۔

چند اہم نکات

۱۔ بتوں کی ناتوانی کی ایک واضح مثال اگرچہ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ ان آیتوں میں مثال کے بارے میں گفتگو ضرور ہے۔ مگر خود مثال کو بیان نہیں کیا گیا۔ بلکہ قرآن مجید کے دیگر مطالب کا ذکر کیا گیا ہے یا یہاں مثال صرف معنی ثبوت یا اصل مطلب یا ایک حیرت انگیز چیز کے معنی میں استعمال کی گئی ہے نہ کہ اپنے معمول کے معنی میں۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ قرآن مجید نے ان آیتوں میں مثال کے تحت جس چیز کو پیش کیا ہے اور جس پر غور و غوض کی عمومی دعوت دی ہے وہ "کھٹی" ہی تو ہے، جسے کمزور مخلوق مگر خوراک پھیننے والی کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اگرچہ یہ مثال مشرکین عرب کے مقابلے میں پیش کی گئی ہے۔ مگر آیت مجیدہ کے عمومی خطاب (یا ایہا الناس) کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ کوئی اور پتھر و بتوں کے بتوں تک

ہی محدود نہیں بلکہ ان تمام مہودوں کے مقابلے میں ہے۔ جن کی اللہ کے علاوہ کسی طور پر بھی پرستش کی جاتی ہے، فرد، فرعون، بت جھوٹی شخصیتیں اور فانیات وغیرہ بھی اس میں شامل ہیں۔ یہ سب کے سب اگر اکٹھے ہو جائیں اور اپنے تمام وسائل و ذرائع علوم اور ٹیکنالوجی بروئے کار لائیں اور نابغہ روزگار سائنس انوں کی ہر پور صلاحیتوں سے استفادہ کریں۔ لیکن پھر بھی ایک کئی تک پیدا نہیں کر سکتے اور یہاں تک کہ اگر کبھی ان کے دسترخوان سے کھانے کا ایک ذرہ اٹھا کر لے جائے تو اس سے ہالیں لینے کی اہلیت نہیں رکھتے

۲۔ ایک سوال کا جواب
ہو سکتا ہے اس مقام پر کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کر آج کا انسان اپنے علم اور ٹیکنالوجی کی بنیاد پر ایسی ایسی ایجادیں کر چکا ہے جو کبھی کے مقابلے میں کہیں زیادہ پیچیدہ اور اعلیٰ ہیں۔ مثلاً تیز رفتار ذرائع آمد و رفت، خلاوردی کے ذرائع، آواز سے زیادہ تیز رفتار راکٹ اور سیارے جو ٹپک ٹپکے میں زمین کے مدار سے نکل جاتے ہیں، اسی طرح کمپیوٹر اور روبوٹ جو ریاضی کے پیچیدہ سوال ایک لحظے میں حل کر کے رکھ دیتے ہیں۔ تو کیا مذکورہ بالا مثال ہمارے اس ترقی یافتہ انسان کے لیے بھی صادق آتی ہے؟
جواب ہم عرض کریں گے کہ بیشک ان معجزات عقل و مسائل اور اشیاء کی ایجاد آج کے انسان کی غیر معمولی ترقی کی روشن دلیل ہے مگر یہ سب کچھ ایک زندہ اور بارادہ مخلوق کی خلقت کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔

اگر ہم فزیالوجی اور بیالوجی کی ان کتاب کا بغور مطالعہ کریں، جن میں کبھی جیسے چھوٹے سے کیرے کے کڑے کی جہانی ساخت اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کا ذکر ہے، تو ہمیں پتہ چل جائے گا کہ ایک کبھی کے دماغ کی ساخت اعصاب کا جال اور نظام باغض آج کے سائنس ہوائی جہاز کی ساخت سے کہیں پیچیدہ اور اعلیٰ ہے اور کسی لحاظ سے بھی اس سے موازنہ کے لائق نہیں دراصل زندگی، زندہ موجودات کی حرکات و احساسات اور نشو و نما علی الخصوص ان کی پیدائش ایسی تک بڑے بڑے سائنس دانوں اور دانشوروں کے لیے لایحل مسائل و مہمت کی طرح ہے۔ اس پرسترازیہ کہ ان کی خلقت کے لیے کن باریکیوں اور تکنیک کی ضرورت ہوگی، کسی کو خبر نہیں ہے۔

علوم طبیعیات کے ماہرین کے بقول بعض حشرات کی آنکھیں بہت چھوٹی ہیں۔ جو مزید کہی سو چھوٹی آنکھوں سے مرکب ہیں۔ یعنی وہ ایک آنکھ جس کو بڑی شکل سے دیکھا جاسکتا ہے اور شاید وہ بھی سوئی کی نوک کے حجم کے برابر ہے۔ کئی سو چھوٹی چھوٹی آنکھوں کا مجموعہ ہے۔ اس کے مرکب کو آنکھ کہتے ہیں۔ بہر حال فرض کریں اگر انسان بے جان مواد سے ایک زندہ بن جائے۔ مگر کس میں یہ صلاحیت ہے کہ کئی سو چھوٹی چھوٹی آنکھوں کو باہم مربوط کر کے اس کے دماغ تک اس طرح لے جائے کہ وہ کچھ شہادت دماغ کو مستقل کر سکے تو کیا وہ چیز کسی موقع پر اپنے ارد گرد دونا ہونے والے واقعات پر کسی قسم کے عمل کا اظہار کر سکتی ہے؟ اور کیا تمام قابل انسان مل کر بھی مذکورہ بالا حیرت انگیز پیچیدہ اور پراسرار شے بنانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

اس پرسترازیہ کہ اگر انسان مذکورہ بالا فرض کو حقیقت بھی کر دکھائے تو کیا اسے "خلقت" کا نام دیا جاسکتا ہے! یا اسے صرف "ASSEMBLING" یعنی پرزوں کو جوڑنے کا نام دیا جائے گا۔ بالکل اسی طرح جس طرح صرف پرزوں کو جوڑ کر گاڑی تیار کرنے والے اس کے جوڑنے والے تو کہلا سکتے ہیں مگر موجد نہیں کہلائے جاسکتے۔

۷۰۔ اللہ یصطفیٰ من الملائکۃ رسلاً ومن الناس ۱۱ ات اللہ سمیع بصیر ۱۲

۷۱۔ یعلم ما بین یدئہم وما خلفہم و
الی اللہ ترجع الامور ۱۳

۷۲۔ یٰۤایہا الذین امنوا ارکعوا واسجدوا
واعبدوا ربکم وافعلوا الخیر لعلکم
تفلحون ۱۴

۷۳۔ وجاہدوا فی اللہ حق جہادہ ۱۵ ہوا جت بکم
وما جعل علیکم فی الدین من حرج ۱۶
ملۃ اٰبیکم ابراہیم ۱۷ ہوسمکم المسلمین ۱۸
من قبل و فی ہذا لیکون الرسول شہیداً
علیکم وتکونوا شہداء علی الناس ۱۹
فاقیموا الصلوۃ واتوا الزکوۃ واعتصموا
باللہ ۲۰ ہومولکم فنعم المولیٰ ونعم
النصیر ۲۱

ترجمہ

۷۵۔ اللہ فرشتوں میں سے پیغامبر منتخب کرتا ہے اور اسی طرح انسانوں میں

سے بے شک اللہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔

۷۶۔ جو کچھ ان کے سامنے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے، وہ جانتا ہے اور تمام امور کی بازگشت اللہ کی طرف ہے۔

۷۷۔ اسے ایمان والو! رکوع کرو اور سجدہ بجالاؤ اور اپنے پالنے والی کی عبادت کرو اور نیک کام کرو تاکہ نجات پا جاؤ۔

۷۸۔ اور راہ خدا میں ایسا جہاد کرو جو جہاد کرنے کا حق ہے۔ اس نے تمہارا

انتخاب کیا ہے اور دین میں تم پر مشقت طلب یوحہ نہیں ڈالتا۔ یہ

وہی تمہارے باپ ابراہیم کا دین ہے، اس نے پہلی کتب اور اس

کتاب میں تمہارا نام "مسلمان" رکھا ہے تاکہ پیغمبر تم پر گواہ ہو

اور تم لوگوں پر اہل نماز پڑھو اور زکوٰۃ دو اور اللہ کے ساتھ وابستہ

رہو، کیونکہ وہی تمہارا مولا اور سرپرست ہے اور وہ کیسا اچھا مولا اور کتنا عمدہ

مددگار ہے۔

شان نزول

بعض مفسرین کے بقول، ولید بن مغیرہ، ہوشیار کن کا داغ سمجھا جاتا تھا۔ وہ اور اس جیسے بعض دیگر مشرکین پیغمبر اسلام کے مبعوث برسات ہونے کے بعد ہجرت سے کہا کرتے تھے۔

﴿عَاۤئِذٌ بِذَٰلِكَ نَعُودُ﴾

”کیا ہم سب کو چھوڑ کر ہم میں سے محمد جیسے یتیم و مفلوک الحال، پر وحی نازل ہوئی ہے

اس تعجب کا جواب بن کر زیر بحث پہلی آیت نازل ہوئی اور انہیں بتایا گیا کہ انبیاء اور فرشتوں کی رسالت کے لیے امتیاز

لیاقت و قابلیت اور معنوی معیار کی بنا پر ہوا کرتا ہے، سلفہ

سلفہ۔ تفسیر قرطبی، ابو العنوف، رازی، فخر الدین رازی اور روح المعانی زیر بحث آیت کی تفسیر کے ذیل میں۔

تفسیر

پانچ اہم اور تعمیری احکام

گدشتہ آیات توحید، شرک اور مشرکین کے خیالی اور خود ساختہ مجہودوں کے بارے میں تین احکام اس لحاظ سے کہ مہین لوگوں نے فرشتوں اور بعض انبیاء کو بھی مسجود بنایا تھا، زیر بحث پہلی آیت میں ارشاد ہوتا ہے۔ اللہ کی طرف سے آنے والے تمام پیغمبر اللہ کے مطیع اور فرمانبردار بندے تھے۔ ”اللہ فرشتوں اور انسانوں میں سے رسول انتخاب کرتا ہے“ (اللہ یصطفیٰ من الملائکۃ رسلاً ومن الناس)۔

فرشتوں میں سے رسول کی مثال جبرائیل امین کی ہے اور انسانوں میں سے تمام رسول اس کی مثال ہیں۔ ملائکہ کے سلسلے میں ”میں“ کا لفظ جیسے ”من تبیینی“ کہتے ہیں۔ اس حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے کہ تمام فرشتے انسان کی طرف اس کے رسول بن کر نہیں آئے، بلکہ ان میں سے چند ایک کو یہ خصوصیت حاصل ہے۔ اس لحاظ سے سورہ فاطر کی پہلی آیت

”جَاعِلُ الْمَلَائِكَةِ رُسُلًا“

”اللہ نے فرشتوں کو رسول بنایا“

اس آیت کی تفسیر نہیں کرتی، کیونکہ وہاں جس ملائکہ مراد ہے نہ کہ انفرادی جنس۔ آیت کے آخر میں ارشاد ہوتا ہے۔

”اللہ سننے والا ہے۔“ (اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ بَصِیْرٌ)۔

یعنی اللہ اپنے رسولوں کی کارکردگی سے بے خبر نہیں بلکہ لمحہ لمحہ سے مطلع ہے، ان کی بات چیت سنا اور ان کے افعال و اعمال کا حوالہ کرتا ہے۔ اس کے بعد جیلغ و ترویج رسالت کے سلسلے میں رسول کی ذمہ داریوں اور اللہ کی طرف سے ان کی نگرانی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے۔ ”اللہ اُسے بھی جانتا ہے جو ان کے سامنے ہے اور اُسے بھی جو ان کے پیچھے ہے“ (یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْہُمْ وَمَا خَلْفَہُمْ)۔ یعنی اللہ ان کے اٹھنے اور مستقبل اور ان کے آٹھنے پر ہر طرح آگاہ ہے۔ ”اور تمام کاموں کی انتہا اور بازگشت اللہ کی طرف ہے“ اور سب اس کے سامنے ہی جواب دہ ہیں۔ (وَالِی اللّٰہُ شَرِّحَ الْمَاسُوْر) تاکہ وہ لوگ اچھی طرح جان لیں کہ فرشتے اور پیغمبر بھی بنسے ہیں۔ اللہ کے مطیع، فرمانبردار اور اس کی بارگاہ میں جواب دہ ہیں، ان کے پاس جو کچھ ہے، ان کا اپنا نہیں، بلکہ سب کچھ خدا کا دیا ہوا ہے، اور ہرگز اللہ کے مقابلے میں معبود یا لائق پرستش نہیں ہیں۔ اس بنا پر (یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْہُمْ) کا جملہ دراصل انبیاء کی شرعی ذمہ داریوں کے بارے میں بارگاہ پروردگار کی جوابدہی اور ان کے افعال و کردار پر اللہ کی طرف سے کڑی نگرانی کی طرف اشارہ ہے۔

اسی طرح سورہ جن کی آیت نمبر ۱۲۷۔ ”وَمَنْ یُّشْرِکْ بِاللّٰہِ فَقَدْ جَعَلَ ذِکْرَہٗ الَّذِیْ یُذَکَّرُ سَیْرًا“

فلا يظهر على غيبه احدا الا من ارتضى من رسول فاته يسلط من بين يديه ومن خلفه رصدا ليعلم ان قد ابلاغوا رسالات ربهم واحاط بما لديهم.

اللہ کسی کو اپنے اسرار غیب نہیں بتاتا، سوائے چنے ہوئے پیغمبروں کے جن سے وہ راضی ہے اور ان پر ایسے نگران مقرر کرتا ہے جو ان کے آگے پیچھے رہتے ہیں تاکہ پتہ چلے کہ وہ اپنے پروردگار کے احکامات پہنچاتے ہیں یا نہیں اور ان کی ہر ایک شے سے اللہ پوری طرح باخبر ہے۔

ضمنی طور پر یہ بھی واضح ہو جائے کہ "ما بین ایدہم" سے مراد مستقبل اور "ما خلفہم" سے مراد انبیاء سے قبل کے واقعات ہیں۔

اس کے بعد سورہ حج کی آخری دو آیات میں مومنین کے دنیوی و آخری، ہمہ جہتی مفاد کے عناصر بنیادی اور مجموعی احکامات بیان کرتے ہوئے ان سے خطاب کیا جا رہا ہے اور یوں سورہ حج کا "حسن اختتام" ہوتا ہے۔ سب سے پہلے پارا ہم احکامات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے: "اے ایمان والو! رکوع کرو۔ سجدہ کرو اور اپنے پروردگار کی عبادت کرو اور اچھے کام کرو تاکہ کامیاب رہو۔ (یا ایہا الذین امنوا ارکعوا وسجدوا واعبدوا ربکم وافعلوا الخير لعلکم تفلحون)۔

ارکان نماز میں سے صرف رکوع و سجدہ کا ذکر ان کی شراہیت پر دلالت کرتا ہے۔ اس کے بعد عمومی طور پر عبادت کا جو بلا قید حکم ہے۔ اس سے مراد اللہ کی ہر قسم کی عبادت و بندگی ہے۔ "ربکم کہہ کر اللہ کی عبادت کے لیے اہمیت ثابت کی گئی ہے اور اس کے غیر کی نا اہمیت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ کیونکہ عالم کائنات میں صرف وہی اکیلا مالک اور پالنے والا ہے "فعل الخیرات" کا حکم بھی مطلق ہے اور کسی قسم کی قید و شرط کے بغیر ہے چنانچہ اس سے ہر ایک کام مراد ہے۔ اس سلسلے میں ابن عباس کی روایت کہ اس سے مراد صلہ رحمی اور مکام الاطلاق ہے۔ دراصل اس کے وسیع مفہوم کا ایک تعمیری مصداق ہے۔

اس کے بعد لفظ "جہاد" وسیع معانی میں استعمال کرتے ہوئے پانچواں حکم دیا جاتا ہے۔ "راہ خدا میں اس قدر جہاد کرو کہ جہاد کا حق ادا ہو جائے (وجاہدوا فان الله حق جہاد کا ہر مفسرین نے اس جگہ جہاد سے مسلح جنگ مراد نہیں لیا۔ بلکہ جیسا کہ اس لفظ کے لغوی معنی ہیں۔ راہ خدا میں مجموعی جدوجہد، کوشش اور نیک کام نیز سرکش اور احکام الہی کی باغی ہوا دھوس کو قابو میں رکھنا، یعنی جہاد اکبر اور ظالم و جائع دشمن کا میدان کارزار میں مقابلہ کرنا یعنی جہاد اصغر مراد لیا ہے۔

لے تفسیر المیزان میں زیر بحث آیت کی تفسیر کے ذیل میں جناب علامہ مہارانی "لعلکم ما بین ایدہم" کو سلا ممت اور اللہ کی مدد و نصرت کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں۔ لیکن ہماری نظر میں یہ بعید ہے۔

نہج ایمان میں مرحوم جناب طبری بہت سے مفسرین کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ حق جہاد سے مراد غلوں سے اور اعمال کو صرف اور صرف اللہ کے لیے انجام دینا ہے۔

بیشک "حق جہاد" بھی عمومی اور وسیع معنی رکھتا ہے، جس میں مقدار، تعداد، کیفیت، حیثیت اور زمان و مکان سب شامل ہیں، مگر چونکہ اخلاص کی منزل جہاد بالنفس کے سلسلے میں مشکل ترین مراحل میں سے ہے، لہذا اس کا خصوصی ذکر کیا گیا ہے، کیونکہ انسان کے دل اور اعمال میں شیطانی خیالات و افکار کا عمل دخل بہت لطیف اور خفیہ انداز سے ہوتا ہے اور اللہ کے خاص بندوں کے سوا اس سے شاید ہی کوئی بچ نکلتا ہے۔

در اصل قرآن مجید نے ان پانچ احکامات کے ذیل میں آسان ترین مرحلے سے شروع کر کے مشکل ترین اور اعلیٰ ترین منزل تک راہنمائی کی ہے۔ سب سے پہلے رکوع کا ذکر کیا گیا ہے، پھر اس سے برتر فعل سجدے کی بات ہے۔ پھر مجموعی عبادت اور آخر میں تمام اچھے اور نیک اعمال و کردار کا ذکر ہے جس میں عبادات و غیر عبادات سب شامل ہیں اس کے بعد انفرادی، اجتماعی، ظاہری باطنی، قوی و دغلی جدوجہد، کوشش، جنگ و دو اور اخلاق و غلوں نیت کی بات کی گئی ہے یہ ایک جامع آئین ہے کہ جس کے نتیجے میں سو فی صد کامیابی کا مہمانی ہے۔ ممکن ہے اس مقام پر یہ خیال پیدا ہو کہ کمزور بندوں کو کس طرح ان بھاری اور سنگین ذمہ داریوں اور احکامات کا حامل قرار دیا گیا ہے، جبکہ ان میں سے ہر ایک ذمہ داری دوسری سے زیادہ وسیع اور جامع ہے، اس کے بعد میں آنے والے جملوں میں مختلف پیرائے میں بتایا گیا ہے کہ مذکورہ بالا ذمہ داریاں بارگاہِ احدیت میں بخیر کے مقام و منزلت اور عظمت و شخصیت کی علامت ہیں اور اللہ کی طرف سے مومن پر خاص لطف و کرم کا مظہر ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے ارشاد ہوتا ہے۔ "اس نے تمہارا انتخاب کر لیا ہے (ہو ا جتبا کھ) یعنی اگر تم اللہ کے منتخب کیے ہوئے نہ ہوتے تو یہ سنگین ذمہ داریاں تمہارے کندھوں پر نہ ڈالی جاتیں پھر ارشاد ہوتا ہے، "اس نے ان کڑی ذمہ داریوں کی انجام دہی کو تمہارے لیے باعثِ رحمت و شفقت قرار نہیں دیا۔

(وما جعل علیکم فی الذین من حرج) یعنی اگر عقل سلیم سے سوچو تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ ذمہ داریاں کڑی اور سخت نہیں ہیں۔ بلکہ تمہاری فطرت سے ہم آہنگ اور تمہارے مزاج و طبیعت سے مطابقت رکھتی ہیں۔ اصولی طور پر چونکہ تمہارے ارتقاء و تکمال کا ذریعہ ہیں۔ ان میں سے ہر ذمہ داری ایک واضح فلسفہ اور کثیر منفعت کی حامل ہے اور یہ منفعت تمہارے لیے ہی ہے۔ اس بنا پر ان کی انجام دہی تمہارے لیے قطعاً شاق اور تلخ نہیں ہے بلکہ نہایت شیریں اور خوشگوار ہے۔ تعمیری بات یہ بیان کی جا رہی ہے کہ یہ پروگرام تمہارے باپ ابراہیم کا دین ہے۔

(ملتہ ابیکم ابراہیم)۔ حضرت ابراہیم کو "باپ" کہنے کی دو وجہیں سمجھ میں آتی ہیں۔

(۱) عرب اور اس وقت کے مسلمان زیادہ تر حضرت اسماعیل کی نسل میں سے تھے۔

(۲) اس وقت کے تمام لوگ حضرت ابراہیم کو اپنا بزرگ اور روحانی باپ سمجھتے تھے۔ اس طرح تقریباً سبھی ان کا احترام کرتے تھے۔ اگرچہ ان کا صاف ستھرا مقدس دین طرح طرح کی خرافات سے آلودہ کر دیا گیا تھا۔

اس کے بعد اسی سلسلے میں ایک اور ارشاد ہوتا ہے: سابقہ کتب آسمانی اور اس وقت کی آسمانی کتاب (قرآن حکیم)

میں اس نے تھرا نام مسلمان رکھا ہے (ہو سماعکم المسلمین من قبل وفی هذا) اور مسلمان وہ ہے جو تمام احکامات خداوند قدوس کے سامنے تسلیم فہم کرنے کو اپنے لیے ایک بڑا اعزاز تصور کرے۔

”ہو سماعکم ...“ میں ضمیر ”ہو“ کے مرجع پر شدید اختلاف ہے۔ بعض مفسرین کے خیال میں ”ہو“ کا مرجع ”اللہ“ ہے۔ یعنی خود اللہ نے سابقہ کتب اور قرآن مجید میں مسلمانوں کو اس قابلِ فخر نام سے موسوم کیا۔ بعض دوسرے مفسرین کے خیال میں ”ہو“ کا مرجع حضرت ابراہیم ہیں۔ کیونکہ سورۃ البقرہ آیت نمبر ۱۲۸ میں مذکور ہے کہ تعیر فاند کعبہ کے انتقام پر حضرت ابراہیم نے بارگاہ اقدس الہی میں چند دعائیں کی تھیں۔ جن میں سے ایک یہ دعا تھی۔

”ربنا واجعلنا مسلمین لك ومن فريقتنا امة مسلمة لك“

بارالہ! ہم دونوں (مجھے اور میرے بیٹے) کو اپنا مطیع رکھ اور ہماری نسل سے ایک امت مسلمہ جو تیری مطیع و فرمانبردار ہو، پیدا کر دے۔

لیکن ہماری نظر میں پہلا نظریہ زیادہ صحیح ہے اور آیت کے مضمون سے زیادہ ہم آہنگ ہے۔ سابقہ کتب اور قرآن مجید میں مسلمانوں کا نام رکھنے کی نسبت حضرت ابراہیم کی طرف دینا مناسب نہیں، بلکہ یہ نسبت اللہ ہی کی طرف مناسب ہے۔ پانچواں اور آخری شوق آخری عتہ یہ ہے کہ مسلمانوں کا تعارف تمام امتوں کے لیے ایک نمونہ اور علامت کے طور پر رکایا جا رہا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: مقصد یہ تھا کہ پیغمبر تہا کے گواہ ہیں اور تم تمام لوگوں کے گواہ ہو۔ (لیکون الرسول شہیداً علیکم وتکونوا شہداً علی الناس)۔

”شہید“ ”شہود“ کے مادہ سے ہے اور اس کا مطلب وہ آگاہ و باخبری ہے، جو چشم دید ہو، اس بات کا مفہوم یہ ہے کہ پیغمبر اکرم کا تمام مسلمانوں پر گواہ ہونا، تمام اعمال کو اسے باخبر ہونے کے معنی میں ہے۔ یہ مفہوم ان تمام آیات و روایات جن میں رسول اکرم کی خدمت میں عرض احوال کا ذکر ہے، اس کے عین مطابق ہے، ان روایات کے مطابق ہفتہ بھر میں ایک دن تمام امت کے تمام اعمال آپ کی بارگاہ میں پیش کیے جاتے ہیں۔ اور آپ کی روح مطہران سے باخبر ہوتی ہے۔ اس بنا پر آپ امت کے گواہ ہیں۔

یہ بات کہ امت کس طرح تمام لوگوں کی گواہ بنی؟ بعض روایات کے مطابق اس سے مراد امت کے معصوم افراد، یعنی اللہ اطہار ہیں جو لوگوں کے اعمال کے گواہ ہیں۔ امام علی الرضا علیہ السلام سے ایک روایت ہے۔

”عن حجج الله في خلقهم وعن شهداء الله واعلامه في بريته“

لے سورۃ مائدہ آیت نمبر ۱۱ میں مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دین کا نام اسلام رکھا ہے۔

واستحمت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دیناً

متحد آیات میں رسول اکرم کو قول المسلین، فرمایا گیا ہے، جن میں سورۃ انعام آیت نمبر ۱۰ اور سورۃ زمر آیت نمبر ۱۱

بھی شامل ہیں۔

”اللہ کی مخلوق اور بندوں میں ہم اس کے مانند سے گواہ اور نشانیاں ہیں“ لے دراصل لشکونوا کے ذریعے اگرچہ ظاہر اساری امت سے خطاب کیا جا رہا ہے۔ مگر درحقیقت امت کے سید و مراد اور بزرگ مراد ہیں۔ جزو کی بنا پر کل سے خطاب کی ہمارے سامنے بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ چند افراد سے خطاب کے لیے سب سے خطاب کیا جاتا ہے۔ مثلاً سورۃ مائدہ آیت نمبر ۱۱ میں ارشاد ہوتا ہے

”اللہ نے تمہیں بادشاہ اور فرمانروا بنایا“

یہ خطاب نبی اسرائیل کو دی گئی نعمتوں کے شمارے کے ذیل میں تمام امت سے کیا جا رہا ہے۔ حالانکہ اس منصب کے حامل تو معدودے چند افراد تھے۔

”شہود“ ایک اور معنی بھی رکھتا ہے اور وہ ہے عملی شہادت، یعنی اپنے کردار سے کسی بات کی گواہی دینا، یعنی موازنہ اور مقابلہ سبکی، کسی عمل و کردار کو دوسرے عمل و کردار سے موازنہ کرنا بالفاظ دیگر ایک شخص کے اعمال و کردار کا دوسروں کے لیے نمونہ ہونا۔ اس معنی میں تمام سچے مسلمان شامل ہو سکتے ہیں یعنی وہ بہترین دین پر عمل پیرا ہو کر تمام لوگوں کے لیے شرافت اور کردار کی رفعت کا ایک پیمانہ بن جائیں۔ حضرت رسول اکرم سے ایک روایت ہے۔

اللہ نے مسلمانوں کو چند فضیلتیں عطا کی ہیں۔ مجاہدان کے ایک یہ ہے کہ گزشتہ ادوار، جبکہ ہر امت کے لیے نمونہ ان کا پیغمبر ہوتا تھا، کیجائے اللہ نے میری ساری امت کو مخلوق کے لیے نمونہ قرار دیا ہے۔ فرماتا ہے:-

لیکون الرسول شہیداً علیکم وتکونوا شہداً علی الناس

یعنی جس طرح ہر نبی اپنی امت کے لیے اسوۂ حسنہ اور نمونہ ہوتا ہے، تم ساری دنیا کے لیے ایک مثالی کردار اور نمونہ ہو۔ یہ مفہوم، ایک تو پہلے بیان شدہ مفہوم کے منافی نہیں اور مزید برآں ہو سکتا ہے یہ مفہوم بھی ہو کہ یوں تو تمام امت ہی گواہ ہے مگر ائمہ اطہار امت ساز اور نمایاں گواہ اور نمونہ ہیں۔ لے

آیت کے آخر میں مذکورہ پانچ ذمہ داریوں کو تاکید مبین محمول میں زیادہ مختصر پیرائے میں فرمایا جا رہا ہے: اب اگر یوں ہے اور تم اعزازات اور امتیازات کے حامل ہو تو نماز ادا کرو، زکوٰۃ ادا کرو اور پروردگار عالم کی بے پایاں عنایات کے پر قیوم آئین اسلام سے متکبر رہو فاقیموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ واعتصموا باللہ، کیونکہ تمہارا سرپرست اور مددگار وہی ہے (ہو مولاکم) اور کتنا اچھا سرپرست اور کیسا عمدہ اور باصلاحیت مددگار ہے (فتعم المولیٰ ونعم النصیر) دراصل یہ جملہ ”واعتصموا باللہ ہو مولاکم“ کی دلیل ہے

لے ذرا فقین جلد نمبر ۱ کے مطابق کتاب کمال الدین اور اسی طرح کی دوسری روایات بھی نقل کی گئی ہیں۔

لے تفسیر برہان جلد نمبر ۲ ص ۱۵

لے اسی تفسیر کی پہلی جلد میں سورۃ البقرہ آیت نمبر ۱۴۲ اور سورۃ النسا کی آیت نمبر ۱۱ کی تفسیر کے ذیل میں ہم اسی معنوں سے متعلق سیر حاصل بحث کر چکے ہیں۔

یعنی اگر تمہیں کہا گیا ہے کہ صرف الطاف و عنایات پروردگار سے وابستہ رہنا بلا وجہ نہیں۔ کیونکہ وہ سب سے اعلیٰ، اچھا، اور مناسب یا در دنا صریح ہے۔

بارالہا! ہمیں یہ توفیق عطا فرما کہ صرف تجھی سے وابستہ اپنے اور خالق و مخلوق سے رشتے کی وجہ سے لوگوں کے لیے نمونہ و معیار بنیں اور تیری عظیم کتاب کی جامع اور نمونہ تفسیر "مکمل کریں۔
خدا یا اچھی طرح سابقہ کتب اور اس قرآن حکیم میں تو نے ہمیں "مسلمان" کہہ کر پکارا ہے۔ یہ توفیق دے کہ سزا پائیں
علم کے بندے بن جائیں۔

پروردگارا! وہ دشمن جو آج ہر طرف سے قرآن و اسلام پر حملہ آور ہو رہا ہے، ہمیں اس پر غلبہ عطا فرما کہ تو ہی بہترین مولا اور مددگار ہے۔ (فنعلم الصواب ونعم النصیر)۔

سورۃ حج کی تفسیر اختتام کو پہنچی



ادارہ امانیہ قرأت کالج

سرفیکٹ تصحیح

یہ نے مستد آصف پاک (تفسیر نمونہ جلد ۱)
کے اس شخص کو حرف بحرف بغور پڑھا ہے
تصدیق کرتا ہوں کہ قلم میں ہے کہ آج
یا غفلت غلط نہیں ہے۔

واللہ اعلم بالصواب
حافظ محمد طفیل (سلطان القاضی)
مدتہ منین

امامیہ قرأت کالج

اندرون جمہوریہ فاہہ - لاہور

۷۰۳	رحیم
۷۰۳	رؤف
۷۱۵، ۷۰۳، ۶۹۵	سمیع
۶۰۹	شہید
۷۰۸، ۶۶۲	عزیز
۷۰۳، ۶۹۵	عفو
۷۰۳، ۶۹۵	علی
۷۳۰	علیم
۷۰۳، ۶۹۵، ۱۴۱	غفور
۷۰۳	غنی
۶۶۲، ۵۹۴	قدیر
۷۰۸، ۶۶۲	قوی
۵۲۶، ۴۸۲، ۴۸۱	قیوم
۷۰۳، ۶۹۵	کبیر
۷۰۳، ۶۹۹	لطیف
۵۰	پہلے ان (اصحاب کہف) کے دل میں توحید کی فکر پیدا ہوئی۔
۷۳	انشاء اللہ کہنا توحیدِ افعالی کا مقدمہ اور کتاب ہے
۱۰۷ تا ۱۰۵	کیا تو اللہ سے کافر ہو گیا جس نے تجھے مٹی، پھر لطف سے پیدا کیا اور پورا انسان بنایا؟
۱۰۵	اللہ میرا رب ہے، میں کسی کو اس کا شریک نہیں بناتا۔
۱۱۲، ۱۱۰	ولایت و قدرتِ خدا کے لیے ہے

أصول وعقائد

(توحید)

اسمائے باری تعالیٰ

۶۵۶، ۶۵۲، ۶۴۵، ۶۱۸، ۶۱۵، ۶۳۲	اللہ
۶۹۹، ۶۹۵، ۶۹۰، ۶۷۴، ۶۶۲	
۷۱۵، ۷۰۸، ۷۰۵	
۷۱۵، ۷۰۳، ۶۹۵	بصیر
۶۸۳	حکیم
۷۰۳	حلیم
۷۰۳	حمید
۵۲۶، ۴۸۲، ۴۸۱	حیی
۷۰۳، ۶۹۹	خبیر
۲۹۴، ۲۸۳، ۲۷۶، ۲۴۸، ۲۳۴، ۲۲۹	رب
۳۶۱، ۳۴۸، ۳۴۶، ۲۹۹، ۲۹۶	
۴۷۶، ۴۰۷، ۳۶۸، ۳۶۷، ۳۶۴	
۷۰۵، ۵۵۴، ۵۴۴، ۵۱۰، ۵۰۸	
۲۷۲، ۲۴۹، ۲۴۸، ۲۴۵، ۲۲۹، ۲۲۲	رحمن
۳۰۳، ۲۹۶، ۲۸۸، ۲۸۶، ۲۷۵	
۳۱۸، ۳۱۵، ۳۱۳، ۳۰۶، ۳۰۵	
۴۸۴، ۴۲۶، ۴۲۴، ۴۲۳، ۴۱۹	
۵۸۶، ۵۸۱، ۵۷۷، ۴۹۷	

اشاریہ

تفسیر نمونہ جلد ۱

ترتیب و ترتیب سید شکیل حسین موسوی
..... سید محمد حسین زیدی الباہروی

۷۲۵	مضامین:
۷۲۸	أصول وعقائد
۷۳۰	احکام
۷۳۱	أخلاقیات
۷۳۱	أقوام گذشتہ
۷۳۸	شخصیات
۷۴۹	علماء و دانشور
۷۵۰	کتاب سماوی
۷۵۲	کتاب تاریخ و تفسیر و سیر
۷۶۱	تفاسات قرآن
۷۷۷	متفرق موضوعات
	مقامات

اس کے یہاں اطاعت گزاروں کے لیے
بہترین اجر و ثواب ہے۔

۱۱۳، ۱۱۰

اللہ ہر چیز پر قادر ہے
پروردگار کے کلمات لکھنے کو سمندر سیاہی

۱۱۷، ۱۱۶

نہیں تو ختم ہو جائیں گے۔

۲۱۹، ۲۱۸

تمہارا معبود صرف ایک ہے

۲۲۳، ۲۲۲

کسی کو اپنے رب کی عبادت میں شریک نہ کرو

۲۲۴

کیا اللہ کا بیٹا ممکن ہے؟ وہ اس بات کے

۲۲۵

لائق نہیں کہ اس کا کوئی بیٹا ہو۔

۲۶۲

بیشک اللہ میرا اور تمہارا پروردگار ہے، اُسی

۲۶۸

کی عبادت کرو۔

۲۶۸

جنہیں تم اللہ کے سوا لپکارتے ہو، اُن سے

۲۷۷

کنارہ کش ہو کر اپنے رب کو پکارتا ہوں۔

۲۷۷

میں تم سے اس بُت پرست قوم اور بُتوں

۲۷۷

سے کنارہ کشی کرتا ہوں۔ ابراہیم ہمیشہ توحید

۲۷۷

کی منادی کرتے رہے۔

۲۷۸

وہ زمین و آسمان اور ان کے درمیان تمام

۲۷۸

چیزوں کا پروردگار ہے، اسی کی عبادت

۲۷۸

کرو، صبر سے کام لو، اس کا مثل و مانند نہیں۔

۲۹۴

اسے ہم نے اس حال میں خلق کیا تھا جب

۲۹۹

وہ کوئی چیز تھا ہی نہیں۔

۲۹۹

یہ بات ہرگز سزاوار نہیں کہ وہ کسی کو اپنا

۳۱۶

بیٹا بنائے۔

۳۱۶

اللہ ہی معبود ہے، اس کے اچھے اچھے نام

۳۳۱، ۳۲۸

میں، زمین و آسمان کی ہر چیز کا مالک ہے،

۳۳۱، ۳۲۸

تمام ظاہر و مخفی کا جاننے والا ہے۔

۳۳۱، ۳۲۸

میں اللہ ہوں میرے سوا کوئی معبود نہیں

۳۳۶

اللہ وہی تو ہے جس نے تمہارے لیے زمین

۳۳۶

کا فرش بچھایا، پانی برسایا، باغ آگائے۔

۳۳۶

بلند مرتبہ ہے اللہ جو بادشاہ برحق ہے

۳۳۱، ۳۳۰

میرا پروردگار زمین و آسمان کی ہر بات کو

۳۳۱، ۳۳۰

جانتا ہے، وہ سمیع و علیم ہے۔

۳۳۱، ۳۳۰

آسمان و زمین اور جو کچھ ان میں ہے، سب

۳۳۱، ۳۳۰

اللہ کی ملکیت ہے۔

۳۳۱، ۳۳۰

صرف میں اور میرے ساتھی توحید کی بات

۳۳۱، ۳۳۰

نہیں کرتے، تمام سابق انبیاء محدث تھے۔

۳۳۱، ۳۳۰

سب انبیاء کے پاس وحی آئی کہ خدا کے

۳۳۱، ۳۳۰

واحد کے سوا کوئی معبود نہیں۔

۳۳۱، ۳۳۰

انہوں نے کہا اللہ اولاد رکھتا ہے، وہ اس

۳۳۱، ۳۳۰

سے منزور ہے، فرشتے اس کے مکرّم بندے ہیں

۳۳۱، ۳۳۰

کیا ان کے معبود ایسے ہیں کہ ہمارے مقابلہ

۳۳۱، ۳۳۰

میں ان کی مدد کریں؟ ہرگز نہیں۔

۳۳۱، ۳۳۰

وہ سب ایک ہی مبداء سے فیض حاصل

۳۳۱، ۳۳۰

کرتے تھے جو خدا کے واحد کا ارادہ تھا، میں

۳۳۱، ۳۳۰

تمہارا رب ہوں، پس میری ہی عبادت کرو۔

۳۳۱، ۳۳۰

تمہارا معبود میں ایک ہی ہے

۳۳۱، ۳۳۰

۵۵۹، ۵۵۸

۵۵۹

لوگو! اپنے خدا سے ڈرو

۵۸۶

دو مہر مقابلہ کرو، پانچ غیر مومن گروہوں کا

۵۸۶

توحید کے بارے میں مومنین سے جھگڑا کرنا جو

۵۸۶

نبوت اور معاہدہ تک بڑھ جاتا ہے۔

۵۸۶

تمہارا خدا معبود و کیا دیکھا نہ ہے

۵۸۶

وہ کہتے تھے ہمارا پروردگار صرف اللہ ہے

۵۸۶

ہر چیز کا انجام و اختتام اسی کے ہاتھ میں ہے۔

۵۸۶

تیرے رب کے ہاں کا ایک دن تمہارے ہزار

۵۸۶

سال کے برابر ہے۔

۵۸۶

عدل

پاک ہے ہمارا رب جس کے وعدے

۱۱۶، ۱۱۱

پورے ہو کر رہتے ہیں۔

۱۱۶، ۱۱۱

ہم ظالموں کو سزا دیں گے

۱۸۵

جب عدلِ الہی کی داد گاہ قائم ہوگی

۳۱۱

قیامت میں ہم عدل کے ترازو قائم کریں گے ۵۰۸ تا ۵۰۵

۵۰۸ تا ۵۰۵

ہم نے دونوں کو علم اور قوت فیصلہ (عدل)

۵۳۷

عطا فرمائے، ہم ایسا کرنے پر قادر ہیں۔

۵۳۷

سب لوگوں کو یکا نگشت (توحید، حق اور عدالت

۵۵۸

کی گواہی دیتے تھے۔

۵۵۸

عملِ صالح انجام دینے والے کی نافرمانی نہیں

۵۶۰

کی جائے گی۔

۵۶۰

نبوت

لوگوں کے ایمان نہ لانے کے غم میں کیا اپنی

۳۹، ۳۸

جان دے بیٹھو گے؟

۳۹، ۳۸

ہم چاہیں تو وحی واپس لے لیں، مگر رحمت

۷۴

الہی تیرے اور لوگوں کے شامل حال ہے۔

۷۴

کہہ دو کہ میں تم جیسا ہی بشر ہوں، مگر مجھ

۲۲۲

پر وحی آتی ہے۔

۲۲۲

مجھے (عیسیٰ کو)، اللہ نے نبی بنا کر بھیجا ہے

۲۵۵

ابراہیم اللہ کا بہت صادق نبی تھا

۲۷۲، ۲۷۱

موسیٰ مخلص، بلند پایا رسول و نبی تھا

۲۸۱، ۲۸۰

اسماعیل صادق الوعد نبی تھا

۲۸۴، ۲۸۳

میں نے تمہیں (موسیٰ کو) رسالت کے لیے

۳۳۷

چُن لیا۔ وحی کو سُنو!

۳۳۷

تم سے پہلے بھی آدمی ہی نبی بنا کر بھیجے، ان

۳۳۷

پر وحی کی، وہ بھی کھاتے پیتے تھے اور ہمیشہ

۳۳۷

زندہ نہیں رہے۔

۳۳۷

ہم نے وعدہ کے مطابق انبیاء اور جنہیں چاہا

۳۳۷

محفوظ رکھا۔

۳۳۷

امامت

ہم نے انہیں ایسا امام و پیشوا قرار دیا جو

۵۱۸

ہمارے حکم سے لوگوں کو ہدایت کرتے تھے

۵۱۸

قیامت

کیا مرنے کے بعد آئندہ (قبر سے) زندہ ہو کر نکلے گا؟ ہم انہیں اور شیاطین کو ضرور زندہ کریں گے۔

۲۹۶

روز قیامت آگ مومن سے کسے گی مجھ سے جلدی گزرجا۔

۳۰۱

اس دن انہیں معلوم ہو جائے گا کس کی جگہ اور محفل بُری اور لشکر کمزور ہے۔

۳۰۵

قیامت کے دن پردے ہٹا دیے جائیں گے، حقائق آشکار ہو جائیں گے۔

۳۰۹

جس دن ہم پر ہیزگاروں کو ان کی ہزرا کی طرف رہنمائی کریں گے۔

۳۱۰

اعمال کو بہت باریکی سے شمار کریں گے جب عدل الہی کی داغ بیل قائم ہوگی، ان سب کو ثبت اور محفوظ کر لیں گے۔

۳۱۱

ہم نے ان تمام اعمال کو ذخیرہ کر لیا ہے، اس دن پر ہیزگاروں کو جزا دیں گے۔

۳۱۳

وہ سب کے سب روز قیامت اس کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے۔

۳۱۸

قیامت یقیناً آئے گی تاکہ ہر شخص اپنی سعی سے جزا پائے۔

۳۳۷

کہہ دو قیامت کا علم اللہ کے پاس ہے اسی خاک سے تمہیں دوبارہ زندہ کر کے نکال کھڑا کریں گے۔

۳۴۲، ۳۶۸، ۳۸۲

۶۲

اللہ کا وعدہ قیامت حق ہے ایسی طویل عید کے بعد بیداری موت کے بعد

۹۱

زندگی سے مشابہ ہے۔ مجھے یقین نہیں کہ قیامت آئے گی

۱۰۴ تا ۱۰۶

اس نے قیامت کا انکار کیا اس دن کا سوچو جب ہم پہاڑوں کو چٹانیں

۱۰۷، ۱۰۹

کے، سب کو محشور کریں گے، تم سب کو واپس آنا پڑے گا، نائنہ عمل بھی وہاں رکھ دیں گے۔

۱۲۱

معاذ پر ایمان کا تربیتی نتیجہ ان کے لیے ایک وعدہ گاہ ہے

۱۲۸، ۱۳۷

دنیا ختم ہوگی، یا ہرج مہرج کو چھوڑیں گے، صور پھونکا جائے گا۔

۱۴۲

قیامت میں کافروں کے لیے میزان نہ ہوگا جو اپنے رب کی نفاق کا اُمیدوار ہے وہ عمل

۲۰۵، ۲۰۷

صالح انجام دے، کسی کو پروردگار کی عبادت میں شریک نہ کرے۔

۲۰۸

یہی پر سلامتی ہو جس دن وہ اٹھایا جائے گا یوم بعثت

۲۲۳، ۲۲۴

قیامت حسرت کا دن ہے حضرت عیسیٰ کے ارشادات (اُس دن) سننے والے کان اور دیکھنے والی آنکھیں کیسی ہو جائیں گی۔

۲۶۹، ۲۷۸

۲۷۱، ۲۷۰

قرآن کا مخالف قیامت میں جواب دہی کا سنگین بوجھ اٹھائے گا، جس دن صور پھونکا جائے گا ہم مجرموں کو نیلے جسم کے ساتھ جمع کریں گے۔

۲۱۸ تا ۲۲۳

میرا بت پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کر دے گا، زمین مہوار کر دی جائے گی، ایک بندہ حساب کی دعوت دے گا، آوازیں خفیف ہو جائیں گی، اللہ کی اجازت کے بغیر کوئی شفاعت نہ کرے گا۔

۲۲۹

ہماری آیات کو فراموش کر دیا، آج تو بھی فراموش کر دیا جائے گا۔

۲۴۲

عذاب الہی سے نہ صرف قیامت میں کوئی بچا سکے گا، بلکہ دنیا میں بھی

۵۰۲

اگر عذاب انہیں چھو لے تو وہ چیخ اٹھیں، قیامت کے دن عدل کریں گے، ذرہ بھر

نیکی بدی کو حاضر کر دیں گے، زیادتی نہ ہوگی حساب کرنے والے ہم ہوں گے۔

۵۰۸ تا ۵۰۵

قیامت کی خصوصیات میں سے ایک اختلاف ختم ہونا اور وحدت اختیار کرنا ہے۔

۵۶۰

آسمانوں کو لپیٹ دیا جائے گا، جس طرح پیدا کیا تھا لوٹائیں گے، یقیناً ایسا ہی کریں گے۔

۵۶۹

میں نہیں جانتا کہ جس عذاب کا اللہ نے وعدہ کیا ہے وہ قریب ہے یا دور۔

۵۸۰

قیامت کا زلزلہ بڑی چیز ہے، مانیں بچوں کو بھول جائیں گی، حمل ساقط ہو جائیں گے، لوگ مدہوش نظر آئیں گے مگر مدہوش نہ ہوں گے۔

۵۸۹ تا ۵۸۶

نباتات و انسان کی پیدائش میں قیامت کے دلائل خلقت انسان کے مختلف مراحل بعض کا عمر ذلیل کو پہنچنا، قیامت آئے ہیں کوئی شک نہیں۔

۵۹۸ تا ۵۹۳

قیامت میں ہم ان کو ہضم کر دینے والے عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔

۶۰۱ تا ۶۰۳

قیامت تمام اختلافات کے خاتمہ کا دن، اللہ مومنین، یہود، نصاریٰ، صائبین، مجوس

مشرکوں کے درمیان فیصلہ چکا دے گا، حق کو باطل سے جدا کر دے گا۔

۶۱۰

قیامت آنے تک کفار قرآن میں شک کرتے رہیں گے یا یوم عقیم کا عذاب نازل

ہو، اللہ کی حکمرانی، مومنوں کو نعمت بہشت اور کفار کو عذاب ہوگا۔

۶۹۰ تا ۶۹۲

جنت

۳۲

وہی بہشت بریں جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے ایمان والوں کے لیے فردوس کے باغ، وہ

۲۰۹

ہمیشہ ان میں رہیں گے۔

جو ایمان لائے عمل صالح کیے، وہ جنت میں داخل ہوں گے۔

۲۸۶

وہی باغات جن کا اللہ نے اپنے بندوں سے وعدہ فرمایا ہے۔

۲۹۲، ۲۹۱

یہ وہی جنت ہے جو ہم اپنے پرہیزگاروں کو بطور میراث عطا کریں گے، یہ ہمیشہ اپنی پسند نعمات میں رہیں گے، کوئی غم نہ ہوگا۔

۲۹۳

مومنوں اور عمل صالح انجام دینے والوں کو اللہ جنت میں داخل فرمائے گا۔

۲۲۱

جہنم

گویا جہنم ان کا چھپا کر رہا ہے

۱۶۴

اس دن جہنم کو ہم کافروں کے سامنے پیش کریں گے۔

۲۰۶، ۲۰۴

کفر اختیار کرنے اور رسول کا مذاق اڑانے کے باعث ان کی سزا جہنم ہے۔

۲۰۹، ۲۰۸

ہم ان سب کو جہنم کے گرو گھسنوں کے بل حاضر کر دیں گے۔

۲۹۶

تم سب کے سب جہنم میں جاؤ گے، یہ اللہ کا قطعی فیصلہ ہے۔

۳۱۰

وہ صرف خدا سے ڈرتے ہیں اور اسی کے خوف کو اپنے دل میں راہ دیتے ہیں۔

۳۸۷

ان پر نیک کام کرنے کی وحی کی اور وہ صرف میری ہی عبادت کیا کرتے تھے۔

۵۲۸

احرام کی پابندی مادی نعمتیں و ظاہری امتیازات

۶۲۳

سے بے نیاز کر دیتی ہے (حج کا اخلاقی پہلو)

اللہ کی راہ میں قربانی دینا، غریب و مساکین اور محتاجوں کو کھانا، احکامات خدا کے سامنے

۶۵۴

جھجک جانے والوں کے لیے بشارت ہے۔

اخلاقیات

اخلاقِ رفیلیہ

ایلیا ناصرہ کے نبیل باشندے جنہوں نے موسیٰ و خضر کی مہمانی سے انکار کیا۔

۱۵۹

یا جوج ماجوج اخلاقِ رفیلیہ کے مالک میری آیات تیرے پاس پہنچیں تو تو نے

۲۰۳، ۲۰۲

اسے بھلا دیا۔

۴۴۱

اپنی زندگی فقیروں کی طرح بسر کرتا ہے مگر حساب سرمایہ داروں کی طرح ہوگا۔

۴۴۳

مصرفین جنہوں نے آیات خداوندی کا انکار کیا اور سفیروں کو بھٹلایا۔

۴۶۶

گمراہ لوگوں کے پُر عشرت محلوں پر سانلوں کا آنا اور محروم واپس لوٹنا

۴۷۰، ۴۶۹

مومنین کو اللہ کی راہ اور مسجد الحرام سے روکنے والے مستحق عذاب ہیں۔

۶۲۳

صائبین

کسی آسانی دین کے پیرو تھے، ان کا ذکر یہود و نصاریٰ کے درمیان آیا ہے۔

۶۱۳

عیسائی

حضرت عیسیٰ کی اُمت تثلیث کے قائل

۶۱۴

قوم عاد

قوم عاد کا ذکر

۶۷۰

قوم لوط

قوم لوط کا عبرت ناک انجام، قوم نوح کے بعد ہم نے ایک اور قوم کو پیدا کیا۔

۶۷۰

مجوسی

مشرکین کے مقابل میں آسانی دین کے پیرو بھلائی اور نور کے خدا کو "ابو زامزدا" اور

۶۱۴

بڑائی و عظمت کے خدا کو "ابرمین" کہتے ہیں۔

۶۱۴

شخصیات

حضرت آدم علیہ السلام

۵۲۴

ہم نے طائر کو کھمکھ دما کہ آدم کو سچا کہ

۶۷۰

اقوام سابقہ

یا جوج ماجوج

دو خونخوار قبیلہ

۲۰۳، ۲۰۲

بنی اسرائیل

ہم نے تمہیں دشمن سے نجات دی، من و ملوی نازل کیا، کھاؤ پیو سرکشی نہ کرو ورنہ میرے

غضب سے تباہ ہو جاؤ گے، میں توبہ کرنے اور ایمان لانے والوں کو بخش دوں گا۔

۳۹۹، ۳۹۸

ہم نے اپنے اختیار سے نافرمانی نہیں کی، زلزلات سے بچھڑا بنایا جو بولتا تھا، اس

نے کہا یہی تمہارا خدا ہے اور موسیٰ کا بھی، ہارون کے منع کرنے پر کہا کہ ہم تو اسی کی

۴۹۹

پوجا کریں گے جب تک موسیٰ نہ آجائیں۔

۶۱۴

ان کا توحید سے انحراف نسبتاً کم درجہ کا ہے

قوم نوح

کیونکہ وہ بُری قوم تھی، لہذا ہم نے سب کو غرق کر دیا۔

۵۲۴

حضرت نوح کی قوم

۶۷۰

سب پیغمبر اولاد آدم تھے
ہم نے سب سے پہلے آدم سے عہد لیا۔
وہ بھول گیا، عزم میں پختہ نہ پایا۔ اسے
آدم یہ تیرا اور تیری بیوی کا دشمن ہے تمہیں
جنت سے نہ نکھوا دے اور تم مصیبت
میں پھنس جاؤ۔ آرام سے بہشت میں رہو،
زمین کو پیاس لگے گی نہ بہمنہ ہو گے۔
دونوں نے شجر ممنوع کھا لیا، بہمنہ ہو گئے
درختوں کے پتوں سے بدن ڈھانپا،
اخلاص سے محروم ہو گئے، تو بر قبول
ہونی اور ہدایت دی۔

۲۸۶، ۲۸۵

آتیل

لیٹروں کا سردار جس نے پوتھی صدی عیسوی
میں روم کے شاہی تمدن کو برباد کر دیا۔

۲۰۳

آذر

حضرت ابراہیم کا منہ بولا باپ (چچا)
بہت پرست، بہت ترش، بہت فروش
آذر نے کہا: ابراہیم کیا تو میرے
خداؤں سے روگردان ہے؟

۲۶۲ تا ۲۶۵

۲۶۶

ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو دیکھا ہے، وہ
ان بتوں کی عبادت کرتے تھے۔

۵۱۳، ۵۱۱

آصف بن برخیا

حضرت سلیمان کا وزیر

۱۶۰

آولی

ایشیائے کوچک کے شہر افوس کا بادشاہ

۸۶

حضرت ابراہیم علیہ السلام

اس کتاب میں ابراہیم کو یاد کرو۔ وہ بہت ہی
سچا نبی تھا۔

۲۶۲

اے بابا تم ایسی چیز کی عبادت کیوں کرتے
ہو جو سستی ہے نہ دیکھتی ہے، نہ تمہاری
مشکل حل کر سکتی ہے۔ مجھ جیسا علم تمہیں

نصیب نہیں ہوا، میری پیروی کرو، شیطان
کی پیروی چھوڑو، وہ دشمن کا دشمن ہے،

مجھے ڈر ہے کہ تم پر اللہ کا غضب طاری ہو۔

۲۶۱ تا ۲۶۵

تجہ پر سلام ہو، میں عنقریب اپنے پروردگار
سے تیری مغفرت کی دعا کروں گا۔

۲۶۶

جب اُن سے اور اُن کے خداؤں سے دُوری
اختیار کر لی تو ہم نے اسحاقؑ سا بیٹا اور یعقوبؑ

۲۶۷

سا پوتا عطا فرمایا اور ہر ایک کو نبی بنایا۔
یہ کام اُن کے بڑے نے کیا ہو گا، بولتے

۵۱۳، ۵۱۱

ہوں تو انہی سے پوچھ لو۔

ہم نے ابراہیمؑ کو رشد و ہدایت کا ذریعہ
دے دیا تھا۔ آذر سے کہا، انہیں کیوں
پوجتے ہو، تم اور تمہارے اجداد واضح
گمراہی میں پڑے رہے۔ میں حق پر ہوں،
بتوں کو نالود کروں گا۔

۵۱۵، ۵۱۱

وہ ابراہیمؑ کو مٹانا چاہتے تھے، آگ گزار
ہو گئی، ہم نے انہیں خسارے میں ڈال دیا
ہم نے ابراہیمؑ اور لوطؑ کو سرزمین شام کی
طرف نجات دی۔

۵۲۸

ہم نے ابراہیمؑ کو خانہ کعبہ کی جگہ دکھائی کہ
وہ اس پر عمارت بنائیں، پھر کہا لوگوں کو
جگہ کی دعوت دو۔

۶۲۷

یہ وہی تمہارے باپ ابراہیمؑ کا دین ہے

۷۱۵، ۷۱۶

ابوالقاسم بشیر بن محمد

ابوالقاسم کی روایت کو ابوالفتوح رازی نے
چنی تفسیر میں لکھا ہے۔

۶۳۰

ابو البصیر

دوئی حدیث امام جعفر صادق علیہ السلام

۶۵۰

ابی بن خلف

اس کے بارے میں سورہ مريم کی آیت ۶۶
بقول الانسان..... حیثاً نازل ہوئی۔

۲۹۷، ۲۹۶

حضرت ادریس علیہ السلام

قرآن میں ادریسؑ کا ذکر کرو، بیشک وہ سچا
نبی تھا۔ ہم نے اسے بلند مرتبہ پر فائز کیا
ادریسؑ کون تھے۔ تورات میں ان کا نام
اخنوخ ہے۔

۲۸۶، ۲۸۵

۲۸۹

وہ صابر تھے، انہیں داخل رحمت کیا،
صالحین میں سے تھے۔

۳۵۰، ۳۵۱

حضرت اسحق علیہ السلام

ہم نے ابراہیمؑ کو اسحقؑ سا بیٹا عطا فرمایا
ہم نے ابراہیمؑ کو اسحقؑ اور پھر یعقوبؑ
بھی بخشا۔ ان سب کو مردان صالح قرار دیا۔

۲۸۰، ۲۷۶

۵۲۸، ۵۲۹

حضرت اسماعیل علیہ السلام

حضرت ابراہیمؑ کی نعمت میں حضرت اسماعیلؑ
کی ولادت وجود کو ذکر کیا ہے۔

۲۸۰

آسمانی کتاب میں اسماعیلؑ کو یاد کرو، وہ وعدہ
کا سچا نبی تھا۔

۲۸۳

اسماعیلؑ اپنے رب کی رضا کا حامل تھا
اسماعیلؑ صالحین میں سے تھے

۲۸۳

۵۲۸

مناسک حج حضرت اسماعیلؑ کے نظریات، کردار
اور راہ خدا میں قربانی کو حجاج کے اذہان پر نقش
کرتے رہتے ہیں۔

الانسان (ایک مخلوق، ایک موجود)

انسان کتاب ہے کہ مرنے کے بعد زندہ ہو کر
قبر سے نکلے گا۔

۲۹۶

کیا اُسے یاد نہیں کہ جب اسے پیدا کیا تو وہ
کوئی چیز تھا ہی نہیں۔

۲۹۷، ۲۹۸

حضرت الیاس علیہ السلام

بعض نے ان کو خضرؑ جانا ہے

۱۷۰

حضرت اُم سلمہؓ

آپ نے ہجرت حبشہ کی تفصیل بیان فرمائی

۲۶۶، ۲۶۵

حضرت ایوب علیہ السلام

ایوبؑ کو یاد کرو، اس نے اپنے رب کو
پکارا، مشکلات نے گھیر لیا ہے، تو رحم
کرنے والا ہے، ہم نے مصائب و دور کر
دیے، اس کے گھر والے اُسے پلٹا دیے،
مزید بھی عطا فرمائے۔

۵۳۸ تا ۵۴۲

حضرت بلالؓ

مکہ کے ایک صاحب ایمان مستضعف

۳۰۴

۵

پرہیزگار

اپنے رب سے غائبانہ ڈرنے والے متقی و
پرہیزگار ہیں۔

۵۱۰، ۵۰۸

جن سے ہم نے اچھا وعدہ کیا ہوا ہے
جہنم سے دور رکھے جائیں گے۔

۵۶۳

وہ من پسند نعمتوں میں نہیں گئے

۵۶۳

تملیخ

اصحاب کہف میں ایک بڑا رکن، اللہ بہتر
جانتا ہے ہم کتنا سونے۔

۸۱، ۹۰

حضرت جابر بن عبد اللہ انصاریؓ

رسولؐ پاک کی حدیث بیان کی کہ سب جہنم
میں داخل ہوں گے۔

۳۰۱

جادوگر

اے موسیٰ! جادو کے آلات پہلے تو پھینکے گا
یا ہم پھینکیں؟

۳۸۱، ۳۸۰

جو کچھ انہوں نے بنایا تھا عصائے موسیٰؑ
سب کو نکل گیا، سب سجدہ میں گر گئے
اور کہا ہم ہاروں موسیٰؑ کے رب پر
ایمان لائے۔

۳۸۶، ۳۸۵

(اے فرعون) ہم واضح دلائل پر تجھے ترجیح نہ
دیں گے۔ ہم خدا پر ایمان لے آئے کہ وہ
ہمارے گناہوں کو بخش دے، مجرموں کے
لیے آگ اور مومنین کے لیے جنت ہے۔

۳۸۷ - ۳۸۸

حضرت جبریلؑ

مقرب خدا، ایک عظیم فرشتہ ہے

۳۲۱

حضرت جعفر بن ابی طالبؓ

نجاشی کے دربار میں بڑی خوبی سے دین اسلام
اور پیغمبر اسلامؐ کا تعارف کرایا۔ سورہ مریمؑ
تلاوت فرمائی۔

۲۶۶

حضرت امام جعفر صادقؑ

انشاء اللہ نہیں کہا تو کام کے انجام پانے کی
امید کیسے ہوئی؟
اصحاب کہف کے بارے میں علی بن ابراہیم
کے ذریعہ حدیث۔

۷۳

۷۸

نامہ اعمال پڑھ کر سب کچھ یاد آجائے گا
حضرت موسیٰؑ علم تشریفی میں حضرت خضرؑ
سے زیادہ عالم تھے۔

۱۲۸

۱۷۴

زیر دیوار مٹیوں کا خزانہ سونا چاندی نہ تھا،
ایک تختی تھی۔

۱۷۵

ابن زرارہ سے مروی کشتی حضرت موسیٰؑ
پر آپ کی حدیث۔
بلند آواز صدقہ کی مانند ہے، بشرطیکہ
غصہ میں نہ ہو۔

۱۷۸، ۱۷۷

۱۹۴

فرمایا کہ بحالت روزہ اپنی زبان کو ہر گناہ
سے پاک رکھو، حسد و فساد نہ کرو۔

۲۵۴

۲۵۹

مبارک کے معنی نفاع یعنی زیادہ نفع مند ہونا
اللہ قیامت کے دن اہل جنت و اہل جہنم
کو ہمیشہ کے لیے اپنے مقامات پر رہنے کا
حکم فرمائے گا۔

۲۷۰

جو مہبود انسانوں نے بنائے تھے قیامت
میں ان کے مخالف ہوں گے، ان کی عبادت
سے بیزار کی کا اظہار کریں گے۔

۳۱۰

اولاد کی عمر کا شمار تو والدین بھی کرتے ہیں۔
اللہ کے شمار کرنے سے مراد سانسوں (نفس)
کی گنتی ہے۔

۳۱۲

رسولؐ پاک نے جناب امیرؑ سے فرمایا کہ دوزخ
ایسے افراد کو کہتے ہیں جو متقی ہوں، سوار یوں
پر سوار ہوں۔

۳۱۲

جو شخص امیر المومنینؑ اور ائمہؑ کی ولایت
کا عقیدہ رکھتا ہے، یہ خدا کے نزدیک
عبد ہے۔

۳۱۴

رسول پاکؐ نماز کے آخر میں بلند آواز سے دُعا فرماتے، خداوند اعلیٰ کی محبت مومنوں کے دلوں میں ڈال دے اور منافقوں کے دلوں میں عظمت و ہیبت بٹھا دے۔ ۳۶۷

ظہر پیغمبر اکرمؐ کا ایک نام ہے، ظاہر طالب حق، ہا، ہادی الیہ۔ ۳۳۰

اے موسیٰؑ جن چیزوں کی اُمید نہیں ان کی اُمید ان سے زیادہ رکھو جن کے لیے اُمید ہو۔ ۳۳۹

واروات عشق خدا پر آپؐ کی ایک حدیث ۴۰۷

ہر شب مجھ ارواح رسول پاکؐ و ائمہ طاہرین اور ہم عرش خدا کی طرف جاتے ہیں۔ ہماری ارواح بدلوں کی طرف نہیں لوٹیں، مگر سننے علم کے ساتھ۔ ۴۳۳

آیت من اعرض..... ضنک سے مراد ولایت امیر المؤمنین سے اعراض کرنا ہے۔ ۴۳۴

طلوع وغروب آفتاب سے قبل ہر مسلمان کو لا الہ الا اللہ..... شیء قدیر پڑھنا چاہیے سورۃ انبیاء کا پڑھنے والا جنت کے باغوں میں تمام انبیاء کا رفیق و ہم نشین ہوگا۔ ۴۵۶

اللہ کی وحدانیت پر آپؐ کا مباحثہ، برہان تمنح اور برہان فرجہ۔ ۴۸۲، ۴۸۱

پانی کا ذائقہ وہی ہے جو حیات (زندگی) کا ذائقہ ہے۔ ۴۹۰

زمین کا نقصان ہونا علماء کے فقدان کے معنی میں ہے۔ ۵۰۴

ابراہیمؑ اس قول کے ذریعہ ان کے انکار کی اصلاح چاہتے تھے۔ بخدا یہ کام بہتوں نے کیا نہ ابراہیمؑ نے جھوٹ بولا۔ ۵۱۹

مومن فولاد سے زیادہ مستحکم ہے، فولاد آگ میں گچھل جاتا ہے مگر..... ۵۲۷

امام دو قسم کے ہوتے ہیں، یہود و ناسوت یا مدعوں الی الناس۔ ۵۳۱

داؤد و سلیمان کا فیصلہ داؤد کے وصی کی تقرری کے لیے بطور آزمائش تھا۔ ۵۳۹

مصیبت ایوبؑ پر آپؐ کے بیان کا خلاصہ ۵۴۶

”یشہدوا منافع لہم“ میں منافع کا لفظ دنیا و آخرت کے جملہ فائدہ اپنے اندر لیے ہوئے ہے ۶۳۱

حج کے ثقافتی پہلو پر اور اقتصادی پہلو پر آپؐ کی احادیث۔ ۶۳۶، ۶۳۵

”ثغر یقضوا نقشہم“ سے اپنے زمانہ کے امام سے ملاقات مراد ہے۔ ۶۴۰

”والیطفوا بالبلیت العتیق“ سے مراد طواف نساء ہے۔ ۶۴۲

حاجی قربانی کے جانور پر سوار ہو سکتے ہیں دو دوہ پی سکتے ہیں، مگر اس پر تشدد کریں قربانی کے جانور کو قبل روٹا کر یا قبل روکھ کر کے ذبح یا نحر کرو اور دوعائے قربانی کی تلاوت کرو۔ ۶۵۸

حضرت خضر علیہ السلام

ذوالقرنین یا کوروش

حضرت موسیٰؑ کی حیرت انگیز داستان ۱۴۶

حضرت خضرؑ کا تعارف، نام، بلیا، ابن ملک ان لقب خضرؑ۔ ۱۵۰

بندوں میں سے ایک بندہ (مراد خضرؑ) تم صبر نہیں کر سکو گے، جس سے آگاہ نہ ہو اس پر صبر کیسے کر سکتے ہو! کشتی میں سوراخ، لوہے کو قتل، دیوار کو سیدھا کر دیا۔ ۱۶۱ تا ۱۶۴

کشتی بستیوں کی تھی، مومن کا بچہ سرکش تھا، دیوار کے نیچے بیٹوں کا خزانہ تھا۔ ۱۶۸ تا ۱۶۲

میں نے یہ کام خود سے نہیں کیے۔ اب آپؐ میں اور مجھ میں جدائی ہے۔ ۱۷۰، ۱۶۹

حضرت داؤد علیہ السلام

داؤد و سلیمان کو یاد کرو جب وہ فیصلہ کر رہے تھے۔ ۵۴۲، ۵۳۷

حضرت داؤدؑ کے ساتھ پہاڑ اور پرندے تسبیح کرتے تھے۔ ایک جائزہ اور نکات ۵۴۰

ہم عنقریب تمہیں ذوالقرنین کے بارے میں بتائیں گے۔ ۱۸۱ تا ۱۸۳

ہم نے قدرت و حکومت عطا فرمائی جس سے اس نے استفادہ کیا۔ ۱۸۴

جنہوں نے ظلم کیا ہم انہیں سزا دیں گے سورج کے مقام طلوع پر پہنچ کر دیکھا، وہاں کے لوگ مفلس تھے۔ ۱۸۵، ۱۸۶

پھر دو پہاڑوں تک پہنچا اور درہ میں دیوار بنائی۔ ۱۸۷ تا ۱۹۲

کیا یہ میرے رب کی رحمت ہے، داستان کے ترتیبی نکات۔ ۱۹۶ تا ۱۹۲

ذوالقرنین کون تھا؟ امن کی اہمیت، یہ دیوار کہاں ہے؟ ۲۰۲ تا ۲۰۶

ذوالکفل

صابرین و صالحین میں سے تھے، ہم نے انہیں داخل رحمت فرمایا۔ ۵۳۹، ۵۴۸

ذوالنون

اور ذوالنون (یونسؑ) کو یاد کرو، وہ غصہ میں اپنی قوم سے چلا گیا۔ ۵۵۰

وقیانوس

اصحاب کعبہ کا ہم عصر ظالم بادشاہ ۸۵، ۸۱، ۵۰

اسے پھلی نے نکل لیا تو پکارا: تو پاک ہے
میں ہی خطا وار تھا۔

۵۵۲

ربیع بن خثیم

اس نے "منافع لہم" میں منافع کا مفہوم
امام جعفر صادقؑ سے دریافت کیا۔

۶۳۱

زکریا

آپؑ کی دعا، طرز دعا، تفصیل دعا
- یحییٰ فرزند کی بشارت، قبولیت دعا پر
تعجب، تین راتیں بات نہ کر سکو گے، قوم
کو اشارہ سے کہا کہ تسبیح خدا کرو۔

۲۳۵، ۲۳۲

اللہ کی طرف سے دلیل اولاد - عرض کیا
نشانی کیا ہے؟ فرمایا تین دن بات نہ کر سکو گے
زکریا کو یاد کرو - میرے رب مجھے نہ چھوڑ،
تو بہترین وارث ہے، ہم نے دعا قبول کی
اور بیٹا عطا فرمایا۔

۵۵۴

سامری

میں نے ایک چیز دیکھی جو انہوں نے نہیں دیکھی
تھی میں نے جبریلؑ کے آثار کا کچھ حصہ اٹھا لیا۔
سامری ایک فتنہ گر، چالاک اور خود خواہ
شخصیت۔

۴۱۸

حضرت سلمانؓ

مکہ کے صاحب ایمان متضعف

۳۰۴

حضرت سلیمان علیہ السلام

داؤد و سلیمان کو یاد کرو جب وہ فیصلہ کر

رہے تھے اور ہم گواہ تھے۔

۵۴۰، ۵۳۷

ہم نے سلیمانؑ کے لیے تیز ہوا کو مسخر کر دیا

ہم ہر چیز سے آگاہ تھے۔

۵۴۳، ۵۴۱

سمیہ

مکہ کی صاحب ایمان اور متضعف خاتون

۳۰۴

حضرت شعیب علیہ السلام

ایک پیغمبر حضرت موسیٰؑ کے خسر

۳۳۶

شیطان

آدمؑ کو سجدہ نہ کیا، کہا اُسے تو نے مٹی سے بنایا

۱۲۹

اولاد آدمؑ کو گمراہ کر دیا۔ وہ جنات سے تھا

۱۲۹

شیاطین کو سرپرست نہ بناؤ

۱۳۰

کیا شیطان فرشتہ تھا؟

۱۳۳

گمراہوں سے مدد قبول نہ کرنا امام حسینؑ

کا ایک واقعہ۔

۱۳۶، ۱۳۵

شیطان نے مشرکین کے اعمال کو ان کی نظر
میں زینت دی۔

۲۱۴

ہم نے شیاطین کو کافروں کی طرف بھیجا کہ انہیں

۳۱۰

شدت سے گمراہ کریں۔

شیطان نے سجدہ نہ کیا، آخر آدمؑ کو دوسرے

۵۲۹ تا ۵۳۵

ملک کی طرف رہنمائی کر دی؟

ہم نے شیاطین کے ایک گروہ کو بھی سلیمانؑ

۵۴۱

کے لیے مسخر کر دیا تھا، ہم انہیں سرکشی سے

باز رکھتے تھے۔

عاص بن وائل

عاص بن وائل (کافر)، کا ایک مسلمان مزدور

۲۹۴

کے ساتھ تمسخر۔

عبداللہ ابن ربیع

قریش کا ایک نمائندہ جو مسلمانوں کو حبشہ سے

۲۶۵

نکلوانے کے لیے نجاشی کے پاس گیا۔

حضرت عبداللہ ابن عباسؓ

بیان میں آخری چیز کے ساتھ 'یا' اور 'لکھا جاتا ہے'

۴۱

بدوؤں کا رسول اکرمؐ کے پاس آنا، تقسیم غنیمت

۶۰۶

پر غور ہونا، آزمائش کے وقت دین کو بڑھلا کر

پیش کرنا۔

تفسیر نمونہ جلد ۱

"تفہیم" سے مراد تمام مناسک کو
بجالاتا ہے۔

۶۴۰

"فعل الخیرات" سے مراد صلہ رحمی

۶۴۰

اور مکارم اخلاق ہے۔

۶۱۸

حضرت علی ابن ابیطالبؓ

انسان جس چیز کو نہیں جانتے اس کے دشمن

۱۷۹

ہوتے ہیں۔

مالک اشتر کو لکھا کہ تیری نظر میں نیک و بد

۱۹۳

ایک نہیں ہونا چاہیے۔

صور چھوٹنے سے مراد قیامت ہے

۲۰۶

یہودی و عیسائی حق پر تھے، پھر گمراہ ہو گئے

خوارج بھی ایسے ہی ہیں۔

۲۱۲

آخرین سے مراد ولایت جناب امیرؑ کے منکر

۲۱۳

حضور پاکؐ کی حدیث۔ زچہ کو پہلی غذا کھجور دو

۲۵۴

اچھی یا، نیک نامی جو اللہ کسی شخص کے لیے

لوگوں کے دل میں پیدا کرے، دولت و ثروت

۲۸۰

سے بہتر ہے۔

اگر میں اپنی تلوار دشمن کی ناک پر ماروں تب

۳۲۲

بھی مجھے دشمن نہ جلنے گا۔ دنیا کی سب نعمات

منافع کو دے دوں تو مجھے دوست نہ رکھے گا

۳۲۲

سینہ کی کشادگی رہبری و قیادت کا

وسیلہ ہے۔

۳۲۸

حضرت موسیٰ نے ہرگز اپنے لیے خوف نہیں کیا بلکہ یہ ڈرتھا کہ اس ہنگام سے لوگ چلے نہ جائیں اور جابل غالب نہ آجائیں۔

۳۸۲

امام حسنؑ کے نام تجربہ و تاریخ کی اہمیت پر ایک خط۔

۴۲۰

وہ اپنی زندگی فقیروں کی طرح بسر کرتا ہے، لیکن اس کا حساب سرمایہ داروں کی طرح ہوگا۔

۴۴۳

"شتر" اور "خیر" پر آپؐ کی حدیث ۴۹۷، ۴۹۶ تیسرے ربیع کا کوئی شریک ہوتا تو اس کے رسول بھی تیری طرف آتے۔

۵۵۹

نیک اعمال میں جلدی کرو تا کہ اللہ کے گھر میں اس کے پڑوسی بنو۔

۵۶۸

مناسب حج دین مقدس اسلام کی تقویت کا سبب ہیں۔

۶۳۵

حضرت علیؑ ابن الحسینؑ (امام چہارم)

بابا کا سر اسی طرح بدکار کو تحفہ میں بھیجا جیسے حضرت یحییٰؑ کا سر بنی اسرائیل کے بدکار کو بھیجا گیا تھا۔

۲۳۸

صوم سکوت (روزہ خاموشی) حرام ہے۔ یہ بات زمانہ کے اختلاف شرائط کے سبب اسلام سے پہلے کی ہے۔

۲۵۲

آیت "وَمَنْ هَدَيْنَا وَاجْتَبَيْنَا..... سجدو و

بکیا" کی تلاوت کے وقت فرمایا کہ اس آیت سے مراد ہم اہلبیت ہیں۔

۲۸۸

حضرت علیؑ ابن موسیٰ (امام ہشتم)

سب فرشتے معصوم ہیں، بہ لطف پروردگار گھر سے محفوظ ہیں۔

موسیٰ و خضرؑ میں ہر ایک اپنے علم میں دوسرے سے بڑھا ہوا تھا۔

ولادت، موت، ایست تین سخت مرحلوں میں اللہ نے حضرت یحییٰؑ کو سلامتی کی بشارت دی۔

۲۴۲

۶۳۶

حج کے اقتصادی پہلو پر آپؐ کی حدیث اللہ کی مخلوق اور بندوں میں ہم اللہ کے نمائندہ گواہ اور نشانیاں ہیں۔

۷۲۱

علیؑ ابن اسباط (راوی)

امام جوادؑ نے فرمایا کہ مسئلہ امامت بھی مسئلہ نبوت کی طرح ہے۔ اللہ نے فرمایا ہم نے یحییٰؑ کو بچپن میں فرمان نبوت اور عقل و دانش عطا فرمائی۔

۲۴۳

حضرت عمارؑ ابن یاسرؑ

مکہ کے ایک صاحب ایمان مستضعف

۳۰۴

عمر و ابن عاص

قریش کا نمائندہ جو مسلمانوں کو حبشہ سے نکلوانے کے لیے نجاشی کے پاس بھیجا گیا۔

۲۶۵

حضرت عیسیٰ علیہ السلام

عیسیٰؑ اللہ کا مکمل تھا جو مریمؑ کی طرف القاد ہوا میں اللہ کا بندہ ہوں مجھے کتاب دی گئی ہے، نبی اور برکتوں والا بنایا، نماز پڑھنے

۲۲۰

زکوٰۃ دینے کی وصیت کی، ماں کے لیے نیک بنایا، جبار و شقی نہیں بنایا، جبار و شقی نہیں بنایا، مجھ پر اللہ کا سلام ہے جس دن میں پیدا ہوا، جب مروں گا اور

۲۲۰

جب مبعوث ہوں گا۔

۲۵۸ تا ۲۵۵

یہ عیسیٰؑ ابن مریمؑ ہے، وہ حق بات جس میں وہ شک کرتے تھے۔

۲۶۳ تا ۲۶۲

اب بھی اسے خدا کا بیٹا خیال کرتے ہیں

۳۱۸

فرشتے

ہم نے ملائکہ سے کہا آدمؑ کو سجدو کرو، سب نے سجدہ کیا۔

۱۳۰، ۱۲۹

۴۳۵، ۴۳۴

وہ اللہ کے محترم و مکرم بندے ہیں۔

۱۳۳

مقربان (فرشتے) بارگاہ الہی میں اس کی عبادت پر کبتر نہیں کرتے، نہ تھکتے ہیں۔

۴۸۸، ۴۷۷

فرشتے اللہ کی اولاد نہیں، اُس کے مکرم بندے ہیں، بات کرنے میں اللہ پر سبقت نہیں کرتے

۴۸۵ تا ۴۸۷

۴۸۷ تا ۴۸۵

اللہ ان کے موجودہ اور آئندہ اعمال کو جانتا ہے۔

۵۶۴

فرشتے مؤمنین کا استقبال کرتے ہوئے کہیں گے کہ یہی وہ دن ہے جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔

فرعون

فرعون نے کہا: اے موسیٰؑ مجھے گمان ہے کہ تو پاگل ہے۔ فرعون نے ان سب کی بیعت کئی کا ارادہ کر لیا۔ ہم نے اسے ساتھیوں سمیت غرق کر دیا۔

۲۰۲

۳۶۷، ۳۶۸

اے موسیٰؑ تمہارا رب کون ہے اپنے جادو کے ذریعہ ہمیں یہاں سے نکالنے آیا ہے، ہم بھی جادو لانیں گے

۳۶۷، ۳۶۸

وقت مقرر کرے۔ یہ دونوں جادوگر ہیں تم وسائل مہیا کرو، کامیابی اس کی ہے جو برتری ثابت کرے۔

۳۷۵، ۳۷۴

میری اجازت کے بغیر اس پر ایمان لے آئے، یہی تمہارا استا ہے میں تمہارے مخالف ہاتھ پاؤں کاٹ کر کھجور پر

۳۷۵، ۳۷۴

سولی دول گا۔

۳۸۶، ۳۸۵

فرعون نے لشکر سمیت موسیٰ والوں کا تعاقب کیا اور دریا میں ڈوب مرا۔

۳۹۵، ۳۹۴

قسطنطین

شہنشاہ روم جس نے حضرت عیسیٰ کی حیثیت پر بحث کے لیے دو ہزار سے زائد مسیحی علماء کا اجتماع بلایا۔

۲۶۹

کافر

کفر کے گڑھے کے کنارے پر کھڑے لوگ، کمزور (زبان کا می، ایمان، منفعت پر خوش، آزمائش میں ٹوگراں۔

۶۰۸، ۶۰۴

حضرت لوط علیہ السلام

ہم نے ابراہیم اور لوط کو بابرکت سرزمین شام کی طرف نجات دی۔

۵۲۸

لوط کو یاد کرو جسے ہم نے حکمت اور علم دیئے گندے اور فاسق لوگوں سے نجات بخشی۔ ہم نے اسے داخل رحمت کیا۔ وہ صالحین سے تھا۔

۵۳۲، ۵۳۳

مالک اشتر

جناب امیر کے ایک خط کا اقتباس

۱۹۳

حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کیا لوگوں کے ایمان نہ لانے کے غم میں اپنی جان دے دو گے۔

۳۹۰، ۳۸

اجابت دہا کے لیے اپنی غذا کو پاک رکھو صبح و شام اللہ کو بکارتنے والوں کے ساتھ رہو، مکبروں کا دباؤ قبول نہ کرو۔

۹۵، ۹۴، ۹۲

تمہارے ساتھ جینا، تمہارے ساتھ مرننا اچھا ہے۔

۹۴

تیری ذمہ داری صرف بشارت و انذار ہے اللہ نے فرمایا: موسیٰ تم سے زیادہ عالم

۱۳۹

مجمع البحرین میں ہے۔ خضر موسیٰ کا علم اللہ کے علم کے مقابلہ میں

۱۷۴

قطرہ و سمندر کی مثال ہے۔ قیامت میں کچھ موٹے تازے لوگوں کا وزن

۲۰۵

مچھر کے پر کے برابر ہوگا۔ جب اللہ سے جنت مانگو تو فروس کا تقاضا کرو

۲۱۵

نیت کے بغیر کوئی عمل نہیں خلوص کامل سے انجام شدہ عمل ہی

۲۲۴

مقبول الہی ہے۔ فرمایا کہ زچہ کو پہلی غذا تازہ کھجور دینا چاہیے

۲۲۵

لفظ 'ہارون کی بہن' پر عیسائیوں کا اعتراض اور آپ کا جواب

۲۵۷، ۲۵۶

تین مرتبہ فرمایا اپنی ماں سے نیکی کرو، پوچھی مرتبہ فرمایا باپ سے۔

۲۶۰

ہم نے قرآن کو تیری زبان پر آسان کر دیا ہے تاکہ بشارت و نذرات انجام دے۔

۳۲۱

یا علی! کہو کہ میرے لیے اپنے یہاں ایک عہد قرار دے..... اللہ آپ کی محبت

۲۶۱، ۲۶۰

لوگوں کے دلوں میں ڈال دے گا یا جس عبادت کوئی مومن ایسا نہ ہوگا جس کے دل میں علی

۳۲۲

کی محبت نہ ہو۔ (صواعق) یا علی! کوئی مومن تجھ سے دشمنی اور کوئی منافق

۳۲۲

تجھ سے محبت نہ کرے گا۔ "واللہی کون ہیں" کے جواب میں فرمایا اخلاق

۳۲۳

حسنا اور عقل سلیم کے مالک۔ جس دن کسی علم کا مجھ میں اضافہ نہ ہو اور

۳۲۴، ۳۲۳

میں اللہ کے قریب نہ ہوں وہ دن مجھے مبارک نہ ہو۔

۳۲۴

سب سے زیادہ صاحب علم وہ ہے جو لوگوں کے علم سے اپنے علم میں اضافہ نہ کرے۔

۳۲۴

سب سے زیادہ فاضل وہ ہے جو تغیرات عالم سے نصیحت حاصل نہیں کرتا۔

۳۲۸

میری بعثت اور قیامت (اشارہ کر کے) ان دو انگلیوں کی طرح ملی ہوئی ہیں۔

۳۶۰، ۳۵۹

اے رسول! تجھ سے پہلے بھی کسی انسان کو دائمی زندگی نہیں دی، اگر تو وفات پا جائے تو کیا وہ ہمیشہ جیتے رہیں گے۔

۳۹۵، ۳۹۴

جہاد کے مقابلہ میں مال کی خدمت کو مقدم فرمایا اُم سلمہ سے فرمایا عورتیں بھی بہت سے اعزاز

۲۶۰

رکھتی ہیں۔ زمانہ عمل، وضع حمل اور رضاعت کی بے شمار فضیلتیں۔

۲۶۱، ۲۶۰

جو شخص بات کرنے والے کی بات تو تجھ سے سنے اس نے گویا پرستش کی۔

۲۷۴

جنیتوں کو تحفے اور ہدیے ان اوقات میں عطا ہونگے جن میں وہ نماز پڑھا کرتے تھے۔

۲۹۳

ہر شخص کا ایک مکان جنت میں اور ایک جہنم میں ہوتا ہے۔ کافر جہنم میں مومنوں

۲۹۴

کے مکان کے مالک اور مومن جنت میں کافروں کے مکان کے وارث بن جائینگے

۲۹۴

سب انسان جہنم میں داخل ہوں گے، مگر مومن جہنم کی اذیت سے محفوظ رہیں گے۔

۲۹۴

روز قیامت آگ مومن سے کئے گی، مجھ سے جلدی گزر جا۔

۳۰۱

سب کے سب جہنم میں جائیں گے، اپنے اعمال کے مطابق باہر نکلیں گے، بعض کو ندی

۳۰۲

بجلی کی طرح وغیرہ..... مسلمان کو موت سے پہلے طویل وصیت کی

۳۱۵، ۳۱۴

تلقین فرمائی۔ مومنین و امیر المومنین کی محبت اور مومنوں اور

۳۲۱

اللہ کے دشمنوں سے دشمنی کرنے پر طویل بحث

تمہارا مذاق اڑاتے ہیں کہ یہ ہے جو خداؤں کے بارے میں بات کرتا ہے۔

۳۹۷

ساتی پیغیروں کا بھی مذاق اڑایا تھا، لیکن وہ تمہارا آخر کار انہیں ہی دامن گیر ہوا، لہذا تم رنجیدہ نہ ہو۔

۵۰۱

کہہ دو رات یا دن میں عذابِ خدا سے تمہیں کون بچا سکتا ہے؟

۵۰۲

وہا قبول ہونے کے لیے اللہ کو کس طرح پکارا جائے؟ (حضرت یونسؑ کی دُعا ہے)

۵۵۲

اگر دنیا کی عمر میں ایک دن بھی باقی رہ جائے تو اللہ اس کو طول دے گا اور میرے خاندان

سے ایک مرد صالح کو مہوٹ فرمائے گا جو زمین کو عدل و انصاف سے بھر دے گا جیسے

۵۷۴

کہ وہ ظلم و جور سے بھری ہوگی۔ ہم نے تمہیں عالمین کے لیے رحمت بنا کر بھیجا

۵۷۹

مسلمانو! تم اہل بہشت کا ایک چوتھائی، ایک تہائی دو تہائی ہو گے۔

۵۸۹

جھوٹی گواہی دینا اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرنے کے مترادف ہے۔

۶۴۳

سینہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا تقویٰ کی حقیقت یہاں ہے۔

۶۴۹

”ارکبھا ویلک“ افسوس تیری حالت پر! اس اونٹ پر سوار ہو جا۔

۶۵۰، ۶۲۹

اگر وہ تمہیں جھٹلاتے ہیں تو نئی بات نہیں۔ پہلے بھی قومِ نوحؑ و عاد و ثمود و اصحابِ مدین

۶۷۰

اور فرعون نے اپنے انبیاء کو جھٹلایا۔ بدترین و شدید اندھا پن دل کا اندھا پن ہے

۶۷۶

جب اللہ کسی بندہ کی بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے تو اس کا دل اور آنکھیں روشن کر دیتا ہے

۶۷۷

فرما دیجیے کہ میں تمہارے لیے ایک واضح ڈرائے والا ہوں۔

۶۸۰

تا کہ (محمدؐ) پیغمبرِ مگر گواہ ہو اور تم لوگوں پر ۷۱۶، ۷۱۵

حضرت امام محمد باقرؑ (امامِ پنجم)

۳۶۱

موسیٰ کی ولادت، مال کا غم، دایہ کی مہربانی ”شہرِ اہتدٰی“ سے ہم اہل بیتؑ کی

۳۹۹

ولایت کی ہدایت مراد ہے۔ روزانہ کی نافذ نمازیں مستحب ہیں، واجب

۴۴۰

نہیں، جو شخص ترک کرے اس نے مصیبت کی۔ نیک کام کو جاری رکھنا چاہیے۔

۴۴۰

وہ کوئی کام انجام نہیں دیتا مگر اس میں حکمت ہوتی ہے اور وہ بالکل صحیح و درست ہوتا ہے۔

۴۸۳

داؤد و سلیمانؑ کے فیصلہ پر آپؑ اور امام جعفر صادقؑ کی ایک روایت! وہ صالح بندے جن کی حکومت

۵۷۲

کا اللہ نے اس آیت میں ذکر فرمایا وہ آخری زمانہ میں مدنی کے انصار و اصحاب ہیں۔

۵۷۲

فرمایا حج کی تکمیل اپنے امام کی ملاقات پر ہوتی ہے یہ آیت اول تا آخر امام آخر الزماں کے انصار

۶۳۱

اور جانشینوں کے بارے میں ہے۔ اور جانشینوں کے بارے میں ہے۔

۶۶۹، ۶۶۸

حضرت مریم علیہا السلام

قرآن میں مریمؑ کا واقعہ یاد کرو، وہ اپنوں سے الگ مشرقی جانب پھری گئی، درمیان میں پردہ، روح

انسانی شکل میں، مریمؑ کا خوف سے پناہ مانگنا، بیٹے کی خوشخبری، تعجب، کہا تیرے رب پر یہ

آسان ہے اور یہ فیصلہ شدہ امر ہے۔

۲۴۴

حضرت مریمؑ کی مشکلات میں تربیت تاکہ فرائض ماری بجالانے پر آمادہ ہوں۔

۲۴۹ تا ۲۵۲

عیسیٰؑ کو لے کر قوم کی طرف آنا، الزام، مریمؑ کا اشارہ، بچنے کیونکر بات کریں۔

۲۵۵

یاد کرو پاک خاتون کو، ہم نے اس کے اندر اپنی روح میں سے پھونکا۔ اُسے اور اس

۵۵۷، ۵۵۵

کے بیٹے کو عظیم نشانی قرار دیا۔

۵۵۷، ۵۵۵

مشرکین و مبت پرست

کیا انہوں نے ایسے خدا بنائے ہیں جو پیدا کریں، زندگی دیں اور انہیں دنیا میں پھیلانیں؟

۲۷۸

وہ خدائے رحمن کے مُنکر ہیں، اگر وہ جان لیتے کہ آگ کے شعلوں کو پھول اور پتھروں سے دُور

۲۹۸، ۳۹۷

ذکر سکیں گے تو قیامت کیلئے جلدی نہ کرتے

۲۹۸، ۳۹۷

جس نے ہمارے خداؤں سے یہ سلوک کیا وہ ظالم و شکر ہے، اسے پیش کرو۔ حاضر کیا

تو یہ گت بنائی۔ اسے جلا دو اور اپنے خداؤں کی مدد کرو

۵۱۸ تا ۵۱۵

۵۲۳، ۵۲۲

حضرت موسیٰ علیہ السلام

میں تلاش جاری رکھوں گا، دریاؤں کے سنگم پر پھیل نکل بجائی۔

۱۳۵

جو علم آپؑ کو عطا ہوا ہے مجھے سکھا دیجیے حضرت موسیٰؑ حضرت خضرؑ کی ملاقات کو

۱۵۱

کیوں گئے؟ موسیٰؑ کو یاد کرو۔ وہ مخلص اور بلند مرتبہ پیغمبر تھا

۱۷۴

کیا موسیٰؑ کی خبر تم تک پہنچی جب اُسے آگ نظر آئی۔ ایک چنگاری لے آؤں،

۲۸۱

رات معلوم کروں۔ میں تیرا رب ہوں۔ جو تے آثار دو، یہ داوی مقدس طوئی ہے

۳۳۴

میں نے تمہیں رسالت کے لیے چُن لیا ہے وہی کو سُنو، میں اللہ ہوں، میرے سوا کوئی

۳۳۶

خدا نہیں۔ دائیں ہاتھ میں کیا ہے؟ عصا، سہارا

۳۳۷

لیتا ہوں، پتے جھاڑتا ہوں۔ پھینک دو۔ سانپ بن گیا، پکڑ لو۔ ہاتھ بے عیب

۳۳۸ تا ۳۳۵

ہو گیا۔

۳۳۸ تا ۳۳۵

فرعون کے پاس جاؤ، سیدہ کشادہ اور کام آسان، زبان کو طاقت، مکر کو مضبوط کر دے، ہارون کو وزیر بنا دے، فرمایا سب کچھ دیا۔ ۳۵۱ تا ۳۵۶

پہلے بھی تم پر احسان کیا، تمہاری مال پر وحی کی، صندوق دریا میں ڈالا، پھر ماں سے ملا دیا، قبطی کو قتل کیا تو حفاظت کی اور اپنے لیے تمہاری پرورش کی۔ ۳۵۴ تا ۳۶۰

دونوں فرعون کے پاس جاؤ، نرمی سے بات کرو۔ ڈرہے وہ زیادتی کرے گا۔ نہیں میں ساتھ ہوں۔ کہو بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دے۔ جو آیات خدا کو جھٹلائے گا، اس پر عذاب ہوگا۔ ۳۶۱ تا ۳۶۵

ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر موجود کو اس کی ضروریات مہیا کیں، وہ بھولتا نہیں، اُس نے تمہارے آرام کے لیے زمین بنائی، پانی برسایا، باغات آگائے تاکہ تم اور تمہارے جانور کھاؤ پیو، ہمارا وعدہ روز عید ہوا۔ ۳۶۴، ۳۶۵

پہلے تم ہی چھینکو۔ لاشیاں اور رسیاں دوڑتی نظر آئیں۔ تم ہی کامیاب ہو گے۔ عصا زمین پر ڈال دو، پھر دیکھو۔ ۳۸۰

میرے بندوں کو راتوں رات لے جا، دریا پار کر لے۔ ۳۹۲، ۳۹۴

تم اپنی قوم سے پہلے طور پر کیوں آگئے؟ وہ پیچھے آ رہے

ہیں، انہیں سامری نے گمراہ کر دیا۔ موسیٰ واپس آئے۔ کیا تمہارے رب نے اچھا وعدہ نہیں کیا تھا؟ تم خدا کے غضب کے انتظار میں رہو۔ ۴۰۰، ۴۰۱

سامری اٹوٹے یہ کام کیوں کیا؟ ہم نے موسیٰ و ہارون کو فرقان، نور اور پرہیزگاروں کے لیے ہدایت کا ذریعہ عطا فرمایا ۵۰۸، ۵۱۰

حضرت امام موسیٰ کاظم (امام ہفتم)

ایام حج میں پندرہ نمازوں کی تکبیریں ۶۲۳

جس کو تمہیں سے استفادہ کرنے والا کوئی نہ ہو اس امام رہبر کی مانند ہے جو سکوت میں ہو۔ ۶۴۲

مؤمن

مومنین کو جنت کے شاداب باغوں میں داخل کیا جائے گا اور انہیں پاکیزہ باتوں کی رہنمائی کی جائے گی۔ ۶۲۱، ۶۲۲

جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کیے ان کے لیے مغفرت اور اچھا رزق ہے ۶۸۰

نضر بن حارث

مکہ کا ایک دولت مند ۳۰۴

نکسن

ہم اپنے آپ کو خوش رکھنے کی آرزو رکھتے ہیں، لیکن ہرگز خوش نہیں ہوتے۔ ۲۴۲، ۲۴۳

نمرود

حضرت ابراہیم اور نمرود کے درمیان معرکہ ۵۲۷

آگ سے حضرت ابراہیم کی معجزانہ نجات نے نمرود اور اس کے ارکان کو لرزہ بر اندام کر دیا۔ ۵۲۸

حضرت نوح علیہ السلام

یہ ان لوگوں میں سے تھے جنہیں ہم نے نوح کی کشتی میں سوار کرایا۔ ۲۸۵، ۲۸۶

حضرت نوح نے ابراہیم و لوط سے بھی پہلے اپنے رب کو پکارا، ہم نے اس کی دعا قبول فرمائی، مدد کی، نجات دی اور ان کی قوم کو غرق کر دیا۔ ۵۲۴

ولید بن مغیرہ

ایک بڑی کوریزہ ریزہ کر کے بکھیر رہا تھا کہ کیا اس حالت کے بعد ہم دوبارہ زندہ ہونگے؟ ۲۹۶، ۲۹۷

حضرت ہاجرہ علیہا السلام

مناسک حج حضرت ہاجرہ کے نظریات، کردار اور راہ خدا میں قربانی کو حجاج کے اذہان پر نقش کرتے رہتے ہیں۔ ۲۷۵

حضرت ہارون علیہ السلام

صالحیت و پاکیزگی میں ضرب المثل ہو گئے تھے۔ کبھی مرد و عورت کو (پاکیزگی کے سبب) ہارون کا بھائی یا بہن کہا جاتا تھا۔ ۲۵۶

ہم نے اپنی رحمت سے موسیٰ کو اس کا بھائی ہارون بنی بنیشتا۔ ۲۸۱

ہارون نے کہہ دیا تھا کہ یہ بچہ تمہاری آزمائش ہے، تمہارا رب خدا نے رحمت سے میری پیروی اور میرے فرمان کی اطاعت کرو۔ ۴۰۱

ہارون بارہ ہزار مومنین کے ساتھ گمراہ بنی اسرائیل سے الگ ہو گئے۔ ۴۰۶

اسے ہارون تم نے بنی اسرائیل کو گمراہ ہوتے دیکھا تو میری پیروی کیوں نہ کی؟ کیا میرے حکم کی نافرمانی کی ہے؟ میری ڈاڑھی نہ کٹو، مجھے ڈر تھا تم یہ نہ کہو کہ بنی اسرائیل میں فقرہ ڈال دیا۔ ۴۱۱ تا ۴۱۳

ہم نے موسیٰ و ہارون کو فرقان، نور اور پرہیزگاروں کے لیے ہدایت کا ذریعہ عطا فرمایا۔ ۵۰۸، ۵۱۰

ہشام بن حکم

امام جعفر صادق نے حج کے اقتصادی پہلو پر
ہشام سے واضح مقاصد بیان فرمائے۔ ۲۷۶، ۲۷۷

حضرت یحییٰ علیہ السلام

عشق الہی میں سرشار پیغمبر، بعض صفات حضرت
عیسیٰ کی مانند، امام حسین علیہ السلام سے شائبہ ۲۳۸، ۲۳۹
حضرت یحییٰ کے فضائل، آیات ۱۲ تا ۱۵، کتاب
یحییٰ کا ذکر۔ ۲۳۹ تا ۲۴۱

حضرت یحییٰ کی شہادت اور آپ کے سر کا ایک
بدکار عورت کی خاطر بطور تحفہ بھیجا۔ ۲۴۲
ہم نے اسے (ذکر کیا کہ) یحییٰ سا بیٹا عطا فرمایا ۵۵۵، ۵۵۶

حضرت یعقوب علیہ السلام

ہم نے ابراہیم کو یعقوب سا پوتا عطا فرمایا ۲۸۰، ۲۷۶
۵۲۹، ۵۲۸
وہ انبیاء اہل ایم و یعقوب کی ذریت سے تھے ۲۸۶، ۲۸۵

یوشع بن لاوی

تیسری صدی عیسوی میں تلمود کے مفسر ۱۷۱

حضرت یوشع بن نون

بنی اسرائیل کے شہنشاہ، رشید اور ایمان براه مرو ۱۴۷

علماء و دانشور

ابن خرداد بہ۔ مؤرخ (المساک والممالک) ۸۶
ابن ماجہ۔ مؤرخ ۳۶
ابوالفتح رازی ۱۶۱
ابوالکلام آزاد۔ عالم ۱۹۷
ابوریحان بیرونی ۱۹۷، ۸۶
ابوالقاسم حاکم جکافی۔ محدث ۳۹۹
اصبغ ابن نباتہ (راوی حدیث) ۲۱۲، ۲۰۵
اصمعی (صاحب تاریخ "عرب قبل از اسلام" ۱۹۶
اکوسی۔ مفسر ۶۲۱، ۶۱۹، ۳۹۹، ۳۵۳
الیکسس کارل مصنف "انسان موجود ناشائستہ" ۲۶۱
بحرانی۔ محدث ۳۵۲
یوعلی سینا۔ مصنف "الشفاء" ۱۹۶
ذوالقرنین۔ عالم و بادشاہ ۱۸۸، ۱۷۰
رابرت نیلسن۔ سائنسدان ۸۹
راغب۔ مصنف "مفردات" ۱۵۶، ۱۳۸، ۹۶، ۶۸
۱۳۶۰، ۳۳۰، ۳۰۴، ۲۳۵، ۱۹۰
۵۶۹، ۵۵۹، ۵۱۰، ۵۰۵، ۲۸۷
۶۵۳، ۶۴۱، ۶۴۰، ۵۹۶
نزارہ، قصبہ، محدث ۱۷۷
ثاکر۔ قصہ اصحاب کعب کا پہلا عیسائی مصنف ۸۶

میں رسول پاک کی احادیث جمع کی ہیں۔ ۳۲۲

کُتب آسمانی

انجیل

روائے یوحنا ۲۰۳
اُس (خدا) نے مجھے آسمانی کتاب عطا فرمائی ۲۵۵

تورات

کتاب اشعیا ۲۰۰
کتاب دانیال ۱۹۹
تورات حزقیل ۲۰۳
سفر خروج ۳۲۶

زبور

ہم نے فکر (تورات) کے بعد زبور میں لکھ
دیا ہے کہ زمین صالح بندوں کے اختیار میں ہوگی ۵۷۱، ۵۷۰

قرآن حکیم

ہم نے قرآن میں مثالیں اور نمونے پیش کیے
لوگوں نے انکار سخت کیا۔ ۱۳۷
تعلیم و تربیت کے لیے ہی تیس سال تک
مناسب وقتوں میں نازل ہوا۔ ۱۱۷

سیوطی، صاحب درمنثور ۶۱۹، ۳۵۲
شعرانی۔ ماضی میں سفر حج کی صعوبات کو بیان کیا ۶۳۱
طہالبہائی۔ علامہ، صاحب "تفسیر المیزان" ۱۲۶، ۹۱
طبرسی۔ صاحب "تفسیر مجمع البیان" ۶۱۹، ۵۴۱، ۳۹۹، ۳۵۲
طبری ۷۱۹، ۶۱۹، ۶۰۸
طوسی ۶۰۸
عبداللہ ابن عباسؓ۔ محدث و فقیہ ۹۰، ۷۱
علی ابن ابراہیم قمی۔ راوی حدیث ۶۲۲، ۷۸
فخرالدین رازی۔ مفسر ۶۱۹، ۶۰۸، ۹۰، ۷۱
فرائک آلن۔ فرس کا استاد ۳۹۲
فیض کاشانی۔ مفسر ۱۹۰
قرطبی۔ مفسر ۷۱
کرسی مورسین۔ شاہیوں کے خواص، رفتار
اور فضا کے قشر کی معلومات
مہتاکین۔ ۳۹۳، ۳۹۴
گوگولیوس۔ مترجم ۸۶
ہرودوت۔ یونانی مؤرخ ۲۰۰
یاسری۔ عالم ربانی ۳۲۶
یاقوت حموی۔ صاحب "معجم البلدان" ۸۶
خوٹ، زمخشری، جوزی، کنی، شافعی، قرطبی، طبری،
نیشاپوری، ابن صباغ مالکی، سیوطی، بیہقی، اکوسی، ثعلبی،
برادین عاذب نے اپنی کتب و تفاسیر میں مؤمنین کے
دلوں میں محبت حضرت علیؓ، آیت ۹۶ سورہ مریم کے ذیل

اللہ کی حمد۔ اپنے بندہ پر کتاب نازل فرمائی

جس میں کجی نہیں۔ ۳۴، ۳۲
۳۷، ۳۵

کتاب جو دوسری کتب کی نگہبان ہے ۳۵، ۳۳، ۳۲

قرآن کو اس کے تازہ نزول کے سبب

حدیث کہا ہے۔ ۳۹

قرآن کا مرکز، لطف ہے، 'والیتلطف'

قرآن کا عین وسط ہے۔ ۷۲

حروف مقطعات، اک حایا ع ص کے مفہا ہم ۲۳۰

اس کتاب میں مریم کا ذکر ۲۴۵

قرآن کا تحسن بیان اور ولادت عیسیٰ ۲۵۸

اس کتاب میں ابراہیم کو یاد کرو ۲۷۲، ۲۷۱

اس کتاب میں موسیٰ کا ذکر کرو ۲۸۱، ۲۸۰

اس کتاب میں اسماعیل کو یاد کرو ۲۸۳، ۲۸۲

اس کتاب میں ادریس کو یاد کرو ۲۸۵

ہم نے قرآن کو تیری زبان پر آسان کر دیا

ہے تاکہ متقیوں کو بشارت دے اور ظالموں

کو ڈرائے۔ ۳۲۱، ۳۱۹

قرآن اس لیے نہیں آنا کہ لو خود کو مشقت

میں ڈال دے۔ ۳۳۱ تا ۳۲۸

اس کا علم میرے رب کے پاس ایک کتاب

میں محفوظ ہے۔ ۳۷۱، ۳۶۸

ہم نے تمہیں قرآن عطا فرمایا جس نے اس سے

منہ پھیرا وہ قیامت میں ہر اب وہ ہوگا۔ ۴۱۹

ہم نے ایسی کتاب نازل کی جس میں

تمہاری ہدایت کا وسیلہ موجود ہے ۴۶۷، ۴۶۶

یہ ایک مبارک ذکر ہے ۵۱۰

کفار ہمیشہ قرآن کے بارے میں شک میں

رہیں گے۔ ۶۹۰

اللہ نے پہلی کتب اور اس کتاب میں

تمہارا نام مسلمان رکھا ہے۔ ۷۱۶، ۷۱۵

کتب تفسیر و تاریخ و سیر

اجتہاد طبری ۴۱۳

احقاق الحق ۳۲۲

اصول کافی ۲۸۸، ۲۸۳، ۲۸۰، ۱۷۵، ۱۷۰

اعلام القرآن ۵۴۳، ۲۳۸، ۱۷۷، ۸۶، ۸۵، ۸۴

الآثار الباقیہ ۱۹۷، ۸۶

الشفاء (بوعلی سینا) ۱۹۶

الممالک والمساکن ۸۶

انسان موجود ناشاختہ (الیکس کارل) ۲۶۱

اولین دانش گاہ و آخرین پیغمبر ۲۵۵، ۲۵۴

بہار الانوار ۶۳۷، ۶۳۳، ۶۳۳

تفسیر اسباب النزول ۶۱۹

تفسیر البیان ۶۲۹

تفسیر المیزان ۲۴۰، ۲۳۳، ۱۸۶، ۱۸۳، ۱۷۷، ۱۷۵، ۱۷۰، ۱۶۷، ۱۶۶، ۱۶۵، ۱۶۴، ۱۶۳، ۱۶۲، ۱۶۱، ۱۶۰، ۱۵۹، ۱۵۸، ۱۵۷، ۱۵۶، ۱۵۵، ۱۵۴، ۱۵۳، ۱۵۲، ۱۵۱، ۱۵۰، ۱۴۹، ۱۴۸، ۱۴۷، ۱۴۶، ۱۴۵، ۱۴۴، ۱۴۳، ۱۴۲، ۱۴۱، ۱۴۰، ۱۳۹، ۱۳۸، ۱۳۷، ۱۳۶، ۱۳۵، ۱۳۴، ۱۳۳، ۱۳۲، ۱۳۱، ۱۳۰، ۱۲۹، ۱۲۸، ۱۲۷، ۱۲۶، ۱۲۵، ۱۲۴، ۱۲۳، ۱۲۲، ۱۲۱، ۱۲۰، ۱۱۹، ۱۱۸، ۱۱۷، ۱۱۶، ۱۱۵، ۱۱۴، ۱۱۳، ۱۱۲، ۱۱۱، ۱۱۰، ۱۰۹، ۱۰۸، ۱۰۷، ۱۰۶، ۱۰۵، ۱۰۴، ۱۰۳، ۱۰۲، ۱۰۱، ۱۰۰، ۹۹، ۹۸، ۹۷، ۹۶، ۹۵، ۹۴، ۹۳، ۹۲، ۹۱، ۹۰، ۸۹، ۸۸، ۸۷، ۸۶، ۸۵، ۸۴، ۸۳، ۸۲، ۸۱، ۸۰، ۷۹، ۷۸، ۷۷، ۷۶، ۷۵، ۷۴، ۷۳، ۷۲، ۷۱، ۷۰، ۶۹، ۶۸، ۶۷، ۶۶، ۶۵، ۶۴، ۶۳، ۶۲، ۶۱، ۶۰، ۵۹، ۵۸، ۵۷، ۵۶، ۵۵، ۵۴، ۵۳، ۵۲، ۵۱، ۵۰، ۴۹، ۴۸، ۴۷، ۴۶، ۴۵، ۴۴، ۴۳، ۴۲، ۴۱، ۴۰، ۳۹، ۳۸، ۳۷، ۳۶، ۳۵، ۳۴، ۳۳، ۳۲، ۳۱، ۳۰، ۲۹، ۲۸، ۲۷، ۲۶، ۲۵، ۲۴، ۲۳، ۲۲، ۲۱، ۲۰، ۱۹، ۱۸، ۱۷، ۱۶، ۱۵، ۱۴، ۱۳، ۱۲، ۱۱، ۱۰، ۹، ۸، ۷، ۶، ۵، ۴، ۳، ۲، ۱، ۰

۷۱۸، ۷۱۷، ۷۱۶، ۷۱۵، ۷۱۴، ۷۱۳، ۷۱۲، ۷۱۱، ۷۱۰، ۷۰۹، ۷۰۸، ۷۰۷، ۷۰۶، ۷۰۵، ۷۰۴، ۷۰۳، ۷۰۲، ۷۰۱، ۷۰۰، ۶۹۹، ۶۹۸، ۶۹۷، ۶۹۶، ۶۹۵، ۶۹۴، ۶۹۳، ۶۹۲، ۶۹۱، ۶۹۰، ۶۸۹، ۶۸۸، ۶۸۷، ۶۸۶، ۶۸۵، ۶۸۴، ۶۸۳، ۶۸۲، ۶۸۱، ۶۸۰، ۶۷۹، ۶۷۸، ۶۷۷، ۶۷۶، ۶۷۵، ۶۷۴، ۶۷۳، ۶۷۲، ۶۷۱، ۶۷۰، ۶۶۹، ۶۶۸، ۶۶۷، ۶۶۶، ۶۶۵، ۶۶۴، ۶۶۳، ۶۶۲، ۶۶۱، ۶۶۰، ۶۵۹، ۶۵۸، ۶۵۷، ۶۵۶، ۶۵۵، ۶۵۴، ۶۵۳، ۶۵۲، ۶۵۱، ۶۵۰، ۶۴۹، ۶۴۸، ۶۴۷، ۶۴۶، ۶۴۵، ۶۴۴، ۶۴۳، ۶۴۲، ۶۴۱، ۶۴۰، ۶۳۹، ۶۳۸، ۶۳۷، ۶۳۶، ۶۳۵، ۶۳۴، ۶۳۳، ۶۳۲، ۶۳۱، ۶۳۰، ۶۲۹، ۶۲۸، ۶۲۷، ۶۲۶، ۶۲۵، ۶۲۴، ۶۲۳، ۶۲۲، ۶۲۱، ۶۲۰، ۶۱۹، ۶۱۸، ۶۱۷، ۶۱۶، ۶۱۵، ۶۱۴، ۶۱۳، ۶۱۲، ۶۱۱، ۶۱۰، ۶۰۹، ۶۰۸، ۶۰۷، ۶۰۶، ۶۰۵، ۶۰۴، ۶۰۳، ۶۰۲، ۶۰۱، ۶۰۰، ۵۹۹، ۵۹۸، ۵۹۷، ۵۹۶، ۵۹۵، ۵۹۴، ۵۹۳، ۵۹۲، ۵۹۱، ۵۹۰، ۵۸۹، ۵۸۸، ۵۸۷، ۵۸۶، ۵۸۵، ۵۸۴، ۵۸۳، ۵۸۲، ۵۸۱، ۵۸۰، ۵۷۹، ۵۷۸، ۵۷۷، ۵۷۶، ۵۷۵، ۵۷۴، ۵۷۳، ۵۷۲، ۵۷۱، ۵۷۰، ۵۶۹، ۵۶۸، ۵۶۷، ۵۶۶، ۵۶۵، ۵۶۴، ۵۶۳، ۵۶۲، ۵۶۱، ۵۶۰، ۵۵۹، ۵۵۸، ۵۵۷، ۵۵۶، ۵۵۵، ۵۵۴، ۵۵۳، ۵۵۲، ۵۵۱، ۵۵۰، ۵۴۹، ۵۴۸، ۵۴۷، ۵۴۶، ۵۴۵، ۵۴۴، ۵۴۳، ۵۴۲، ۵۴۱، ۵۴۰، ۵۳۹، ۵۳۸، ۵۳۷، ۵۳۶، ۵۳۵، ۵۳۴، ۵۳۳، ۵۳۲، ۵۳۱، ۵۳۰، ۵۲۹، ۵۲۸، ۵۲۷، ۵۲۶، ۵۲۵، ۵۲۴، ۵۲۳، ۵۲۲، ۵۲۱، ۵۲۰، ۵۱۹، ۵۱۸، ۵۱۷، ۵۱۶، ۵۱۵، ۵۱۴، ۵۱۳، ۵۱۲، ۵۱۱، ۵۱۰، ۵۰۹، ۵۰۸، ۵۰۷، ۵۰۶، ۵۰۵، ۵۰۴، ۵۰۳، ۵۰۲، ۵۰۱، ۵۰۰، ۴۹۹، ۴۹۸، ۴۹۷، ۴۹۶، ۴۹۵، ۴۹۴، ۴۹۳، ۴۹۲، ۴۹۱، ۴۹۰، ۴۸۹، ۴۸۸، ۴۸۷، ۴۸۶، ۴۸۵، ۴۸۴، ۴۸۳، ۴۸۲، ۴۸۱، ۴۸۰، ۴۷۹، ۴۷۸، ۴۷۷، ۴۷۶، ۴۷۵، ۴۷۴، ۴۷۳، ۴۷۲، ۴۷۱، ۴۷۰، ۴۶۹، ۴۶۸، ۴۶۷، ۴۶۶، ۴۶۵، ۴۶۴، ۴۶۳، ۴۶۲، ۴۶۱، ۴۶۰، ۴۵۹، ۴۵۸، ۴۵۷، ۴۵۶، ۴۵۵، ۴۵۴، ۴۵۳، ۴۵۲، ۴۵۱، ۴۵۰، ۴۴۹، ۴۴۸، ۴۴۷، ۴۴۶، ۴۴۵، ۴۴۴، ۴۴۳، ۴۴۲، ۴۴۱، ۴۴۰، ۴۳۹، ۴۳۸، ۴۳۷، ۴۳۶، ۴۳۵، ۴۳۴، ۴۳۳، ۴۳۲، ۴۳۱، ۴۳۰، ۴۲۹، ۴۲۸، ۴۲۷، ۴۲۶، ۴۲۵، ۴۲۴، ۴۲۳، ۴۲۲، ۴۲۱، ۴۲۰، ۴۱۹، ۴۱۸، ۴۱۷، ۴۱۶، ۴۱۵، ۴۱۴، ۴۱۳، ۴۱۲، ۴۱۱، ۴۱۰، ۴۰۹، ۴۰۸، ۴۰۷، ۴۰۶، ۴۰۵، ۴۰۴، ۴۰۳، ۴۰۲، ۴۰۱، ۴۰۰، ۳۹۹، ۳۹۸، ۳۹۷، ۳۹۶، ۳۹۵، ۳۹۴، ۳۹۳، ۳۹۲، ۳۹۱، ۳۹۰، ۳۸۹، ۳۸۸، ۳۸۷، ۳۸۶، ۳۸۵، ۳۸۴، ۳۸۳، ۳۸۲، ۳۸۱، ۳۸۰، ۳۷۹، ۳۷۸، ۳۷۷، ۳۷۶، ۳۷۵، ۳۷۴، ۳۷۳، ۳۷۲، ۳۷۱، ۳۷۰، ۳۶۹، ۳۶۸، ۳۶۷، ۳۶۶، ۳۶۵، ۳۶۴، ۳۶۳، ۳۶۲، ۳۶۱، ۳۶۰، ۳۵۹، ۳۵۸، ۳۵۷، ۳۵۶، ۳۵۵، ۳۵۴، ۳۵۳، ۳۵۲، ۳۵۱، ۳۵۰، ۳۴۹، ۳۴۸، ۳۴۷، ۳۴۶، ۳۴۵، ۳۴۴، ۳۴۳، ۳۴۲، ۳۴۱، ۳۴۰، ۳۳۹، ۳۳۸، ۳۳۷، ۳۳۶، ۳۳۵، ۳۳۴، ۳۳۳، ۳۳۲، ۳۳۱، ۳۳۰، ۳۲۹، ۳۲۸، ۳۲۷، ۳۲۶، ۳۲۵، ۳۲۴، ۳۲۳، ۳۲۲، ۳۲۱، ۳۲۰، ۳۱۹، ۳۱۸، ۳۱۷، ۳۱۶، ۳۱۵، ۳۱۴، ۳۱۳، ۳۱۲، ۳۱۱، ۳۱۰، ۳۰۹، ۳۰۸، ۳۰۷، ۳۰۶، ۳۰۵، ۳۰۴، ۳۰۳، ۳۰۲، ۳۰۱، ۳۰۰، ۲۹۹، ۲۹۸، ۲۹۷، ۲۹۶، ۲۹۵، ۲۹۴، ۲۹۳، ۲۹۲، ۲۹۱، ۲۹۰، ۲۸۹، ۲۸۸، ۲۸۷، ۲۸۶، ۲۸۵، ۲۸۴، ۲۸۳، ۲۸۲، ۲۸۱، ۲۸۰، ۲۷۹، ۲۷۸، ۲۷۷، ۲۷۶، ۲۷۵، ۲۷۴، ۲۷۳، ۲۷۲، ۲۷۱، ۲۷۰، ۲۶۹، ۲۶۸، ۲۶۷، ۲۶۶، ۲۶۵، ۲۶۴، ۲۶۳، ۲۶۲، ۲۶۱، ۲۶۰، ۲۵۹، ۲۵۸، ۲۵۷، ۲۵۶، ۲۵۵، ۲۵۴، ۲۵۳، ۲۵۲، ۲۵۱، ۲۵۰، ۲۴۹، ۲۴۸، ۲۴۷، ۲۴۶، ۲۴۵، ۲۴۴، ۲۴۳، ۲۴۲، ۲۴۱، ۲۴۰، ۲۳۹، ۲۳۸، ۲۳۷، ۲۳۶، ۲۳۵، ۲۳۴، ۲۳۳، ۲۳۲، ۲۳۱، ۲۳۰، ۲۲۹، ۲۲۸، ۲۲۷، ۲۲۶، ۲۲۵، ۲۲۴، ۲۲۳، ۲۲۲، ۲۲۱، ۲۲۰، ۲۱۹، ۲۱۸، ۲۱۷، ۲۱۶، ۲۱۵، ۲۱۴، ۲۱۳، ۲۱۲، ۲۱۱، ۲۱۰، ۲۰۹، ۲۰۸، ۲۰۷، ۲۰۶، ۲۰۵، ۲۰۴، ۲۰۳، ۲۰۲، ۲۰۱، ۲۰۰، ۱۹۹، ۱۹۸، ۱۹۷، ۱۹۶، ۱۹۵، ۱۹۴، ۱۹۳، ۱۹۲، ۱۹۱، ۱۹۰، ۱۸۹، ۱۸۸، ۱۸۷، ۱۸۶، ۱۸۵، ۱۸۴، ۱۸۳، ۱۸۲، ۱۸۱، ۱۸۰، ۱۷۹، ۱۷۸، ۱۷۷، ۱۷۶، ۱۷۵، ۱۷۴، ۱۷۳، ۱۷۲، ۱۷۱، ۱۷۰، ۱۶۹، ۱۶۸، ۱۶۷، ۱۶۶، ۱۶۵، ۱۶۴، ۱۶۳، ۱۶۲، ۱۶۱، ۱۶۰، ۱۵۹، ۱۵۸، ۱۵۷، ۱۵۶، ۱۵۵، ۱۵۴، ۱۵۳، ۱۵۲، ۱۵۱، ۱۵۰، ۱۴۹، ۱۴۸، ۱۴۷، ۱۴۶، ۱۴۵، ۱۴۴، ۱۴۳، ۱۴۲، ۱۴۱، ۱۴۰، ۱۳۹، ۱۳۸، ۱۳۷، ۱۳۶، ۱۳۵، ۱۳۴، ۱۳۳، ۱۳۲، ۱۳۱، ۱۳۰، ۱۲۹، ۱۲۸، ۱۲۷، ۱۲۶، ۱۲۵، ۱۲۴، ۱۲۳، ۱۲۲، ۱۲۱، ۱۲۰، ۱۱۹، ۱۱۸، ۱۱۷، ۱۱۶، ۱۱۵، ۱۱۴، ۱۱۳، ۱۱۲، ۱۱۱، ۱۱۰، ۱۰۹، ۱۰۸، ۱۰۷، ۱۰۶، ۱۰۵، ۱۰۴، ۱۰۳، ۱۰۲، ۱۰۱، ۱۰۰، ۹۹، ۹۸، ۹۷، ۹۶، ۹۵، ۹۴، ۹۳، ۹۲، ۹۱، ۹۰، ۸۹، ۸۸، ۸۷، ۸۶، ۸۵، ۸۴، ۸۳، ۸۲، ۸۱، ۸۰، ۷۹، ۷۸، ۷۷، ۷۶، ۷۵، ۷۴، ۷۳، ۷۲، ۷۱، ۷۰، ۶۹، ۶۸، ۶۷، ۶۶، ۶۵، ۶۴، ۶۳، ۶۲، ۶۱، ۶۰، ۵۹، ۵۸، ۵۷، ۵۶، ۵۵، ۵۴، ۵۳، ۵۲، ۵۱، ۵۰، ۴۹، ۴۸، ۴۷، ۴۶، ۴۵، ۴۴، ۴۳، ۴۲، ۴۱، ۴۰، ۳۹، ۳۸، ۳۷، ۳۶، ۳۵، ۳۴، ۳۳، ۳۲، ۳۱، ۳۰، ۲۹، ۲۸، ۲۷، ۲۶، ۲۵، ۲۴، ۲۳، ۲۲، ۲۱، ۲۰، ۱۹، ۱۸، ۱۷، ۱۶، ۱۵، ۱۴، ۱۳، ۱۲، ۱۱، ۱۰، ۹، ۸، ۷، ۶، ۵، ۴، ۳، ۲، ۱، ۰

۷۱۸، ۷۱۷، ۷۱۶، ۷۱۵، ۷۱۴، ۷۱۳، ۷۱۲، ۷۱۱، ۷۱۰، ۷۰۹، ۷۰۸، ۷۰۷، ۷۰۶، ۷۰۵، ۷۰۴، ۷۰۳، ۷۰۲، ۷۰۱، ۷۰۰، ۶۹۹، ۶۹۸، ۶۹۷، ۶۹۶، ۶۹۵، ۶۹۴، ۶۹۳، ۶۹۲، ۶۹۱، ۶۹۰، ۶۸۹، ۶۸۸، ۶۸۷، ۶۸۶، ۶۸۵، ۶۸۴، ۶۸۳، ۶۸۲، ۶۸۱، ۶۸۰، ۶۷۹، ۶۷۸، ۶۷۷، ۶۷۶، ۶۷۵، ۶۷۴، ۶۷۳، ۶۷۲، ۶۷۱، ۶۷۰، ۶۶۹، ۶۶۸، ۶۶۷، ۶۶۶، ۶۶۵، ۶۶۴، ۶۶۳، ۶۶۲، ۶۶۱، ۶۶۰، ۶۵۹، ۶۵۸، ۶۵۷، ۶۵۶، ۶۵۵، ۶۵۴، ۶۵۳، ۶۵۲، ۶۵۱، ۶۵۰، ۶۴۹، ۶۴۸، ۶۴۷، ۶۴۶، ۶۴۵، ۶۴۴، ۶۴۳، ۶۴۲، ۶۴۱، ۶۴۰، ۶۳۹، ۶۳۸، ۶۳۷، ۶۳۶، ۶۳۵، ۶۳۴، ۶۳۳، ۶۳۲، ۶۳۱، ۶۳۰، ۶۲۹، ۶۲۸، ۶۲۷، ۶۲۶، ۶۲۵، ۶۲۴، ۶۲۳، ۶۲۲، ۶۲۱، ۶۲۰، ۶۱۹، ۶۱۸، ۶۱۷، ۶۱۶، ۶۱۵، ۶۱۴، ۶۱۳، ۶۱۲، ۶۱۱، ۶۱۰، ۶۰۹، ۶۰۸، ۶۰۷، ۶۰۶، ۶۰۵، ۶۰۴، ۶۰۳، ۶۰۲، ۶۰۱، ۶۰۰، ۵۹۹، ۵۹۸، ۵۹۷، ۵۹۶، ۵۹۵، ۵۹۴، ۵۹۳، ۵۹۲، ۵۹۱، ۵۹۰، ۵۸۹، ۵۸۸، ۵۸۷، ۵۸۶، ۵۸۵، ۵۸۴، ۵۸۳، ۵۸۲، ۵۸۱، ۵۸۰، ۵۷۹، ۵۷۸، ۵۷۷، ۵۷۶، ۵۷۵، ۵۷۴، ۵۷۳، ۵۷۲، ۵۷۱، ۵۷۰، ۵۶۹، ۵۶۸، ۵۶۷، ۵۶۶، ۵۶۵، ۵۶۴، ۵۶۳، ۵۶۲، ۵۶۱، ۵۶۰، ۵۵۹، ۵۵۸، ۵۵۷، ۵۵۶، ۵۵۵، ۵۵۴، ۵۵۳، ۵۵۲، ۵۵۱، ۵۵۰، ۵۴۹، ۵۴۸، ۵۴۷، ۵۴۶، ۵۴۵، ۵۴۴، ۵۴۳، ۵۴۲، ۵۴۱، ۵۴۰، ۵۳۹، ۵۳۸، ۵۳۷، ۵۳۶، ۵۳۵، ۵۳۴، ۵۳۳، ۵۳۲، ۵۳۱، ۵۳۰، ۵۲۹، ۵۲۸، ۵۲۷، ۵۲۶، ۵۲۵، ۵۲۴، ۵۲۳، ۵۲۲، ۵۲۱، ۵۲۰، ۵۱۹، ۵۱۸، ۵۱۷، ۵۱۶، ۵۱۵، ۵۱۴، ۵۱۳، ۵۱۲، ۵۱۱، ۵۱۰، ۵۰۹، ۵۰۸، ۵۰۷، ۵۰۶، ۵۰۵، ۵۰۴، ۵۰۳، ۵۰۲، ۵۰۱، ۵۰۰، ۴۹۹، ۴۹۸، ۴۹۷، ۴۹۶، ۴۹۵، ۴۹۴، ۴۹۳، ۴۹۲، ۴۹۱، ۴۹۰، ۴۸۹، ۴۸۸، ۴۸۷، ۴۸۶، ۴۸۵، ۴۸۴، ۴۸۳، ۴۸۲، ۴۸۱، ۴۸۰، ۴۷۹، ۴۷۸، ۴۷۷، ۴۷۶، ۴۷۵، ۴۷۴، ۴۷۳، ۴۷۲، ۴۷۱، ۴۷۰، ۴۶۹، ۴۶۸، ۴۶۷، ۴۶۶، ۴۶۵، ۴۶۴، ۴۶۳، ۴۶۲، ۴۶۱، ۴۶۰، ۴۵۹، ۴۵۸، ۴۵۷، ۴۵۶، ۴۵۵، ۴۵۴، ۴۵۳، ۴۵۲، ۴۵۱، ۴۵۰، ۴۴۹، ۴۴۸، ۴۴۷، ۴۴۶، ۴۴۵، ۴۴۴، ۴۴۳، ۴۴۲، ۴۴۱، ۴۴۰، ۴۳۹، ۴۳۸، ۴۳۷، ۴۳۶، ۴۳۵، ۴۳۴، ۴۳۳، ۴۳۲، ۴۳۱، ۴۳۰، ۴۲۹، ۴۲۸، ۴۲۷، ۴۲۶، ۴۲۵، ۴۲۴، ۴۲۳، ۴۲۲، ۴۲۱، ۴۲۰، ۴۱۹، ۴۱۸، ۴۱۷، ۴۱۶، ۴۱۵، ۴۱۴، ۴۱۳، ۴۱۲، ۴۱۱، ۴۱۰، ۴۰۹، ۴۰۸، ۴۰۷، ۴۰۶، ۴۰۵، ۴۰۴، ۴۰۳، ۴۰۲، ۴۰۱، ۴۰۰، ۳۹۹، ۳۹۸، ۳۹۷، ۳۹۶، ۳۹۵، ۳۹۴، ۳۹۳، ۳۹۲، ۳۹۱، ۳۹۰، ۳۸۹، ۳۸۸، ۳۸۷، ۳۸۶، ۳۸۵، ۳۸۴، ۳۸۳، ۳۸۲، ۳۸۱، ۳۸۰، ۳۷۹، ۳۷۸، ۳۷۷، ۳۷۶، ۳۷۵، ۳۷۴، ۳۷۳، ۳۷۲، ۳۷۱، ۳۷۰، ۳۶۹، ۳۶۸، ۳۶۷، ۳۶۶، ۳۶۵، ۳۶۴، ۳۶۳، ۳۶۲، ۳۶۱، ۳۶۰، ۳۵۹، ۳۵۸، ۳۵۷، ۳۵۶، ۳۵۵، ۳۵۴، ۳۵۳، ۳۵۲، ۳۵۱، ۳۵۰، ۳۴۹، ۳۴۸، ۳۴۷، ۳۴۶، ۳۴۵، ۳۴۴، ۳۴۳، ۳۴۲، ۳۴۱، ۳۴۰، ۳۳۹، ۳۳

راز آفرینش انسان

۴۹۴

سفینۃ البحار

۵۲۷، ۴۳۸، ۳۳۰، ۲۷۴، ۲۲۵، ۱۹۴

سیرت ابن ہشام

۴۶۷

غایت المرام

۳۵۳

فرہنگ نامہ مادہ زمستان خوانی

۸۸

قاموس اللغات

۶۴۰، ۵۷۰

قصص القرآن

۵۴۳

کامل ابن اثیر

۵۴۹، ۵۲۷، ۵۲۲، ۱۹۶

کنز العرفان

۶۴۲، ۶۴۰، ۶۲۶

"لائف" اور "سکوائر" (انسانی جسم کو منہ)

۹۰

کسے پر کتب سائنس

۸۶

معجم البلدان

۱۷۸

معجم رجال الحدیث

۴۴۴

معانی ہستی

۱۹۰، ۱۵۶، ۱۴۸، ۹۶، ۶۸

مفردات راغب

۵۰۵، ۴۸۷، ۳۶۰، ۳۳۰، ۳۰۴

من لا یحضر الفقیہ

۶۴۰، ۵۹۶، ۵۷۰، ۵۵۹، ۵۱۰

من لا یحضر الفقیہ

۶۵۳، ۶۴۱

نور الابصار

۵۷۴

نور الابصار

۵۳۹، ۲۵۴

نور الابصار

۵۷۴

نور الابصار

۳۳۳، ۳۲۲، ۲۸۳، ۱۹۳، ۱۷۹، ۱۴۳، ۱۳۴

نور الابصار

۵۵۹، ۴۷۴، ۴۴۰، ۴۸۲، ۳۶۳، ۳۴۸

نور الابصار

۶۳۷، ۶۳۵، ۵۶۸

وسائل الشیعہ

۶۱۳، ۲۶۱، ۲۵۸، ۲۵۳، ۷۲، ۴۱

۶۴۲، ۶۴۱، ۶۳۸، ۶۳۷، ۶۳۵

لغات قرآن

(۱)

اشارہ: نشانی یا علامت باقی

۳۹

احداث: میں غروب شروع کروں گا

۱۹۰

احلام: حلم کی جمع (بروزن ہم خواب) رویا

۴۶۲

احبط: تباہ کن، گھیر لینے والا عذاب

۱۱۱

اخفی: دل میں رکھی جانے والی نیت

۳۳۲

اذا (بروزن ضد) گریہ آواز، جبرے اور

۳۱۶

دشت ناک کام۔

۹۷

اذقان: ذقن کی جمع، ٹھوڑی

۶۲۹

اذن: مادہ، اذان، بلاوا

۵۸۰

اذنت: مادہ، اذان، ہدایت کے ساتھ

۹۷

خبردار کرنا۔

۲۳۱

ارائک: اریک کی جمع، تخت

۶۰۰

ارث: تملیک و ترسیلات ارث

۳۱۱

ارذل العمر: گھٹیا دنا پسندیدہ زمانہ

۳۵۰

ازا: دیگ کا جوش مارنا

۳۵۰

ازد: مادہ، ازار لباس، کمر کا پٹکا، کمر

۳۵۰

توت، قدرت

۳۵۰

ازواجاً: مادہ، زوج، نباتات مختلف اصناف

۳۷۳

نرو مادہ۔

اساورہ: اسورہ (بروزن مشورہ) کی جمع،

۶۲۱، ۹۷

کنگن: سوار کی جمع فارسی کے

۳۶۰

شہسوار سے متعلق۔

۶۲۱، ۹۷

اصطناع: مادہ، صنم، اصلاح کرنا، مکمل کرنا

۲۵۸

اضغاث: جمع، ضغث، کی، خشک لکڑی یا

۲۸۸

گھاس کے گٹھے۔

۶۲۸

افصح: فہمیدہ و رسا گفتگو کرنے والا

۳۲۹

اکاد: ارید کے معنی میں، میں چاہتا ہوں

۳۳۸

اکتہ: کنان (بروزن زبان) کی جمع، پردہ

۱۴۳

دھانپنے والی چیز۔

۱۴۳

اکیدن: مادہ، کید، پوشیدہ منصوبہ، خفیہ

۵۱۴

چارہ جوئی۔

۳۰۶

الساعة: قیامت

۵۵۹

اقت: ایسا گروہ جس کی مشترک جہت اسے

۱۵۷

متمدد رکھے۔

۳۳۵

امصر: (بروزن شمر) حیرت انگیز ناپسندیدہ کام

۴۶

امکثو: مادہ، مکث، مختصر توقف

۴۶

اوسی: مادہ، مادی، جانے امن

۳۳۲

اوجس: مادہ، ایجاس، جس (بروزن جس)

۳۴۳

پوشیدہ آواز، اندرونی احساس۔

۳۴۳

اھش: مادہ، اھش، پتہ جھاڑنا

۳۸۳

(ب)

باخ: مادہ، باخ، (بروزن نخل) شدت

۶۵۷

غم سے اپنے آپ کو مار ڈالنا۔

۶۵۷

بدن: بدنہ کی جمع۔ موٹے تازے اونٹ

۲۵۸

میترا: نیکو کار

۲۸۸

بکینا: باکی، گریہ کرنے والا

۶۲۸

بوا: مادہ، بوا، عمارت کیلئے جگہ تیار کرنا

۱۹۱

(ت)

تالیوت: لکڑی کا صندوق، صندوق جنازہ

۱۹۶

تاویل: مادہ، اول، (بروزن قول) لوٹانا۔

۱۹۶

دایس دینا۔

۱۹۶

تبع: یمن کے بادشاہوں کا لقب، جمع، تباہ

۱۹۶

تخطفہ: خطفہ (بروزن عطف)

۶۴۷

تھپٹ کر پھڑنا۔

۱۹۶

تذروہ: مادہ، ذرو، منتشر کرنا، بکھیرنا

۳۴۳

تسلی: مادہ، سعی، تیزی سے چلنا، دوڑنا

۳۳۷، ۳۳۰

تسقی: شقاوت، تکلیف، دکھ

۴۳۸

تضیی: مادہ، ضعی، سورج کا چمکانا، شدید گرمی

۵۹۰، ۵۵۹

تقطعوا: مادہ، قطع، ٹکڑے کرنا، تقسیم کرنا

۳۸۳

تلقف: مادہ، لقف، (بروزن وقف)

۳۸۳

نگنا، اچک لینا۔

۳۸۳

تمثل، مادہ، متول، کسی کے سامنے کھڑا ہونا،

کسی اور کی شکل ظاہر ہونا، دارالندہ

۲۳۸ میں شیطان کا بزرگ صورت میں آنا

۳۱۲ تصید: مادہ، میدان، ناموزوں جھگڑے و زلزلے

۳۷۷ تول، روگردانی، اعتراض، ناراضی

(ث)

۳۳۲ ثری، مطلوب مٹی، تشیر زمین سے نیچے کا حصہ

(ج)

۲۵۸ جبار: غیض و غضب میں لوگوں کو مارنے والا

جثیا، جثی، جاثی کی جمع۔ ناتوانی یا ذلت

کے سبب گھٹنوں بل بیٹھا ہوا۔ گروہ

۲۹۹، ۲۹۸ درگروہ۔ انہو

۱۳۸ جدل، مقابل پر غلبہ پانے کے لیے گفتگو

۲۵۰ جذع، درخت کا تنہا

جھیم، مادہ، جم، (بروزن شر) آگ کا شدت

۶۸۲ سے بھڑکنا۔

جیبوب، 'جیب'، بروزن غیب، کی جمع،

۵۹۲ گریبان، سینہ کا اوپر کا حصہ

(ح)

حدب، (بروزن ادب) پستیوں کے درمیان بلندی ۵۶۲

حسان (بروزن لقمان) مادہ، حساب، منزل ۱۰۸

۵۶۷ حسیس، مخصوص آواز

۵۶۵ حصب، ایندھن تنور میں ڈالنا

حضور، مادہ، حضور، جو شخص محاصرہ میں ہو

شادی سے اجتناب کرنے والا۔

۲۳۸، ۲۳۷ ترک ہوا دھوس۔

۴۷۰ حصید، کٹی ہوئی کھیتی

۱۳۸ حق، عرصہ دراز یا ۸۰ سال

۱۸۳ حقمہ، سیاہ، بدبو دار مٹی، کچھڑ

۷۰۱، ۶۲۱ حمید، قابل تائش

۷۰۱، ۶۲۰ حمیم، گرم، جلا دینے والا پانی

حنفاء، حنیف کی جمع، حنف (بروزن)

صدف۔ راہ راست سے میلان

۶۴۶ رکھنے والا۔

۲۱۶ حول، (بروزن مل) نقل مکانی۔

(خ)

خامدین، مادہ، 'خود' (بروزن جنود) آگ

۴۷۰ 'خجما، خاموشی، قبرستان جیسی دیرانی

۷۰۱ خبیر، باریک بین، مسائل سے آگاہ

۱۵۶ خرق، بے سوچے سمجھے چیر پھاڑ کر برباد کر دینا

خشیت، تعظیم و احترام کے ساتھ

۳۸۷ ہم آہنگ خوف۔

۵۵۵ رہبا، خوف، نفرت، بیزاری

(ق)

۱۹۰ زبیرہ، (بروزن عرفہ) لوبے کی سلیں

زرق، ارزق کی جمع۔ نیلی آنکھوں والا شخص

۴۲۲ جس کا بدن درو و تکلیف کی شدت

سے سیاہ اور نیلا ہو گیا ہو۔

۴۲۲ زفیہ، چرخ و پکار جس کے ساتھ سانس کی

آواز بھی آئے، بقول بعض فخر کی

۴۶۸ نفرت انگیز آواز۔

۲۲۰ زکوٰۃ، مختلف معنی، تمام پاکیزگیاں

۱۰۸ زلق، چٹیل میدان، پھسلنے کی جگہ

(س)

سبب، رستی جس کے ذریعہ کھجور پر پڑھا

۱۸۴ جاسے، وسیلہ، ذریعہ

۲۸۸ سجدۂ آ، ساجد، سجدہ کرنے والا

سجبل، پتھر کے ٹکڑے جن پر لکھا جاتا تھا۔

پھر بڑے کاغذ کے معنی ہوئے

جن پر لکھائی ہوتی اور وہ لپیٹے

جاتے تھے۔

۵۶۹ سحیق، دودرواز۔ سحوق، کھجور کا بہت

۶۴۷ بڑا درخت۔

۱۶۵ خشینا، ہمیں ڈرتھا کہ ایسا ہوگا، ہمیں اچھا نہ لگا

خلف، (بروزن برف) غیر صالح اولاد

۲۸۹ خلف، (بروزن صدف) نیک و صالح اولاد

۳۰۴ نخوار، گائے، گوسالہ یا اونٹ کی آواز

(ذ)

ذالنون، 'نون' بہت بڑی پھلی، مگر چھ، بڑا

۵۵۰ دریائی جانور۔

۵۷۲ ذکر، یہاں بمعنی تورات

(س)

۶۲۹ رجال، راجل کی جمع، پیدل چلنے والے

۷۰ رجم، پتھر یا پتھر پھینکنا، تیر اندازی

۷۰ رجما، بالغیب، اندھیرے میں تیر چلانا

روم، (بروزن مرد) پتھروں سے رخنہ پڑ کرنا

۱۹۰ رکاوٹ، دیوار، پیوند

۵۱۲ رشد، مقصد تک راہ پانا

۵۵۵ رغبا، میلان، لگاؤ

رقیم، مادہ، رقم، (بروزن زخم) لکھنا،

۴۴ کتاب، سختی۔

۲۲۱ رکز، آہستہ آواز

۵۶۹ رکض، تیزی سے دوڑنا

۳۹۰ رواسی، راسیہ کی جمع، سختی سے جھے ہوئے پہاڑ

- ۳۳۲ بستر چھپ کر انجام دیا جانے والا عمل
سُرب: (بروزن جرب) نشیب کی طرف جانا
۱۴۸ سُرب: (بروزن جرب) نشیبی راستہ
سعو: مادہ 'سعی' دوڑنا۔ یہاں آیات الہی کو
مثانہ مراد ہے۔
۶۸۱ سعیر: مادہ 'سعر' (بروزن قعر) اگ بھڑک
اٹھنا، مراد جہنم۔
۵۹۱ سوات: سوئۃ (بروزن عوۃ) کی جمع
'پاسندیدہ شے، مردہ جسم، شرمگاہ۔'
۳۳۸ (ش)
شاخصۃ: 'شخص' (بروزن خلوص) گھر
سے نکلتا۔ ایک شہر سے دوسرے شہر
جانا، تعجب سے آنکھیں نکل پڑنا۔
۳۶۳ شطط: بروزن وسط) حد سے نکلتا، دور
پلے جانا۔ حق سے دور کی باتیں۔
۵۰ شقی: اپنے لیے مصیبت و مزل کے اسباب
فراہم کرنے والا۔
۲۵۸ شقاوت: یہاں بمعنی رنج و تعب و تکلیف
۲۳۱ شہود: عملی شہادت، اپنے کردار سے کسی
بات کی گواہی دینا۔
۷۲۱ شہید: مادہ 'شہود' چشم دید گاہی و خبر داری
۷۲۰ شیعۃ: گروہ، ایک دوسرے سے تعاون کرنا والا گروہ
۲۹۹

(ص)

- ۱۹۰ صدف: پہاڑ کا کنارہ
صدیق: صفت سے صیغہ مبالغہ بہت ہی سچا
۲۷۲ صراط سوامی: راہ مستقیم
۲۷۵ صرفنا: مادہ 'تعریف' تغیر و تبدیل۔
حالت بدلنا۔
۱۳۸ صعید: مادہ 'صعود' زمین کے اوپر کی تہ
تشر زمین۔
۱۰۸ صلوات: صلوة کی جمع، یہودیوں کی عبادت گاہیں
مراد ہیں۔
۶۶۵ صلی: مصدر، اگ روشن کرنے کے معنی ہیں
یادہ شے جسے اگ میں جلاتے ہیں۔
۲۹۹ صواف: صاف کی جمع، قطار میں کھڑا ہونا
۶۵۸ صوامع: بستی سے باہر ٹھکانوں کی عبادت گاہ (دیر)
۶۶۵ صحرا: (بروزن فکر) دولہا
۶۲۰

(ض)

- ۶۲۹ ضامیر: لاغر و کمزور جانور
۲۷۷ ضحی: سورج کا اوپر آنا
۳۳۷ ضمر: (بروزن حر) ہر طرح کی بیماری
ضمربنا علی: اذ انھم، ہم نے اُن کے
کانوں پر پردہ ڈال دیا۔
۳۶

ضنك: تنگی و سختی

(ظ)

- ۳۳۲ ضنك: تنگی و سختی
ظاہراً: غالب، مسلط، کامیاب
۶۹ ظلام: صیغہ مبالغہ بہت زیادہ ظلم
۶۰۳ ظنوا: مادہ 'ظن' گمان، لیکن بمعنی یقین
۱۳۳ (ع)
عاصفہ: تند و تیز ہوائیں
۵۴۲ عاقر: مادہ 'عقر' بڑ، بنیاد، جس 'عقم'
۲۳۶ عبادۃ: اللہ کے نمونہ بندے، دیکھ سب کے بندے
۲۹۱ عتیا: معنی، ایسا شخص بڑھاپہ سے جس کا جسم
خشک ہو گیا ہو۔
۲۳۵، ۲۳۴ عتیق: عتیق سے شقی، قید و بند سے آزادی
۶۴۱ عدن: ہمیشگی، جاودانی اقامت
۲۹۱ عرش: تخت، قدرت و اقتدار، عرش الہی وغیرہ
۳۳۱ عصیان: اطاعت و فرمان سے باہر ہونا
۳۳۹ ترک مستحب و از کتاب مکروہ
۵۱۳ عکوف: احترام کے ساتھ ملی ہوئی خدمت
۶۹۸ عمیق: یہاں 'دور' بہت فاصلہ مراد ہے
۶۲۹ عننت: مادہ 'عنوت' خضوع و ذلت
۳۲۷

عوج: کجی، گڑھا

عہد: پروردگار پر ایمان، وحدانیت
کی شہادت، ایک وسیع مفہوم

(غ)

- ۱۴۹ غدار: ناشتہ یا دوپہر کا کھانا
غرائیق: غرق (بروزن مزدور) کی جمع
۶۸۶ ایک سیاہ یا سفید رنگ کا آبی پرندہ
۳۹۸ غفار: صیغہ مبالغہ، بخشا، معاف کرنا
۱۵۸ غلام: نوری نوجوان
۷۰۱ غنی: بے نیاز، توں گھر
غوی: مادہ 'غی' غفلت کے سبب جہل و
نادانی، رشد کی ضد
۳۲۹

(ف)

- ۳۶ فقیہ: فقی کی جمع، لوئیہ جوان
۶۲۹ فج: پہاڑی درہ
فتریا: چھڑے کی چادر پارہ پارہ کرنا، خراب
کرنا، عظیم و عجیب۔
۲۵۶ فرج: فاصلہ، شکاف
۵۵۶ فزع: اکبر، عظیم اور بڑی وحشت
۵۶۷ قاع: صاف و ہموار زمین
۳۲۵

(ق)

قانع : قناعت کرنے والا، جو کچھ مل جائے اسی

۶۵۹

پر خوش ہونے والا۔

۳۳۵

قبس : (بروزن) قبس، تھوڑی سی آگ

۱۳۹

قبل : مقابلہ کرنا، سامنا کرنا

قرن : مادہ، اقتران، نزدیکی، قوم و جمیعت

جو ایک ہی زمانہ میں موجود ہو، ہمعصر

۳۰۵

جماعتیں، طولانی زمانہ۔

۵۶۹

قصہ : کسی چیز کو سختی سے توڑنا۔ کوٹنا

۱۹۱

قطر : پگھلا ہوا تانبہ

قیمہ : مادہ، قیام، (بروزن) سید، مستحکم

۳۲۷

ثابت، استوار

ک

۵۳۵

کرب : زمین پلٹنا، اندوہ شدید

کلمات : کلمہ کی جمع، اہم اور با عظمت موجود

۲۲۰

عینی کلمۃ اللہ۔

ل

۹۵

لا تعذ : مادہ، عدا، 'یعدوا'، سباز کرنا

آگھیں پھیرنا۔

لا ترحقنی : مادہ، اوراق، قرو غلبہ سے کسی

۱۵۷

چیز کو ڈھانپنا۔

لبوس : دفاعی حملہ میں استعمال ہونے والا اسلحہ،

۵۴۱

زرد، تلوار، نیزہ وغیرہ

لذہ : الذی جمع، سخت دشمنی رکھنے والا،

۳۲۱

ہٹ دھرم۔

۲۷۹

لسان : زبان، یاد

۷۰۱

لطیف : مادہ لطف، نہایت عمدہ و باریک کام

۳۶۲

لعل : شاید

لن نخلفہ : ایک فعل مہول، نائب فاعل

یہاں سامری اور اس کی خبر مراد ہے۔

دوسرا مفعول ہے اور فاعل اصل

۴۱۶

میں خدا ہے۔

۴۷۲

لہو و لعب : بے مقصد بے ہودہ و نامقول کام

لیقطع : دم گھٹنا، سانس بند ہونا، موت

۶۱۰

کی حالت کو پہنچنا۔

م

۲۳۹

محراب : مادہ، حرب، ہوائے نفس اور

شیطان سے جنگ کی جگہ۔

۶۵۳

مخبتین : مادہ، اجبات، ہموار و وسیع و

۲۱۹

عریض زمین، الطینان، انکساری۔

۵۱

مداو : مادہ، مدد، کشش خطوط، روشنائی

مرافق : راحت و آرام۔ ذریعہ مہربانی

۹۶

مرفق : مادہ، رفیق و رفیق، دوستوں کے

جمع ہونے کی جگہ۔

۶۸

مروء : امریۃ الناقہ، دو بچے کے لیے اونٹنی کا تھن

پکڑنا۔ ہٹ دھرمی کی گفتگو

مَرَدَّ : (بروزن) مَرَد، بازگشت یا مقام بازگشت ۲۹۶

مرضعہ : دودھ پلانے والی جب وہ دودھ

۵۸۸

پلا رہی ہو۔

مشید : مادہ، شید، (بروزن) بید، بلند و بالا

۶۷۲

پختہ و مضبوط۔

مضغہ : مضغ سے مشتق۔ بقدر ایک لقمہ گوشت ۵۹۶

معاجزین : مادہ، معجز۔ جو اللہ تعالیٰ کی قوتوں

۶۸۱

پر غلبہ پانے کے خیال میں ہیں۔

معتو : مادہ، عو، (بروزن) شر، مانع کی ضد، غارش

۶۵۹

جیسی ایک بیماری۔

۶۲۱

مقاصع : موقع کی جمع، آہنی گریز یا کوڑا

۶۶۶

مکتا : مادہ، تمکین، وسائل و ذرائع کی فراہمی

۶۶۶

ملک : (بروزن) ورک

۴۰۳

(بروزن) پلک، کسی شے کا مالک ہونا

۲۷۷

ملیا : مادہ، املا، طولانی مہلت

۲۷۷

مناسک : منسک کی جمع۔ عبادت، مراد

۷۰۶

مختلف و بی ضابطہ

۷۰۶

منت : مادہ، من، بڑے پتھر سے وزن کیا جانا

۳۵۵

گراں بہا نعمت، بخشا۔

۴۶

من لدنک : رحمت، تیری طرف سے رحمت

۴۶

مواقعہا : مادہ، مواقعہ، ایک دوسرے

۱۳۳

پروا قع ہونا۔

۱۳۳

موئل : مادہ، موئل، (بروزن) سرو، طوطا، پناہ گاہ

۱۳۳

موشل : مادہ، موئل، (بروزن) سرو، طوطا، پناہ گاہ

مہدو مہاد : بچہ کو آرام سے لٹانے کی

۳۷۳، ۲۵۷

جگہ۔ گوارہ، مال کی گود

۹۶

مہل : تر نشین تیل

(ن)

۵۳۰

نافلہ : نعمت، اضافی کام، زائد عمل

۴۰۶

نبرج : مادہ، برج، زائل ہونا

۲۸۲

نجیا : سنجی، مناجی کے معنی میں، جو کسی

۲۸۲

دوسرے کے کان میں بات کرے۔

۳۰۴

ندیا : ندی، رطوبت، سخاوت، رنجش

۲۰۷

نزل : (بروزن) نزل، منزل، سہانی کی اشارہ

۲۰۷

نسفا : مادہ، نصف، غذائی جنس کو چھلنی

۴۶۵

میں ڈال کر پلانا، مراد برباد کرنا۔

۶۵۳

نسک : عبادت، ناسک، عابد، مناسک ج

۱۲۳

نفاور : مادہ، غدر، کسی چیز کو ترک کرنا

۴۰۷

نفخہ : حقیر، کم مقدار چیز، ملائم شدہ

۴۰۷

نفشت : مادہ، نفش، (بروزن) نفش، رات

۵۳۷

کے وقت، پرانہ و منتشر پھیریں۔

۵۵۰

نقدہ : مادہ، قدر، سخت گیری، تنگی دینا

۵۵۰

نکیر : انکار، یہاں عذاب و عقاب کے معنی

۶۷۲

میں ہے۔

۳۷۲

نہی : نہیہ کی جمع۔ امر کی ضد، بمعنی

۳۷۲

عقل و دانش۔

(و)

وذر: (بروزن مرز) کسی چیز کو معمولی و گھٹیا جان کر ترک کرنا۔

۵۵۴

وراء: پیچھے

۱۶۴

ورد: پیاسے انسانوں یا جانوروں کا گردہ جو گھاٹ کی طرف دوڑتا ہے۔

۳۱۳

وزیر: مادہ 'وزر' سنگین بوجھ، بار حکومت اٹھانے والا۔

۳۴۹

وسوسہ: بہت دھیمی آواز ذہن میں جُرسے

۵۳۸

مطالب: بے بنیاد افکار وفد: (بروزن وعد) گردہ جو مشکلات کو حل کرنے کے لیے بزرگوں کے پاس جاتا ہے

۳۱۲

وقر: (بروزن جبر) کان کا بھاری پن

۱۴۳

(بروزن رزق) بار سنگین

(ھ)

ھامره: بھی ہوئی آگ، ایسی زمین جس پر مہربانی ختم ہو گئی ہو۔

۵۹۶

ھضم: نقص، کمی ھمس: (بروزن لمس) آہستہ و پشمال آواز

۵۲۶

ھوئی: بلندی سے گرنا۔ ہلاکت، راندہ و رگاہ ہونا

۴۲۶

(ی)

یخضفان: مادہ 'خضف' لباس

۴۳۹

یخضو: مادہ 'اوغاض' ابطال، نازل کرنا

۱۳۹

یستحسرون: مادہ 'حسر' پوشیدہ چیز کو کھولنا

۴۷۸

یسرفاہ: مادہ 'تیسر' سہل و آسان کرنا

۲۲۳

یسطون: مادہ 'سطوت' فعل مضارع

۷۱۱

یصحبون: کوئی چیز حمایت یا مدد کے طور پر دینا

۵۰۳

یصھر: مادہ 'صھر' (بروزن قہر) چربی گھیلنا

۶۲۰

یفرط: مادہ 'فرط' (بروزن شرط) آگے

۳۶۳

یہ: وریائے عظیم، مراد وریائے نیل

۳۵۶

ینسون: مادہ 'نسول' (بروزن فضول)

۵۶۳

تیزی سے نکلنا۔

۵۶۳

ینشرون: مادہ 'نشر' پیچیدہ چیزوں کو پھیلانا۔

۴۷۸

یہتی: مادہ 'تھیہ' تیار کرنا

۵۱

(ی)

یخضفان: مادہ 'خضف' لباس

۴۳۹

یخضو: مادہ 'اوغاض' ابطال، نازل کرنا

۱۳۹

یستحسرون: مادہ 'حسر' پوشیدہ چیز کو کھولنا

۴۷۸

یسرفاہ: مادہ 'تیسر' سہل و آسان کرنا

۲۲۳

یسطون: مادہ 'سطوت' فعل مضارع

۷۱۱

یصحبون: کوئی چیز حمایت یا مدد کے طور پر دینا

۵۰۳

یصھر: مادہ 'صھر' (بروزن قہر) چربی گھیلنا

۶۲۰

یفرط: مادہ 'فرط' (بروزن شرط) آگے

۳۶۳

یہ: وریائے عظیم، مراد وریائے نیل

۳۵۶

ینسون: مادہ 'نسول' (بروزن فضول)

۵۶۳

تیزی سے نکلنا۔

۵۶۳

ینشرون: مادہ 'نشر' پیچیدہ چیزوں کو پھیلانا۔

۴۷۸

یہتی: مادہ 'تھیہ' تیار کرنا

۵۱

متفرق موضوعات

آخری مقابلہ کیلئے فرعون کی تیاری

سب نشانیوں کے بعد فرعون نے انکار کیا مقابلہ کا دن مقرر ہوا۔ اپنے وسائل مجتمع کر لیے گئے۔

۳۸۰ تا ۳۷۶

آسمان پھٹ کر ریزہ ریزہ کیسے ہو گئے؟

اللہ کی اولاد کا عقیدہ نہایت قبیح و بیجاں نیز ہے کہ ہر چیز منقلب ہو جائے گی۔

۳۱۹

آسمان مضبوط پھٹتا ہے

فضائی قشر کے خواص کی بحث

۴۹۲ تا ۴۹۴

آسمانی کتاب کو قوت سے پکڑو

عمومی حکم، مسلمانوں کو حکم جس قدر قوت و طاقت ممکن ہو دشمن کے مقابلہ میں فراہم کر دو۔

۲۴۱

آگ گلزار ہو گئی

ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالنا، آگ کا گلزار ہونا۔

۵۲۲ تا ۵۲۵

ابراہیم کے دندان شکن دلائل

انہی سے پوچھو کس نے انہیں توڑا، ایسوں کی عبادت کیوں کرتے ہو جو نہ بول سکیں نہ دفاع کر سکیں۔

۵۱۹ تا ۵۲۲

اخلاص یا عمل صالح کی روح

اسلام ہر عمل کو اس کی نیت یا مقصد کے ساتھ قبول کرتا ہے۔

۲۲۴

اس زمانہ میں قربانی کے گوشت کی ذمہ داریاں

گوشت اور کھالوں کے مستحقین تک نہ پہنچنے کی صورت میں ضائع ہو جانا۔

۶۳۸

اسماعیل، ذی الکفل اور ادریسؑ

وہ سب صابر تھے، ہم نے انہیں اپنی حجت میں داخل کیا۔ وہ صالحین میں سے تھے۔

۵۴۸ تا ۵۴۹

اس نے تمہارا نام مسلمان رکھا

مسلمان وہ ہے جو تمہارے اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کو بہت بڑا اعزاز تصور کرے۔

۷۲۰

اصحاب کہف والرقیم

- چند افراد حفاظتِ ایمان کے لیے غار میں جا چکے ۴۷، ۴۸
وہ رب پر ایمان لائے، ہم نے مزید ہدایت
عطا کی۔ ۴۸
ایمان اور جوانی کا رشتہ، جو انہوں نے سرچشمہ
ایمان ہے۔ ۵۱
تاریک، سرور، خاموش، پرخطر، لیکن نورانی غار ۵۲
پاکیزہ غذا منگو اے کا اہتمام کیا ۶۱
طویل نیند سلائے اور جگائے پر ہماری قدرت ۶۰
ہم نے ان کا قصہ بیان کیا تاکہ لوگ قیامت
کا یقین کر لیں۔ ۶۳
وہ سات تھے اور اٹھواں ان کا کتا ۶۴
وہ غار میں تین سو نو سال رہے ۷۵
یہ غار ترکی کے شہر افسوس کے قریب ہے ۸۲

اللہ اور مسجد الحرام کی راہ سے روکنے والے

- جو اس سرزمین پر راہ حق سے روگرداں ہو۔
جسے ہم اذیت ناک عذاب کا مزہ چکھائیں گے ۶۲۳

اللہ نے کن لوگوں سے مدد کا وعدہ فرمایا ہے

- محبتیں، محبتیں اور اللہ کے انصار ۶۶۸، ۶۶۹

اُمت کی رہبری

- وحی موسیٰ کی کوششیں، جناب امیر
کی مثال، اعتراض کا جواب۔ ۴۰۹، ۴۱۰

انبیاء کے خلاف شیطانی وسوسے

- پستلے بھی ہرنی کے کام میں شیطان نے
دوسرے والا، اللہ اپنے نبی کو تنہا نہیں
چھوڑتا۔ یہ تمام امور بیماروں اور سنگدل
افراد کی آزمائش ہیں۔ ۶۸۲، ۶۸۵

انبیاء کے علاوہ دوسروں پر بھی وحی ہوتی ہے

- رمز و اشارہ، الہام مرد و عورت کے علاوہ
کتنی کو بھی ہوا۔ ۳۶۶، ۳۶۷

اندرونی اور بیرونی اندھا پن

- اس جہان میں احکامِ خدا سے روگردانی
کے نتائج۔ ۴۴۳، ۴۴۵

انسان جلد باز مخلوق ہے

- مشکلوں کا استہزاء، قیامت کے لیے
تقاضا، جلد بازی کی مختلف تعبیریں
اور ممانعت۔ ۴۹۸، ۵۰۰

انسانی زندگی کے سات مراحل

- مٹی، نطفہ، علقہ، مضغہ، بچپن، جوانی،
بڑھاپا، (ارذل العمر) ۵۹۸، ۶۰۰

انشاء اللہ

- انشاء اللہ کہنا اہم حقیقت کا بیان ہے ۷۲
انقلابِ انبیاء کی دشمن تحریکیں ۶۹۵
ہر انقلاب کی دشمن تحریکیں سرگرم عمل رہتی ہیں۔
انقلابِ موسیٰ کے خلاف سامری کا عمل۔ ۴۰۸
اہل خانہ کو نماز کا حکم دو اور خود بھی پڑھو

- نماز دل کی پاکیزگی، توحید کی تقویت اور یا خدا
کے دوام کا سبب ہے، ہم تم سے کچھ نہیں
چاہتے، بلکہ تمہیں روزی دیتے ہیں۔ نیک
انجام تقویٰ و پرہیزگاری کے لیے ہے۔ ۴۵۲، ۴۵۳

اہل ذکر کون ہیں؟

- آگاہ و باخبر لوگ علماء و مجتہدین اور بلند مرتبہ
ائمہ اہل بیت۔ ۴۶۷

ایام معلومات

- ایام المعدودات اور ایام المعلومات کا مفہوم
ایک سے یا مختلف (بحث) ۶۳۲

ایمانی عہد کی صداقت

- جناب اسماعیل کا ایک شخص سے وعدہ
ایک سال تک اسی مقام پر منتظر رہے۔ ۲۸۴

ایک اُمت

- سب سے پہلے اور ان کے پیروکار ایک اُمت
ہیں۔ سب کا ہدف و مقصد ایک تھا۔ ۵۵۸

ایک بیہودہ و اسخرا فی خیال

- ایمان، تقویٰ اور پاکیزگی کو مال دُنیا اور
دوسری لذتوں سے محرومیت کا سبب
سمجھتے ہیں۔ ۳۰۴، ۳۰۸

ایمان محبوبیت کا سرچشمہ

- اللہ صاحبِ ایمان اور عمل صالح انجام دینے
والوں کی محبت دلوں میں ڈال دے گا۔ ان
میں ایک فخر معمولی جذبہ کشش۔ ۳۱۹

بارگاہ سے بچہ پیدا ہونا

- بہت سے جانوروں میں نر کے بغیر بچے
پیدا ہوتے ہیں۔ ۲۶۱

بُت پرستی

اللہ کے سوا کچھ اور معبود بنائے ہیں جو ان کی عورت و شفاعت کا سبب ہوں، مشکلات میں مدد کریں، مگر قیامت میں یہ ان کے دشمن ہوں گے۔

۳۰۸

بُت پرستی کی تشکیل

مٹی، لکڑی اور دھاتوں کے علاوہ غیر خدا کی طرہ ہر قسم کی توجہ۔

۵۱۵

بُت پرستوں کی سرزمین سے حضرت ابراہیمؑ کی ہجرت

نرو میں تاب مقابلہ نہ رہی تو اس نے چاہا کہ ابراہیمؑ یہاں سے چلے جائیں۔ ابراہیمؑ بھی کابر رسالت انجام دے چلے تھے جناب لوطؑ حضرت سارہ اور مومنین کو لے کر شام پہنچ گئے۔

۵۲۹، ۵۲۸

بُتوں کی ناتوانی کی واضح مثال

اللہ نے کبھی کی مثال دی ہے۔ بُتوں کے علاوہ نمرود و فرعون جیسے خدائی کے دعویدار بھی ایک کبھی پیدا نہیں کر سکتے۔

۷۱۳، ۷۱۴

ۛ

مُرد بار لوگوں کے لیے بشارت ہے

استقامت و پامردی دکھانے والوں کیلئے بشارت ہے۔

۶۵۵، ۶۵۲

بیابان میں آگ کا شعلہ

موسیٰؑ نے شعلہ دیکھا، کہا تم ٹھہرو میں آگ لے آؤں، راستہ کا پتہ کروں اور تم سہری سے بچ سکو۔

۳۳۹، ۳۳۲

پانچ اہم تعمیری کام

رکوع، سجود، عبادت، فعل الخیرات اور جہاد جیسا جہاد کرنے کا حق ہے۔

۷۱۶، ۷۲۲

پیغمبر اسلامؐ کے تقاضوں میں تمثیل موسیٰؑ

رسول اکرمؐ نے اللہ سے وہی کچھ مانگا جو موسیٰؑ نے مانگا تھا، البتہ ہارونؑ کی جگہ علیؑ کو متعین فرمایا۔

۳۵۲

تشلیث کی بحث

مختلف عیسائی فرقوں کے نظریات تبسیح و ذکر

۲۶۹

تبسیح و ذکر سے مراد آلودہ معاشرہ میں حقائق الہیہ کو رو بہ کار لانا۔

۳۵۲

تکبیر

غزوہ تکبیر ہمیشہ کفر و سرکشی کا سرچشمہ رہا ہے

۱۳۱

تمام پیغمبرؑ نوح البشر سے تھے

ہم نے تم سے پہلے بھی آدمی ہی نبی بنا کر بھیجے وہ کھاتے پیتے تھے، ان پر وحی کی، ان کی زندگی ہمیشہ کی نہ تھی۔

۳۶۵

تمہارا رب کون ہے؟

اس کے انعامات، پرورش، توحید، جہاد اختیار اور علم و قدرت کا بیان۔

۳۶۸ تا ۳۷۳

تنگ زندگی

تم دونوں اور شیطان یہاں سے زمین پر اتر جاؤ، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو۔ جو میری ہدایت کی پیروی کرے گا، گمراہ نہ ہوگا، میری یاد سے منہ موڑنے والا نہ ہوگا۔ سخت زندگی بسر کرے گا۔ نابینا محسوس کریں گے۔ میں بینا تھا، تم نے فراموش کیا۔ ہم نے بھی بھلا دیا۔

۳۳۲، ۳۳۱

جادو کی حقیقت

غریب نظر، اجسام و مواد کے طبیعیاتی و کیمیائی خواص، شیاطین کی امداد وغیرہ۔

۳۸۳، ۳۸۴

جادو گر کبھی کامیاب نہیں ہوتا

جادو عارضی اور محدود کلام ہے، مشق و مہارت ہے۔ معجزہ کے پیچھے خدائی قوت ہوتی ہے۔

۳۸۵، ۳۸۴

جذبہ عشق الہی

اپنے رب سے ہم کلام ہونے کے شوق میں موسیٰؑ کا طور پر جانا۔

۴۰۷

جہاد کا پہلا حکم

اللہ نے مومن کے دفاع کا وعدہ فرمایا۔ اگر ان کی مدد نہ کی جائے تو عبادت لگا دیں ویران ہو جائیں۔

۶۶۳ تا ۶۶۷

جہان ہستی میں اللہ کی نشانیاں

زمین و آسمان کی پیوستگی و کشادگی کی بحث موجودات کی پانی سے پیدائش، پہاڑ زمین میں گاڑ دیے۔ ان میں درے بنائے، آسمان کو محفوظ چھت، چاند سورج بنائے۔

۳۸۷ تا ۳۹۲

جہنم کا ایندھن

انہیں اور ان کے معبود کو جہنم میں جھونک دیا جائے گا، خواہش کے باوجود دنیا میں پلٹ کر نہ آئیں گے، وائے ہوتم پر۔ ۴۶۸ تا ۴۶۲

حاجب کا خواب

جناب امیر کو خواب میں دیکھنا۔ آپ کا اس کے شعر کی اصلاح فرمانا۔ ۴۶۷

حدیث منزلت

ان تکون منی بمنزلہ ہارون من موسیٰ..... ۴۵۳

حصول وحی تک تلاوت میں سبک نہ کرو

تلاوت قرآن میں اس سے پہلے کہ وحی مکمل ہو جلدی نہ کرو اور خود اندامیرا علم زیادہ کر ۴۳۲ تا ۴۳۴

حیاتِ دنیا

دنیا میدان آزمائش ہے، اس کی دلربائیوں سے فریب نہ کھائیں۔ ۴۱، ۴۰

بارش، دانہ پھوٹنا، پروان چڑھنا، مال و اولاد دُنیا کی زینت۔ ۱۱۷، ۱۱۶

دُنیا کی ناپائیدار خوشیاں

۱۱۹

خدا اور اولاد

یہودیوں، عیسائیوں اور مشرکین کو تنبیہ وہ بڑا جھوٹ بولتے ہیں۔ ۱۱۲، ۱۱۱
اللہ کو پہچانا نہیں، اولاد کے لیے جسم بیوی اور احتیاج لازم ہیں جن سے وہ بے نیاز ہے۔ وہ سب کو اپنی بارگاہ میں حاضر فرمائیں گے ۳۱۷

خدا کے سبھی نام اچھے ہیں

خدا کے ننانوے نام ہیں، جو ان ناموں سے پکارے دعا قبول ہوگی، خالق، حاکم، مالک، علیم سب اسمائے شہی ہیں۔ ۳۲۳

خدا کی عجیب و غریب قدرت نمائی

خود سر و طاقتور افراد کے مقابلہ میں کوئی فوج جمع نہیں کی، ان کے ہاتھوں ہی انہیں برباد کر دیا۔ ۳۶۵

خلقتِ زمین و آسمان کھیل نہیں

یہ وسیع زمین و آسمان اور ان کے درمیان کی چیزوں کی خلقت کسی اہم مقصد کو واضح کرتی ہیں، یہ کہ ان کا کوئی خالق ہے اور پھر معاد۔ ۴۷۱، ۴۷۳

داستانِ حضرت موسیٰ

حضرت کون تھے؟ خود ساختہ افسانے
موسیٰ حضرت کی ملاقات کو کیوں گئے؟ ۱۷۴
اس داستان کا درس حاصل۔ ۱۷۶
استاد و شاگرد کے روابط ۱۷۹، ۱۸۱

داؤد و سلیمان کا فیصلہ

دونوں فیصلے صحیح۔ سلیمان کے فیصلہ کی تائید
ہم نے دونوں کو علم و قوت فیصلہ عطا فرمائے
ہم ایسا کرنے پر قادر ہیں۔ ۵۳۷ تا ۵۴۰

دشمن سے مدارات

ابتداء قرآن نے ظالموں اور گنہ گاروں کو
مہر و محبت سے سمجھایا ہے۔ ۳۶۵

دلیلِ تمنا

اس جہان میں ایک نظام واحد حکم فرمانظر
آتا ہے جو تمام حیات سے ہم آہنگ ہے
قوانین ثابت و جاری ہیں۔ ۴۷۹

دولتِ دنیا کا غرور

یہ وقار بھی ختم نہ ہوگا، میرا خیال نہیں کہ کبھی
قیامت آئے گی۔ ۱۱۳

اس داستان کے چند سبق

۱۱۵، ۱۱۴

غرور شکن عوامل

۱۱۹

دُنیا میں قیامت کے مناظر

اللہ کا عذاب شدید ہے، قیامت کا زلزلہ
ہم گمراہ ہوگا۔ ۵۸۸

ذکرِ رحمت

یہ تیرے پروردگار کی رحمت کی یاد ہے،
اس کے بندہ ذکرِ تبارک کے بارے میں۔ ۲۳۹، ۲۳۰

رحمت اور یادِ آوری کا سُورہ

شُرک و بت پرستی، ظلم و بیدادگری کے خلاف
انبیاء اور مصلحین کی کوششوں کی یادِ آوری۔ ۲۷۵

رزقِ حسن

جنہوں نے ہجرت کی، شہادت پائی، اللہ
ان کو عہد روزی اور مخصوص نعمات سے
نوازا ہے گا۔ ۶۹۰، ۶۹۳

رَسُول اور نبی میں فرق

رَسُول پیغام رسانی پر اور نبی کی تبلیغ و
ترویج پر مامور، نبی وحی الہی سے آگاہ
اور اس کی خبر دینے والا۔ ۲۸۲، ۲۸۳
۶۸۹

روح خدا

اللہ تعالیٰ کا بزرگ فرشتہ جبریل امین وحی، اس کے علاوہ برگزیدہ لوگوں کو اللہ کا پیغام پہنچانے والا۔

۲۴۸

رہبری انقلاب کی شرائط

براعتبار نوعیت، مبارزہ، تمام ضروریات فراہم کرنا، جیسا کہ موسیٰ نے اپنی دعاؤں سے حاصل کیا۔

۳۵۱

زچہ کے لیے کھجور کی اہمیت

کھجور زچہ کی بھائی صحت اور اس سے بچہ کیلئے دودھ مفید ہوتا ہے کھجور میں تیرہ سیاتی اور پانچ جیاطین ہیں۔

۲۵۳

زمین اور اس کے اطراف کا حاکم ہونا

بزرگوں، بڑی بڑی اقوام، علماء کی تدریجی موت کو مغرور و بے خبر لوگوں کے لیے بطل و استان عبرت بیان کرنا۔

۵۰۳

زمین کی حکومت صالحین کیلئے ہے

اس دنیا میں آخر کار صالحین کی حکومت ہوگی، قیام مہدی کی روایات۔

۵۷۴ تا ۵۷۱

سامری کا شور و غوغا

فتنہ سامری میں ہارون نے اپنے فرائض انجام دیے، تمہارا رب وہی غفار ہے جس نے تمہیں نعمات عطا فرمائیں میری اطاعت و پیروی کرو۔

۳۰۱ تا ۳۰۴

سامری کا عبرت ناک انجام

دو تفسیریں، ان کے اجزاء سامری کی صدمے، لاساس، گنہگار مجسمہ کی بربادی۔

۳۱۲

سامری کون تھا؟

عبرانی نام سامری، عربی میں ثمری، ایک خود خواہ و فتنہ گر شخصیت۔

۳۱۹

سبب سازی و سبب سوزی

اللہ تعالیٰ اشیاء کے خواص و آثار و طبائع کو بدل دیتا ہے۔

۵۲۶

سرکشوں کے خلاف جنگ

حضرت موسیٰ کا طاغی فرعون سے مبارزہ، ایک مثال ہے۔

۳۵۱

۵

حضرت سلیمان، زکریا، مریم، عیسیٰ اور ابراہیم کے تذکرے۔

۲۲۶ تا ۲۲۹

سیر و سیاحت اور دلوں کی بیماری

کیا وہ چلتے پھرتے نہیں کہ دل حقائق کا اور اک کرتے، آنکھیں تو دیکھتی ہیں، دل اندھے ہو جاتے ہیں۔

۶۷۵ تا ۶۷۹

شرک

اے کاش میں کسی کو اپنے رب کا شریک نہ گردانتا۔

۱۱۰ تا ۱۱۲

کسی کو عبادت پروردگار میں شریک نہیں کرنا چاہیے۔

۲۲۳ تا ۲۲۴

یہ خیال پیدا ہونا کہ اللہ کو ہماری عبادت کی کیا ضرورت ہے۔

۲۸۷ تا ۲۸۹

شعائر اللہ کی تعظیم علامت تقویٰ ہے

مناسک حج اور تلبیہ خالصہ اللہ ادا کرو

۶۴۶

شیطان کے پیروکار

حق تعالیٰ کی کینائی، شرک کی نفی، مردوں کی حیات نو اور حشر و نشر کے بارے میں جھگڑنے والے۔

۵۹۰ تا ۵۹۳

سورہ انبیاء کی فضیلت و مضامین

اس کی تلاوت سے حساب آسان، پیغمبر مصافحہ کریں گے، نبیوں کے حالات مبداء و معاد وغیرہ

۲۵۷

سورہ حج کے فضائل و مضامین

تلاوت کرنے والے کو گذشتہ اور آئندہ حجاج کی تعداد کے برابر ثواب ملے گا۔

۵۸۵

قیامت، شرک، عذاب، حج، فوج دین اور ظالموں کے خلاف قیام کا بیان۔

۵۸۵

سورہ طہ کے فضائل و مضامین

تلاوت کرنے والے کو اللہ دوست رکھتا ہے۔
(امام جعفر صادق) قرآن کی عظمت، ذکر بنی اسرائیل وغیرہ۔

۳۲۶ تا ۳۲۷

سورہ کہف

سورہ کی فضیلت میں رسول پاک اور آئمہ کی احادیث و مضامین

۲۹ تا ۳۱

سورہ مریم کے فضائل و مضامین

مریم اور سات نبیوں کی تصدیق یا تکذیب کرنے والوں کی تعداد سے دس گنا زیادہ ثواب قاری سورہ کو ملے گا۔

۲۲۶ تا ۲۲۷

شیطان کی فریب کاری۔

عبدالہم، ناپستہ عبد، سجدہ ملائک، شیطان
کا انکار، شیطان کی دشمنی، شیطان کا دوزخ و غیرہ ۳۹۶ تا ۳۹۷

طبقاتی تفاوت

فقر کو اپنے پاس سے اٹھا دو ۹۶ تا ۹۷
غریب و مساکین ہمیشہ مستکبرین کے لیے باعث
نفرت رہے۔ ۹۸
دونوں جہانوں کی زندگی کا موازنہ ۹۹
ہوا پرستی اور خدا سے غفلت ۱۰۰
سرمایہ کی وجہ سے سویا داریوں کی قربت ۱۰۱
قدر و قیمت معیار دوزخ و دوزخ اور دولت و ثروت
مقام و منصب اور ظاہری ہیئت تھی۔ ۳۰۳

طرح طرح کے بہانے

حساب قریب ہیں مگر وہ غفلت میں پڑے
ہیں۔ غفلت آیات حق سے اعراض کا
سبب ہے۔ یہ جادو گر ہے، اس نے قرآن
خود گھڑ لیا ہے۔ ۳۶۲، ۳۵۹

ظالم

ہم نے ظالموں کے لیے آگ سے گچھلی ہوئی
دھات جیسا پانی تیار کر رکھا ہے۔ ۹۶

آیات سے منہ پھینا، بہت بڑے ظالم، دلوں
پر پردہ، کان بھاری کر دیے۔ ۱۳۱

مگر عذاب سے ڈر کر بھاگتے ہیں، بھاگو نہیں
پاٹ اور اسی طرح بے رحمی و ظلم کا مظاہرہ
کرو۔ عذاب میں گھر کرکتے ہیں واسے ہوم
پر ہم ظالم تھے۔ ۳۶۹، ۳۷۰

ظلم

باخلف اولاد نے نماز کو ضائع کیا، شہوات
کی پیروی کی، عنقریب سزا پائیں گے، مگر
جو توبہ کر لیں ان پر بالکل ظلم نہ ہوگا۔ ۲۸۶

ظلم اور ہضم میں فرق

ظلم ناکردہ گناہ ہے، ہضم ثواب میں کمی
کی طرف اشارہ ہے۔ ۳۲۹، ۳۲۸

ظلم کے ساتھ الحاد کا مفہوم

کفار ظلم کے ذریعہ میانہ روی سے تجاوز
کرتے ہیں۔ ۶۲۶

عالم کی پیروی کرنے کی التجا

حضرت ابراہیمؑ آذکو اپنی پیروی کی دعوت دیتے ہیں۔
ایسے ظلم کا قائل ہوں جو تیرے پاس نہیں۔ ۲۷۵

عالمین کے لیے پیغمبر رحمت

موجودات کو جس قدر عالم خیال میں لائیں ان
سب کے لیے آپؐ کا وجود وسود رحمت ہے ۵۷۹، ۵۷۸

عذاب الہی

ہم نے ہر طرح کی مثالیں دیں مگر کسرش ایمان نہ لائے ۱۳۸
انسان سب سے بڑا جھگڑالو، عذاب الہی میں
جلدی ممکن نہیں۔ ۱۴۲

عصائے موسیٰؑ ویدربضیا

عصا سانپ بن گیا، ہاتھ بفل میں دیا، نکالا تو
نورانی بن گیا۔ دو معجزے

علم سرچشمہ ایمان و انقلاب ہے

جادو گر جان گئے کہ موسیٰؑ کے ساتھ خدائی
طاقت ہے تو ایمان لے آئے۔ دل میں ایسا
انقلاب آیا کہ جہنم سے نکل کر جنت میں
پہنچ گئے۔ ۳۹۳، ۳۹۱

غرائق کا من گھڑت افسانہ

ایک من گھڑت شیطانی روایت منسوب بعبداللہ
ابن عباس جو ثابت نہیں ہوتی۔ ۲۸۸، ۲۸۶

فاخلع نعلین کا مفہوم

عجز و انکسار سے بڑھنا، بقولے و دعوت،
بیابان میں کنبد کی تباہی، فرعون کا خوف ۲۳۹

فرزند کی نفی

اللہ سے ہر قسم کی احتیاج کی نفی، جو اللہ کیلئے
بیٹے کے قائل ہیں، انہوں نے اللہ کا اپنے
اوپر قیاس کیا ہے۔ ۲۲۴

فرعون کے ساتھ پہلا مقابلہ

زمی کے ساتھ تبلیغ ۳۶۵ تا ۳۶۰

قربانی کیوں کی جاتی ہے؟

قربانی کا ثواب، طریق کار، خالصتاً اللہ
کے لیے ہونا، خود کھانا اور مستحقین کو
کھانا وغیرہ کی تفصیلات۔ ۶۶۱، ۶۵۸

قول الزور کیا ہے؟

قبل از اسلام مشرکین کا تبلیغ ۶۲۲

کافر

کافروں کا گمان، مجھے چھوڑ کر میرے بندوں کو
سرپرست بنائیں۔ ۲۰۷، ۲۰۶

۲۰۶ ہم کافروں کے سامنے جہنم کو پیش کریں گے
جب جاری آیات سنائی جاتی ہیں تو کافر مومنوں
سے کہتے ہیں کہ ہم میں اور تم میں کون بہتر ہے؟

کامران کون ہیں؟

جواب اپنے اوپر کی ہوئی زیادتی کا برابر بدلہ
لے لے مگر اس پر مزید زیادتی نہ کی جائے تو اللہ
اس کی مدد کرے گا، اللہ ہی برحق، بلند مقام
اور بڑا ہے۔

۶۹۵ تا ۶۹۸

کائنات کا انسان کیلئے مستحق ہونا

اس تسخیر کا مطلب یہ ہے کہ کائنات انسان
کی خدمت گزار ہے۔

۷۰۳ تا ۷۰۴

کائنات میں اللہ کی نشانیاں

پانی برسا، زمین کا شاداب ہونا زندگی و موت
عطا کرتا ہے۔ زمین و آسمان میں جو کچھ ہے
اسی کا ہے۔

۷۹۹ تا ۸۰۲

کان کھول کر سنو

اللہ اور اس کے انبیاء کے احکام پر متوجہ
نہیں ہوتے۔ کیا وہ غالب ہیں یا ہم؟

۵۰۲ تا ۵۰۴

ۛ

کج بخشی کرنے والے

بنیہ علم و دانش کے واضح کتاب کے بارے
میں جھگڑتے ہیں۔

۶۰۱ تا ۶۰۳

کفار قیامت کے آستانہ پر

ہلاک ہونے والے خواہش کے باوجود پلٹ
کرنہ آئیں گے غلبہ یا جوج دما جوج۔
قیامت کا وعدہ قریب ہوگا۔ آنکھیں
پتھر جانیگی۔ افسوس ہم ظالم تھے۔

۵۶۱ تا ۵۶۳

کفار کی بہانہ سازی

معجزہ طلب کرنا بہانہ ہے، اگر ہم ہادی بھیجے
سے پہلے ہلاک کر دیتے تو کہتے کہ کوئی پیغمبر
کیوں نہ بھیجا کہ ہم پیروی کرتے، کوہ ہم
انتظار کرتے ہیں، تم بھی انتظار کرو۔

۴۵۴

کفار کی مادی نعمتیں

کفار کو دی گئی نعمتوں کو خاطر میں نہ لانا۔ یہ
دنیا کے شگوفے اور آذنائیں ہیں۔ جو روزی
نہیں ہم نے دی ہے وہ بہتر ہے۔

۴۵۰ تا ۴۵۲

کیا آدم گناہ کے مرتکب ہوئے؟

ترک الی گناہ نبی کی تشریح

۴۳۹ تا ۴۴۰

لا وارث کنوئیں۔ فلک بوس محل

کتنی بستیوں کے ساکنین کو ہم نے ہلاک کر
دیا، کنوئیں خشک ہو گئے، فلک بوس
عمارت منہم ہو گئیں۔

۶۷۱ تا ۶۷۳

لقد اللہ

قیامت میں انسان ہر زمانہ سے زیادہ بہتر طور
پر آثارِ خداوندی کو دیکھے گا۔

۲۱۴

ماں بیٹا ایک معجزہ

ہم نے مریم ادا اس کے بیٹے کو سارے عالم
کے لیے آیت و نشانی قرار دے دیا۔

۵۵۷

ماں کا مقام

علی نے ماں کو الزام سے بری قرار دیکر
بلند مرتبہ کا اظہار کیا۔ ماں کے مقام و مرتبہ
پر اسلام میں حیرت انگیز روایات۔

۲۵۹ تا ۲۶۰

مخلص

بہت ہی با عظمت مقام جہاں شیطان
کا گزر نہیں۔

۲۸۲

ۛ

کیا خدا کا کوئی ہم نام ہے؟

یہاں نام کے معنی و مفہوم سے مراد ہے خالق،
رازق، مخفی، مہینت۔

۲۹۶

کیا قرآن حادث ہے؟

اگر کلام اللہ سے مراد اس کا مفہوم ہے تو وہ قدیم
ہے۔ اگر الفاظ سے مراد کلمات و وحی ہے تو حادث ہے۔

۴۶۳

گردشِ ارض و فلک

متنلف تفاسیر و مطالب

گذشتگان تاریخ سے عبرت

ان کی ہدایت کے لیے کافی نہیں ہے کہ سابقہ
نافرمان قہول کو ہلاک کر دیا۔ نشانیاں صاحبان
عقل کے لیے ہیں۔

۴۴۶ تا ۴۵۰

گناہ میں اسراف

اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں آنکھ کان، عقل
کو غلط راستوں پر ڈال دینا۔

۴۴۶

لائقنا ہی تصویر کشی

اعداد کی عظمت

۲۲۱، ۲۲۲

مریم کی تمنائے موت

اسلام نے موت کی تمنائے منع کیا، لیکن یہ گدشتہ شریعت کی بات ہے۔

۲۵۲

مزامیر داؤد

صالحین کی حکومت کی بشارت، شرع منقطع ہو جائیں گے۔ خدا والے زمین کے وارث ہونگے۔

۵۷۶، ۵۷۴

مسائل کو لہو و لعب جانتے ہیں

باطنی لحاظ سے غفلت میں ڈالنے والے یہود مسائل میں الجھ رہتے ہیں۔

۳۶۱

مستضعف

ملکہ کے مسلمان بلال، عمار، سلمان اور جناب سمیہ وغیرہ

۳۰۴

مشکلات کے مقابلہ کا عمل

موسیٰ نے پہلے ہارون پر شدت کی، پھر سامری کو نکالا اور بنی اسرائیل کو سزا دی کہ ایک دوسرے کو قتل کریں۔

۳۱۸، ۳۱۶

معرکہ ابراہیم و نمرود

اسے ابراہیم تیرا خدا واقعی عظیم ہے (نمرود)

۵۲۷

مغرور و ستگر لوگوں کا فخر

نصرانی حادثہ وغیرہ کا بلال، سلمان، عمار پر مرتبہ و نشان و شوکت کی بنا پر فخر و تمسخر۔

۳۰۴

مقصد خلقت

غرض خلقت ہمارے تکامل و ارتقاء و بلندی کے سوا اور کوئی چیز نہیں۔

۴۷۶ تا ۴۷۳

لمکھی سے بھی کمزور معبود

اللہ کے سوا جنہیں تم بکارتے ہو وہ ایک لمکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے بلکہ لمکھی اگر ان سے کچھ چھین لے تو واپس لینے کی طاقت نہیں رکھتے۔

۷۱۳ تا ۷۰۸

منیٰ میں ذکر خدا

اس ذکر سے وہ بکیریں مراد ہیں جو چند نمازوں تک پڑھنا مستحب ہیں۔

۶۳۳

موجودات عالم اسکی بارگاہ میں سجدہ ریز ہیں

زمین و آسمان کے رہنے والے سب سجدہ کرتے ہیں، چاند، ستارے، چوپائے، کائنات کا ذرہ ذرہ مگنوبی سجدہ کرتے اور ذی عقل تشریف سجدہ کرتے ہیں۔

۶۱۷ تا ۶۱۵

موجودہ دور کی ایجادات

موجودہ دور کی ایجادات ایک لمکھی کی تخلیق کے برابر قرار نہیں دی جاسکتی۔

۷۱۴

من و سلویٰ

من ایک قسم کا طبعی شہد یا کوئی قوت بخش بناتی شیعہ جو درختوں سے نکلتا تھا۔ سلویٰ ایک مال پندہ

۲۹۷

موسیٰ بھی مقابلہ پر آگئے

تم ہی پہلے پھینکو، کچھ خوف محسوس ہوا، حکم دیا اب تم پھینکو، یہ ان سب کو اچک لے گا۔

۳۸۲ تا ۳۸۰

موسیٰ پر اللہ کی مہربانیاں

ولادت، حفاظت و پرورش، مقصد نبوت کے لیے تیاری۔

۳۶۰ تا ۳۵۴

موسیٰ کی دعائیں۔ اللہ تعالیٰ کی عطا

میرا سینہ کشادہ اور کام آسان کر دے، زبان کو قوت، بھائی کو وزیر بنا کر پشت قوی کر دے۔ فرمایا ہر التجا قبول ہے۔

۳۵۱، ۳۴۶

موسیٰ کی عظیم کامیابیاں

جادو گردن کے کھیل کو عصا ساپ بن کر نکل گیا، وہ سجدہ میں گر گئے۔ ہم ہارون و موسیٰ کے رب پر ایمان لائے۔ فرعون کی دھمکی جواب دیا کہ مجرموں کے لیے جہنم اور نومنین کے لیے جنت ہے۔

۲۹۱ تا ۲۸۷

نمون

کافر نمونوں سے کہتے ہیں کہ ہم اور تم میں مقام و مرتبہ کے لحاظ سے کون بہتر ہے!

۳۰۳

نومنین کے دلوں میں علی کی محبت

سورہ مریم، آیت ۹۶ شان علی میں نازل ہوئی۔ بہت سے اہل لغت، مؤرخ و مفسر زعمشری، جوزی کنبی، شافعی، طبری، صباغ مالکی، سیوطی، آلوسی سرفہرست ہیں۔

۳۲۲

نامہ عمل

ہائے ہماری قسمت اکیسی کتاب ہے! تین کتابیں، سب کی کتاب، ہر امت کی کتاب، ہر شخص کی کتاب۔

۱۲۶

نبوت و رسالت کا امامت سے فرق

مقام نبوت و رسالت پیغام حق کو حاصل کرنا اور تبلیغ کرنا ہے۔

۵۳۰

بحیرہ روم

۱۴۷

بحر ہند

۱۴۷

بھاگ گورائی

۲۰۲

دیوار کورش

جبل الطارق

۱۴۷

جبرالٹر (ایک آبنائے)

جنت

۲۰۹، ۳۲

جنم

۲۱۱، ۲۰۸، ۲۰۶، ۲۰۴، ۱۹۳

خانہ کعبہ

۶۳۴، ۶۲۶، ۶۲۵

مسجد الحرام

خلج سونیز

۱۴۷

خلج عقبہ

۱۴۷

دار الندوہ

۳۰۲

سربراہان قریش مکہ کی مشادت کا ایک مقام

درہ وانیال

۲۰۳

دیوار مارب

۱۹۷

یمن کی ایک دیوار بطور بندیا ڈیم

سائرس

۲۰۲

ایک نہر

سویتدیہ

۱۵۹

ایک بند گاہ، انطاکیہ سے ۲۷ کلومیٹر دور

طنجبہ

۱۴۷

جبرالٹر کے قریب ایک شہر

طور

۲۸۱

کلیم اللہ کا مقام کلام (ہم نے موسیٰ کو طور

کی دائیں طرف سے پکارا)

طویٰ

۳۳۷

مقدس سرزمین طویٰ جہاں موسیٰ کو جوتے اتار

کر مودب رہنے کا حکم ہوا۔

عراق - نینوا

۵۵۱

جناب یونس کی جائے تبلیغ

قفقاز

۲۰۲

ایک علاقہ جس میں دو پہاڑوں کے درمیان

درہ وانیال ہے۔

لیدیہ

۲۰۱

ایشیائے کوچک کا شمالی علاقہ (مفتوحہ ذوالقرنین)

مدین

۳۳۶

حضرت شعیب علیہ السلام کا شہر

مصر

۳۳۶

سلطنت فرعون - حضرت موسیٰ کا وطن

مطاف

۶۳۳

منیٰ

۶۳۳

ناصرہ

۱۵۹

فلسطین کے شمال میں ایک شہر

(تمام شد اشاریہ جلد ہفتم، تفسیر نمونہ)